انسانی تہذیب کے پانچ دور
ولیم میک گاگی
ترجمہ: حسن عابدی
مشعل

میرے والدین کے نام!

جنہوں نے بیسویں صدی میں 178 * برس اکٹھے بسر کیے۔ ان میں سے 120 برس انہوں نے بہ طور شادی شدہ جوڑے کے گزارے۔

اور

میرے بھائی اینڈریو کے نام!
جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے۔

* : پُر مسرت زندگی بسر کرنے کی جانب مصنف کا یہ ایک خوب صورت اشارہ ہے۔

تشکّر

بن ہنی کٹ، جین ہیلی سن، مارک ویلٹر، للّی ڈونگ، اینڈریونووِکی، جوئل کرامر، شیلا مِکگارگی، جروائے پیئرنٹ اور رابرٹ مُلّر کا شکریہ جنھوں نے مسوّدے کو پورا یا جزوی طور پر پڑھا اور نہایت کارآمد مشوروں سے نوازا۔

کمپیوٹر کی سہولت مہیا کرنے کے لیے مارک سٹینلے کا، (انگریزی ایڈیشن کے) کورڈیزائن کے لیے کیتھی کروگر کا شکریہ۔ جم نیلسن اور جوشوارز برگ کا شکریہ کہ انہوں نے بہت مدد کی۔ اور بے شمار ناشرین کا شکریہ کہ انہوں نے بہت سا مواد نقل کرنے کی اجازت دی۔

نہایت کارآمد تبصرے کیے۔ نہایت کارآمد مشورے دیے۔

ترتیب

کتاب کے متن کا خلاصہ

وہ کون سے واقعات ہیں جنہیں تاریخ میں شامل کیا جانا چاہیے؟ اس سوال پر اختلاف پایا جاتا ہے اور جب سوال عالمی تاریخ کا ہو تو یہ سوال اور بھی دُشوار ہو جاتا ہے۔ اگر تاریخ ایک خاص نہج کے وقائع پر مشتمل ہو تو یہ معاملہ یوں ہو جاتا ہے کہ وہ کون سا وقوعہ یا وقائع ہیں جو معاشرے کے ایک سے دوسرے مرحلے میں داخل ہونے کے عمل کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ جیسے چھوٹے چھوٹے قبائلی سماج کا بڑے اور کثیر آبادی والے معاشرے میں داخل ہونے کا عمل، جو ہمیں امریکا اور چھوٹی قوموں میں نظر آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی وقوعہ ایک سے دوسری صورت حال تک پہنچنے میں براہِ راست معاون ہو لیکن وہ بہت سے ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے اور اس کی مختلف سمتیں ہوتی ہیں۔ ایسے میں عالمی تاریخ کو یہ معاملہ درپیش ہوتا ہے کہ ان اجزا کا تعین کرے اور یہ معلوم کرے کہ تاریخی موڑ کہاں آتے ہیں۔ اس کے بعد تمام تر انسانی تجربے کو ادوار میں تقسیم کرنا ہوتا ہے اور ادوار میں بانٹنا ہوتا ہے، جن کا تعلق یکے بعد دیگرے آنے والی تہذیبوں سے ہوتا ہے۔

اس کتاب کو عالمی تاریخ میں درج ذیل قرینہ نظر آیا۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے تہذیب کا آغاز چار ہزار سال قبل مسیح کے دوران میں مصر اور میسوپوٹیمیا کی ابتدائی شہری ریاستوں کے فروغ سے ہوا۔ پہلے تین ہزار برس تک سماجی ترقی کے عمل میں وہ مقصد جو سب پر حاوی تھا، سیاسی حکمرانوں کے ہاتھوں میں طاقت کا ارتکاز تھا، یعنی مخصوص علاقوں پر بالادستی۔ حکمرانوں نے فوجی طاقت استعمال کر کے اقتدار حاصل کیا۔ شہری ریاستوں سے انہوں نے سلطنتیں اور بادشاہتیں قائم کیں۔ پہلی تہذیب کے عروج تک چار عالمی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ دوسری صدی قبل مسیح تک پُرانی دُنیا پر ان کی بالادستی تھی۔ یہ تھیں، روما، فارس، کشن اور ہنس چینی سلطنتیں۔ (مایا کلچر نئی دُنیا میں شمولیت کے لیے اپنے

کلاسیکی دور سے گزر رہا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ مہذب سلطنتوں پر حملہ کر کے انہیں تہس نہس کر دیا۔ اس طرح وہ دَور تمام ہوا۔

دوسرا تاریخی دَور پہلے ہزار سالہ قبل مسیح کے وسط سے شروع ہوا۔ یہ دَور فلسفیوں، پیغمبروں اور مذہبی مفکروں کے گروہ سے عبارت تھا۔ یہیں سے فلسفے کے مکاتیب اور فلسفیانہ معتقدات پر مبنی مذہب وجود میں آئے۔ اس دَور کی تاریخ تین عالمی مذاہب کی مقبولیت سے عبارت ہے۔ بدھ مت، مسیحیت اور اسلام، اور وہ دوسرے مذاہب جن کی تخلیق ان کے باہمی میل جول سے ہوئی۔ آخر میں یہ عالمی مذاہب فوجی طاقت کے ساتھ اور نظریاتی طور پر بھی سیاسی سلطنتوں کی طرح ایک دوسرے سے متصادم ہوئے۔ سال کے دوسرے ہزارے کے وسط میں یہ دَور بھی اختتام کو پہنچا جب مذہبی جنگوں اور تشدد کے رویے نے عوم کو ان سے متنفر کر دیا۔

تیسرا دَور یورپی تہذیب کے علاقائی اور تہذیبی فروغ سے شروع ہوا، جس کا تعلق نشاۃ ثانیہ سے تھا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے دوران میں جدید کاروباری ادارے قائم ہوئے، یونیورسٹیوں میں سیکولر علم کے نئے معیارات اور معمولات کو رواج ملا اور دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے بہت سے معاشرے سمندر کی راہ سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے۔ ابتدائی زمانے میں سمندروں کے درمیان سفر اور نئے بحری راستوں کی دریافت نے بحر اٹلانٹک سے متصل قوموں میں سیاسی اور تجارتی رقابتوں کو جنم دیا۔ اس سے نوآبادیات وجود میں آئیں۔ غیر یورپی قوموں کو غلام بنایا جانے لگا۔ سائنسی، صنعتی اور جمہوری انقلابات رونما ہوئے اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی بہ دولت نئے جنگی اسلحہ کے ساتھ جنگیں ہوئیں۔ ان کا انجام پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی صورت میں سامنے آیا۔ بالآخر اس کا ردِعمل ہوا اور ساری دُنیا یورپ کی اس مہم جوئی کی لپیٹ میں آ گئی۔

تہذیب نے اس چوتھے دَور میں نہایت سنجیدہ مقاصد کو قدرے سکون اور عافیت سے ہم کنار کرنے کے لیے عام تفریح کی طرف اپنا رُخ کیا۔ محنت کش مرد اور عورتیں جو صنعتی معاشرے میں مشینوں میں جکڑے ہوئے تھے، ان میں فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فرصت کے اوقات میں اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لیے ہلکی پھلکی تفریحات کا سہارا لیں۔ الیکٹرانک کی بتائی ہوئی ترکیبوں نے جس کے تحت لطیف جمالیاتی مرقع کو محفوظ کر کے نشر کرنا ممکن ہو گیا، ایک نیا کلچر وجود میں آیا جو ''ابلاغ عامہ'' سے منسلک ہو گیا۔ اوپیرا میں رقص اور عوامی

تھیٹر میں زندہ ناچ گانے کی جگہ موشن پکچرز اور وِڈیو و ٹیلی وِژن کی نشریات نے لے لی۔ راک این رول کی موسیقی نے بین الاقوامی کلچر پیدا کیا جو نوجوانوں سے مخصوص تھا۔ برقی ذرائع سے خبروں کی ترسیل اور تفریح کے نظام نے سیاسی عمل کو اچانک بدل دیا۔ جمے جمائے مذہب میں رخنے ڈال دیے، بچوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے سکولوں کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوا اور تجارتی مصنوعات کے خرید و فروخت کا کام اپنے ذمے لے لیے۔

اب اس چوتھے دَور میں انسانیت کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی توانائی کے ساتھ پانچویں دَور کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اس کی تاریخ جو مستقبل میں مرتب ہوگی، ابھی تو قیاس پر ہی مبنی ہے۔

اس کتاب کے اوراق میں ایک دوسری لہر بھی کام کر رہی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہر تہذیب کا آغاز ایک نئی بالا دست ٹیکنالوجی کے کلچر کے ساتھ ہوا۔ پہلی تہذیب بالکل ابتدائی تحریر یا مجرد علامتوں کے ساتھ شروع ہوئی۔ دوسری حروف تہجی کی تحریر کے ساتھ، تیسری، یورپ میں چھپائی کے ساتھ اور چوتھی مواصلات کی برقیاتی ٹیکنالوجی کے ساتھ اور اب پانچویں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ساتھ۔

یہ چاروں تہذیبیں اپنی پوری ترقی یافتہ صورت میں نمودار ہوئیں، چنانچہ ان میں سے ہر ایک کی مختصر تاریخ کے ساتھ اس کتاب میں تہذیبی ٹیکنالوجی کی تاریخ بھی شامل کر لی گئی ہے۔ کلچرل ٹیکنالوجی اور نجی یا سماجی اقدار کے مابین جو تعلق ہے، اس پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اور یہ کتاب ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ معاشرے کا ارتقائی عمل کس طرح اسے بتدریج پیچیدہ اور اجتماعی اداروں کے نظام میں تبدیل کر دیتا ہے، بدلتے ہوئے عقائد کی نشان دہی کرتا ہے، یکے بعد دیگرے آنے والی تہذیبوں میں مثالی شخصیات تبدیل ہو جاتی ہیں اور یوں ہم قیاس کرتے ہیں کہ پانچویں تہذیب کے دَور میں جسے زمانۂ خمسہ کہا گیا ہے، آئندہ تاریخی واقعات کیا رُخ اختیار کریں گے۔

الگ الگ باب کا خلاصہ

پہلا باب: تاریخی مطالعہ کا ایک اہم جز یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمہ گیر انسانی تجربے کا ایک ڈیزائن یا نمونہ کیا ہے۔ عالمی تاریخ واقعات کا مجموعہ ہے۔ یہ واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک صورت حال سے دوسری تک پہنچنے میں انسانیت نے کس طرح ترقی کی اور وہ جو پہلے

نسبتاً کم پیچیدہ معاشرہ تھا، زیادہ پیچیدہ بن گیا۔ دُشوار مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ تاریخ میں موڑ کہاں آتا ہے۔ ایسے مواقع آتے ہیں جب دو بُنیادی طور پر یک سر مختلف تہذیبوں کے درمیان خطِ تقسیم واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ تاریخ جو کسی خاص اقوام یا گروہوں کے تجربوں پر مبنی ہے، اس کتاب میں اس کے معاشرے کی ساخت اور اقدار میں تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ نئی تہذیبی ٹیکنالوجیز کے رواج سے نئے ڈھب کے عوامی تجربے کے لیے گنجائش نکل آئی ہے۔ یہ عبوری مرحلہ عالمی تاریخ کے کامیاب ادوار کی تعریف متعین کرتا ہے۔ تہذیبیں معاشرے کی طرح عروج و زوال کے مرحلے سے نہیں گزرتیں بلکہ تہذیبی نظام گزشتہ تہذیبوں پر اپنی تعمیر کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ تہذیبیں عالم گیر نظر آتی ہیں۔ اس طرح عالمی تاریخ کو ایک ہی نظر میں دیکھ لینا ممکن ہوتا ہے۔

دوسرا باب: ایک بتدریج پیچیدہ ہوتے ہوئے معاشرے میں تاریخ اس کے ساتھ ہی سفر کرتی ہے۔ تخصص پر مبنی ادارے پہلے سے زیادہ وجود میں آ چکے ہیں۔ جب تہذیبیں اوّل اوّل بحیرۂ روم کے مشرقی علاقے میں نمودار ہوئیں تو تہذیب یافتہ معاشرے اداروں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ان میں سیاسی اور مذہبی دونوں طرح کی طاقت شامل تھی۔ پہلے تاریخی دَور میں سیاسی عمل نے مذہب اپنا تعلق ختم کر دیا تھا۔ شاہی حکومتوں نے اسلحہ کے زور پر وسیع علاقوں پر مشتمل سلطنتیں قائم کرنی شروع کر دیں۔ البتہ فوجی خون ریزی، سفاکی اور بے انصافیوں نے اس خواہش کو لوگوں میں بیدار کیا کہ اس دُنیا کو زیادہ معقول اور صلح و آشتی کی دُنیا ہونا چاہیے، جس کے معیارات کا اظہار فلسفیوں کے افکار میں ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ فلسفے کو اپنے اظہار کی راہ مذہب کے لازمی وجود میں مل گئی۔ اس کے بعد افکار پر مبنی مذاہب کا زمانہ آیا جو قومی حدود سے نکل کر دور تک پھیل گیا۔ جسے ''عالمی مذاہب'' کا نام دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ مذاہب نے جھد آزما سلطنتوں کی صورت اختیار کر لی اور دُنیاوی اقتدار کے حصول کی خاطر لڑنا شروع کر دیا۔ اب ایک وقت آیا جب روحانی جارحیت سے الگ تحریک شروع ہوئی جو زیادہ سیکولر، لطیف احساسات کی حامل اور مخصوص کاروباری مقاصد رکھتی تھی۔ یورپی تلاش اور تجسس اور نوآبادیاتی توسیع کا یہ دور پندرھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ اس نے ان قدروں کو پھیلایا جو دولت کی پیدا کردہ تھیں اور دولت کی ہی تام جھام اور طمطراق سے اس کا تہذیبی رشتہ تھا۔ پھر پہلی بار ایسا ہوا کہ مغرب کی توسیع پسندی کی بدولت ساری

دُنیا کے عوام کا ایک دوسرے سے رابطہ پیدا ہوا۔ دو جنگوں کی ہلاکتوں کے بعد یہ تیسری تہذیب عوامی تفریحات کے نئے کلچر میں ضم ہونے لگی۔ اب عام لوگوں کو تفریح مہیا کرنا ایک سنجیدہ کاروبار بن گیا تھا۔ ان کی توجہ حاصل کرنا اور اسے برقرار رکھنا طاقت اور دولت کے حصول کا ذریعہ بن گیا۔

تیسرا باب: حکومت کے ادارے، دُنیا کا مذہب، تجارت اور تعلیم، عوام پسند تفریحات، ان سب میں روحانی وسعت اور پہنائی ہوتی ہے اور ان کے رشتے اپنے اپنے عقائد کے نظام سے، اور پُرکشش شخصیات کے تعلق سے وابستہ ہوتے ہیں۔ وسیع تر معنوں میں ہر ایک کا اپنا ''مذہب'' ہوتا ہے۔ مذہب سے ان عقائد کا اظہار ہوتا ہے جو بُنیادی سوالوں سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ خاص نمونوں کی شخصیتوں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ قبائلی لوگ فطرت کی پرستش کرتے تھے۔ ''اس سے افراد کو اپنی ہی اجتماعی انسانی طاقت کی پرستش کا راستہ نکل آیا۔'' شہری مذہب جو حکومتوں کی خدمت کرتے تھے، ان میں پرستش کی سابقہ صورتوں کی نشانیاں ملتی تھیں۔ پھر پیغمبروں اور فلسفہ دانوں نے اس طرح کے اختیار کو چیلنج کیا۔ انہوں نے ایک نئی طرح کے مذہب کی تخلیق کی جسے معتقدات میں مرتب کیا جا سکتا تھا۔ ان معتقدات کی پابندی نے جنت میں داخلے کی راہ کھول دی۔ تجارت اور تعلیم کے دور میں مذہب نے اس دُنیا کے معاملات پر زیادہ توجہ دی۔ اس کے ماننے والوں کا عقیدہ اس پیسے پر تھا جسے وہ کامیاب پیشے کے توسط سے یعنی فنون اور موسیقی میں بڑائی حاصل کر کے کماتے تھے۔ برقیاتی ٹیکنالوجی کی ایجاد نے، جس کی بہ دولت جیتے جاگتے اداکاروں کے لطیف اور کیف آور حسن کو گرفت میں لے لیا جاتا ہے، برجستہ اور فوری چہرہ نمائی کا کلچر تخلیق کیا ہے، جس میں پوری اجتماعی برادری شریک ہوسکتی ہے۔ یہ ہمہ گیر اور بھرپور تفریحات کی دُنیا چند اچھا لکھنے والے لوگوں کو شہرت اور دولت عطا کرتی ہے، وہی لوگ جنہیں اس کے ''شو'' میں شرکت کا موقع ملتا ہے۔ لیکن ہلکی پھلکی گپ شپ رکھنے والے اخباری کالم یہ بھی انکشاف کرتے ہیں کہ ان زرق برق لوگوں کے بھی بہت سے مسائل ہیں۔

چوتھا باب: اوّلین تہذیب کی تاریخ حکومت کی تاریخ ہوگی جس میں جنگوں کے تجربے اور شاہی خاندانوں کی تبدیلیوں کا بیان ہوگا۔ یہ ایسی تاریخ ہے جسے لوگ بالعموم جانتے ہیں۔ شاہی حکومتیں شہری ریاستوں کے قیام کے ساتھ وجود میں آئیں اور جب

مقامی حکومتیں آپس میں متصادم ہوئیں تو وہی شاہی حکومتیں سلطنت بن گئیں۔ ان جنگوں میں چند بادشاہ اپنے اقتدار کو طول دے سکے، کچھ لوگوں کو شکست ہوئی اور انہیں غلام بنا لیا گیا۔ جیسے دو عدد کتابیں اس دور کا احاطہ کر لیں۔ مصر اور چین میں خودمختار حکومتیں ہزاروں سال تک قائم رہیں۔ یہ نمونے ہیں، شاہی حکمرانی کے جس کا آغاز ایک عہد سے ہوتا ہے اور اس عہد کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ مغرب کی اقوام روم پر نظر ڈالتی ہیں، جو پہلے اٹلی کے سیاسی استحکام کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، بعد میں ایک ایسی سلطنت کے طور پر نظر آتا ہے، جو مشرقی اور دو مغربی حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے مشرق وسطیٰ میں خون ریز سلطنتیں وقفے وقفے سے آتی رہیں اور ختم ہوتی رہیں۔ یہ تھیں ایشیائے کوچک آنے والی حِتّی قوم کی حکومت، اشوریہ کی سلطنت، بابل کی حکومتیں، یورپی نژاد ماد، فارس اور یونان کی حکومتیں۔ فارس کی سلطنت پارتھین اور ساسانی بادشاہوں کے دَور حکومت میں دوبارہ بحال ہو گئی، تا آں کہ اسلامی افواج نے انہیں ختم کر دیا۔ ہندوستان میں مقامی طور پر دو سلطنتیں قائم ہوئیں لیکن ان کی عمر مختصر تھی۔ ان کے بعد غیر ملکی حکمرانوں، مغلوں اور انگریزوں نے اس برصغیر کو متحد کر دیا۔ تیسری صدی عیسوی اس کے عروج کا دور تھا۔ ساتویں صدی کے آنے تک صرف یونانی، بازنطینی اور چینی سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں جن کا رشتہ پرانی دُنیا سے تھا۔ طاقت کے توازن کی حکمت عملی نے یورپ میں سلطنتوں کو دوبارہ ظہور میں آنے سے روکا۔ مختلف اقوام کو ایک برادری میں جوڑنے کے لیے صرف ایک ہی وسیلہ مذہب کا رہ گیا تھا۔

پانچواں باب: دوسری تہذیب کی تاریخ اس شان دار ذہنی اور اخلاقی بیداری کے ساتھ شروع ہوئی جو چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں پُرانی دُنیا کے متعدد معاشروں میں رونما ہوئی۔ بہت سے کہن سال اور روحانیت کے حامل لوگوں نے جو اس زمانے میں سانس لے رہے تھے اپنی تعلیمات آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ دی تھیں۔ اس عہد کا نقطہ عروج تین مذاہب کا وجود میں آنا تھا، جن کی حیثیت عالمی تھی، بدھ مت، مسیحیت اور اسلام اور بعض مذاہب کا از سرِ نو ظاہر ہونا، جیسے یہودیت اور ہندو دھرم، جن کا تعلق قدیمی روایات سے تھا۔ ان مذاہب نے سیاسی طاقت کے ساتھ مل کر اپنے زیر اثر علاقے متعین کر لیے۔ اس طرح کا مذہب رسومات کے ذریعے نہیں بلکہ افکار کے ذریعے پھیلا۔ کسی مذہب کے بانی کی

تعلیمات کے علاوہ مذہبی نظریوں میں جو ترقی ہوئی، ان سے مفسرین کے کام کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو مذہب کے اُصولی موقف کا تعین کرتے ہیں، اس کے قواعد متعین کرتے ہیں اور ان کی وضاحت کرتے ہیں۔ پادری جو مذہب کو چلاتے ہیں، ان کے درمیان مذہب کا ایک ایثاری پہلو بھی ہوتا ہے، چنانچہ نظریاتی جوش وخروش اور ولولہ انہیں اس نتیجے تک لے جاتے ہیں جو سودمند اور پُرامن ہونے کی بجائے کہ وہ مذہب کے بطن میں موجود ہوتا ہے، اس سے مختلف نتیجے کا حامل ہوتا ہے۔ اس دَور کے آخری برسوں مسیحی صلیب برداروں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کا آغاز کیا جو بیت الاقدس کی سرزمین پر حکمران تھے۔ ہندوستان پر قبضے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں نے جنگیں لڑیں۔ بدھوں، چینی مفکر تاء کے ماننے والوں اور دوسروں نے فن حرب سیکھا۔ دُنیاوی کاوشوں کے ساتھ ہی صوفیوں، بھکشوؤں اور دوسروں نے وہ سخت کوش زندگی گزاری جس کا مرکز روحانیت تھا۔ ان کے خاموش تجربات بھی اس دوسرے دَور کی تہذیب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

چھٹا باب: تیسرے دَور کی تہذیب کا آغاز ایک اور طرح کی بیداری سے ہوا جسے نشاۃ الثانیہ کہا گیا۔ اس کے کلچر کی ابتدا شمالی اٹلی سے ہوئی، جہاں تجارتی ہنرمندی میں کلاسیکی دانش اور فنی نفاست بھی شامل ہوگئی تھی۔ جب سمندروں کے درمیان آبی راستے دریافت ہو گئے، تو پُرتگال اور اسپین کے تاجروں نے دور دراز کا سفر اختیار کیا اور یوں یورپ کے اثرات پھیل گئے۔ مغربی یورپ کے لوگوں نے اس نئی دُنیا میں جسے کولمبس نے مشرق کی جانب سفر کے دوران میں دریافت کیا تھا، اپنی نوآبادیات قائم کر لیں۔ ایک دوسرے کی مخالف اقوام نے جو شمالی اوقیانوس کے آس پاس آباد تھیں، مشرق بعید پر گرم مسالے کی تجارت کو قبضے میں لینے کے لیے آپس میں جنگ آزما تھیں۔ اس کے بعد شراب کافی اور تمباکو کی تجارت میں تیزی آ گئی، جب یورپ اور شمالی امریکا اور جزائر کیریبین کے درمیان ان اشیا کی تجارت کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ افریقا سے لائے جانے والے غلام اشیا کی تیاری کے لیے کام پر لگا دیے گئے۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں فرقوں کے درمیان وحشیانہ جنگ اور خون ریزی شروع ہوگئی۔ اس سے یورپ کے دانش وروں میں یہ خیال محکم ہو گیا کہ مذہبی اختلافات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس کے بجائے سیکولر علم کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنی چاہیے۔ سائنسی دریافتوں سے ٹیکنالوجی کی ایجادات کے لیے تحریک پیدا ہوئی جس

نے صنعت اور مواصلات کو تبدیلیوں سے ہم کنار کیا۔ صنعتی معاشروں نے بے اندازہ دولت کمائی، اس کے ساتھ ہی ان میں سماجی تفرقے بھی پیدا ہوئے۔ محنت کش طبقے نے ہڑتالوں کے ذریعے سے اپنی حیثیت منوائی، پارلیمانی حکومتوں نے بادشاہوں کے اقتدار کو چیلنج کیا۔ جنگوں اور انقلابات نے پُرانی دُنیا کے خلاف ترقی کے معیارات آگے بڑھایا۔ برطانیہ عظمیٰ نے سمندر میں سپین کو شکست دی، خشکی میں فرانس کو جنگ میں ہرایا۔ ہندوستان میں لڑائیاں لڑیں، شمالی امریکا میں معرکے سر کیے اور اس دُنیا کی سب سے بڑی نوآبادیاتی طاقت بن گیا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے تباہ کن نتائج سے برطانیہ پوری طرح بحال نہ ہو سکا۔ اس طرح طاقت کا جو خلا پیدا ہوا تھا، اسے برطانیہ کی سابق نوآبادی امریکا نے پُر کر دیا۔ جنوبی امریکا، ایشیا اور افریقا کی اقوام نے اُنیسویں اور بیسویں صدیوں کے دوران میں نوآبادیاتی تسلط کے خلاف تحریکیں چلائیں اور سیاسی آزادی حاصل کی۔

ساتواں باب: بڑی عجیب بات معلوم ہو گی اگر یہ کہا جائے کہ نئی تہذیب کی بُنیاد تفریحات پر ہے جس نے پچھلے پانچ سو سال کی تہذیب کی جگہ لے لی ہے۔ اس کے باوجود بیسویں صدی کے اواخر میں تہذیبی بالادستی کی علامتیں بہت نمایاں ہیں۔ یہ تاریخی عہد گشتی نوٹنکیوں، کھیل تماشوں اور سرکس سے شروع ہوا جو پچھلی صدی سے چلے آ رہے تھے۔ پھر مقبول عام کھیلوں کے مقابلے، جیسے گھوڑ دوڑ، باکسنگ اور بیس بال وغیرہ اس میں شامل ہو گئے۔ خاص دھوم دھام کی نمائشیں جیسے 1851 میں کرسٹل پیلس کی نمائش۔ اس نے عام لوگوں کے ولولے اور پہچان میں اضافہ کر دیا، تاہم یہ برقیاتی آلات کی ایجاد تھی جس نے مناظر کو اپنی گرفت میں لے کر اور آوازوں کو اسیر کر کے انہیں آگے لے جانے کا عمل شروع کیا اور یوں ایک عوام پسند کلچر کی تخلیق کی۔ سیاسی گٹھ جوڑوں، کاروباری رقابتوں اور گھمبیر خیالات کی یورش کے نتیجے میں دو عالمی جنگیں اور خون ریزی ہوئی۔ لہٰذا اب عام لوگ کچھ ہلکی پھلکی باتیں چاہتے تھے۔ امریکیوں نے اپنی تفریح کے لیے براڈوے تھیٹر کا رُخ کیا یا ان کلبوں میں جا پہنچے، جہاں جاز کی موسیقی گونجتی ہوتی تھی۔ کچھ دوسرے بیب رُتھ اور ڈی میگیو کے ہمراہ بیس بال ڈائمنڈ کے گرویدہ تھے۔ 1920 کے عشرے میں بولتی فلمیں آ گئیں۔ کمرشل ریڈیو اسٹیشن موسیقی، خبریں اور ہلکی پھلکی تفریح نشر کرنے لگے۔ تفریحات کے مرحلے میں کالے اور گورے دونوں طرح کے لوگوں کے تخلیقی میل جول کے نتیجے میں ایک بین

الاقوامی نوجوان کلچر پیدا ہوا، جس کے مرکز میں راک اینڈ رول کی موسیقی تھی۔ ٹی وی کے نشریے دوسری عالمی جنگ کے بعد شروع ہو گئے، جس کے گرد گھروں میں لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ اب عام لوگوں کو آسانی سے پیسا کمانے کا امکان نظر آنے لگا۔ اس سے جوئے کا جنون پھیل گیا۔ اب تفریحات میں تنوّع آ گیا۔ کچھ لوگوں نے ایسے ''شو'' کا انتخاب کیا جو خاندان کے لیے مناسب تھے۔ کچھ دوسروں کے لیے ''بالغوں'' کے پروگرام میں دلچسپی تھی۔ کمپیوٹر کی پیدا کردہ تصویروں نے تجسس کا ایک نیا دوراز ہ کھول دیا۔ طرح طرح کے خیالی مرقعے پیدا کرنے والی اس مشین میں لوگوں کو ایک اور تفریح مل گئی۔

آٹھواں باب: مختلف ٹیکنالوجی کا پیدا کردہ اس نئے کلچر کا رشتہ اب ایک نئی تہذیب کے ساتھ ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کثیر آبادی کے ایک حصے تک اپنی خیالی تصویریں اور پیغامات لے جانے والی یہ ٹیکنالوجیز خود اپنی طرح کا تجربہ کرتی ہیں اور ان میں خاص طریقوں سے رنگ آمیزی کرتی ہیں۔ اگر ترسیل کی یہ صلاحیت بروے کار نہ آتی تو بعض اداروں کا وجود بھی نہ ہوتا۔ سرکاری عہدے دار اس ٹیکنالوجی کو تحریر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حروف کی ایجاد نے تحریر کی زبان کو تاجروں اور دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیا، جو نہایت مصروف زندگی گزار رہے تھے۔ بصری علامتوں کو دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ خیال آیا کہ ان علامتوں کا ایک اپنا وجود بھی ہے اور اس دروں بینی نے بہت سے فلسفوں کو تقویت دی۔ چھاپے خانے نے عام لوگوں میں خواندگی پھیلائی۔ اس نے سوچ کے ایک زیادہ صریح طریقے کو پروان چڑھایا جو جدید دانش اور علم اور سائنس کے لیے نہایت اہم تھا۔ مشہور و معروف مصنف اتنے مقبول ہوئے کہ اُن کے ماننے والے ایسے بن گئے جیسے ایک مسلک کے لوگ ہوں۔ لیکن اس وقت یہ کیفیت بدل گئی جب فلم بندی کی ٹیکنالوجی، موسیقی کی ریکارڈنگ اور ٹی وی کے نشریوں اداکاروں کی شکل وشباہت کو بھرپور طور پر پیش کیا اور انہیں ''اسٹار'' بنا دیا۔ مشہور شخصیات کو فیتوں میں بند کر کے اپنی ذاتی املاک کی صورت میں فروخت کیا جانے لگا۔ کمپیوٹر کی آمد کے بعد تہذیب میں ایک پھر تبدیلی رونما ہوئی۔ شاید ربطِ باہمی کا انفرادی تجربہ اور سرگرمیوں میں ایک دوسرے سے شراکت، عوامی اقدار کے نئے معیارات پیش کرے۔

نواں باب: تحریر کی زبان قدیم میسوپوٹامیہ میں کاروباری لین دین کے کوائف

محفوظ رکھنے کے لیے دریافت کی گئی۔ اعداد اور الفاظ دونوں کے لیے ایک ہی نمونے کی علامتیں اختیار کی گئیں۔ علامتی تحریر کا آغاز اس وقت ہوا جب لکھنے والوں نے تجارتی مال کی مقدار اور ان کی اقسام کے بیان کرنے کے لیے مختلف علامتوں کا استعمال کیا۔ جب مجرد خیالات کو پیش کرنے کا مرحلہ آیا تو تحریر میں صوتی عنصر بھی شامل کر لیا گیا۔ بعض تحریروں میں علامتیں اس طرح استعمال ہونے لگیں جو حروف تہجی کی آوازوں سے ملتی جلتی ہوتیں۔ وہ حروف جو بیان کی خالص آوازوں کی نمائندگی کرتے تھے سب سے پہلے دوسرے ہزار سالہ قبل مسیح میں مشرق وسطیٰ میں استعمال ہوئے۔ سامی نسل کی دو اقوام جنوبی شام کی ایک قدیم قوم (Phoenician) اور آرمینیائی باشندوں نے اپنی تجارتی مہمات کے دوران میں اس طریق کار کو دور افتادہ مقامات تک پہنچایا۔ اول الذکر کے حروف نے ترقی یافتہ صورت میں یونانی اور اطالوی حروف کی شکل اختیار کی۔ انھی سے دیگر کئی یورپی زبانوں کے حروف پیدا ہوئے۔ مشرق بعید کے معاشروں نے اپنا ابتدائی اندازِ تحریر جو مفرد حروف پر مبنی تھا، برقرار رکھا۔ مغرب میں چھپائی کا فن چین سے آیا۔ گوٹن برگ نے حرکت پذیر ٹائپ کا خلاقانہ استعمال کیا، جس سے مطبوعہ ادب میں ایک دھماکا ہوا۔ انیسویں صدی میں وہ اخبارات آ گئے، جو بڑے پیمانے پر چھاپے اور تقسیم کیے جاتے تھے۔ فوٹوگرافی اور تار برقی کی ایجاد 1830ء اور 1840ء کے عشروں میں ہوئی۔ یہ وہ پہلی ٹیکنالوجی تھی جسے بصری تصاویر اور الفاظ کی صورت گری کے لیے کیمیاوی اور برقی سگنل میں استعمال کیا گیا۔ فونوگراف اور موشن پکچر مشین نے بہ یک وقت تصویریں پیش کرنی شروع کر دیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پیغامات ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے ان افراد تک پہنچنے لگے جن کے رسیور اس مخصوص برقی لہر (فریکوئنسی) سے جڑے ہوئے تھے۔ پھر جیتے جاگتے مرقعوں کی پیش کش کا ایک کلچر آ گیا۔ اس وقت فن کاروں کا ایک مختصر سا گروہ ناظرین کی ایک بڑی تعداد تک اپنی پیش کش پہنچاتا رہا۔ کمپیوٹر کو دوسری عالمی جنگ میں استعمال کے لیے ترقی دی گئی۔ پھر اس کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ اس کی قامت مختصر اور کارکردگی میں وسعت بڑھتی گئی۔

دسواں باب: کیا عالمی تاریخ کو مستقبل کی پیش گوئی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اگر مستقبل ماضی سے ملتا جلتا ہو تو شاید ایسا ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت میں آئندہ واقعات کے بارے میں قیاس اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس سے مشابہہ صورت حال کی

تلاش دوسری تہذیبوں میں کی جائے جو ترقی کے اس مرحلے میں تھیں۔ چار عالمی تہذیبوں میں سے ہر ایک تہذیب جس کا احوال پہلے ہی معلوم ہے، یکساں نوعیت کے واقعات کا نمونہ پیش کرتی ہے، جو ایک دائرے میں گردش کرتے ہیں۔ عام طور پر اس کے خوب پھلنے پھولنے اور تخلیقی انداز سے پھیلنے کے بعد ایک دور سلطنت کے پختہ ہونے کا آتا ہے۔ پھر اس عالمی طاقت کو قائم رکھنے کی کوشش میں تشدد اور جبر کا استعمال شروع ہوتا ہے۔ ایک اور طرزِ عمل نظر آتا ہے کہ وہ ادارے، جنہیں ایک دَور میں فروغ حاصل ہوا، دو ادوار کے بعد بُنیادی طور پر بدل دیے گئے۔ مورخ صاحبان تاریخ کے حقیقی موڑ کو تہذیب میں عارضی تبدیلیوں سے الگ شناخت کرنا چاہتے ہیں۔ نئی تہذیبی ٹیکنالوجی کی نشان دہی کے علاوہ اس کتاب میں اُن دیگر حالات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جو بُنیادی تبدیلیوں کے مرحلے میں ایک مخصوص جگہ اور وقت پر پائے جاتے ہیں۔ اول، نئی تہذیب ایک سیاسی یگانگت اور زبردست کاروباریت کے ماحول میں اُبھر کر آئی۔ دوم اس ماحول سے ریاضی اور تجارتی معمولات میں اہم اختراعات پیدا ہوتی ہیں۔ سوم، جب عام لوگوں کی تخلیقی ذہانت ایک وسیع تر دُنیا کے بارے میں قیاس کرتی ہے تو اس سے جغرافیائی آفاق پھیلنے لگتے ہیں۔

گیارھواں باب: کمپیوٹر کا زمانہ آچکا ہے۔ اگر چہ یہ اس کی ابتدا ہے، لیکن یہ عہد اس معاشرے میں جسے ہم جانتے ہیں نمایاں تبدیلیاں لائے گا۔ اس تہذیب کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کے لیے ان اثرات کا اندازہ کرنا ہوگا جو ٹیکنالوجی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ کاروبار میں کمپیوٹر کے استعمال سے پہلے ہی خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ چشم تصور سے اس وقت کو دیکھا جا سکتا ہے جب تجارتی مصنوعات کی فروخت اور تقسیم میں نئے نئے طریقے استعمال کیے جائیں گے اور جب صارفین کو زیادہ معلومات، زیادہ اختیار اور کسی شے کے انتخاب کے لیے زیادہ گنجائش ہوگی۔ تعلیم، وہ دوسرا علاقہ ہوگا جس کی صورت، یہ نظر آتا ہے کہ بدل جائے گی۔ کمپیوٹر کی بہ دولت طلبہ کو زیادہ آسانی میسر ہوگی کہ انفرادی طور پر درسی ذرائع سے اپنا رابطہ رکھیں۔ انہیں بے اندازہ استعداد حاصل ہوگی کہ اپنے اسباق کے چربے تیار کریں۔ اعلیٰ درجے کی معیاری تعلیم کی کمی ایک قصہ پارینہ ہو چکی ہو گی۔ کسی شخص کے لیے سب سے بڑی بصیرت اس امر میں ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو تبدیل کرنے کے لیے کمپیوٹر کو استعمال کر سکے گا۔ انسان میں ڈی این اے کے خلیوں میں جتنی

وسیع اطلاع موجود ہوگی، کمپیوٹر ان سے عہدہ برآ ہوگا۔ کمپیوٹر میں اتنی طاقت ہوگی کہ انسانی دماغ کی عملی کارکردگی کو دُہرا سکیں۔ کمپیوٹر کی اس (Frankenstein Civilization) تہذیب میں انسان اور مشین دونوں کا ایک مشترکہ مستقبل ہوگا جو بہ یک وقت خطرناک بھی ہوگا اور ہیجان خیز بھی، جس کے نہایت دوررَس امکانات ہوں گے۔

حصہ اوّل

پہلا باب

عالمی تاریخ میں قرینے (Pattern) کی تلاش

انسانیت اپنے ماضی کے بارے میں سوچتے ہوئے ان زمانوں سے واقف ہے جو آج کے دنوں سے مختلف تھی۔ اس زمانے کی فن کاری کے نمونے پتھر کے مجسموں، برتن کی کرچیوں، اوزاروں اور دیگر باقیات میں اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ تاریخ ماضی کی سرگزشت کا مجموعہ ہے، جو ہمیں بتاتی ہے کہ وہ دُنیا جس سے ہم آج واقف ہیں، کیسے بنی۔ ادبیات کی کہانیوں سے مختلف تاریخ کی کہانیاں حرف بہ حرف درست مانی جاتی ہیں۔ علم و دانش کے دوسرے شعبے تاریخی صداقت پر توثیق کی مہر لگاتے ہیں۔ اگرچہ تاریخ کے بارے میں ہماری یادیں مستقل طور پر ماضی میں گم ہو جاتی ہیں، لیکن جب نئے حقائق سامنے آتے ہیں تو تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ طبعی سائنس میں تحقیق کی تکنیک بہتر ہو گئی ہے، جیسے کاربن سے وقت کا تعین، چنانچہ اس طرح ملنے والی اطلاع، تاریخی حقیقت کے طور پر مان لی جاتی ہے۔ چونکہ بابل کے باشندے، چینی، ہندوستانی، مایان (وسط امریکا کے لوگ) اور دوسری قوموں کے افراد فلکیات سے متعلق واقعات کا ریکارڈ رکھتے تھے، جو ان کے زمانے کا طریقہ تھا، لہٰذا ہم اس زمانے کے واقعات کو قدیم ادبیات میں تلاش کر سکتے ہیں، جہاں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی میں ایسے مسودے یا کندہ عبارتیں ملی ہیں۔ جب انہی نامعلوم زبانوں کے بھید کھلے تو بہت پرانی اور گم شدہ تہذیبیں بھی روزِ روشن میں آ گئیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ تاریخی نویسی اس حد تک ہے، جہاں تک مؤرخوں کو واقعات کا علم ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے ہو چکا ہوگا، اگر اس کا تجربہ بھلا دیا گیا تو ظاہر ہے کہ تاریخ میں اس کا

تذکرہ شامل نہیں ہوگا۔ چونکہ تاریخ کی ان کہانیوں میں واقعات کی داخلی بصیرت شامل ہوتی ہے، لہٰذا ان کے بارے میں ہمارے علم کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ انہیں کسی ایسے ذریعے سے محفوظ کر لیں جس میں انسان کے خیالات کو ادا کرنے کی صلاحیت ہو۔ کچھ واقعات ہم تک لوک کہانیوں کی صورت میں آئے ہیں، جو قبائلی معاشرے کے درمیان گردش کرتی رہتی تھیں۔ وہ کہانیاں ممکن ہے اصل تجربات پر مبنی ہوں، لیکن ایک سے دوسری نسل تک ان کو زبانی دہرانے کے عمل میں تحریف کا اندیشہ موجود رہا ہوگا۔ دوسری طرف تحریر کی صورت میں عبارت اس وقت تک اصل حالت میں محفوظ رہتی ہے، جب تک وہ موسمی اثرات کا مقابلہ کرتے ہوئے برقرار رہتی ہے، لہٰذا خواندگی سے پہلے کے معاشروں کو بڑی آسانی سے ''ماقبل تاریخ'' کے زمانوں سے جوڑا جا سکتا ہے۔ آرنلڈ ٹوائن بی نے لکھا ہے کہ ''خانہ بدوش دراصل وہ معاشرہ ہے جس کی کوئی تاریخ نہیں، خانہ بدوشوں کے دل جب ایک بار گردش میں آ گئے تو وہ اس وقت تک گردش کرتے رہیں گے، تاآں کہ وہ کسی بیرونی طاقت سے مقابلے کی تاب نہ لا سکیں اور وہ ان کی خانہ بدوشی کی زندگی کا خاتمہ کر دے اور یہ گرد و پیش کے جمے جمائے معاشرے کی طاقت کا دباؤ ہو سکتا ہے۔'' ملی ڈوما سوم ایک افریقی ماہر رسومات ہیں جو امریکا میں رہتی ہیں۔ انہوں نے اپنے آبائی گاؤں میں خواندگی سے قبل کے کلچر کا مقابلہ مغرب کے کلچر سے کیا ہے۔ انہوں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ مغرب کے لوگ ہمیشہ کہیں نہ کہیں جانے کے لیے سخت عجلت میں ہوتے ہیں اور اس مرحلے میں ان کا رابطہ اپنی روحانی بنیادوں سے ختم ہو جاتا ہے۔ ملی ڈوما نے یہ دیکھا ہے کہ اس کے قبیلے ڈگارا کے لوگ جو مغربی افریقا میں رہتے ہیں، تاریخ کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ دنیا کے بارے میں ان کا نظریہ وقت کی قید سے آزاد ہے۔ ان کے لیے وہ بات اہم ہے جو اَب رونما ہو رہی ہے، نہ کہ وہ جو رُونما ہو چکی ہے۔ اگر کوئی ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے تو اسے فوراً دیومالائی واقعات میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

مغرب والوں کی نظر میں انسانی معاشرے، افراد کی تخلیقی خدمات کے وسیلے سے بہتر ہوتے ہیں۔ ان میں تباہی بھی آتی ہے، جب ان کے صحت مند ادارے بدعنوان ہو جاتے، اس کے باوجود عالمی تہذیب اپنے شعور کی توسیع شدہ صورت میں ہمیشہ آگے بڑھتی ہے۔ انسانی معاشرہ تبدیل ہوا ہے۔ بہت کم لوگ قبائلی معاشرے میں رہتے ہیں، زیادہ تر لوگ شہری معاشروں میں رہتے ہیں، جنہیں ''تہذیب یافتہ'' کہا جاتا ہے۔ عالمی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسانیت ایک سے دوسری صورت حال کی طرف کس طرح بدلتی آئی ہے۔ کہانی کے آغاز

میں جو صورتِ حال تھی، خاتمے تک مختلف ہو چکی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تاریخ وہ عنصر ہے جو معاشرے کی ساخت پر اپنا نقش چھوڑ دیتی ہے۔ یہ وہ کہانی ہے، جو ہمیں بتاتی ہے کہ آج کے انتہائی ترقی یافتہ معاشرے کس طرح وجود میں آئے۔ دراصل اس عمل کی وضاحت کے لیے کوئی ایک کہانی نہیں ہے۔ یہ تو بہت سی کہانیاں ہیں اور وہ اس لیے کہ جدید معاشرہ بہت سے متنوع اداروں سے مل کر بنا ہے، جو اس کے مختلف امور انجام دیتے ہیں اور یہ ادارے مختلف زمانوں میں بنے تھے۔

اس کتاب کا مقصد عالمی تاریخ کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانا ہے، ان کو الگ الگ لڑیوں میں تقسیم کرنا ہے اور ہر لڑی کو صریح اور قابل فہم اشکال کے ذریعے پیش کرنا ہے۔ یہ اس طرح کی مثال ہے کہ سفید روشنیوں کی آبشار میں سے بہت سے رنگوں کی ایک لہر کو گزارا جائے۔ اس طرح کی روشنی بہت سی رنگا رنگ کرنوں کا مجموعہ ہوتی ہے، ہر کرن دوسری کرنوں سے الگ ہوتی ہے اور الگ نظر آتی ہے۔ اس طرح عالمی تاریخ، جیسا کہ ہمیں آج نظر آتی ہے، بہت سی مختلف تہذیبوں کا مجموعہ ہے۔ ہر تہذیب کی اپنی سرگزشت ہے، چونکہ یہ تہذیبیں زمانی اعتبار سے ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں، اس کی مجموعی تاریخ ملگجی اور الجھی ہوئی ہے۔ تاریخ کی تفہیم کا تقاضا ہے کہ مختلف تہذیبوں سے متعلق واقعات کو الگ کر لیا جائے تاکہ یکساں نوعیت کے تجربات کا رخ صاف طور پر نظر آنے لگے۔

تاریخ کی کتابوں میں جگہ کے لیے مقابلہ

چونکہ عالمی تاریخ، گزشتہ انسانی تجربوں کا اجتماعی ریکارڈ ہوتی ہے، لہٰذا اس میں بہت بڑے پیمانے پر کتابیں، خطوط، نجی تحریریں اور فوٹو گراف شامل ہو سکتے ہیں۔ ہر شخص جس نے کبھی زندگی گزاری، ایک کہانی بیان کرنا چاہے گا۔ اگر تاریخ ایسی ہی کہانیوں کا مجموعہ ہو تو پھر انہیں کتابوں میں نہیں، بلکہ کمپیوٹر کی بڑی بڑی فائلوں میں بھی شامل کیا جا سکے گا۔ ان بے پایاں اطلاعات کے ہوتے ہوئے تاریخ تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔ کوئی بھی شخص اس بے حد و حساب ذخیرے کے ایک جز کا بھی احاطہ نہ کر سکے گا۔ روایتی طور پر تاریخ کبھی بھی عام لوگوں کی زندگیوں کا بیان نہیں، بلکہ اہم لوگوں کے سوانح پر مشتمل رہی ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے دوسروں کے مقابلے میں تاریخی شخصیت کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ تاریخ کے منصب تک پہنچنے کے لیے کسی شخص کو ایسا ڈھب اپنانا پڑے گا، جس سے اس کی شخصیت میں مقناطیسی کشش پیدا ہو، سرکاری مناصب نے بعض افراد کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بااختیار عہدے پر فائز کیا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور کی تاریخ شاہی خاندانوں کی اہم تاریخوں پر مشتمل ہے۔ جمہوریت نے تاریخی کرداروں کے لیے میدان کشادہ کر دیا ہے۔ مورخ اب بادشاہوں اور وزرائے اعظم کے علاوہ فلسفیوں، روحانی پیشواؤں، مفتیوں، سائنس دانوں، تفریح مہیا کرنے والوں اور دوسری عوامی شخصیات کے نام درج کرتے ہیں۔

تاریخ نویسی اِدھر کچھ عرصے سے ایک اختلافی موضوع بن گئی ہے۔ وہ اس لیے کہ تاریخی شخصیتوں کو جب سے جمہوریت کے قالب میں ڈھالا گیا ہے، لوگوں کی توقعات اس ضمن میں بہت بڑھ گئی ہیں کہ اب ان کو تاریخی تحریروں میں نمائندگی دی جائے گی۔ یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ افراد کو تاریخ کی کتابوں میں ان کے بعض کارناموں یا تخلیقی کاموں کی بنا پر شامل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا تاریخ میں کسی کا نام آنا ایک بڑے اعزاز کی بات ہے، اور اس اعزاز کے کم و بیش ہونے کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے کہ کسی شخص کی زندگی کے بیان میں کتاب کے اندر کتنی جگہ دی گئی ہے۔ اگر ایک اوسط فرد کا ذکر نہیں ہوتا تو وہ اپنے کسی متبادل کے ذریعے جس کے کوائف اس سے ملتے جلتے ہوں، تاریخی اہمیت اختیار کرنے کی آرزو کرتا ہے۔ عام لوگ تاریخ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کے لیے نمونے کے لائقِ تقلید کردار مہیا کرے گی۔ اسی لیے ایک سیاسی جنگ اس ضمن میں جاری رہتی ہے کہ اسکول کے درسی نصاب میں تاریخ کی کیسی کتابیں شامل کی جانی چاہئیں۔ تاریخ کی وہ کتابیں جو بعض گروہوں کے کارناموں پر مناسب توجہ نہیں دیتیں ان کی صداقت کو تاریخی عصبیت کی بنیاد پر چیلنج کیا جاتا ہے۔ چونکہ ''تاریخ فاتح لکھتے ہیں'' اس لیے وہ کسی زمانے میں صرف ان لوگوں کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں جو سیاسی طور پر مضبوط ہوتے ہیں۔ اس نظریے کے مخالف ان پر تاریخ نویسی میں جانب داری برتنے کا الزام دھرتے ہیں۔ آرتھر شیل سنگر جونیئر نے افریقی امریکیوں، عورتوں اور دوسروں کو زیادہ اہمیت دینے کے ضمن میں حالیہ کوششوں کا مقابلہ بیسویں صدی کے اوائل کے آئرش امریکی انتہا پسندوں سے کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ''جان وی کیلہر نے جسے برسوں تک ہارورڈ میں آئرلینڈ کا ممتاز عالم تسلیم کیا گیا، آئرش امریکی تاریخ سے پہلی بار روشناس ہونے کا تجزیہ ایک بار یوں بیان کیا کہ اسے چھوٹے چھوٹے مضامین پر طویل مقالے محض اس لیے لکھنے پڑے کہ براعظمی فوج میں 76 فی صد آئرلینڈ کے لوگ شامل تھے، یا یہ کہ جارج واشنگٹن کے حلقۂ احباب میں بہت سی راہبائیں اور پادری شامل تھے، یا لنکن کو الپاکا، نیویارک کے فرانسس میگ بیگن سے اپنے دوسرے افتتاحی خطبے کے لیے بیشتر خیالات میسر آئے تھے۔

وہ شخص فولاد سے تسبیح کے دانے بنانے میں پیش رَو کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیلہر نے بتایا کہ 1930 تک وہ ''چھوٹے چھوٹے طویل مضامین'' آئرش امریکی دستاویزات سے غائب ہونے لگے۔ اس نے مزید کہا، ''میں حیران ہوں کہ ان دنوں براعظمی فوج میں بڑا حصہ کس کا ہے؟''

متعصّبانہ تاریخ کی ایک مثال

انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی اقوام کو اپنی خود اعتمادی کا زبردست احساس ہوتا تھا۔ امریکا میں یورپی تہذیب کے تعلق سے امریکا کی قومی توانائی کا نہایت جارحانہ انداز سے بیان ہوتا تھا۔ اس عہد میں تاریخ کی نصابی کتابوں میں نسلی اقدار کی عکاسی نظر آتی تھی۔ مجھے اپنے پردادا کے ذخیرۂ کتب میں چمڑے کی جلد سے مجلد ایک کتاب ''السٹریٹڈ یونیورسل ہسٹری'' کے نام سے مل گئی، اس سے اُس زمانے کے تاریخی افکار کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ کتاب فلیڈلفیا میں 1878ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ''قدیم تاریخ''، ''ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ'' اور ''جدید تاریخ''۔ قدیم تاریخ کا آغاز باغِ عدن میں حضرت آدم کی زندگی سے ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ 476 عیسوی میں مغربی روٗسا کی سلطنت کے خاتمے پر ہوتا ہے۔ زمانہ وسطیٰ کا آغاز روم کے زوال سے ہوتا ہے اور 1518ء تک برقرار رہتا ہے۔ یہ وہی سال ہے جب مارٹن لوتھر نے پوپ کے اقتدار کو چیلنج کیا تھا۔ ''جدید تاریخ'' نے اس کے بعد کے زمانے کا احاطہ اس کتاب کی اشاعت کے زمانے تک کیا تھا۔ مصنف نے قارئین کو کتاب کے دیباچے میں یہ بتایا تھا کہ ''سب سے زیادہ امتیازی حیثیت قدیم اور جدید زبانوں میں ان قوموں کے ادوار کو دی گئی ہے، جنہوں نے عالمی تاریخ کے اسٹیج پر قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔''

685 صفحات کی اس کتاب میں مختلف قوموں کی تاریخ کو جتنے صفحات میں جگہ دی گئی ہے، وہ ایک انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ پہلے دو صفحات میں طوفان نوح سے پہلے کی تاریخ اور نسل کے پھیلاؤ کا بیان ملتا ہے۔ اس کے بعد کے 13 صفحات میں ''مشرقی اقوام کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔'' چین، ہندوستان، آشوریہ اور بابل و مصر اور فونیشیا، ان سب کی تاریخ کو ایک ایک صفحے میں بیان کر دیا گیا ہے۔ فارس اور یہود کی تاریخ کو سات صفحے دیے گئے ہیں۔ تقریباً 30 صفحات میں قدیم یونان کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور روما کی تاریخ کو پچاس صفحات دیے گئے ہیں۔ زمانہ وسطیٰ کے لیے 78 صفحات مخصوص کیے گئے ہیں، جن میں پانچویں سے پندرھویں صدی عیسوی کے دوران میں یورپ کے شاہی خاندانوں کا تذکرہ ہے۔ آنحضور صلی

اللہ علیہ وسلم کی مسلمان سلطنت کو چار صفحات میں سمیٹا گیا ہے۔ ہندوستان اور چین کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''وہ یورپ کے مہم جوؤں کے لیے سفر کی آخری منزلیں تھیں۔'' ''جدید تاریخ'' میں یورپی خاندانوں کے بعد از اصلاح زمانوں اور امریکا کی سیاسی انتظامیہ پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ جن واقعات کو یہاں پر توجہ کی گئی ہے، وہ ہیں جنگیں اور انقلابات۔ ان میں ''تیس سالہ جنگ'' ''انگریزی انقلاب'' اور آسٹریلیا میں تخت نشینی پر جنگ'' کے کوائف شامل ہیں۔ اس تاریخ میں ایک ایک ورق کے اندر ہندوستان اور فارس کے واقعات کا خلاصہ الگ سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک مختصر سا بیان امریکا میں اسپین کی فتوحات کا بھی ہے۔1776 سے1876 تک کی امریکی تاریخ65 صفحات میں بیان کی گئی ہے۔

آج ایسی کسی کتاب کو''عالم گیر تاریخ''، تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ویسے یہ جاننا تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مثال کے طور پر روم کے بادشاہ ہیلوگیبولس کو222 میں قتل کر دیا گیا تھا اور یہ کہ ڈیوک آف بکنگھم کے گستاخانہ رویے نے برطانیہ کے چارلس اوّل کا سارا منصوبہ ٹلپٹ کرایا جو سپین کی شہزادی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مغرب کی سیاسی تاریخ کے ایسے واقعات ان بنیادی مسائل پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے جو آج کے معاشروں پر اثر انداز ہو رہے ہوں گے، اگر چہ حکومتوں کی تاریخ نے بھی عام تاریخ کی نمائندگی کی ہے، لیکن ان کے سیاسی پہلو سے زیادہ انسانی معاشرے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ کتاب کی ایک نمایاں کوتاہی مغربی یورپ اور شمالی امریکا کا بہت زیادہ تذکرہ ہے۔1876 میں تو یہی نظر آ رہا ہوگا کہ ہماری دنیا کی تاریخ کا رخ مغربی طاقتوں کی بالادستی کی طرف ہے، لیکن گزشتہ صدی کے واقعات نے اس تاثر کی تصحیح کر دی ہے۔ غیر مغربی دنیا کی قوموں کے تجربوں کے حوالے سے بہت سی باتوں کو اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے، جنہوں نے اپنی بابت ایک مکمل تحریری ریکارڈ چھوڑا ہے۔ اگر کرۂ ارض پر منتشر معاشروں کی الگ الگ تاریخیں موجود ہیں، تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ عالمی تاریخ کی ایک کتاب میں ہر قوم کے تجربات کو کتنی جگہ دی جائے۔

تاریخ کے بیان میں آبادی کی قائدانہ حیثیت

اسے سمجھنے کا ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر فرد کے تجربات کسی دوسرے کے تجربات کی طرح تاریخ میں درج کیے جانے کے مستحق ہیں، اور چونکہ تمام افراد کا یہ دعویٰ ہے کہ عالمی تاریخ میں انہیں اُسی قدر اہمیت دی جائے جو دیگر مختلف قومی تاریخوں کو دی گئی ہے، لہٰذا مختلف قومی تاریخیں اپنی قومی آبادی کے حجم کے مطابق ہوں گی۔

جس قوم کی آبادی کسی زمانے میں سب سے زیادہ ہوگی، اس کو اُس زمانے میں تاریخ کے اندر سب سے زیادہ جگہ ملے گی۔ پھر جو آبادی اپنی تعداد میں دوسرے نمبر پر ہوگی، اُس کو دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ جگہ ملے گی، اور یونہی یہی سلسلہ چلے گا۔ اگر تاریخ کے بیان میں آبادیوں کے حجم کو اہمیت دی گئی تو خاص زمانوں میں تاریخ دانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ آبادی کے اعداد وشمار پر نظر رکھیں۔ کولن مک ایوڈی (Colin McEvedy) اور رِچرڈ جونز (Richards Jones) کی کتاب "اٹلس آف ورلڈ پاپولیشن ہسٹری" سن ایک ہزار قبل مسیح سے، جب پتھر کے زمانے کا آغاز ہوا تھا، آج کے زمانے (1975) تک کے اعداد فراہم کرتی ہے۔

میزانیہ 1-1 اور 2-1 سے کرۂ ارض کی آبادی معلوم ہوتی ہے اور چار سو عیسوی سے

گوشوارہ 1-1 Table 1-1

منتخب برسوں میں دُنیا کی کل آبادی

سال	آبادی (ملین)	سال	آبادی (ملین)
10000 B.C.	4	1100 A.D.	320
5000 B.C.	5	1200 A.D.	360
4000 B.C.	7	1300 A.D.	360
3000 B.C.	14	1400 A.D.	350
2000 B.C.	27	1500 A.D.	425
0	170	1700 A.D.	610
200 A.D.	190	1750 A.D.	720
400 A.D.	190	1800 A.D.	900
500 A.D.	190	1850 A.D.	1,200
600 A.D.	200	1875 A.D.	1,325
700 A.D.	210	1900 A.D.	1,625
800 A.D.	220	1925 A.D.	2,000
900 A.D.	240	1950 A.D.	2,500
1000 A.D.	265	1975 A.D.	3,900
		1999 A.D.	6,000

Source: Atlas of World Population History, Penguin, 1978

1997 تک الگ الگ علاقوں کی فی صد آبادی کا پتا چلتا ہے۔ زیادہ تر زمانوں میں چین اور ہندوستان کی مجموعی آبادی، دنیا کی کل آبادی کا نصف تھی۔ 17 اور 18 ویں صدیوں کے دوران میں دنیا کی آبادی کے اندر یورپ کی آبادی کا حصہ بڑھ گیا، لیکن پھر گھٹنے لگا۔ شمالی اور جنوبی امریکا اور پھر آسٹریلیا اور بحرالکاہل کے جزائر سمیت 1850 سے 1997 کے درمیان ان علاقوں کی آبادی نمایاں طور پر بڑھ گئی تھی۔ آبادی میں اضافہ اس زمانے کے اندر دیکھنے میں آیا جب امریکا ایک عالمی طاقت بن کر ابھرا۔ یورپ کا اقتدار اور اثر رسوخ 19 ویں صدی کے اندر عروج پر تھا۔ آبادی میں بھی اس کا حصہ بڑھ گیا تھا۔ آبادی میں اضافے کا اصل سبب زراعت میں توسیع تھی۔ بعض معاشروں نے دوسرے کے مقابلے میں زرعی معیشت کو جلد فروغ دیا۔ آبادی میں اضافے کے دیگر اسباب میں صنعتوں کا قیام اور فروغ تھا، پھر طب کی ترقی بھی جس سے شرح اموات گھٹ گئی اور کم آبادی والے علاقوں کی طرف آبادی کی منتقلی شروع ہوئی۔ جنگ، قحط، ناداری اور وباؤں کی وجہ سے اچانک کمی واقع ہوئی۔ آبادی میں کمی کا ایک اور سبب متمول معاشروں میں زچگی کی کمی تھی۔

عالمی آبادی میں تبدیلیوں سے قوموں کے درمیان متنازعہ رجحانات پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ پہلے ایک ہزار سال قبل مسیح میں آبادی میں زبردست اضافہ اوّل ایشیا، شمالی افریقا اور یورپ میں ہوا۔ بحیرۂ روم اور بحر اسود کے ساحلی علاقوں میں آباد لوگوں نے آبادی میں نمایاں اضافہ کیا۔ یونانیوں نے اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی بدولت ایران کے شہنشاہ زیورس دوم کا مقابلہ کیا، جس نے چھٹی صدی قبل مسیح میں ان کے ملک پر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ دو صدیوں کے بعد انہی یونانیوں نے سکندر اعظم کو قومی ہیکل جوانوں کی فوج فراہم کی۔ تاہم اس کے بعد کے زمانے میں ان کی آبادی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ روم کی آبادی دو سو قبل مسیح کے قریبی زمانوں میں پچاس لاکھ تھی۔ کارتھیج (Carthage) کے خلاف جنگ میں، جن کی آبادی اس وقت تقریباً پندرہ لاکھ تھی، روم کی فوج کا پلہ بھاری تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں یہودیوں کی آبادی میں زبردست اضافہ ہوا جس سے یہودیت اور مسیحیت، سلطنت روما کی حدود میں شہروں تک پہنچ گئی۔ میزانیہ 3-1 سے ظاہر ہے کہ دو ہزار قبل مسیح کے زمانے سے دنیا میں تین بڑے شہر نظر آ رہے ہیں۔ ان شہروں کے نام بادشاہوں اور سلطنتوں کی یادوں کو ذہنوں میں تازہ کر دیتے ہیں، جنہوں نے دنیا کی تاریخ پر گہرے نقوش ثبت کیے۔

رومن اور ہن چینی سلطنتوں کی آبادی تیسری صدی عیسوی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی

گوشوارہ 1-2 Table 1-2

مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں آبادی کا تناسب

تاریخ	چین	ہندوستان	باقی ایشیا	یورپ	افریقا	دیگر
400 B.C.	27	24	21	18	7	3
200 B.C.	28	21	23	18	7	3
0	30	21	18	18	10	3
200 A.D.	32	22	15	19	9	3
400 A.D.	27	25	17	17	10	4
600 A.D.	23	26	24	13	10	4
800 A.D.	23	29	18	13	13	4
1000 A.D.	23	30	17	14	12	4
1100 A.D.	31	26	14	14	11	4
1200 A.D.	32	24	14	16	11	3
1300 A.D.	23	25	15	22	11	4
1400 A.D.	21	28	18	17	12	4
1500 A.D.	23	25	18	19	11	4
1600 A.D.	28	25	17	18	10	2
1700 A.D.	25	27	16	20	10	2
1750 A.D.	30	24	15	19	9	3
1800 A.D.	35	21	13	20	8	3
1850 A.D.	35	19	12	22	7	5
1900 A.D.	28	18	14	24	7	9
1950 A.D.	21	18	19	21	8	13
1975 A.D.	18	20	21	16	10	15
1997 A.D.	21	21	18	13	13	14

Source: Atlas of World Population History, Penguin, 1978

تھی۔ سلطنت روم کی مجموعی آبادی اس وقت چار کروڑ 6 لاکھ تھی اور چینی سلطنت کی پانچ کروڑ۔ 220 صدی عیسوی میں ہن خاندان کے زوال کے بعد چین کی آبادی گھٹ گئی۔ یورپ کی آبادی جو 3 کروڑ 60 لاکھ افراد پر مشتمل تھی، 600 صدی عیسوی میں کم ہو کر دو کروڑ 60 لاکھ رہ گئی تھی۔ یورپ اور ایشیا یعنی یوریشیا کے دونوں سروں سے مشرق وسطیٰ کے خانہ بدوش قبائل اٹھے۔ ان کی آبادی غالباً پچاس لاکھ تھی۔ یوریشیا میں گھستے رہے اور انہوں اپنے سے دس گنا بڑی آبادی کی سلطنتوں کو شکست سے دوچار کر دیا۔ چین کی آبادی شاہی حکمرانی کے ساتھ دوبارہ بڑھنے لگی اور ایک ہزار سن عیسوی میں 6 کروڑ تھی۔ سن 1200ء میں یانگ سی کی وادی کے اندر دھان کی زبردست پیداوار کے نتیجے میں گیارہ کروڑ 50 لاکھ ہو گئی۔ اس طرح کے اضافے کا عمل یورپ میں 1000 عیسوی میں شروع ہوا۔ اب کشش کا مرکز بحر روم کے ساحلی علاقوں سے بحر شمالی اور بحر اٹلانٹک کے نواحی ملکوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ ہندوستان کی آبادی کا مرکز جمنا اور گنگا کے زرخیز میدان تھے، جہاں 200 صدی عیسوی میں چار کروڑ دس لاکھ کی آبادی تھی اور بڑھتے بڑھتے ایک ہزار سن عیسوی میں 7 کروڑ 90 لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ یہی آبادی آئندہ پانچ صدیوں میں دھیمے انداز سے بڑھتی رہی۔

تیرھویں صدی میں جب چنگیز خاں کی سرکردگی میں منگولوں کے لشکر نے فوج کشی کر کے سنگ سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد چین کی آبادی میں اضافے کا عمل دفعتاً رک گیا۔ یہ وحشی قبائل چین کے زراعتی ڈھانچے کو تہس نہس کرنے پر تل گئے تھے، جسے وہ اپنی خانہ بدوشی کے لیے فطری سمجھتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق چین کے شمالی صوبوں کی تین چوتھائی آبادی منگولوں کے تشدد سے ہلاک ہو گئی تھی۔ اس طرح کے حملے مشرقی یورپ میں اسلامی سلطنتوں اور بازنطینی بادشاہوں پر بھی ہوئے اور بڑی خون ریزی کی گئی۔ مغربی یورپ کی آبادی اُس زمانے میں ایک سطح پر رک گئی تھی کیوں کہ جتنی زمین کاشت کے لیے موجود تھی، زرعی ٹیکنالوجی وہاں تک پہنچ کر ختم ہو گئی تھی۔ پھر اس کے بعد یورپ میں طاعون کی خوف ناک وبا پھیل گئی۔ 1347 کا سال تھا۔ وبا اس قافلے سے پھیلی جو اپنا تجارتی سامان کافا اور کریمیا کے مقام پر ڈھیر کر دیتے تھے۔ یہ ''طاعونی وبا'' چھ سال باقی رہی جس میں یورپ کی ایک تہائی سے لے کر ایک چوتھائی آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔

عالمی آبادی کا غالباً سب سے غیر معمولی واقعہ اُس وقت رونما ہوا جب امریکا میں یورپی نوآبادیات قائم ہونے لگیں۔ اس مغربی کرۂ ارض میں کولمبس کی آمد کے بعد صدی کے

گوشوارہ 1-3 Table 1-3

دُنیا میں تین سب سے بڑے شہر

تاریخ	پہلا	دوسرا	تیسرا
2000 B.C.	Ur	Memphis	Thebes
1600 B.C.	Avaris	Babylon	Setabul
1200 B.C.	Memphis	Khattushash	Dur-Kurigalza
1000 B.C.	Thebes	Sian	Loyang
800 B.C.	Thebes	Sian	Loyang
650 B.C.	Nineveh	Lintzu	Loyang
430 B.C.	Babylon	Yenhsiatu	Athens
200 B.C.	Chang'an	Patna	Alexandria
100 A.D.	Rome	Loyang	Seleucia
361 A.D.	Constantinople	Ctesiphon	Patna
500 A.D.	Constantinople	Ctesiphon	Loyang
622 A.D.	Ctesiphon	Chang'an	Constantinople
800 A.D.	Baghadad	Chang'an	Loyang
1000 A.D.	Cordoba	Kaifeng	Constantinople
1200 A.D.	Hangchow	Fez	Cairo
1350 A.D.	Hangchow	Peking	Cairo
1500 A.D.	Peking	Vijayanagar	Cairo
1600 A.D.	Peking	Consantinople	Agra
1700 A.D.	Constantinople	Yedo	Peking
1800 A.D.	Peking	London	Canton
1850 A.D.	London	Peking	Paris
1900 A.D.	London	New York	Paris
1950 A.D.	New York	London	Tokyo
1975	Tokyo	New York	Osaka

Source: Chandler, Tertius. Four Thousand Years of Urban Growth. (Lewiston, NY: The Edwin Mellen Press, 1987.)

دوران میں مقامی آبادی اپنے پانچویں حصے کے برابر گھٹ گئی۔ اگرچہ اسپین کی حکمرانی بے رحمانہ تھی لیکن یہاں آبادی میں کمی کی اصل وجہ بیماری تھی۔ خسرے اور چیچک کے جراثیم جب یورپ سے امریکا پہنچے تو وہاں کے انڈین امریکن ان امراض سے مدافعت کی قوت نہیں رکھتے تھے۔ آبادکار جنھوں نے پہلے انڈینز کو چاندی اور سونے کی کانوں میں مزدوری کے لیے استعمال کیا تھا، اب انہیں کام پر لگانے کے لیے محنت کے نئے ذرائع کی تلاش میں تھے۔ سب سے پہلے پرتگالیوں، پھر ہالینڈ اور برطانیہ کے تاجروں کو یہ کام بڑا نفع بخش نظر آیا کہ مشرقی افریقا سے سمندر پار کرکے افریقیوں کو پکڑ کر لائیں اور انہیں بطور غلام فروخت کر دیں۔ 1500 اور 1850 کے درمیان 9 کروڑ 50 لاکھ نیگرو غلام شمال اور جنوب کے امریکا میں لائے گئے۔ انہیں زیادہ تر برازیل اور کیریبین جزائر میں رکھا گیا۔ انیسویں صدی میں جب غلاموں کی تجارت ممنوع قرار دے دی گئی تو یورپ سے رضاکارانہ ترکِ سکونت کی بنا پر نئی دنیا کو بہت فائدہ پہنچا۔ 1845 اور 1914 کے درمیان تارکین وطن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ بیسویں صدی کے اندر دنیا میں ہر جگہ آبادی میں اضافہ ہوا ہے۔

چونکہ گزشتہ زمانوں کے مقابلے میں آبادی بہت زیادہ ہوگئی تھی، اس لیے تاریخی ''وسعت'' کا تقاضا ہے کہ برسوں کی تعداد کو اور ان سے وابستہ آبادی کے وزن کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ تاریخی تجربے کے معیار کو انسانی زندگی کے مطابق ہونا چاہیے، اگر فی الواقعی اس تصور کی کوئی اہمیت ہے۔ میزانیہ 4-1 میں دس ہزار قبل مسیح اور 1997 عیسوی کے درمیانی زمانوں میں وقفے کے ساتھ مجموعی انسانی سال دکھائے گئے ہیں، اس حساب سے گزشتہ دس ہزار سال قبل مسیح کے مقابلے میں پچھلے پچاس سال کے اندر زیادہ ''تاریخ'' دو مساوی آبادی کے زمانوں میں سموئی گئی ہے اور ان کے درمیان خطِ تقسیم 1577 کا عیسوی سال ہے۔ اس طریقے سے پرکھنے کی اپنی محدودات ہیں، لیکن یہ حقیقت بہرحال یقینی طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ تاریخی تجربے میں اضافہ ہوا ہے۔ عالمی تاریخ کے کسی بھی حساب میں جدید زمانے کی اہمیت کو کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اجزا کے درمیان تقسیم

تاریخ، تجربات کا ایک نہایت گراں قدر ذخیرہ ہے۔ سمجھ میں نہ آنے والے اس انبوہ کی تفہیم کے لیے پہلا قدم یہ ہوتا کہ کسی طرح ان کے الگ الگ ٹکڑے کیے جائیں۔ چنانچہ ہم تاریخی تجربات کے اس انبوہ کو تہذیبوں کے درمیان تقسیم کرتے ہیں۔ وہ زمانے اور وہ

Table 1-4 گوشوارہ 1-4

10000 قبل مسیح تا 1999ء انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی

(By Percentage of 1999 Total)

24.5	600 A.D.		
26.1	700 A.D.	1.7	7500 B.C.
27.9	800 A.D.	2.1	5000 B.C.
29.8	900 A.D.	2.6	4000 B.C.
31.9	1000 A.D.	3.7	3000 B.C.
34.4	1100 A.D.	4.5	2500 B.C.
37.3	1200 A.D.	5.6	2000 B.C.
40.1	1300 A.D.	7.1	1500 B.C.
42.9	1400 A.D.	9.1	1000 B.C.
46.3	1500 A.D.	9.9	500 B.C.
48.2	1550 A.D.	10.7	400 B.C.
50.3	1600 A.D.	11.6	300 B.C.
52.5	1650 A.D.	12.8	200 B.C.
54.9	1700 A.D.	14.1	100 B.C.
57.8	1750 A.D.		
61.3	1800 A.D.	15.4	0
66.1	1850 A.D.		
68.7	1875 A.D.	16.9	100 A.D.
71.9	1900 A.D.	18.4	200 A.D.
75.9	1925 A.D.	19.9	300 A.D.
80.9	1950 A.D.	21.4	400 A.D.
88.6	1975 A.D.	22.9	500 A.D.
100.0	1999 A.D.		

Source: Atlas of World Population History, Penguin.

مقامات، جہاں انسانی تہذیب بنیادی طور پر ہماری تہذیب سے مختلف نظر آتی ہے۔اس کے لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک مختلف تہذیب تھی۔ دنیا کی تہذیب کرۂ ارض پر بہت سی مختلف جگہوں پر موجود رہی ہے۔ان معاشروں میں رہنے والوں نے ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کیا ہو، یا ہوسکتا ہے نہ کیا ہو۔ اگر وہ ایک دوسرے یک سر جدا ہوتے تو ان سب کی ایک مشترکہ تاریخ نہ ہوتی۔اس صورت میں دنیا کی تاریخ، الگ الگ راستے پر چلنے والی بہت سی تاریخوں کا مجموعہ ہوتی۔ ہر معاشرے کے پاس اپنے یادگار واقعات کا ذخیرہ ہوتا۔اب کہ دنیا بھر کے لوگ ایک دوسرے کے وجود سے باخبر ہیں، عالمی تاریخ کے تصور کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اب تاریخ دانوں کے سامنے ایک چیلنج ہے کہ اپنے گزشتہ تجربات کو بیان کرنے کے لیے کوئی صریح اور قابل فہم ترکیب ڈھونڈ لیں۔

عالمی تاریخ دراصل اعلیٰ ترین سطح پر کہانی بیان کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ یہ کوئی ایک کہانی نہیں ہے جس میں دنیا میں رونما ہونے والے تمام واقعات کو سمیٹ لیا جائے۔ کہانیاں ایک صورتِ حال سے دوسری صورتِ حال تک رونما ہونے والی تحریکوں کو شمار کرتی ہیں۔ عالمی تاریخ میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک دور میں واقعات ایک ہی سمت میں سفر کرتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں اپنے آپ کو پلٹ دیتے ہیں۔ لہٰذا عالمی تاریخ کو وسیع بنیادوں پر بیان کرنے کے لیے اسے ٹکڑوں میں بانٹ لیا جاتا ہے۔ جسے 'عہد' کہتے ہیں، اس طرح بیان کرنے اور سمجھنے میں سہولت ہے۔ یہ طویل اوقات ہیں، جس میں معاشرے اور تہذیب کے تعلق سے لوگوں کے تجربات اور تاریخی واقعات ایک ہی سمت میں سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ عالمی تاریخ کو عہدوار تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کتاب ابواب میں تقسیم کی جاتی ہے۔اس طرح کی تنظیم سے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

عہد کی تاریخ

ابتدائی مسیحی آبادی کے لوگوں میں ایک واضح شعور اس امر کا تھا کہ دنیا ختم ہونے کو ہے۔اس توقع نے جسے تائید ایزدی حاصل تھی اس خیال کو تقویت دی کہ تاریخ کے دو عہدوں کے درمیان خطِ تقسیم کھینچ دیا جائے اور یہ کام کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ اس تقسیم کے ایک طرف انسانی آلام و مصائب اور فساد کا زمانہ تھا، جب دنیا پر شیطان کی حکمرانی نظر آ رہی تھی، دوسری طرف زمین پر خدا کی بادشاہی تھی، جب عدل اور رحم کی حکمرانی ہمیشہ کے لیے قائم ہو جائے گی۔ جب تمام ضروری شرائط طے پا جائیں گی تو ایک سے دوسرا عہد ''چشم زدن'' میں بدل

جائے گا۔ چونکہ مسیحیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ مسیحا تھے، جو اس عمل میں شریک تھے، اس لیے زمین پر ان کا ظہور ایک عہد جیسی اہمیت کا حامل ہوگا۔ مغربی دُنیا نے عالمی تاریخ کو حضرت عیسیٰؑ سے پہلے اور ان کی پیدائش کے بعد کے زمانوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ وضع کیا ہے۔ عیسیٰؑ سے قبل کا زمانہ ''قبل مسیح'' کہلاتا ہے، اس کے بعد کا زمانہ عیسوی سن سے منسوب ہے۔

یہ عہد سازی کی تجویز سب سے پہلے چھٹی صدی عیسوی میں ایک یونانی بولنے والے پادری ڈائنوسیس ایکسی گس (Dionysins Exignus) نے پیش کی تھی۔ اس سے پہلے یہ بات لوگوں کے شعور میں نہ تھی کہ وہ مسیحی دور میں سانس لے رہے ہیں۔ ابتدائی زمانے کے مسیحی، عیسیٰؑ کی عنقریب واپسی کی امید کرتے تھے۔ عیسیٰؑ کے حواری ہر ہفتے ایک بند کمرے میں اکٹھا ہوتے۔ یہ وہ افراد تھے جنھوں نے عیسیٰؑ کے ساتھ ''آخری عشائیے'' میں شرکت کی تھی۔ یہ کھانا مسیحی دسترخوان کی ایک علامت تھا۔ مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی دوسری واپسی کسی ایسے ہی موقع پر ہوگی، جب ان کے مرید ایک جگہ جمع ہوں گے۔ جب مسیحی آبادی اتنی بڑھ گئی کہ ان کے لیے ایک کمرے میں اکٹھا ہونا ممکن نہیں رہا تو ان کے لیے ایک وقت کا تعین کرنا لازمی ہوگیا۔ اس طرح دور تک بکھرے ہوئے مسیحی اجتماعی کھانے میں شریک ہوسکیں گے۔ چونکہ عیسیٰؑ کی واپسی کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ اپنی دوبارہ پیدائش کے موقع پر ظہور کریں گے، اس لیے ایسٹر کے لیے ایک مشترکہ تاریخ کا تعین چرچ کے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ آخر نکایا کی کونسل (Council Nicaea) نے 825 عیسوی میں طے کیا کہ تمام عیسائی جہاں کہیں بھی ہوں، یہ تہوار موسم بہار کے بعد پہلے اتوار کے دن منائیں۔

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد، جب مغربی معاشرے کو ایک ہزار سال گزر گئے تو ایک راہب نے جس کا نام جوکم آف فیور (Jaochim of Fiore) تھا یہ اندازہ لگایا کہ مسیحی دور کا تیسرا عرصہ تیزی سے قریب آ رہا ہے اور یہ عرصہ مقدس ارکانِ ثلاثہ کے تیسرے رکن سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ پہلا عہد مقدس باپ کا تھا۔ یہ عیسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے کے دور پر محیط تھا، دوسرا عہد بیٹے کا عہد تھا۔ یہ اس عرصے پر محیط تھا جب مسیحی کلیسا نے دنیا میں اپنے سرگرم وجود کا ثبوت دیا۔ تیسرا عہد روح القدس کا ہوگا۔ خداوند کی روح کا براہِ راست تجربہ اس وقت مسیحیت کے لیے میثاق مقدس سے زیادہ اہم ہوگا۔ یہ کلیہ فرانسسکین راہبوں کے لیے پرکشش تھا اور روحانی طور پر دوسرے حساس لوگوں کے لیے بھی۔ یہ کلیہ مسلّمہ کلیسا کے لیے بھی

ایک چیلنج بن گیا۔ جوکم کی پیش گوئی 1260 عیسوی کے آس پاس گردش میں تھی۔ اس دوران میں ایسا کوئی انقلاب آفریں واقعہ رونما نہیں ہوا جو روحانیت کی لہر پیدا کرتا۔ اس کی بجائے وہ رومن بادشاہ کی تخت نشینی سے ایک سال قبل کا درمیانی عرصہ تھا۔ بعض لوگوں نے کلیسا میں بادشاہ فریڈرک دوئم کو عیسیٰ کا مخالف قرار دیا جو دس سال قبل انتقال کر چکا تھا اور دوسرے بادشاہ ہیبرگ کے روڈلف اوّل کا انتخاب 1271 سے قبل نہیں ہوسکتا تھا۔

ہوسکتا ہے جوکم کی پیش گوئی نے ہی مغربی قوموں کو تین تاریخی عہدوں کے حوالے سے سوچنے پر آمادہ کیا ہو؛ قدیم، وسطی اور نشاۃ الثانیہ کا عہد۔ اس منصوبے کو نشاۃ الثانیہ میں ہی رواج ملا۔ اگرچہ اس سے پہلے عہد وسطیٰ کی اصطلاح، عیسیٰ کی پہلی اور دوسری پیدائش کے درمیانی عرصہ کو شناخت کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ نشاۃ الثانیہ سے پہلے یورپ والے روما کے باشندوں اور اپنے درمیان ایک تہذیبی تسلسل دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک طویل مدت کے آخری دنوں تک پہنچ گئے تھے، جو ماضی میں آگسٹس، قیصر اور عیسیٰ کے زمانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ عیسیٰ سے پہلے ایک اور ہی زمانہ تھا، جو تاریکی کا زمانہ تھا۔ چودھویں اور پندرھویں صدیوں کے درمیان لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ ان میں اور رومن دور کے بیچ ایک ہزار سال کی مدت حائل تھی۔ اس گزشتہ دور کے مقابلے میں اب معاشرے کی ساخت بالکل مختلف تھی۔ یونان اور روم کا پرانا کلاسیکی کلچر جا رہا تھا اور اس نے ایک اور کلچر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ نشاۃ الثانیہ کے دانش وَر جو یونانی اور رومن متون کا مطالعہ کر چکے تھے، اس امر سے آگاہ تھے کہ ایک اور تہذیب ان کی اپنی تہذیب کے مساوی یا شاید اس سے بہتر، بہت سال پہلے موجود تھی۔ انہوں نے اس درمیانی مدت کو ''عہد وسطیٰ'' کا نام دیا اور جدید کی اصطلاح اپنے ساتھ وابستہ کر لی۔ آج اس کے کئی سال بعد تک ہم اس ''جدید'' زمانے میں زندہ ہیں۔

نشاۃ الثانیہ کے مؤرخوں نے یونان اور روم کی قدیم تہذیبوں کو برتر تہذیب قیاس کیا اور اپنی تہذیب کو کلاسیکی علوم کی تجدید قرار دیا۔ اس طرح زمانۂ وسطیٰ تہذیب کے زوال کا زمانہ تھا۔ جب مسیحیت نے ایک بار پھر تاریخی ترقی کی نمائندگی کی تو اس کے اثر کو محدود، بے علم اور پس ماندہ سمجھا گیا۔ مسیحی تہذیب کی یہ تحقیر اٹھارھویں صدی میں اور بھی گہری ہوگئی کہ اسے روشنی کی صدی کہا گیا۔ اب زمانۂ وسطیٰ کے معاشرے کا تعلق ''تاریک زبانوں'' سے ہوگیا تاہم مسیحی مذہب نے مغربی تہذیب کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کی بالادستی کا عہد جسے یورپ کی تاریخ میں درمیانہ حیثیت حاصل رہی ایک طرح سے قدیم اور جدید دونوں عہد تک

پھیلا ہوا تھا۔

مسیحیت اور روم کی سلطنت ان کے درمیانی رشتے کو مغرب کی تاریخ میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا عہد اس وقت بدل گیا جب ان کے ادارے بنیادی طور پر متاثر ہوئے۔ قدیم اور عہد وسطیٰ کے درمیان خط مستقیم کی تعریف مختلف طرح سے کی گئی ہے۔ جیسے کہا گیا کہ وہ سال جب روم کے بادشاہ کانسٹن ٹائن نے (1313 سن عیسوی میں) مسیحیت کو گوارا کر لینے کا فیصلہ کیا، جب کانسٹن ٹائن نے قسطنطنیہ کا شہر تعمیر کر کے اسے اپنی سلطنت کا دوسرا دارالحکومت (330 عیسوی میں) قرار دیا۔ جب بادشاہ تھیوڈوسس (Theodosius) اوّل (380 عیسوی سال میں) مسیحیت سے مشرف کیا گیا۔ جب مغربی روم کی سلطنت کے آخری بادشاہ رومولس آگسٹولس (Romulus Angustulus) کو (476 عیسوی میں) بادشاہ اوڈیسر (Odoacer) نے تخت سے اتار پھینکا۔ قدیم اور جدید کے درمیان خط مستقیم اس سال کو تسلیم کیا گیا ہے۔ جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ پر (1453 عیسوی میں) قبضہ کر کے مشرقی روم کی سلطنت کو نابود کر دیا۔ جب کولمبس نے پہلی بار (1492 عیسوی میں) امریکا کی سرزمین پر قدم رکھا اور جب مارٹن لوتھر نے مغرب کی مسیحیت میں اس وقت رخنہ ڈال دیا جب اس نے وٹن برگ جرمنی کے پُرشکوہ کلیسا کے دروازے پر اپنے ''95 نظریے'' آویزاں کر دیے۔

غیر مغربی عوامی تاریخیں

دنیا کی تاریخ کو تین حصوں قدیم، وسطی اور جدید ادوار میں تقسیم کرنے سے مغربی یورپ کی اقوام کے تجربے کی وضاحت تو ہو جاتی ہے، لیکن باقی دنیا کی نہیں ہوتی۔ دنیا کی بیشتر آبادی مسیحی نہیں ہے اور یوریشیا (یورپ، ایشیا) کا انتہائی مغربی علاقہ ہی روما سلطنت کے ماتحت تھا۔ لہٰذا ایک زمین بوس ہوتی ہوئی سلطنت کا تجربہ، پھر اس کے بعد ایک عالم گیر اگرچہ سلطنت کے بغیر مذہب کی آمد، پھر اس کا منتشر ہونا اور اس کی جگہ ایک سیکولر نظام زندگی کا قیام، یہ سب ایک مغربی معاشرے کے لیے بالکل انوکھی باتیں تھیں۔ دوسرے معاشروں کی تاریخیں ایک مختلف نمونہ پیش کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ معاشرہ جو مغرب کی مسیحی عمل داری اور سخت گیر مسیحی معاشرے سے وابستہ تھا، اُس کا تاریخی تجربہ بھی مختلف تھا۔ اس سلسلے میں پہلی سلطنتیں 1453 عیسوی سال تک برقرار رہیں۔ بازنطینی معاشرہ، طویل عرصے تک جنگ میں مبتلا رہا۔ کبھی ساسانی ایرانیوں کے ساتھ، پھر اُموی مسلمانوں کے ساتھ، پھر فرانک کے صلیبی جنگ جوؤں کے ساتھ، سلجوق ترکوں، منگولوں اور عثمانی ترکوں کے ساتھ، یہاں تک کہ قسطنطنیہ شکست

سے دوچار ہوا۔ پھر خالص مسیحی برادری نے اپنا دہرا وجود قائم کیا۔ وہ یوں کہ جب ماسکو کے ڈیوک نے اس کا عقیدہ قبول کرلیا تو شاہی مذہب کا مرکز ماسکو ہوگیا۔ اس دوران میں ایشیائے کوچک اور بلقان کے جزیرہ نما میں مسیحیت کو ایک اسلامی معاشرے میں اپنا وجود برقرار رکھنے کی آزادی دے دی گئی۔ پہلی عالمی جنگ کے آخر تک سلطنت عثمانیہ بھی ختم ہوگئی اور روس میں زار کی حکومت کی جگہ ایک غیر مذہبی سیاسی حکومت نے لے لی۔

چین میں مذہب (جس کا وجود ایک اخلاقی فلسفہ کی صورت میں تھا) ایک شاہی حکومت کے زیرانتظام برقرار تھا، اس کی بالادستی دو ہزار برس تک رہی۔ اس کا اوّلین عہد 221 قبل مسیح میں چینی قوم کے اتحاد کے ساتھ شروع ہوا۔ اس کے بعد شاہی خاندان یکے بعد دیگرے آتے رہے، جس سے چینی تاریخ کو مرتب کرنے کا ایک ڈھانچا میسر آ گیا۔ چن (Chin)، ہن (Han)، سوئی (Sui)، ٹانگ (T'ang)، شمالی اور جنوبی سونگ (Sung)، یوان (Yuan) منگ (Ming) اور چنگ (Ching) خاندان حکمرانی کرتے رہے، حکومتیں بنتی رہیں اور ختم ہوتی رہیں۔ ان کے درمیان تعطل کا وقفہ بھی آتا رہا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں موروثی بادشاہتیں پھر واپس آ گئیں، جن کی انتظامیہ میں کنفیوشس کے فلسفے کے عالم شامل ہوتے تھے۔ صرف یوآن (منگول) سلطنت ان سے مختلف تھی۔ چنگ (Ching) ماکیو سلطنت 1912 میں ختم ہوگئی۔ جب کہ اس کے آخری فرماں روا کو چینی قوم پرستوں نے خاموشی سے برطرف کردیا۔

ہندوستان کی ایک بالکل مختلف تاریخ ہے۔ برصغیر ہند میں صرف دو دیسی سیاسی خاندانوں نے حکومت کی، یہ تھے موریہ اور گپتا۔ دونوں کی حکومت کا دورانیہ نسبتاً کم تھا۔ اس کی بجائے ہندوستان کے معاشرے کو تسلسل کے ساتھ غیر ملکی حملہ آوروں سے نپٹنا پڑا۔ آریائی خانہ بدوش آئے، مقدونیہ کے یونانی آئے، ہنز آئے، ترکی مسلمان آئے، تیموری مسلمان آئے، یورپ کے مہم جو سوداگر آئے۔ ہندوستان بہت سے مذاہب کے لیے ہمیشہ میدان جنگ بنتا چلا رہا ہے۔ ابتدائی مذہب جو فاتح آریاؤں کا تھا، اسے چھٹی صدی قبل مسیح میں دو مذہبی فلسفیوں، گوتم بدھ اور مہاویر کا مقابلہ کرنا پڑا۔ گپتا خاندان کی حکومت نے ہندومت کو دوبارہ بحال کیا جو بدھ مت کو ہندوستان سے باہر نکال دینے میں کامیاب ہوگیا۔ بعدازاں مسلم افواج نے جو شمال مغرب سے آئیں، برصغیر پر طاقت کے ذریعے قبضہ کرلیا۔ اس وقت تک ہندو راج دھانیاں جنوب میں ختم ہوچکی تھیں۔ اس کے بعد کی ہندوستانی تاریخ مسلمانوں اور ہندوؤں

کے باہمی تنازعے سے عبارت ہے۔

اسلامی معاشرے کی صورت یہ تھی کہ اس میں ایک ہی مذہب نے سیاسی سلطنتیں قائم کیں اور ان کو یک جا اور برقرار رکھا۔ اس کا پہلا عہد اس وقت شروع ہوا ہوگا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اتری اور اللہ کا پیغام پہنچا۔ 632ء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ وہ عہد ختم ہو گیا۔ دوسرے دور میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں نے بڑی تیزی سے فتوحات کیں اور یوں دمشق میں امیہ خلافت کا دور آیا۔ ان کے خلاف 747 اور 750 عیسوی کے دوران میں عباسیوں نے بغاوت کی۔ چنانچہ عربوں کی جگہ خلافت کے تخت پر ایک ایرانی آ گیا اور دارالخلافہ دمشق سے بغداد منتقل ہو گیا۔ اس عہد میں سیاسی اقتدار کے ٹکڑے ہو گئے۔ شمالی افریقا میں نئی بادشاہتیں، جن کی وفاداری عباسی خاندان کے ساتھ تھی قائم ہو گئیں۔ امیہ کے پناہ گزینوں نے جزیرہ نما لائبیریا میں حکومت قائم کی۔ اب مغرب سے مسیحی صلیب برداروں نے مسلمانوں پر حملے کرنے شروع کیے اور زیادہ شدید حملہ منگولوں کی جانب سے بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے درمیان ہوا۔ جب یہ خطرہ ذرا دُور ہوا تو تین نئی سلطنتیں نمودار ہوئیں۔ یہ تھیں ترکی عثمانیہ سلطنت، ایرانی صفوی سلطنت اور ہندوستان میں مغل سلطنت۔

مسلمانوں کا ہجری کیلنڈر 622 عیسوی سے شروع ہوتا ہے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی۔ مسیحی دور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ رومن کیلنڈر 750 قبل مسیح سے شروع ہوا جب روم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یونان کی سلطنت نے 311 قبل مسیح سے جب بابل فتح ہوا تھا، اپنے سال کا آغاز کیا۔ بابل کے باشندوں کا عہد 747 قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے جسے بنو نصر کا عہد Era of Nabonassar کہتے ہیں، اسے سکندریہ کے یونانیوں نے استعمال کیا۔ اگر اقوام متحدہ کا اثر اقوام عالم کی برادری میں ویسا ہی ہوتا، جیسا کہ قدیم سلطنتوں کا اپنے اپنے علاقوں میں ہوتا تھا تو پھر ہم بھی عالمی تاریخی کے لیے 1945 کو بنیاد بناتے اور واقعات کو اسی تاریخ کے حساب سے رقم کرتے۔ بہرحال حکومت اب ایسا بالادست ادارہ نہیں رہی اور نہ مذہب کی ویسی حاکمیت رہ گئی ہے۔ دوسرے ادارے معاشرے میں ان کی طاقت میں شریک ہیں۔ یہ بہت مشکل ہو گیا ہے کہ کوئی ایک مرکزی نوعیت کا واقعہ معلوم کر کے اس کو معاشرے کے اجتماعی تجربے کا حاصل سمجھ لیا جائے۔

ایک روایتی مسیحی عقیدے کے مطابق دنیا کی تاریخ اس وقت شروع ہوئی جب خدا

کے حکم سے چھ دنوں کے اندر اس کی تخلیق ہوئی۔ نسلوں کی فہرستیں جو بائبل میں آئی ہیں، ان کو مطالعہ کر کے اینگلیکسن چرچ کے آرک بشپ یوشر نے یہ نتیجہ نکالا کہ دنیا کی تخلیق 440 قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ یونان اور روس کے راسخ العقیدہ کلیسا دنیا کی تخلیق کی تاریخ 5509 قبل مسیح مقرر کی ہے۔ ہزار سالہ سالگرہوں نے یہ امیدیں پیدا کی ہیں کہ یہ عہد تبدیل ہونے والا ہے۔ جب عالم انسانی پہلے ہزار سالہ عیسوی سن پر پہنچ گئی تو بہت سے لوگوں میں یہ امید پیدا ہوئی کہ دنیا اب ختم ہو جائے گی۔ روس کے عظیم کلیسا نے بھی کچھ ایسی ہی توقع کی تھی کہ 1492 سن عیسوی دنیا کے خاتمے کا سال ہوگا۔ جو دنیا کی مفروضہ تاریخ پیدائش سے سات ہزار سال بعد کا سال ہوگا۔ چونکہ خدا نے دنیا کی تخلیق سات دنوں میں کی تھی اور خدا کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر رہا ہوگا تو یہ سمجھ لیا گیا کہ ممکن ہے دنیا 31-اگست 1492 میں ختم ہو جائے گی۔ جب وہ تاریخ بھی بخیریت گزر گئی تو پھر راسخ العقیدہ پادریوں نے اپنا حساب لگایا، جس کی رو سے ایسٹر آٹھویں ہزار سالہ مدت کے خاتمے پر آئے گا اور اب کہ عالم انسانیت نے دوسرے ہزار سالہ سن عیسوی کو پار کر لیا ہے، یوم قیامت کے بارے میں اس کے خیالات اب اس نکتہ پر مرکوز ہو چکے ہیں کہ کوئی دھماکہ خیز غلطی کمپیوٹر میں ہو جائے اور وہ اس لیے کہ پروگرام چلانے والوں کی گزشتہ نسل نے ایک سال کے عرصے میں صرف دو دِنوں کی چوک کی تھی۔ کچھ دوسرے لوگ اقتصادی کساد بازاری کی پیش گوئی کر رہے ہیں اور بعض اس سے بھی بدتر Y2K کی باتیں کر رہے ہیں۔

مذہبی تاریخیں

دنیا کی تاریخ کے بہترین نمونے اپنی بنیاد میں مذہبی روایات کے اندر پیوست ہیں، ایسا کیوں ہے؟ اس کی بھی ایک وجہ ہے اور وجہ یہ ہے کہ مذہب تاریخ کے لیے عالم گیر سطح پر بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ہر معاشرے کا فطری رجحان اس امر میں ہوگا کہ اس کی اپنی ایک تاریخ ہو، ہر معاشرے کی تاریخ کی حرکی قوت اور ارتقا کا عمل ہوتا ہے، لہٰذا دنیا کی تاریخ اگر اس وقت کوئی ہوتی تو اس کی کتاب کے الگ الگ باب میں مختلف نوعیت کے تجربے شامل ہوتے۔ تاہم مذہب میں خدا (یا خداؤں) کا تصور شامل ہے۔ جس نے ساری دنیا کو پیدا کیا۔ یہودیت کا دعویٰ ہے کہ یہودیوں کا خدا یہودا پوری کائنات کے خدا کا ہم معنی ہے۔ لہٰذا اپنے منتخب بندوں کے ساتھ یہودا کا تعلق انسانیت کی ہی سرگزشت ہے۔ اگر یہودا خدا ہے تو وہ زمین پر طاقت کا مالک ہے اور اس پر آباد تمام لوگوں کی تقدیر اس کی مٹھی میں ہوتی ہے۔ اس دنیا کے لیے خدا کا

منصوبہ، صحیح معنوں میں ایک عالمی تاریخ کی بنیاد ہے۔

چونکہ دنیا میں مختلف قوموں کے تجربات مختلف رہے ہوں گے اور خدا کے ساتھ ان کا مقابلہ بھی الگ رہا ہوگا، لہٰذا مذہبی تاریخ کا رُخ مستقبل کی طرف ہوگا۔ لازمی بات ہے کہ خدا تمام انسانیت پر اپنے وجود کو ظاہر کرے گا۔ یہودی مذہب میں آخرت کا یہ تصور، اسے مستقبل بینی کی بصیرت عطا کرتا ہے۔ اگرچہ یہودیت ایک قبائلی مذہب ہے ممکن ہے وہ اپنی دو بہنوں مسیحیت اور اسلام کے ذریعے سے اپنا پیغام آگے لے کر جاتا ہے۔ یہ مذاہب خدا کے وعدے کو ساری انسانی برادری میں لے کر جاتے ہیں۔ یہودیت کی تاریخ انفرادیت پر مبنی اور تمام انسانوں کے احساسات کے تحت سب کے لیے قابل قبول ہوتی ہے۔ اس میں تاریخی ترقی کا تصور بھی شامل ہے، اس میں ہر عہد کا ایک واضح موضوع ہے۔

آدم کی پیدائش کے چھٹے دن کے بعد سے، یہودی مذہب کی تاریخ کو درج ذیل عہدوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا عہد آدم اور حوا سے شروع ہوتا ہے، جن سے نسل آدم کی پیدائش ہوئی۔ حضرت نوح کے زمانے تک دنیا کی خلقت کسی خدائی رہنمائی کے بغیر زندگی گزار رہی تھی۔

دوسرا عہد خدا کے اس وعدے سے شروع ہوا جس میں خدا نے ابراہیمؑ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ ایک بڑے قبیلے کا باپ ہوگا۔ جس کی نسل کے لوگ کنعان کی سرزمین کے ہمیشہ کے لیے وارث ہوں گے۔ ابراہیمؑ کے فرزند اسحاقؑ اور یوسفؑ مصر میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد ایک بڑے قبیلے کی صورت میں پھیل گئے۔

تیسرے عہد میں موسیٰ نے اس بڑھتی ہوئی خلقت کو ایک آزاد قوم کی صورت میں بدل دیا۔ انہوں نے یہودیوں کو اپنے آبائی وطن کی طرف واپس سفر اختیار کرنے میں رہنمائی کی اور ان کے لیے اصول مرتب کر کے، ان پر عمل پیرا رہنے کی تاکید کی۔

چوتھا عہد حضرت داوٗد سے شروع ہوتا ہے، جب انہیں سارے لوگوں کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ یہودیوں کو اپنی سیاسی مملکت مل گئی۔ سلیمان کے دورِ حکمرانی کے بعد سلطنت ختم ہو گئی، کیوں کہ وہ زمانہ حق سے برگشتہ بادشاہوں کا تھا، یہ عہد 586 قبل مسیح میں یروشلم کی شکست پر تمام ہوا اور یہودی قائد یہاں سے جلاوطن ہو کر بابل چلے گئے۔

پانچواں عہد شروع ہوتا ہے، بابل کی قید کے دوران یہودا کی اس بشارت کے ساتھ کہ بالآخر جلاوطنی ختم ہوگی اور واپسی میں یروشلم کا مقدس معبد واپس مل جائے گا۔ وہ مسیحا کی

متوقع آمد کا زمانہ تھا اور اس توقع کا حامل تھا کہ خدا یہودیوں کو ان کی سابقہ امتیازی حیثیت واپس دلا دے گا۔ یہ عہد 70 سن عیسوی میں یروشلم [illegible]

چھٹے عہد میں یہودیوں کا وہ تجربہ شامل ہے جس کا تعلق [illegible] کے زمانے سے تھا۔ اس کا آغاز یہودیوں کے مذہبی پیشوا جوہانان سے ہوا جنہوں نے یروشلم کے انہدام کے بعد جمنیا میں ایک دینی اکیڈمی قائم کی تھی۔

ساتواں عہد تھیوڈر ہرزل کی صہیونی تحریک کی کامیابی سے شروع ہوا جس نے 1948 میں فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کی۔

پانچویں عہد کے آغاز سے یہ ہوا کہ گزشتہ زمانوں کے اوقات کو ایک مثالی تاریخ کے تصور کے ساتھ جوڑ کر اسے مستقبل کی متوقع تاریخ بنا دیا گیا۔ اس وقت جو یہودی پیش گوئیاں لکھی گئیں جو آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا ایک منظر نامہ پیش کر رہی تھیں، جو اس زمانے پر پہنچ کر ختم ہوئیں جب ایک مسیحا نے ظہور کیا اور زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کر دی گئی۔ اس کہانی کا دوسرا حصہ یہ ہوگا کہ مسیحا نمودار ہوں گے اور یہ واقعہ ابھی رونما نہیں ہوا، لہٰذا تاریخ لازمی طور پر تعطل کے مرحلے میں ہے۔ اس دوران میں بہت سی دلچسپ باتیں رونما ہوئی ہوں گی لیکن ان کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ عیسائیوں کی بھی یہی توقعات ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ مسیحا، عیسیٰ کے قالب میں دنیا کے اندر ظہور کر چکے ہیں۔ البتہ وہ اس پرشکوہ انداز سے ظاہر نہیں ہوئے ہیں جس کا بیان پیش گوئیوں میں ہے۔ مسیحی فرقے کے لوگ اب ان کے ''دوبارہ ظہور'' کے منتظر ہیں۔ جب عیسیٰ زندہ ہوں گے اور 'خدا کے بیٹے' کے ہونے کا انکشاف کریں گے اور تمام تر توقعات جو مسیحیوں کی ہیں، نہیں پورا کریں گے۔

مسیحا کہانی کا ایک کردار تھا۔ یہ کہانی آئندہ تاریخ کی ہے، جس کا علم عیسیٰ کو تھا اور اسے مکمل کرنے کے لیے پورے شعور کے ساتھ انہوں نے کام کیا۔ خدا کی بادشاہی کے اعلان کے دن، پیش گوئی رقم کرنے والوں کے مطابق خدا، اسرائیل کے دشمنوں پر اپنا عذاب نازل کرے گا اور یہودی قوم کو اس کی وہ شان و شوکت واپس دلا دے گا، جو اسے داؤد اور سلیمان کے زمانوں میں حاصل تھی۔ مسیحا، جو داؤد کے وارثوں میں سے ہوں گے، ان واقعات کے رونما ہونے میں خدا کے فرستادہ کے طور پر کام کریں گے۔ جب عیسیٰ نے کتاب مقدس میں کہا تھا، ''خدا کی بادشاہت تمہارے حوالے،'' تو ان کا مدعا یہ تھا کہ مسیحا کی پیش گوئیوں میں جو کچھ کہا گیا

تھا، وہ اب ظاہر ہونے کو ہے۔ مطلوبہ شرائط کو پورا کرنے کے لیے مسیحا خود اس کہانی میں داخل ہو رہے ہیں۔ { مسیحی پیشوا ایلیجاہ، جان دی بپٹسٹ (John the Baptist) کی شکل میں پہلے ہی واپس آ گئے ہیں} تاہم خدا کا گوشوارہ انسان کے بنائے ہوئے گوشوارے سے مختلف ہے۔ چنانچہ انسان آسانی سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ مسیحا نے کہا تھا کہ انسان کا فرزند یا مسیحا، فردوس کے بادلوں میں سوار پورے دبدبے اور شان وشوکت کے ساتھ ظہور کرے گا۔ انہوں نے جنگوں، زلزلوں اور قحط کی باتیں کی تھیں جو ''نئے دور کی پیدائش کے وقت دردِ زِہ'' کی علامتیں ہوں گی۔

یہ ہیجان خیز واقعات جن کا تذکرہ عیسیٰ نے کیا، دو تاریخی عہدوں کے درمیان خط تقسیم کی طرح ہوں گے۔ پہلے عہد میں عام تاریخی نوعیت کے واقعات ہوں گے۔ اس کے بعد کا عہد تاریخ کے بعد کا زمانہ ہوگا۔ جب زمین پر خدا کی مکمل بادشاہت قائم ہوگی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عیسیٰ کی وفات کے چھ سو سال بعد زمین پر تشریف لائے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ یہود کی روایت کے مطابق اور عیسیٰ کی طرح پیغمبر ہیں۔ یہ آسمانی ہستیاں مختلف زمانوں میں خدا کے پیغام لوگوں تک پہنچاتی رہیں۔ ایک پیغمبر سے دوسرے پیغمبر تک تاریخی زمانے گزرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود خدا کے پیغمبروں کے جاری کردہ پیغامات اس سے پہلے کی روایت پر کاربند رہنے والوں کے لیے عقیدے کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔ یہودیوں نے عیسائی تعلیمات کو رد کر دیا۔ عیسائیوں نے یہودیت کی مذہبی صداقت کو بس اسی وقت تک تسلیم کیا، جب تک عیسیٰ زندہ رہے، اس کے بعد انہوں نے یہودیوں کی اس بنا پر مذمت کی کہ انہوں نے خدا کے بیٹے کو مسترد کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے مسیحی اور یہودی دونوں کے عقائد کو الوہی تسلیم کیا۔ لیکن ان کے ماننے والوں کو اس کوتاہی کا مرتکب قرار دیا کہ انہوں نے زمین پر خدا کے آخری اور سب سے بڑے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام سے انکار کر دیا تھا۔ اس میں تاریخ کی ترقی کا عمل دیکھا جا سکتا ہے۔ خدا کا آخری پیغام بر سب سے اچھا ہے کیوں کہ یہ ماننے کے بعد کہ اس کا پیغام الہامی اور براہِ راست خدا کی طرف سے آتا ہے، لہٰذا وہ سب سے زیادہ موزوں اور ہر زمانے کے لیے مکمل پیغام ہوگا۔ زندہ تاریخ یہاں آ کر پھر بند ہو جاتی ہے۔ خدا کلام نہیں کرتا۔

حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانوں کے طویل عرصے بعد ایک اور طرح کے پیغمبر نے ظہور کیا، وہ ایک سیاسی معیشت دان تھے۔ ان کا نام کارل مارکس تھا۔ یہ

اعلان کرتے ہوئے کہ ''مذاہب عام لوگوں کے لیے افیون ہیں،'' اس معیشت دان نے بہرطور یہودی مذہب کے تاریخی نظریے کو تسلیم کر لیا۔ مارکس نے یہ دلیل دی کہ کسی معاشرے میں اقتصادی رشتے اس معاشرے کی سیاسی، ثقافتی اور روحانی زندگی پر حاوی ہوتے ہیں۔ ترقی اس وقت ہوتی ہے جب وہ رشتے تبدیل ہوتے ہیں، چنانچہ انسانیت اس طرح یکے بعد دیگرے مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی یہاں تک آئی ہے۔ پہلے درندگی کا زمانہ تھا، پھر بربریت کا اور وہاں سے تہذیب کا دور۔ تہذیب نے معاشروں میں اس طرح ترقی کی ہے کہ پہلے معیشتوں کی بنیاد غلامی پر تھی، پھر جاگیرداری آئی اور پھر وہ معاشرے جن کی بنیاد سرمایہ داری نظام پر تھی۔ مزید اور آخری ترقی سرمایہ داری سے آگے سوشلسٹ نظام ہے۔ پرتشدد بغاوتیں اور سماجی اتھل پتھل تبدیلی کے مرحلے میں ظاہر ہوں گی۔ جس طرح انقلاب فرانس کی بدولت جاگیرداری، سرمایہ دارانہ معیشت میں داخل ہوئی، اسی طرح ایک خونی انقلاب آئے گا اور سرمایہ داری سوشلسٹ سوسائٹی کو راستہ دے کر ہٹ جائے گی۔ سوشلسٹ سوسائٹی کی پرامن سرگرمیاں تاریخ کے آخری عہد کی تکمیل کریں گی۔

ایک انقلابی واقعہ اس وقت رونما ہوا جب 1917 میں لینن اور اس کے ماننے والوں نے روس میں سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ بالشویکوں نے پرانے نظام کو ختم کر دیا اور معاشرے کی تشکیل سوشلسٹ اصولوں پر کی۔ یوم آخرت کا یہ مارکسی متبادل تھا۔ نظریاتی طور پر ایک ''بادشاہت'' مکمل طور پر اور ہمیشہ رہنے والی اس معاشرے کی صورت میں پیدا کر لی گئی تھی، جس کی حکومت معیشت کو سائنسی اصولوں کے مطابق جاری رکھنے کی پابند تھی۔ یہاں خدا کی مرضی نہیں بلکہ سائنس کی حاکمیت اس امر کی ضمانت دے گی کہ مارکس اور اینگلز کی پیش گوئی درست ہے۔ اب خدا کی رضامندی سے نہیں بلکہ دنیا کے نظام میں تبدیلی کے باعث حکومتوں میں طوفان خیز ردوبدل دیکھا گیا۔ لینن ایک سیکولر مسیحا تھا۔ اب عہد ساز تبدیلیوں پر اس کا حکم چلتا تھا۔ مارکسزم کے مقلدین کی بدقسمتی سے روسی انقلابیوں کو اپنے نظریے کو رُوبہ عمل لانے کا موقع مل گیا۔ لینن کو یہ بات زیادہ قرین مصلحت نظر آئی کہ سرمایہ داری نظام کی ترغیبات کے ذریعہ گرتی ہوئی سوویت معیشت کو سہارا دے۔ سٹالن نے سوشلسٹ نظام کو نافذ کرنے کے لیے خوف اور دہشت کے طریقے استعمال کیے۔ پھر یہ ہوا کہ یہ نظام پیداواری نااہلی، اسلحہ بندی اور روحانی زوال کی دلدل میں پھنس کر رہ گیا۔ کمیونسٹ ریاست 75 سال بعد روس میں ختم ہو گئی۔ ظاہر ہوا کہ سوشلزم معاشرے کی آخری منزل نہ تھی بلکہ سرمایہ داری کے واپسی سفر کا ایک

مرحلہ تھا۔

تاریخی ترقی کے بارے میں ہیگل کا نظریہ

مارکسزم کی تاریخ پر ایک گہرا اثر جرمن فلسفی ولیم فریڈرک ہیگل کا تھا۔ وہ 1820 کے عشرے میں برلن یونیورسٹی میں لیکچر دینے پر مامور تھا۔ مغرب کے مثالیت پرست فلسفوں کو ہیگل کی فکر نے ایک تاریخی وسعت عطا کی۔ افلاطون اور ارسطو کی طرح ہیگل کا موقف بھی یہ تھا کہ استدلال، دنیا میں ہونے ولے واقعات پر اپنی گرفت رکھتا ہے۔ لیکن دونوں سے الگ اس نے اپنی بصیرت سے یہ دیکھا کہ خیالات یا ان کے دنیاوی مظاہر کو جب عمل میں لانے کی کوشش کی گئی تو اس عمل کے دوران میں کچھ سے کچھ ہو گئے، عالمی تاریخ میں خیالات کے اندر ترقی نظر آتی ہے۔ ہیگل کا موَقف یہ تھا کہ معاشرے کے مختلف ادارے تاریخی جبر کے نتیجے میں ایک منطقی عمل کے تحت قائم ہوئے۔ دنیا کی تاریخ، اداروں کی ترقی اور ان کی حرکی قوت کے نتیجے میں جو ایک جدلیاتی منطق سے پیدا ہوئی، آگے بڑھتی آتی ہے۔ اس منطق کی بنا پر جو مقاصد حاصل کیے جا چکے ہیں، وہ نئے مقاصد پیش کر دیتے ہیں جو اسے مخالف سمت میں کھینچتے ہیں۔ دنیا میں جب ایک مقصد کا خیال اپنی تکمیل کر لیتا ہے تو اس خیال کی نفی کرتے ہوئے ایک مخالف خیال جنم لیتا ہے۔ یہ دونوں عمل ایک ساتھ چلتے ہوئے ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ کارل مارکس نے اس یقین کی بنیاد پر کہ معاشرے کی مادی صورت حال ہی خیال پر اپنی گرفت رکھتی ہے، ہیگل کی جدلیات کو جدلی مادیت کے فلسفے میں منتقل کر دیا۔

دُنیا کی تاریخ پر ہیگل کے خیالات ''فلاسفی آف ہسٹری'' میں نمایاں ہوئے۔ یہ کتاب ہیگل کے 1822 کے لیکچرز پر مبنی ہے۔ اس کے خیال کے مطابق تاریخ کے سرکردہ کردار وہ افراد تھے، ''جن کے اپنے مخصوص مقاصد، ان وسیع تر مسائل سے جڑے ہوتے ہیں، جو دنیا کی روح ہیں۔'' وہ لوگ جانتے تھے کہ کون سے تاریخی امکانات ان کے وقت میں ''ترقی کے لیے موزوں ہیں۔'' ہیگل نے یہ دیکھا کہ دنیا کی تاریخ ایک ایسی صورتِ حال کی جانب ترقی کرتی ہوئی بڑھ رہی ہے، جو انسانی معاشرے کی آزادی سے عبارت ہے۔ ''دنیا کی تاریخ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آزادی کا شعور مسلسل رُوبہ ترقی ہے،'' یہ ہیگل کے الفاظ ہیں۔ وہ ایک جرمن قوم پرست تھا، اس نے لکھا کہ '' دنیا کی تاریخ مشرق سے مغرب کی جانب سفر کر رہی ہے، کیوں کہ یورپ ہی یقینی طور پر تاریخ کی آخری منزل ہوگا۔'' ہیگل نے دنیا کی تاریخ کو چار عہدوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ (1) ایشیا (2) یونان (3) روم اور (4) جرمنی۔ ''رومن'' یا

''کرسچین'' ادوار کو اس نے عیسیٰ اور شارلیمین (Charlemagne) اور شارلیمین اور مارٹن لوتھر کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ پھر جرمن عہد میں شامل مارٹن لوتھر اور انیسویں صدی کا درمیانی عرصہ شامل تھا۔ ہیگل کو یقین تھا کہ جرمن تہذیب گزشتہ تہذیبوں کے مقابلے میں برتر ہے کیوں کہ اس نے اعلیٰ ترین درجے کی آزادی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ یونان اور روم کی معاشرتی بنیاد غلامی پر تھی اور ان معاشروں کے لوگ صرف چند لوگوں کے لیے آزادی کی ضرورت سے واقف تھے۔ موجودہ زمانے کے جرمن وہ لوگ پہلے ہیں، جنھوں نے یہ جان لیا کہ ''انسان آزاد ہے'' اور آزادی ہی تاریخ کا منتہا ہے۔

ہیگل کا فلسفہ اس یقین پر قائم ہے کہ ایک عالمی دماغ دنیا کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور اسے نئی نئی اشکال میں ظاہر کرتا ہے۔ ان اشکال کا کسی جگہ ایک مستقل وجود ہے۔ اس بارے میں ہیگل کا منصوبہ افلاطون کے فلسفے کی طرح ہے، البتہ افلاطون کو انسانی معاشروں کی بدلتی ہوئی صورت حال سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہیگل وہ پہلا شخص تھا جس نے تاریخ کے اندر کام کرنے والی سماجی فعالیت کو پہچان لیا تھا۔ اس کا فلسفہ تاریخ کی ترقی کا خیال پیش کرتا ہے۔ چونکہ دنیا کے بارے میں ہیگل کا ذہن عالم گیر ہے لہٰذا اس کے طریقے چینی، پیرو اور مغربی یورپ غرضیکہ ہر مقام کے لیے موزوں ہیں۔ خدا کی طرح اس کا دماغ بھی ایک مکمل عالمی تاریخ کو پیدا کرنے پر قادر ہے۔ کیوں کہ خیالات کو ختم نہیں کیا جا سکتا لہٰذا دنیا جب خیالات سے بھر جاتی ہے تو مزید خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ترقی کا عمل ایک ہی سمت میں چلتا ہے اور جب انسانی معاشرے میں نئے پیدا ہونے والے خیالات کی طاقت کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور محسوس ہونے لگتا ہے تو اس میں موڑ آ جاتے ہیں۔ جب ایک یا کوئی دوسرا نظام افکار غالب آ جاتا ہے تو اس کو تاریخی عہد سے پہچانتے ہیں۔ ہیگل کی تاریخ اگرچہ مصروفیت کے لبادے میں نظر آتی ہے، لیکن یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی مذہبی تاریخ ہے۔ لہٰذا اس میں علاقائی اور لسانی عصبیت کے شامل ہونے کا امکان رہتا ہے۔

تاریخ کے دہرائے جانے کا عمل اور اس بارے میں نظریات

اگر تاریخ دان خدا کا قائل نہیں یا ایسے عالمی دماغ کو تسلیم نہیں کرتا جو عالمی ادارے تخلیق کرتا ہے تو پھر اس امر کی ضمانت نہیں کہ دنیا کی تاریخ ایک ہی راہ پر چلتی جائے گی۔ پھر تو تاریخی ترقی کے تصور کی بنیاد بہت ہی بور ہو گی۔ تاریخ دان زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ الگ الگ تہذیبوں کی تاریخ جو ماضی میں پیدا ہوئی اور فنا ہو گئیں، انہی کو بیان کر دے۔

''لاحاصل، لاحاصل اور محض لاحاصل ... جو کچھ رونما ہو چکا ہے، وہی آئندہ بھی ہو گا۔ جو کچھ انجام پا چکا ہے، وہی پھر انجام پائے گا۔ آسمان تلے کچھ بھی نہیں۔'' یہ الفاظ ایک نہایت دنیا شناس کلیسائی بزرگ کے ہیں۔ صرف احمق لوگ ہی اس بات پر یقین کریں گے کہ اس وقت انہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے اس کا تجربہ پہلی بار ہوا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آج جو بھی خیال یا طرزِ عمل نظر آتا ہے، تقریباً وہ سب کچھ ابتدائی معاشرے میں رونما ہو چکا تھا۔ دوسری طرف موجودہ زندگی کے حالات ماضی سے مختلف نظر نہیں آتے۔ پھر کون سا نظریہ درست ہے؟ کیا انسانی معاشرہ مسلسل نئے اور پہلے سے زیادہ حساس اور پیچیدہ نوعیت کے ادارے تخلیق کرتا ہے یا دنیاوی تجربے ایک ہی دائرے میں معلوم انداز سے اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں۔

مشرق میں مذہب کے نظریے کی رو سے ایک فرد کا دنیاوی وجود ایک ہی روح کے ساتھ برقرار رہتا ہے، زندگی ایک پہیے کی طرح گھومتی رہتی ہے۔ یہ خام خیالی اور مصائب کا پہیہ ہے۔ مذہب پر عمل اس لیے کیا جاتا ہے کہ اپنی روحانی بصیرت یا خدا سے براہِ راست معاملے کے تجربے بار بار ہونے اور کرما کے چکر سے چھٹکارا مل جائے۔ اس نقطۂ نظر کی بنا پر دنیا کی تاریخ، لوگوں کے لیے کوئی بڑا تشویش انگیز مسئلہ نہیں۔ اگر عالمی واقعات ایک ہی دائرے میں رونما ہوتے رہتے ہیں تو جو کچھ بھی ایک خاص دائرے کے اندر رونما ہو گا، بہت زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہو گا۔ پھر تو زندگی کی سب سے دلچسپ تحریر یہ ہو گی کہ کسی امکان کے تحت اس مسلسل گھومتے ہوئے چکر سے چھلانگ لگا کر آدمی باہر آ جائے اور اس کائنات کے سفر میں شامل ہو جائے۔

ایڈورڈ گبن کی کتاب ''رومن سلطنت کے عروج و زوال کی تاریخ'' 1776 اور 1788 کے درمیان چھ جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے یہ خیال پیش کیا کہ دنیاوی حکومتیں انجام کار بداعمال ہو کر ناکام ہو جاتی ہیں۔ جب لوگ تاریخ کے سبق کا حوالہ دیتے ہیں تو معمول کے انداز میں ان کا اشارہ اس طرف ہوتا ہے کہ ماضی اور حال کے درمیان متوازی معاشرے موجود ہیں، جیسا کہ روم کا معاشرہ تھا، جو منہدم ہو کر صفحۂ ہستی سے نابود ہو گیا اور اب خود ان کا معاشرہ اخلاقی زوال کے اس مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ شاید موجودہ معاشرہ اس تاریخی انتباہ کو سن لے اور اس تباہی سے بچنے کے لیے کوئی تدبیر کرے، اس سے پہلے کہ بہت تاخیر ہو چکی ہو۔ گبن کو یقین تھا کہ مسیحیت نے رومن اخلاقیات کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن اس

حقیقت نے بھی مسیحی مبلغین اخلاق کو مذہبی عقیدے کے زوال پر گریہ کرنے سے باز نہیں رکھا۔ روم کی مثال نے کہ ایک تہذیب کس طرح فنا ہوگئی، مغربی ذہنوں پر زمینی کلچر کے ناپائیدار ہونے کا گہرا اثر ڈالا۔ عالمی تاریخ ایک طرح کا باغیچہ بن گئی ہے جس میں گزشتہ اور موجودہ تہذیبوں کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔

سپنگلر کی تاریخ

جرمن مؤرخ آسوالڈ سپنگلر نے بیسویں صدی کے اوائل میں تاریخ کے بار بار دہرائے جانے کا خیال پیش کیا اور اسے شہرت دی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ تمام نمو پذیر اشیا کی طرح انسانی معاشرے کی زندگی کا بھی ایک چکر ہوتا ہے جس طرح ایک فرد پختگی کی عمر کو پہنچتا ہے اور بوڑھا ہوتا ہے، اس طرح پورے کلچر میں یہ تجربہ نظر آتا ہے کہ پکنے کی حالت کو پہنچ کر اس وقت مر جاتا ہے جب اس کے خواص میں مزید امکانات باقی نہیں رہتے۔ اس نے اپنا نظریہ ''مغرب کا زوال'' (Decline of the West) نامی کتاب میں پیش کیا اور یہ بتایا کہ مغربی تہذیب اس مرحلے کو پہنچ گئی ہے۔ سپنگلر کا مقصد تاریخ کے تجزیے کا ایک نیا طریقہ پیش کرنا تھا جسے اس نے تاریخ کی شکلیات (morphology) کا نام دیا تھا۔ اس تجزیے کا طریقہ یہ تھا کہ انسانی معاشروں کو اس وقت سمجھا جا سکتا ہے اور ان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ جب یہ معلوم ہو کہ ان کے نشر و ارتقا کے مختلف اوقات میں ان کی تہذیبی شکلیں کیا تھیں۔ اگرچہ معاشرے کی مخصوص شکلیں، مختلف تہذیبوں میں مختلف ہوسکتی ہیں، لیکن زندگی کے چکر (life circle) کے حوالے سے وہ ہم شکل یا ''معاصرانہ'' ہوسکتی ہیں۔ سپنگلر نے کہا، ''عام طور پر یہ معلوم ہے کہ عالمی تاریخ کے اظہار کی شکلیں گنی چنی ہیں، وہ ہیں زمانہ، عہد، صورتِ حال، شخصیات جو اپنی اصل کے مطابق ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں۔'' سپنگلر ان مورخوں کی تحقیر کرتا تھا، جن کے خیال میں عالمی تاریخ ترقی کر رہی ہے۔ اس نے لکھا، ''وہ (مورخ) ایک کیچوے کی طرح ہیں، جو بڑی تن دہی سے اپنے اوپر ایک کے بعد دوسرا عہد لادتے جا رہے ہیں۔ اس کی بجائے انسانی تہذیبیں مختلف طرح کے پوروں یا حیوانی زندگی جیسی ہیں۔ اس نے بڑے یقین سے کہا میں اس کی بجائے ایک خالی موہوم شے، یک رخی تاریخ کا ایک جز متعدد عالی شان تہذیبوں کا ڈراما، اپنے جنم دینے والے علاقے کی مٹی سے پھوٹتا ہوا اور ہر تہذیب اپنی خلقی توانائی کے ساتھ پُر جوش انداز میں ابھرتی ہوئی اور زندگی کے دائرے میں مضبوطی کے ساتھ جڑی ہوئی اپنے مادی وجود کا اثبات کرتی ہوئی اپنے انسان

ہونے کا اور اپنے امیج کا ثبوت دیتی ہوئی —— ہر تہذیب کے اپنے نئے امکانات ہوتے ہیں۔ جو ابھرتے ہیں، پختہ ہوتے اور پک جاتے ہیں۔ پھر سڑ گل جاتے ہیں اور دوبارہ واپس نہیں آتے۔ کوئی ایک مجسمہ ایسا نہیں، کوئی ایک پینٹنگ نہیں، ایک ریاضی `ایک فزکس نہیں، بلکہ تعداد میں کئی ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اصل نہیں دوسروں سے الگ اپنی زندگی کے دورانیے میں مختلف اور خود مکتفی، جیسے مختلف پودوں میں سے ہر ایک کے پھولنے اور پھلنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں اور ان کے بڑھنے اور انحطاط پذیر ہونے کے مخصوص قرینے ہیں۔''

جسمانی زندگی کے اس چکر سے سپنگلر نے یہ نتیجہ نکالا کہ کلچر (ثقافت) اور سولائزیشن (تمدن) میں فرق ہے۔ اس نے لکھا، ''ایک کلچر تو اسی وقت پیدا ہو جاتا ہے جب ایک عظیم روح طفلانہ انسانیت کی ابتدائی ہیئت سے باہر نکلتی ہے اس کے وجود سے اپنے آپ کو الگ کر دیتی ہے۔ پھر پودے کی طرح ایک مخصوص زمین میں پھوٹتی ہے اور پودے ہی کی طرح اس سے پیوست رہتی ہے اور جب روح اپنی حقیقت، حالات اور اپنی وجود کی صفات پوری کر چکی ہوتی ہے تو اپنی اصل روح کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔ جب ایک مقصد پورا ہو چکا ہو تو کلچر میں اچانک سختی آ جاتی ہے، یہ گلنے سڑنے لگتا ہے، اس کا خون منجمد ہو جاتا ہے، تب ایک تہذیب وجود میں آتی ہے۔ وہ شے جسے ہم مصر، بائزنٹائن اور منڈارن سے منسوب کرتے ہیں، اسے محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ اس طرح یہ کچھ یوں محسوس ہوتا گویا کسی ابتدائی زمانے کا جنگل ہو، جس سے سوکھی ٹہنیاں، سینکڑوں یا ہزاروں سال سے آسمان کی طرف رخ کیے کھڑی ہوں۔'' مغرب کے مستقبل کے بارے میں سپنگلر کا انداز اس یقین کی بنیاد پر تھا کہ یورپ کا معاشرہ تہذیب کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کی تخلیقی توانائی بروئے کار آ چکی ہے۔ یہ کلاسیکی عہد کا یونان یا قدیم یورپ نہیں بلکہ یہ زمانہ ایک قریب المرگ سلطنت کا ہے۔ لندن کے بنک نہایت جچے تلے اور فیصلہ کن انداز سے معاشرے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔ اب ایک ہی امکان پورا ہونے کو رہ گیا ہے —— مکمل فنا۔

ٹوائن بی کا نظریہ تہذیب

سپنگلر کی تاریخ علاقائی عصبیت پر مبنی نہ تھی۔ مغرب کا کلچر مختلف طرز کے کلچرز میں سے ایک تھا، جو دنیا کی تاریخ میں نمودار ہوا۔ سپنگلر نے اسے دوسروں سے بہتر یا منفرد نہیں سمجھا بلکہ مختلف قرار دیا۔ اسے اسٹڈی آف ہسٹری (ایک مطالعۂ تاریخ) کے برطانوی مصنف آرنلڈ ٹوائن بی نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ایک مرتبہ تو وہ سپنگلر کی ''شعلہ افگن تاریخی بصیرت'' سے مرعوب

ہو گیا تھا اور یہ سوچ کر حیران تھا کہ ''قبل اس کے کہ سوالات میرے ذہن پر ابھی پوری طرح مرتب بھی نہ ہوئے تھے سپنگلر نے میری ساری چھان بین ٹھکانے لگا دی۔'' اس نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ تہذیبوں کی متوازی تاریخیں ہو سکتی ہیں، لیکن سپنگلر کے اس طریقہ کار سے اختلاف کیا کہ پہلے سے طے شدہ تمثیلات کو تاریخ کے آہنی اصول مان لیا جائے۔ ٹوائن بی نے فرض کیا کہ اس میں عالمانہ فکر کے اندر قومی روایات کا عکس ملتا ہے، جہاں جرمنی کا ایک راہبانہ انداز بے نتیجہ نظر آیا وہاں اب دیکھنا ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کیا کر کے دکھاتی ہے۔ اس نے کہا

ٹوائن بی نے اس تجویز سے اپنے دلائل کا آغاز کیا کہ تاریخی مطالعہ کا قابل فہم پہلو نہ تو ایک قومی ریاست کا مطالعہ ہے، نہ اجتماعی طور پر پوری نسل انسانی کا بلکہ لوگوں کے ایک مخصوص گروہ کا مطالعہ ہے، جسے معاشرہ کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ایک معاشرہ مختلف انسانی برادریوں کے لیے ''ایک مشترکہ میدان'' مہیا کرتا ہے۔ جہاں مختلف پیشوں سے وابستہ لوگ مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ تہذیبیں، وہی معاشرے تھے، جو بلند ہو کر ایک خاص سطح پر پہنچ گئے۔ اپنی کتاب مطالعہ تاریخ میں اس نے اسی طرح کے معاشروں کی نشان دہی اور ان کا جائزہ لیا ہے۔ اس نے تہذیبوں کی اکیس (21) مثالیں دریافت کیں۔ (ملاحظہ کیجئے میزانیہ ایک تا پانچ) اکیس (21) تہذیبوں میں سے آٹھ ابھی تک موجود ہیں اور تیرہ فنا ہو چکی ہیں۔ ٹوائن بی نے یہ تسلیم کیا کہ عالمی تاریخ میں وہ معاشرے شامل ہیں جو تہذیبیں نہیں بن سکے۔ مثلاً آئر لینڈ اور نستوری عیسائی جو محض ''ناکام'' تہذیبیں بن سکے۔ کچھ دوسروں میں جزائر پولینیا اور اسکیمو کے کلچر شامل ہیں جو ''مقید'' تہذیبیں ہیں۔ اس طرح کے متعدد معاشرے میں جنہیں ٹوائن بی نے ''ابتدائی تہذیب کے معاشرے'' کہا ہے۔ علم بشریات کی ایک جمعیت نے 1915 میں 650 مختلف معاشروں کا شمار کیا تھا۔

ابتدأ یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب معاشرے وہ تھے، جنہیں زیادہ زرخیز مٹی، زیادہ عالی دماغ لوگ، زیادہ ترقی پذیر ٹیکنالوجی اور ایسے ہی سودمند اسباب میسر تھے۔ ٹوائن بی نے یہ معلوم کیا کہ معاشروں نے قدرتی فائدوں کی بدولت خوش حالی حاصل نہیں کی، بلکہ کامیابی کے ساتھ چیلنج کا مقابلہ کر کے جو تجربے حاصل کیے ان کی بدولت خوش حال ہوئے۔ مثال کے طور پر مصر اور میسو پوٹیمیا کی ابتدائی تہذیبوں کو برفانی زمانے کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ برفانی عہد کے آخری سال گزر رہے تھے۔ زمین سوکھنے لگی تھی، چنانچہ

گوشوارہ 1-5 Table 1-5

ٹوائن بی کی بیس تہذیبیں

نام	جگہ	آغاز
مصری	مصر	4000 B.C. سے قبل
سمیرین	عراق	3500 B.C. سے قبل
میوین	کریٹ اور قبرص	3000 B.C. سے قبل
حِتّی	ترکی	1500 B.C. سے قبل
بابلی	عراق، شام	1500 B.C. سے قبل
سیرین	شام	1100 B.C. سے قبل
حلّین	یونان، ترکی	1100 B.C. سے قبل
مغربی کرسچین	مغربی یورپ	700 A.D. سے قبل
آرتھوڈاکس کرسچین	ترکی اور بالکنز	700 A.D. سے قبل
روسی آرتھوڈاکس	روس	دسویں صدی عیسوی
عربی	عرب	1300 عیسوی سے قبل
ایرانی	فارس	1300 عیسوی سے قبل
چینی	چین	1500 A.D.
ہندی	ہندوستان	1500 A.D.
بعید مشرقی	چین	500 A.D. سے قبل
جاپانی	جاپان	500 A.D. کے بعد
ہندو	ہندوستان	800 A.D. سے قبل
مایان	وسطی امریکا	500 B.C سے قبل
اینڈین	پیرو	پہلی صدی عیسوی
یوکیٹک	میکسیکو	629 A.D. کے بعد
میکسیکن	میکسیکو	629 A.D. کے بعد

Source: Arnold Toynbee, A Study of History, Oxford Univ. Press, 1956. Reprinted by permission of Oxford University Press.

پہلے جہاں گھاس کے ہرے بھرے قطعات تھے، وہ اب ریگستان میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اس چیلنج کے مقابلے میں انہوں نے آب پاشی کے نظام کی تعمیر کی جس سے کھیتوں کو پانی ملنے لگا۔ اس طرح وہ آبادیاں جو وحشی قبائل کی سرحدوں پر آباد ہیں یا مختلف معاشروں کے درمیان رہتی ہیں، انہیں اکثر کارنامے انجام دینے کی تحریک ہوئی۔ تہذیب کے ابتدائی دور کے معاشرے دوسری طرف ایک ہی ڈھرّے پر چلتے رہے اور اس سے مطمئن تھے۔ چونکہ ان کے پاس تبدیلی کی کوئی وجہ نہیں تھی اس لیے ان معاشروں پر رسوم و رواج کی ایک موٹی کھال جمتی چلی گئی۔ اگرچہ یہ بھی ہے کہ جو معاشرہ شدید حالات سے دوچار ہوتا ہے وہ یا تو پس ماندہ رہ جاتا ہے یا مشکلات کی تاب نہ لاکر تباہ ہو جاتا ہے۔

زمانہ قبل از مسیح کے حالات زندگی کو فطرت کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ تمثیلی پیرائے میں اسے باغِ عدن سے مماثل بیان کیا جا سکتا ہے، جہاں زندگی نہایت متوازن اور مکمل تھی۔ تب اس دنیا میں ایک نیا عنصر داخل ہوتا ہے تاکہ دنیا کے توازن کو برہم کر دے اور بحالی کے ایک عمل کا آغاز کر دے۔ یہ واقعہ ''خدا کی کائنات میں شیطان کی دراندازی'' کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر خدا کی قبل از تاریخ کی دنیا متوازن اور مکمل ہے تو تاریخ کے زمانے غیر متوازن اور محض شر ہیں۔

وہ ایک ایسی حرکی توانائی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو نادرست کو درست کرنے کی ضرورت کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ تاہم ایک نسبتاً کم مکمل اور تہذیب یافتہ معاشرے لازمی طور پر تاریخ سے قبل کے معاشروں پر غلبہ پا لیتے ہیں اور وہ اس لیے کہ تخلیقی جدوجہد کے طویل تجربے نے ان معاشروں علم اور طاقت دونوں فراہم کی ہیں تاکہ وہ عناصر فطرت کو اپنا تابع بنا لیں اور دوسری انسانی آبادیوں پر فتح یاب ہوں۔ بائبل کی کہانی میں قابیل اور ہابیل اسی عمل کا مرقع پیش کرتے ہیں۔

اوائل تہذیب سے موجودہ تہذیب تک کے سفر کو ٹوائن بی تمثیلی انداز سے بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھا: ''ابتدائی معاشرے کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو ایک پہاڑ کے چھجے پر کاہلی سے پڑے ہیں۔ نیچے ایک پھسلواں راستہ ہے، اوپر بھی پھسلواں راستہ ہے۔ تہذیبیں انہی سوئے ہوئے لوگوں کی مانند ہیں جو ابھی ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے ہیں اور عمودی پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا ہے۔ ابتدائی معاشرے جینیاتی طور پر جب تہذیبوں میں منتقل ہوتے ہیں تو یہ جامد سے متحرک حالت کی جانب منتقلی ہوتی ہے۔'' اس عمل کو قدیم چین

کے فلسفیوں نے سمجھ لیا تھا، انہوں (چینی دانش وَروں) نے اس حرکت، تعطل اور حرکت کو ین اور یانگ کے اصطلاحی معنوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔ ین حرکت نہیں کرتا اور یانگ متحرک رہتا ہے۔ چینی معمول کے مطابق ین کا نام پہلے لیا جاتا ہے اور ہم اپنی بصیرت کے دائرے میں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری نسل کا انسان جو تین لاکھ سال قبل ابتدائی انسانی فطرت کے دہانے پر پہنچ گیا اس عہد کا 98 فیصد زمانہ آرام سے گزار دیا اور اس سے پہلے کہ یانگ کی تہذیبی سرگرمی کا آغاز ہوتا۔

سپنگلر کی طرح ٹوائن بی بھی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ تہذیبیں زندگی کے چکر سے گزرتی ہیں اور بعض واقعات دوبارہ رونما ہوتے ہیں۔ ان کے معاشرے لازمی طور پر خانہ بدوش قبائلی زندگی سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ خانہ بدوش ایک علاقے میں داخل ہوتے ہیں اور پھر وہیں ڈیرہ ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب کوئی تہذیب زمین بوس ہو جاتی ہے تو اس کے سماجی ملبے سے کوئی خانہ بدوش قبیلہ پھر نکل آتا ہے۔ عام طور پر ''مصیبتوں کا وقت'' آتا ہے، جب نئے معاشرے پر دباؤ پڑتا ہے۔ تہذیبیں اس وقت ایک سیاسی مملکت کے روپ میں ''آفاق گیر حیثیت'' اختیار کر لیتی ہیں اور کئی سال تک امن قائم رکھتی ہیں۔ بالآخر یہ مملکت زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد بدنظمی کا ایک دور شروع ہوتا ہے اور پھر ایک نیا نظم و ضبط کا دور۔ شکست خوردہ معاشرے سے پیدا ہونے والا ایک مذہب ایک ایسا تہذیبی ڈھانچا فراہم کرسکتا ہے جس سے دوسری تہذیب پیدا ہوسکتی ہے۔ ٹوائن بی اس عمل کا مقابلہ اس کیڑے کی ابتدائی شکل سے کرتا ہے جو مرتے ہوئے کیڑوں کو لاروا سے جوڑ دیتی ہے اور جو دوسری نسل میں ظاہر ہوتا ہے۔ روما سلطنت کے آخری دَور میں جب کہ معاشرہ قریب مرگ تھا، مسیحی کلیسا نے اس کے اور مغربی یورپ کی بادشاہت کے درمیان اس طرح رابطے کا کام کیا۔ اسی طرح کا واقعہ چین میں رونما ہوا جب بودھ مت جنوب مشرقی ایشیا میں پھیل گیا اور ہن سلطنت کو اپنے عقیدے میں ضم کر لیا۔

ٹوائن بی کے بیان کے مطابق اکیس تہذیبیں پشتوں سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں، جیسے ترتیب وار شجرے لکھے جاتے ہیں۔ اس نے لکھا کہ ''تاریخ میں تسلسل اس طرح نہیں ہوتا، جیسے کسی ایک فرد کی زندگی میں ہوتا ہے۔ یہ اس طرح کا تسلسل ہے جو یکے بعد دیگرے کئی پشتوں کی زندگی سے مل کر مرتب ہوتا ہے، کچھ اس طرح کہ اس کا مقابلہ جو ایک بچے کا اپنے والدین سے ہوتا ہے۔'' ٹوائن بی نے یہ بات محسوس کی کہ تمام معروف تہذیبیں تین

''نسلوں'' تک برقرار رہیں۔ پہلی نسل کا معاشرہ تو وہی ہوگا، جس کے سامنے کوئی مثال نہ تھی اور وہ جو کچھ بنا، اپنی ہی کوشش سے بنا۔ کچھ عرصہ بعد وہی معاشرہ وحشی قبائل کے حملے اور لوٹ مار کا شکار ہو کر غائب ہو جائے گا۔ دوسری نسل کے معاشرے منہدم معاشروں کے ملنے سے ابھرتے ہیں اور ان میں اکثر وہی وحشی قبائل شامل ہو جاتے ہیں، جو پہلے معاشرے کی تباہی کے ذمہ دار تھے۔ تیسری نسل کے معاشروں میں یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔
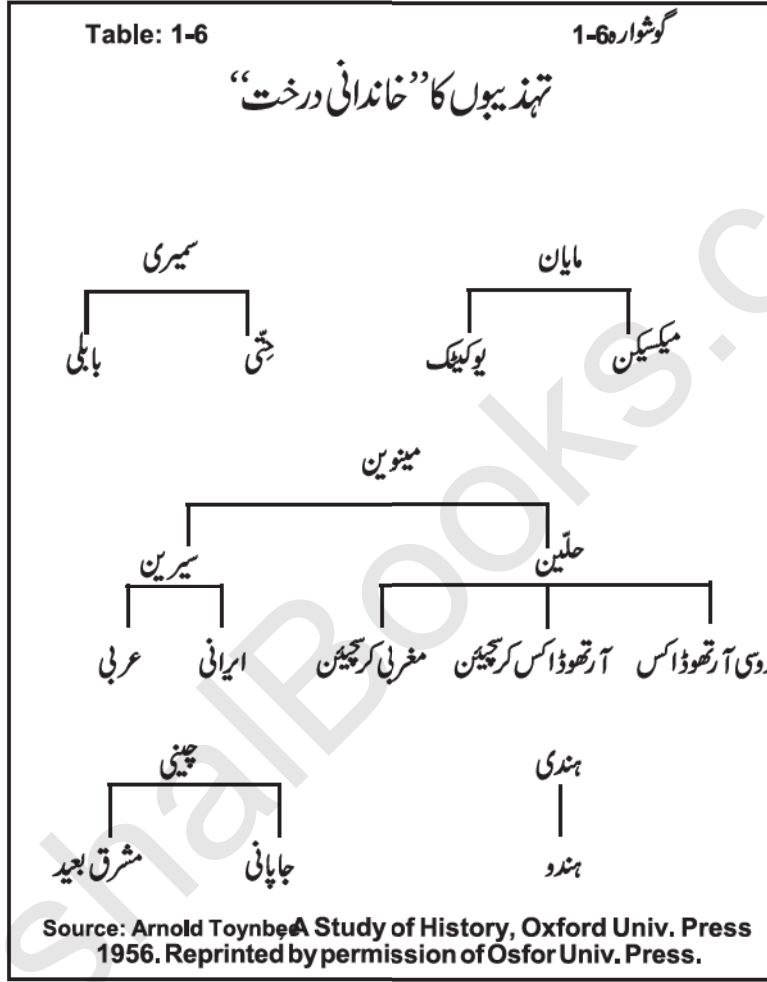
سولھویں صدی قبل مسیح میں جب سمیری تہذیب ختم ہوگئی تو حِتّی اور بابل کی تہذیبوں

نے ان کی جگہ لے لی، جن کی نسل سے وہ اٹھی تھیں۔ سمیرا معاشرے کی ملحن متوی تہذیب، سیریاک اور ہیلنک تہذیبوں کی مورث اعلیٰ تھی، منویٰ کے لوگ بحری سیاح تھے۔ کریٹ اور ہمسائے کے جزیروں میں آباد تھے۔1200 قبل مسیح میں وحشی لوگوں کے ایک اچانک حملے نے ان کو زیر کرلیا۔ ہیلنک تہذیب کوانہی لوگوں کے وارثوں نے تعمیر کیا، جوایگیئن سمندر کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ سیریک معاشرہ تقریباً اسی زمانے میں ان لوگوں نے تعمیر کیا جو بحر روم کے مشرقی کنارے پر آباد تھے، ان میں داؤد اور سلیمان کی یہودی بادشاہتیں، لبنان اور شمالی افریقی (کارتھیج) کی آبادیاں شامل تھیں، جن کو سائرس نے بسایا تھا۔ اس معاشرے کو تاخیر کے ساتھ ایک عالمی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینوں نے اپنی ریاست تعمیر کی۔ سکندراعظم کی فتوحات کے نتیجے میں ہلینک تہذیب ایشیا اور افریقا کے ذریعے سے دور تک پھیل گئی۔ روما والوں نے بھی بعد میں اسے قبول کرلیا۔

سیریا کا معاشرہ، تیسری پشت کے ان دو معاشروں کا مورث تھا، جو اسلامی مذہب کے تحت وجود میں آئے۔ سیریک اور ہلینک (یا یونانی ورومن) معاشروں نے بہم مل کر مسیحیت کو جنم دیا، جس نے بعد میں تین پشتوں کے معاشروں کی نشوونما کی۔ پرانی دنیا کی باقی تہذیبوں میں جو آج بھی زندہ ہیں اور ایشیا میں موجود ہیں، پہلی پشت کی دو دیگر تہذیبوں، انڈک اور سنیک (Indic and Sinic) کے بطن سے پیدا ہوئیں، دونوں عالمی مذاہب کی پیدا کردہ ہیں، جن کا تعلق ہلینک تہذیب سے ان کی تہذیب کے نازک مراحل میں رہ چکا تھا۔ مشرق بعید میں بودھ مت جو چین اور جاپان میں پھیلا ہوا تھا، ان بودھ تعلیمات سے مختلف تھا جو بیکٹر یا اور شمالی ہندوستان کی کشن سلطنت میں پائی گئیں۔ موجودہ ہندو مذہب بھی بہت سے مذاہب کے تہذیبی ملاپ کی پیداوار ہے۔ نئی دنیائیں، انڈیان اور مایائن معاشرے میں پہلی پشت کی تہذیبیں تھیں۔ مایان معاشرہ یوسیٹو اور میکسک تہذیبوں کا وارث تھا، جسے اسپین کے فاتح لشکروں نے سولھویں صدی میں ختم کر دیا۔

ٹوائن بی ایک راسخ العقیدہ عیسائی تھا، اس کا خیال تھا کہ مسیحیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ مختلف عقائد کے درمیان ہم آہنگی تلاش کرتے ہوئے نئے اثرات قبول کرتی اور اثر انداز ہوتی جائے گی۔ مغرب کا معاشرہ چونکہ تہذیبی طور پر مذہب سے منسلک ہے، لہٰذا قبولیت کا یہ عمل ہمیشہ جاری رہے گا۔ تہذیبوں کے مسلسل عروج وزوال سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ مذہب کی دانش بہ اعتبار مجموعی تہذیبی ترقی کا پتا دیتی ہے۔ ان مختلف عناصر میں ہم آہنگی

کی خاطر ٹوائن بی نے ایک نمونہ پہیے اور رَتھ کا وضع کیا تھا۔ اس نے دنیا کے مذہب کا تقابل ایک رَتھ سے کیا تھا۔ جو ''جنت کی سمت گرم سفر ہے ... ساتھ ہی کرۂ خاک پر تہذیبیں فنا ہوتی رہتی ہیں۔'' اشلس (Aeschylus) کے بقول اگر دانش مصائب سے گزرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے تو کسی معاشرے کی تباہی سے جو غیر معمولی مصیبتیں آتی ہیں، وہ انسانیت کی اخلاقی دانش میں اضافہ کرتی ہوں گی۔ معاشرے کی جسمانی ساخت اگر مسلسل گردش کی پابند ہو، پھر بھی انسان کی روحانی فہم اور دانش میں اضافہ ہی ہوگا۔

ٹوائن بی کی فکر کا ایک ناقدانہ مطالعہ

اگر تہذیبوں کو پودوں یا حیوانات کی زندگی کے مماثل سمجھا جائے تو ایک معاشرہ بعد میں آنے والی نسلوں میں بھی اپنے آبائی معاشرے سے کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ تاریخ دان جو نمونوں کے اسیر ہیں، یہ تسلیم نہ کر سکے کہ موجودہ معاشرہ ماضی کے معاشروں سے یک سر مختلف نظر آتا ہے۔ بظاہر صاف نظر آتا ہے کہ انسانی معاشرہ، علم کی نئی اور بہتر صورتوں میں تنظیم اور مادی آلات کے ساتھ برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ ہمارے پاس ہوائی جہاز ہیں، موٹر گاڑیاں ہیں اور ٹیلی وِژن ہیں، جب کہ ماضی بعید میں ہمارے پُرکھوں کے پاس جنگی ہتھیار، زرہ بکتر اور بھالے ہوتے تھے۔ ٹوائن بی کے بیان کے مطابق مسیحی مغربی معاشرہ تقریباً 1400 برس سے قائم ہے۔ اس کا آغاز کوئی چھ سو عیسوی میں ہوا تھا اور یہ اب تک پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یورپی اور امریکی بیسویں صدی کے اواخر میں ایک ہی تہذیب سے وابستہ ہوں گے جس طرح شارلیمین (Charlemagne) کے زمانے میں، تو اس سے ہمارے موقف کو اور بھی تقویت ملتی ہے۔ اس زمانے میں جنگ جُو بادشاہ اور پوپ معاشرے پر حکمران تھے، آج بچے ہفتے کی صبح ٹیلی وِژن پر کارٹون دیکھتے ہیں۔ مسیحیت وہ عنصر ہے جس نے دونوں تہذیبوں کو جوڑ رکھا ہے لیکن کچھ دوسرے عناصر بھی ہیں جو دونوں تہذیبوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ٹوائن بی نے تہذیبوں کی بدلتی ہوئی صورت حال کو ان کی فوجی اور سیاسی طاقت کے ساتھ جوڑا ہے۔ سنگین واقعہ یہ ہوگا کہ وحشی عناصر تہذیب یافتہ معاشروں پر یلغار کر دیں، جس کا نتیجہ پرانے نظم کا خاتمہ اور ایک نئے بندوبست کی تخلیق ہوگا۔ تاہم ٹوائن بی نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسیحی معاشرہ کی تشکیل میں وحشیوں کے حملے سے زیادہ مسیحی چرچ کا کردار تھا۔ روم کا ریاستی مذہب مسیحیت تھا، جو روم کے سیاسی ڈھانچے کے انہدام کے بعد بھی نہایت شان دار طور پر

برقرار رہا۔ رومن اور فرنگی معاشروں کے درمیان عقائد و اقدار کا تبادلہ تسلسل کے ساتھ ہوتا رہا۔ اگر مسیحیت وہ اصل طاقت تھی جس نے اس تہذیب کو سالم اور برقرار رکھا تو غالباً یہ کہنا پڑے گا کہ وہ تہذیب 600 صدی عیسوی کے بعد بھی برقرار رہی۔ غالباً اس کا آغاز اس وقت ہوا جب کانسٹنٹائن نے مسیحیت قبول کی۔ اس سے بھی بہتر یہ کہنا ہوگا کہ اس کی ابتدا عیسیٰ کی وفات اور حیات نو کے ساتھ ہی ہوگئی ہوگی یا شاید ان کی پیدائش پر ہوئی؟ یا شاید یہ تہذیب دراصل اس وقت شروع ہوئی جب یہودی پیغمبروں نے مسیحا کے بارے میں اپنا متن لکھنا شروع کیا۔

ٹوائن بی کا مسئلہ شاید یہ ہو کہ اس نے تہذیبوں کو معاشروں کے ہم پلہ سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ تہذیبیں معاشروں کے تابع ہوتی ہیں اور کسی زمانے میں تہذیبیں، معاشرتی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ تھیں، اس کی ایک اور تعریف یہ ہوگی کہ معاشروں میں اجتماعی زندگی کی مادی تنظیم بھی شامل ہوتی ہوگی —— جیسے اس کی حکومت، اس کی معیشت، اس کی انتظامی ساخت، جب کہ تہذیب کا تعلق صرف اس کے معاشرتی پہلو سے ہوتا ہے۔ اس حساب سے ایک تہذیب میں سوسائٹی کے بالا دست تصورات، خیالات اور اس کی اقدار شامل ہوتی ہیں۔ یہ گویا اس کے شعور کا پیرہن ہوگا۔ اگر یہ بات ہے تو ممکن ہے کہ مسیحیت کی طرح کوئی ایک تہذیب روح کی مانند مختلف معاشروں کے اندر حلول کرتی جائے اور جب وہ معاشرے ختم ہو جائیں اس وقت ہی وہ ختم نہ ہو۔ اس کے برعکس ایک معاشرہ اپنے وجود میں بہت سی تہذیبوں کا مالک ہوسکتا ہے۔ کسی تہذیب کا آغاز اور انجام کا تعلق اس کے شعور کے سرمائے سے ہوسکتا ہے نہ کہ خاندانی حکومتوں کے تسلسل سے ہوتا ہے۔ تہذیب ایک قوم کے تاریخی حافظے سے مرتب ہوتی ہے۔ یہ تجربات کے شعور سے مل کر بنتی ہے، جو اپنے تسلسل میں ٹوٹتے نہیں۔ معاشرہ کی مثال ایک جسم میں خلیوں کی ساخت جیسی ہے۔

معاشروں کے تناظر میں، عالمی تاریخ کے اندر موڑ اس وقت آتے ہیں جب اہم جنگیں ہوں، حکمران آ رہے ہوں اور جا رہے ہوں اور وہ دیگر عناصر جو سیاسی تنظیم پر اثر انداز ہوتے ہیں، تاہم تاریخ کی جانب ہمارا آج کا یہ طریقہ نسبتاً کم بامعنی رہ گیا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ قوموں کی تقدیر ان کے سیاسی رہنماؤں کی چھیڑی ہوئی جنگوں میں کامیابی کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی۔ اگر جنگ میں شکست ہو جاتی تو عام لوگ قتل کروائے جاتے یا غلام بنائے جاتے۔ اب قومیں اپنی حکومتوں سے اخلاقی طور پر الگ ہو چکی ہیں۔ ایڈولف ہٹلر نے جرمن عوام کے نام پر جنگ لڑی تھی۔ اب ہم جرمن عوام کو جنگ کے مابعد اثرات سے بچاتے ہوئے ہٹلر کی

مذمت کرتے ہیں۔ سیاسی سلطنتوں کی تاریخ ان لوگوں کے لیے دلچسپ ہو سکتی ہے اگر وہ ذاتی طور پر اپنے آپ کو دیوہیکل وجود کے ساتھ شناخت کریں۔ بصورت دیگر دنیاوی طاقت اکٹھا کر لینے کا نتیجہ وہی ہوگا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا۔ ''بے دین لوگوں کی بے مصرف تکرار۔'' ان کے مسلسل عروج وزوال سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

عالمی کلچر کے مشترکہ عناصر

کرۂ ارض پر دنیا بھر کے لوگوں نے الگ الگ مقامات پر گزر اوقات کی ہوگی لیکن ان کے درمیان ایک مشترکہ کلچر کے شواہد موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ٹوائن بی کی شمار کردہ تمام تہذیبوں نے 'انکا' (جنوبی امریکا کی ایک قدیم قوم) کے سوا تحریر کے فن پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ فرض کیا جاتا ہے کہ بیرونی دنیا میں تحریری زبان کا علم میسوپوٹیمیا سے، جو اس کا پہلا مرکز جانا جاتا ہے، پھیلا اور دوسری جگہوں پر پہنچ گیا۔ اس کا امکان بہت کم نظر آتا ہے کہ کولمبیا کے انڈینز کے رابطے پرانی دنیا کے خواندہ معاشروں سے رہے ہوں گے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مایان (Mayan) ایزٹک (Aztecs) اور دوسری امریکی قوموں نے تحریر کا فن کہاں سے حاصل کیا۔ اگر ان کی تحریر طبع زاد تھی تو اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کوئی پراسرار طاقت انسانی تہذیبوں کو آگے لے کر چلتی ہے۔ وہ کسی جسمانی ضرورت کا لازمی تقاضا تھا کہ سمیرا والوں کی طرح مایان نے بھی تحریر کی زبان دریافت کی، اور وہ اس وقت جب ان کی تہذیب ترقی کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ گئی۔

تہذیب کے ابتدائی دور کی خصوصیات ساری دنیا میں ایک سی ہیں۔ یہ قبائلی معاشرے ہیں جنہیں خون کے رشتوں نے آپس میں جوڑا ہے۔ تجربے کا علم ان کے پاس نہیں۔ ان کے معمولات میں آرنلڈ ٹوائن بی کے بیان کے مطابق سالانہ زرعی پیداوار کا چکر اور اس کی عبادت، ٹوٹکے کندہ کرنے کا عمل، قبیلے سے باہر شادی، ناپسندیدہ اشیا کی ممانعت، کسی علم کی ابتدائی تربیت کا آغاز، عمر کا حساب رکھنا، جنس کی تفریق بعض خاص مراحل ہیں اور الگ الگ برادری کے اداروں میں۔ جب تہذیب پہلی بار اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے تو معاشرے کو مختلف طرز کی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ روجر لیون کے مطابق اس کے اداروں میں بیٹھ کر کام کرنے کا معمول، تدفین کی طویل رسمیں اور بڑے بڑے مزاروں کی تعمیر، سماجی عدم مساوات، پیشہ ورانہ مہارت، طویل فاصلوں کے درمیان لین دین، فنی جدت (اور) جنگی مہارت شامل ہے اور ان خصوصیات کا اطلاق دنیا بھر میں پھیلے ہوئے معاشروں پر ہوتا

ہے۔ ان معاشروں کے درمیان کوئی رابطہ رہا ہو یا نہ رہا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں جب تہذیبیں قبائلی معاشرے سے باہر نکلتی ہیں تو عمل کا ایک سلسلہ ہر جگہ کام کرتا ہوتا ہے۔ وہی پتھر کے مخروطی اہرام، وہی پروہت، راجا اور ان کے حواری، کولمبیا میکسیکو سے پہلے فتوحات کے لیے جنگیں جیسے شانگ چین اور فراعین کے مصر میں ہوتی تھیں۔ یہی عبوری عرصہ تحریری زبان کے حصول تک پہنچنے کا ہے۔

چنانچہ ہم ایک عالمی تاریخ کے بیرونی خطوط کو اس طرح ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں کہ ایک طرح کی تہذیب دوسری طرح کی تہذیب کی جانب قدم بڑھا رہی ہے۔ کسی نئی ٹیکنالوجی، جیسے تحریر کی مہارت کو اس عمل میں ایک عنصر شمار کیا جائے گا۔ معاشرے میں طاقت کے ڈھانچے کے اندر کوئی تبدیلی ہوگی تو اسے بھی تہذیب کا ایک عنصر سمجھا جائے گا۔ ٹوائن بی نے ابتدائی معاشرے کی جو تعریف کی ہے، اس کا مقابلہ لیون کی بیان کردہ قدیم ترین تہذیبوں سے کریں تو معاشرے کی نوعیت میں ایک تبدیلی نظر آتی ہے، جو نسبتاً چھوٹی اور ایک ہی نسل کی قبائلی برادری پر مشتمل ہے، جس پر راجاؤں، پروہتوں اور ان کے حاکموں کی حکمرانی ہے۔ اس نئی طرح کی حکومت نے ''تہذیب یافتہ'' معاشرے کے کردار کا تعین کیا ہے۔ اس کے بادشاہ جنگیں لڑتے ہیں، قیمتی زیورات اور نفیس لباس پہنتے ہیں، تجارت کے لیے سہولتیں مہیا کرتے ہیں اور ان کی تدفین کے لیے بڑی دھوم دھام کا بندوبست ہوتا ہے، وغیرہ۔ تحریر کے فن کا فائدہ اس وقت نظر آتا ہے جب بادشاہ کے پیغام کو لوگوں کی برادری میں دور دور تک پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ دو عناصر، تہذیبی ٹیکنالوجیز اور طاقت کے ادارے بعض طریقوں سے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان دونوں میں سے تہذیبی ٹیکنالوجی کو تاریخی حوالے سے سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ تاریخ پبلک زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کا ریکارڈ ہے تو وہ میکانکی عمل جو اعلیٰ سطح کے واقعات سے عام لوگوں کو آگاہ کرتا ہے، وہ اس سارے عمل کا بنیادی حصہ ہوگا۔ جب ایک نئی تہذیبی ٹیکنالوجی متعارف ہوتی ہے تو اس سے عام لوگوں میں ایک نئی طرح کی واقفیت پھیلتی ہے۔ ذریعہ اظہار کے طور پر اس کی اپنی خصوصیات لوگوں کی فہم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک طرح سے عوامی زندگی میں تبدیلیاں آتی ہیں اور ان تبدیلیوں کا اثر تاریخ پر پڑتا ہے۔ ہمارا اپنا کلچر تحریری زبان کے استعمال سے دُور کے عبوری دور سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اب اس کا رخ برقی ذرائع کے استعمال کی طرف ہوتا ہے۔ جیسے فلم، آڈیو ٹیپ، ریڈیو اور ٹیلی وژن۔ تحریر سے تقریری زبان کی طرف واپسی کے بارے میں کچھ لوگ کہیں گے کہ اس غیر خواندہ کلچر

کے معنی ہیں ''تہذیب کا خاتمہ''۔ ہمیں یہ کہنے دیجیے کہ یہ ایک مختلف طرح کی تہذیب ہے۔ ابلاغ کی ٹیکنالوجی کے زبردست اثرات معاشرے پر اور اس کی اقدار پر پڑیں گے۔

بدلتی ہوئی کلچرل ٹیکنالوجی: تاریخی عہدوں کی راہنما

اگرچہ کلچرل (تہذیبی) ٹیکنالوجی اور اقتدار کے ادارے، دونوں تہذیب کے تعین میں فیصلہ کن عناصر ہوتے ہیں، مناسب ہوگا کہ کلچرل ٹیکنالوجی پر نظرِ ثانی سے آغاز کیا جائے۔ خواندگی سے پہلے، خواندگی کے دوران اور خواندگی کے بعد کے معاشروں میں جس طرح ترقی ہوئی ہے، اس کو بیان کرنے کے لیے تاریخ کے الگ الگ حصوں کا تصور کر لیا جائے تو اسے سمجھنا آسان ہوگا۔ ان ساری تہذیبوں کی بنیاد آبا و اجداد سے ملنے والی دانش کو آئندہ نسل تک زبانی پہنچانے پر تھی۔ چار ہزار سال قبل مسیح سے پہلے، تمام معاشرے خواندگی سے قبل کے معاشرے تھے۔ پہلے خواندہ کلچر جنہیں ہم ''تہذیب'' کہتے ہیں، ساڑھے تین ہزار سے تین ہزار سال قبل مسیح کے دوران میں، پہلے خواندہ معاشرے مصر اور مسیوپوٹیمیا میں نمودار ہوئے۔ تحریری زبان تین ہزارال قبل مسیح میں ہندوستان کی ہڑپہ تہذیب میں پائی گئی اور دو ہزار قبل مسیح یہ منوان (Minoan) اور چینی کلچر میں دیکھی گئی۔ اس دوران میں خواندگی سے قبل کے معاشروں کا وجود ان جگہوں پر برقرار رہا، جہاں خانہ بدوشی یا قبائلی طرزِ زندگی کا رواج تھا۔ بیسویں صدی عیسوی میں خواندگی کے بعد کا کلچر (Post literate) سب سے پہلے مغرب کے متمول معاشروں میں نمودار ہوا، اس کے بعد دوسرے معاشروں میں دیکھا گیا، جب برقیات کے ذریعے سے ریکارڈنگ اور رسل و رسائل کے ذرائع کا استعمال عام ہوگیا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ لوگوں نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا تھا۔

آرنلڈ ٹوائن بی نے جن اکیس تہذیبوں کی فہرست مرتب کی ہے، اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ تہذیبیں، جنہیں ٹوائن بی نے ''پہلی نسل کے معاشرے'' کہا تھا وہ اس کے بیان کیے ہوئے ''دوسری'' اور ''تیسری'' نسل کے معاشروں سے اپنی وضع میں مختلف تھے۔ پہلی نسل کے معاشروں میں مصری، اینڈین، سینائی، منیوان، سمیرا، مایان اور ہندوستانی تہذیبیں شامل تھیں، دوسری نسل کے معاشروں میں سیریا، ہلینک اور ہندو تہذیبیں، علاوہ دیگر تہذیبوں کے شامل تھیں۔ تیسری نسل کے معاشرے دراصل مذہبی کلچر سے پھوٹی ہوئی شاخیں ہیں، جو سیریا اور ہلینگ تہذیبوں سے نکلی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ سب سے پرانی نظر آتی ہیں۔ پہلی نسل کے معاشروں کی خصوصیت جو انہیں دوسروں سے ممیّز کرتی ہے یہ ہے کہ ان معاشروں نے

تحریر کے وہ طریقے وضع کیے جب حروف اظہار کا وسیلہ نہ ہوئے تھے۔ یہ درست ہے کہ دوسری نسل کے چند معاشروں نے بھی یعنی یوکیٹ، میکسیکو، بابل، حتی، مشرق بعید اور جاپان کی تہذیبوں نے بھی اس طرح کی تحریر وضع کر لی تھی، تاہم علامتی تحریر سے مفرد حروف اور پھر عبارت نویسی تک کے عبوری مراحل تاریخی تبدیلی میں نہایت اہم عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حروف تہجی پر مبنی باترتیب عبارت سب سے پہلے دو ہزار سال قبل مسیح میں دیکھی گئی۔ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں اسے بڑی خوبی میں استعمال کیا جانے لگا، گیارھویں سے ساتویں صدی قبل مسیح میں مذکورہ علاقوں کے علاوہ اسے ہندوستان میں بھی رواج ملا۔ قدیم سامی زبان میں، عبرانی، فارسی، یونانی اور رومن آبادیوں میں حروف تہجی پر مبنی عبارت کا رواج تھا۔ جب کہ اس سے پہلے بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں مخروطی نشانات پر مبنی تحریر یا علامتی نقوش کا طریقہ رائج تھا۔ لہٰذا ایک ہزار سال قبل مسیح کے نصف اوّل میں عالمی تاریخ کے اندر کسی مقام پر ایک خط تقسیم کھینچا جا سکتا ہے۔ یہی خط قدیم ترین تہذیبوں کو ان تہذیبوں سے الگ کرے گا، جن سے ہم بائبل پڑھنے کے دوران میں مانوس ہو چکے ہیں یا جس کا تذکرہ کلاسیکی ادب میں ملتا ہے۔ شاید اس ادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حتی اتنے اجنبی کیوں لگتے تھے، اتنے ظالم کیوں نظر آتے تھے، جب کہ تہذیبی اعتبار سے یونانی ترقی یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ یونانی اور رومن ادب جو حروف تہجی میں لکھا گیا، ان قدیم لوگوں کے اور ہمارے درمیان ایک تہذیبی تعلق پیدا کرتا ہے۔ ہم خواندگی کی ایک روایت کے ذریعے اپنے آپ کو ان سے جوڑ لیتے ہیں۔ اس سے ہمیں ان کے فلسفے، پراسرار روایات اور مذاہب کا علم ہوتا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی کے وسطی زمانے میں مغربی یورپ میں چھاپے خانے کی ٹیکنالوجی متعارف ہوئی۔ یہ ایک اور تہذیبی ٹیکنالوجی تھی جس نے معاشرے کو بدل دیا۔ چھپائی کی بدولت کتابوں کی تعداد اور تنوع میں بہت اضافہ ہو گیا۔ اس نے اخبارات کی چھپائی کو ممکن بنایا اور اسی کے ساتھ ہی اشتہارات کی اشاعت اور خبروں کی فوری تقسیم ممکن ہو گئی۔ اس طرح چھپائی کا زمانہ خواندہ تہذیب کے دور میں تیسرا عہد تھا۔ پہلا عہد چار ہزار قبل مسیح سے شروع ہو کر ایک ہزار قبل مسیح کے نصف اوّل تک پہنچا۔ حروف تہجی سے پہلے کی تحریر نے ایک قدیم طرز کا ادب پیدا کیا۔ دوسرا عہد ایک ہزار سال قبل مسیح کے نصف سے شروع ہو کر پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک پہنچا، اس عہد میں بائبل اور کلاسیکی ادب کے ذریعے خواندگی کی روایت بڑی جو دستی تحریر کے ذریعے ان مسودوں تک پہنچی، جنہیں حروف تہجی میں لکھا جاتا تھا۔ تیسرے

عہد میں جس کا آغاز پندرھویں صدی کے اواخر سے ہوا اور انیسویں صدی کے ختم تک پہنچا۔ اس عہد میں کلچر پر چھپے ہوئے متن کا غلبہ تھا۔

خواندگی کے بعد کے بیسویں صدی کے کلچر پر ایجادات کی بالادستی تھی۔ یہ کلچر بصری اور سمعی مرقعے منعکس کرتا ہے۔ اس کی بالادست ٹیکنالوجی میں فوٹوگرافی، صدابندی، پردے پر چلتی پھرتی تصویر، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی ٹیکنالوجی شامل ہیں۔ بیسوی صدی کے اواخر میں کمپیوٹر بھی عام استعمال میں آ گیا ہے۔ یہ دوسروں سے یک سر مختلف طرح کی ٹیکنالوجی ہے۔ اگرچہ کمپیوٹر برقی لہروں کے ذریعے بھی کام کرتے ہیں، لیکن اس میں حسی تصویروں کو تبدیل کرتے رہنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ پیغام بھیجنے والے اور وصول کرنے والے کے درمیان دوطرفہ رابطہ قائم رہتا ہے۔ اطلاعات کو ایک نہایت وسیع پیمانے پر پروسس کرنا (محفوظ کر لینا) کمپیوٹر کے ذریعے ممکن ہو گیا، جو کسی اور طریقے سے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا خواندگی کے بعد کے کلچر کی تاریخ میں ایک خطِ تقسیم کھینچ کر دو علیحدہ عہد بنائے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ عہد جس پر مواصلات کی ٹیکنالوجی کا پہلا دور حاوی تھا اور دوسرا کمپیوٹر کا عہد۔ بہرحال چونکہ کمپیوٹر کا زمانہ ابھی شروع ہی ہوا ہے اس لیے اس عہد میں کہیں زیادہ توانائی موجود ہے، اس سے کہیں زیادہ جسے تاریخی طور پر ترقی دینے کا امکان ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ہمارے پاس عالمی تاریخ پانچ حصوں پر مشتمل موجود ہے جس میں درج ذیل تہذیبیں شامل ہیں۔

تہذیب1	3000 قبل مسیح سے550 قبل مسیح تک
تہذیب2	550 قبل مسیح سے1450 عیسوی تک
تہذیب3	1450 عیسوی سے1920 تک
تہذیب4	1920 عیسوی سے1990 عیسوی تک
تہذیب6	1920 سے موجودہ زمانے تک

ابتدائی اور آخری تاریخیں قدرے گمراہ کن ہیں۔ عالمی تاریخ کے عہد اس طرح واقعات کے ذریعے واضح طور پر متعین نہیں ہوتے کہ ایک کے خاتمے اور دوسرے کے آغاز کی تاریخ درج کر لی جائے۔ تاریخ دان اس طرح صریح طور پر نہیں بتا سکتے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک تہذیب نے دوسری تہذیب کی جگہ فلاں تاریخ کو حاصل کر لی۔ جہاں تک پہلی تہذیب کا معاملہ ہے، کرۂ خاک کی آبادی کا ایک بہت مختصر سا حصہ سمیرا یا مصری معاشروں میں آباد تھا۔

زیادہ تر لوگ اب بھی قبائلی معاشروں میں رہتے ہیں۔ ایک ہزار سال قبل مسیح کے وسط میں جب حروف تہجی سے عبارت لکھی جانے لگی، بہت سے لوگوں نے تحریر کا پرانا طریقہ ہی برقرار رکھا، چینی تو آج بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریروں کا سلسلہ اس وقت بھی بند نہیں ہوا جب کہ چھپائی کی آسانی موجود تھی۔ جب سے ریڈیو اور ٹیلی وژن آ گئے ہیں، خواندگی ایک گم شدہ مہارت بن کر رہ گئی ہے۔ اب تبدیلی کے عمل کو بیان کرنے کے لیے تاریخ کے ایک زیادہ پیچیدہ نمونے کی ضرورت ہوگی۔

جب ایک نئی تہذیبی ٹیکنالوجی وجود میں آتی ہے اور اختیار کر لی جاتی ہے تو یہ لازمی طور پر اس سے پہلے کی تمام ٹیکنالوجیز کو بے دخل نہیں کرتی اور نہ اس کا اپنا مخصوص کلچر اس سے پہلے کے کلچر کو بے دخل کر کے خود حاوی ہو جاتا ہے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ ٹیکنالوجی اور اس کے تہذیبی عناصر پہلے کی ٹیکنالوجی اور تہذیبی عناصر سے مل جاتے ہیں۔ اس وقت معاشرے میں مختلف نوعیت کے عناصر اکٹھا ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی نئی تہذیبی ٹیکنالوجی نئی اور ناآزمودہ ہونے کی بنا پر گزشتہ کے مقابلے میں زیادہ شد و مد سے اپنے وجود کا اظہار چاہتی ہے۔ اور کلچر پر اپنا نشان پوری شدت سے ثبت کرنے کی آرزومند ہوتی ہے۔ شاید تاریخی عہد مختلف مراحل میں اگنے والے نباتات کی طرح ہیں جو جنگل میں آتش زدگی کے بعد ایک جلے ہوئے قطعہ اراضی پر اگتے ہیں۔ پہلے اکھوے پھوٹتے ہیں، پھر مختلف طرح کے پودے نمودار ہوتے ہیں۔ پھر چھوٹے درخت، بھوج پتر اور تیزی سے بڑھنے والے درخت اپنے قد نکالتے ہیں اور آخر میں دراز قد دیودار پختہ عمر کو پہنچ کر پورے جنگل پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کے مرحلے میں جب کوئی خاص طرح کا پودا نمودار ہوتا ہے تو دوسری طرح کے درخت غائب نہیں ہو جاتے۔ بس یہ ہوتا ہے کہ جنگل پودوں، درختوں اور قسم قسم کی جھاڑیوں سے بھر جاتا ہے۔

اس کتاب میں ''عہد'' اور ''تہذیب'' کی اصطلاحات کو مختلف طرح استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ایک ہی بات کے الگ الگ پیرائے ہیں۔ تہذیب ایک طرح کی ثقافتی موجودگی کا اقرار ہے۔ ہماری عالمی تاریخ میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ عہد اُس وقت بدل جاتے ہیں جب اس سے وابستہ تہذیبیں بدل جاتی ہیں، اگرچہ ایک نئی کلچرل ٹیکنالوجی اس کی محرک ہوسکتی ہے لیکن ہمیں تو اس کے نتیجے سے غرض ہے۔ اگر دنیا میں تمام جگہوں کے معاشرے ایک خاص کلچر سے نکل کر بیک وقت دوسرے کلچر میں منقلب ہو جائیں تو تاریخ دانوں کے لیے اس میں

بڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن بہرحال حقیقت یہ ہے کہ کرۂ خاک پر تمام معاشروں میں تہذیبیں مختلف زمانوں میں پہنچیں۔ مثال کے طور پر نوزائندہ شہری ریاست کی تشکیل مصر اور میسوپوٹیمیا میں، چین کے مقابلے میں کم از کم ایک ہزار برس پہلے ہوگئی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مشرق بعید کے معاشرے کے مقابلے میں مشرق وسطیٰ کے دو معاشروں کے اندر پہلے عہد کا آغاز کم از کم ایک ہزار سال پہلے ہو چکا تھا۔ اگر پھر بھی بیشتر یا تمام تہذیبوں میں واقعات اس طرح وقت کے فرق کے ساتھ رونما ہوتے ہوں تو بھی عالمی تاریخ کا اوقات نامہ مختلف جغرافیائی خطوں میں مختلف ہوتا۔ تہذیب بجائے خود اسی طرز کے سماجی ڈھانچے کی پابند ہوتی ہے جو طاقت کے ساتھ اس کے رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔

دوسرا باب

پُرہجوم سماج میں تفریق کرنے والے ادارے

انسانی معاشرے کسی زندہ وجود کی طرح ہوتے ہیں جو ایک خلیے کے وجود میں منقلب ہو کر، پودے یا حیوانی زندگی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زندگی بجائے خود سادہ سے خلیوں سے مل کر وجود میں آئی ہے، ساری کارکردگی ایک ہی خلیے کے اندر ہوتی رہی۔ تمام اعلیٰ تر اقسام میں کئی خلیے شامل ہوتے ہیں اور اپنا کام زیادہ مستعدی سے انجام دیتے ہیں۔ کیوں کہ ہر خلیہ خصوصی استعداد رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج زمین پر لاتعداد اقسام کے زندہ وجود پائے جاتے ہیں۔ ان میں بالکل ابتدائی زمانے کے جرثومے بھی شامل ہیں اور انسان بھی۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص وقت میں مشترکہ آبائی رشتے کے ہوتے ہوئے تفریق کے عمل کی بدولت ترقی کی۔

قدیم انسانی معاشروں میں آبادی بڑے بڑے خاندانوں یا قبیلوں کی صورت میں منظّم ہوتی ہے۔ قبیلے کی حکومت بزرگوں کی ایک جمعیت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ابتدائی طور پر ایک سردار جو ایک کاہن (عامل) ہوتا ہے، قبیلے کے بارے میں فیصلے صادر کرتا ہے۔ یہ کاہن کائنات کی روح سے اپنے طور پر رابطہ رکھتا ہے اور رسوم ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی شخصیت ہونے کی بنا پر وہ ایک معالج، تاریخ دان، موسمی پیش گوئی کرنے والا، شاعر، مصنف اور فوجی سالار بھی ہوتا ہے۔ یہ بندوبست ایک چھوٹی سی قبائلی برادری میں تو خود کام کرتا ہے، لیکن زیادہ ترقی یافتہ معاشرے میں نہیں چلتا۔ اس وقت چند ہاتھوں میں اتنے بہت سے اختیارات سونپ دینا خطرناک ہوسکتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ پھیلتا، بڑا اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے، کسی فردِ واحد کے لیے ان تمام کاموں میں مہارت حاصل کرنا دشوار ہو جاتا ہے، جو معاشرے میں درپیش ہوتے ہیں۔ مختلف فنون میں ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے، جو اپنے فرائض زیادہ اہلیت کے ساتھ دوسروں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے انجام دے سکتے ہیں۔

معاشرے میں ہر بڑے کام کے لیے ماہرانہ ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ادارے کا ایک وقت تھا جب اس نے اپنی مخصوص ہیئت کو ترقی دی اور انتہائی درجے کی توانائی حاصل کی۔ اگر اس کی مثال زندہ جان داروں سے دی جائے تو اسے اس طرح سوچ سکتے ہیں کہ ایک ادارہ کل سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا اور اس نے اپنی جداگانہ انفرادیت قائم کر لی۔ جس طرح خلیے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، اسی طرح اداراتی ڈھانچے ابتدائی معاشرے کے رحم مادر سے الگ ہو گئے۔ ایک طرح سے خلیوں کی تقسیم کا عمل شروع ہو گیا۔ اسی طرح معاشرہ تاریخی عہدوں سے گزرتا ہوا کسی منطقوں کے درمیان بٹ گیا۔ سماج کی ملی جلی ساخت سے پہلے ایک ادارہ الگ ہوا، پھر دوسرا، اور اس کے بعد اور، یہاں تک کہ معاشرے میں بہت سے ادارے بن گئے، جو ہمیں آج نظر آ رہے ہیں۔ تاریخی ترقی ایک آئینہ ہے جس میں اس طریق کار کا عکس نظر آتا ہے کہ زیادہ ترقی یافتہ معاشرہ کس طرح بہت سے اداروں کو اپنے اندر شامل کر لیتا ہے۔

ہر عہد کی امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس ادارے سے تاریخ کی چاشنی حاصل کرتا ہے جو ابھی حال ہی میں کُل سے ٹوٹ کر الگ ہوا تھا۔ اس سے پہلے معاشرے کی ایک مختلف ساخت تھی اور ایک مختلف سماجی و ثقافتی خصوصیت۔ اس کا تعلق ایک مختلف تہذیب سے تھا۔ عالمی تاریخ تہذیب کی ترقی کی اطلاع دیتی ہے۔ ہر تہذیب کی پیدائش کا ایک عہد ہوتا ہے، پھر ایک زمانہ اس کی بلوغت اور جوانی کا ہوتا ہے۔ ایک مرحلہ اس کی پختگی کا ہوتا ہے، جس سے اس کے دائرۂ اقتدار کی ہیئت کا پتا چلتا ہے۔ ترقی پرانے منطقوں میں بھی ہوتی رہتی ہے جس سے کہ نیا منطقہ وجود میں آیا، لیکن یہ نئے منطقے چونکہ عمر میں نسبتاً کم ہوتے ہیں، اس لیے زیادہ پرجوش اور متحرک ہوتے ہیں۔ اپنے عہد پر بالادستی انھی کی ہوتی ہے کیوں کہ یہ نیا ادارہ جو ٹوٹ کر الگ ہوتا ہے، اس میں زیادہ شدت اور تخلیقی توانائی ہوتی ہے اور دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کو ایک خاص راستے پر بہائے لیے جاتی ہے۔

آج کی دنیا میں انسانی معاشرے تہذیبی ترقی کی مختلف سطحوں پر پائے جاتے ہیں۔ ابتدائی زمانے کے قبائل آج بھی جنوبی امریکا کے جنگلات، سائبیریا کے جنگلات یا مائکرونیشیئن جزائر میں پائے گئے ہیں۔ یورپ اور جزیرہ نما عرب میں جاگیردارانہ علاقے موجود ہیں۔ مین ہٹن کے وسط میں یا بیورلی ہلز کا معاشرہ سرتاپا الیکٹرانک کے عہد میں سانس لے رہا ہے۔ کوئی آبادی جب تک مختصر رہے گی اور دوسری انسانی آبادیوں سے الگ اور یکہ وتنہا رہے گی، وہ

جس سطح پر آج ہے، آئندہ بھی اسی پر برقرار رہے گی۔ وہ ایک اور سطح پر پہنچے گی لیکن اس وقت جب اس کا سامنا دوسرے کلچر سے ہوگا۔ معاشرے جب تک ''وقت کے جال'' میں پھنسے رہیں گے، اسی قدر قدامت میں مبتلا رہیں گے۔ وہ اسی سطح پر قائم رہیں گے جس پر انسانیت اپنی تاریخ کے ابتدائی دَور میں تھی۔ زیادہ ترقی یافتہ کلچر بعد کے دَور میں ہی پیدا ہوئے۔ اس طرح ہر تہذیبی ترقی کا تعلق مخصوص سلسلۂ واقعات سے ہے، جسے تاریخی طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ تاریخ کی ترقی کو معاشروں کے ڈھانچے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ذات پات اور طبقات میں تقسیم

انسانی آبادی نے قبائلی بستیوں سے ابتدا کی اور نئے ادارے حاصل کر لیے، جو دوسروں سے ٹوٹ کر الگ ہوئے اور طاقت کے الگ الگ مرکز بن گئے۔ اس طرح معاشرہ میں اقتدار کی تقسیم کا ایک نظام سٹ کر آ گیا۔ چار ہزار سال قبل مسیح میں شاہی حکمرانی کا ادارہ سمیرا اور مصر کے عبادت گاہی کلچر سے الگ ہو گیا تھا۔ فلسفے پر مبنی مذاہب نے جن کی پیدائش غالباً چھٹی صدی قبل مسیح میں ہو گئی تھی، شاہی ریاستوں کے اقتدار کو چیلنج کیا۔ اب نشاۃ الثانیہ کا دور آیا۔ تجارتی ادارے کلیسا اور ریاست دونوں سے الگ، اپنی حیثیت میں جداگانہ شعبہ بن گئے۔ آخر میں بیسویں صدی میں تفریحات کی صنعت نے اپنا رنگ وروپ نکالنا شروع کیا۔ یہ سارے ترقیاتی مدارج، اپنے اپنے عہد کی تاریخ کی نشان دہی کرتے ہیں۔

قدیم تحریریں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ معاشروں نے مختلف کاموں کو انجام دینے کے لیے کس طرح الگ الگ طبقے بنائے۔ جینیس (Genesis) کے بقول یعقوب کے بارہ بیٹے تھے اور ہر ایک کے یہاں اولادیں ہوئیں۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے بڑے بڑے قبیلے بن گئے۔ جب یہ سب کنعان واپس ہوئے تو ہر ایک کو اپنے اپنے حصے کی زمین مل گئی۔ موسیٰ اور اس کے بھائی (Aaron) ہارون، لیوی کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ موسیٰ کی زبان میں لکنت تھی۔ خدا نے ہارون کو گفت گو کرنے کے لیے مقرر کیا۔ اس طرح ہارون کے بیٹے موروثی طور پر اپنے دین کے پروہت یا پجاری ہو گئے۔ ایک مفروضے کے مطابق فرعون کی بیٹی کا لے پالک بیٹا بادشاہ ہو سکتا تھا، تاہم ایک دوسرا قبیلہ یہودا عبرانی خاندان سے منسلک ہو گیا۔ جب گیارھویں صدی قبل مسیح میں داؤد نے سال (Saul) کو بادشاہ بنا کر بٹھا دیا، اس طرح لیوی اور یہودا دونوں کے بیٹے اپنی موروثی ذمہ داریاں انجام دینے لگے۔ ایک مذہبی منطقے میں دوسرا سیاسی شعبے میں۔

جب آریائی خانہ بدوشوں نے1500 قبل مسیح کے آس پاس ہندوستان پر حملہ کیا تو انہوں نے سماج میں ذات پات کا ایک نظام نافذ کیا۔ دراوڑ لوگ جن کے رنگ کالے تھے اور جو تعداد میں زیادہ تھے، آریاؤں نے ان پر فتح پا لینے کے بعد اپنی برتری قائم کرنے کی خاطر ان پر اپنا نظام نافذ کر دیا۔ انہوں نے سختی کے ساتھ یہ قانون جاری کیا کہ کوئی فرد اپنی ذات سے باہر شادی نہیں کر سکتا۔ پہلے تو اس کی تعریف نسلی طور پر کر دی گئی تھی، پھر پیشہ ورانہ کارکردگی تک اس کا دائرہ پھیل گیا اور سلسلہ قرابت کا تعین بھی کر دیا گیا۔ چونکہ آریہ سردار جنگ جُو تھے، لہٰذا سب سے بڑا مرتبہ کشتری جنگ جُو ذات کو دیا گیا۔ مذہبی تقریبات میں سربراہی کا منصب جنگ جُو سردار انجام دیتا تھا۔ پجاری اس کی مدد کرتے تھے۔ تاہم برہمن پجاریوں کے سپرد مقدس ادبیات تھیں۔ رفتہ رفتہ کر کے برہمنوں کی ذات نے امن کے طویل دور میں سب سے اونچا مرتبہ حاصل کر لیا۔ جیسا کہ دو ہزار سال قبل مسیح کی عبارتوں سے ظاہر ہے، ذات کی ترتیب، ان کے مرتبے کے حساب سے درج ذیل تھی۔

نام	کام
برہمن پجاری	مذہب پر کامل اختیار رکھتے تھے
کشتری، جنگ جُو بادشاہ	سیاسی اقتدار کا مالک تھا
ویش، کسان اور بیوپاری	معاشی طاقت رکھتے تھے
شودر بوجھ اٹھانے والے	معیشت کے دوسرے کام کرتے تھے
اچھوت	ذات پات کے نظام سے باہر تھے

افلاطون نے اپنے مکالمات میں سماجی تقسیم کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ پیشوں کی بنیاد پر معاشرے میں عام لوگوں کی تقسیم کو اس نے پسند کیا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ سب سے نیچی ذات والے اپنی حیثیت سے غیر مطمئن رہیں گے، افلاطون نے یہ تجویز پیش کی کہ معاشرے کے حکمران ایک دیومالائی قصہ گھڑ لیں اور وہ یہ کہ خدا نے مختلف اقسام کے لوگ الگ الگ دھاتوں سے بنائے ہیں۔ اونچے درجے کے افراد کو قیمتی دھات راس آئے گی اور گھٹیا دھاتیں مزدور طبقے کے لوگوں کے لیے ہیں۔

افلاطون کی اسکیم جس کے تحت افراد اور دھاتوں کے تین درجے مقرر کیے گئے ہیں، درج ذیل ہیں:

دھات	پیشہ
سونے کے لوگ	''محافظین''(فلسفی)
چاندی کے لوگ	''معاونین''(سپاہی/پولیس)
پیتل کے لوگ	کسان اور صنعت کار

تیسری صدی قبل مسیح میں چینی معاشرے نے شاہانہ حکومت کی ایک اسکیم وضع کی تھی، جس میں بادشاہ ''جنت کے بیٹے'' طور پر حکومت کرتا تھا۔ اس سلسلے میں کوئی سیاسی طبقہ نہیں تھا، کیوں کہ چینی بادشاہ نے اپنی سلطنت کو مستحکم بناتے ہوئے کم تر درجے کے امرا کو کچل دیا تھا۔ کوئی مذہبی طبقہ بھی نہیں تھا۔ اس کا منصب کنفیوشس کے فلسفہ دان منصب دار سنبھالے ہوئے تھے اور شاہی حکومت کے انتظامات انجام دے رہے تھے۔ اس معاشرے میں حیثیت کے اعتبار سے تلے اوپر چار طبقے تھے۔

(1) عالم، استاد اور ناظم (2) کسان اور کاشت کار (3) دست کار (4) تاجر

انقلاب کے موقع پر فرانس میں ایک طاقت وَر بادشاہ برسرِ حکومت تھا۔ وہ جب اضافی لگان وصول کرنے کا خواہش مند ہوتا تو ایک پارلیمانی جماعت سے مشورہ کرتا، جسے اسٹیٹس جنرل کہا جاتا تھا۔ اس جماعت کی تین ''ریاستیں'' تھیں، جو مختلف طبقات کی نمائندگی کرتی تھیں، جو فرانس کے معاشرے کا حصہ تھے۔ 1789 کے کنوکیشن (بڑے اجتماع) میں طوفان خیز واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو بادشاہ کی موت اور معاشرے کی تنظیم نو پر جا ختم ہوا۔ وہ تین ریاستیں جن کی نمائندگی اسٹیٹس جنرل میں ہوتی تھی، درج ذیل ہیں۔

ریاستیں	طبقہ/کارگزاری
پہلی ریاست	عیسائی پادری
دوسری ریاست	کم تر درجے کا رئیس
تیسری ریاست	کاروباری اور محنت کش طبقہ

یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ یہی تینوں ادارے، حکومت، مذہب اور تجارتی ادارے انسانی معاشروں میں دو ہزار سال سے براجمان ہیں۔ حال ہی میں ''چوتھی ریاست'' کا حوالہ بھی سننے میں آیا ہے اور وہ ہے پریس (اخبارات)، اور اگر ہمارا نظریہ درست ہے تو کمپیوٹر کی

آمد سے، جو ایک زبردست تہذیبی ٹیکنالوجی ہے، نئے ادارے بھی ظہور میں آئیں گے جن کا تعلق ممکن ہے ''پانچویں ریاست'' سے ہو۔ انسانیت نے ماضی میں معیشت کے مقابلے میں مذہبی اور سیاسی امور کی زیادہ قدر کی ہے، حالانکہ معیشت کا وجود انسانی زندگی کے لیے لازمی ہے۔

انقلاب فرانس کے دوران میں پورا سماجی نظم تہ و بالا ہو گیا۔ مسیحی پادریوں سے ان کا اثاثہ اور منصب سب کچھ جاتا رہا۔ جب کہ اعلیٰ منصب داروں کو پھانسی پر ٹانگ دیا گیا۔ عام لوگوں نے جن میں تاجر شامل تھے، معاشرے میں خاص مقام حاصل کر لیا۔ اس حکومت نے نپولین کے لیے حکمرانی کا راستہ صاف کیا۔ پھر اس کی شکست اور پھر بادشاہت کی واپسی ہو گئی۔ تاہم فرانس جیسے انقلاب کا خیال جو مسلمہ نظم ریاست کو الٹ دے یورپی ذہن میں ہی آ سکتا تھا۔

1917 میں روس کا انقلاب، فرانس کے انقلاب کی شعوری نقالی تھی۔ درحقیقت وہ نیا معاشرہ جسے بالشویکس نے بنایا تھا، افلاطون کی جمہوریہ کے مشابہ تھا، سوائے اس کے کہ اپنے مادیت پرست فلسفے کی وجہ سے حکمران طبقہ زیریں سطح پر مزدوروں اور کسانوں کے مفادات کی برائے نام ترجمانی کرتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی نے اپنی پالیسیاں خفیہ پولیس اور سرخ فوج کے ذریعے نافذ کیں۔ حکومت کا پہلا سربراہ ایک پیشہ ور فلسفی تھا۔ معاشرے میں ''کانسی کے لوگ'' اسٹالن کی تحکمانہ حکمرانی کے تحت جی رہے تھے۔ اسٹالن کے نام کے معنی ہی ''فولاد کا آدمی'' ہے۔

''غیر طبقاتی'' روسی معاشرے کا طبقاتی ڈھانچا اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

ادارہ	کارگزاری
کمیونسٹ پارٹی	سیاسی فلسفہ داں
کے جی بی اور رَیڈ آرمی (سرخ فوج)	پالیسی نافذ کرنے والے
کسان اور مزدور	معاشی امداد بہم پہنچانے والے

امریکا کے موجودہ معاشرے میں اقتدار کے ڈھانچے کے اندر مرکزیت کے خلاف یک جائیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کی منطقہ وار تقسیم میں طبقاتی کی بجائے اداراتی تخصیص کی جاتی ہے۔ ٹائم میگزین نے جون 1996 میں امریکا کی دس سب سے زیادہ بااختیار شخصیات کی

نشان دہی کی تھی۔ اداروں کے ساتھ ان کی وابستگی خاصی دلچسپ ہے۔ ان میں سے تین شخصیات یعنی امریکا کے صدر، ایوان کے سپیکر اور وفاقی ریزور بورڈ کے چیئر مین، سب حکومتی اداروں سے وابستہ تھے۔ دو افراد جنرل موٹرز، جنرل الیکٹرک اور فائڈلیٹی فنڈ کے چیف ایگزیکٹوز، تجارت اور مالیات کی نمائندگی کرتے تھے۔ مزید دو مائیکروسافٹ اور انٹیل کے چیف ایگزیکٹوز تھے۔ وہ ترقی پذیر کمپیوٹر کی قسمت کے نمائندے تھے، صرف مذہب کے شعبے کا کوئی نمائندہ نہیں تھا۔

مغرب کا معاشرہ طاقت کی شراکت کے بندوبست کو اپنے نظام میں نسبتاً زیادہ جگہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک اس کی تاریخ ہے۔ معاشرے کا یہ نمونہ ان لوگوں کے تاریخی تجربے کی پیروی کرتا ہے جو رومن سلطنت کے نصف مغربی علاقے میں آباد تھے، تاآں کہ وحشی قبائل نے انہیں ٹھکانے لگا دیا۔ امریکی حکومت میں روک ٹوک اور توازن کا جو نظام پایا جاتا ہے، وہ اس قدیمی روایت کا عکس ہے۔ دوسری طرف چینی معاشرہ اپنے تاریخی تجربے کی عکاسی کرتا ہے، جس کی بنیاد ایک مرکزی اقتدار کے تحت شاہی حکومتوں کی موروثی آمدورفت پر تھی۔ لہٰذا مارکسی مرکزیت کے باوجود چین اور مشرق بعید کے دیگر معاشروں میں بھی جو رجحان مطلق العنانیت کا پایا جاتا ہے، اسے بھی تاریخی ورثے کی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے۔ سوویت یونین میں مرکزی آمریت پر مبنی جو معاشرہ تھا، اسے بھی "تین روم" کے نظریہ سے سمجھنا چاہیے۔ روم اور قسطنطنیہ اور ماسکو، ان کی متحدہ طاقت کا ڈھانچا روم کی شاہی حکمرانی کا ورثہ ہے، جو بازنطینہ کی سلطنت کے توسط سے حال تک پہنچا۔ اس سلسلے میں مذہب نہایت سختی کے ساتھ سیاسی ریاست کے تابع تھا۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں، جب مشرق کی کٹر عقیدہ پرستی کا رخ قسطنطنیہ سے ماسکو پہنچا تو روس کی زار شاہی نے بازنطینہ کا نظام اپنا لیا۔

اس تاریخ کا خلاصہ

عالمی تاریخ سے موجودہ معاشرے کے آغاز کا پتا چلتا ہے، وہ باتیں جو آج کی دنیا میں ہمیں غیر منطقی اور مبہم معلوم ہوتی ہیں، تاریخ سے واقفیت کی بدولت ان کے اسباب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پورے تاریخی ادوار میں معاشرے پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہوتے آئے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجیز ایجاد کی گئی ہیں اور انسانی علوم میں اضافہ ہوا ہے، اگرچہ روحانی طور پر ہم نے زیادہ ترقی نہیں کی ہوگی اور اگر کی بھی تو اپنے ابتدائی زمانے کے آباؤاجداد کی سطح سے اوپر بلند نہیں ہوئے۔ مرقوم تاریخ میں تشدد اور جبر ہمیشہ پائے گئے ہیں، پھر بھی اچھا ہوا یا برا، انسانیت

ایک بڑی مہم سر کر رہی ہے، جسے تہذیب کہتے ہیں۔ اس کے تسلسل کی وضاحت عالمی تاریخ سے ہی ہوتی ہے۔

عالمی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ علمی سرگرمیوں کے متفرق شعبوں میں جب ادارے الگ ہوتے گئے، اس لیے کہ معاشرہ بتدریج پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا، تو معاشرے کے نشو و ارتقا کا یہ عمل اور اس کا تسلسل کیا تھا، مختصراً اس نے درج ذیل طریقوں سے ترقی کی۔

پہلی تہذیب کی ابتدا اس وقت ہوئی جب حکومتی ادارے، ابتدائی شہری ریاستوں میں پروہتی معاشروں سے الگ ہو گئے اور انہوں نے سیاسی سلطنتیں قائم کر لیں۔ اسے ہم تہذیب اوّل کہیں گے۔

دوسری، تہذیب دوم اس وقت شروع ہوئی جب مذہب میں فلسفہ داخل ہوا، جس میں صداقت کی روح شامل تھی، اس نے ریاست سے رشتہ توڑ دیا اور عالمی مذاہب پیدا کیے۔

تیسری تہذیب تجارت، فن، علم و دانش اور عالمی دریافت سے شروع ہوئی جس نے مغربی یورپ میں کلچر شامل کیا۔ اب اس کلچر کا مرکز نگاہ دولت کا حصول اور تعلیم تھا۔

چوتھی تہذیب اُس وقت شروع ہوئی جب تفریحات نے ایک سنجیدہ کاروبار کی شکل اختیار کی اور خبروں کی تشہیر و ابلاغ نے رائے عامہ کی تشکیل کا عمل شروع کیا۔

پانچویں تہذیب کا آغاز کمپیوٹر کی آمد سے ہو چکا ہے، تاہم اس کی خصوصیات کے حامل اداروں کی شناخت کرنا قبل از وقت ہوگا۔

پہلے عہد میں حکومت کا الگ ہونا

معاشرے کے سیاسی ادارے، ان کی جنگ آزمائی کے کاموں سے وابستہ ہیں، جب قبائل لڑائی پر جاتے ہیں تو فوجی سردار ہنگامی حالات میں اکثر آمرانہ اختیارات سنبھال لیتے ہیں۔ جنگیں حکومت کی ضرورت پیدا کرتی ہیں۔ ''تہذیب یافتہ'' لوگوں کی حکومتیں اس وقت بنتی ہیں جب ایک قبیلہ یا قوم دوسری قوم کو شکست دے کر اسے غلام بناتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مختلف نسلوں کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بہت قریب آ جاتے ہیں۔ اس طرح سماجی درجہ بندی کا ایک زیادہ سخت نظام وجود میں آتا ہے اور املاک کے حقوق واضح طور پر تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امن کے زمانے میں قبائل کی دلچسپی رسوم کی ادائیگی پر زیادہ ہوتی ہے۔ جن پر آبادی کی صحت اور خوش حالی کا، ان کے خیال کے مطابق انحصار ہوتا ہے۔ خاص جگہوں پر دیوتاؤں کے لیے یا بزرگوں کی ارواح کے لیے مندر تعمیر کرتے ہیں۔ وہ پجاری جو ان

مندروں میں جاتے ہیں، بزرگوں کی دانش کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کا فن اور اسے فروغ دینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ عام لوگ معاشی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں، جب معاشرہ شکار اور غذا اکٹھی کرنے کے دور سے نکل کر آگے بڑھا تو معاشی سرگرمیوں میں زراعت کو بالادستی حاصل ہوگئی، اگرچہ کچھ لوگ گلہ بانی اور بھیڑیں پالنے، دھات کا کام کرنے اور دوسری دست کاریوں میں بہ دستور مصروف رہتے تھے۔ جب آبادی بڑھی اور چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں ابھرنے لگیں تو زراعت کا رواج بڑھ گیا۔ عام طور پر شہری بستیاں دریا کی وادی میں تعمیر ہوتی تھیں، جہاں آب پاشی کی آسانی تھی یا جوہڑ والی زمین کو کام میں لانا آسان ہوتا تھا۔ سمیرا والوں کا شہر اُرک جو تغریز اور فرات کی نشیبی وادیوں میں قائم ہوا، 4300 اور 3100 قبل مسیح میں بہت پھل پھول رہا تھا۔ ایک درجن سے زیادہ شہر جن میں اُر اور اریدو بھی شامل ہیں، اس کے قریب ہی آباد ہوئے۔ مصر میں 4000 قبل مسیح میں دریائے نیل کے ساتھ بستیاں بہت سی جگہوں پر آباد ہوگئیں۔ ان کے باشندے عام طور پر ایک ہی قبیلے کے لوگ تھے۔ سب ایک ہی علامت کو مانتے تھے۔ ایک ہی سردار کی اطاعت کرتے تھے اور ایک ہی رسوم و رواج پر عمل پیرا تھے۔ دریائے سندھ کے قریب موئن جوڈارو اور ہڑپہ کی حالیہ کھدائی سے معلوم ہوا کہ یہاں کے باشندوں کا زیادہ ترقی یافتہ کلچر تھا۔ ان کا زمانہ 2500 اور 1900 قبل مسیح کا تھا۔ یہ جگہ پاکستان میں واقع ہیں۔ پہلی چینی شہری ریاست اور لوٹو (Erlitou) کی تعمیر 1900 قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ یہ جگہ دریائے زرد (Yellow) کی وادی میں واقع تھی، دو ہزار سال قبل مسیح میں مینوان بادشاہوں نے کریٹ (Crete) کے جزیرے میں کنوسس (Knossos) کے مقام پر بڑے بڑے محلات اور مندر تعمیر کرائے تھے، جنوبی میکسیکو میں مونٹی البان کے مقام پر امریکا میں تعمیر کیا جانے والا پہلا شہر دریافت ہوا۔

جب میسوپوٹیمیا اور مصر میں قدیم ترین تہذیبیں دریافت ہوئیں، اس وقت دنیا کی بیشتر آبادی قبیلوں میں رہتی تھی۔ خانہ بہ دوش لوگ اپنے ریوڑ ساتھ لے کر چلتے تھے اور بہتر چراگاہوں کی تلاش میں جگہ جگہ پھرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ گھر کا اسباب گاڑی پر لادتے تھے یا کشتی پر سفر کرتے تھے۔ جب وہ جنگ کرنے جاتے تو کنبوں کے سربراہ ایک کونسل کی صورت میں اکٹھا ہوتے اور اپنا بادشاہ مقرر کرتے، قبائلی رسوم اور ٹوٹکے مناسب رویے کا فیصلہ کرتے تھے۔ کسی جرم کے بعد سزا دینے کا معاملہ متاثرہ خاندانوں اور مخالف فریق کے درمیان نجی طور پر طے پاتا تھا۔ مصر اور میسوپوٹیمیا کی نہری وادیوں اور جوہڑ والی زمینوں پر اور شام اور ترکی میں

بھی شہری ریاستوں کے اندر ایک نئی طرح کی معاشرت نے جنم لیا، ان جگھوں پر زراعت میں مدد کے لیے آب پاشی کے کام ایک وسیع سماجی تنظیم کا مطالبہ کرتے تھے۔ چنانچہ کوئی مقتدر اشرافیہ جس کی رسائی تحریری ریکارڈ تک ہوتی اجتماعی مصریوں کا بندوبست سنبھال لیتی۔ وہ رواج جو اس وقت تک تحریر میں نہیں آئے تھے، ان کی جگہ قوانین تختیوں پر لکھے جانے لگے۔ زرعی اجناس کی بڑھتی ہوئی پیداوار نے فالتو معیشت پیدا کی، جو مقتدر اشرافیہ کے تصرف میں چلی جاتی۔ معاشرہ بہت آسودہ حال ہو گیا تھا۔ ان کے حاکموں کو اب تعیش کے اسباب، مثلاً زیورات اور عطریات کی ضرورت لاحق ہونے لگی۔ مرنے کے بعد ان کی تدفین تفصیلی رسوم کے ساتھ انجام پاتی، وہ خدمت گار جو خودکشی کر لیتے، ساتھ ہی دفن کیے جاتے تھے۔

سمیرا کی تہذیب میں ابتداً کوئی ایک درجن چھوٹے شہر شامل تھے جو موجودہ عراق میں ہیں۔ مندر کی حیثیت جنم دینے والے اداروں کی تھی، جہاں سے تہذیب نے ترقی کی۔ سمیرا کی سرزمین پر واقع مندر اینٹوں سے بنے ہوئے خاصے بڑے ڈھانچے تھے، جنہیں زغرات (مستطیل عمارت کی بالائی منزل پر معبد) کہا جاتا تھا اور اسے ایک اونچی چوٹی پر کئی منزلوں کے بعد بناتے تھے۔ پجاریوں کی ایک جمعیت، جن کے ساتھ عورتیں بھی اکثر مدد کے لیے ہوتیں، اس عمارت میں رہتے تھے اور یہی مقامی دیوتا کا معبد بھی ہوتا تھا۔

ان کا دیوتا ایک پُرشکوہ مجسمے کی صورت میں جس کے حیوانی یا انسانی اعضا ہوتے، نمودار ہوتا۔ یہ دیوتا شہر کے آس پاس کی بیشتر اراضی کا مالک ہوتا تھا، چنانچہ کسانوں کو لگان دینی پڑتی تھی۔ عالی مرتبہ پجاری، جنہیں پیٹسی (Patesi) یا پجاری بادشاہ کہتے تھے، مقامی دیوتا کے نام پر حکومت کرتے تھے۔ دیوتا کے آگے عام لوگوں کی نمائندگی پجاری کا ہی کام تھا، وہی بستی کا محافظ ہوتا تھا۔ تاہم مندر تجارتی سرگرمیوں کے مرکز بھی ہوتے تھے جہاں اناج اور دیگر اشیا ذخیرہ کی جاتی تھیں۔ پجاریوں کی بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ ایک اچھی فصل کو یقینی بنانے کے لیے رسوم ادا کرتے رہیں اور ستاروں کا اور نجوم کے دنوں کا ریکارڈ رکھیں اور یہ بتائیں کہ کاشت کے لیے سب سے سازگار وقت کون سا ہو گا۔ پجاری اجتماعی رسوم بھی ادا کرتے۔ تنازعوں کا فیصلے کرتے، امراض کا علاج کرتے، دست کاریوں کو بڑھاوا دیتے اور مقامی معاملات نپٹاتے تھے۔ اب یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک چھوٹی سی برادری جو ایک معبد کے گرد آباد تھی کس طرح بہت سے فرائض، جو بیشتر خصوصی نوعیت کے ہوتے، انجام دے رہی تھی۔

پجاری بادشاہ جو دیوتاؤں کے خادم کی حیثیت سے سمیرا کے شہروں پر حکمرانی کرتے، مذہبی اور سیاسی، بہ یک وقت دونوں طرح اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ معاشرہ اس وقت تک ایک جڑی ہوئی شکل میں تھا۔ بادشاہی امور رفتہ رفتہ کر کے مذہبی امور سے الگ ہو گئے۔ شہری ریاستوں کے علاقوں میں جب توسیع ہوئی تو ایک نے دوسرے کے دائرہ اختیار میں مداخلت شروع کی، تو ان کے درمیان تصادم اور جنگیں بھی ہوئیں۔ جب تک شہری ریاستیں چھوٹی اور منتشر حالت میں تھیں فوجی امور نسبتاً غیر اہم تھے۔ تاہم اراضی اور پانی کے حقوق پر برادریوں کے درمیان تنازعے بڑھنے لگے۔ انہی میں سے ایک مشہور تصادم سمیرا کے نواحی شہروں لاغاش اور امہ کے درمیان ایک نہر کی ملکیت کے دعوے پر ہوا جو دونوں ریاستوں کی سرحد پر واقع تھی۔ لاغاش کا بادشاہ ایناتم اس مقابلے میں کامیاب ہوا۔ اس فتح کے جشن کو ایک پتھر پر کندہ کیا گیا اور یہ دکھایا گیا کہ ایناتم کے فوجی دستے قدم بہ قدم آپس میں جڑے ہوئے، خُود اور ڈھال سے مزین چلے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تنازعے کی نوعیت اندرونی ہوتی اور برادری کی طرف سے کسی کو ثالثی کرانی پڑتی تھی۔ بادشاہ اگرچہ ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ ہوتے تھے، لیکن عمل میں پجاریوں سے بہتر ہوتے۔ ان کے رہائش محلات مندر کے پہلو میں ہوتے۔ انصاف کا دہرا نظام کام کر رہا تھا۔ ایک مذہبی اور دوسرا شاہی نظام تھا۔

شاہی حکومت کا معبد سے الگ ہونا، وہ فیصلہ کن واقعہ تھا جہاں سے پہلی تہذیب کا آغاز ہوا۔ جب ہمسائے میں شہری ریاستیں پھیلنے لگیں اور فوجی خدمات کی ضرورت بڑھنے لگی تو ممکن ہے ایک فطری ضرورت کے تحت شہنشاہت ظہور میں آئی۔ دوسری طرف آباد بستیوں میں اس طرح کی حکمرانی غالباً اس بنا پر نافذ کی گئی ہو گی کہ خانہ بدوش بادشاہوں نے حملہ کر کے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ بہت سے حکمران ابتدا میں لوٹ مار کرنے والے وحشی قبائل کے سردار تھے، جنھوں نے زراعتی معاشروں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور خاندانی حکومت قائم کر لی۔ مصر کا معبدی ادارہ جو رسوم، ٹونے ٹوٹکے اور جادو کے فن کے لیے معروف تھا، اسی طرح دولت مند ہو گیا کہ دیوتاؤں پر چڑھاوے آتے تھے اور مندر کی اراضیات سے آمدنی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود بہت سے پجاری دائمی زندگی کے ٹوٹکے اور جادو ٹونے کا کاروبار کرتے تھے۔ فراعین کو امون ری دیوتا کے فرزند سمجھا جاتا تھا جن کا مذہبی طریقہ دوسری مذہبی روایات سے متصادم ہوتا تھا۔ فوجی سردار ہونے کی بنا پر انہیں وسائل کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے معبد سے آنے والی دولت اللّے تللّے خرچ کرتے تھے۔ چونکہ وہ قانونی فیصلے کرتے تھے، لہٰذا انہیں یہ ضرورت محسوس

ہوئی کہ تمام فریقوں سے مساوی سلوک کریں، چنانچہ بادشاہ اروکاگینا (Urukagina) نے یہ فرمان جاری کیا کہ تمام بڑے پادریوں کو اب یہ اجازت نہیں ہوگی کہ ایک نادار ماں کے باغ میں داخل ہوں اور وہاں سے لکڑی بٹور کر لے جائیں اور نہ ٹیکس کے لیے وہاں سے پھل بٹوریں گے۔ یوں بادشاہ ایک منظم معاشرے کا محافظ اور امن کا پاسبان بن گیا۔حمورابی کے ضابطے کی ابتدائی سطور یہ ہیں، ''اس وقت (دیوتاؤں) انو اور بعل نے مجھے حمورابی کہا، عالی رتبہ شہزادہ، دیوتاؤں کا پجاری، تاکہ وہ انصاف کو زمین پر پھیلائے، شر اور فساد کو ختم کرے، طاقت وَر کو روکے، تاکہ وہ کمزور پر ظلم نہ کرے۔ زمین کو روشن کرے اور لوگوں کی بھلائی کو آگے لے جائے۔

''اور اس کی بدترین بات یہ ہوگی کہ وہ ستم گر اور ظالم بن جائے جو اپنی خواہشوں کے لیے لوگوں پر ٹیکس لگائے یا دوسری قوموں پر جارحانہ حملے کرے۔ حواری سیموئیل نے یہودیوں کو تنبیہ کی تھی جو بہت شور شرابہ کر رہے تھے کہ ہمیں ایک بادشاہ چاہیے، تو وہ بادشاہ 'تمہارے بیٹوں کو اپنی ملازمت میں لے کر اپنی رتھ میں لگا دے گا اور گھوڑوں کی خدمت کے لیے رکھ لے گا۔ اور انہیں اپنی جنگوں کا آلہ کار بنائے گا... اور تمہاری بیٹیوں کو توشہ خانوں، باورچی خانہ اور تنور پر کام کرنے کے لیے لگا دے گا اور وہ تمہارے کھیت اپنے قبضے میں کر لے گا۔تمہارے انگوروں کے باغیچے اور پھلوں کے باغ، بلکہ ان میں جو سب سے اچھے ہیں وہ اپنے ملازموں کو دے دے گا۔ وہ تمہارے خادموں کو اور خادماؤں کو اپنے ساتھ لے جائے گا اور انہیں اپنی خدمت پر لگا دے گا۔ وہ تمہاری بھیڑوں کا دسواں حصہ بھی لے لے گا۔''

وحشی لٹیروں کے سرداروں کے برعکس ایک مہذب معاشرے کے حکمران کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ آبادی کی دیکھ بھال اس طرح کرے کہ وہ اپنی محنت کے بل پر پھل پھول سکے۔ بنیادی طور پر اس میں ایک فوج رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو سرحدوں پر بیرونی دشمنوں سے بستی کی حفاظت کر سکے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں فسادی اور مجرم عناصر کے خلاف ملک کے اندر جنگ کر سکے۔ غیر ملکی شہروں پر چڑھائی کے لیے بادشاہ کو سواری کی خاطر رتھ کی ضرورت ہوگی اور وہ تیر کمان سے مسلح ہوگا۔ پیدل سپاہیوں کا ایک دستہ، قدم سے قدم ملائے اس کے ساتھ چلے گا۔ اکثر اس چڑھائی کا مقصد سامان لوٹنا ہوتا تھا۔ جنگ کے نتیجے میں جنگ پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ جلد ہی سیاسی سلطنتیں وجود میں آنے لگیں۔ تقریباً 3000 سال قبل مسیح میں شمالی مصر کے شاہ نارمر (King Narmer) نے شمال کے دوآبے کو فتح کرلیا، وہ پہلا فرعون بنا

جس کے سر پر دہرا تاج تھا۔ چوبیسویں صدی قبل مسیح میں اغاز کے بادشاہ سرغون اول نے میسوپوٹیمیا میں اپنی حکومت قائم کی، جو پہلی بادشاہت تھی۔ اس وقت نوجوانوں کے لیے فوج کی ملازمت ان کی ترقی کا زینہ بن گئی۔ جو حوصلے اور شہ زوری سے خود کو نمایاں کر سکتے تھے، روم کے جنرل ماریس نے باتنخواہ پیشہ وَر سپاہیوں کی ایک فوج تیار کی، جو اس کے وفادار تھے، وہ مالِ غنیمت میں حصہ دار ہوتے تھے اور انہیں بڑھاپے کی پنشن بھی ملتی تھی۔

یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہت نے اپنی ہیبت ناک طاقت سے اور جبر کے ذریعے کس طرح لوگوں کے دلوں اور ذہنوں کو مسخر کیا۔ بادشاہ زبردست فوجیں رکھتے تھے جو دشمنوں کو ہلاک کر دیتے۔ شکست خوردہ لوگوں کو غلام بنا لیتے اور ان کی دولت چھین لیتے۔ فوجی فتح سے جو فخر پیدا ہوتا اس سے ریاست کے ساتھ وفاداری کے جذبے کو تقویت ملتی تھی۔ تاہم بادشاہ اور شہنشاہ دیوتاؤں کے اختیارات کا احترام کرتے۔ جو بادشاہ دوسرے شہر فتح کرتے وہاں اکثر مفتوحہ لوگوں کے دیوتاؤں کے مجسمے ان کے دارالحکومت میں دیوتاؤں کے معبد کے درمیان ایستادہ کرتے تھے۔ ریاست کے امور میں ہنرمندی کے ساتھ اچھی خاصی مذہبی حکمت عملی بھی شامل کی جاتی تھی۔ بادشاہ طاقت کے استعمال سے زیادہ اپنے احکامات کے ذریعے عام لوگوں میں اطاعت کی عادت پیدا کر کے ان پر حکومت کرتے تھے۔ قدیم مصر میں آبادی کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ عام لوگوں کے تحفظ کا اظہار فرعون کے دبدبے پر تھا، جسے مزید تقویت عام تقریبات سے، مجسموں سے اور مفروضہ طور پر دیوتاؤں تک رسائی کے ذریعے ہوتی تھی۔ مردوں کے بارے میں مصریوں کا مسلک یہ تھا کہ بعد از مرگ زندگی کی چابی فرعون کے پاس ہوتی تھی، اس کی اپنی متوقع دائمی زندگی سے اس کی وفادار رعیت کو بھی وہی زندگی ملتی تھی۔

کسی حکومت کے داخلی نظم و نسق کا انحصار ٹیکس کے مؤثر انتظام اور قانون کی عمل داری پر ہوتا ہے۔ قدیم مصر میں پجاری معبد کے ساتھ کے اسکولوں میں امرا کے بچوں کو لکھنا سکھاتے تھے۔ ان کا خاص مقصد یہ ہوتا تھا کہ ریاست کے دفتری کاموں کے لیے منشی تیار کریں۔ حکومت کے کلرک اعداد و شمار کو اپنی نظر میں رکھتے تھے۔ ٹیکس کے ریکارڈ کا جائزہ لیتے تھے، وصیّوں پر فیصلے کرتے اور دستاویزات کا حساب کتاب کرتے تھے۔ عدالت میں قانونی دلائل زبانی نہیں بلکہ تحریری طور پر پیش کیے جاتے تھے۔ تحریری دستاویزات کے بغیر سرکاری امور کی انجام دہی ممکن ہی نہیں تھی، جب تحریر وجود میں آ گئی، وہ قبائلی رسمیں جن کے تحت لوگوں کے

رویے متعین ہوتے تھے، ان کی جگہ قانونی اصولوں نے لے لی۔ ان قوانین کے نفاذ سے انصاف حاصل کرنے کے لیے ذاتی انتقام لینے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ قوانین کی رو سے شکایات کے ازالے کے لیے عدالت میں کارروائی کے طریقے اور سزائیں مقرر تھیں۔ حکومت کا سربراہ منصف بھی تھا اور انصاف دینے والا بھی۔ چین میں جب ابتدائیں قانونی اصولوں کے نفاذ کی کوششیں ہوئیں تو آبادی نے اس کے خلاف سخت مزاحمت کی کہ وہ رسوم و رواج کے عادی تھے۔ بالآخر ایک سمجھوتا طے پا گیا۔ اس کے تحت حکومت کو اجازت دے دی گئی کہ فوجی پالیسی کے معاملات طے کرے، البتہ روزمرہ امور میں مقبولِ عام رسمیں فیصلہ کن تھیں۔

تہذیب کے پہلے عہد میں بادشاہ کے کردار میں یہ اضافہ ہو گیا کہ وہ سارے امور بھی انجام دے جو حکومت سے وابستہ ہو چکے تھے۔ فوجی امور کی برتری تو مسلم تھی ہی، اب بادشاہ کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ امن کے زمانے میں معاشرے کو مستحکم کرے۔ وہ انصاف صادر کرتا تھا، عوامی تعمیر کے کاموں کو منظم کرتا تھا، غیر ملکی حکومتوں کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال رکھتا تھا، خراج وصول کرتا یا ادا کرتا تھا اور عوامی رسوم کی ادائیگی میں اپنی شرکت سے مذہب کو قائم رکھتا تھا۔ بادشاہوں نے ناپ تول کا دستور بھی رائج کیا، انہوں نے سرکاری کیلنڈر بھی وضع کیے۔ لاغاش کے بادشاہ اروکاگینا نے ایک حکم جاری کر کے غیر ملکی تجارت کو فروغ دیا کہ ریاست میں آنے والے تاجروں سے مار پیٹ نہ کی جائے۔ اُر کے بادشاہ شلگی نے قانون، محاصل، کیلنڈر اور ناپ تول کے معاملات میں خاصی اصلاحات کیں۔ بابل کے حموربی نے مندر اور حصار تعمیر کرائے، نہریں کھدوائیں اور اپنی حکومت میں توسیع کرتے ہوئے مشہور قانونی ضوابط مرتب کیے۔ سکندر اعظم نے جن علاقوں کو فتح کیا، ان میں یونانی رسم الخط نافذ کیا۔ کون چنگ نے، جو زی (Tsi) کے بادشاہ کا مشیر تھا، کانسی کی بجائے لوہے کے اسلحے رائج کیے اور لوہے اور نمک کی اجارہ داری حاصل کر کے ریاست کو مستحکم کیا۔ کنفیوشس نے کہا تھا، ''اگر کون چنگ نہ ہوتا تو ہمارے سروں کے بال اب تک اسی طرح الجھے ہوئے ہوتے اور ہمارے کوٹ کے کاج بٹن بند کرنے کے لیے بائیں جانب ہوتے۔'' فارس کی پہلی بادشاہت میں بڑے پیمانے پر سڑکوں کا جال بچھایا گیا اور ان کی اچھی دیکھ بھال ہوتی رہی۔ چین کے شہنشاہ شیہ ہوانگ زی نے گاڑیوں میں پہیوں کے درمیان ایکسل (Axle) کا ایک خاص فاصلہ مقرر کر دیا۔ اس طرح تمام گاڑیاں کچے راستے پر نپے تلے درمیانی فاصلے کے ساتھ روانی سے چلتی رہتی تھیں۔ اس نے عظیم دیوار کی تعمیر کا بھی حکم دیا اور اس عظیم نہر کو بہتر بنانے کے لیے

کہا جو مشرقی ساحل کے ساتھ بہتی آئی ہے۔ رومن بادشاہوں ٹیٹوس (Titus) اور ویسپاسیان (Vespasian) نے کولوسیم (دنگل) تعمیر کروایا، جہاں پبلک کی تفریح کا سامان مہیا تھا اور وہ وہاں بیٹھ کر تلوار زنوں کے مقابلے دیکھ سکتے تھے۔ ایک خاص تہوار کے موقع پر کم وبیش دس ہزار افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ شاہی حکمرانوں نے سکے جاری کیے، انہوں نے اپنے خرچ پورے کرنے کے لیے ٹیکس جمع کیے، یا یہ کام کسانوں سے ٹیکس وصول کر کے پورے کیے۔ حکومتوں نے دور افتادہ مقامات پر فوجی چھاؤنیاں تعمیر کرائیں۔ اپنی سلطنت کے طول و عرض میں پیغامات کی ترسیل کے لیے ڈاک کا نظام قائم کیا۔ انہوں نے اعلیٰ افسروں کی دفتر شاہی پر نگرانی رکھی تا کہ وہ مذکورہ فرائض انجام دیتے رہیں۔ تاریخ کے اس اولین عہد میں، روم کی سڑکوں، کنوؤں، غسل خانوں اور آبی گزرگاہوں کو اور مصر یا مایان کے اہرام کو دیکھ کر، ساریان یا مینوان کے محلات کے کھنڈر دیکھ کر اور چین کی عظیم دیوار کو دیکھ کر اس تہذیب کی شان وشکوہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسرے عہد میں عالمی مذہب کا الگ ہونا

ایک ہزار سال قبل مسیح میں جب حروف تہجی کی تحریر یورپ اور جنوب مغربی ایشیا میں پھیل گئی تو انسانی تہذیب میں ایک غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی۔ یہی وقت تھا جب زمین پر آباد اقوام دلیل اور صداقت سے واقف ہوئیں۔ کارل جیسپر (Karl Jasper) نے اس دَور کو گہری عقلیت پسندی کا دَور کہا ہے اور ''محوری دَور'' قرار دیا ہے۔ یہ وہ دَور تھا جس کے لیے آرنلڈ ٹوائن بی نے کہا کہ ''یہ وہ محور تھا، جس پر انسانی تاریخ گھومتی تھی۔'' تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں دنیا کے عظیم فلسفہ دانوں اور روحانی راہ نوردوں کی بہت بڑی اور غیر متناسب حد تک کثیر تعداد پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں یہی وہ زمانہ تھا جب گوتم بدھ اور مہاویر اپنی روح کی روشنی کی خاطر نئی راہیں دریافت کر رہے تھے۔ ادھر فارس میں زرتشت، زرتشتوں کا پیغمبر خیر و شر کا ایک فلکیاتی جائزہ مرتب کر رہا تھا۔ جودہ میں یرمیاہ (Jeremiah) از کائیل اور عیسیاہ دوئم یہودی قوم کی بحالی کے لیے خدائی منصوبہ بنا رہے تھے۔ مصر میں فیثا غورث، ہر کیولیٹس اور سقراط آخری صداقتوں کی تلاش میں سرگرم تھے۔ چین میں لاؤسی اور کنفیوشس پاک بازی کی زندگی کے اصول وضع کر رہے تھے۔

عبرانی مذہب نے، جس نے قربانی کی رسمیں جاری رکھی تھیں، اچانک اپنا راستہ بدل دیا، آموس پہلا محرر پیغمبر تھا جس نے خدا کے بیان کی رو سے لکھا، ''مجھے نفرت ہے، مجھے

تمہار اس زیارت اور دعوت سے نفرت ہے، میں تمہاری ان قربانی کی رسموں سے بالکل خوش نہیں ہوں گا۔ (اس کی بجائے) انصاف کو ایک دریا کی طرح بہنے دو اور حق وصداقت کو اس طرح جاری رکھو جیسے ہمیشہ بہنے والا چشمہ ... شر سے نفرت کرو اور خیر سے محبت کرو۔ عدالتوں میں انصاف کو عدل کے تخت پر بٹھاؤ۔'' میکاہ پیغمبر نے لکھا، ''جب میں اپنے آقا کے پاس جاؤں گا تو کیا لے کر جاؤں گا؟ کیا میں اس کے پاس قربانی یا بچھڑے لے کر جاؤں گا؟ کیا میرے معبود کو ہزاروں دنبے یا تیل کے دس ہزار دریا قبول ہوں گے، خدا نے بتا دیا ہے کہ نیکی کیا ہے اور یہ بھی کہ وہ تم سے چاہتا کیا ہے؟ بس یہی کہ انصاف سے کام کرو، وفا پرستی سے محبت کرو، اپنے خدا کے آگے دانش مندی سے چلو۔'' اس دوران میں بدھ ہندوستان میں پجاریوں کے اقتدار کو چیلنج کر رہا تھا، جو تمام رسوم پر تصرف رکھتے تھے اور انہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ''اپنی ذات اور سچائی کے درمیان فرق کرنا سیکھو،'' بدھا نے کہا تھا، ''تمہارا نفس ہی خود غرضی کا سبب اور فساد کا ذریعہ ہے۔ سچائی، نفس سے نہیں ڈرتی۔ یہ عالم گیر ہے اور انصاف اور سچائی کی طرف لے جاتی ہے۔ راست روی اور انصاف دونوں کا تعلق اخلاقیات سے ہے اور وہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں۔ صحیح علم اور عقیدہ مذہبی طرزِ عمل کی بنیاد ہیں۔

ایک نئی تہذیب کی نشوونما ہو رہی تھی، جو ایک عالمی مذہب پر جا کر دم لے گی۔ یہ مندر کے پجاریوں کا موروثی مذہب نہیں تھا بلکہ ایسا مذہب تھا جس میں فلسفہ کی روح شامل تھی۔ مسیحیت اور اسلام اس کے خاص نمائندے ہیں۔ اس حقیقت سے کسی کو الجھن محسوس نہیں کرنی چاہیے کہ دونوں طرح کے معمولات کو بیان کرنے کے لیے ایک ہی لفظ ''مذہب'' استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کے دَور میں رسوم پر مبنی بہت سے دیوتاؤں کی عبادت کا جو طریقہ رائج تھا، اس کا اور نام نہاد اعلیٰ تر مذاہب کے درمیان کوئی تسلسل نہیں، جن کا تعلق مذہب کے دوسرے دور سے تھا۔ بادشاہوں کی حکمرانی درمیان میں آ گئی تھی۔ اب انسانیت کے پاس تنظیم کا ایک مکمل نمونہ آ گیا تھا، جس کے آگے عالمی مذاہب کے تصورات ڈھالے گئے۔

عالمی مذاہب کی نوعیت کا سراغ ان قبیلوں میں ملتا ہے جہاں سے ان کے بانی نکل کر آئے۔ سدھارتھ (بدھا) نیپال کے ساکیہ قبیلے کے شاہی خاندان کا شہزادہ تھا۔ وہ برہمن پجاری نہیں تھا بلکہ کھتری یا جنگ جُو ذات کا ایک فرد تھا، جو شاہی حکومت سے وابستہ تھا۔ بدھا

گوشوارہ2-1 Table: 2-1

فلسفی، پیغمبر اور مذہبی رہنما، تاریخ اور مقام کے لحاظ سے

نام	تاریخ	مقام
اخناتون	1375-1358 B.C.	مصر
موسیٰ	13ویں صدی قبل مسیح	مصر
ایلیاہ	9ویں صدی قبل مسیح	اسرائیل
اموس	8ویں صدی قبل مسیح	اسرائیل
یرمیاہ	628-586 B.C.	اسرائیل
تھیلیس	636-546 B.C.	یونان
زرتشت	628-551 B.C.	فارس (ایران)
لاؤزی	چھٹی صدی قبل مسیح	چین
عزاقیل	چھٹی صدی قبل مسیح	اسرائیل
عیسایاہ ثانی	چھٹی صدی قبل مسیح	اسرائیل
فیثاغورث	582-507 B.C.	یونان
بدھا	563-483 B.C.	ہندوستان
کنفیوشس	551-479 B.C.	چین
مہاویر	540-468 B.C.	ہندوستان
ہیراکلیس	535-475 B.C.	یونان
موزو	پانچویں صدی قبل مسیح	چین
سقراط	469-399 B.C.	یونان
افلاطون	427-347 B.C.	یونان
ارسطو	384-322 B.C.	یونان
مَین شی اُس	371-288 B.C.	چین
عیسیٰ	4 B.C-30 A.D.	اسرائیل
سینٹ پال	پہلی صدی عیسوی	اسرائیل
جوہن بن ذکّائی	پہلی صدی عیسوی	اسرائیل

پلوٹی نس	205-270 A.D.	مصر
مانی	216-276 A.D.	فارس
سینٹ آگسٹائن	354-430 A.D.	شمالی افریقا
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	570-632 A.D.	عرب

نے اوائل عمری میں ہی تخت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تا کہ اپنی ذات کی روشنی حاصل کرے۔ اسی طرح عیسیٰ بھی لیوی کے عبادت گزار قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ بادشاہ داؤد کے خاندان سے تھے۔ جس کا تعلق جودا قبیلے سے تھا۔ عیسیٰ کو جب صلیب پر چڑھایا گیا تو صلیب کے اوپر ایک نشان آویزاں تھا، جس پر تین زبانوں میں لکھا تھا ''ناذرتھ کا عیسیٰ، یہودیوں کا بادشاہ۔'' جان کی انجیل میں صریح کے طور پر یہ عبارت ہے کہ یہودیوں کے بڑے پروہتوں نے پونٹیئس پائلیٹ (Pontious Pilate) کو آمادہ کرنا چاہا کہ اس نشان کو بدل دیں تا کہ اس طرح پڑھا جائے: ''اس نے یہودیوں کی بادشاہت کا دعویٰ کیا تھا لیکن پائلیٹ نے انکار کر دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قبیلے سے تھے، جو مکہ کے حکمران طبقہ میں سے تھا۔ وہ بادشاہ یا بڑے پجاری نہیں تھے، بلکہ بدوی شتربان تھے اور قافلوں کی راہنمائی کرتے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بجائے خود ایک تاجر تھے جو خدا کی وحی وصول کرنے سے پہلے تک اپنے پیشے میں بہت مصروف رہتے تھے۔

یہ حقیقت کہ ان میں سے کوئی بھی مذہبی رہنما پجاریوں اور پروہتوں کے طبقے سے نکل کر نہیں آیا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ مروجہ مذہب کے اندر اصلاح کرنے والے نہیں تھے بلکہ ایک مختلف قسم کے مذہب کے بانی تھے۔ بدھ، عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تاریخ کے بعد کے ادوار میں آئے، ان میں روایتی عبادت اور پوجا پاٹھ سے زیادہ مشترکہ عنصر بادشاہی حکومت کا ادارہ تھا۔ چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح کے دوران میں جو فلسفے کا انقلابی زمانہ تھا، نئے مذاہب میں اس کے اثرات نظر آتے تھے۔ اسی کے تعلق سے حروفِ تہجی کی عبادت کا آغاز ہوا۔ فلسفیوں نے عمومیت کے تصور کو فروغ دیا، جس سے مراد یہ تھی کہ وحدت میں کثرت پائی جاتی ہے۔ ایک بادشاہ تن تنہا بہت سے لوگوں پر حکمرانی کرتا تھا۔ یہ تمام باتیں مل کر ایک نئے اندازِ فکر کو فروغ دے رہی تھیں۔ یعنی یہ تلاش کہ دنیا کی تنظیم کس طرح ہوئی۔ مقامی نوعیت کے مذاہب، جن کی بنیاد بہت سی دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش تھی، اب ان کی جگہ ایک خدا کے تصور نے لے لی جو ساری کائنات کا حکمران تھا۔ فلسفیوں نے اپنی توجہ انسانی

معاملات کی طرف کی اور انصاف اور نیکی کے تصورات پر مکالمے ہونے لگے۔ یہ کچھ اس نوعیت کے تھے جو شاہی حکومتوں کے اصولوں میں شامل تھے۔

آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ حروف تہجی پر مبنی تحریریں سب سے پہلے 1500 قبل مسیح میں مصری سلطنت کے تحت ایشیائی علاقوں کے اندر دیکھی گئیں۔ اس نئے طرز تحریر کو مشرق قریب میں سامیوں نے استعمال کیا۔ مذہب میں وحدانیت کا پہلی بار اظہار بھی دنیا کے اس خطے سے ہوا۔ موسیٰ سے ایک صدی پہلے ''کافر'' فرعون اخناتون (حکمران 1372-1354 قبل مسیح) نے یہ دعویٰ کیا کہ خدا ایک ہے، وہ ہے ایٹن (Aton)، سورج کا دیوتا۔ لیکن اس کی شبیہہ بنانے سے روک دیا، کیوں کہ اس خدا کی کوئی جسمانی ہیئت نہ تھی۔ جب اخناتون مرگیا تو امون ری کے پجاریوں نے دوبارہ اقتدار سنبھال لیا اور ان کے جانشین توتین خامون (TutanKhamen) نے پرانا مذہب بحال کر دیا۔ یہ مذہبی انقلاب اپنی ناکامی کے باوجود جس کی تحریک دنیا کے سب سے طاقت وَر حکمران نے ذاتی طور پر کی تھی، کلچر پر اپنے گہرے اثرات چھوڑ گیا۔ اس وقت مذہب وحدانیت کے لیے نہایت سازگار تھا۔ بعض مؤرخوں نے یہ کہا ہے کہ ایک خدا کا تصور دراصل اخناتون کے پیش روؤں کی اس خواہش کا آئینہ دار تھا اور اس میں خاص طور پر خواہش مندتت موز سوم تھا کہ مصر کا بحیرۂ روم کے مشرقی علاقے سے اشتراک ہو جائے۔ اس شبیہ میں خدا، فرعون کے مشابہ تھا، ایسا وجود جس سے ڈرنا اور جس کا احترام کرنا چاہیے۔

موسیٰ نے وحدانیت کا زیادہ دیرپا ڈھانچا مہیا کیا۔ اس نے یہودیوں کے قبائلی خدا کو ایک سب سے برگزیدہ ہستی کا درجہ دیا اور اس نکتے پر زور دیا کہ ان کے خدا یہووا (Jehovah) نے کئی نہایت واضح معجزوں کے ذریعے عصری خدا پر اپنی برتری ثابت کر دی تھی اور جب ہی تو فرعون نے یہودیوں کو مصر سے نکل جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک خدا جس کی اطاعت فطری عناصر کرتے ہوں، اسے حقیقی ہونا چاہیے۔ اگرچہ ابتدائی یہودیت کے واقعات چھٹی اور پانچویں قبل مسیح کے فلسفیانہ انقلاب سے پہلے کے ہیں، لیکن ان سے ویسی ہی عقلیت پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ تحریری قانون نے یہودی قومیت کی تشکیل میں شروع ہی سے ایک کردار انجام دیا تھا۔ کندہ کی ہوئی شبیہوں کی پرستش کی ممانعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ خیالات کو زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہودی مذہب میں رسوم کے حوالے سے بہت سے رسوم پر مبنی عناصر شامل ہو گئے تھے، لیکن 'دس احکام' (Ten Commandments) میں

ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ احکام عام اصولوں پر مبنی ہیں۔ جو قابلِ قبول یا ناقابل قبول رویوں پر مشتمل ہیں۔اس میں پہلا حکم یوں شروع ہوتا ہے:

''میں تمہارا آقا ہوں، تمہارا خدا، جو تمہیں مصر سے نکال کر لایا۔تمہارے پاس کوئی اور خدا میری مخالفت کے لیے نہیں ہے۔'' وحدت پرستی بجائے خود قانون کے اندر موجود ہے۔

سن 800 اور 500 قبل مسیح میں ہندوستان کے مذہب کے اندر ایک فلسفیانہ پہلو نظر آنے لگا۔اس وقت برہمنوں کا معبدی نظام سماج میں اپنی بالادستی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔حروف تہجی پر مبنی تحریر براہمی متعارف کی جا رہی تھی۔نوجوانوں کو درس دینے والے پروہت تھے اور معاشرے کی مجلسی تہذیب کے محافظ بھی وہی تھے۔ ویدک کی رسمیں اور داستانیں جو لکھی گئی تھیں، ان کو سنسکرت کا مقدس ادب شمار کیا جانے لگا۔ان صحیفوں کے ابتدائی حصے میں مذہبی رسوم کی ادائیگی کی رسمیں درج تھیں، مناجاتیں، جنتر منتر اور دعائیں بھی تھیں، تاہم پجاریوں نے بعد میں ان کی وضاحت کے لیے حاشیے بھی لکھے۔انہی کوششوں کے نتیجے میں براہمان اور اپنشد وجود میں آئیں، جو فلسفیانہ دستاویزات تھیں، تاکہ تنہائی میں جنگلوں کے اندر یکسوئی کے ساتھ پڑھی جائیں۔ان تحریروں میں زندگی کے لازمی سوالوں کے جواب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ایک فرد کی روح اس کے پورے بیرونی وجود کی طرح ہوتی ہے۔چھٹی صدی قبل مسیح تک گوتم بدھ کی زندگی میں مذہبی مباحثوں نے کھلی اور آزاد فلسفیانہ مکالمے کی جگہ لے لی تھی، اور تمام عقائد اور اصولوں پر جرح کی جا رہی تھی۔ کلاسیکی یونان کی طرح ان میں مادہ پرست، مسلمہ اور باطل دلائل سے قائل کر دینے والے بھی شامل ہوتے اور کسی بھی موقف پر بحث چھیڑ دیتے۔ ہر ایک بطور خود سچائی کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔

تیسری اپنشد میں ایک بادشاہ کی کہانی درج ہے جس نے سادہ زندگی گزارنے کی خاطر تخت و تاج کو تج دیا تاکہ جنگل میں جائے، اپنے ذہن کو صاف کرے اور کائنات کے بھید معلوم کرے۔ بدھ کا کام بھی یہی تھا، مہاویر اور دوسرے ہندوستانی دانش وَروں کا وظیفہ بھی یہی تھا۔کہانی یہ بتاتی ہے کہ بدھ کی پیدائش کے وقت یہ پیش گوئی کر دی گئی تھی کہ یہ بچہ بڑا ہو کر یا تو پوری دنیا کا بادشاہ بنے گا یا اگر اسے درد اور اذیت کی زندگی کے کچھ تجربے ہوئے تو وہ نجات کا راستہ ڈھونڈ نکالے گا۔ چار طرح کے مصائب سے گزرنے کے بعد نوعمر سدھارتھ نے اپنے کنبے اور شاہی ورثے کو چھوڑ دیا۔اس نے زہد اور مراقبے میں اپنے شب و روز گزارے اور

روحانی روشنی حاصل کی۔ اور گھوم گھوم کر قریہ قریہ کو درس دینے لگا۔ بدھ کے مذہبی کردار نے ایک ڈرامائی صورت پیدا کر دی تھی کہ ایک طرف دنیاوی اقتدار تھا اور دوسری طرف سچائی کی تلاش اور ان کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا تھا۔ بدھا کے لیے دونوں راستے کھلے تھے، لیکن اس نے اعلیٰ تر نیکی یعنی سچائی کا انتخاب کیا۔ (عیسیٰ کو بھی شیطان نے اسی طرح انتخاب کی پیشکش کی تھی کہ دنیا پر حکمرانی کرے، بجائے اس کے کہ خدا کے کام انجام دے) یہاں یہ بتا دینا سچ ہو گا کہ شاہی حکومت کا ادارہ دنیا میں بدھ کے خیالات کو پھیلانے کے خلاف تھا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی حکمران نے اشوک نے بدھ مت کو ریاست کا مذہب قرار دیا تھا۔

اس عہد کے دو اور دانش وَر زرتشت اور کنفیوشس تھے، ان دونوں کا ابتدا میں دنیاوی اقتدار سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بصیرت حاصل کر لینے کے بعد یہ لوگ اس تلاش میں سرگرداں رہے کہ کوئی صاحب اقتدار سرپرست مل جائے جو ان کے اخلاقی اصولوں کو نافذ کر دے۔ پیغام بر زرتشت نے وحدانیت کے مذہب کا منصوبہ پیش کیا جس میں خیر اور شر کے درمیان تصادم کی طویل تاریخی جدوجہد بیان کی گئی تھی۔ دو روحانی طاقتیں انسانوں کی ارواح پر قبضہ کرنے کے لیے آپس میں لڑ رہی تھیں۔ زرتشت کو فارس کے بادشاہ دشتاسپا کی صورت میں ایک سرپرست مل گیا۔ زرتشی مذہب کو ریاست کا پہلا اور ساسانیوں کی حکومت میں دوسری بار ریاست کا مذہب قرار دے دیا گیا۔ اس کا یہودیت پر، اس کی جلاوطنی کے بعد گہرا اثر پڑا تھا۔ کنفیوشس، قدیم چین کی تاریخ کا عالم تھا، جس نے زندگی بڑے آشوب کے زمانے میں گزاری۔ اس نے شانگ خاندان کے دو ''اچھے بادشاہوں'' کی حکمت عملی اور معمولات کے نچوڑ سے اخلاقی تعلیمات کا نمونہ مرتب کیا، جس کی بدولت اس کے خیال میں چینی معاشرے کی تجدید ممکن تھی۔ وہ کسی بادشاہ کی تلاش میں تھا جو اس کے پیغام کا اثر قبول کرتا، کہ اس دوران میں اسے چند مقلد طلبہ مل گئے۔ کنفیوشس خود بھی بہت سے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہا۔ اس کا فلسفہ عملاً اس وقت ریاست کا مذہب بن گیا، جب ہن بادشاہ دو۔ٹی نے یہ حکم صادر کیا کہ سرکاری عہدوں پر تمام تقرریاں اس بنیاد پر کی جائیں کہ امیدواروں نے کنفیوشس کی کلاسیکی تعلیمات کا امتحان پاس کر لیا ہو۔

فلسفیوں کو اپنے خیالات کی ترویج کے لیے حکومتوں کی سرپرستی درکار تھی۔ حکومت کے قائدین کو فلسفیوں کی ضرورت تھی جو معاشرے کی بہتری کے لیے اپنے خیالات کو بروئے کار لائیں یا ان کی بدولت حکومتوں کی دانش ورانہ حیثیت میں اضافہ ہو۔ افلاطون کی تجویز یہ تھی

کہ بادشاہ اور فلسفی ایک ہی فرد کو ہونا چاہیے۔ اس نے لکھا، ''جب تک فلسفی بادشاہ نہیں بنیں گے، یا بادشاہ، فلسفے کو اپنا مشغلہ نہیں بنائیں گے اور سیاسی اقتدار اور فلسفیانہ بصیرت میں ایک ارتباط پایا جاتا ہے، اس وقت تک نسل انسانی کی مشکلات ختم نہیں ہوں گی۔'' دوسری جانب شہزادے فلسفہ پڑھیں یا فلسفیوں کو حکمت عملی کے باب میں اپنے مشیر بنائیں۔ مثال کے طور پر سائیروکوس (Syracuse) کے جواں سال بادشاہ ڈائنوسس دوم (Dionysius-II) نے افلاطون کو انتظامیہ میں مشورے کے لیے بلایا۔ سیاست اور فلسفے کو آپس میں ملانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ فلسفہ مذہب کے روپ میں ایک عوامی تحریک کے ذریعے سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لے، اُسی طرح جیسے مارکسزم نے کیا تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینے کی حکومت کا سربراہ بنایا گیا تو سیاسی اقتدار سے ان کا تعلق قائم ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیقوں نے اس وقت فوجی طاقت کے ذریعے ایک سیاسی سلطنت قائم کر لی۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ضرورت نہ رہی کہ کسی بادشاہ سے آپ کا مذہبی پروگرام قبول کرنے کی درخواست کرتے۔

وہ مذہب جس کی بنیاد فلسفے پر ہو، حکمرانوں اور ان کی رعیت دونوں کے لیے پرکشش ہوتا ہے۔ ایک عالمی بھائی چارے کی اخلاقیات قبیلہ جاتی حدود کو توڑ کر، جس نے انہیں الگ الگ نسلوں میں بانٹ دیا تھا، آپس میں ملا دیتی ہے اور یوں حکومت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ مذہب جو جنت میں داخلے کا وعدہ کرتا ہے، موجودہ زندگی میں عمل کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ زرتشی یہودی مذہبی نظریے نے الوہی امداد کا سہارا لیا۔ زمین پر ایک مکمل معاشرہ بنانے کے لیے شاہی ترغیبات کا سہارا نہیں لیا۔ پیش گوئی کرنے والے مصنفوں نے آئندہ واقعات کا ایک منظر نامہ پیش کیا جس میں خیر اور شر، خدا اور شیطان کی باہمی جنگ دکھائی گئی اور عین اس وقت جب شیطان فتح مند ہوتا نظر آتا تھا، خدا اس اندیش ناک صورتِ حال سے بچنے کے لیے فتح حاصل کر لے گا اور یوں حق و صداقت کی دائمی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ اس عمل میں ایک آسمانی ہستی، مسیحا، مدد کو آئیں گے۔ عیسیٰ نے اسے ''انسان کا بیٹا'' بیان کیا تھا۔ یہ بیان دانیال کے ساتویں باب سے ماخوذ ہے۔ دانیال نے لکھا، ''میں نے دیکھا کہ کوئی جنت کے بادلوں کے ساتھ چلا آ رہا ہے ... اقتدار اعلیٰ، شان و شوکت اور شاہانہ اقتدار اس کے حوالے کر دیا گیا تاکہ تمام لوگ اور ہر زبان کی قومیں اس کی اطاعت کریں۔ اس کی حکمرانی دائمی حکمرانی ہو گی۔ اسے جانے نہ دیا جائے اور اس کے شاہی اقتدار کو ہرگز نقصان نہ پہنچے۔''

کیا وہ عیسیٰ تھا؟ دانیال کی تحریروں میں جس طرح کی بادشاہت کا بیان ہے، وہ مسیحی کلیسا کے مطابق ہے جو عیسیٰ کی روحانی قیادت میں پائی جاتی ہے۔ اگر عیسیٰ بادشاہ تھا تو وہ یقیناً عدم تشدد کا حامی ہوگا۔ ''امن کا شہزادہ'' کی اصطلاح متضاد لگتی ہے، کیوں کہ بادشاہ کی اولین ذمہ داری تو جنگ کرنا ہوتی ہے۔ اس کا اصل حوالہ سلیمان بادشاہ کے لیے تھا، جس کی پُرامن حکمرانی کا زمانہ داؤد کے بعد آیا۔ یہی محاورہ آگسٹس سیزر پر بھی منطبق کیا گیا تھا۔ جب جرمن قبیلوں نے نویں صدی عیسوی میں روم کے تین فوجی دستوں کو تہہ تیغ کر دیا تو آگسٹس سیزر نے مزید علاقائی فتوحات سے دست کش ہونے کا اعلان کر دیا۔ عیسیٰ کے لیے وہ نہایت موزوں خطاب تھا جس پر شاہی اقتدار طلب کرنے کا الزام تھا۔ لیکن اس نے اطاعت مندی کے جذبے سے مصلوب ہو جانا پسند کیا۔ کلیسا کا ابتدائی زمانہ صلح مندانہ تھا۔ اسے یاد تھا کہ مسلح یہودی جوانوں کا 70 عیسوی میں ماڈا کے مقام پر کتنا اندوہ ناک انجام ہوا۔ مسیحیوں کو روم کی شاہی فوج میں ملازمت سے منع کر دیا گیا۔ تیسری صدی عیسوی سے حکمت عملی میں بتدریج ترقی پیدا ہوتی گئی۔

مذہبی برادریاں معاشرے میں طاقت کے ابتدائی مراکز تھے، تاہم انہیں شاہی حکومتوں کے ساتھ طویل جدوجہد کرنی پڑی۔ ایسا نہیں ہوا کہ مذہب نے حکومت کے ادارے سے خود کو الگ کر لیا ہو، کیوں کہ حکومت اس عہد میں بجائے خود ایک مذہب تھی۔ یہ ایک مختلف طرح کا مذہب تھا جو مذہبی ساخت کے اداروں سے الگ تھا اور اس کی بنیاد دُنیاوی اقتدار پر تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روم کے معاشرے میں جو بے دین یا عناصرِ فطرت پر مبنی عبادتیں رائج تھیں، مسیحیت نے ان پر غلبہ پالیا تھا، لیکن مقامی برادریوں کے دیوتا بہت عرصے سے ان کے لیے زیادہ اہم شمار کیے جا رہے تھے، لیکن اس وقت ایک رائج قسم کا مذہب وہ تھا جسے ''شہری مذہب'' کہا جا سکتا ہے۔ جیسے آج کی دنیا میں حب الوطنی ہے کہ کوئی فرد ریاست کی اس طرح پرستش نہیں کرتا جتنا اپنی برادری سے وفاداری ظاہر کرتا ہے۔ تہذیب کے چوتھے عہد کے جنگی معاشروں میں ایسے باہمت افراد ہوتے تھے جو اپنی برادری کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ بوقت ضرورت جان دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیت کے ابتدائی زمانے کے صلح پسندوں کی تحقیر کی جاتی تھی۔ وہ تنہائی پسند اور آزردہ افراد ہوتے جن کی ساری امیدیں دوسری دنیا کے ساتھ لگی ہوئی تھیں اور جو اپنی برادری کے ساتھ بنیادی طور پر غیر وفادار سمجھے جاتے تھے۔

دونوں مذہبی نظریات میں ایک نمایاں تصادم سقراط کے خلاف مقدمے کے موقع پر ہوا۔ ایک سیاسی دھڑے کے ارکان نے ایتھنز میں اسے شہری عدم وفاداری کا ملزم ٹھہرایا۔ انہوں نے کہا کہ سقراط نے اپنے سیاسی مباحث سے شہر کے نوجوانوں کو بدراہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ ایتھنز کی اقدار پر حرف گیری کرنے لگے ہیں۔ سقراط کو ملزم ٹھہرایا گیا اور اسے موت کی سزا دی گئی۔ اس نے دلیری سے موت کا مقابلہ کیا، ساتھ ہی ایتھنز کے شہر میں اس کی فوجی خدمات کا شان دار ریکارڈ تھا۔ یہ دونوں خوبیاں اتنی ممتاز تھیں کہ تاریخ نے سقراط کی بجائے اس پر الزام لگانے والوں کو ملزم قرار دیا۔ سقراط نے ہی افلاطون کو تربیت کی تھی، جو ارسطو کا استاد تھا اور ارسطو نے سکندرِ اعظم کی بطور اتالیق تربیت کی تھی، جس کی فوجی فتوحات نے یونان کے فلسفے کو آدھی دنیا کے اندر دُور تک پہنچایا۔

روم کے شہریوں کا ایک ''شہری مذہب'' تھا، یہ تھا بادشاہ کی پرستش۔ ابتدائی زمانے کے مسیحیوں نے جو یہودی وحدت پرست تھے، بادشاہ کی الوہی روحانیت کو خراجِ عقیدت دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی سزا موت تھی۔ رومیوں کو بھی یہ شک تھا کہ عیسائی ایک خفیہ مردم کشی کی رسم کے مطابق انسانوں کا گوشت کھاتے اور ان کا خون پیتے تھے۔ لہٰذا مسیحی کلیسا کے پہلے تین سو سال بڑی سخت سزاؤں اور ایذاؤں میں گزرے۔ نیرو نے عیسائیوں کو روم کو آگ لگانے کا ملزم گردانا، اپنے مسیحی عقائد پر کاربند رہنے کے جرم میں بہت سے عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، لیکن کلیسا نے اس عذاب کو برداشت کر لیا۔ اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے مسیحیوں نے مقبولیت حاصل کی۔ روم کی سلطنت میں ان کی حیثیت ایک متوازی ریاست کی تھی، یہاں تک کہ شاہ کانسٹانٹائم نے 313 عیسوی میں رواداری کا فرمان جاری کیا۔

جب جرمانک جنگ جویوں نے مغربی سلطنت کو تباہ کر دیا تو مسیحی کلیسا ضرورتاً اس مردہ مملکت سے الگ ہو گیا اور اس کی حیثیت ایک آزاد ادارے کی ہو گئی۔ اب وحشت ناک قبائلی بادشاہ فوجی طاقت کے مالک بن گئے تھے۔ روم کا مسیحی بشپ، یعنی پوپ اب منہدم ریاست کے تہذیبی ورثے کا مالک تھا اور اس طرح وقار حاصل کر چکا تھا۔ جب پوپ لیواوّل نے اٹیلا پر زور ڈالا کہ روم پر حملہ نہ کریں تو اس سے معلوم ہو گیا کہ کلیسا کے عہدے دار بھی کچھ دنیاوی طاقت رکھتے تھے۔ اور جب قبیلوں کے بادشاہوں نے جو یورپ پر قابض ہو چکے تھے، مسیحیت اختیار کر لی تو کلیسا کے عہدہ داروں کی طاقت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ پوپ اور غیر

مسیحی بادشاہوں میں ایک معاہدہ ہوگیا۔ مغربی مسیحی چرچ نے، جس پر پوپ کی حکمرانی تھی ایک پائدار شاہی خاندان کی حیثیت اختیار کر لی جو شاہی حکومت کے روحانی طور پر مساوی تھا۔ تھامس ہوبس نے لکھا کہ ''پاپائیت، مردہ رومی سلطنت کی اس مقدس روح سے کچھ مختلف نہیں جو تاج پہن کر اس کی لاش پر بیٹھی ہوتی ہے۔ یہ غیبی روحانی ڈھانچا دُنیا سے تعلق کے ساتھ ہی اس سے الگ اور ''خدا کی بادشاہت'' کی جگہ موجود ہے۔''

جب مسیحیت میں رہبانیت شامل ہوگئی، تو اس کی مرکزی تنظیم روما کی ریاست جیسی بن گئی۔ کلیسا کے روحانی ڈھانچے کو شاہانہ دفتریت کے خطوط پر منظّم کیا گیا۔ روم کی دولت مشترکہ میں جن شہروں کو میونسپل اداروں کی حیثیت دی گئی تھی، وہی اب مسیحی بشپ کے دارالسلطنت بن گئے۔ مشرقی سلطنت کے شہروں کو یروشلم، اسکندریہ، انیٹوک اور قسطنطنیہ کی بزرگ ریاستوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا جب کہ روم کو مغربی سلطنت کی تین ریاستوں کے برابر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اب شاہی حکومتوں کے فوجی پہلوؤں کی جانب مسیحیوں کا رویہ نرم پڑ گیا۔ روم کے فوجی جس جسمانی نظم وضبط کے تابع تھے وہ مسیحی شہیدوں کے روحانی نظم وضبط جیسا تھا۔ سینٹ کلینمٹ نے ستائشی انداز میں لکھا، ''نظم وضبط، اطاعت اور تابع داری کے جذبے سے روم کے فوجی احکام بجالاتے ہیں۔'' سینٹ سپرین نے بپتسمہ کی مسیحی رسم کا مقابلہ روم کی فوج میں داخلے سے کیا ہے۔ مسیحیت کی جغرافیائی حدیں پھیلنے لگیں، مشنریوں نے ملحدوں کو مسیحیت کے دائرے میں لانے کے لیے خدا کے سپاہی کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔

جہاں تک یہ معاملہ روحانی جنگ کا تھا، یہ مذہبی مشن کی حدود تک ہی رہا، لیکن جب پوپ اربن دوئم نے1095 میں یہ تجویز پیش کی کہ یورپ کے مسیحی حکمران یروشلم میں مسلمانوں سے صلیبی جنگ کر کے مقدس سپلچر (Sepulcher) واپس چھین لیں تو معاملہ حد سے آگے نکل گیا۔ کلیسائے روم نے دنیاوی فتوحات کے جذبے سے سرشار ہو کر پرانی طرز کی سیاسی سلطنتوں کا رویہ اختیار کر لیا۔ چھٹی صلیبی جنگ میں پوپ نے بادشاہ فریڈرک دوم کو دائرے سے اس بنا پر باہر نکال دیا کہ وہ صلیبی جنگ صحیح طرح شروع کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ فریڈرک نے پوپ کے احکام پر عمل کرنا شروع کیا۔ ارضِ مقدس میں پہنچنے کے بعد وہ اور سلطان مصر مل کر بیٹھے اور مفاہمانہ بحث، مباحثے کے بعد یروشلم کی شکست کا ایک ذلت آمیز معاہدہ کر لیا۔ اس نام نہاد ''بچوں کی صلیبی جنگ'' میں ہزاروں پُرجوش نوجوان جو چڑھائی کے لیے آئے تھے، ان کو غلامی کے لیے بیچ دیا گیا یا بھوک اور بیماری میں سب اپنی جانوں سے گئے۔ کلیسا نے ایک

خون ریز صلیبی جنگ جنوبی فرانس میں الگینیا کے ''بے دینوں'' اور دوسری جنگ جان ہس کے بدراہ پیروکاروں کے خلاف چھیڑ دی۔ اب جنگ جُو یانہ روِش پر چل کر مسیحیت نے پہلے جیسا پُرامن انداز ترک کر دیا۔ ایک شاہی حکومت کے طور پر اب اس کی اصل فطرت ظاہر ہونے لگی تھی۔

زمانہ وسطیٰ کے عروج میں یورپی معاشرے کے اندر طاقت کا دُہرا ادارہ ظاہر ہونے لگا۔ مقتدر مذہبی اور غیر مذہبی تنظیمیں معاشرے پر حکمرانی کے لیے ذمہ داریوں میں شانہ بشانہ شریک ہونے لگیں۔ روم کے پوپ مقدس رومی بادشاہوں سے مقابلہ کرتے تھے اور یورپی شہزادوں کے منتخب قائدین کے ہم پلہ تھے۔ ان کی اس جدوجہد میں سن 1077ء میں یہ یادگار واقعہ ہوا کہ پوپ گریگوری ہفتم نے بادشاہ ہنری چہارم کو معاف کرنے سے پہلے تین دن تک برف باری میں ننگے پاؤں کھڑا رکھا۔ ان دنوں پادریوں کے معافی نامے کا اختیار موضوع بحث بنا رہا۔ چرچ کا اقتدار انوسنٹ سوم کی پاپائیت کے زمانے میں اپنے عروج پر تھا۔ اس جابر پوپ نے ''دو روشنیوں'' سورج اور چاند کا نظریہ وضع کیا تھا، جو دن اور رات میں آسمانوں پر حکومت کرتے تھے، جس طرح رومن کلیسا اور غیر مذہبی شہزادے علی الترتیب روحوں پر جسموں پر حکمرانی کرتے تھے۔ اس نے دلیل یہ دی کہ چاند اپنی طاقت سورج سے حاصل کرتا ہے اور اس سے کم تر ہے، اس طرح شاہی اقتدار اپنا دبدبہ اور وقار پوپ کے اقتدار سے حاصل کرتا ہے۔

تیسرے عہد میں تعلیم اور تجارت کا الگ ہونا

تہذیب کے تیسرے عہد میں تجارتی ادارے ترقی کر کے معاشرے کے نہایت منظم منطقے میں شمار کیے جانے لگے۔ ان اداروں کو تربیت یافتہ عملہ فراہم کرنے کا ایک ذریعہ سیکولر تعلیم تھی۔ زمانہ وسطیٰ میں معاشی کامیابیوں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ ان دنوں ایک مرغوب کہاوت یہ تھی کہ ''پیسے کی محبت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔'' دولت مندوں سے نفرت کی جاتی تھی، خاص طور پر نو دولتیوں سے۔ اعلیٰ درجے کی دلیرانہ خوبیوں کو اشرافیہ سے منسوب کیا جاتا تھا، لیکن کاروباری اور محنت کش طبقوں کے لوگوں کو بدفطرت خیال کیا جاتا تھا۔ فرانس کے ایک درباری مورخ چیسٹیلین (Chastellain) نے لکھا تھا، ''اچھی صفات کو ان سے منسوب کرنا بہت مشکل ہے، کیوں کہ وہ ہیں ہی گھٹیا درجے کے لوگ۔'' رومن کی اشرافیہ کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جنگ باز اور مدبر تھے جو گھریلو نوعیت کے کام اپنے غلاموں سے لیتے تھے۔ روم کے بادشاہ نے تاجر طبقے کو نچوڑنے کی کوشش کی۔ اسلامی معاشرے میں تاجروں کے

کاموں کو بہتر انداز سے دیکھا گیا کیوں کہ پیغمبر اسلام خود تجارت کرتے تھے۔ یورپ کے ''تاریک زمانوں'' میں مسلمانوں کے علاقے تجارت کی وجہ سے خوب پھل پھول رہے تھے۔ عرب تاجروں نے نفیس و نادر اشیا کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کیا، اس سفر کی وہ بڑی رنگارنگ کہانیاں بیان کرتے تھے۔ چینی بادشاہ عربی گھوڑوں کے دلدادہ تھے، جنہیں وہ مسلمانوں سے ہی حاصل کرتے تھے۔

یورپ کی تجارتی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب تعطیلات کے دنوں میں کلیسا اور بڑے گرجا کے پہلو میں مذہبی میلے لگنے لگے۔ کسی مسیحی پادری کی باقیات بڑی دعوتوں کے موقعوں پر نمائش کے لیے رکھی جاتی تھیں، جس کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ آس پاس کے دیہات سے کسان ہجوم در ہجوم ان تقریبات میں شرکت کرتے، چنانچہ عرب تاجر وہاں اپنے تجارتی مال کے خوانچے لگاتے تھے۔ مقامی تاجروں میں بعض تاجران سے مال مہیا کرنے کے لیے کہتے اور دست کاروں سے معاملہ کرتے کہ عرب تاجروں کے ساتھ تبادلے کے لیے مصنوعات تیار کریں۔ دست کاروں نے چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا اور جو خام مال دستیاب ہوتا، اس سے قابلِ فروخت اشیا تیار کرتے۔ اس طرح مختلف طرح کا مال تیار کیا جانے لگا، بازار کے پاس قصبے آباد ہونے لگے۔ بندرگاہوں پر، دریاؤں کے گھاٹ پر، یا بشپ اور مقامی رئیس کے مکان کے ساتھ بستیاں آباد ہونے لگیں۔ جن لوگوں نے جاگیرداروں کے جبر سے خود کو آزاد کرا لیا تھا، یہ قصبات ان کے لیے بڑی نعمت تھے۔ جن دست کاروں نے قصبات میں مل کر کام کرنا شروع کیا، وہ الگ الگ تنظیموں میں متحد ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی تجارت کو ان مصنوعات تک محدود رکھا، جو مقامی طور پر فروخت ہو جائیں۔ البتہ فالتو سامان کو آزادانہ تبادلے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ دسویں صدی عیسوی تک بلجیم اور فلینڈرز کے دست کار سالانہ تجارتی میلے لگاتے تھے۔ سمندر کے ساحل پر واقع شہر کاروباری مرکز بن گئے جو کسی نہ کسی تجارتی مال کی فراہمی میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

وینس کا شہر ایک ایسا ہی مرکز تھا، جسے گرم مسالے، ریشمی کپڑے، دمشق کے خنجر اور دوسری اشیا کی فراہمی میں خصوصیات حاصل تھی، یہ اشیا اسلامی یا مشرقی ملکوں سے لائی جاتی تھیں۔ 1082 میں بازنطینہ کی سلطنت نے اس شہر کو آزادی کا محضر نامہ جاری کر دیا اور اس کے تاجروں کو باسفورس سے مغرب کے تمام علاقوں میں آزادی سے جانے آنے کے لیے ٹیکس اور محصول سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ وینس کے لوگ ماہر مدبر تھے، ان کے پاس فوجی وسائل نہیں

تھے۔ ان میں سے چند ایک نے یورپ اور مشرق کے ملکوں کے درمیان ہونے والی تجارت پر غلبہ حاصل کر لیا۔ فلورنس میں ایک کاروباری خاندان سارے شہر کے انتظامی امور پر حاوی تھا۔ بحیرۂ روم کے مغربی علاقوں میں تجارت پر فیودا اور امالفی کا قبضہ تھا۔ اس وقت امالفی نیپلز کے قریب ایک بڑا شہر شمار ہوتا تھا، جو مسلمان ملکوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر تجارت کرتا تھا اور زائرین کو ارض مقدس تک لے جاتا تھا۔ جب نارمن لوگوں نے سسلی فتح کیا تو 1131 عیسوی کے لگ بھگ یہ شہر تباہ ہو گیا۔ جینوا جو اٹلی کے شمال مغربی ساحل پر واقع تھا، صلیبی جنگوں کے زمانے میں کاروباری اقتدار کا شہر بن گیا تھا۔ درحقیقت مسیحی فوجی دستوں کو جنگ کے لیے جاتے ہوئے راستے میں جن اشیا کی ضرورت ہوتی، ان کی ضرورت پوری کرتے ہوئے تاجر فائدہ اٹھاتے، بلکہ اٹلی کے تمام تجارتی شہروں نے اس سے فائدہ حاصل کیا۔ وینس نے تیسری صلیبی جنگ کے شمشیر زن سپاہیوں سے ایک معاہدہ کیا کہ وہ ان کو سمندر پار مصر تک پہنچا دے، یہ ان کی خدمت کے عارضی تبادلے میں ہو گا۔ یا ان کی عارضی ملازمت کے تبادلے میں ہو گا۔ چنانچہ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ڈالمٹ کے ساحل کو فتح کر لیا، پھر ایک گزشتہ تنازعے کا انتقام لیتے ہوئے قسطنطنیہ میں لوٹ مار کی۔

صلیبی جنگوں سے تجارت میں، خصوصاً شمالی اٹلی میں، ایک دم تیزی آ گئی۔ مقدس سرزمین تک پہنچنے کے لیے مال اسباب اور سامان سفر کی فراہمی نے معاشی کارروائیوں کو فروغ دیا۔ پہلی صلیبی جنگ میں عیسائیوں کی کامیابیوں نے جنوبی بحیرۂ روم کا دوبارہ راستہ کھول دیا اور مختلف راستوں سے تجارت ہونے لگی۔ پوپ کی تنبیہ کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم رہے۔ قونصل خانوں کی موجودگی اور بحری تجارت میں قانونی تحفظات نے تاجروں کو غیر ممالک تک جانے میں تحفظات مہیا کیے۔ دی نائٹس ٹمپلرز اور دی نائٹس ہاسپٹلرز عیسائی زائرین کی مدد کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ یہ یورپی اقوام کے درمیان وہ فوجی تنظیمیں تھیں، جنھوں نے اپنے بین الاقوامی روابط کی بدولت بھاری املاک اور جائدادیں بنا لی تھیں۔ نائٹس ٹمپلرز نے تو بادشاہوں اور شہزادوں کو قرضے دیے اور گروی کا ایک بڑا نفع بخش کاروبار شروع کیا۔ فرانس کے فلپ چہارم نے جب ان سے قرض مانگا اور ادھر سے انکار ہو گیا تو فلپ نے اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ بوریا کے اوٹو نے شیر دل رچرڈ کو صلیبی جنگ سے واپسی میں انگلینڈ جاتے ہوئے اغوا کر لیا، چنانچہ انگلینڈ کے بادشاہ کو تاوان ادا کرنے کے لیے بھاری رقم جمع کرنی پڑی۔ یہ رقم رئیسوں سے حاصل کی گئی، جس کا انہوں نے خاصا برا مانا اور بادشاہ جان کو

میگنا کارٹا پر دستخط کرنے پڑے۔ رؤسا اور اشرافیہ نے تقاضا کیا کہ برطانوی بادشاہ ایک پارلیمنٹ کا اجلاس وقفے وقفے سے بلاتے رہیں۔ پارلیمنٹ ہی فیصلہ کرے گی کہ ٹیکس کی رقم کس طرح خرچ کی جائے۔

مسیحی روایت کے تحت سود پر رقم دینا ممنوع تھا۔ اصل رقم سے زائد جو بھی رقم لی جائے گی، وہ سود شمار ہوگی۔ یہودی قوانین نے یہودی سرمایہ کاروں کو یہ اجازت دے دی تھی کہ غیر یہودی سے سود وصول کریں، لیکن یہودیوں سے نہیں۔ اس طرح یہودی تاجر ساری مسیحی اور مسلمان دنیا میں پھیل گئے اور بنکاری میں خاص شہرت کے مالک ہوئے۔ تاہم رومن کلیسا نے بھی خاصی بڑی رقم اکٹھا کر رکھی تھی اور اسے نفع بخش طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ کلیسا، عیسائیوں سے ان کی آمدنی کا دسواں حصہ یا چڑھاوے اور وہ رقوم جو محض لوگ امانت کے طور پر جمع کراتے تھے، اپنے پاس رکھتا تھا۔ گیارھویں صدی تک معبدوں کے نگران یا مقامی پادریوں کا معمول بن گیا تھا کہ زمین داروں کو رقم عاریتاً دیتے تھے اور اگلی فصل میں پیداوار میں ایک حصہ وصول کرلیا کرتے تھے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اصل رقم کے عوض جو پیداوار ملتی تھی، وہ اصل سے مالیت میں کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ مہاجن اکثر اوقات سود کی وصولی کو چھپاتے تھے اور سالانہ کرایہ دینے والی اراضی کی جھوٹی رسیدیں دکھاتے تھے۔ تیرھویں صدی کے آغاز سے کلیسا کے سربراہوں اور دینیات کے عالموں نے سود سے مختلف ضابطوں میں نرمی برتنی شروع کی۔ بیشتر یورپی حکومتوں نے پندرھویں صدی میں سود کے خلاف قانون منسوخ کر دیا۔ سود کے حوالے سے جو اخلاقی عیب وابستہ تھا اس پر نظرثانی کی گئی اور ایک خاص فی صد سے زائد شرح کو ناپسند کیا گیا۔

بڑے بڑے کاروباری اداروں کے لیے سرمایے کا وسیلہ دولت مند افراد یا ثروت مند خاندان ہوا کرتے تھے۔ وہ ایسے کسی تاجر کو جو دُور اُفتادہ سرزمین سے بحری جہاز کے ذریعے سامان کا لین دین کرتا تھا منافع میں ایک خاص حصے کے عوض رقم ادھار دے دیا کرتے تھے۔ اس قسم کی خاموش شراکت سے ایسی تجارتی کمپنیاں بن گئیں جن سے سرمایہ کاری کرنے والے افراد اپنے سرمایے کے تناسب سے منافع کمانے لگے تھے۔ چودھویں صدی میں جینوا (Genva) شہر میں سرمایہ منتقل کرنے اور جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر تو دولت مند خاندان بھی منافع پر قرض دینے لگے۔ لمبارڈز (Lombards) خاص طور پر فلورنٹائنز (Florentienes) نے نہایت سخت اور عیارانہ شرائط کے تحت لین دین کے

لیے شہرت حاصل کر لی۔ قرض دہندہ خاندان جن کا تعلق آرسا (Arras) اور کاہورس (Cahors) سے تھا، انہوں نے فلانڈرس، فرانس اور انگلینڈ کے قرض مانگنے والوں سے سخت شرائط پر معاملات طے کیے۔ شمالی اٹلی کے بنک کاروں نے نہایت باریک اور منجھے ہوئے طریقے جو آج کل استعمال ہوتے ہیں، اس زمانے میں اپنے سرمایے اور مالیات کے تحفظ کے لیے وضع کر لیے تھے۔ وہ بنک کے ڈیپازٹ وصول کر لیتے تھے۔ انفرادی اکاؤنٹس کے لین دین کا ریکارڈ رکھتے تھے، سفری تاجروں کو بل آف ایکسچینج لکھ کر دیتے تھے۔ قرض کے سرمایے کو تحفظ دینے کے لیے قیمتی اشیا اپنے قبضے میں لے لیتے تھے اور انشورنس پریمیم کی ادائیگی کے لیے ایکسچینج میں خطرہ قبول کر لیا کرتے تھے۔ جینوا کے تاجروں نے تیرھویں صدی میں ہی دہرے کھاتے رکھنے شروع کر دیے تھے۔ لوکاس پیکولی (Lucas Pacioli) نے وینس والوں کے حساب کے طریقوں پر ایک کتاب 1449 میں لکھی تھی۔

تیرھویں صدی میں ایک اور منطقے نے تجارتی اہمیت حاصل کر لی۔ جرمنی کی شہری ریاستوں کی ایک کنفیڈریشن نے جو ہینسیٹک لیگ (Hanseatic League) کے نام سے مشہور ہے، مال اسباب کی تجارت شروع کر دی۔ مثلاً مچھلی، عمارتی لکڑی اور نمک۔ بالٹک اور بحر شمالی کی بندرگاہوں سے ان اشیا کی تجارت ہوتی تھی۔ ان کے تجارتی اشتراک کو فروغ اس معاہدے کے تحت ہوا جو ہمبرگ اور لوبیک کے درمیان باہمی تحفظ کی خاطر طے پایا تھا۔ ڈنمارک کے بادشاہ ولادمیر چہارم نے جب 1362 میں گوتھ لینڈ کے جزیرہ بالٹک پر قبضہ کر لیا، جو ان کی سب سے بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا تو ہانسی (Hansea) کے تاجروں نے ڈنمارک کے خلاف تجارتی بائیکاٹ کر دیا۔ جرمنی کے ان شہروں اور کئی شہزادوں کی مشترکہ کاوش کے نتیجے میں ڈنمارک کا بادشاہ جزیرے سے دست بردار ہو کر واپس آ جانے کے لیے مجبور ہو گیا۔ اسے عملاً بھاگنا پڑا تھا۔ ہانسی کے تاجروں نے مناسب دام اور لین دین میں دیانت کے لیے شہرت حاصل کی۔ انہوں نے ''کاؤنٹر'' بنائے اور تجارتی بندرگاہیں برجیس (Briges) جیسی جگہوں پر قائم کیں جو نہایت باریک اونی شالوں کا مرکز تھا۔ لندن سے اون آتا تھا، پولینڈ سے اناج، جرمنی سے عمارتی لکڑی، شراب اور نمک۔ تین صدیوں سے زیادہ عرصے تک دولت مند بیوپاریوں اور ہینسیٹک لیگ کے تاجروں نے اپنے کاروباری مفادات کا کامیابی سے تحفظ کیا۔ اسلحہ کی طاقت کی بجائے باہمی مفاد کی بنیاد پر وہ ایک طاقت وَر ریاست بن گئے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی کے دوران میں مذہبی اور سیاسی اداروں نے اپنے

علاقے میں توسیع کی خاطر یا اس پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے اکثر جنگیں لڑیں، چونکہ ان کی شہری فوجیں نہیں ہوتی تھیں، لہٰذا وہ کرایے کے سپاہی اکٹھا کر لیتے تھے۔ یورپی شہزادوں نے کلیسا سے کرایے کے پادری کر لیے۔ روم کے بادشاہوں کو اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے منتخب کرنے والوں کو رشوت دینی پڑی تھی۔ ویٹیکن ریاست کو اس وقت اٹلی میں اپنے علاقوں کی حفاظت کرنی پڑی جب فرانس نے فوجی مداخلت کرنی شروع کی۔ نشاۃ الثانیہ کے دور میں جب تخلیقی فن کا احیا دیکھنے میں آیا تو رومن چرچ نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ پوپ جیولیس دوم نے تجویز کی کہ سینٹ پیٹر کا کلیسا بڑے اور شان دار طریقے سے دوبارہ بنایا جائے۔ مشہور فن کار برانٹ (Bramante)، رافیل (Raphael) اور مائیکل اینجلو (Michael Angelo) نے اس منصوبے پر کام کیا۔ ایک صدی سے زائد عرصے تک کام ہوتا رہا۔ اس منصوبے میں کثیر رقم خرچ ہوئی۔ یورپ کے مقتدر افراد نے اس کے دیگر کئی منصوبے کو پورا کرنے کے لیے نیک کاروں سے رجوع کیا۔ اپریل 1552 میں شہنشاہ چارلس پنجم نے جو بلاشبہ شارلیمین (Charlimagne) کے بعد یورپ کا سب سے طاقت وَر حکمران شمار ہوتا تھا اینٹن فگر سے مالی امداد کی درخواست کی تاکہ اپنے سابق حلیف ڈیوک مارس آف سیکنی کے خلاف فوج تیار کرے۔ ڈیوک پروٹسٹنٹ کے مسلک سے پھر گیا تھا۔ اس طرح ابھرتے ہوئے تجارتی شعبے نے معاشرے میں اختیارات حاصل کیے۔

یورپ کے بعض بڑے بنکوں نے سوتی کپڑے بنانے والے کارخانوں کے مالی تعاون کے طور پر اپنے کام کا آغاز کیا۔ فلورنس کا شہر اس وقت اونی کپڑوں کی بُنائی اور رنگائی کا مرکز بن گیا جب آرڈر آف ہمبل برادران (Order of Humble Brethren) کے بعد انہوں نے اپنا مرکز ٹائر سے بدل دیا اور فلورنس آ گئے اور کپڑے بننے کا مشرقی ہنر اپنے ساتھ لائے۔ فلورنس کو اپنے اعلیٰ معیار کے کپڑوں کی بنا پر بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اون کی درآمد شمالی یورپ سے ہوتی تھی۔ اس کی ترسیل اور اس پر سرمایہ لگانے میں خطرات تھے۔ فلورنس کے بنکر جن کے پاس پوپ کے ادارے کا فنڈ ہوتا تھا، انہوں نے ایک طریقہ نکال لیا۔ وہ رومن کلیسا سے سرمایہ لے کر انگلینڈ سے اون خریدتے، چونکہ اسباب تعیش کے مقابلے میں اونی کپڑوں کی فروخت میں منافع کی شرح بہت معمولی ہوتی تھی اور تعیش کے سامان مشرق سے درآمد کیے جاتے تھے، لہٰذا کپڑوں کے تاجروں کو اپنی مصنوعات کی لاگت پر گہری نظر رکھنی پڑتی تھی۔ انہیں قرض کی رقم کو استعمال کرنے، قیمتیں لگانے اور خطرات سے نپٹنے کے لیے باضابطہ حسب رکھنے کے

نہایت حساس طریقے وضع کرنے پڑے تھے۔ انہوں نے اس دوران میں سیکھ لیا تھا کہ کاروبار کو مستحکم طریقے سے کس طرح چلاتے ہیں اور یہ کہ اس کی بنیاد اصل میں اعتماد پر ہوتی ہے۔

جرمنی کے ہاؤس آف فگر (House of Figger) کا آغاز چودھویں صدی میں اس وقت ہوا جب ہنس فگر نے فستئن کے نام سے ایک کپڑا بنایا اور فروخت کے لیے پیش کیا۔ اس میں سوتی اور اونی دھاگے دونوں استعمال ہوتے تھے۔ اس کے دو بیٹوں جیکب اور اینڈریاس نے ہینس کی وفات کے بعد خاندانوں کے کاروبار کو آگے بڑھایا اور اس میں بہت نفع کمایا۔ لہٰذا جب ٹائرول کے آرک ڈیوک سگمنڈ کو ایک ناکام جنگ کے بعد وینس کا نقصان پورا کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت ہوئی تو جیکب اور اینڈریاس نے1488 میں قرض کی رقم فراہم کی۔ جیکب فگر نے ضمانت کے طور پر چاندی کی کان سے، دھاتوں کی ایک مقدار حاصل کی جو ٹائرول میں حال ہی میں کھلی تھی۔ ایک بار کان کنی کے کاروبار میں آنے کے بعد انہیں ٹائرول کی دوسری کانیں اور ہنگری کی تانبے کی کانیں، ہمبرگ خاندان کے ارکان کو قرض کے عوض ہبہ کے طور پر ملنے لگیں۔ خاص طور پر میکس ملن اول اور میکس ملن کے پوتے چارلس پنجم کو دیے جانے والے قرضے۔ فگر کا تجارتی خاندان پوپ کے فنڈ کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ پوپ کو دور دور کے متفرق مقامات سے رقوم حاصل ہوتی تھیں اور انہیں تقسیم بھی کرنی ہوتی تھیں۔ پوپ جیولس دوم نے سال1509 کے جوبلی سال کے تحت آنے والی رقوم فگر بنک میں جمع کر دیں جس کو اصل مقصد کے تحت سینٹ پیٹر چرچ کی تعمیر میں خرچ کیا جانا تھا۔

روم میں ایک یادگاری چرچ کی تعمیر اور اسے نشاۃ الثانیہ کے انتہائی نفیس فن سے آراستہ کرنے کا کام غلط ترجیحات پر مبنی معلوم ہوتا تھا۔ وہ یہودی مذہب تھا، جسے بصری فن کے ساتھ جوڑا جا رہا تھا اور یہ جوڑ نہایت ناپائدار تھا۔ اس منصوبے کی مالی مدد کے لیے چرچ کو چندہ اکٹھا کرنے کے سلسلے میں شمالی یورپ میں اپنی کوششیں تیز کرنی پڑیں۔ جب1517 میں جون ٹزول (Johan Tetzel) سیکنی پہنچا تا کہ پوپ نئی چندکوششوں کے لیے لوگوں کو ہموار کرے تو مارٹن لوتھر نے وھٹن برگ کے کلیسا کے دروازے پر ایک مذہبی منشور آویزاں کر دیا جس میں رومن کلیسا کی غلط کاریوں پر احتجاج کیا گیا تھا۔ اگرچہ لوتھر کو ملحد قرار دیا گیا تھا، لیکن اسے مقتدر جرمن شہزادوں کی امداد حاصل تھی۔ جلد ہی یورپ کا معاشرہ دو مسلح دھڑوں میں بٹ گیا۔ پروٹسٹنٹ موسیٰ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بازنطینہ کے روایت شکنوں کی روایت کے مطابق مذہبی جنونی تھے۔ اور کسی نقش کی صورت میں خدا کی پرستش کے خلاف تھے۔ وہ خدا کے انہی الفاظ کو

ترجیح دیتے تھے جو بائبل میں درج تھے۔ رومن کلیسا کی دنیا داری، دولت، آرائش، شان و شوکت کی نمائش پروٹسٹنٹوں کے مذہبی احساسات کے منافی تھی، پھر جرمنی میں اس طرح کی نمائش اور فروخت تو اور بھی مایوس کن تھی۔ آدھی آمدنی تو فگرز کو کیش میں مل گئی باقی پچھلے قرضوں کی ادائیگی میں کام آ گئی۔

تاریخ کا تیسرا عہد انفرادی کارناموں سے عبارت ہے۔ اس عہد کا امتیازی نشان یہ ہو گا کہ کوئی ہنر مند فن کار اپنی مصنوعات بادشاہ کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش کرے گا یا کولمبس کے معاملے میں سمندروں کے درمیان سفر کے اسباب تیار کرنے کا خواب ملکہ ازابیلا کو فروخت کرے گا۔ سرمایہ داری کے ابھرتے ہوئے میدان میں ایسے حوصلہ منداور مہم جو افراد نظر آتے ہیں جو اپنی ہنر مندی کو مالی فائدے کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے معاملات کو آسان بنا دینے والے بھی نظر آ جاتے ہیں۔ آمادگی ایسے لوگوں میں نظر آ جاتی ہے جو کچھ فروخت کرنے یا کچھ حاصل کرنے کے لیے دوسرے فرد کے دائرۂ کار میں گھس جاتے ہیں۔ اس عہد میں پائی جانے والی کثیر دولت نے چالاک لوگوں کو اپنی طرف کھینچا، جو ذہانت سے اپنے حالات بہتر بنانے کی خاطر کوشاں رہے۔ جیسے سنار، موسیقار، قیمتی ملبوسات بنانے والے، پورٹریٹ (شبیہیں بنانے والے مصور)، اٹلی میں نشاۃ الثانیہ کے دور میں دولت مندی کی زندگی اور تحصیل علم کی لگن دونوں ساتھ ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ خوب صورت اشیا کا حصول بھی طاقت کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ فرانس، وینس اور شمالی اٹلی کے دوسرے شہروں میں کامیاب تاجروں کا معمول تھا کہ کاروبار سے جلد دست کش ہو جاتے اور باقی زندگی خدمت عام میں صَرف کر دیتے۔ وہ انسان دوست علما سے اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے۔ وہ فن کے کاموں پر فن کاروں کو مامور کرتے۔ وہ قدیم مسودوں کی خریداری یا ان کی نقل حاصل کرنے کے لیے رقم خرچ کرتے تھے۔ ایسے گرم جوشی کے ماحول میں ایک آرٹسٹ اپنے نام سے مشہور ہوسکتا تھا۔ تاجر بھی تھوڑا خطرہ مول لے کر دولت مند ہو سکتے تھے۔

پندرھویں صدی میں بحری سفر کے اختراع نے یورپ کے معاشرے کو براہِ راست سمندر کے راستے مشرق بعید سے ملا دیا۔ اس کے نتیجے میں ازتک (Aztec) اور انکا (Inca) کی سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ غیر ملکی علاقوں پر نو آبادیات کے قیام کا آغاز ہوا اور متعدد غیر یورپی اقوام کو ماتحت بنانے کی ابتدا ہوئی۔ اس کا ملا جلا مقصد مسیحی سلطنت کی توسیع اور دولت مند بننے کے لیے افراد کے عزائم تھے۔ مسیحیت اور اسلام کے درمیان صدیوں طویل جنگ فیصلے

کے مرحلے میں داخل ہوگئی تھی۔ سلطنت عثمانیہ کے ترکوں نے مسیحی ریاستوں کے مشرقی علاقوں کو فتح کر لینے کے بعد مشرقی روما کی سلطنت کو نابود کر دیا تھا اور یوں مشرقی ممالک کے ساتھ یورپ کی تجارت کا راستہ بند کر دیا تھا۔ ادھر مغربی جانب اراکان اور کیسٹائل کی مسیحی بادشاہتوں نے مسلمانوں کو لائبیریا کے میدانی علاقوں سے باہر نکال دیا تھا۔ مارکو پولو نے اپنی کتاب میں تیرھویں صدی کے اندر اپنے سفرِ چین کے حالات بیان کرتے ہوئے یورپ والوں کو یقین دلا دیا کہ مشرق میں سونا زبردست مقدار میں پایا جاتا ہے۔ قیمتی مسالے اور ریشمی کپڑے بھی بکثرت موجود ہوتے ہیں۔ کرسٹوفر کولمبس نے اسپین کی شاہی حکومت کو ایک منصوبہ مغرب کی طرف سمندر کا سفر کرتے ہوئے اس دولت مند علاقے تک پہنچنے کے لیے دیا تھا۔ یہ منصوبہ اُسی سال منظور کر لیا گیا تھا۔ جس سال گرینیڈا پر عیسائی پوری طرح فتح پا چکے تھے۔

جب عثمانی ترکوں نے1453 میں قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تو وہاں سے یونانی زبان کے عالموں نے جوق در جوق مغرب کے مسیحی علاقوں کا رخ کیا۔ اس نے ایک نئے رجحان کو بڑھاوا دیا جس کا آغاز دانتے اور پٹرارک سے ہوا۔ انہوں نے یونانی اور رومی تہذیب کے نوادر کا حقیقت پسندی سے مطالعہ کی۔ صدیوں تک مسیحی مسلک کی دھندلی عینک لگانے کے بعد مغربی دانش وَروں نے اب کلاسیکی دنیا کو جیسی وہ حقیقتاً تھی، دیکھنا شروع کیا۔ پیٹرارک پرانے مصنفوں کو ذاتی طور پر جاننے کا خواہش مند تھا، اس نے ان کے تمام خطوط اس طرح لکھے جیسے وہ ان کے دوست تھے۔ پندرھویں صدی میں اس طرح کے علم و دانش میں زبردست انہماک نے ایک ریلے کی سی کیفیت اختیار کر لی تھی۔ مرد عبادت گاہوں یا معبدوں کے کتب خانوں میں قدیم مسودے کھنگالتے پھرتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ سے آنے والے یونانی تارکِ وطن اپنے ساتھ ہزاروں مسودے اور کتابیں لے کر آئے۔ وہ لسانیات میں مہارت بھی ساتھ لائے، جس کی بڑی طلب پائی جاتی تھی۔ کلاسیکی زبانوں میں از سرِ نو دلچسپی نے دو طرح کے اثرات مرتب کیے، اوّل اس سے بائبل کے عالموں نے اصل یونانی متون کے نئے تراجم کیے، اس طرح انہوں نے مسیحی فکر کا مصدقہ علم اصل کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیا۔ دوم اس طرح یورپ کے لوگ کلاسیکی یونانی ادبیات سے آشنا ہوئے۔ قدیمی ادبیات میں اس مہارت نے یورپ والوں کو ان کے مذہبی ورثے سے رُوشناس اور دوسروں سے منفرد ہونے کا موقع دیا۔

اصل مسودوں میں دلچسپی ان کو مضبوط کرنے اور ان کے مطالعے میں پیٹرارک کے انہماک سے مغرب میں علمی روایات کا آغاز ہوا۔ مارٹن لوتھر وٹن برگ یونیورسٹی میں انجیل کے

نئے عہد نامے کے مطالعہ کا پروفیسر تھا۔ اس نے مسیحیت میں از سر نو توانائی پیدا کرنے کی خاطر اس میں علمی مطالعہ شامل کیا۔ دانتے نے سنجیدہ ادب کو مقامی زبانوں میں تحریر کرنے کی یورپی روایات کا آغاز کیا۔ اس کا سب سے اہم کام بائبل کے متون کا ترجمہ تھا۔ وائکلف نے بائبل کے اس نسخے کو جو لاطینی زبان میں چودھویں صدی میں شائع ہوا تھا، انگریزی زبان میں منتقل کیا۔ مارٹن لوتھر نے بائبل کا یونانی سے جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ لوتھر اور وائکلف ان کے علاوہ جان ہس یورپ کی یونیورسٹیوں میں عہدوں پر فائز تھے۔ یہ سب رومن کلیسا کے نقاد تھے اگرچہ ان کو مسیحی دائرے سے خارج کر دیا گیا تھا، پھر بھی ان کو سرکاری طور پر اور عام لوگوں میں بھی مقبولیت حاصل تھی۔

جس طرح کی یونیورسٹی آج نظر آتی ہے اس کا سراغ زمانہ وسطیٰ میں ملتا ہے۔ یورپ کی ایک درجن یونیورسٹیوں میں سے آٹھ یونیورسٹیاں اٹلی میں قائم تھیں۔1400 میں ان کی تعداد45 ہوگئی تھی اور1500 میں80۔ چودھویں اور پندرھویں صدی کے اندر یورپی کلچر کا جو خمیر تیار ہو رہا تھا، اس کا تعلق ایک خیال کے مطابق یونیورسٹیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کی قدر و قیمت سے تھا۔ ایک اور عنصر پندرھویں صدی میں چھاپے خانے کی آمد تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب سے کیسیڈورس (Cassidorus) نے راہبوں کو ہدایت کی تھی کہ کلاسیکی تحریروں کو محفوظ کر لیں۔ مسیحی معبد خواندگی کے کلچر کے مراکز بن گئے۔ ڈومینکن اور فرانسیکن راہبوں نے جو درس دینے پر مامور تھے، تیرھویں صدی میں دینیات کے سکول کھولے تھے۔ میڈیکل یونیورسٹیوں نے طلبہ کو نہ صرف ادویہ بلکہ قانون، دینیات اور دیگر علوم وفنون کی تربیت دینی شروع کی۔ مثال کے طور پر پیرس کی یونیورسٹی دانش وَروں اور طلبہ کی ایک انجمن تھی جو پیٹر ابھی لارڈ کے ساتھ نوٹرڈم کے کلیسائی اسکول سے ترک سکونت کر کے آ گئے تھے۔ پہلے یہ بشپ چانسلر کے ماتحت تھا، لیکن بعد میں تدریس کی تنظیم کے ایک چارٹر کے تحت کام کرنے لگا۔

ریفارمیشن (اصلاح کی تحریک) نے یورپ میں تعلیم کو ایک نئی توانائی دی۔ پروٹسنٹ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ بائبل پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔ مارٹن لوتھر نے عام تعلیم کے نظام کا ایک منصوبہ پیش کیا، جو بلدیاتی اور مذہبی عہدے داروں کے زیر انتظام ہوا اور ان کے اداروں میں طلبا کو تاریخ، لسانیات، موسیقی اور ریاضی کی تعلیم دی جانے لگی۔ سکاٹ لینڈ میں کالون کے مقلدوں نے اور جان ناکس (John Knox) نے اس بات پر زور دیا کہ ہر کلیسا میں ایک اسکول ماسٹر لاطینی زبان اور گرامر کی تعلیم کے لیے رکھا جائے۔ پروٹسٹوں کے

مقابلے میں انجمن عیسوی کے اراکین (Jesuits) نے اپنی طرز کی نہایت جامع تدریس کا انتظام کیا جس میں مبلغوں کے لیے دینیات کی چار سالہ تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ فلسفے کا چھ سالہ نصاب بھی اساتذہ کی تعلیم و تدریس کے لیے رکھا گیا۔ بعد میں ایک اور رُجحان آیا کہ سیکولر مضامین کے مزید نصاب شامل کیے جائیں اور تعلیم کے قومی نظام کو فروغ دیا جائے۔ اراسمس (Erasmus) کا خیال تھا کہ کلاسیکی ادب کی تعلیم سے اخلاقی تربیت بہتر ہو جائے گی۔ فرانس میں پورٹ رائلسٹس (Port Royalists) نے فرانسیسی ادب کے نصاب کی تعلیم پر زور دیا۔ تعلیم میں اصلاحات لانے واے دانش وَروں نے اساتذہ کے کردار پر بہت زور دیا اور بچوں کے لیے کھیلوں کی اہمیت کا احساس دلایا۔ بوہیمیئن تعلیم دان جان کومینیس (John Comenius) نے کتاب میں تصاویر شامل کیں اور جان جیکوس نے دلیل دی کہ بچوں کو ''فطری تعلیم'' دی جائے اور کتاب خوانی میں تاخیر کی جائے۔ دوسری طرف پرشیا والوں نے لازمی تعلیم متعارف کرائی، جس میں اسکولوں کے اندر پیشہ وَر عملہ رکھا گیا۔ وہاں ریاست نے کلیساؤں سے اسکول اپنے اختیار میں لے لیے۔

بچپن کے بارے میں جدید تصور، سولھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے درمیان پیدا ہوا۔ اس سے پہلے بچوں کو چھوٹے بالغ افراد سمجھا جاتا تھا۔ ان کے مخصوص لباس یا ان کے لیے کھلونے نہیں ہوتے تھے اور سوائے اس کے کہ والدین ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے، ان کی الگ سے تربیت کا کوئی نظام نہیں تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں ہی بہت سے بچوں کو کسی کام کے سیکھنے پر یا گھریلو کاموں پر لگا دیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی نو بلوغت میں شادی کر دی جاتی تھی۔ سب سے پہلے تعلیم لڑکوں کے لیے ہوتی جو نسبتاً بہتر خاندانوں سے آتے تھے۔ یہ خیال کہ تعلیم عام ہو، عمر کے حساب سے بچوں کی درجہ بندی ہو، جس میں اسکول کی کئی سال کی تعلیم شامل ہو، اور رفتہ رفتہ کر کے زیادہ مشکل نصاب پڑھائے جائیں، بعد میں آیا۔ ایک اور تبدیلی سماجی طبقات کے حوالے سے آئی۔ یورپ کے معاشرے کی تنظیم، روایتی طور پر ریاست کے تحت نہیں بلکہ سماجی و اقتصادی طبقات کے تحت ہوئی تھی۔ ہر ریاست میں اشرافیہ، پادری، ادنیٰ درجے کے مزدور اور کھیت مزدور ایک خاص قانونی مراعات اور پابندیوں کے تحت زندگی گزارتے تھے۔ پادری کو چھوڑ کے باقی ہر فرد کی رکنیت موروثی ہوتی تھی۔ معاشرے میں ہر فرد کا کردار متعین تھا جسے وہ تا زندگی انجام دیتا تھا۔ تعلیم جو بھی میسر تھی، اس کا مقصد فرد کو اس کے

کردار کی ادائیگی کے لیے تیار کرتا تھا۔ انقلاب فرانس نے اس طرح سماجی درجہ بندی کو ختم کر دیا۔ نئے معاشرے میں ہر شخص کو اجازت تھی کہ جو بھی پیشہ یا کاروبار چاہے، اختیار کرے۔

اٹھارھویں صدی کے فلسفہ دان، جو روشن خیالی کے ایک نئے دور کے دانش وَر تھے، اس امر کے خواہش مند تھے کہ یورپی کلچر کو مسیحی عنصر سے الگ کر دیا جائے۔ انہیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ مسیحیت نے جہاں یورپ کے کلچر میں کبھی پدرانہ کردار ادا کیا تھا، وہیں اب یورپی عوام اس عمر کو پہنچ گئے ہیں کہ اپنے صواب دیدی اختیارات استعمال کر سکتے ہیں اور اپنے لیے سوچ سکتے ہیں۔ اس رویے نے تعلیم کو سیکولر راستے پر ڈال دیا۔ فلسفہ، ادب، موسیقی یا فن پہلے بادشاہ یا مذہبی ادارے کے تحت پروان چڑھتے تھے، اب ان کے لیے ایک اعلیٰ تر کلچر کی بنیاد مہیا ہو گئی۔ اب اسکولوں میں ان کا پڑھنا اور سیکھنا ممکن ہو گیا۔ پادریوں کے مخالف فرانس والوں نے اس سلسلے میں پہل کی اور یہ تجویز رکھی کہ تعلیم کے شعبے کو مذہبی تعلیم و تدریس کے مقصد سے الگ کر دیا جائے۔ اس کی بجائے اس کا رخ عملی پیشوں کی تربیت کی طرف ہو۔ مارکوئیس (Marquis de Condorat) نے قانون ساز اسمبلی میں 1792 میں یہ تجویز پیش کی کہ فرانس میں تعلیم کو از سرِ نو منظم کیا جائے تاکہ سماجی درجہ بندی سے قطع نظر افراد کے لیے اپنی اپنی اہلیت کے مطابق تحصیل علم و ہنر کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس نے پانچ سطحوں پر مبنی ایک ہمہ گیر نظام تعلیم تجویز کیا، یعنی پرائمری اسکول، ثانوی اسکول، انسٹی ٹیوٹ (ادارے)، فرانس کے اپنے اعلیٰ نصاب کے مدرسے اور آرٹس و سائنس کی قومی سوسائٹی، ایک فرد اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس نظام کے تحت جس حد تک چاہے اوپر جا سکتا ہے۔ نادار طلبا کو وظیفے بھی دیے جائیں گے۔

انقلاب فرانس کے زمانے میں یہ خیال بھی مقبول ہوا کہ جو لوگ قدرتی طور پر اشرافیہ کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی جگہ ''باصلاحیت اشرافیہ'' کا ہونا ضروری ہے۔ کوئی طالب علم تعلیم کے مرحلے میں کہاں تک جا سکتا ہے، اس کا فیصلہ صرف اس کی صلاحیت کرے گی۔ بعد میں یہ خیال بھی پختہ ہو گیا کہ اس نظام کے تحت ترقی سے فرد کی ذاتی اہلیت نمایاں ہو گی۔ یہ خیال اتنا پھیلا کہ تعلیم اعلیٰ تر ذہانت کے ہم معنی ہو گئی۔ جس نوجوان نے کسی کالج سے گریجوایشن کیا ہو وہ ثانوی مدرسے کے گریجوایٹ سے زیادہ ہوشیار سمجھا جانے لگا اور ایڈوانس ڈگری کا گریجوایٹ اس سے بھی زیادہ باصلاحیت ہو گا۔ یہ نیا معاہدۂ عمرانی اس طرح کے استدلال پر مبنی ہے: آجر، ملازمت کی درخواست میں تعلیم کے مکمل ہونے کا ثبوت دیکھتا ہے۔

درخواست دینے والا یہ توقع کرتا ہے کہ کئی سال کی تعلیم کے بعد اسے ایک پرکشش ملازمت کی پیش کش ہو گی۔ اس طرح پوری زندگی کے لیے ایک نئی طرح کی ترغیب کے اسباب پیدا ہو گئے، جو تہذیب کے تیسرے عہد میں تجارتی افسر شاہی کے ساتھ پروان چڑھتے گئے۔ جس طرح رومن کلیسا اپنے دینی اختیارات استعمال کرتے ہوئے جنت میں داخلے کا پروانہ دیتا تھا، اسی طرح تعلیمی ادارے منافع بخش پیشہ ورانہ زندگی کے دربان بن گئے۔ تعلیم نے یورپ اپنی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے خود کو مستحکم کیا کہ سماج ترقی پر آگے لے جانا اس کے اختیار میں تھا۔ اگر "تم اپنے آپ کو بہتر بنانا چاہتے ہو" تو سکول کو واپس جاؤ۔

چوتھے عہد میں خبر کا تفریحات سے الگ ہونا

عالمی تاریخ چوتھے عہد میں ان اداروں سے معاملہ کرتی ہے، جو پچھلی صدیوں میں محض اپنا وجود رکھتے تھے۔ وہ شعبہ جس نے کاروباری معاشرے سے خود کو الگ کر لیا، اس کا تعلق خبروں اور تفریحات سے ہے۔ انسانوں نے صدیوں تک ایک دوسرے کو تفریح مہیا کی ہے اور دلچسپی کے موضوعات پر آپس میں گپ شپ کر کے خوش ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح کی سرگرمیاں غیر رسمی ہوتی تھیں۔ ماضی میں منظم تفریح کا طریقہ اس لیے استعمال کیا گیا کہ آپس میں، اور بعض اوقات زُود رنج گروہوں کے درمیان، برادرانہ تعلق کا احساس پیدا ہو۔ یونان میں اولمپک کھیل ہر پانچ سال بعد اس لیے منعقد کیے جاتے تھے کہ جنگ آزما شہری ریاستوں کے درمیان ایک مہینے کی جنگ بندی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا آغاز 776 قبل مسیح میں ہوا۔ یونانیوں نے اپنے کیلنڈر کا آغاز بھی اس تاریخ سے کیا۔ روم کی حکومت نے شہ زوری کے کھیلوں کا آغاز شہری باشندوں کی دل جوئی کے لیے کیا تھا۔ اب عوامی زندگی کی سب سے مرغوب شے "روٹی او سرکس" تھے۔ کولوسیم (روم کے گول تاریخی دنگل) میں پورے سال شہ زوری کے مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ سرکس دیکھنے والوں کا بھی ہجوم لگا رہتا تھا۔ سب سے زیادہ پسندیدہ خوف ناک لڑائی کے مظاہرے ہوتے جو موت پر ختم ہوتے اور وہ گاڑیوں کی خطرناک دوڑ کے مقابلے، تماشائیوں کے درمیان جو کسی ایک یا دوسرے گھوڑے گاڑی والے کی حمایت کرتے آپس میں دھڑے بن جاتے اور خوفناک بلوہ شروع ہو جاتا۔

اگرچہ تفریحات کی صنعتوں کی خبریں کاروبار سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن اب ان کی

اہمیت اس سے کچھ زیادہ ہے۔ بعض دوسری صنعتوں کے برعکس، ان میں باضابطہ طور پر وقت کا استعمال بھی شامل ہے۔ تمام تر معاشی حیثیت سے کہیں آگے ان میں معاشرے کو اور طرح متاثر کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔ مواصلات کے ذرائع میں کسی حد تک یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے ذہنوں کا اور خیالات کا اندازہ کرلیں۔ پھر اس کا ردِعمل کئی سمتوں میں ہوتا ہے۔
جنسِ تجارت ہونے کی حیثیت سے تفریح، رہائش یا خوراک کے مقابلے میں کم تر لازمہ ہے۔ یہ وہ جنس ہے جو فالتو آمدنی سے ہی خریدی جاتی ہے۔ اس صنعت کے قابل عمل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ناظرین یا تماشائی ہوں، جن کی اچھی خاصی آمدنی ہو، اور اس تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لیے فرصت ہو اور اس تفریح کی قیمت ادا کرنے کے اہل ہوں۔ اس صنعت کو بہ یک وقت مجمع اکٹھا کرنے کا ایک ذریعہ چاہیے جو تفریح مہیا کرنے والوں کی مہارت کے مطابق ہو۔ اور آخری بات یہ کہ وہ اتنا پرلطف ہو کہ سامعین بڑی تعداد میں سننے اور دیکھنے کے لیے آئیں۔ عام تفریح فراہم کرنے والوں کا کردار ایک دیہی معاشرے میں بہت محدود ہوتا ہے، جہاں لوگ سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک مشقت کرتے ہیں اور ان کے پاس رقم بہت کم ہوتی ہے۔ البتہ اس میں اضافہ اس وقت ہونے لگا جب اس شعبے نے دیہات سے قصبات اور شہروں کا رخ کیا جو گھومتے پھرتے ''شو'' ہوتے تھے۔ 1812 کی جنگ کے بعد سے امریکا کے مشرقی حصے میں گشتی منڈیوں کا ایک جال سا پھیل گیا۔ اس دور کے پھیری والوں کی طرح وہ پیسا خرچ کرنے والے گاہکوں کی تلاش میں گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔
برطانیہ میں گشتی سرکس 1830 کے عشرے میں امریکا سے آیا۔ ثقافت کی نام وَر شخصیات کے لیکچر بھی بہت مقبول ہو گئے تھے جسے لائسس (Lyceums) نے شروع کروایا تھا۔ امریکا کی شبانہ زندگی کی ایک اور تفریح اس کے زندہ تھیٹر (یانوٹنکی) تھی۔ ایک گورا مسخرا جس کا نام ''ڈیڈی'' وائس تھا، جس کے لیے سنا گیا کہ ایک غلام کا بچہ تھا، سنیا سنیائی میں ایک گیت گایا کرتا تھا، جمپ جم کرو۔ سارے تن پر چیتھڑے پہنے اور منہ پر جلی ہوئی کارک ملے وہ ایک بوکھل لڑکے کی یومیہ مصروفیت کی نقل اتارتا تھا۔ وہ ابتدا تھی عوامی گیتوں کی اور منڈیوں کی۔ تاہم اس دور کا استاد فینس ٹی بارنم (Phineas T. Barnum) تھا، اس نے اپنا تفریحی پروگرام 1835 میں صرف ایک دلچسپی سے شروع کیا۔ ''ایک نیگرو عورت جوائس ہیتھ جس کے لیے کہا گیا تھا کہ 160 سال کی تھی، اور کسی زمانے میں جارج واشنگٹن کی آیا ہوا کرتی تھی، ہلڑ بازوں کا ہجوم محض

اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہفتہ وار1500 ڈالر پیشگی فیس داخلہ جمع کرا دیا کرتا تھا۔ بارنم نے اپنے پروگرام میں توسیع کی۔ اس میں کچھ اور دلچسپی کا عنصر شامل کیا۔ اس میں عجیب الخلقت چیزیں بھی دکھاتے تھے اور اس طرح کے کردار، جیسے جوجو، مینڈک کی شکل کا لڑکا، زِپ جس کے سر پر نوکیں نکلی تھیں۔ دیوہیکل ایڈمرل ڈاٹ اور پست قد جنرل ٹام تھمب۔ اس کے بعد بارنم نے ایک کیم شیم ہاتھی خریدا۔ لندن کے اس ہاتھی کا نام جمبو تھا۔ وہ ہاتھی کی عام نمائش کرتا۔ بارنم کا ''دنیا کا سب سے بڑا تماشا'' جیمس بیلی کے ساتھ شامل ہو گیا۔1881 میں ان کے اشتراک سے بارنم بیلی سرکس تماشا دکھانا شروع کیا۔ اس دوران میں ''بفیلو بل'' کوڈی نے ''وائلڈ ویسٹ شو'' شروع کیا، تاکہ وہ متجسس لوگ جو امریکا کے مشرقی حصے میں اور یورپ میں رہتے ہیں، ان کی تفریح کے لیے امریکا کے مغربی حصے کے مناظر دکھائے اور اس کی صورت یہ ہوتی کہ ''کاؤ بوائے'' اور انڈینز گھوڑوں پر سوار، کمندیں لہراتے ہوئے اور بندوقوں سے کھیل دکھاتے وہاں کا منظر دکھاتے۔ ملکہ وکٹوریہ تو اس تماشے کی اس وقت سے بڑی شیدائی ہو گئی، جب بفیلو بل1888 میں اسے لے کر انگلینڈ آیا۔

عوامی دلچسپی کا ایک اور جائے وقوع، وہ خاص نمائش یا میلہ ہوتا جس کا مقصد تہذیبی یا صنعتی ترقی کی نمائش ہوا کرتا تھا۔ یا شاید کسی اہم تاریخی واقعے کی سالگرہ منانا مقصود ہوتا۔ اس مقصد کے لیے یورپ اور امریکا میں متعدد بین الاقوامی نمائشیں ہوئیں۔ ملکہ وکٹوریہ اور شہزادہ البرٹ نے1851 میں ہائیڈ پارک لندن کے کرسٹل پیلس میں ایک ایسی ہی تقریب کی میزبانی کی۔ اس کی کامیابی نے دوسروں میں بھی تحریک پیدا کی۔ ان میں شامل کامیاب تقریبات یہ تھیں: فلیڈیلفیا کی صد سالہ نمائش برائے سال1876 (یہیں الیگزینڈر گراہم بل نے ٹیلی فون پیش کیا)، پھر1889 میں پیرس کا ایکسپوزیشن (جس کے لیے ایفل ٹاور تعمیر کیا گیا تھا) اور 1904 میں سینٹ لوئی کے مقام پر لوسیانا پرچیز ایکسپوزیشن۔ یہ عالمی میلے کہ ان کا یہی نام پڑ گیا نیو یارک، برسلز، مونٹریال، سیٹل اور دیگر شہروں یں منعقد ہوئے۔ ریاستی اور ضلعی سطح کے میلے، جن میں خاص زور زراعت پر ہوتا، انیسویں صدی میں امریکا کے بیشتر حصوں میں سالانہ روایت کی صورت اختیار کر گئے۔ ان کے علاوہ تجارتی تنظیموں نے، مختلف صنعتوں کے لیے عوامی ''شو'' منعقد کیے، تاکہ آنے والے سال کے لیے ان کی مصنوعات کی نمائش ہو جائے۔

بڑھتی ہوئی آمدنی اور کم ہوتے ہوئے اوقات کار نے صنعتی ممالک میں محنت کش

عوام کو یہ موقع فراہم کیا کہ تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لیں، جن میں تفریح سے ملی جلی تقریبات بھی شامل ہیں۔1800 کے اوائل میں برطانیہ اور امریکا فیکٹری مزدوروں کا یہ معمول بن گیا تھا کہ یومیہ بارہ گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ وقت کام کریں۔ ابتدائی ٹریڈ یونین تحریک میں احتجاج نے آجروں کو آمادہ کیا کہ اوقات کار کم کر کے دس گھنٹے یومیہ کر دیں۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اس ضمن میں1848 میں ایک قانون بھی منظور کیا۔ سول وار (خانہ جنگی) کے بعد امریکا کی مزدور تحریک کا مطالبہ آٹھ گھنٹے یومیہ کام کرنے کا تھا۔1860 اور1900 کے درمیان امریکا میں محنت کے اوقات اوسطاً ہر ہفتے دو گھنٹہ کم ہوتے ہوتے68 سے60 گھنٹے ہو گئے۔ اس کے بعد 1900 اور1940 کے درمیان اوسط اوقاتِ کار ہر دس سال پر4 گھنٹے فی ہفتہ کم ہوتے گئے اور 60 سے کم ہو کر44 گھنٹے رہ گئے۔1940 اور1980 کے درمیان امریکا میں اوقاتِ محنت5-5 گھنٹے مزید کم ہو گئے۔1980 میں یہ رجحان مخالف سمت میں چل پڑا۔ صنعتی مزدوروں کی حقیقی تنخواہ کاروبار کے تناسب سے کم یا زیادہ ہوتی رہی، لیکن بالعموم اس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

صنعتی ترقی کی بنا پر لوگوں نے زیادہ تعداد میں شہروں کا رخ کیا، جہاں تفریحات زیادہ تھیں۔ مزدوروں کو فرصت کے اوقات میں بڑی سہولت محسوس ہوتی تھی کہ سیلون میں جا کر ستائیں یا کھیلوں کے مقابلے دیکھیں۔ سول وار کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ امریکا میں پیشہ وارانہ بنیاد پر بیس بال(Base Ball) کا آغاز ہو گیا۔ ہنری وائٹ نے1869 میں پیشہ ور کھلاڑیوں کی پہلی ٹیم تیار کی۔ انگلینڈ میں شمال کے صنعتی شہروں میں رگبی، فٹ بال فیکٹری مزدوروں کے درمیان مقبول ہو گیا۔ وہ مزدور جو ٹیموں کے لیے کھیلتے تھے، مطالبہ کرتے کہ جو اجرتیں کھیل کے پیچھے ضائع ہو گئیں ان کی تلافی کی جائے۔ فٹ بال یا 'سوکر' کی تنظیم1863 میں فٹ بال ایسوسی ایشن کے نام سے شروع ہوئی۔ یہ انگریزی کھیل اپنے پیشہ وارانہ کھلاڑیوں کے ساتھ سارے براعظم میں پھیل گیا اور یورپ کا مقبول ترین کھیل ثابت ہوا۔ ایک بین الاقوامی سوکر فیڈریشن1904 میں پیرس میں قائم ہوئی، اس میں تیرہ یورپی ممالک شامل تھے۔ ٹور ڈی فرانس کے نام سے طویل فاصلے تک سائیکل سواری کا مقابلہ پچھلے برس ہو گیا تھا۔ اس کے مصارف پورا کرنے والا پیرس کا ایک ہفت روزہ اخبار تھا جس کے پبلشر کو یہ امکان نظر آیا کہ مقابلے کی بدولت اس کا اخبار زیادہ فروخت ہو گا۔

تفریحات کی صنعت میں اصل فائدہ تماشائیوں سے فیس داخلہ وصول کرنے میں نہ

تھا بلکہ ناظرین کی ایک بڑی تعداد تیار کرنے میں تھا، جس سے مشتہرین بعد میں رجوع کریں اور ایسا کرنے کے لیے خوردہ فروشی میں تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ یورپی تاریخ کے بیشتر زمانوں میں یہ ہوتا کہ عوامی بازاروں میں اشیا ایک خاص جگہ پر اور خاص اوقات میں فروخت کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ کوئی شخص اگر کچھ خریدنا چاہتا اور بازار بند ہوتا تو وہ دکان دار کے پاس جاتا جو ایک تنگ سی کوٹھڑی میں مختلف قسم کی اشیا رکھتا تھا۔ ان ''جنرل اسٹوروں'' میں عام طور پر فروخت ہونے والی اشیا میں کھانے کی چیزیں، مثلاً اچار، چینی، کافی، تمباکو اور چائے شامل ہوتی تھیں۔ کپڑے الگ سے تھوک کے تاجر یا درزی فروخت کرتے تھے، چادر اور پردے وغیرہ کی دکانیں، مشروبات اور کھانے پینے کی اشیا کی دکانیں، لوہے کے سامان کے اسٹور اور ''گھریلو مصنوعات'' یہاں دستیاب ہوتیں۔ اشیائے صرف بنانے والی فرمیں اپنے کارندوں کو ان سٹوروں کا چکر لگانے کے لیے بھیجتیں، اپنی منتخب اشیا پھیلا کر رکھنے اور بیچنے کے لیے دکان داروں کو زیادہ کشادہ جگہوں کی ضرورت ہوتی، جو ترجیحاً فرش پر ہوں۔ اس کا کرایہ ادا کرنے کے لیے ان کو زیادہ تعداد میں گاہکوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ صنعت کار لوگوں کو سڑکوں پر اپنے ہینڈ بل فروخت کرنے کے لیے بھیجتے، جن میں اسٹور کے اندر اپنی مصنوعات کے حاضر مال کا اشتہار درج ہوتا۔

ایک فرانسیسی تاجر ارسٹائیڈ بوکیکاٹ نے 1852 میں پیرس میں دنیا کا پہلا ڈیپارٹمنٹل اسٹور کھولا۔ اس نے اسٹور کا نام بون مارک رکھا۔ جو اسٹور پہلے سے موجود تھے، ان اسٹوروں کے برعکس جہاں گاہک قیمت چکانے کے لیے دکان دار سے بہت مول تول کرتے تھے، اس اسٹور میں ہر شے کی قیمت مقرر کر دی گئی تھی۔ مصنوعات پیکٹ میں بند فروخت کے لیے تیار رَیک پر صفائی کے ساتھ آراستہ ہوتی تھیں۔ خُردہ فروش کا منافع صرف 20 فیصد تک مقرر تھا۔ اس کے باوجود گاہکوں کو اجازت تھی کہ کسی مال سے مطمئن نہ ہوں تو اسے واپس کر کے قیمت لے جائیں۔ فروخت کرنے والے کلرک کو یہ ہدایت تھی کہ خریداروں کی مدد کرے، انہیں کسی چیز کو خریدنے کے لیے تنگ نہ کرے۔ یہ نیا طریقہ پیرس کی خواتین میں بہت مقبول ہوا۔ 1867 میں پیرس کی عالمی نمائش میں جو لوگ شریک ہوئے، انہوں نے دکان داری کی اس اختراع کو بہ غور دیکھا اور تجارت کے اس تصور کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد تو جلد ہی چھوٹی چھوٹی مخصوص اشیا کی دکانوں کی جگہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کھلنے لگے۔ منافع کی معمولی شرح کی وجہ سے گاہکوں کو ترغیب ملتی تھی کہ اسٹور میں ہی جائیں۔ 'بون مارک' مصنوعات کی نمائش کے لیے

دلکش نمائشی کھڑکیاں کھل گئیں۔ خریداروں کو چونکہ تنوع کی تلاش رہتی تھی۔ اس لیے اسٹور ہر سال نئے فیشن کی مصنوعات متعارف کراتے تھے۔ کاروبار کے فروغ کی خاطر خاص سیل لگاتے تھے اور نئی یا غیر معمولی مصنوعات پر کم قیمت لگاتے تھے۔ یہ سارے اعلانات عام لوگوں تک پہنچانا ضروری ہوتا تھا۔

خریداروں کی ایک یقینی تعداد تک پہنچنے کے لیے اخبارات میں انتہائی کفایت سے شائع ہونے والے اشتہار ایک یقینی ذریعہ تھے۔ اشتہار بازی کا بنیادی نظام یقیناً بہت مستحکم تھا۔ پورے صفحے پر پھیلے ہوئے اشتہارات خبروں کے ساتھ شمالی امریکا میں نو آبادیاتی دَور سے ہی شائع ہوتے آئے تھے۔ چھاپے خانے میں جب نئی ٹیکنالوجی بیلن پر چھپائی کے ذریعے1830 کے عشرے میں آئی تو اخبارات نے جدید پیرایہ اختیار کیا۔ نیو آرلینس میں اخبارات نے پہلی بار اپنے نامہ نگاروں کو میکسیکو کی جنگ کی خبریں بھیجنے کے لیے روانہ کیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں صحافیوں پر یہ راز کھلا کہ لیتھوگرافی کی تصویروں کی اشاعت سے عام لوگوں کی دلچسپی ان کے اخبارات سے بڑھ جائے گی۔ چنانچہ ہارپر ویکلی نے امریکی خانہ جنگی کے مناظر سے میدانِ جنگ کے مناظر تصویروں میں پیش کیے اور اپنی اشاعت میں اضافہ کیا۔ اخبارات یک طرفہ سیاسی نظریات کے اظہار کا ذریعہ بن گئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے فیچرز کے ذریعے اپنی اشاعتوں میں اضافے کا طریقہ ڈھونڈ لیا۔ طویل اور کھلبلی پیدا کرنے والی شہ سرخیاں، ہاف ٹون میں چھپی ہوئی تصویریں، خبروں کی چٹ پٹی عبارت اور خبروں کے ہیجان خیز مواد، ان سب ذرائع سے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اس صدی کے ختم ہونے تک ایسی ہی کوششیں اپنے عروج پر پہنچ گئی تھیں اور اخبارات کے درمیان مقابلہ شروع ہو گیا۔ ایک طرف جوزف پولٹزر کے اخبارات تھے اور اس کے مقابل ولیم رانڈولٹ ہرسٹ کے اخبارات۔ مقابلہ نیو یارک شہر میں سب سے زیادہ اشاعت کے دعوے کا تھا۔ یہ دونوں اخبارات بھیانک جرائم، جنگوں اور تباہیوں کی رپورٹیں چھاپنے میں لطف محسوس کرتے تھے۔

اخبارات کم از کم اپنی ایک تہائی آمدنی اشاعتوں کی فروخت سے حاصل کرتے ہیں۔ دو تہائی آمدنی اشتہارات سے حاصل ہوتی ہے۔ تاجر اخبارات کو اشتہارات چھاپنے کا معاوضہ دیتے ہیں، کیوں کہ قارئین کی ایک خاص تعداد جن کی نظروں سے یہ اشتہارات گزرتے ہیں، تاجروں کی مصنوعات خریدنے کے لیے متاثر ہوتی ہے۔ تعدادِ اشاعت جتنی

زیادہ ہوگی، کسی خاص اشتہار کو اتنے ہی زیادہ لوگ دیکھیں گے اور اشتہار کے ذریعے ملنے والے پیغام سے ان میں خریدنے کی تحریک پیدا ہوگی۔ اس لیے اخبارات کی تعدادِ اشاعت کی نسبت سے شرحِ اشتہارات کم وبیش ہوتی ہے۔ قاری کے نقطۂ نظر سے اشتہارات تو کسی اور کی غرض پوری کرتے ہیں، لیکن وہ اس لیے گوارا ہوتے ہیں کہ ان کی اضافی آمدنی سے اخبارات کی قیمت کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ فیچرز کے بعد وہ نامطلوب مواد جس میں قارئین کی بنیادی طور پر زیادہ دلچسپی ہوسکتی ہے، اشتہارات کی آمدنی پوری ہو جاتی ہے۔ چند استثنائی صورتوں سے قطع نظر یہ مواد محض خرافات ہوتا ہے۔ لیکن اسے بھی سرسری پڑھا جاتا ہے کہ اخبارات میں شاید وہ کچھ مل جائے جسے وہ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی وہ بہت کم قیمت ہوتی ہے۔

بعض لوگ اخبارات اس لیے پڑھتے ہیں کہ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنے کو وہ اپنی شہری ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اگر وہ پبلک حکام کے بارے میں، یا سیاسی مہم میں اٹھائے جانے والے سوالات کے متعلق خبریں اور تبصرے اکثر پڑھتے رہیں تو غالباً وہ اپنا ووٹ زیادہ ذہانت سے استعمال کرسکیں گے۔ رابرٹ اور ہیلن لنڈس نے 1920 کے عشرے کے امریکا میں ایک فرضی مقام ''مڈل ٹاؤن'' کا سماجی تجزیہ پیش کیا اور یہ بتایا کہ سال 1890 کے مقابلے میں 1923 کے اخبارات زراعت، تعلیم اور سیاسیات پر کم مواد شائع کرتے ہیں اور زیادہ جگہ منظم کھیلوں، عورتوں کے مسائل، کاروبار اور کارٹون کی اشاعت پر صَرف کرتے ہیں ۔ بظاہر اخبارات کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچائیں، ان مصنفوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اخبارات سیاسی رائے عامہ ہموار کرنے اور مشتہرین کے لیے قابل قبول تصویر پیش کرنے کا اضافی کام اور اخبارات کے لیے منافع کمانے کا دھندا زیادہ کر رہے ہیں۔ صبح کے اخبار میں دو تہائی جگہ اشتہارات کے لیے وقف ہوتی ہے۔ بامعاوضہ اشتہارات کی سطور کی تعداد 1890 اور 1923 کے درمیان چھ گنا بڑھ گئی ہے۔ اخبارات طبقاتی عدم تحفظ کے احساسات کو بھڑکاتے ہیں یا جیسا کہ لینڈس نے کہا، اس طرح کے متن پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، جو قاری کو جذباتی طور پر بے چین کر دیتی ہے اور اس حقیقت کا ہتھوڑا اس کے سر پر مارتی ہے کہ نفیس لوگ اس طرح تو نہیں رہتے، جیسے وہ رہتا ہے۔ نفیس لوگ تو غباروں میں سفر کرتے ہیں، ان کے گھروں میں دو دو غسل خانے ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ریڈیو کے نشریوں کو وہ کاروباری طریقے ورثے میں ملے ہیں، جنہیں اخباری

اشتہارات نے وضع کیا ہے۔ امریکا میں1919 میں ریڈیو کارپوریشن آف امریکا قائم کی گئی تاکہ ریڈیو ریسیور کی فروخت سے منڈی میں منافع کمائیں۔ یہ ریسیور ریڈیو کی شوقیہ بات چیت میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ مقصد ناکافی ثابت ہوا۔ کمرشل ریڈیو اسٹیشنوں سے1920 کے عشرے میں نشریوں کا آغاز ہوا تو اس پر وقت کی فروخت سے جو منافع ہوتا اشتہار کی اشاعت کا منافع اس سے بہت کم تھا۔ خود نشریات مفت پیش کی جانے لگی تھیں۔ مگر اس کے بعد سامعین کی ایک کثیر تعداد جب اس کے پروگراموں میں دلچسپی لینے لگی تو ریڈیو اسٹیشن اشتہارات نشر کرنے کے لیے بھاری اجرت وصول کرنے لگے۔ سامعین ریڈیو کے اشتہارات کو نظرانداز نہیں کرسکتے تھے، جو پروگرام کے عین وسط میں براہِ راست نشر کرائے جاتے تھے۔ جیسے اخبار کے قاری اشتہار کو نظرانداز کردیتے ہیں۔1940 کے عشرے کے اواخر میں جب ٹیلی وژن آیا تو اس نے پروگرام میں بصری عنصر شامل کردیا لیکن جو بندوبست ریڈیو کے براڈ کاسٹر کا تجارتی خبروں کی ترسیل سے تھا، اس کو بدستور رہنے دیا۔ ٹیلی وژن اشیائے صَرف کی فروخت کا نہایت مکمل وسیلہ ہے۔ اشتہار کے اس وسیلے پر جو رقم خرچ ہوتی تھی، اس کے جواب میں تاجروں کو اشیائے صَرف کی فروخت میں زبردست اضافہ نظر آیا۔

نیو یارک ٹیلی وژن اپنی زبردست مقبولیت کے زمانے میں لوگوں کی نگاہوں کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔ امریکی گھرانوں میں ٹی وی سیٹ اوسطاً سات گھنٹے یومیہ کھلے رہتے ہیں۔ یہ پرکشش ذریعہ اظہار ہر چار گھنٹے میں ایک ناظر کو پوری طرح متاثر کرلیتا تھا۔ ناظرین کی اتنی بڑی تعداد کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی عام لوگوں سے رابطہ پیدا کرنا چاہے تو اسے یہ کام ٹیلی وژن کے ذریعے کرنا پڑے گا۔ لیکن ٹیلی وژن پر چلنے والے تجارتی اشتہار بہت مہنگے ہوتے تھے۔ جب ٹی وی پر درس دینے والے پادریوں نے عیسیٰ کے ارشادات کے لیے اس طرف توجہ کی تو انہیں بھی بھاری رقم اکٹھا کرنے کے لیے ناظرین سے اپیل کرنی پڑی۔ ٹی وی اسٹیشن ان مبلغوں کو مجبور کرتے رہتے تھے کہ نشریات کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنے کے لیے وہ ''بیچ مین'' (درمیانے فرد) کے طور پر موجود رہیں۔ اگرچہ نظریاتی طور پر ٹیلی وژن کے براڈ کاسٹر خبروں کے تعلق سے سیاسی وقوعوں کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے لیکن یہ میڈیا انتخابی مقابلوں کے حوالے سے انوکھی باتوں کو ہلکی پھلکی گفت گو اور گپ شپ کو نشر کرتا رہتا ہے۔ انتخابی مقابلے کے امیدواروں کو رپورٹروں سے بڑا سخت مقابلہ درپیش ہوتا ہے، جو بہت کڑے

سوالات کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی شخصیت کا حسب منشا رخ پیش کرنا چاہتے تھے وہ ٹی وی کمرشل کے لیے وقت خریدنے پر مجبور ہوتے تھے۔ سیاسی مہم چلانے میں اصل خرچ اسی کا ہوتا تھا۔ چنانچہ منتخب عہدے داروں کے لیے لازمی ہو جاتا تھا کہ عطیہ دینے والے متمول لوگوں سے اور مخصوص مفاد کے حامل گروپوں سے جو اپنے تعاون کے عوض پسندیدہ پالیسیاں چاہتے ہوں، دل کھول کر مالی مدد حاصل کریں۔

اب خبر زیادہ سے زیادہ تفریح کی ایک صورت بنتی جا رہی ہے۔ اب یہ احساس پایا جاتا ہے کہ جب تم ریڈیو لگاؤ یا ٹی وی چلاؤ یا کوئی فلم دیکھ رہے ہو، تو تمہاری خواہش اس سے لطف حاصل کرنے کی ہوتی ہے، درس یا اطلاع حاصل کرنے کی نہیں ہوتی۔ سام گولڈوِن نے فلموں کے بارے میں ایک بار کہا تھا، ''اگر تم کوئی پیغام دینا چاہو تو ویسٹرن یونین استعمال کرو۔'' اس طرح تفریح کے کلچر نے کھلے عام سنجیدہ مباحثے اور مکالمے کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ ٹیلی وژن کا ایک مشیر جو سیاست دانوں کے ساتھ کام کرتا ہے، اپنے ہنر کے تعلق سے یہ کہتا ہے ''ہم موڈ سے اور موسیقی سے زیادہ کام لیتے ہیں، ہم ایک تاثر پیدا کر کے اسے ناظرین کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب شخصیات مسائل سے زیادہ اہم ہوتی ہیں، ہم لکھے ہوئے الفاظ کی چنداں پروا نہیں کرتے۔'' ٹیلی وژن بڑی احتیاط سے منتخب کی ہوئی تصویروں کو ایک خاص ترتیب سے پیش کر کے جذباتی تاثر پیدا کرتا ہے۔ تصویری جھلکیوں اور آوازوں کے تال میل سے کسی شخصیت کے بارے میں ایسا تاثر پیدا کرتا ہے جو حسب توقع ناظرین کے لیے دل کش ہوتا ہے۔ ٹی وی کمرشل اشیائے صرف کو ان کی خصوصیات کی بنا پر عقلی مباحثوں کے ذریعے فروخت نہیں کرتے بلکہ یہ اشارہ دیتے ہیں کہ وہ مصنوعات ایک دل کش اسلوب زندگی کے لیے عین مناسب ہیں۔ جب کسی برانڈ کا نام بار بار لیا جائے تو وہ ناظرین کے لیے مانوس ہو جاتا ہے پھر ایک ناظر ان کے درمیان فائدے اور نقصان کے حوالے سے کوئی تقابل کیے بغیر ٹی وی دیکھتا رہتا ہے۔

تجارت کے نفع بخش ہونے کا انحصار قیمت اور لاگت کے تناسب پر ہے۔ کوئی شے جو اس جیسی دیگر مصنوعات سے مقابلہ کر رہی ہو، اشتہارات مشتہر کے لیے یہ ممکن بنا دیتے ہیں کہ خریداروں سے زیادہ قیمت وصول کرے اور انہیں ہاتھ سے جانے نہ دے۔ اگر اشتہار میں کسی شے کی خوبیوں کے حق میں منطقی دلائل دیے گئے ہوں تو پھر صنعت کار کے لیے ضروری ہو

جاتا ہے کہ اپنی اشیا کے معیار کو بہتر بنائے یا پھر ان کی قیمتیں کم کرے۔ پھر انہیں پبلک کو قائل کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تیار کردہ چیز اعلیٰ درجے کی ہے، تاہم ٹیکنالوجی کی لائی ہوئی معلومات منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی بھی فرد جو کسی شے کی تیاری کے مراحل سے واقف ہو، وہ اس کی نقل بنا سکتا ہے یا ویسا ہی ڈیزائن تیار کرسکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی بھی صنعت کار ادارہ جس کے پاس اچھا خاصا سرمایہ ہو، اپنی تیار شے کو بہتر بنانے کے بعد اسے لاتعداد مقدار میں تیار کرسکتا ہے اور جیسا کہ سرمایہ کی منڈی میں ہوتا ہے پھر اس کی قیمت اور منافع کی شرح بھی تیزی سے گر جائے گی۔ اس کی متبادل صورت یہ ہوگی کہ کسی برانڈ نام کو مشتہر کرتے ہوئے صارفین کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی جائے کہ اسے بس وہی مخصوص شے چاہیے۔ عام لوگوں کے شعور میں خواہ کوئی بھی تصویر ابھرتی ہو لیکن اگر اس شے کا نام ہی کوئی لذت رکھتا ہو تو اس کی قیمت بڑھ جائے گی۔ ایک بار جب صارفین کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہی خاص برانڈ کی شے انہیں مطلوب ہوگی تو پھر وہ اس کا متبادل قبول نہیں کریں گے۔ خواہ یہی دکھایا جائے کہ دونوں کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں۔

تاہم یہ سارا عمل اب اپنی کشش کھوتا جا رہا ہے۔ سستے برانڈ کی اشیا اسٹورز پر اور سپر مارکیٹوں میں اب فروخت ہوتی ہیں۔ وہ مہنگی اور برانڈ نام کی اشیائے منافع میں اپنا حصہ بٹا رہی ہیں۔ پھر اس کا دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ وہی اشیا فروخت کی جائیں جو واقعی منفرد ہوں، صرف وہ شے جو اس تعریف پر پورا اترتی ہے، انسانی شخصیت ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب مینیسوٹا ٹمبر وولوز (Minesota Timber Wolves) نے بیس بال کے ایک 19 سالہ پیشہ ور کھلاڑی کیون گانٹ سے چھ سال کا معاہدہ کیا، جس نے 125 ملین ڈالر کے عوض صرف اس کی ٹیم میں شامل ہو کر کھیلنے کا وعدہ کیا۔ اب قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ٹمبر وولوز کو نسبتاً کم رقم میں کوئی اور کھلاڑی جو گارنٹ جیسا کھیل سکتا ہو، دست یاب ہوسکتا تھا۔ بہرحال اس طرح کے ورزشی کھیلوں میں کارکردگی کا انحصار کھلاڑی کی ذاتی مہارت پر ہوتا ہے، اور یہ چیز بازار میں منفرد اور نایاب ہے۔ یہی بات پیشہ ور موسیقاروں، اداکاروں، ''ٹاک شو'' کے میزبانوں اور دوسرے فن کاروں پر صادق آتی ہے۔ عام لوگ ایک شخص کو سننے یا دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، اور اسی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس ایک شخص کا پایا جانا تو محدود ہے لیکن طلب کرنے والوں کی کوئی حد نہیں۔ چنانچہ اس پر حیرت نہیں ہوگی کہ 'سٹار' شخصیات کے معاہدے کی لاگت اس وقت آسمان

سے باتیں کر رہی ہے۔

نائک فٹ ویئر نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اور ایک مشہور اتھلیٹ کا ''امیج'' دکھا کر اپنی مصنوعات کی فروخت میں اضافے کی کوشش کی ہے۔ شکاگو بلز کا 'سٹار' کھلاڑی میکائیل جورڈن نائک ٹیلی وژن کے کمرشل میں اس طرح آتا ہے کہ اس کمپنی کا خاص جوتا، جورڈن کی بھڑکیلی شخصیت اور رہن سہن سے میل کھاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے جوتے جو معمولی تبدیلی کے ساتھ مشرق بعید میں تیار کیے جاتے ہیں، امریکا میں نوجوان مردوں اور عورتوں کے ہاتھ زیادہ قیمت پر فروخت کیے جا سکتے ہیں۔ جورڈن کی شخصیت کے تعلق سے قیمت بڑھ جاتی ہے۔ نائک ایک نہایت نفع بخش صنعت کار ہے جس کی مصنوعات کی لاگت اربوں ہے۔ ڈزنی کارٹون کے کردار اپنے کمرشل میں استعمال کرتا ہے۔ اس میں اسے کسی کو وہ فیس نہیں دینی پڑتی جو معروف شخصیات کو دینی ہوتی ہے۔ ان کی جگہ ایک ''فرضی شخصیت''، جو ایک فلم کمپنی کی ملکیت ہے، معاوضہ وصول کرتی ہے۔

تیسرا باب

شخصیت اور عقیدہ

مذہب وسیع معنوں میں

تاریخی عمل کے دوران میں پبلک کی اقدار بدلتی رہتی ہیں۔ یہ بدلتی ہوئی اقدار ان اداروں کی آئینہ داری کرتی ہیں جو ایک خاص وقت میں بالادست معاشرے تھے۔ ہر ادارہ اپنے ہی طرح کے قیمتی اسباب سے ملا ہوا ہے۔ دیکھئے جدول 1-3۔ اگرچہ اقتصادی اور سیاسی امور اہم ہوتے ہیں لیکن تہذیب کا زیادہ تعلق زندگی کے ذہنی، ثقافتی اور روحانی پہلو سے ہے۔ اس میں کسی تہذیب کے نازک عناصر لوگوں کے دلوں میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ مذہب ایک ادارے کے طور پر انسانی تجربے کے اظہار کے لیے تہذیب سے قریب ترین ہے۔ لہٰذا اس باب میں اس سوال سے بحث کی جائے گی۔ ہر تہذیب کا وسیع تر معنوں میں مذہب کیا ہے؟

مذہب کسی معاشرے کی بنیادی اقدار کے بارے میں گفت گو کرتا ہے۔ اس میں ایک خدا، یا خداؤں کی عبادت بھی شامل ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے بھی نہیں۔ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی کتاب ''مذہب کی جانب ایک مؤرخ کا رویہ'' (A Historians' Approach to Religion) میں لکھا ہے، ''اگر ہم ان مذاہب کا جائزہ لینا شروع کریں جن پر مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر لاتعداد لوگوں نے عمل کیا تو ہمارا پہلا تاثر طرح طرح کی اور بے پایاں حیرتوں سے ہوگا۔ لیکن یہ ظاہری تنوع انسان کی عبادت یا تین اشیا یا مقاصد یعنی فطرت، انسان بجائے خود اور حقیقت ثابتہ کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں آ جاتا ہے۔'' فطرت کی عبادت سے ٹوائن بی کی مراد رسوم کا مذہب ہے، جس پر تہذیب سے پہلے کے لوگ عمل کرتے تھے۔ انسان کی عبادت اپنے وجود سے، اس سے مراد انسان کا تعلق سیاسی اداروں سے، یا اجتماعی انسانی طاقت کی عبادت سے ہے۔ حقیقت ثابتہ کی عبادت کا حوالہ اعلیٰ تر مذاہب سے ہے جس کا مرکز

گوشوارہ:3-1 Table: 3-1

اَدوار کی اہمیت

پہلی تہذیب	عظیم اور طاقت وَر ہونے کے لیے اچھی
دوسری تہذیب	بہتر ہونے کے لیے اچھی
تیسری تہذیب	تعلیم کے حصول اور تموّل کے اچھی
چوتھی تہذیب	شہرت کے لیے اچھی
پانچویں تہذیب	کس لیے اچھی ہے؟ فیصلہ ہونا باقی

روحانیت یا خدا ہے۔

ٹوائن بی نے جن تین طرح کے مذاہب کی نشان دہی کی ہے، ان میں ایک خدا یا خداؤں کی عبادت شامل ہے۔ خدا نے انسان جیسی شخصیات کو عبادت کی چیز بنا دیا۔ ٹوائن بی کا مفروضہ یہ تھا کہ انسانیت اس کی عبادت کرتی ہے، جس سے سب سے زیادہ ڈرتی ہے۔ جب وہ کسی شے سے ڈرنا چھوڑ دیتی ہے تو اس شے میں عبادت کی کشش نہیں رہتی، اور مذہب اس سمت رخ کرتا ہے جسے پہلے برتا نہیں گیا۔ فطرت کی پرستش اس وقت کی گئی تھی جب انسانیت، فطرت کے رحم و کرم پر تھی۔ زراعت کی آمد سے خوراک کا مسئلہ پہلے کی طرح ہراساں کرنے والا نہیں رہا۔ اتنا بھی نہیں رہا جتنا دوسری انسانی برادریوں سے نپٹنے میں ہوتا تھا۔ لہٰذا عبادت کا رخ سیاسی وحدتوں کی طرف مڑ گیا۔ جنگجو شہری ریاستوں نے مقامی خداؤں کی عبادت شروع کر دی جو اس کی اجتماعی طاقت کی علامت تھے۔ یہ عہد اُس وقت ختم ہو گیا جب عظیم سیاسی سلطنتوں نے علاقے میں امن بحال کیا۔ انسانی معاشرہ اب پہلے سے کم ہراساں رہے گا۔ اب وقت تھا زندگی کی حقیقت ثابتہ کی عبادت کا۔

ٹوائن بی نے عبادت کے جن تین مظاہر کو بیان کیا ہے، یعنی فطرت، انسان اپنی اجتماعی صورت میں اور حقیقت ثابتہ کے طور پر، ان سب کا تعلق پہلے تین ادوار کے مذاہب سے ہے، تاہم اس میں پہلا دور ماقبل تاریخ کا ہے۔ فطرت کی عبادت قبائلی معاشرے میں ہوتی تھی جو پہلی تہذیب کے آغاز سے پہلے کا زمانہ تھا۔ ٹوائن بی کا دوسرا مرکز عبادت یعنی انسانی معاشرہ، اس کا تعلق پہلے تاریخی عہد میں مروجہ مذہب سے تھا، جب حکومتیں شہری مذاہب کو مستحکم بناتی تھیں۔ عبادت کا تیسرا مرکز حتمی یا یقینی حقیقت ہے۔ یہ مذہب ان افکار کے مطابق تھا جن کی اساس فلسفہ تھا۔ ان کا تعلق تاریخ کے دوسرے عہد سے تھا۔ انسانیت کی لابدی حقیقت تک رسائی نظریاتی قیاس آرائی کے ذریعے ہوتی ہے۔ بہتری کے لیے اس نے خدا کی وحدانیت کے تصور تک پہنچایا۔ ٹوائن بی کا تجزیہ اس نکتہ پر آ کر ختم ہو جاتا ہے جب مذہب اپنی کامل شکل اختیار کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تاریخ کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں عہد ابھی آنے والے ہیں، بظاہر اس میں مزید مذہبی ترقی کا امکان نہیں پھر بھی مذہب اپنے وسیع تر معنوں میں

پھیلتا گیا ہے اور عالمی مذہب کے درجے سے آگے تک نکل گیا ہے۔

شخصیت اور عقیدہ

کسی کامیاب مذہب میں شخصیت اور عقیدے کے درمیان ایک توازن پیدا ہوتا ہے۔ عقیدہ پہلے آتا ہے، یہ وہ بات ہے جو عام طور پر لوگ درست سمجھتے ہیں۔ عالم و فاضل لوگوں نے یہی نتیجہ نکالا ہے، سفید اور دراز ریش والے مسیحا، جن سے اہم امور پر مشورہ کیا جاتا ہے۔ یونان اور روم کے زمانوں میں فلسفہ عقیدے سے ماورا ہوتا تھا۔ فلسفیوں نے سچائی کو معلوم کرنے کے لیے ایک طریقہ وضع کیا تھا جو افلاطون کے بقول یہ تھا کہ سچی کھری ''سائنس'' کو ''رائے'' سے الگ کر دو۔ مذہبی لوگوں کے لیے خدا سچائی تک پہنچنے کا یقینی وسیلہ ہے۔ جدید معاشرہ عظیم سائنس دانوں کے نظریوں پر زیادہ یقین رکھتا ہے۔ ممکن ہے یہ کائنات ایک ''عظیم دھماکے'' کے نتیجے میں بنی ہو۔ ممکن ہے انسانی نسل ایک فطری انتخاب کے تحت ارتقا کے مراحل سے گزر کر حیوانی زندگی کی دوسری اقسام سے بنی ہو۔ سماجی صورت حال کے تعلق سے ہمارا معاشرہ سماجیات کے عالموں یا نفسیات دانوں کی طرف دیکھتا ہے کہ قابل یقین جوابات فراہم کریں۔ اگر کسی شخص نے کسی مستند ادارے سے اعلیٰ درجے کی سند لی ہو یا گراں قدر مطالعہ کیا ہو تو اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے، جب کہ ایک عام آدمی کی رائے کو بمشکل اہمیت دی جائے گی۔

اس طبعی دنیا کے حوالے سے علم کے حصول میں ریاضی کا علم بھی شامل ہے۔ الفرڈ نارتھ وہائٹ ہیڈ نے فیثا غورث اور افلاطون کے زمانوں (چھٹی اور ساتویں قبل مسیح) اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کو اس طرح یاد کیا ہے کہ ریاضی کا علم عوام کے شعور میں گہرائی تک پیوست کر گیا تھا۔ چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان میں فلسفے کے انقلاب کا محرک بنیادی طور پر جیومیٹری کا علم تھا۔ فیثا غورث کا موقف یہ تھا کہ دنیا اعداد سے مل کر بنی ہے۔ افلاطون، ریاضی کے استدلال کی خالصتاً نظریاتی ساخت سے بہت متاثر تھا۔ ''اکادمیہ'' کے دروازے پر یہ نشان آویزاں ہوتا تھا، ''ریاضی سے نابلد لوگوں کا داخلہ منع ہے۔'' سترھویں صدی میں جب مسلمانوں نے الجبرا متعارف کرایا تو یورپ کے ریاضی دانوں نے اسے بہ کثرت استعمال کیا۔ نیوٹن نے طبیعات کے جو قوانین مرتب کیے وہ طاقت، رفتار اور شدت رفتار کے درمیان تناسب سے عبارت ہیں۔ ریاضی کی مساوات کا تعلق دورانیے سے تھا۔ اس

سے سیاروں کی حرکت کے بارے میں کیپلر کے نظریات کی تائید ہوتی ہے۔ فطرت کی دنیا میں ریاضی اشیا کی مقدار اور ان کے درمیان تعلق کا خالصتاً معروضی بیان ہوتی ہے۔ یہ علم کی وہ شاخ ہے جو انسانی شخصیت سے بہت دور رہتی ہے۔ اس لیے ریاضی داں کسی قدر محفلوں سے بے تعلق رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

ریاضی پر مبنی علم نے اپنے وجود کی اہمیت کو ڈرامائی انداز سے منوایا ہے۔ کئی صدی پہلے جب لوگ دنیا کے مغربی کرے سے ہی بے خبر تھے، سیرین (Cyrene) کے ایراٹوستھی نوس (Eratosthenos) نے حساب لگا کر بتایا کہ زمین کا قطر اس کے اصل حجم کا ایک فیصد ہے۔ منجنیق اور دوسری مشینی ترکیبوں سے ارشمیدس نے روم کی فوجوں کو سیراکوس (Syracuse) کا محاصرہ کرنے سے تین سال تک باز رکھا۔ جوہری کیمیا دانوں نے بیسویں صدی میں ایک ایسا بم تیار کیا جو اس قدر خوف ناک ہے کہ جاپان کے دو شہروں کو اس نے آنِ واحد میں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور دوسری عالمی جنگ میں جاپان کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے۔ دوسری طرف ریاضی کا علم مذہب سے یا موجودات کی دنیا سے چنداں مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے یقین کی صورت ذاتی زیادہ ہوتی ہے۔ مذہب کے زیادہ بلیغ نظاموں کی تخلیق کا ایک ناقدانہ طریقہ یہ ہوگا کہ اس پر سائنس کے ساتھ ریاضی اور انسانی طرزِ عمل کے مطالعہ کا اطلاق کیا جائے۔ یونان کی فلسفیانہ روایت میں سقراط کا بھی کردار تھا۔ دنیا کی بنیادی اشیا کے بارے میں اس نے اپنی تحقیق کو سوالات کی شکل دی۔ مثلاً یہ کہ انصاف، نیکی اور سچائی، یہ سب کیا ہیں؟ جب طبیعات کے اصول مرتب کرنے میں طبیعی سائنس کا نام سنا گیا، تو سماجی سائنس نے بھی بازار میں اور انسانی نفسیات میں اپنی حرکی قوت کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔

یہاں ایک تضاد پیدا ہوتا ہے، ایک طرف تو انسان بنیادی طور پر اپنے آپ کو جاننا چاہتا ہے۔ حصولِ علم کے جو انتہائی یافتہ طریقے ہیں، ان سے حاصل کردہ یقین کے بعد مذہب اس کے سہارے چلتا ہے۔ مسیحی دینیات نے افلاطون اور ارسطو کے فلسفوں کو استعمال کیا۔ آدم اسمتھ اور کارل مارکس کے اقتصادی نظریات اور سگمنڈ فرائڈ اور کارل یونگ کے تصورات نیم مذہبی نظریات کی بنیاد ثابت ہوئے ہیں۔ دوسری طرف غیر ذاتی قوانین قدرت، طبعیات کی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اپنی دست رَس رکھتے ہیں۔ مغربی طب کے باپ ہپوکریٹس (Hippocrates) نے یہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ دیوتا بیمار ڈال دیتے ہیں، یا یہ کہ اس کے

موثر علاج میں رسوم اور دعائیں دیوتا کے عتاب کی شدت کو کم کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس نے بیماریوں کے طبعی اسباب کا پتہ چلانے کی کوشش کی اور کامیاب علاج کے طریقے خود اپنے تجربے سے حاصل کیے۔ سائنٹیفک طریقہ یہ سبق سکھاتا ہے کہ سائنس دان کو بے تعلقی کے ساتھ قدرت کا مشاہدہ کرنا اور اپنے نتائج کو ذاتی وجدان کی بنیاد پر نہیں بلکہ مشاہدات پر مرتب کرنا چاہیے۔ اس کو جس حد تک ممکن ہو، اپنے نظریات سے الگ رہنا چاہیے اور خود کو محض دریافت کا ایک آلہ سمجھنا چاہیے۔

جدید سائنس نے انسان کو کائنات کے مرکز سے، جسے وہ اپنا مقام کہتا تھا، الگ کر دیا ہے۔ کوپرنیکس نے کہا تھا کہ زمین نہیں بلکہ سورج نظام شمسی کے وسط میں ہے۔ ڈارون نے انسان کو ارتقا کے عمل کی پیداوار سمجھا جو کم تر درجے کی موجودات، یعنی پودے اور حیوانی زندگی سے نکل کر انسانی مرتبے تک پہنچا۔ سائنس دانوں کا موقف یہ ہے کہ قدرت کے غیر ذاتی قوانین دنیا پر حکمران ہیں۔ لیکن اگر کوئی انتہائی ترقی یافتہ عقائد کا نظام ایک خالصتاً معروضی قسم کے علم تک رسائی حاصل کرتا ہے تو یہ انسانی تہذیب کے لیے ایک مسئلہ بن جائے گا۔ انسانیت کا ایک بڑا حصہ اس طرح کے کلچر کو تسلیم نہیں کرے گا، کیوں کہ انسان محض خیالات پر زندہ نہیں رہتا۔ دانش ورانہ صداقت کے باوجود اگر کسی کلچر میں محض خیالات کی کارفرمائی ہو تو وہ کلچر ٹھنڈا اور بانجھ ہوگا۔ ایسی صورت حال ایک روحانی بحران پیدا کرتی ہے، کیوں کہ انسان تمام تر معروضیت سے اپنا تعلق قائم نہیں کرتا۔ انسانوں کو شخصیت کے نمونے بھی چاہئیں۔

سانتا بار برا کے مقام پر کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ ''زیادہ تر لوگ ایک مسئلہ کو اس وقت آسانی سے حل کر لیتے ہیں جب اسے سماج کے تعلق سے پیش کیا جائے، نہ کہ جب وہی مسئلہ مجرد اعداد اور علاقوں کے ذریعے پیش کیا جائے۔'' ایک تجربے میں انہوں نے ایک پرانے مجرد منطقی معمے کو نئے سماجی منظرنامے میں پیش کیا۔ مثال کے طور پر زیر تجربہ افراد سے کہا گیا کہ وہ اپنے آپ کو ایک شراب فروش تصور کریں، جس کا کام یہ دیکھنا ہے کہ شراب خانے میں کوئی کم سِن لڑکا نہ آ گیا ہو۔ 25% سے بھی کم افراد نے اس مسئلہ کو اُس وقت سمجھ لیا جب اسے اعداد اور علامتوں کے حوالے سے پیش کیا گیا، لیکن 75% نے صحیح اور برجستہ جواب اُس وقت دیا جب اس سوال کو انسانی حوالے سے پیش کیا گیا۔ اس تجربے کے مصنفوں نے قیاس کیا کہ نظریاتی مسائل کو حل کرنے میں ذاتی حوالوں کی ضرورت ''پتھر کے زمانے کی ذہانت'' کی عکاسی کرتی ہے، جو ہماری نسل تک آتی ہے۔

معروضی علم کی بنیاد اس امر پر ہے کہ حقائق کی تصویر کو تجربات سے الگ کر دیا جائے۔ مجرد اور صریح اشیا کے درمیان حرکت کرتے ہوئے ایک منطقی عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ مناسب درجہ بندی اور دلائل کی مدد سے مطلوبہ اطلاع کی بازیابی میں مدد ملتی ہے۔ دوسری طرف شخصیت لوگوں کو تقلید کے نمونے دکھاتی ہے۔ ایک شخص ایک مکمل ماڈل کی نقل کچھ سوچے بغیر کر لیتا ہے۔ مذہب میں شخصی مرقعے بچپن سے ہی سکھانے کے عمل میں معاون ہوتے ہیں اور ایسی صورتِ حال سے نپٹنا سکھاتے ہیں جسے سمجھنا کسی کی اہلیت میں نہیں ہوتا۔ جس طرح ایک بچہ اپنے بالغ ماں باپ پر بھروسا کرتا ہے کہ وہ اسے خطرناک صورتِ حال سے بچا لیں گے، اُسی طرح ایک مذہبی عقیدت مند مشکل میں مدد کے لیے خدا کو پکارتا ہے۔ یہ اس کا مکمل ردِعمل اور جذباتی طور پر خود اس کے لیے اطمینان بخش ہوتا ہے۔ معروضی تصورات اپنے طور پر درست ہوں گے، لیکن وہ ذہانت میں جذبات کو مہمیز نہیں کرتے۔ لہٰذا کوئی کلچر جس کا ارادہ معاشرے کی کثیر آبادی کو متاثر کرنا ہو، محض معروضیت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس درجے کا ذاتی تعلق اور قربت فلسفے پیدا نہیں کرتے، صرف مذہب پیدا کرتا ہے۔

اوائل زندگی کا مذہب

انسانیت نے جب بھی دورِ ماضی کے دھندلکوں میں ایک غیر شخصی صورت حال کا سامنا کیا، اس نے ناقابل فہم وجود کو انسانی صورتیں دے دیں۔ ابتدائی زمانے کے لوگوں نے قدرت کے عناصر کو ایک بوڑھی عورت کے روپ میں دیکھا، یا جواں سال شکاری کی شکل میں یا عظیم باپ کی طرح، وغیرہ وغیرہ۔ قدیم لوگوں نے رات کے آسمان کو ستاروں کے جھرمٹ کے اندر انسانی اور حیوانی شکلوں میں دیکھا۔ فطرت کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے جب انسان نے پہلی کوشش کی تو اس نے مافوق الفطرت تاویلیں کیں۔ اس وقت لڑائی کی کہانیاں ہوتی تھیں یا دیوتاؤں اور دیویوں کے درمیان سازشیں جس کا انجام فطرت کی دنیا میں قرینے مقرر کرنے پر ہوتا۔ مثال کے طور پر یونان کی دیومالا کی کہانی، ڈیمیٹر اور پرسیفون، جس کی یاد ہر سال ایلیپس میں منائی جاتی ہے، اس میں موسموں میں تبدیلی کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ ایک معاہدہ ہے جو دیوتاؤں نے شیطان سے خوب صورت پرسیفون کو سال کے کچھ عرصوں میں بدستور رکھنے کے لیے کیا۔ اس طرح عقیدہ اور شخصیت علم کے ایک ہی ڈھانچے میں آ ملے۔ یہ وقت تھا جب انسان نے فطرت کو سمجھنے کی سب سے پہلے کوشش کی تھی۔

یہ کہنا کہ ابتدائی انسان قدرت کو کوئی الوہی شے سمجھتا تھا، گمراہ کن ہوگا۔ اس طرح کی عقیدت مندی تو ہمارا مذہبی رویہ ہے۔ ابتدائی مذہب، خطرے سے خوف کے ساتھ پیدا ہوا، اس حد تک خوف کہ اس نے فطرت کو ایک شر سمجھا۔ گویا انسان کو ایک خوف ناک دنیا میں بے بسی کے ساتھ پھینک دیا گیا ہو۔ انسان کو اس خطرے کے ساتھ گزارا کرنا پڑا اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے، یہ باخبری کے ساتھ ہوا۔ انسان سبب اور نتائج سے لاعلم رہا اور اس نے فطرت کو اپنی افتادِ ذہنی کے مطابق دیکھا، اس نے فطری مظاہر کو اپنی شخصیتوں کے مطابق دیکھا۔ واقعات بالارادہ رونما ہوتے رہے، جیسے کوئی انسانی ذہن انہیں ہدایت دے رہا ہو۔ مظاہر پرستی کا یہ نظریہ، فطرت کی اس دنیا کو اس آئینے کی طرح بنا دیتا ہے جس میں انسان کو داخلی طور پر اپنی شباہت نظر آتی ہے۔ انسان کا یہی ابتدائی مذہب تھا۔ چاند، ستارے اور آسمان یہ سب دیوتا تھے، جسے انسانی روح عطا ہوتی تھی، جیسے دوسرے فطری عناصر کو ملی تھی۔ ان کے الگ الگ دائرۂ اثر تھے، اور ان کو خوش رکھنا ہوتا تھا، یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انفرادی طور پر ان سے رجوع کرنا ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ کرکے دیوتاؤں کا ایک طائفہ آسمان سے وابستہ ہوگیا اور دوسرا زمین سے۔ آسمانی دیوتا کے لیے طے ہوگیا کہ وہ مرد ہے اور زمین دیوی۔ آسمان کا دیوتا مردانہ توانائی خارج کرتا ہے۔ جب کہ سورج شعاعیں طاقت سے بھری ہوئی زمین پر پھینکتا ہے۔ جب زیوس کڑکتا ہے اور اپنے تخت پر براجمان وہاں سے بجلی کے جھٹکے پھینکتا ہے۔ زمین کی دیوی یا دیویاں، جن میں درخت اور زمین خود بھی شامل ہے، اپنے سلوک میں زیادہ مادرانہ اور پرورش کرنے والی ہستیاں تھیں اور فطری عنایات کا خاموش وسیلہ تھیں۔ اس طرح دیوتا، سب انسان کے کنبے میں شامل ہو گئے، ان میں ایک باپ ہے اور ماں ہے، بیٹے اور بیٹیاں ہیں، اور دوسرے رشتہ دار ہیں، اور ان کے مختلف کردار ہیں۔ مذہب کا مرکزی موضوع آسمان اور زمین کے درمیان وصل تھا۔ آسمان سے زمین پر بارش ہوتی جس سے مٹی نرم اور سبز ہو جاتی اور وافر فصل تیار ہوتی۔

مذہب کا مرکزی مقصد زمین کی زرخیزی تھا، زرخیزی سے بہ افراط پیداوار ہوتی۔ دونوں صورتوں میں، بہت سے بچوں کی پیدائش کی صورت میں بھی، اور وافر غذا کی پیدائش کی صورت میں بھی۔ چونکہ ان سب کا تعلق فطرت سے تھا، لہٰذا مذہب کا سارا زور فطرت پر تھا۔ مصر، ہندوستان اور مشرق وسطیٰ میں پیداوار کے سلسلے کی رسوم میں جنسی رسوم بھی شامل تھیں،

جس سے مراد فطرت کو یہ اشارہ تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ حیوانات جن کے بارے میں خیال تھا کہ ان میں زبردست جنسی توانائی ہوتی ہے، مثلاً سانپ اور سانڈ، اُن کی عبادت کی جانے لگی تا کہ پیداوار بہتر ہو۔ ایک اور مذہبی معاملہ کھیتوں کی زرخیزی تھا۔ ازمنہ وسطٰی کے انگلینڈ میں عام شادیاں مئی کے دن پر ہوتی تھیں یا ایسٹر کے بعد ساتویں اتوار کو، اس لیے کہ نئی فصل کے بیج کو طاقت پہنچے۔ جاوا میں کسان جوڑے دھان کے کھیت میں اسی غرض سے مباشرت کرتے تھے۔

یہ ساری رسمیں قدیم زمانے کے ''ہمدردانہ جادو'' کے عمل کی وضاحت کرتی ہیں۔ نظریہ یہ تھا کہ دیوتا جو عام لوگوں کی طرح ہوتے، انہیں اکثر بتانا پڑتا کہ انہیں کیا اور کس طرح کرنا چاہیے۔ فطرت کو اس کے لیے جلد ردِعمل کی خاطر آمادہ کرنے کے لیے ایک خاص فطری عمل کی نقل اتارتے یا جزوی طور پر ویسا ہی کرتے، یا اس طرح کا عمل دہراتے، گویا وہ کام ہو چکا ہے۔ ایک بانجھ عورت ایک گڑیا حاملہ ہونے کی امید میں ساتھ لیے رکھتی ہے۔ ایک عامل جادوگرنی جس شخص کو ہلاک کرنا چاہتی، اس کے موم کے پتلے میں سوئیاں پیوست کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فصل کی کٹائی کا موسم جنسی عمل سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ اس بات کی آس ہوتی کہ زمین بیجوں کے چھڑکاؤ کے بعد انہیں خوب اچھی فصل کے لیے تیار کرے گی۔ ''ہمدردانہ جادو'' سے ابتدائی مذہب کو اس کا مؤثر ہونا تسلیم کیا جاتا تھا۔ جادوگر کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ ذاتی صلاحیت یا اپنی ترکیبوں کے ذریعے مثلاً تعویذ اور ٹوٹکوں کی مدد سے، خاص طاقت حاصل کر کے فطرت کی بے پایاں طاقت میں دخیل ہو جائے گا۔ ایک اور جادو، الفاظ کا استعمال تھا دعاؤں کے لیے یا بددعاؤں کے لیے، یا دوسرے مخصوص الفاظ کا طلسمی استعمال۔

چونکہ زراعت ہی معاشی زندگی کی بنیاد تھی اس لیے ایک پیشہ ور پجاری ان رسوم کو انجام دیتا تھا، جن کا مقصد اچھی فصل حاصل کرنا تھا۔ ان رسموں کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری تھا کہ انہیں کوئی ایسا شخص انجام دے، جس کے پاس رسم کی انجام دہی کا خاصا علم ہو، رسم کی صحیح ادائیگی اس کے مؤثر ہونے کی چابی تھی۔ چنانچہ منظم مذہب جادوگری کا فن قرار پایا، جس کا مقصد فطرت کی دنیا سے محض نتائج حاصل کرنا تھا۔ فصل کی کٹائی کے حوالے سے جو رسوم ادا کی جاتیں، بعض اوقات ان میں انسانی قربانی بھی شامل ہوتی۔ ابتدائی زمانے کے لوگوں کا یقین تھا کہ مٹی کو زرخیز بنانے کے لیے کسی کو زمین میں دفن کرنا ضروری تھا۔ انسانی قربانی کی رسم ان دیوتاؤں سے وابستہ ہوگی کہ مرنے والا اناج کی شکل میں دوبارہ پیدا ہو گیا اور سال کے سال

زمین سے اگتا رہتا ہے۔ مصریوں میں اوسیریز (Osiris) کی رسم، ان بہت سی نباتاتی رسموں میں سے ایک تھی جو موت کی پیش بنی اور عیسیٰ کی دوبارہ پیدائش کی خبر دیتی تھی۔

مذہب میں تقدس کا ایک گونہ احساس شامل ہوتا ہے، جو سیکولر اور غیر مذہبی احساس سے بالکل جدا ہے۔ ابتداً کچھ مقدس مقامات کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہاں دیوتا رہتے ہیں۔ پجاری ایسی جگہوں پر معبد تعمیر کرتے تھے۔ سمیر کے لوگوں نے مقدس مقامات پر مندر تعمیر کیے۔ یونانی اور رومن باشندے اپنے مقامی دیوتاؤں کی رسمیں ادا کرتے تھے۔ ہندوؤں کے گھروں میں ایک کمرہ دیوتاؤں اور دیویوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ یہاں وشنو کا ایک روپ گرد و پیش پر نظر رکھتا ہے اور کنبے کی حفاظت کرتا ہے۔ یعقوب نے بیت ایل (Beth-El) میں ایک قربان گاہ تعمیر کی۔ یہ اس خواب کی یادگار ہے، جو اس نے دیکھا کہ ایک زینہ ہے جو جنت تک جا رہا ہے۔ اس مقدس جگہ کا نام اس نے بیت اللہ رکھا۔ تحریری تاریخ کی آمد کے ساتھ تقدس کا محل جگہ سے وقت کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہودیوں کا یوم سبت ہفتے میں ایک دن عبادت کے لیے وقف ہوتا ہے۔ تہوار اور تعطیلات سال میں کسی خاص بزرگ یا دینی ہستی کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔ وقت کے بارے میں یہ تصور کہ جب ساری دنیا اچانک خدا کی سمت مڑ جائے گی، یہودیوں کی آئندہ توقعات سے پیدا ہوا۔

کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تجسیمات کے متعلق تصور، یا انسان کی طرح کے خدا کا خیال، مذہب کی تاریخ میں نسبتاً تاخیر سے آیا۔ ابتدا میں علامتی جانور کی عبادت کی جاتی تھی۔ خاص جانوروں کا انتخاب جو قبائل کی شناخت اور ان کا نشان ہوں، ایسا ہی تھا جیسے آج کل پرچموں پر منفرد ڈیزائن بناتے ہیں تاکہ دوسری جمیعتوں سے الگ پہچانا جائے۔ ابتدائی معاشرے میں وہ مخصوص جانور جنہیں کوئی قبیلہ نشان کے طور پر منتخب کرتا تھا یا اپنا روحانی نشان سمجھتا تھا، مقدس خیال کیے جاتے تھے۔ بہت خاص تہوار کے موقعوں کو چھوڑ کر عام طور پر قبیلے کے لوگوں کو ایسے جانور کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ اس کے بعد ایک عبوری دور آیا جب دیوتا جزواً جانور ہوتے تھے۔ مصر کا ابوالہول اس کی ایک مثال ہے۔ (سر شیر کا اور جسم عورت کا) اووِڈ کی نظم میٹاسورفوسس میں، جسے مسدس میں لکھا گیا ہے، جانور کو دیوتا اور دیوتا کو جانور کے روپ میں ڈھلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پیغمبر دانیال نے جواب میں چار سیاسی سلطنتوں کو دیکھا، جن کی نمائندگی علامتی طور پر مختلف النسل جانور کر رہے تھے۔ اس کے بعد ایک اور حکمران تھا، ''کوئی آدمی جیسا''۔ پوری طرح انسانی دیوتا جو پہلے نظر آتے، طاقت وَر انسان رہے ہوں

گے جو مر گئے، لیکن ان کا اثر برقرار رہا۔ ابتدائی لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ایسے مرنے والوں کے بھوت واپس آ کر زندوں پر اپنا ہیبت ناک سایہ ڈال سکتے ہیں، لہٰذا ان کو خوش رکھنا ضروری ہو گا۔

مذہب پہلی تہذیب کے دور میں

پہلی تہذیب کی آمد سے فطرت کی پرستش کے بعد سیاسی طور پر منظم، انسانی معاشرے کی پرستش شروع ہوئی۔ فطرت کے دیوتا تبدیل ہوئے، اب ان کی جگہ مقامی ریاستوں کے دیوتاؤں نے لے لی۔ ریاستیں اس وقت محض سیاسی وحدتیں نہیں تھیں، بلکہ عبادت کے لیے بھی تھیں۔ ہر شہر کا اپنا دیوتا ہوتا تھا۔ جو اس کے شہریوں کی بھلائی کا خیال رکھتا تھا۔ مقامی دیوتا پوری انسانی برادری کا برائے نام آقا ہوتا تھا، جس کی جگہ پر پجاری بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ سومیز (Somes) میں ایک شہر کی حیثیت کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ خدا اسے کون سا مرتبہ دیتا ہے۔ اریدو سب سے زیادہ متبرک شہر تھا کیوں کہ یہاں دیوتا کا معبد تھا، جس نے انسانیت کو پیدا کیا۔ خانقاہیں مندر کے اندر تعمیر کی جاتی تھیں اور وہ شہر کی اجتماعی زندگی کا محور ہوتی تھیں۔ وہاں عام طور پر دیوتا کا ایک بھاری بھرکم بت رکھا ہوتا، جو نصف جانور کی شکل میں ہوتا اور وہیں قربان گاہ ہوتی، جہاں لوگ قربانیاں پیش کرتے تھے۔ اس بت کو کبھی کسی دیوتا کا روپ قیاس کیا جاتا اور بعض اوقات وہی دیوتا ہوتا۔ کلیسا کے پجاری اور داسیاں، جو دیوتا کے خدمت گار ہوتے، قربانی کی رسم ادا کرتے، پجاری بادشاہ بیک وقت دیوتا کا سب سے بڑا خادم بھی ہوتا اور اس کا ذاتی نمائندہ بھی۔

ابتدا میں مذہب کے نئے نظام کو جو سیاسی اداروں کے ساتھ پہچانا جانے لگا تھا، فطرت کی پرستش کی ماقبل تاریخ رسم قبول کرنی پڑی۔ اب دو مذہبی نظاموں نے ایک ساتھ رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔ ٹوائن بی نے لکھا، ”مصر میں سورج، فصل اور دریائے نیل کی عبادتوں کے ساتھ ہم مقامی بتوں کو بھی پوجتا ہوا دیکھتے ہیں۔ سمیر اور اکاد میں ہمیں تموز اور اشتار کی عبادت کے ساتھ شہری ریاستوں کی عبادت بھی نظر آتی ہے۔ چین میں ہمیں ایک سالانہ زراعتی رسم کے مظاہر نظر آتے ہیں جن میں شہزادہ بہشت سے ہم کنار ہوتا ہے اور نئے زراعتی سال کے لیے ہل کے ساتھ پہلی کیاری بناتا ہے، یہ رسم دعوے دار ریاستوں کی پرستش کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس پرامن اور غیر محسوس مذہبی انقلاب میں نئے مذہب نے پرانے پر غلبہ پا

لیا ہے بلکہ بعض اوقات اس نے عملاً فطرت کے پرانے خداؤں کو ہدایت کی ہے کہ نئی عبادت کے نمائندے کے طور پر قریبی اجتماعی انسانی قوت کی نمائندگی بھی کریں۔''

ٹوائن بی نے فطرت کے دیوتاؤں کی مثالیں دی ہیں، جنہیں شہروں نے اور قبائل نے بھی اپنا لیا تھا۔ ماؤنٹ سینائی پر جو خطبہ دیا گیا تھا، اس کی بنیاد پر ٹوائن بی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جیہودا اسرائیل کے قبیلے کا جنگی دیوتا بننے سے پہلے آتش فشاں کا یا موسم کا دیوتا تھا۔ زیوس کی بیٹی پلاس ایتھینا بیک وقت جنگ کی دیوی بھی تھی اور زیتون کی کاشت کی سرپرست بھی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایتھنز کی شہری ریاست کی روح اور محافظ ہوتی تھی۔ مصر کا سب سے بڑا دیوتا امون ری، امون یعنی زندگی کا سانس ہونے کے علاوہ اکثر ایک دنبے کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا اور ری سورج دیوتا تھا۔ گیارھویں خاندان کے بعد مصر کی سلطنت کے دارالحکومت تھیبس کا بڑا دیوتا امون تھا۔ فرعون زندہ خدا سمجھا جاتا تھا جو ری کا بیٹا تھا، اس کی پیدائش کے متعلق پاکیزہ اور صاف ستھرا تصور تھا۔

پانچویں خاندان سے پہلے فرعون بجائے خود ایک دیوتا تھا، لیکن فرعون کی عبادت کی رسم فطرت کی عبادت کے پرانے مذہب سے متصادم تھی۔ ری کے مقدس شہر ہیلیو پولس میں، جو مصر کے شمال میں تھا، پجاریوں کے ایک نہایت بااثر ادارے نے فطرت پرستوں کو غیر انسانی دیوتاؤں کے ایک الگ مقدس گروہ میں منظم کر دیا تھا، جن کا سربراہ سورج کا دیوتا ری تھا۔ ری کے بیٹے کے طور پر فرعون کا تقرر یعنی ری کے تقدس سے اس کی وابستگی ہیلیو پولس کے پجاریوں کی طرف سے ایک خاص رعایت اور فرعون کے کمزور ہوتے ہوئے اقتدار کی علامت تھا۔ پھر فرعون کی سورج پرستی اور دریائے نیل اور اس کے شاداب ساحل کے دیوتا اوری سس (Osiris) جو بہت مقبول تھا، کے درمیان تنازعہ پیدا ہو گیا۔ نباتات کی زندگی ہر سال پیدا ہوتی ہے اور مر جاتی ہے۔ اس طرح اوری سس اپنے ایک بڑے بھائی جس کا نام سیٹ تھا کے ہاتھوں قتل ہو گیا، لیکن اپنی بیوی ایسس (Isis) کی سخت محنت کے نتیجے میں زندہ ہو گیا۔ اس کے بعد حکومت اس کے بیٹے ہورس کو منتقل ہو گئی جس کی نیابت ایک باز کر رہا تھا۔ سیٹ پر ہورس کی فتح سیاسی طور پر بہت اہم تھی۔ کیوں کہ اس کے جادو منتر کرنے والے نمائندوں نے یعنی پہلے خاندان کے فراعین نے جن کا تعلق ملک کے جنوبی علاقے سے تھا، شمال کے دوآبے کو فتح کر لیا تھا جو سیٹ کی پرستش کا مرکز تھا، اوس رس کی مافوق الفطرت کہانی نے بھی شخصی دائمی زندگی کے مسلک کو تقویت دی جس کا مرکز فرعون کے جنازے کا بندوبست تھا۔ فرعون کی موت کے بعد فرض کر

لیا گیا تھا کہ وہ دیوتاؤں سے جا ملا ہے اور پاتال کے آقا کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہو گیا ہے۔ فرعون نے جس کے بدن پر مسالہ لگایا گیا تھا، لاتعداد رسوم کی ادائیگی اور دعاؤں کے ساتھ خود کو زندہ رکھا۔ فرعون کی وفادار رعیت خود بھی فرعون کی سفارش کے ساتھ اس کی بعد از حیات زندگی میں شریک ہو سکتی تھی۔

میسوپوٹیمیا میں سیاسی قائدین عام طور پر دیوتا کے فرستادہ کے طور پر حکومت کرتے اور اس سے مطمئن تھے۔ عظیم بادشاہوں لوگل زاگسٹ (Lugolzaggist) اور سارگن اوّل (Sargon-I) میں سے کسی نے، جنہوں نے 24 ویں صدی قبل مسیح میں اس علاقے کو منظم اور متحد کیا تھا، خداوندی کا دعویٰ نہیں کیا حالانکہ سارگن کے پوتے نے ایسا کیا۔ مصر اس لحاظ سے منفرد تھا کہ یہاں خدا کا تعلق ایک زندہ انسان کے ساتھ تھا۔ زندہ مورتیوں کی روایت نے یونان اور روم کی سلطنتوں کی مذہبی رسوم پر اثر ڈالا۔ مغربی وضع کے یہ دونوں عظیم فوجی لیڈر اپنی فتوحات کے دوران جب مصر آئے تو مذہب کی اس روایت کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سکندر اعظم 332 قبل مسیح میں مصر آیا۔ اس کے ساتھ یونان کی ایک بڑی فوج تھی۔ مصری مذہب سے وہ بہت متاثر ہوا، چنانچہ چار سو میل کا سفر کر کے وہ ایک دور افتادہ نخلستان پہنچا جو مغرب کے ریگزار میں واقع تھا۔ وہ امون ری کے دیوتاؤں سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ پجاریوں نے سکندر سے کہا کہ وہ امون ری کا بیٹا تھا۔ اس کے بعد سکندر اور ہیلین کے جانشینوں نے مصر کے شاہی فرمانروا ہونے کے ساتھ الوہیت کا دعویٰ کر دیا۔ سکندر کے ایک مداح جیولس سیزر نے بھی دیوتا بادشاہ کی روایت کے آگے سر جھکا دیا، جن دنوں وہ 48 قبل مسیح میں کلوپٹرا کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہا تھا۔ پھر ایک رسم ڈال دی گئی جس کے تحت اسے دیوتا بنا دیا گیا اور اس کی عبادت شروع ہو گئی۔ روم کی سینیٹ نے سیزر کی موت کے دو سال بعد آ کیٹوین کے زور دینے پر اس رسم کی توثیق کر دی۔ اگرچہ آ کیٹوین خود دیوتا بنانے کے خلاف تھا، لیکن اس شاہی خاندان نے جسے اس نے مستحکم کیا تھا، بادشاہ کی پرستش کی رسم جاری کر دی۔ پھر روم کے شہریوں سے اپنی مذہبی وطن دوستی کے اظہار کے طور پر یہ توقع کی جانے لگی کہ وہ بادشاہ کی غیر معمولی ''فطانت'' یا آسمانی روح کی خاطر قربانیاں دیں گے۔

بادشاہ کو دیوتا بنانے کے طریقے نے اس کی خودستائی کے علاوہ ایک سودمند سیاسی مقصد پورا کیا۔ اس نے شاہی اقتدار کے لیے مذہب کی مدد حاصل کی۔ اس حقیقت نے کہ بادشاہ کو الوہی مدد حاصل ہے، اقتدار پسند یا ناراض سپاہیوں کو اسے قتل کرنے کی ممکنہ کوشش سے

باز رکھا۔ چند بادشاہوں نے دیوتا کے حکم کے طور پر حکومت کرنے کو ترجیح دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ قتل کا ارادہ کرنے والوں کو زیادہ مؤثر طور سے خوف زدہ رکھا جا سکے گا کیوں کہ انہیں یقین ہو گا۔ ایک منتقم مزاج دیوتا قتل کی کامیاب کوشش کے بعد سلامت رہ جائے گا۔ بادشاہ اپنے خاص سیاسی مقاصد کی خاطر بھی مذہب کو استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ٹولمی اول (Ptolemy-I) نے یونانی حکومت اور مقامی مصری آبادی کے درمیان مذہبی تعلق پیدا کرنے کے لیے اوسیرس ایپس (Osiris Apis) کی رسم کو یونانی رنگ دینے کی کوشش کی تھی، چنانچہ ایپس (سانڈ) دیوتا کا نام از سرِ نو سیراپس (Serapis) رکھا گیا اور اسے یونانی رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ ایپس (سانڈ) دیوتا کا نام از سرِ نو سیراپس (Serapis) رکھا گیا اور اسے یونانی شباہت دی گئی۔ اسکندریہ میں اس نئے دیوتا کے لیے ایک مندر تعمیر کیا گیا۔ اگرچہ یونانیوں کو سیراپس کی پوجا سے دلچسپی پیدا ہوئی لیکن مصری پہلے ہی کی طرح اوسیرس ایپس کی پرستش کرتے رہے۔ اس سے ایک بہتر اور معروف مثال اینٹیوکس اپی فینس (Antiochus Epiphanes) چہارم کا یہ فیصلہ تھا کہ یروشلم کے مندر میں جو قربان گاہ ہے، اس کی جگہ زیوس اورینس کا مجسمہ کھڑا کر دیا جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک مقامی دیوتا یہواہ (Yehwah) کو سیلوسڈ کی سلطنت کی اقوام کے دیوتاؤں میں شامل کر لیا جائے۔ اس مذموم فعل نے میکابیہ کی فوج میں بغاوت کی چنگاری پھونک دی۔

چند رومن بادشاہوں نے جو طاقت کے جوش میں دیوانے ہو رہے تھے، الوہی حیثیت کا دعویٰ اشتعال انگیز انداز سے کیا۔ کیلی گلا (Caligula) نے اعلان کیا کہ وہ جوپیٹر کے مرتبے کا دیوتا ہے۔ اس نے ایک مندر بنوایا جہاں بادشاہ کی عبادت کی جا سکے اور اپنے پسندیدہ گھڑسوار کو پجاریوں میں سے ایک پجاری بنا کر مقرر کرایا۔ نیرو نے حکم دیا کہ خود اس کا 120 فٹ اونچا مجسمہ بنایا جائے اور اس کے سر سے آفتابی شعاعیں ہر طرف نکل کر پھیل رہی ہوں۔ جیسا کہ فیوبس اپولو میں ہے۔ بادشاہ ڈومیشین نے اپنے خاندان کے قریبی عزیزوں کے بت بنوائے اور پجاریوں کا ایک نیا گروہ تیار کیا، جو اس کی عبادت میں شریک ہوا کریں اور سرکاری عہدے داروں کو حکم دیا کہ اسے سرکاری کاغذات میں ''میرے آقا، میرے خدا'' لکھا کریں۔ ان بہت سے عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جنہوں نے اس کے آگے قربانی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم زیادہ تر بادشاہ مذہب کو حکومت چلانے کا محض ایک آلہ سمجھتے تھے۔ وہ مفتوحہ اقوام کے دیوتاؤں کو روم کے بتوں کی صفت میں ایک باعزت مقام دیتے

تھے۔ ہیلو گابالوس (Heiogabalus) نے سول انوِکٹس (Sol Invietus) یعنی غیر مفتوحہ سورج کی عبادت کو متعارف کرایا جس کی بنیاد میسوپوٹیمیا کے سورج دیوتا پر تھی۔ کانسٹنٹائن اعظم مسیحی عقیدہ اختیار کرنے کے بعد بھی اس پرانے عقیدے میں سرتاپا غرق رہا۔ کانسٹنٹائن کے بھتیجے جیولین اپاسٹیٹ نے نیو پلیٹونزم (Neoplatonism) کو ریاست کا مذہب قرار دینے کی کوشش کی۔

مشرق بعید میں بادشاہوں نے پجاری دیوتا کا قدیمی کردار جدید زمانے میں اختیار کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر سال چینی حکمران قوم کو قربانی کی رسمیں ٹمپل آف ہیون (جنت کے مندر) میں ادا کرنے کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ اس میں ایک اچھی فصل کی خاطر منتر پھونکنے کا عمل بھی شامل ہوتا تھا۔ سب سے بڑا دیوتا ٹی اِن بمعنی جنت تھا، جو کائنات کو چلانے والی حکمران طاقت کی نمائندگی کرتا تھا۔ دانش وَر اس کی تفسیر غیر شخصی انداز سے کرتے تھے، جب کہ عام لوگ ٹی اِن کی پرستش ایک دیوتا کے طور پر کرتے رہے۔ بادشاہ چونکہ ''جنت کا بیٹا'' تھا، اس لیے زمین پر جنت کا نمائندہ تھا۔ وہ سماج میں سب سے اونچے درجے پر فائز تھا۔ بادشاہ کے احکام اس وقت تک خدا کی خواہش کا اظہار سمجھے جاتے تھے، جب تک وہ ''جنت'' کے منصب پر براجمان تھا۔ جاپان کا شہنشاہ ایک خاندان کی طرح قومی اتحاد کی علامت تھا۔ اس کا روایتی کردار یہ تھا کہ اپنے بزرگوں کی روح کو سلام عقیدت پیش کرتا رہے۔ ''کامی'' یا ایک پاکیزہ روح کا تصور، جس کی نمائندگی سنٹو روایات کے مطابق بادشاہ کرتا تھا روزمرہ زندگی میں ایک باعزت طرزِ عمل اختیار کرنے پر آمادہ رکھتا تھا۔ وہ تو جب فوجیوں نے جاپانی حکومت کے اختیارات حاصل کر لیے تو شہنشاہ اپنے جنگجویانہ عزائم کی علامت بن کر رہ گیا۔ شہنشاہ کی پرستش جاپان میں ایک طرح کی آباواجداد کی پرستش تھی جو ایک نسل کے لوگوں کی روحانیت کی آئینہ دار تھی۔

تہذیب کے پہلے عہد میں مذہبی عقائد اسی طرح کے تھے، جو ماقبل تاریخ کے دور میں تھے۔ دیوتاؤں کا وجود تھا یا واقعی ان کے پاس طاقت تھی، اس بارے میں کوئی سوال نہیں کرتا تھا۔ موجودہ عقیدہ فطرت کے خداؤں سے شہروں کے خداؤں کو یا قوموں کو یا حکومتوں کو منتقل ہو گیا تھا۔ سیاسی مذاہب نے قدیم روایات کا احترام کرتے ہوئے اور مقامی لوگوں کے جدی پشتی دیوتاؤں کو خراجِ عقیدت ادا کر کے عوامی تائید حاصل کر لی تھی۔ اس میں وہ احترام بھی شامل تھا جو دنیاوی طاقت کے استعمال سے ان کو حاصل تھا۔ زمین کے عظیم بادشاہوں کو یہ

طاقت حاصل تھی کہ اپنی شان وشوکت اور دبدبے کی نمائش سے ان کے عقیدوں کو مزید تقویت پہنچائیں۔ اس زمانے میں عام لوگ طبعی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی توجیہہ کے لیے آسمانی روحوں اور بھوت پریت کی طرف دیکھتے تھے۔ بیماریوں کا سبب ان کے نزدیک بدروح کا سایہ تھا۔ علاج کا مقصد جسم سے بدروح کا اخراج تھا۔ بابل کے نجومیوں نے ستاروں کے ساتھ ارواح کے بارے میں بھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ان کے نزدیک ہر سیارہ ایک دیوتا تھا، جو انسانوں کے معاملات سے دلچسپی رکھتا تھا۔ شاہی دربار میں قسمت کا حال بتانا ایک اہم پیشہ تھا۔ چین کے شانگ بادشاہ ماہروں سے مشورہ کرتے تھے جو ہڈیوں میں شگاف سے مستقبل کا حال پڑھ لیتے تھے۔ روم کے جرنیل جنگ شروع کرنے سے فال نکالنے والوں سے مشورہ کرتے تھے۔

دیوتاؤں اور دیویوں میں شخصیات کا اظہار ہوتا تھا۔ جو قدرتی دنیا میں اپنا وجود رکھتے تھے اور کبھی کبھی انسانوں کے معاملات میں مداخلت کرتے تھے۔ بعض انسان جیسے ایکلز (Achilles) خدا کی طرف سے آئے تھے یا خدا سے ربط ضبط رکھتے تھے۔ بادشاہ اور شہنشاہ اپنی شہرت میں اضافے کے لیے بہت سرگرم رہتے تھے۔ معبد کی دیواروں پر کندہ مصر کے فرعون کا پرغرور اعلان جنگوں میں اس کی کامیابی کے بارے میں لکھا ہوتا تھا۔ ایک ایسی ہی کھدی ہوئی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیریا بادشاہ تغلتھ پائلسر اول نے پیدل ہوتے ہوئے 120 شیر مارے اور 80 شیروں کا شکار اپنے ہاتھ سے کیا۔ فارس کے دارا اوّل نے ''بہستان'' میں لکھا: ''فراورتش پکڑا گیا اور اسے میرے پاس لایا گیا۔ میں نے اس کی ناک کاٹ دی، پھر کان کاٹ دیے اور زبان کاٹ دی۔'' شہری مذہب بھی مجسموں، آرائشی کندہ کاری اور دوسرے تصویری طریقہ سے افراد کی شباہت کو نمایاں کرتا تھا۔ یونانیوں کی حقیقت پسندانہ مجسمہ سازی نے شخصیتوں کو غیر معمولی طور پر نمایاں کر دیا تھا۔ شہنشاہ کی شباہت کو نمایاں کرنے کا ایک نہایت مؤثر طریقہ سکوں کے ذریعے ممکن تھا۔ یہ سکے جن پر شہنشاہ کی شباہت نمایاں ہوتی دور دراز جگہوں تک پہنچتے۔ ایک فریسی نے عیسیٰ سے سوال پوچھا، ''کیا روم کے بادشاہ کو ٹیکس دینا قانونی طور پر درست ہے۔'' عیسیٰ نے ایک سکہ دکھاتے ہوئے پوچھا، ''اس پر سر کس کا ہے؟'' جواب دیا، ''سیزر کا،'' عیسیٰ نے کہا، ''جو سیزر کا ہے وہ سیزر کو دو، جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔''

مذہب: دوسری تہذیب میں

دوسری تہذیب میں مذہب میں فلسفہ داخل ہوا۔ اب تک فلسفہ کو علم کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ نظام کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی اخلاقی سربلندی نے چین سے یونان تک تہذیبوں پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور تقریباً ایک ہی عہد کے عظیم مفکروں اور دانشوروں کے گروہ نے نیکی، انصاف اور صداقت کی اعلیٰ اقدار کا پرچم بلند کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن یہ فلسفہ تو اس سے بھی زیادہ قدیم کلچر کے مذہب میں موجود تھا۔ اس کلچر نے بھی ابھرتے ہوئے عالمی مذاہب میں تخلیقی طور پر مدد دی تھی۔ انقلابی فلسفہ اور روائتی مذہب، دو والدین، باپ اور ماں کی طرح تھے، جنھوں نے ایک نیا مذہبی نظام قائم کیا، جس کی بنیاد صداقت اور عقیدے پر تھی۔ عقیدے کا ڈھانچا جو روایتی مذہب کا ورثہ تھا، اپنی جگہ محفوظ تھا۔ مسیحی عقیدے کی بنیاد خدا کی وحدانیت کے تصور پر تھی۔ یہ تصور یہودیت سے آیا تھا۔ یہود کا خدا جیہوا (Jehovah) بابل کے پجاریوں کے مقابلے میں موسیٰ اور علیجاہ کے معجزوں کے ذریعے اپنی اعلیٰ تر طاقت ثابت کر چکا تھا، اسی طرح بودھ اور ہندومت کے فلسفے نے، جو عالمی مذاہب ہیں، دیوتاؤں پر اور بھی پرانا عقیدہ رکھتے ہیں، پہلے کے مذہبی طور طریقوں کو بلکہ خدا کے وجود کو بھی چیلنج کیا، لیکن بعد میں ایک زیادہ نفیس اور اخلاق پر مبنی مذہب کی تشکیل پر تکیہ کر لیا۔

یونانی فلسفے نے انسان کی فکر پر گہرا اثر ڈالا، کیوں کہ اس نے اشرافیہ کے دلوں اور دماغوں کو مسخر کر لیا تھا، یہ طبقہ ان دور افتادہ علاقوں کے معاشروں پر ہی گہرا اثر رکھتا تھا، جن پر سکندر اور اس کے جانشین حکمرانوں نے حکومت کی تھی۔ یہ فلسفہ جس کی بنیاد ریاضی اور خود آگاہی کے طریقوں پر تھی، دنیا میں سب سے زیادہ نفیس قسم کا علم مانا جاتا تھا۔ اس نے دنیا کے سب سے زیادہ طاقت وَر اور ذہین افراد کے دل جیت لیے تھے، جنھیں اس میں صداقت کی کلید نظر آتی تھی، تاہم ہندوستان اور چین کے معاشرے چھٹے اور پانچویں قبل مسیح کے زمانے میں فلسفے سے روشناس ہوئے۔ ہر مکتبہ فکر کے اپنے نمائندے ہوتے تھے۔ تاریخ جن لوگوں کو سب سے زیادہ یاد رکھتی ہے، وہ اخلاقی فلسفہ دان اور مثالیت پسند لوگ ہیں، جن کے پاس انسانوں کے طرزِ عمل کا ایک واضح نسخہ موجود ہے۔

یونان کی فلسفیانہ تحریک کا مرکزی شخص افلاطون تھا۔ افلاطون نے ایتھنز میں فلسفہ دانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ اقلیدس، موسیقی اور دوسرے سنجیدہ مضامین کی تعلیم سے نوجوان گھٹیا فسادات سے ہٹ کر محبت، نیکی اور سچائی کی اعلیٰ صفات میں خود کو

ڈھال لیں گے۔ افلاطون کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر خالصتاً سچائی کے بارے میں جاننا چاہو تو سچا بننے کی خواہش اپنے اندر پیدا کرنی ہوگی۔ اس نے اپنی اکیڈمی میں تعلیم کا تقابل پہاڑ سر کرنے اور دنیا کو بلندی سے دیکھنے سے کیا۔ وہ فلسفی جنہوں نے اعلیٰ تر سچائیوں کی جھلکیاں دیکھی ہوں، ان کا فریضہ ہے کہ معاشرے میں واپس جائیں اور اپنی بصیرت کو کام میں لائیں، اس نے لکھا، ایک بار تمہیں اس (سچائی) کی عادت پڑ جائے تو تم اسے ہمیشہ (دنیاوی حالات سے) الگ کر کے دیکھو گے، ان لوگوں سے بہتر جو وہاں رہتے ہوں اور پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہر ایک دیوتا کیا ہے اور وہ کہیں سے بھی ہو، وہ تو ایک شائبہ ہے، کیوں کہ تم (فلسفیوں) نے خوب صورتی، عدل اور نیکی کی حقیقت کو دیکھ لیا ہے۔ افلاطون کو یقین تھا کہ خیالات کا صحیح ادراک وہ کلید ہے جس سے افراد کی زندگی کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ یہ تھا تمام تر دلائل میں غرق ہو جانا۔ ذہن کی اعلیٰ و ارفع عادات اختیار کرنا اور انہیں روزمرہ زندگی میں برتنا۔ افلاطون کا موقف یہ تھا کہ خیالات حقیقی ہوتے ہیں، بہت زیادہ حقیقی، جسمانی اشیا سے بھی زیادہ حقیقی۔ اپنی تصنیف (Timaew) میں اس نے وجود کے ایک دائمی علاقے کا ذکر کیا ہے، جہاں خیالات ذخیرہ ہوتے ہیں جیسے وہ نمونے جن کے طرز پر دنیا میں اشیا تخلیق کی جاتی ہیں۔

افلاطون کے شاگرد ارسطو نے فلسفے کا ایک متوازی سکول قائم کیا۔ اس کی تصنیف (Nicomaeheom Ethics) میں سچائی کا راستہ ایک اور سمت میں نکلتا ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ خوش رہنا اچھا ہے لیکن فوری خوشی کا حصول، اس خوبی کے مقابلے میں بے حقیقت ہے، جو دیرپا آسودگی مہیا کرتی ہے۔ اب فلسفۂ اخلاق وہ سوال ٹھہرا کہ خوشی کی تلاش معقول انداز سے کس طرح کی جائے۔ ارسطو نے یہ اجازت دے دی کہ افراد خوشی کو ہی اپنا اصل مقصود بنانے ہیں۔ آزاد ہوں گے، لیکن اس نے ''مقاصد'' کی وضاحت اس طرح کی، یعنی وہ ''جس کی ہم خواہش کرتے ہیں''، اور ''ذریعہ، جس کا ہم انتخاب کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں یہاں تک اسے حاصل کر لیں۔'' لہٰذا ایک مقصد کے طور پر خوشی کسی فرد کی سچی خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ خواہش قدر پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی تحریک ہوتی ہے، جو بعض چیزوں کے حصول کو ذاتی طور پر اہم بنا دیتی ہے اور اس کے حصول کے لیے تحریک پیدا کرتی ہے۔ اگر کسی فرد کے لیے اپنی خواہش کی تکمیل ''اچھائی'' ہے تو فلسفے کا مقصد یہ ہو جاتا ہے کہ اسے کامیابی سے حاصل کرنے کے لیے حکمت عملی تیار کرے۔

عاقلانہ طور پر خوشی کے حصول کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک ذہین شخص اپنے مقصد تک

پہنچنے کے لیے اس غیر یقینی دنیا میں مواقع کو بہتر بنائے۔ پھر وہ اس طرح کے طریقوں کو ترک کر دیں، مثلاً کثرت سے شراب نوشی جو تھوڑی دیر کے لیے خوشی فراہم کرتی ہے، پھر دیرپا اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بیشتر جسمانی لذتیں پھر خواہشات کی فہرست سے خارج کر دی جاتی ہیں۔ پھر وہ ایسی سرگرمیاں ترک کر دیتا ہے جس کے نتائج پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر کسی دوسرے فرد سے محبت کرتے ہوئے بہت زیادہ خطرہ ہوتا ہے اور نتیجہ غیر یقینی۔ کوئی بھی معقول آدمی ایسا مقصد حاصل کرنے کی امید نہیں کر سکتا۔ اس کے بجائے فلسفی ذہانت سے بھری ہوئی خواہش پوری کرنا چاہیں گے، ایسی خواہش جو خوشی کے کامیاب حصول کا ذریعہ ہو۔ اس سوال کا سب سے نتیجہ خیز حل بدھ کے پاس تھا۔ اس نے خوشی تک پہنچنے کا یہ راستہ دکھایا، یا مصائب سے بچنے کی یہ ترکیب بتائی کہ خواہش کو سرے سے ہی ختم کر دو۔ اگر کسی شخص کی کوئی خواہش نہیں ہو گی تو اسے خواہش کے حصول میں ناکامی بھی نہیں ہو گی۔ اس سے کم تر بات یہ کہ ایک معقول شخص ناکام خواہشوں کی ناگواری سے بچنے کے لیے ایسے جذباتی الجھاوؤں سے گریز کرے جو اذیت دہ ہو سکتے ہیں۔

اس حساب سے دیکھیں تو سب سے اچھی محبت اپنے آپ سے محبت ہو گی۔ ایسا کرتے ہوئے چونکہ جوابی ردِ عمل اس فرد کے اپنے اختیار میں ہو گا تو خواہش کی تکمیل بھی اسی لیے ممکن ہو گی۔ اس طرح وہ شخص جذباتی توانائی کے اخراج پر قابو پا سکے گا اور مطمئن رہے گا۔ لہٰذا رنج اور خوشی دونوں سے عاری طمانیت کی زندگی ایک فلسفی کے لیے یہی ہو گی کہ اس کا رخ دوسروں کی طرف ہو کہ یہی سب سے معقول طریقہ ہو گا۔ یقیناً یہی وہ راستہ تھا جو یونانی، رومن اور فلسفے کے ہندوستانی مکینوں نے اپنے لیے اختیار کیا۔ فلسفیوں نے ذہنی لاتعلقی کا ایک رویہ اختیار کرنا شروع کیا اور ہمدردی اور محبت دونوں طرح کے جذبات کو دباتے رہے۔ سینیکا نے کہا تھا ''ترس ایک ذہنی بیماری ہے، جو دوسرے لوگوں کو مصائب میں دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ سمجھ دار آدمی ایسی ذہنی بیماریوں کا شکار نہیں ہوتا۔ اپی ٹیٹس (Epictetus) نے اپنے شاگردوں سے کہا، اگر تم اپنے ایک بچے کو چوم رہے ہو تو اس عمل میں اپنے تخیل کو بے اختیار نہ چھوڑ دو اور نہ جذبات کو بے لگام ہونے دو، واقعی بچے کو چومتے وقت سرگوشی میں یہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ ''کل تم مر جاؤ گے۔''

اس انتہا درجے کی عقلیت پسندی کے فلسفے کو دوسرے اثرات کے ذریعے معتدل بنانا کلچر کی سلامتی کے لیے ضروری تھا۔ یہ اثرات تو میہاتی رسوم اور عقائد کی صورت میں مفتوحہ

علاقوں کے اندر سامنے آئے۔ سکندر کی فوجیں لوٹ کے مال کے علاوہ اپنے ساتھ یونان میں بابل کا علوم نجوم بھی لائی تھیں۔ رومن فوجوں نے نہایت وسیع علاقہ فتح کر لیا تھا اور اس میں جوڈیا بھی شامل تھا، اور جوڈیا سے ایک عجیب حکایت ایک شخص عیسیٰ کے بارے میں سنی گئی، جسے صلیب پر لٹکا دیا گیا تھا، لیکن مرنے کے بعد پھر زندہ ہو گیا۔ اسی طرح کا مسلک روم کے بالغ نظر فلسفیوں کے لیے قابلِ قبول ہوتا اور وہ اس سے متاثر ہو جاتے جو ایک غیر منطقی بات تھی، قابل فہم نہیں مگر وہ تو ہوئی۔ روم کے حکمران طبقے کو مسیحیت کا پیغام بالکل مہمل نظر آیا۔ ان کے صلح کل اور نیاز مندی کے اصولوں کو دنیاوی اقتدار کے آگے انہوں نے حقارت سے رد کر دیا اور ''غلامی کی صفات'' قرار دیا۔ مسیحیت میں رحم اور محبت کی انسانی صفات استدلال پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ روم والوں کی اس میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایسے اصول کردار کے کمزور اور غیر عقلی رجحانات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اپوسٹل پال نے فرسٹ کورن تھینز (First Corinthians) منابا ''خدائی نادانی انسان کی عقل مندی سے زیادہ دانش مندانہ ہوتی ہے اور خدائی کمزوری انسان کی طاقت سے بھی زیادہ طاقت وَر ہوتی ہے۔

مسیحیت نے روم کے فلسفیانہ کلچر کو شخصیت کا عنصر دیا۔ روم کا معاشرہ معافی اور درگزر کی بات کو زیادہ جلد قبول کر لیتا تھا، بجائے اس کے کہ کسی کو سزا دی جائے اور ذہنی طور پر اسے سب سے الگ تھلگ کر دیا جائے۔ یہ مذہب عورتوں اور غلاموں میں خاص طور پر مقبول ہوا۔ صلیب پر عیسیٰ کے وجود کا تصور کر کے، مصیبت کے مارے ہوئے لوگوں کو ہمدردی کا ایک نمونہ مل گیا۔ موت کے بعد اس کا دوبارہ زندہ ہونا امید کا نہایت مؤثر پیغام دیتا تھا۔ انجیل میں عیسیٰ کی کہانی ایک ایسے شخص کی شبیہہ پیش کرتی ہے جو فلسفی سے مختلف نہیں لگتا اور جو انتہائی دانشمند اور منظّم معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ عیسیٰ کی یہ شبیہہ ایسی نہ تھی جو معمولی لوگوں سے موافقت کرتی لہٰذا یہاں نوزائیدہ عیسائیت نے روم کے حریف عقائد سے بھی کچھ شخصی عناصر عاریتاً لے لیے تا کہ ان کی جذباتی اپیل میں اضافہ ہو جائے۔ مصریوں کے آئسس (Isis) عقیدے سے اور فریگین (Phrygian) کے سائبل (Cyble) مسلک سے اور کچھ دوسرے عقیدوں سے مسیحیت کو ایک محبت کرنے والی ماں کی شباہت مل گئی، جسے کنواری مریم پر منطبق کر دیا۔ نجات دہندہ کے طور پر عیسیٰ کے کردار پر فارس کے دیوتا متھراس کا سایہ تھا جس نے ایک بیل کو ذبح کیا۔ یونانی دیوتا ڈائنوسس کے عقیدت مندوں کی طرح جو عیسائیوں ہی کی طرح یوکراسٹ

(Eucharist) منا رہے تھے، یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ سب دیوتا کا اپنا لہو پی رہے تھے۔ حالانکہ وہ شراب پی رہے تھے۔

ایک اور عمل اسی کی طرح بدھ کے فلسفیانہ مذہب کو ایک نجات دہندہ کے مسلک میں تبدیل کر رہا تھا، جس میں عام لوگوں کے لیے کشش تھی۔ بودھ کی اصل تعلیمات جو بدھ ازم کے اصولوں میں درج ہیں، یہ بتاتی ہیں کہ افراد کس طرح نروان حاصل کر سکتے ہیں یا بار بار پیدا ہونے اور زندگی سے بچ سکتے ہیں۔ اس کے لیے رویے کی تبدیلی درکار ہوگی۔ مسئلہ اب یہ تھا کہ سبق سکھانے والا جب اپنے وجود میں گم ہو کر نجات پا گیا تو وہ اپنے مقلدوں کے لیے نایاب ہو گیا۔ مذہب کی ایک نئی شاخ مہایانہ بدھ ازم چین جانے سے پہلے ہندوستان کے شمال مغرب میں پہلی دو صدی عیسوی کے اندر پھیلنے لگی تھی۔ مہایانہ کی تعلیم کا تقاضا یہ تھا کہ بدھ نے اپنے پیروکاروں کے لیے رحم دلی کے جذبے کے تحت زمین سے اپنی روانگی میں تاخیر کر دی تھی تاکہ دوسروں کی مدد کر کے انہیں نروان دلا سکیں۔ اس طرح بدھ ایک روحانی فلسفی کی بجائے ایک شخصی نجات دہندہ بن گئے تھے۔ اگرچہ وہ خود لا مذہب تھے یا کم از کم ایک ایسے شخص جسے موت کے بعد کی زندگی اور اس کے سوالوں سے یا دائمی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بدھ بالآخر مذہبی کلچر میں ایک دیوتا جیسے بن گئے، جنہیں اعجاز اور فیض رسانی کی طاقتیں ودیعت ہو گئی تھیں، بدھ دیوتا کمزور درجے کے دیوتا تھے لیکن وہ بھی مدد کے لیے پکارے جانے پر فوراً مدد کو پہنچتے۔ مہایانہ بدھ ازم نے مسیحیت کی طرح خیراتی کاموں کو ترقی دینا شروع کیا، اور اس یقین کو پھیلایا کہ پاک باز روحوں کو مرنے کے بعد ایک جنت ملے گی۔

ہندوستان کی پرانی ہندو روایت میں نسوانی اور مردانہ شخصیات کا ایک ثروت مند گروہ تھا۔ اس بنا پر ہندو مذہب میں بہت سے خداؤں کی گنجائش تھی۔ بدھوں کے مقابلے میں بھی اس نے اپنا وجود برقرار رکھا اور حریف مذاہب سے کچھ عناصر لے کر اپنی دوبارہ تنظیم کی۔ پہلے ویدک رسوم میں دیوتاؤں کی تشکیل کا مقصد انہیں کسی نہ کسی طور پر لوگوں کی مدد کے قابل بنانا تھا۔ سنسکرت ادب ایک طرح سے پیچیدہ ہو گیا تھا۔ ہندومت میں اس کی تجدید کے بعد دیوتاؤں اور دیویوں کے درمیان اور ان کا عام لوگوں کے ساتھ ایک جذباتی تعلق پیدا ہوا تھا، یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے بودھوں کا بودھ پجاریوں کے ساتھ تھا۔ تین بڑے دیوتا، براھما، وشنو اور شِو کائنات پر حکومت کرتے تھے اور تخلیق اور تباہی کے درمیان توازن قائم رکھتے تھے۔ شِو اور اس کی دیوی ''کالی'' تباہی اور موت کی طاقتوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ وِشنو محبت کا دیوتا

تھا۔ وہ ذاتی طور پر نجات دہندہ تھا اور کبھی کبھی انسان کا روپ اختیار کر لیتا تھا۔ براھما کائنات کا اصل پیدا کرنے والا تھا، وہ نیکی اور بدی کی قوتوں سے بالا تھا۔ گنیش جس کا سر ہاتھی کا تھا، دانش کا دیوتا تھا۔ وہ شِو اور سرسوتی کا بیٹا تھا، جو مہربان دیوتا ہیں۔ ہندو مذہب میں جو فطرت کی پرستش سے وابستہ پرانے مذاہب کی ایک ترقی یافتہ شکل تھا، ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کا وجود ایک خاندان کی صورت میں متحد تھا۔ اس تعلق باہمی کو ادب میں اور مافوق الفطرت کہانیوں میں واضح کیا گیا ہے۔ پوجا کرنے والے خاص خاص مقاصد کے لیے مخصوص دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت کرتے، ان پر نذرانے دیتے یا ان کی پوجا کے لیے تہوار مناتے تھے۔

اپنے تصورات اور طریقوں میں مذہب اسلام سادگی اور سخت اصولوں کا مذہب ہے، جب کہ ہندو مذہب میں رسوم کی فراوانی ہے۔ مسیحی مذہب پر قدیم یونانی صنمیات کا اثر تھا۔ ان کے ردِعمل میں اسلام نے موسیٰ کی توحید پرستی کو سختی سے برقرار رکھا اور اس میں کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ یہاں خدائی میں کوئی ارکانِ ثلاثہ نہیں تھے۔ بس ایک خدا تھا۔ دینیات کی پیدا کردہ نفاستوں سے قطع نظر اس کے عقائد کا ڈھانچا یہودیت اور مسیحیت سے ملتا جلتا تھا۔ وہ عبادت گزار جو مرنے کے بعد روزِ قیامت پر اپنے امتحان میں پورا اترے گا، اسے جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

اسلام میں شخصی چہروں کو نمایاں کرنے کی ممانعت ہے، اس لیے اسلامی کلچر میں شخصیات کو اس طرح پیش کرنا ممکن نہیں تھا جس طرح دوسرے مذاہب میں اس کی اجازت ہے۔ تاہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں اتنے تاریخی احوال چھوڑے تھے جن میں ان کی شخصیت کا کچھ عنصر شامل ہے۔ اسلامی کلچر میں شخصیت کا عنصر شاعری کی متمول روایت سے بھی اخذ کیا جاتا ہے۔ یہ شاعری ایسے اشخاص پر مرکوز ہوتی ہے جنہوں نے اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی مرضی کے تابع کر دیا ہے۔ ان میں عظیم فارسی شعرا رومی اور حافظ بھی شامل ہیں۔ دونوں صوفیوں کی روایت سے وابستہ رہے۔ اسلام عبادت گزاروں سے سخت شخصی مطالبے کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی مانا جاتا ہے کہ اللہ غفار اور رحمان ہے۔ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ خدا انسان کی کمزوریوں کو بھی جانتا ہے۔

چینی مذہب آبا و اجداد کی پرستش کی نہایت مضبوط روایت سے شروع ہوا، اس روایت پر پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کے فلسفوں کا دباؤ بھی تھا۔ دو مقامی چینی فلسفے، کنفیوشس ازم اور تاؤ ازم، بھی تیسری صدی قبل مسیح میں اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ پھر ایک

مکمل مذہب اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ ہندوستان سے آ گیا۔ یہ بودھ مت ماہایانہ کی صورت میں آیا۔ ہر مذہب کا اپنے حصے کے عقائد کے جواز میں باقاعدہ ادب تھا۔ کنفیوشس کے مقصد کے نو کلاسیکی سرمایے میں چار ایسے ہیں جو دوسرے لوگوں نے لکھے۔ کنفیوشس کا ادب ایک ملغوبہ ہے تاریخی، اخلاقی، رسوم و رواج کی تفصیل اور مابعدالطبیعاتی تحریروں کا۔ تاؤ کا ادب ایک ہی کتاب پر مرکوز ہے۔ یہ ہے ایک کتاب جو طرزِ عمل اور نیک صفات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب لاؤ سی (Lao-Tse) سے منسوب ہے۔ اگرچہ کنفیوشس کا رُجحان قوم پرستی کی طرف تھا اور تاؤ عقیدے والے صوفیانہ مزاج رکھتے تھے، لیکن دونوں فلسفے مذہبی رسوم و رواج کے ساتھ مذہب بن گئے اور انہوں نے اپنے بانیوں کو دیوتاؤں کا مرتبہ دلا دیا۔ چین کے ہر بڑے شہر میں ایک مندر ہوتا ہے جہاں کنفیوشس کی روح کے لیے قربانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ ماہایانہ بودھوں نے ایک انتہائی شخصی نوعیت کی پرستش شروع کی ہے، ان کے مندروں اور غاروں میں بڑے قد آور بت بنائے جاتے ہیں اور دیواروں پر عبارتیں کندہ ہوتی ہیں۔ تاؤ مذہب والوں نے جادو کا پھونکا ہوا پانی تیار کیا ہے، جسے وہ ''آبِ حیات'' کہتے ہیں اور اپنی دائمی زندگی کے لیے پیتے ہیں۔

دُنیا کے سارے مذاہب میں عقیدے کا مقام بہت پختہ ہے۔ مذہبی زندگی کے ہر اصول پر بڑی تفصیل کے ساتھ دینیات کی ادبیات دستیاب ہیں۔ خالص مذہب کیا ہے؟ اس بارے میں پادریوں اور پجاریوں کی تنظیمیں مقرر ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر اب مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک شخصیت کا تعلق ہے، ظاہر بات ہے کہ سب سے بڑا خدا ہے۔ اس کے باوجود دُنیا کے مذاہب میں توجہ کا اصل مرکز خدا کی ذات نہیں ہوتی۔ خدا کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے ہیں، اس کا ماخذ قدیم صحیفے ہیں۔ جب مذہب فلسفیانہ ہو جاتا ہے، تو خدا بہت کچھ خیال بن گیا۔ ارسطو نے لکھا تھا کہ ''خدا کی خود کفیل حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک زندگی ہے، نیکی ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔'' دوسرے الفاظ میں خدا دائمی خیر ہے۔ ٹوائن بی نے لکھا تھا کہ اعلیٰ تر مذہب سب کے سب ''ایک حقیقت کی عبادت کرتے ہیں، جو ایک ہے اور اپنے متنوع پہلوؤں کے پیچھے بھی وہی ایک ہے۔'' دوسرے الفاظ میں خدا ہر موجود شے کو آپس میں ملاتا ہے۔ سینٹ اینسلم (St. Anselm) کے ''تلاش حق کی دلیل'' کے مطابق خدا وہ مکمل ترین وجود ہے جس کے بارے میں ہم سوچ سکتے ہیں۔ اس لیے خدا کا وجود بہت ضروری ہے، ورنہ

ہم ایک لازمی خصوصیت سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ تو خیال آفرینی ہے۔ مذاہب کا اجتماعی طور پر اس رائے سے اتفاق ہے کہ خدا انسانی فہم سے بالا ہے، ایک قادر مطلق، اس کے باوجود ایک ذاتی ہستی جس کو ہم یقینی طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

چونکہ خدا کی ہستی کو جانا نہیں جا سکتا، لہٰذا دوسری تہذیب میں شخصیت کا مرکز پہلے تو دنیا کے متعدد بڑے مذاہب میں ان کے پیغمبروں اور بانیوں کی ہستی ہوگی، دوم ہر مذہبی روایت میں دوسری متعدد اور نسبتاً چھوٹی ہستیوں کا وجود ہوگا۔ ان ہستیوں کو پیش کرنے کا وسیلہ ادب ہو گا۔ جیسا کہ چار صحیفوں میں بیان کیا گیا ہے عیسیٰ کا کردار انتہائی ڈرامائی اور مانوس کردار ہے۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم، گوتم بدھ، کنفیوشس اور لاؤسی کی ہستیاں معروف ہیں۔ ان عظیم ہستیوں کے حالاتِ زندگی ان کے اقوال اور خیالات صریح طور پر اور نہایت واضح انداز سے زبانی بیان ہوئے ہیں۔ تاہم مذہبی کلچر نے بھی شخصی شباہتوں کو اپنے فائدے میں استعمال کیا ہے۔ ماہایانہ بدھ مت کو "خیالی پیکروں کا مذہب" کہا گیا ہے۔ یونانیوں کے بنائے ہوئے بصری فن کے نمونوں سے متاثر ہو کر چین میں چھٹی صدی عیسوی میں گوتم بدھ کے بت متعارف کرائے گئے۔ اس کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ ایک ہستی آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوتی ہے۔ اس کے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی بلند ہوتی ہوئی اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی نیچے، کان لمبے اور پتلے اور چہرہ بھرا بھرا سا، بہت پرسکون۔ مسیحیت میں عیسیٰ کی شبیہ، صلیب سے لٹکتے ہوئے۔ لاتعداد تقریروں میں ماں اور بچے کو بھی دکھایا گیا ہے۔ کرسمس کے موقع پر پالنے میں عیسیٰ کی پیدائش کے بعد کا منظر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں تک دوسری کم تر شخصیتوں کا تعلق ہے، ہم اس کی ابتدا مشہور دین دار ہستی سینٹ اینتھونی یا روحانی کرتبی سینٹ سائموں سٹائلائٹس (St. Simon Stylites) سے کرتے ہیں۔ ان کے نہایت جرات مندانہ ضبط نفس کے مظاہروں پر مسیحی دنیا نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ہندوستانی مذہب نے ایسے رشی پیدا کیے ہیں جنھوں نے ٹیلی پیتھی کے نہایت نمایاں کرتب دکھائے ہیں یا اس طرح کے مظاہرے کیے ہیں گویا جسمانی اذیت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ زمانہ وسطیٰ کا یورپ کنواری مریم کا گرویدہ تھا۔ انہوں نے جو مظالم دیکھے تھے، ان کے نتیجے میں مسیحی شہیدوں اور دین داروں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوگئی تھی۔ ان شہیدوں کی ہڈیاں اور دیگر باقیات، عبادت کی اشیا بن گئیں۔ یہ آثار جو کلیسا میں اور معبدوں میں رکھے

ہوتے تھے، قیاس کیا جاتا تھا کہ ان میں شفا بخشی کی معجزانہ صلاحیت ہے۔ عام لوگ ہجوم در ہجوم ان کی زیارت کو آتے تھے۔ بعض پادری اپنے مشن میں ہیرو کا کردار ادا کرنے والے سینٹ پیٹرک اور سینٹ کولمبا آف اسی سی کی طرح تھے، نہایت نیک سیرت اور جانوروں پر شفیق، تھیریسا ایک عیسائی صوفی تھا اور کارسیلائٹ ایک نن۔ ہر مقدس مرد اور عورت اپنے ذاتی انداز میں خدا کی روح کو پیش کرتا تھا۔

مذہب تیسری تہذیب میں

حقیقت اس اقرار پر مائل ہوتی ہے کہ پروٹسٹنٹ مسیحیت تیسری تہذیب کا مذہب تھا۔ اس عہد کو تہذیبی توانائی یورپ سے ملی اور پروٹسٹنٹ ریفارمیشن یورپ کا سب سے زیادہ اہم مذہبی واقعہ تھا۔ تاہم اس عہد کی روح مذہبی نہیں بلکہ سیکولر تھی۔ نشاۃ الثانیہ کی پیدا کی ہوئی انسان دوستی خدا کو نہیں بلکہ انسان کو ہر شے کے پرکھنے کی میزان سمجھتی تھی۔ اس عہد کا کلچر ہر فرد بشر کے وقار اور اس کی قدر کی اہمیت کا اعلان کرتا تھا۔ اس عہد میں زمانہ قدیم کے فنون اور تحریروں میں عام لوگوں کی دلچسپی عود کر آئی تھی، یہ ورثہ نادر کلاسیکی آثار سے دست یاب ہوا تھا۔ مسیحیت کی ایک خوبی ناداری تھی۔ اب اس کی جگہ عالی دماغی کی فلسفیانہ روایت نے لے لی۔ پہلے انسانی جسم سے نفرت کی جاتی تھی، اب انسانی جسم مصوروں، فن کاروں کے لیے ایک خوب صورت وجود بن گیا تھا۔ اگرچہ مسیحیت کا بنیادی تصور نہیں بدلا تھا، لیکن کلیسا کو جسے ایک قدیم اور محکم ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اپنے اقتدار کے مقابلے میں ایک چیلنج محسوس ہونے لگا۔ مذہبی عقیدہ ایک معاملہ قرار پایا۔ پہلے ایک شاہانہ عزم کا معاملہ اور پھر افراد کا اپنا انتخاب۔ آخرکار یہ افراد کے نسلی ورثہ کا ایک جز سمجھا جانے لگا، جو کسی قوم کی اخلاقیات کا تحفظ کرتا ہے۔ شکی مزاج تھامس، جسے یقین نہیں تھا کہ عیسیٰ کو مرنے کے بعد زندہ اٹھالیا گیا تھا، جب تک عیسیٰ کے زخموں میں انگلی ڈال کر نہیں دیکھا، اسے یقین نہیں آیا۔ اسی طرح زمانہ وسطیٰ کے اواخر اور نشاۃ الثانیہ کے زمانے میں دانش وَروں کا رویہ ''دیکھو تب مانو'' کا تھا۔ گلیلیو نے دیکھا کہ ارسطو کی رائے کے برعکس مختلف چوڑائیوں لیکن یکساں طوالت کے پنڈولم ایک ہی رفتار سے جھولتے ہیں، لہٰذا اس نے ارسطو کی بجائے اپنی آنکھوں کی شہادت پر بھروسا کرنے کو ترجیح دی۔ سترھویں صدی کے سائنسی انقلاب نے اس وقت ظہور کیا جب مسیحی عقائد جابرانہ اور جارحانہ

ہو گئے تھے۔ عناد پر مبنی دینیات کے جھگڑے، جن کی وجہ سے تیس سال تک جنگیں ہوتی رہیں، یورپ کے دانش وَر اب ان سے بیزار ہو چکے تھے۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اس دائرے میں لے جانا چاہتے تھے، جہاں معقول لوگ کسی نکتے پر اتفاق کرتے ہوں۔ سائنسی حقیقت اپنی موجودہ تخلیق میں عقائد کا ایک نظام نہیں، جو کسی اعلیٰ تر ذہنوں سے ہم تک پہنچا بلکہ کام کا وہ مفروضہ ہے جس پر حقائق کو پرکھا جا سکے۔ انہی حقائق سے علوم کی عام ماہیت کا ادراک کرتے ہیں۔ اس طرح سائنس ایک نظام ''عقیدے کی نفی'' کا ہے یا ایک سوچی سمجھی پالیسی کا ہے جس کے تحت متضاد شواہد کے ہوتے ہوئے مسلمہ اصولوں پر یقین نہ کرو، نہ یہ کہ روایتی طریقے سے اقرار کرتے جاؤ۔

تاہم قدرتی دنیا سے اس کی قربت کی بنا پر اس طرح کے علم کا اطلاق ٹیکنالوجی پر کرتے ہیں، جو ظاہری طور پر لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ سائنسی علوم نے زمین کا سارا منظر نامہ بدل دیا ہے۔ سائنس کے نتائج کو چونکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اس لیے اس پر فوراً یقین آ جاتا ہے۔ حالانکہ ابتدائی سائنسی دریافتیں فلکیات کے علم پر مرکوز تھیں، لیکن روشن فکر یورپی دانش وروں نے بہت جلد زراعت میں دلچسپی لینی شروع کر دی کہ اجناس کس طرح ادل بدل کرنے اور گھوڑوں کو ہل میں جوتنے سے بہتر پیدا ہوتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں جب بھاپ کا انجن ایجاد ہوا تو اسے کانوں سے پانی نکالنے اور سوتی کپڑے کی صنعت میں بڑے پیانے پر استعمال کیا گیا۔ اس کے لیے کوئلے کی ضرورت تھی اور کان سے کوئلہ نکال کر استعمال کی جگہ تک اسے پہنچانے کے لیے صنعتی انجینئروں نے راستے بنائے اور آہنی پٹریاں بچھائیں جن پر بھاپ کے انجن کو چلایا جا سکے۔ مختلف اقسام کے لوہے کی دریافتوں کے بعد لوہے اور فولاد کے بہتر معیار تیار کیے گئے۔ اس دھات سے پل بنائے گئے اور فلک بوس عمارتیں بھی۔ بجلی نے شہروں کو روشن کر دیا اور زمین دوز راستوں پر گاڑیاں چلائیں۔ سائنسی علوم نے سہولتوں سے پُر اور دولت سے بہرہ مند جو دنیا تعمیر کی ہے، اس کی طاقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ خوش حالی کا انحصار بجائے خود اس امر پر تھا کہ کسی حریف کے مقابلے میں جلد تر علم حاصل کیا جائے اور اس سے کام لیا جائے۔

طبیعات کی سائنس کا تعلق ایک نئے طرح کے فلسفے سے تھا، جو سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے درمیان پیدا ہوا۔ یہ تجربوں کی بجائے مشاہدوں پر انحصار کرنے والا

فلسفہ تھا۔ اور ڈیکارٹ، پسکال، لاک اور ہیوم جیسی شخصیات سے منسوب تھا۔ انہوں نے دنیا کو ان مثالیت پسند فلسفیوں سے بالکل الگ اور مختلف انداز سے دیکھا۔ مثالیت پسندوں کا موقف یہ تھا کہ خیالات آزادانہ طور پر اپنا وجود رکھتے ہیں اور دنیاوی اشیا کے حصول کا ذریعہ ہونے میں مشاہدہ پرستوں نے دماغ کو ذمہ دار قرار دیا، جس کے مشینی عمل کے نتیجے میں خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر فلسفے کا مقصد مشاہدہ ذات کے ذریعے یہ معلوم کرنا ٹھہرا کہ دماغ کس طرح کام کرتا ہے۔ ذہنی عمل کی بنیاد جسم کے اس عضو پر ہے جسے دماغ کہتے ہیں۔ قدرتی دنیا بجائے خود ایک بھاری بھرکم گھڑیال کی کارکردگی کی مثل ہے جو ایک عمل اور ردِعمل کے تحت کام کرتا ہے۔ لاک، روسو، مانٹیسکو اور دیگر فلسفی ایک نئے حکومتی نظام کے بانی تھے اور اس کی بنیاد ایک معاہدۂ عمرانی پر تھی، ان کی رضامندی جن پر حکومت کی جا رہی ہو، اور موروثی مفادات کے برعکس نجی ملکیت کا احترام۔ اختیارات کے تقسیم کیے جانے کا اصول انہی اختیارات کی بقا اور سلامتی کے لیے ہے۔ ڈیوڈ ہیوم اور اس کا شاگرد آدم سمتھ، اقتصادی نظریے کے سرکردہ دانش وَر تھے، جن کی دلیل یہ تھی کہ تجارتی اور نجی آزادیوں پر سے پابندیاں ہٹا لینے سے قدرتی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان سماجی فلسفہ دانوں نے یہ نظامِ فکر تخلیق کرتے ہوئے جمہوری حکومت اور آزاد منڈیوں کی حمایت کی تھی۔

صاف ظاہر ہے کہ تہذیب کے تیسرے عہد میں لوگ پیسے پر یقین رکھتے تھے۔ پیسا اپنی قیمت رکھتا تھا اور اس کی حقیقت تھی۔ خدا کے وجود کے بارے میں تمام مباحث کے دوران میں کسی کو یہ پروانہ تھی کہ پیسے کا کوئی وجود ہے۔ انہوں نے بس یہ فرض کر لیا تھا کہ یہ بھی ہے، سونا اور چاندی سکے کی روایتی شکلیں تھیں، اس لیے یورپ کے مہم جُو اس دولت کی خاطر نئی دنیا کی طرف جا نکلے۔ اسپین کے بادشاہ کو امریکا کی کانوں سے نہایت قیمتی دھاتیں ٹنوں کے حساب سے ملیں، تب کہیں اسے پتہ چلا کہ اس کی قیمت دیوالیہ ہوتی جا رہی ہے۔ چاندی کی بھاری مقدار کے آ جانے سے زبردست افراطِ زَر پیدا ہو گیا تھا۔ چاندی کے ہر ایک اونس میں اب مطلوبہ چیز پہلے سے کم مقدار میں ملنے لگی تھی، چنانچہ چاندی کا سکہ اب اتنا محکم نہیں رہا جتنا لوگوں نے اب سے پہلے خیال کیا تھا۔ سن 1700 کے عشرے میں ایک اور انکشاف اس وقت ہوا جب فرانس کی حکومت کو جو لوئی چہاردہم کی جنگوں سے تھک چکی تھی، یہ خیال آیا کہ اس کے پاس پیسا ختم ہو گیا ہے۔ سکاٹ لینڈ کے ایک سرمایہ کار جان لا نے ایک نیا سکہ بنک نوٹ کی

صورت میں جاری کرنے کی تجویز کی اور اس کے پیچھے اس نے اپنا سرمایہ لگایا۔ اس تجویز کی حمایت کی گئی اور اتنی کامیاب ہوئی کہ اس نے خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کیا تھا۔ عام لوگوں کے اعتماد نے اس پیسے کو حقیقی بنا دیا تھا۔ لیکن جب جان لا کے بنک نے ایک اسٹاک کمپنی کے ساتھ مل کر لوسیانا میں اراضی فروخت کرنی چاہی اور زبردست سٹہ لگنا شروع ہو گیا تو حصص کی قیمتیں بہت اوپر چڑھ گئیں اور اس کو سپورٹ کرنا ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ جب یہ غبارہ پھٹ گیا تو لا کو ذلت اٹھا کر ملک سے بھاگنا پڑا۔ اس طرح حقیقت کے باب میں ایک اور سبق سیکھا گیا۔

کسی قوم کی صحیح دولت کی حقیقت کیا ہے؟ اسکاٹ لینڈ کے ایک ماہر اقتصادیات آدم سمتھ نے اپنی کتاب ویلتھ آف نیشنز (Wealth of Nations) میں، جو 1776 میں شائع ہوئی تھی، اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی۔ اس نے لکھا کہ دولت پیسے کی مقدار کا نام نہیں ہے بلکہ مارکیٹ میں کار آمد اشیا، جو آزادی سے تیار کی جاتی ہوں، اور مختلف خدمات، یہ سب خریداروں کو ان کے حسب خواہش فروخت کی جاتی ہوں تو اسی کو دولت کہتے ہیں۔ یہ کاروباری منصوبہ کہ تجارتی گوشوارے میں سرمایہ فاضل ہو، ہر قوم کے لیے قابل عمل نہیں۔ سمتھ کا خیال تھا کہ آزاد منڈی سے قوم کی دولت میں بہت اضافہ ہوتا ہے اور حکومتوں کو چاہیے کہ اس عمل میں جس حد تک ممکن ہو اپنے ہاتھ صاف رکھیں۔ یہ سرمایہ دارانہ اصولوں کی بنیاد تھی۔ نصف صدی بعد کارل مارکس نے اس کے مخالف نظریہ پیش کیا۔ وہ یہ کہ قومی معیشت اس وقت بہتر حالت میں ہو گی جب حکومتیں نہ صرف یہ کہ تجارتی منڈیوں میں دخیل ہوں گی بلکہ پیداوار اور اس کی تقسیم کا سارا بندوبست اپنے ہاتھ میں رکھیں گی اور اسے اقتصادی ''سائنس'' کے اصولوں کے مطابق چلائیں گی۔ تیسری تہذیب کے عہد میں آخری زمانوں تک پہنچتے ہوئے دو متحارب نظریات نے اقوام عالم کو دو الگ الگ دھڑوں میں بانٹ دیا تھا، ان دونوں کی پشت پر سیاسی حکومتیں تھیں، ان کے پاس میزائل اور ہائیڈروجن بم تھے۔ یہ عہد مذہبی جنگوں کے برابر کا ہی عہد تھا۔

اس کلچر نے جس کی بنیاد پیسے پر تھی، یہ اضافی عقیدہ بھی اپنے ساتھ رکھا کہ معاشرے میں دولت مند ہونا کوئی معنی رکھتا ہے۔ قدیم چینی معاشرے میں ایسا نہیں تھا۔ تاجر اگرچہ آسودہ حال ہوتے لیکن انہیں لوگ حقارت سے دیکھتے تھے۔ نشاۃ الثانیہ کے بعد یورپ اور امریکا کے معاشروں میں پیسے سے ذلت کا نشان بڑی حد تک ڈھل چکا تھا۔ اب اعلیٰ سماجی

حیثیت کے لیے دولت ایک اہم خصوصیت شمار کی جانے لگی تھی۔ اس کے باوجود پرانے رئیس زادے اور پیسے والے جو اپنی دولت تو یک گونہ وقار کے ساتھ سینے سے لگائے ہوئے تھے، نو دولتیوں کو کس طبقے میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کمی کی تلافی کے لیے تعلیم مفید تھی۔ دولت مند لوگوں کے بچوں کو رئیسانہ آداب اور اطوار سکھائے جاتے تھے تاکہ اپنی حیثیت اور منصب کو برقرار اور محفوظ رکھیں۔ لہٰذا پیسے میں یقین کے ساتھ سکولوں میں بھی یقین پیدا ہو گیا۔ یہ ممکن ہوتا کہ پہلی نسل گنوار لوگوں یا مجرموں کی ہوتی جو پیسے کماتے تھے، لیکن ان کی اولادیں زندگی میں نفیس اشیا سے لطف اندوز ہونے کا ذوق پیدا کرتی تھیں۔ اس وقت ''جنٹل مین'' (شریف لوگ) کی خصوصیات کیا تھیں: گرامر کے مطابق صحیح گفت گو کرنے اور لکھنے کا ہنر آتا ہو، اپنی تہذیب کے چند بہترین ادب پاروں اور فن پاروں سے آگاہ ہو اور حسب خواہش خرچ کرنے کے لیے پیسا ہو۔

تہذیب کے تیسرے دَور میں شخصیت کے عقیدے سے ہم آہنگ ہونا لازمی نہیں رہا۔ جس طرح ایک یونانی رومن فلسفے کی بدولت ایک فرد بلند اخلاقی منصب پر پہنچ جاتا تھا، حالانکہ اس میں انسانیت کی گرم جوشی نہ ہوتی۔ اسی طرح فرد میں اعلیٰ سطح کی سائنسی شخصیت کی دلآویزی کا عنصر شامل نہ ہوتا، جو بظاہر ایک عام کلچر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تجرباتی سائنسدان اپنی تربیت کے تحت معروضی ہونے کی بنا پر اپنی شخصیت کو سامنے نہیں آنے دیتا۔ اگرچہ البرٹ آئن سٹائن کی شخصیت کے گرد ایک مسلک کا ہالہ بنا دیا گیا ہے، لیکن سائنس دانوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ روکھے پھیکے لوگ ہوتے ہیں۔ بس تجربہ گاہوں میں یا سمّیت کش جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ صرف محاورۃً ''پاگل سائنسدان'' ایسے متنوع افراد ہوتے ہیں، جن کے لیے عام لوگوں میں کسی قدر دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ غالباً اس وقت اپنے ''ہیروز'' کے لیے تاجر برادری کی طرف دیکھنا پڑا ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کبھی سب سے زیادہ دولت اکٹھا کر لی تھی۔ لیکن پھر بھی صنعت، مالیات اور تجارت کے شعبوں کی سرکردہ شخصیتیں ذاتی طور پر کوئی کشش اور عام لوگوں سے تعلق اور دلچسپی پیدا نہیں کرتی۔ وہ عام طور پر زبردست کاروباری اداروں کے پیچھے، منظر سے بہت دور کام کرتے رہتے ہیں اور ویسی ہی روکھی پھیکی شخصیت ہوتی ہیں، جیسا سائنسدان ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی اینڈریو کارنیگی یا کوئی ہنری فورڈ ان کی دلیرانہ مہم جوئی سے عام لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے دلچسپی پیدا کر دیتا ہے، لیکن یہ تو استثنائی صورتیں ہیں۔

اس عہد کے ابتدائی زمانے میں ہیروز کی کمی نہیں تھی۔ کرسٹوفر کولمبس، واسکوڈی گاما، فرفائنڈو میگلان اور پونسی ان لیون دلیری کے ساتھ ان مقامات تک جا پہنچے جہاں پہلے کسی یورپی باشندے نے قدم نہیں رکھا تھا۔ ہرنانڈو کوریٹز اور فرانسسکو پزارو کی فوجی فتوحات نے وہ حیران کن کارنامے انجام دیے جو کسی بھی تاریخ میں یادگار ہیں، اس کے باوجود ان عظیم تاریخی شخصیات نے تہذیب کے تیسرے عہد میں وہ ہما ہمی پیدا نہیں کی جو تہذیب کے دوسرے عہد میں مذہب کے بانیوں اور بزرگوں نے پیدا کی تھی۔ مسئلہ غالباً یہ تھا کہ انہیں اپنی شخصیتوں کی نمائش کے لیے کوئی ذریعہ چاہیے تھا۔ عالمی تاریخ کی کتابیں دور ونزدیک بہت زیادہ نہیں پڑھی جاتیں۔ پھر تیسرے عہد کی تہذیب اپنی شخصیتوں کے دلآویز پیکر کہاں سے لاتی؟ اس کا ایک موزوں جواب ہے: ادب اور آرٹ سے۔

نشاۃ الثانیہ وہ زمانہ تھا جس میں ماہرفن کار اور دست کار تصاویر، عمارات، مجسمے اور خوب صورت اشیا بناتے تھے۔ صورت گری (پورٹریٹ بنانا) ان دنوں بہت مقبول تھا۔ اس طرح بصری مرقعے تیار کرنا، جسے کسی شخصیت کو پیش کرنے کا ہمیشہ ایک اہم ذریعہ سمجھا گیا ہے، تیسرے عہد میں شروع سے ہی بہت اہم کہا جاتا تھا۔ ان بصری فنون میں بہت قریبی شخصی تصورات بھی شامل ہو گئے تھے، جیسے دانتے نے پیٹرس کے لیے لکھا، یا پیٹرارک نے لارا کو لکھا، شیکسپیئر کے ڈرامائی فن نے یادگار کرداروں کو جنم دیا۔ شخصیات کو سامعین کی بڑی تعداد کے آگے پیش کرنے کے لیے عالمانہ اسلوب اختیار کیے جاتے تھے، لیکن اس کا انداز افسانوی ہوتا تھا، لیکن جو عنصر پیش ہوتا وہ خود مصنف کی ذات ہوتی تھی۔ فن کار ترقی یافتہ بصیرت کے مالک ہوتے تھے، جنہیں اپنے خیال کو ایک خاص اسلوب میں پیش کرنے کا ہنر آتا تھا، ان کی بھی شخصیت ہوتی تھی، لیکن ایک خاص ڈھب کی شخصیت!

رافیل نے ایک بار کہا تھا ''ایک خوب صورت عورت کی تصویر بنانے کے لیے مجھے بہت سی خوب صورت عورتوں کو دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ... لیکن چونکہ ان کی قلت ہے، اس لیے اس خوب صورت عورت کے تصور سے رہنمائی حاصل کرتا ہوں جسے میں اپنے دماغ میں لیے رہتا ہوں۔'' آرٹسٹ کا اظہار ایک لحاظ سے کسی موضوع کی فطری عکاسی ہوتا ہے، لیکن جیسا کہ رافیل نے اقرار کیا، آرٹسٹ اپنے ہی خیالی مرقعوں سے معاملہ کرتا ہے اور اپنے ہی طریقے سے خیالات برتتا ہے۔ ہر آرٹسٹ اپنے وجود میں مختلف نوعیت کی شباہتیں رکھتا ہے اور اس کے فن کارانہ اظہار پر خود اس کے پیدا کرنے والے کی شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔

نشاۃ الثانیہ کے تصور افلاطون کے تصورِ حسن سے واقف تھے اور اپنے فن میں اس تصور سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اس لیے آرٹسٹ کا پیشہ محض دست کاری سے کچھ زیادہ سمجھا جاتا تھا۔ آرٹسٹ بھی دانش وَر ہوتے تھے، اس قدر بیش قیمت کپڑے سے تراشے ہوئے جن سے فلسفیوں کو بنایا گیا تھا، تاہم فلسفیوں کے برعکس جو صداقت کا ایک عالم گیر تصور پیش کرتے ہیں، آرٹسٹ اپنے فن کارانہ ٹیکنیک کے ذریعے ذاتی بصیرت سے صداقت کا اظہار کرتا ہے۔ بڑے تحمل کے ساتھ محنت کرتے ہوئے اور تجربوں کی مدد سے، وہ ایک منفرد فن پارہ تخلیق کرتا ہے۔ اس عمل کے آخر میں ایک عادت ثانیہ بن جاتی ہے جو اس آرٹسٹ کے خاص اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہی چیز آرٹسٹ کو بجائے خود ایک اسلوب کا نمونہ بنا دیتی ہے، جس میں مخصوص نوعیت کے خریداروں کو دلچسپی ہوتی ہے۔

چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد کسی مصنف کے الفاظ کو حرف بہ حرف نقل کر لینا اور ان کی بہت سی کامیابیوں کو چھاپ لینا ممکن ہو گیا۔ اس طرح بہت سے قارئین مصنف کے طرزِ فکر سے بہ خوبی واقف ہو گئے۔ کثیر الاشاعت اخبارات معروف مصنّفین کی تحریروں کو بالاقساط چھاپنے لگے۔ ناول نگاروں کو ان کی ہر چھپی ہوئی سطر پر ایک خاص رقم بطور معاوضہ دی جانے لگی۔ اس کا انحصار ان کی مقبولیت پر ہوتا تھا۔ قارئین، ایک ایک مصنف کی تحریروں کو پہچاننے اور پسند کرنے لگے تھے۔ ایک اور طرح کا آرٹسٹ موسیقی کی دھنیں بنانے والا تھا۔ وہ بھی الفاظ کی بجائے موسیقی کی علامات کے ذریعے ایک اپنا ذاتی اسلوب وضع کر لیتا تھا۔ کوئی بھی شخص موسیقی سن کر دھن بنانے والے کو پہچان سکتا تھا۔ آرکسٹرا کے کنسرٹ (جشن موسیقی) سے ان کے فن کو شہرت ملتی تھی۔ جس طرح بصری فن کار، مصور اور موسیقار سالہا سال کی محنت سے ایسے نمونے تخلیق کرتے تھے، جنہیں انفرادی سطح پر پہچانا جا سکتا تھا، اسی طرح فن، موسیقی اور ادبی کلچر کی ایک روایت قائم ہو گئی تھی۔ بصری فن کے لازوال نمونے نئی فنی ٹیکنالوجی کے ذریعے ناظرین کی کثیر تعداد تک پہنچنے لگے۔ یہ تھا کرومولیتھ گرافی کا فن اور فوٹو انگریونگ اور رنگین چھپائی کے فن، پیانو اور فونوگرافک ریکارڈ تیار کیے جانے لگے، جو آرکسٹرا کی موسیقی کو دوبارہ نشر کر سکتے تھے۔ اس وقت ہر خود آگاہ قوم نے جسے اپنے وقار کا خیال رہتا اعلیٰ کلچر کے ادارے قائم کر لیے تھے، ان میں سمفنی آرکسٹرا، اوپیرا ہاؤس اور میوزیم شامل تھے تاکہ اپنے شناختی کاموں کی نمائش عام لوگوں کے لیے کر سکیں۔

الیگزینڈر سلکرک اس وقت ایک مشہور عالم شخصیت بن گیا، جب اس نے اپنی

مہمات کی تفصیل بیان کیں۔ وہ بحرالکاہل میں ایک جزیرے فرینڈس میں راستہ بھول کر پہنچا اور پھنس گیا تھا اور جزیرے میں چار سال تک رہا۔ رچرڈ اسٹیل نامی صحافی کو جب اس نے یہ تفصیلات بتائیں تو وہ پوری روداد اُس نے لکھ کر لندن کے ایک مجلّہ میں چھاپ دی۔ یہ 1713 کی بات ہے۔ چھ سال بعد ڈینیل ڈفو نے ایک ناول رابن سن کروسو لکھا، جو اس تجربے کی بنیاد پر تھا۔ ناول کے کردار ٹام ساور اور ہکل بری فن جو مارک ٹوین کے ناولوں میں انھی ناموں سے آتے ہیں، امریکی فکشن کی نام وَر شخصیات میں شمار کیے جانے لگے۔ تاہم تہذیب کے تیسرے عہد کی شخصیات میں اصل توجہ کا مرکز تحریروں میں آنے والے کردار نہیں، بلکہ خود مصنف بن گئے۔ انیسویں صدی میں چھپنے والی کتابوں میں مصنّفین کی تصویریں بھی شائع ہونے لگیں، وہ سرورق پر ہوتیں اور ان کے نام بھی ساتھ ہی ہوتے۔ چارلس ڈکنس، ولیم میک پیس، تھیکرے اور مارک ٹوین ثقافت کے دیوتا شمار کیے جانے لگے۔ قسط وار ناولوں اور اس طرح کی دوسری کتابوں کی اشاعت سے اس مصنف کے لیے قارئین کے دلوں میں اشتیاق اور توقعات پیدا ہو جاتی تھیں۔ ادبی اسالیب نے اپنے عقیدت مند پیدا کر لیے تھے۔

ممکن ہے وہ انگریزی کے رومانوی شعرا رہے ہوں، جنھوں نے پہلی بار یہ خیال پیش کیا کہ ایک مصنف کی شخصیت بھی اتنی ہی رنگا رنگ اور دلچسپ ہو سکتی ہے، جس طرح اس کی تحریروں میں پائے جانے والے کرداروں کی زندگی ہوتی ہے۔ اپنے عروج کے زمانے میں جب کہ برطانیہ دولِ مشترکہ کی قیادت کرتا تھا، لارڈ بائرن نے ایک بلند قامت شخصیت کا روپ اختیار کر لیا۔ وہ عورتوں کا بلا کا گرویدہ اور جواری تھا، اور ہمیشہ مقروض رہتا تھا۔ فرانس پر قبضے کے زمانے میں اس نے یورپ کی سیر کی اور اپنی مہمات کو نظم کے پیرایے میں بیان کیا، جس کا نام اس نے چلڈے ہیرالڈس پلگرمج (Childe Harold's Pilgrimage) رکھا۔ اس سے بائرن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ شیلے سے بائرن کی دوستی، اس کے اَن تھک سفر اور اپنی مختصر زندگی کے آخری سال میں سلطنتِ ترکی سے ایک دلیرانہ جنگ کے ذریعے یونان کو آزاد کرا لینا اور پھر اس کی بے ساختہ نظمیں، ان سب نے لارڈ بائرن کو ذہنی اور جذباتی، ہر اعتبار سے ایک بھرپور شخصیت بنا دیا تھا اور نوجوانوں کے لیے اس کے کردار میں ایک خاص کشش پیدا ہو گئی تھی۔ حسن اور صداقت، انھی دو ذرائع سے نوجوان عاشق اپنے دلوں کی بات ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ نثری ادب نے انیسویں صدی کے وسط میں پختگی حاصل کر لی

تھی۔ ڈکنس، بالزاک، ہیوگو اور ٹالسٹائی جیسے مصنفوں نے ناداروں کی ستم زدہ زندگیوں کے بیان میں خاص طور پر مہارت حاصل کر لی تھی۔ فن ایک زبردست سیاسی دھارے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جس کا مطالبہ تھا کہ انسانیت کو یومیہ اجرت کی غلامی اور دوسری برائیوں سے نجات دلائی جائے۔

نشاۃ الثانیہ کے دور میں تعلیم کا مرکزِ توجہ کلاسیکی ادب کا مطالعہ تھا۔ سترھویں صدی کے آغاز سے اسکولوں میں ان ادبیات پر زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی جو دورِ حاضر کی زبانوں میں لکھے جا رہے تھے۔ اس میں دونوں باتیں ملحوظ ہوتی تھیں، ایک تو مثالی اسلوبِ تحریر، دوسرے قومی غرور۔ سکول کے بچوں نے اپنے قومی ادب پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ کالج کے طلبا کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی کہ لبرل آرٹس وفرد کی آزادی سے متعلق فنون کا مطالعہ کریں، جن کے ذریعے وہ میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں ''کسی قوم کی تہذیبی زندگی کے بہترین خیالات سے روشناس ہوں گے۔'' انگریزی ادب کا کوئی بھی طالب علم ملٹن، وَرڈز وَرتھ، شیلے یا کیٹس سے نابلد نہیں رہ سکتا تھا۔ باش (Bach) موزارٹ، ہینڈل اور بیتھوون کی آرکسٹرا موسیقی سے ہر وہ شخص واقف تھا جس نے ایک خاص سطح کی تہذیبی نفاست پائی ہو۔ اب کسی قوم کی عظمت کا پیمانہ یہ تھا کہ اس کے عوام نے کتنے دیوقامت تخلیقی فن کار پیدا کیے ہیں۔ فرانسیسوں نے نثر نگاری میں ایک نئے اسلوب کی قیادت کی جس نے مولیر (Moliere) جیسے ڈراما نویس اور مونٹین (Montaign) اور پاسکل (Pascal) جیسے انشا پرداز پیدا کیے۔ انگریز کو شیکسپیئر، ملٹن اور پوپ پر ناز تھا۔ جرمنی والوں کی یہ شہرت تھی کہ انہوں نے موسیقی کی دھنیں بنانے والے پیدا کیے۔ انیسویں صدی کے فرانس نے تجرباتی مصوری کی رفتار متعین کی۔ اطالوی، فلیمنگ اور ہالینڈ کے مصوروں نے اپنے حصے سے زیادہ حق ادا کیا، اس سے بھی زیادہ جو میوزیم میں پرانے فن کاروں کے فن پاروں میں نظر آتا ہے۔ قوم پرست امریکیوں نے دعویٰ کیا کہ یورپ کے لوگوں نے بیشتر شعبوں میں جتنا کچھ کیا ہے، اتنا ہی اچھا، بلکہ بہتر کام انہوں نے بھی کیا ہے۔ وہ تخلیقی کام جو مشہور مصوروں، فن کاروں اور موسیقاروں نے تخلیق کیے اسے پوری انسانیت کے تہذیبی ورثے کا جز سمجھنا چاہیے اور وہ روشن دلانہ فنون کے نصاب میں نظر آتے ہیں، اور تہذیب کے تیسرے عہد کے افق پر حسین تجربوں کے جھرمٹ میں ستاروں کی طرح جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شخصی نفاست اور ذہانت کی علامت تھی کہ کوئی شخص کلچر سے بہرہ مند ہو اور اس کے نادر نمونوں کو سمجھے اور ان کی قدر کرنا سیکھے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کی نشانی یہ ٹھہری کہ ان

لوگوں کے ناموں سے واقف ہو جو اعلیٰ درجے کے دانش وَر اور شائستگی میں اعلیٰ معیار کے مالک ہوں۔ یہاں ایک رویہ فنون کے اس قدرداں کا ہونا چاہیے جو بہت سی صورتوں میں اعلیٰ ترین صفات سے واقف ہو اور دنیا سے جذباتی تعلق کے ساتھ ایک بے تعلقی کا انداز بھی رکھتا ہو۔ آرٹسٹ جو اس مہارت فن کا ذریعہ ہوتا ہے، تہذیبی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ ایک جینئس (نابغہ) تھا، ایک رنگا رنگ اور زرق برق ذاتی زندگی کا مالک۔ ونسنٹ وان گوف اور اس کی دیوانگی، ایف اسکاٹ فزگرالڈ کی اعلیٰ سماجی زندگی، ارنسٹ ہیمنگوے کے مردانہ مشاغل میں جیک کیروک بیٹ تحریک والوں جیسا طرز زندگی، ان سب سے امتیازی زندگی کی علامتیں ملتی تھیں (کلاڈ مونیٹ میں عام لوگوں کی دلچسپی اس وقت بڑھ گئی، جب یہ الزام سامنے آیا کہ اس کی ایک داشتہ بھی تھی)۔ پھر یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ کچھ لکھنے یا تصویرگری کے لیے زندگی سے آگاہی ضروری ہے اور اس کے لیے ذاتی طور پر انتہائی حدوں تک پہنچنا اور تجربہ کرنا ضروری ہوگا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل میں فن کار یا مصنف کا مشکل زندگی گزارنا، کثرت سے شراب پینا اور عورتوں سے تعلق رکھنا عام لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور یوں شخصیت طلبی کے لیے ان کی بھوک کی تسکین ہونے لگی۔

مذہب: تہذیب کے چوتھے عہد میں

لٹریچر کے پروفیسر لیو براڈی نے لکھا ہے ''امریکا میں شہرت ہمارا حقیقی مذہب ہے۔ اور ہم ان مقدس ہستیوں کے کیلنڈر تبدیل کرتے رہتے ہیں، جنہیں ہم اپنے کلیساؤں میں، خاص طور پر فلم اور ٹیلی وژن پر، جہاں افراد کا سب سے زیادہ اجتماع ہوتا ہے، دیکھتے رہتے ہیں۔'' ٹیلی وِژن اور فلم کی تفریح کے بارے میں اس طرح سوچنا کہ وہ بھی ایک مذہب ہے، دُور اَز کار بات ہوگی کیوں کہ ان کے ''شو'' میں کم ہی لوگ کوئی بات تہذیبی طور پر بصیرت افروز پائیں گے۔ اس کے باوجود تہذیب کے چوتھے عہد میں مقبول عام تفریح ہی تہذیبی/روحانی مطالبے کی تشفی کرتی ہے۔ یہاں عقیدے کا شائبہ بمشکل نظر آتا ہے۔ تفریحی مواد عام طور پر کوئی سنجیدہ پیغام نہیں دیتا، یا سوائے اشتہارات کے، اس کا مقصد کسی شخص کو ایک خاص نقطہ نظر کا قائل بنانا ہوتا ہے۔ یہ فرض کرنا ہوتا ہے کہ میں بہت خوش ہوں، بچوں کے کھیل کی ایک برتر صورت ہے۔ لوگ اس تجربے کی اہمیت کو بچپن سے ہی سمجھنے لگتے ہیں۔ جب کوئی شخص یہ باور کرنے لگتا ہے کہ وہ فلاں شخص ہے یا ایک مخصوص صورتِ حال میں موجود ہے تو بڑی آسانی سے خود کو ان تجربوں سے گزرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ تفریح جذباتی طور پر تسکین بخش ہوتی ہے،

جس میں کوئی باضابطہ تیاری یا توجہ درکار نہیں ہوتی۔ اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دو، ہنسو، اور مزے لو۔

شخصیت، تفریح کے کلچر سے مضبوط مطابقت رکھتی ہے۔ فلم، ساؤنڈ ریکارڈنگ، ریڈیو اور ٹیلی وژن، شخصیت کی حسیات کو اپنی گرفت میں لینے اور اس کے مناظر کو عام لوگوں کی بہت بڑی تعداد تک پہنچانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ریڈیو سننے والے دن کے کسی مخصوص وقت میں، بعض آوازوں سے جنہیں وہ ہر روز سنتے ہیں اور ان آوازوں کے عقب میں خیالی شخصیات سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ ٹی وی دیکھنے والے بعض افراد کو اپنے کمرے میں روبرو دیکھتے ہیں، اس طرح برقیاتی ذریعہ ابلاغ نے ہماری ذاتی ہمسائیگی کی حدود بہت پھیلا دی ہیں اور ہمسایوں میں ان سب کو شامل کر دیا ہے، جنہیں ہم ان کی پیش کشوں کے حوالے سے جانتے آئے ہیں۔ ہنسانے والی شخصیات مختلف کرداروں کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ پردے پر، یا مووی تھیٹر میں، یا ٹیلی وژن پر جانی پہچانی شخصیات کی شباہتیں نمودار ہوتی ہیں، ان کے چہرے اور جسم ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ کلوز اپ میں بہت قریب یا بہت دور، بہت سے کرداروں کی صورت میں، کہانیوں میں اور مناظر میں اور یوں لگتا ہے کہ ہم انہی لوگوں کے درمیان ہیں اور انہیں ذاتی طور پر جانتے ہیں۔

دنیا میں جہاں بھی اکیلے لوگ ہیں، اداکاری کرنے والوں کا برقیاتی چہرہ ان کی تنہائی کے احساس کو دور کر دیتا ہے۔ اور انہیں انسانی برادری کے ساتھ دوبارہ جوڑ دیتا ہے۔ ان اداکاروں کی نہایت جیتی جاگتی شخصیات ہوتی ہیں اور پھر بھی عام لوگوں کی دست رَس میں ہوتی ہیں۔ رقاصوں اور گویوں کی طرح بعض افراد میں واضح طور پر صلاحیت ہوتی ہے، کچھ ذاتی وجوہ کی بنا پر فلم اسٹار بھی انہی میں سے مل جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لانا ٹرنر کو ہالی وڈ کی ایک بڑی فلمی شخصیت نے اس وقت ''دریافت'' کیا جب وہ شیوان کے ادویہ کے اسٹور میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو خاص طور پر اس لیے معاوضہ دیا جاتا ہے کہ وہ ''بالکل اپنے جیسے رہیں؛'' اور فطری اداکاری کریں، حالانکہ وہ خوب صورت جسم اور چہرے کے مالک ہوتے ہیں۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ کوئی بھی شخص ''سٹار'' ہو سکتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ صحیح جگہ پر ہو، صحیح وقت پر ہو اور ہاں تھوڑی سی قسمت بھی ساتھ ہو۔

گزشتہ تہذیب میں شخصیت چھپے ہوئے الفاظ کے پیلے کاغذ میں یا بالواسطہ انداز

سے ایک فن کار کی تخلیقی شباہت میں دکھائی دیتی تھی۔ برقیاتی ریکارڈنگ اور مواصلات نے اب اس مقام کو ان افراد کی ذاتی موجودگی سے پُر کر دیا ہے، جسے پڑھنے والوں کے تخیل پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تماشائی اور سامعین بھی اب اپنی آنکھوں سے کسی منظر کی ریکارڈنگ کو دیکھ سکتے ہیں اور سن سکتے ہیں۔ کیمرے کے آگے یا مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہوا اداکار ان ذرائع اظہار کی مدد سے تجربوں کے ہجوم سے گزرتا ہے۔ ابھرتے ہوئے سورج کے ساتھ جس طرح رات گزر جاتی ہے، اسی طرح موسیقی کی دھنیں بنانے والے، فن کار اور آرٹسٹ اپنی پیشہ ورانہ مقبولیت کے ساتھ، برقی ٹیکنالوجی کی آمد کے ساتھ پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور یہ ٹیکنالوجی اداکاروں کی دھندلی شباہتوں کو پورے جمالیاتی حسن کے ساتھ تیز روشنی میں لا کھڑا دیتی ہے۔ لہٰذا اب شخصیت کی توجہ کا مرکز بدل گیا ہے۔ جو شخص سوچتا ہے کہ کوئی تہذیبی موضوع تخلیق کرتا ہے، اس کی بجائے اب توجہ اس فرد پر ہوتی ہے جو اداکاری کرتا ہے۔ برقیاتی کلچر سے پہلے کے زمانے میں ادبی تخلیقات کے اندر جو اشارے شخصیات کے نظر آتے ہیں، ان سے کہیں زیادہ محکم اور ذاتی امیج اس اداکار کا ہوتا ہے، جو سوچے ہوئے خیال کو ادا کرتا ہے۔

ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو ڈرامائی مسودے تحریر کرتے ہیں اور وہی کام کرتے ہیں جو کسی زمانے میں شیکسپیئر کرتا تھا۔ وہ فلموں کے اسکرپٹ رائٹر ہوتے ہیں اور ٹیلی وژن کے لیے تیار کردہ ڈراموں کے مسودہ نگار ہوتے ہیں، لیکن نہ تو ناقدین اور نہ عام پبلک ان کی فن کاری کو مزید توجہ کے لائق سمجھتی ہے۔ بڈ شلبرک وہ سکرین رائٹر تھا جس نے امریکن فلموں کے ڈاویل فیسٹول میں انعام حاصل کیا تھا۔ انعامات کی تقسیم کے موقع پر اس نے شکایت کی کہ فیسٹویل کے پروگرام میں صرف فلم ڈائریکٹروں کو شامل کیا جاتا ہے، اسکرین رائٹر اس میں شامل نہیں کیے جاتے۔ ''اگر فلم بہت اہم ہے تو فلم کا مسودہ بھی اسی قدر اہم ہوتا ہے،'' اس نے اپنی اپیل پیش کی۔ ریکارڈ کی ہوئی موسیقی کے میدان میں روشنی اس شخص پر ڈالی جاتی ہے جو گا رہا ہو اور ایک مقبول عام پروگرام ریکارڈ کرا رہا ہو، نہ کہ اس شخص پر جس نے وہ گیت لکھا۔ جیری لیپر اور مائک اسٹولر جنھوں نے ایلوس پریسلے کے لیے ''ہاؤنڈ ڈاگ'' اور دوسرے گانے لکھے، ایک بار یہ شکایت کی: ''ہم ہمیشہ یہ سوچتے رہے کہ یہ کتنی اندوہ ناک بات ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے گانے لکھے انہیں آخر میں آلو اور چٹنی ملتی ہے اور نقل کرنے والے اپنی کوششوں سے قطع نظر بے اندازہ دولت کما کر لے جاتے ہیں۔''

اسٹار سسٹم ہالی وڈ پر پوری طرح حاوی ہو گیا ہے، چونکہ ایک اداکار میں کچھ ذاتی

خوبیاں ہوتی ہیں، جن میں بہت سے لوگوں کے لیے کشش ہوتی ہے اس لیے وہ فلم انڈسٹری میں ایک ایسی ملکیت بن جاتا ہے جسے سبھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایک یا دوسرے کسی فن کار کی فلم حال ہی میں باکس آفس پر ہٹ ہوگئی ہو، (بہت مقبول ہوئی ہو) تو اسے فلم میں کام کی پیش کش فوراً قابل قبول ہو جاتی ہے اور اسے آئندہ فلم میں لیڈنگ رول (سب سے ممتاز کردار) ادا کرنے کے لیے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ کرک ڈگلس نے کہا تھا: اگر کوئی سٹار بہت ہی 'گرم' ہے تو وہ ایک فلم بنوا لے گا۔ اسی بنا پر ہوشیار قسم کے ایجنٹ جو مسلمہ طور پر پر کشش اداکاروں اور اداکاراؤں کی نمائندگی کرتے ہیں، ہالی وڈ کے سب سے اونچے درجے کے دلال بن گئے ہیں۔ اب سے پہلے پرانا اسٹوڈیو سسٹم تھا (اداکار اسٹوڈیو کے ملازم ہوتے تھے) نئے دور میں ان کی جگہ آزاد ایجنسی نے لے لی ہے، اب وہ (دلال) جو ہر قابل کا پیکیج تیار کرتے ہیں، جس میں اداکار، ڈائریکٹر اور موسیقار یعنی وہ سب، فلم سازی میں جن کی ضرورت ہوتی ہے، شامل کیے جاتے ہیں۔ میوزک کی صنعت کو شخصیت کے ٹیکے لگا کر چلاتے ہیں، جن کو میوزک کی ریکارڈنگ کرنے والے آرٹسٹ ان کے گانوں میں ڈال دیتے ہیں، فونوگراف یا ٹیپ ریکارڈنگ کرنے والے، گانے والے کی آواز میں، جہاں بھی کسی عیب کا شائبہ ہوتا ہے، پہچان لیتے ہیں اور اس میوزک میں نہایت منفرد طرز کا اپنا ذاتی میوزک ڈال دیتے ہیں۔ سازوں کی موسیقی کے مقابلے میں گلے کی موسیقی زیادہ مقبول ہے، لیکن سامعین سب سے زیادہ اس گانے والے سے ایک تعلق قائم کر لیتے ہیں۔

برقیاتی اظہار، نہایت گہرے طور پر ایک ذاتی وسیلۂ اظہار ہے، جو شخصیت کی نقالی کے نمونے خاصے متنوع پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ ایلوس پریسلے کے گل مچھے اور بیٹلز کے روحانی استغراق کی کیفیت کے اظہار نے اپنے زمانے کے نجی فیشن پر اثر ڈالا تھا۔ جیمز ڈین بہت عرصے تک سرپھرے نوجوانوں کا ہیرو تھا۔ وہ بہت سے لوگ جو اپنے مشغلے یا پیشے کی بنیاد پر دوسروں سے رشتہ قائم نہیں کر سکتے، ایسی فلموں اور ٹی وی کے شو میں اپنے لیے دلچسپی کے سامان پیدا کر سکتے ہیں جو کبھی انہوں نے دیکھے ہوں گے۔ تفریح کے تجربات کا تعلق لوگوں کی نسل سے ہے۔ ناواقف لوگوں کے لیے یہ تجربے ایسے ہوتے ہیں کہ بے تکلف بات چیت میں ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ٹیلی وژن پر کسی اہم واقعہ کو رونما ہوتے ہوئے دیکھنا، جیسے لی ہاروے اوسوالڈ کو گولی چلاتے ہوئے، یا چاند پر انسان کو پہلی بار قدم رکھتے ہوئے دیکھنا، ایسا لگتا ہے جیسے تاریخ کے ساتھ تعلق پیدا ہو گیا ہو۔ پیشہ ورانہ کھیلوں میں اپنی گھریلو ٹیم کے مقابلے میں

دوسری برادریوں کو منظّم ہوتے ہوئے دیکھنا، جیسے اہم رسم ادا ہو رہی ہو، یادگار تجربہ ہوتا ہے۔ مجلسی زندگی کا یہ بھی ایک قابل قبول نمونہ ہے کہ آدمی جنون کی حد تک کسی کھیل کا شیدائی ہو۔ ایک شخص جس نے ایک بڑی کارپوریشن کے شعبہ محاصل میں سربراہی کی تھی، اس کی وفات پر لکھی جانے والی تعزیتی تحریر میں یہ بھی لکھا تھا ''مینیسوٹا میں ساٹھ سال تک رہنے کے باوجود وہ (گرین لے) پیکر فین کا وفادار رہا۔ اس نے1925 سے کھیل دیکھنے شروع کیے اور اس بات کو ہمیشہ بڑی خوش دلی سے یاد کیا کرتا کہ 48 گز کی لائن پر موجود رہتا۔ وہ چمپئن شپ کے موسموں میں1929، 1930 اور1930 تک برابر بارھویں قطار کی نشست پر براجمان رہتا۔

آبادی کی نمایاں تعداد جن تصورات کی دلدادہ ہوتی ہے، جیسے مہمات کی تصویر کشی، حصولِ زَر کے آسان طریقے، یا جنسی قربت، تفریحات کی صنعت وہ سب کچھ فراہم کرنے کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔ سیاحت اب گرینڈ کینیان یا ولیمز برگ جیسی جگہوں کے سفر تک محدود نہیں بلکہ روتھ مین کے بقول اب یہ ''تفریحی سیاحت'' بن گئی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتا ہے: ''کسی دلچسپ سیاحتی مقام سے گزرتے ہوئے تمہیں معلوم ہوگا کہ یہاں سب سے اہم شخصیت تم ہی ہو۔ وہ تمہیں آئینہ دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں تمہارا وہی عکس نظر آئے گا جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔ لاس ویگاس اس کا مکمل نمونہ ہے۔''

پیشہ ورانہ کھیلوں کو تماشائیوں کی پسندیدگی اور وفاداری سے تقویت ملتی ہے۔ اس کی پشت پر ''ریتیلے'' بیس بال، سکول ٹیم اور خاندان کی دلچسپی کی ایک روایت ہوتی ہے جو تفریحی مشاغل سے مل جل کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ تاہم اس کی کامیابی پر ہی کھلاڑیوں کی تنخواہوں کا انحصار ہوتا ہے۔ ٹکٹ کی قیمت لگتی ہے اور ٹیلی وژن پر اس کی نمائش کے لیے معاوضہ ادا کرنے والے ملتے ہیں، جب سیاست دانوں نے ساؤتھ فلوریڈا میں ٹیکس کی رقم سے ایک نیا اسٹیڈیم فلوریڈا مارلنس تعمیر کرنے سے انکار کر دیا تو مارلنس کے اپنے مالکوں نے خود سودا کیا اور 1997 کی عالمی چمپئن شپ میں عملاً اپنے ہر ''سٹارٹر'' (گیند پھینکنے والے پہلے کھلاڑی) کا سودا کر لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ 1998 میں مارلنس کو آخری جگہ ملی۔ اس کے بعد سے دو متحارب ٹیموں کے درمیان ان کے مقابلے کی اہلیت کا خیال کیا جانے لگا، تاکہ کھیل میں مقابلہ مصدقہ طور پر درست معلوم ہو۔ البتہ درمیانہ آبادی کے شہروں میں میجر لیگ ٹیمیں، کھلاڑیوں کی تنخواہیں ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتیں، جو انہیں بڑے شہروں میں ملتی ہیں۔ منی سوٹا ٹوئنز نے منافع کی خاطر اپنے کھلاڑیوں کی تنخواہوں میں کمی کر دی ہے، اگرچہ اس میں کھلاڑیوں کی وفاداری کے

ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہے۔ معلوم نہیں اس بنیادی کمی پر قابو پانے کے لیے کھیل سے پہلے تفریحی پہلو کو اجاگر کرنے سے کچھ فائدہ ہوتا ہے یا نہیں، جیسے ''ڈاگ ڈیز'' غبارے چھوڑنا اور کنسرٹ کا اہتمام۔

ڈیوڈ سرناف نے 1939 کے عالمی میلے میں ٹیلی وژن کے نشریے سے پہلی بار پردہ اٹھایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ذریعہ اظہار امریکا کے چکر کو بہتر بنائے گا۔ اس نے کہا تھا ''اس بات کا امکان ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کے ڈرامے سے جس کو اوّل درجے کے فن کاروں نے پیش کیا ہو، قوم کے ذوق کی سطح ڈرامے کے تعلق سے بلند ہو گی۔'' لیکن یہ نہ ہوا، فنی محاسن کے سوا دوسری اقدار کو فروغ ملنے لگا۔ کہا جا سکتا ہے کہ تفریح کے شعبے کی سرکردہ شخصیات آبادی کے مختلف حصوں کے درمیان تفریق پر نظر رکھتی ہیں اور پروگرام پروڈیوسر ناظرین کو ہر ترکیب سے چینل بدلنے سے باز رکھتے ہیں، خاص طور پر ان ناظرین سے جو مشتہر اشیا کے خریدار ہو سکتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ آنکھوں کی پتلیوں کو جوڑے رکھو۔ اگر اخباری نوعیت کے یا تعلیمی قدر و قیمت کے پروگرام میں ناظرین کو دلچسپی محسوس ہوئی تو ٹیلی وژن انہیں ضرور نشر کرے گا، لیکن چونکہ ایسے پروگراموں کی مانگ نہیں ہوتی لہٰذا کمزور درجے کے پروگرام، جنہیں نشر کرنا سستا پڑتا ہے، دھڑا دھڑ نشر ہوتے رہتے ہیں۔

تفریح تو محض تفریح ہوتی ہے اس کا مقصد خوش کرنا ہوتا ہے، درس دینا نہیں۔ وہ صحیح ہو یا غلط، ہر وہ چیز جو لوگوں کی دلچسپی اور توجہ حاصل کرے گی، نشر ہوتی رہے گی۔ یہ وہ شعبہ ہے جس میں اوّل درجے کی شباہت کو سراہا جاتا ہے۔ جہاں ٹھس اور ثقیل مزاج کے لوگ سوچتے ہیں کہ ٹیلی وژن یا فلم کو چاہیے کہ علم کو فروغ دیں، ٹی وی کی دستاویزی فلموں کے ایک پروڈیوسر نے کہا، ''ٹیلی وژن اور فلم تو محض سطحی چیزیں پیش کرتے ہیں اگر آپ چیزوں کو پورے یقین کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تو ناقابل برداشت ٹیلی وژن سے اور ناقابل برداشت فلموں سے، جنہیں دیکھنا ممکن نہیں، جان چھڑاؤ اور باندھ کر الگ رکھ دو۔''

اس کے باوجود کہ فلموں کے مسودے محض کہانیاں ہوتی ہیں، لیکن اس میں یقین کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلم جراسک پارک اس غیر معقول مفروضے کی بنیاد پر بنائی گئی تھی کہ ڈائنوسار زندہ ہو گئے تھے۔ اس میں ناظرین کو یقین دلانا پڑا تھا کہ فلم کے مسودے کا حقیقت کے ساتھ واسطہ تھا۔ فلم کے ڈائریکٹر اسٹیون اسپل برگ بہ اصرار کہتے رہے کہ فلم کی کامیابی کا سبب جس قدر اس کے خاص اثرات تھے، وہیں اس کی ''سائنسی صداقت'' بھی تھی۔

اس میں خیال یہ تھا کہ ایک مچھر نے ڈائنوسار کے خون سے ڈی این اے نکالا۔ پھر مچھر شہد میں پھنس گیا اور تیرہ کروڑ سال تک اس میں پھنسا رہا۔ سائنس دانوں نے شہد سے ڈی این اے نکال کر اس کی کلوننگ ایک ڈائنوسار کے ساتھ کر دی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس زمانے میں جراسک پارک کی فلم بندی ہو رہی تھی حیاتیات کے ماہر اس قدیمی شہد کی مکھی کی کلوننگ کامیابی کے ساتھ کر رہے تھے، جس کا ڈی این اے شہد میں محفوظ رہ گیا تھا۔

حقیقت اور مفروضہ، بچے ان کے درمیان تمیز کھیلوں کے ذریعے کرتے ہیں، اس کے باوجود جب تفریحات کی یہ صنعت کی پیدا کردہ کسی حیران کن صورتِ حال سے ان کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے۔ ایک ماں اپنی تین سالہ بچی کو ڈزنی کی فلم ''الہ دین برف پر'' دکھانے لے گئی۔ اس نے بتایا کہ بچی الہ دین سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی زبان بند ہو گئی۔ آخر پہلے ہی منظر کے وسط میں بولی، ''ماما، کیا یہ وہی الہ دین ہے، جو ہمارے یہاں گھر میں ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا، ''الہ دین جو ہمارے وڈیو میں ہے یا وہ الہ دین جو 'رکن ڈال' میں ہے؟''

''وہ، مووی والا الہ دین، ڈنگ ڈانگ سر والا۔''

میں نے کہا، ''مجھے ڈنگ ڈانگ سر والا نہ کہو،'' پھر اسے سمجھایا کہ ''مووی الہ دین ایک خیالی الہ دین کا کارٹون تھا، جب کہ یہ الہ دین تو برف پر پھسلنے والا ہے اور ایک خیالی الہ دین بننا چاہتا ہے۔''

اس نے سوال کیا، ''پھر ان میں اصلی کون ہے؟''

اب میں لاجواب ہو گئی، کون سا بھلا ہو گا۔ میں تہہ بہ تہہ حقیقتوں سے اتنی حیرت زدہ ہو گئی کہ اب مجھے پاپ کلچر کو ایک ننھے بچے کے ذہن نشین کرانے کے لیے خود تحقیق کرنا ہو گی۔

ابتدائی زمانے میں جب ٹیلی وژن پر زندہ پروگرام آتے تھے، تماشائیوں کی ایک تعداد کو علم ہوتا تھا کہ یہ چونکہ جیتے جاگتے لوگ ہیں، اس لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اداکار کوئی سطر بھول جاتا یا کوئی پریشان کن حماقت کر بیٹھتا اور ناظرین اسے دیکھنے کے لیے موجود ہوتے۔ لیکن اب جو پہلے ٹیپ کیے ہوئے پروگرام چلائے جاتے ہیں، تو اس میں کسی غیر یقینی صورتِ حال کے پیدا ہونے کا امکان نہیں رہا۔ یہ تجربہ حقیقی تھا۔ اس زمانے میں ٹیلی وژن کی صنعت کو اپنی اس منفرد اہلیت پر اصرار تھا کہ وہ شہری دفاع کی کسی ہنگامی صورتِ حال میں عام

لوگوں کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں مکالمہ کر سکتی ہے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ ٹی وی کے تفریحی پروگرام اس کے لیے زیادہ نفع بخش اور محض لایعنی ہوتے تھے۔ اس تاثر کو دور کرنے کے لیے ٹی وی نیٹ ورک کو خبروں کی معیاری نشریات کے ذریعے اپنا اعتبار اور وقار حاصل کرنا تھا۔ خبرنامہ اس طرح کا پروگرام ہے، جس کا سارا وزن اس کے آخر میں ''یقین'' ہوتا ہے۔ ٹی وی کا ناظر خبریں دیکھتا ہے، کچھ نئے اور غیر معمولی واقعات کا تجربہ حاصل کرنے اور اس تجربے سے لطف لینے کے لیے، اور کچھ مسلسل اطلاعات سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ چونکہ خبریں ''تصنیف کی ہوئی'' نہیں ہوتیں اس لیے ناظرین کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ نیوز رپورٹروں نے وہ خبریں گھڑی ہیں تو وہ مشتعل ہو جائیں گے۔ اس دَور میں کہ میڈیا، واقعات کو سٹیج پر پیش کرتا ہے۔ اصلی اور نقلی خبروں کے درمیان تفریق کرنا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے۔

بعض مخصوص تفریحات کا انحصار یہ نہ جاننے میں ہوتا ہے کہ اس وقت جو منظر دکھایا جا رہا ہے، اس کا نتیجہ آخر میں کیا ہوگا۔ لاٹری میں شریک افراد داؤ پر اپنی رقم لگاتے ہیں تو انہیں یقین ہوتا ہے کہ جیتنے والے کو پہلے سے ہی منتخب نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ معمولی کھیل، جیسے معمے یا کوئز شو، جو تمام تر تفریح کے لیے ہوتے ہیں، ان میں بھی یقین کی بنیاد لازماً ہونی چاہیے۔ جب چارلس وان ڈورین نے یہ اقرار کیا کہ اسے 564000 سوالوں میں صحیح جوابات پہلے سے بتا دیے گئے تھے تو اس سے پورا قومی سکینڈل کھڑا ہو گیا۔ کسی ورزشی کھیل کے مقابلے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ کون جیتے گا۔ کھیل دیکھتے وقت اس کے آخری نتیجے کے علم سے تماشائی کی توجہ ہٹ جائے گی اور محسوس ہوگا کہ اس نے نامکمل کھیل دیکھا۔ اگر کھیل چل رہا ہو تو ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ 1996 کے سمر اولمپک میں جب نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن جس نے اسے سپانسر کیا تھا، تماشائیوں کو یہ اطلاع نہ دے سکی کہ وہ کیری اسٹرگ کے جسمانی کرتبوں کے تاخیر سے موصول ہونے والے ٹیپ، جس میں اس کی کہنی کو چوٹ آئی تھی، نشر کر رہی ہے تو اس کا اعتبار مجروح ہوا۔ مبصرین نے بتایا کہ امریکی ٹیم کو گولڈ میڈل جیتنے کے لیے اس کے نمبروں کی ضرورت تھی، دراصل مبصرین کو نتیجے کا پہلے ہی علم تھا۔ میڈل جیتنے کے لیے گریٹی کی جانکاہ محنت کی ضرورت نہیں تھی، نیشنل براڈ کاسٹنگ نے حقیقت کی قیمت پر ایک ذاتی ڈراما رچانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایسے کھیلوں کے مقابلے کو دیکھنے کی جزوی قدر و قیمت یہ جاننے میں ہوتی ہے کہ ان میں جیتنے اور ہارنے والے دونوں ہوں گے۔ اس لیے کھلاڑیوں پر مقابلہ جیتنے کے لیے

زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ کامیابی کا غیر یقینی ہونا تماشائیوں کی بے چینی میں اضافہ کر دیتا ہے اور اس طرح صحیح چمپئن پیدا ہوتے ہیں۔ ایک چمپئن کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کھیل کے فیصلہ کن لمحات کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوتا ہے۔ اسے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کا سلیقہ سیکھنا ہوتا ہے۔ اس معمول کے دوران میں اس کے خون میں برگردی مادہ (جو خون پیدا کرتا ہے) حرکت کرتا رہے اور دماغ معمول کی طرح ہموار انداز سے اپنا کام کرے، اس کے لیے کچھ صلاحیت اور بہت زیادہ مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود تماشائی بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ایک چمپئن کھلاڑی کو اپنی صحیح ذہنی کیفیت میں رہنا چاہیے۔ اس ''ذہنی برتری'' کو حاصل کرنے کا ایک فن ہے۔ اس طرح کی یکتائی حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور عام لوگ بھی یہ بات جانتے ہیں۔ لہٰذا ٹیلی وژن کے مبصرین کا معمول ہے کہ جیتنے والے کھلاڑیوں کو جب کہ ان پر فتح کی گرم جوشی طاری رہتی ہے یہ جاننے کے لیے انٹرویو کریں کہ اس وقت ان کے دماغ میں کیا ہے؟ اس اعلیٰ ترین کامیابی کے لیے کوشش کرتے ہوئے وہ کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟ وہ کون سے خاص خیالات تھے، جن سے اس میں ولولہ پیدا ہوا؟ جیتنے کے بعد اب کیسا لگتا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات کا حصول ہمارے ذہن میں گویا غیبی ولولے کا مشاہدہ کرنا ہے۔

جہاں تک تفریح کی خاطر پہلے سے لکھے ہوئے مسودے کی بات ہے، لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب بیشتر خیالی ہے۔ ٹیپ کی نوک پلک سنواری اور غلطیاں نکالی جا سکتی ہیں۔ اور اس کے مکمل ہونے کی ایک مصنوعی ڈگری حاصل کی جاتی ہے۔ ہر وہ اداکار جو اپنا کردار ادا کر رہا ہے، کیمرہ بند ہونے کے بعد ممکن ہے کہ ایک بدسلیقہ اور پھوہڑ شخص ثابت ہو۔ بہر حال یہ سب اداکار ہیں، ایسے فراد جو کسی اور شخصیت کا روپ دھارتے ہیں اور اس کی کمائی کھاتے ہیں، اس کے باوجود عام لوگ اس خیالی پیکر کے پیچھے اصلیت کو جاننے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ وہ بڑے اشتیاق سے مقبول عام شخصیتوں سے متعلق رسالے پڑھتے ہیں۔ عوامی نوعیت کے جریدے پڑھتے ہیں یا کوئی چیز، جس سے اس مقبول عالم اداکار کے پیچھے اصل شخصیت کا علم ہو سکے۔ ٹیلی وژن سے رات گئے، ملاقاتوں کے جو پروگرام ٹاک شو نشر ہوتے ہیں، ان میں تفریحی پروگراموں کی صنعت سے آنے والے مہمانوں کی ایک لین ڈوری لگی ہوتی ہے۔ یہ مہمان دانش وَری کا دعویٰ نہیں کرتے، نہ یہ کہ وہ اداکاری کے ترقی یافتہ ہنر سے آگاہ ہیں، جس کے راز اب وہ ناظرین کے سامنے منکشف کریں گے۔ ناظرین بھی ان میں محض اس لیے

دلچسپی لیتے ہیں کہ ان افراد نے بڑے اداکاروں کی ظاہری شخصیت کے پیچھے ان کی اصلیت کو دیکھا تھا۔ ادھر ایک نہایت ہیجان خیز منظر ان مشہور عالم شخصیتوں کو جو کہانیوں کی کتابوں میں بھی نظر آتے ہیں کامیابی کی بلندیوں سے ذلت کے گہرے کھڈ میں گرتے ہوئے دیکھنا ہے، اگر وہ اس سے پہلے نہایت گھٹیا مجرم نہ قرار دیے گئے ہوں۔ ٹونجا ہارڈنگ نے اپنے حریف کو زخمی کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ معاہدہ کرنے کی وجہ اس واقعے سے گہری دلچسپی کے سوا اور کیا تھی، یا او جے سیمسن کے قتل کا مقدمہ؟ تفریحی پروگرام چلانے والی برقیات کی دنیا لوگوں کی آنکھوں کے آگے چاند کی طرح روشن ہے، بہت قریب، پھر بھی بہت دور، اگرچہ بعض لحاظ سے حقیقی بھی ہے، لیکن ذاتی طور پر اسے چھو نہیں سکتے۔ نیو یارک میں ایک شخص تھا جو نہایت پابندی کے ساتھ ریڈیو کے ایک نشریے میں شریک ہوتا تھا، اسے یہ امید تھی کسی روز ایک مزاحیہ کردار کے لیے ''دریافت'' کر لیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے بہت سے چلتے ہوئے فقرے یاد کر لیے تھے، اس امید میں کہ شاید میزبان کبھی حاضرین میں سے کسی فرد کو کچھ کہنے کے لیے بلا لے۔ لیکن اسے کبھی نہیں بلایا گیا۔ امریکا کی ایک بڑی صنعت 'جوا' ہے۔ اس کی بنیاد بھی اسی خیال پر قائم ہے کہ ناگزیر مشکلات کے باوجود ''میں ان دس لاکھ افراد میں سے ایک ہو سکتا ہوں جو لاٹری یا جیک پوٹ جیت لے گا۔'' لاکھوں افراد ہر روز ایک چھوٹی سی لیکن حقیقی رقم ایک زبردست ''کامیابی'' کی موہوم امید کے تحت داؤ پر لگانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ فنر یز ٹی بارنم کا ایک مقولہ ہے، ''ہر منٹ ایک احمق پیدا ہوتا ہے۔'' شو دکھانے والا استاد اپنے ارادوں سے ہمیں دھوکا دینا نہیں چاہتا، لیکن جب تک ہمیں اور ہمارے بچوں کو اچھی اور صاف ستھری تفریح مل رہی ہے، ہم تو خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہیں گے۔

مذہب: تہذیب کے پانچویں عہد میں

آئندہ عہد کا مذہب کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن آج کے کمپیوٹر کلچر میں اس کے بعض عناصر کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پانچویں تہذیب کو ایسی صورتِ حال درپیش ہے، جو چوتھی تہذیب کے عین مخالف ہے۔ شخصیت کا پہلو جب کہ کمزور ہے، یقین کا عنصر مضبوط ہے۔ ہر شخص کمپیوٹر پر یقین کرتا ہے۔ کمپیوٹر کی ذہانت مکمل ہے اور نہایت تیز ہے۔ اگر اس کے حسابات کے نتائج میں کوئی غلطی نکلتی ہے تو وہ غلطی

یقیناً پروگرامر کی ہو گی یا پھر کسی نے اس کے سسٹم میں غلط اعداد ڈال دیے ہوں گے۔ وال اسٹریٹ کا کامل یقین کمپیوٹر پر ہے۔ بیس سال پرانی ایک کمپیوٹر سافٹ ویئر کمپنی مائیکروسافٹ کی قیمت اس نے جنرل موٹرز سے زیادہ لگائی ہے اور اس کے چالیس سالہ چیئرمین کو دنیا کا امیر ترین شخص بنا دیا ہے۔ والدین اپنے بچوں کے لیے ہوم کمپیوٹر خریدتے ہیں، انہیں امید ہوتی ہے کہ اس طرح وہ ایسے ہنر سیکھ لیں گے جن سے مستقبل میں ملازمت کے اہل بن جائیں گے۔ امریکا کا تجارتی شعبہ یقین کرتا ہے کہ کمپیوٹر کی بدولت ان کی مصنوعات کا معیار بہتر ہو جائے گا اور لاگت گھٹ جائے گی۔

جہاں تک شخصیت کا تعلق ہے، کمپیوٹر کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ ایک کارٹونسٹ اس کے احساسات اور خیالات کے حوالے سے اس کا مذاق اڑا سکتا ہے، لیکن روبوٹ کا بھی ایک عوام دوست وجود ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کے ساتھ جس طرح کے لوگ کام کرتے ہیں، وہ ان حد درجہ سرگرم اور شخصیات سے مختلف ہوتے ہیں، جو تفریحات کی صنعت میں مصروف کار ہیں۔ یہ صرف ''آنکھیں'' ہوتے ہیں اور حد درجہ خشک، جو ساری زندگی کمپیوٹر کے ٹرمینل پر گزار دیتے ہیں۔ یہ گوشہ نشین افراد، جنہیں انٹرنیٹ میں 'سرفنگ' کی لت پڑ چکی ہوتی ہے، انہیں چاہیے کہ کبھی کبھار باہر نکلیں، سورج کی روشنی دیکھیں اور گوشت پوست کے حقیقی انسانوں سے ملیں۔ ان کی شباہت ذہن میں اس طرح آتی ہے کہ سب ایک ہی جیسے اُلّو صفت افراد جو کچھ اپنے اندر ہیجان پیدا کرنے کے لیے عریاں ویب سائٹ لگا لیتے ہیں، یا ان کے ذریعے کسی اور کو نفرت خیز پیغام بھیجتے ہیں، اس کے دوسری طرف کچھ 'سائبر پنک' (سائبر کے بدمعاش) بھی ہوتے ہیں، یہ بدراہ قسم کے نوعمر لڑکے، جن کے پاس فنی مہارت ہوتی ہے، جسے وہ ٹیلی فون کمپنی سے چوری کرتے ہیں، یا کسی کاروباری ادارے کے ڈیٹا بیس سے ڈاکہ ڈال کر حاصل کر لیتے ہیں، ممکن ہے کبھی ان فسادی اچکوں کے درمیان سے جو ''رابن ہڈ'' کی منعکس شخصیت ہوں گے، ہیرو بھی نکلنے لگیں۔

اگر خود ساختہ ارب پتیوں کی ایک دل کش ذاتی شبیہ ہوتی ہے تو اس میں نصف سے زیادہ حصہ کمپیوٹر انڈسٹری کی دین ہے۔ لیکن صرف یہی معاملہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی بجائے ہمیں شخصیت کے ماڈل کو کہیں اور کمپیوٹر کلچر میں تلاش کرنا ہو گا۔ شاید اس کا سراغ جینیفر رنگلے کے کاروبار سے مل جائے۔ یہ اکیس سالہ عورت واشنگٹن ڈی سی میں کہیں رہتی ہے۔ اس نے اپنی

خواب گاہ میں ایک کوئیک کیم کیمرہ نصب کرلیا ہے، تاکہ اپنی روزمرہ زندگی کے مناظر کو ریکارڈ کرتی رہے۔ وہ دوسرے لوگوں کو دعوت دیتی ہے کہ اس کی ویب سائٹ پر اپنے تصویری معمولات برابر ریکارڈ کرتے رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ویب سائٹ پر ہر ہفتے دس کروڑ ''ہٹ'' موصول ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس میں قدرے عریانی بھی ہے، لیکن اصل کشش سادہ سی رفاقت کی ہوتی ہے۔ انٹرنیٹ اتنا مدھم ہوتا ہے کہ ذاتی شباہتوں کو ٹیلی وژن کے نیٹ ورک کی طرح نمایاں کر کے پیش نہیں کرتا۔ اس کی اپیل خود شناسی میں ہے۔ ای میل کے کروڑوں پتوں میں سے کسی شخص کو شاید اپنے مزاج کا کوئی فرد بلکہ زندگی کے کسی شعبے میں اپنی روح کا ساتھی مل جائے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے یہ جانیں کہ ہم کون ہیں اور پھر اپنی ذاتی ترجیحات کا اظہار کریں اور اپنے خیالات بھی، تاکہ اس کی تائید میں جواب موصول ہو سکے۔

بدلتی ہوئی تعطیلات

جس طرح مذہب زمانوں کے اندر بدلا ہے، اسی طرح ان اداروں کا رنگ بھرنے میں وقت گزرا ہے، جن کی یکے بعد دیگرے آنے والے معاشروں پر بالادستی رہی۔ ان تبدیلیوں کا پتہ چلانے کے لیے ان اداروں کی تشکیل کا جائزہ لینا ہوگا جو متبرک جگہوں پر اور زمانوں میں موجود تھے۔ جب رومن کلیسا نے یہ فیصلہ کیا کہ انگلینڈ کو عیسائیت سے مشرف کرے گا تو پوپ گریگوری اوّل نے یہ حکم جاری کیا کہ ''بتوں کے معبد کسی طرح بھی ڈھائے نہ جائیں۔ وہ (آگسٹسائن) بتوں کو تباہ کر دے گا، اس پر پاکیزہ پانی چھڑکا جائے گا۔ قربان گاہیں تعمیر ہوں گی اور شکستہ آثار ان سے متصل ہوں گے۔ اس طرح ہمیں امید ہے کہ لوگ بت پرستی چھوڑ دیں گے اور پہلے کی طرح موجودہ جگہوں پر واپس آ جائیں گے۔'' اس طرح وہ جگہیں جو بت پرستی کے مذاہب کے لیے مقدس تھیں، ترقی کرتی ہوئی مسیحیت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تبدیل ہو گئیں۔ انجیل میں عیسیٰ کی کہانی بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے یروشلم کی عبادت گاہوں سے سکے تبدیل کرنے والوں کو بھگا دیا۔ اس طرح عیسیٰ نے ایک ایسے مقام کو بچا لیا، جو یہودیت کے لیے مقدس تھی اور جسے دولت کی اقدار پامال کر رہی تھیں۔ اب تہذیب کے تیسرے عہد میں چرچ کے تہہ خانوں سے 'بنگو گیم' شروع ہو گئے اور مثالیت پرستی نے سمجھوتا کر لیا۔

بڑھتے ہوئے ادوار نے بھی نئے مقاصد کی خاطر مقدس زمانوں کو بدل دیا ہے۔ عیسیٰ نے سکے بدلنے والوں کو معبد سے نکال دیا ہوگا، لیکن اس سے وہ چھٹی بند نہیں ہوئی، جو ان کے یوم پیدائش پر منائی جاتی ہے اور جسے پورے سال کے سب سے شدید شاپنگ کے موسم میں بدل دیا گیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق کرسمس کے تحائف کی خریداری کی رقم ایک امریکی دکان دار کی سال بھر کی اوسط فروخت کے ایک تہائی سے بھی زیادہ اور سالانہ منافع کے نصف یا تین چوتھائی کے برابر ہوتی ہے۔ چونکہ کرسمس کی کرسچین ہالی ڈے (چھٹی) کو کمرشل کرسمس نے بے دخل کر دیا ہے اور خود اس کی جگہ لے لی ہے، لہٰذا یہ وہی کرسمس ہے جس نے بت پرستوں کی تہذیب کے زمانے میں تعطیل کے دن کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ فارس کے دیوتا متھراس کے پجاری جو رومن سپاہیوں میں بہت مقبول تھے، اپنے دیوتا کا یوم پیدائش 25 دسمبر کو مناتے تھے۔ سیٹر نالیا (Saturnalia) کی رومن تعطیل جس کی ابتدا 17 دسمبر کو ہوئی، چار سال تک منائی جاتی رہی۔ اس دن سیٹرن (Saturn) دیوتا کا تہوار منایا جاتا تھا، جس نے اطالوی باشندوں کو مہذب بنایا تھا۔ اس دن تحائف تقسیم کرنا روایت کا حصہ تھا۔ 440 میں مسیحی چرچ نے فیصلہ کیا کہ سال کے اس دن پر میلادِ مسیح کی دعوت کا اہتمام کیا جائے۔

Table: 3-2 گوشوارہ: 3-2

بہت سی تہذیبوں میں کرسمس

پہلی تہذیب	سٹرنالیا (Saturnalia)
دوسری تہذیب	حضرت عیسیٰ کی پیدائش پر
تیسری تہذیب	خریداری کا مرکزی موسم
چوتھی تہذیب	باب ہوپ کا خصوصی کرسمس (طریقہ)
پانچویں تہذیب	(ابھی انتظار ہے)

دعوتیں اور تعطیلات زمانہ ماقبل تاریخ سے اب تک انسانی تہذیب کا جز رہی ہیں۔ فطرت کے مذہب کے دور میں سرما جب سورج نصف النہار پر ہوتا، یا گرما کے زمانے میں جب رات دن برابر ہوتے ہیں، خصوصی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ کرسمس کا دن سرما کے اس تہوار کے چار دن بعد آتا اور یوم مئی پر بت پرستوں کا تہوار ہوتا، جسے بہار کی آمد پر منایا جاتا۔ ہالووین کا تعلق ایک قدیم مذہبی تہوار سے تھا۔ جس سے نئے سال کا آغاز ہوتا تھا۔ ان دونوں موسمی تہواروں کو مختلف زمانوں میں مختلف تقریبات کا رنگ دے دیا گیا۔ یوم مئی کو ایک عالمی یوم محنت کی تعطیل قرار دیا گیا، کیوں کہ امریکا اور برطانیہ میں یکم مئی 1886 کو عام ہڑتال کی گئی تھی

اور تین دن بعد شکاگو میں ایک بمباری ہوئی تھی۔ ہالووین آل سینٹس ڈے کی بیداری کا چھٹی کا دن ہے۔ مسیحی اس روز رومن زمانے سے شہیدوں کے ایک گروہ کی یاد مناتے آئے ہیں۔ گریگوری اوّل نے اس تہوار کی تاریخ 15 مئی سے بڑھا کر 31 اکتوبر کر دی۔ اس نے بت پرستوں کی پہلی تاریخ کا فائدہ اٹھایا۔

ایسے دَور میں جب مذہب عام شہریوں میں پہنچا تو تہوار کو اجتماعی زندگی میں اہم مواقع کے طور پر منایا جانے لگا۔ رومیوں نے اپنے کیلنڈر کے 355 دنوں میں سے تقریباً ایک تہائی دن تعطیلات کے لیے مخصوص کر دیے۔ ان دنوں میں عدالتی یا سیاسی کاروبار ممنوع اور خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ چوتھی صدی عیسوی کے وسط میں چھٹیوں کی تعداد بڑھا کر 175 دن کر دی گئی۔ وینس کا شہر ''ڈوگے اور سمندر کی شادی'' کی تقریب سالانہ ایسنسن ڈے فیئر کے دوران مناتا ہے۔ یہ اس موقع کی یاد میں منایا جاتا ہے جب سن 1000 عیسوی میں ڈالیٹ کے بحری قزاقوں پر وینس ڈوگے کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ انگریز 5 نومبر کو ''گائی فاکس ڈے'' مناتے ہیں۔ اور الاؤ دہکا کر گائی فاکس کا پتلا آگ میں جلا دیتے ہیں۔ وہ ایک ناکام سازشی بندر تھا، جس نے 1605 میں اس روز بارود سے پارلیمنٹ کو دھماکے سے اڑا دینے کی سازش کی تھی۔ فرانس کے لوگ 14 جولائی 1789 کو بیسٹائل ڈے مناتے ہیں، کیونکہ اس روز بیسٹائل جیل کے قیدی رہا کرا لیے گئے تھے۔ امریکہ کی قومی تعطیلات میں یومِ آزادی (جس روز اعلان آزادی پر دستخط ہوئے تھے) صدر کا دن (واشنگٹن اور لنکن کی پیدائش کے دن) اور مارٹن لوتھر کنگ ہالی وے (سول رائٹس کے مشغول لیڈر) کا دن منایا جاتا ہے۔

ہر بڑے مذہب نے تعطیلات کو اہم واقعات یا شخصیات کے حوالے سے منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہودی یوم نجات (پاس اوور) اس وقت کو یاد دلاتا ہے، جب خدا نے مصر میں ہر اکلوتے بچے کو ہلاک کیا لیکن یہودیوں کے مکانوں سے درگزر کیا، جن کی دہلیز میں خون سے رنگینی دیکھی گئی تھی۔ مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا دن مناتے ہیں اور رمضان کے روزوں کے بعد کہ اس مہینے میں قرآن نازل ہوا تھا، دعوت کا اہتمام کرتے ہیں۔ بودھ مت کے لوگ گوتم بدھ کی پیدائش اور موت کے دن، اور وہ تاریخ بھی جب ان کو نروان حاصل ہوا تھا، مناتے ہیں۔ ہولی اور درگا پوجا کے تہوار وسنتی اور کالی دیوی، علی الترتیب ان دونوں کے احترام میں مناتے ہیں۔ ایسٹر جو عیسیٰ کی از سر نو ولادت کی یاد میں منایا جاتا ہے، عیسائیوں کے

لیے تعطیل کا نہایت مقدس دِن ہوتا ہے۔ ایسٹر اور کرسمس کے علاوہ مسیحی کیلنڈر میں تعطیلات کے لیے کئی یادگاری دن بھی شامل ہیں۔ ان میں عیسیٰ کا جنت میں پہنچنے کا دن، پینٹ کوٹ (جب بالکل ابتدائی مسیحیوں میں مقدس روح پھونکی گئی تھی)، اور اپنی فینے (عیسیٰ کے بپتسمہ کے موقع پر ان میں خدائی طاقت کے وجود کا انکشاف)، اور ان کے علاوہ مسیحی پادریوں کی یادگار منانے کے دن بھی شامل ہیں۔ زمانہ وسطیٰ میں ان دنوں پر ''حقیر کام'' کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اِس کے بجائے لوگ عبادت کرتے ہیں اور جشن مناتے ہیں۔

تیسرے عہد میں جب تہذیب تجارتی ہو گئی تھی، موقع پرست تاجروں نے مسیحی چھٹیوں کو اپنا مالِ تجارت بیچنے کے لیے نیم سرکاری تقریب قرار دے دیا تھا۔ اس تجارتی کرسمس کے طریقے کو چارلس ڈِکنس کے ناول ''اے کرسمس کیرول'' میں پرانے صحیفوں کے حوالے سے تائید کی سند بھی مل گئی۔ اس میں اسکروج کا کردار شامل ہے۔ اسکروج اتنا کنجوس تھا کہ اپنے ملازم بوب کراچٹ کو اپنے خاندان والوں کے ساتھ کرسمس منانے کے لیے چھٹی بھی نہیں دیتا تھا۔ چونکہ یہ مضمون آج کل کے کاروباری اندازِ فکر سے میل نہیں کھاتا، اس لیے اسکروج آج وہ شخص ہے جو کرسمس کے تحائف کی خریداری پر کوئی رقم خرچ نہیں کرتا۔ آج سانتا کلاز ڈیپارٹمنٹل سٹور کا موسمی ملازم ہے جو کسی زمانے میں سینٹ نکولس کے روپ میں نظر آیا تھا۔ یہ سینٹ چوتھی صدی کا ایک عیسائی بشپ تھا۔ سینٹ ویلنٹائن ڈے، سینٹ ویلنٹائن کے ہی نام سے ایک بزرگ کے احترام میں منایا جاتا تھا، اب یہ محبت کرنے والوں کا دن ہے، جو اس دن اپنی محبوب ہستیوں کے لیے پھول یا تہنیتی کارڈ خریدتے ہیں۔ ہالووین وہ تقریب ہے جب بچوں کو مٹھائی دیتے ہیں اور ڈراؤنے ملبوسات پہن کر پارٹی میں شریک ہوتے ہیں۔ خالصتاً تجارتی چھٹیوں میں مدرز ڈے، فادرز ڈے، گرینڈ پرنٹس ڈے اور سکریٹریز ویک شامل ہیں۔ اس موقع پر ان افراد کا نام لیا جاتا ہے جنہیں تحائف ملنے والے ہوتے ہیں۔ جارج واشنگٹن کا یوم پیدائش اب محض قومی تعطیل کا دن نہیں رہا۔ اس روز تاجر اپنے مال کی اسپیشل سیل لگاتے ہیں۔

چھٹیوں کی روایت تہذیب کے چوتھے عہد میں موسمی تفریحات کے حوالے سے آ گئی ہے، جیسا کہ کرسمس پہلے بھی روپ بدل کر آتا رہتا ہے۔ اب سال کے اس زمانے میں باب ہوپ کرسمس اسپیشل جیسے ٹی وی شو دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی۔ بِنگ کراس بی کا ''وہائٹ

کرسمس‘ پچاس سال تک سب سے زیادہ فروخت کیا جانے والا ریکارڈ رہا ہے۔ لیبر ڈے جو تیسری تہذیب کے عہد سے آیا ہے، اب جیری لیوس کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ جیری کا سالانہ میلہ ہوتا ہے جس میں وہ اعصابی مرض میں مبتلا بچوں کے لیے چندہ اکٹھا کرتا ہے۔ اب نئے سال کا دن ٹی وی پر کالجیٹ فٹ بال گیم اور پریڈ دیکھنے کا دن ہوتا ہے۔ سپر بادل سنڈے چھٹی کے ایک دن کی مثال ہے، جس کا تمام تر مقصد تفریح ہے۔

حصہ دوم

چوتھا باب

زمانہ قبل از تاریخ

نسل انسانی کا رشتہ ماقبل انسان کی کسی نسل سے جا ملتا ہے، جسے ہومینڈ (hominid) یعنی اعلیٰ حیوانوں میں سے بشر نما کوئی وجود سمجھا جاتا ہے، جو40 لاکھ سال پہلے مشرقی افریقا میں پایا جاتا تھا۔ ہومینڈ اور بن مانس نما دوسرے حیوانوں میں ایک اہم فرق یہ تھا کہ ہومینڈ اپنے دونوں پاؤں پر سیدھا کھڑا ہوسکتا تھا اور دونوں بازو اور ہاتھ دوسرے کاموں کے لیے آزاد رہتے تھے۔ انسان وہ جانور بن گیا جو ہاتھ میں پکڑے ہوئے اوزار استعمال کر سکتا تھا۔ جدید آدمی ''ہوموسیپئنز'' وہ جانور تھا جس کی بڑی کھوپڑی ہومونائیڈک نسل سے تعلق ظاہر کرتی ہے۔ وہ ایک لاکھ سال پہلے افریقا میں پایا جاتا تھا۔ آخری برف کا عہد، جو75 ہزار سال قبل شروع ہوا تھا، اس کی آبادی ابتداً گرم موسم کے علاقوں تک محدود تھی۔ بعض گروہ سردی میں نکل آئے۔ وہ شمال میں یورپ کی طرف، پھر جنوبی ایشیا کے راستے آسٹریلیا تک جا پہنچے۔ بہت دور تک پہنچنے والوں میں بیشتر لوگ امریکی انڈینز کے آبا و اجداد تھے، جنہوں نے الاسکا اور سوبیا کے درمیان ارضی پل پار کیا تھا اور یہ واقعہ غالباً25000 قبل مسیح کا ہے، لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ10000 سال قبل مسیح کا ہے۔ برف کا آخری زمانہ سن12000 سے10000 قبل مسیح کا ہے، اس وقت کرۂ ارض کی آبادی تقریباً40 لاکھ افراد پر مشتمل اور چھ براعظموں میں بکھری ہوئی تھی۔

سب سے پرانے انسانی معاشروں میں لوگ خاندانوں میں بٹے ہوئے اور قبائل میں رہتے تھے۔ شکار کرتے، مچھلیاں پکڑتے اور دوسرے طریقوں سے خوراک اکٹھی کرتے تھے۔ حجری دور کے باشندے خوراک کی تلاش میں خشکی اور سمندر کو چھانتے رہتے تھے۔

جانوروں کی کھال اور ان کے بالوں سے اپنے لباس بناتے تھے۔ پتھروں کو تراش کر اوزار بناتے۔ تیروں کی نوک بھی اسی طرح بناتے اور ہڈیوں سے متعلق اشیا تیار کرتے تھے۔ پتھر کے زمانے کے اواخر میں ایک انقلاب رونما ہوا، جو برف کے زمانے کو جاتے ہوئے دیکھ کر ہوا۔ اس انقلابی دور میں کھیتی باڑی کا ہنر آیا، سوت کاتنے اور بُننے کا عمل شروع ہوا، مٹی کا برتن بنانے، تیر بنانے اور گھریلو جانوروں سے کام لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کھیتی باڑی کے ہنر میں بہتری آئی جس سے خوراک کی پیداوار اور فراہمی میں اضافہ ہوا اور لوگوں کا اپنا وقت دوسرے فنون پر صَرف کرنے کے لیے بچ گیا۔ چھ سات ہزار برس پہلے تانبے کے اوزار پتھر کے ہتھیاروں کی جگہ استعمال کیے جانے لگے۔ تانبے اور ٹین کو ملا کر کالتی بنائی گئی جو زیادہ لچک دار دھات ہوتی ہے۔ لوہے کو پگھلانے کا ہنر کوئی تین ہزار سال پہلے شروع ہوا۔ اب چونکہ خوراک زمین سے پیدا ہونے لگی تھی لہٰذا عام لوگوں نے جمی جمائی برادریوں کی صورت میں رہنا شروع کیا۔ آبادی پہلے سے زیادہ گھنی ہونے لگی۔

تاریخ دانوں میں یہ نقطہ زیرِ بحث ہے کہ کرۂ ارض پر زراعت کسی ایک جگہ شروع ہوئی یا بہت سے مقامات پر۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے شام کے شمال میں ابوموریہ کے مقام پر یہ دریافت کیا کہ تقریباً نو ہزار پانچ سو برس پہلے یہاں اچانک ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ زمین کی گہرائی میں کھودتے ہوئے انہوں نے یہ دیکھا کہ مٹی کا رنگ بادامی سے کالا ہو گیا تھا جس میں کسی پودے کے ٹکڑے شامل تھے۔ جس سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ اس سے پہلے کی بستی پر کھیتی باڑی کرنے والا ایک گاؤں تعمیر ہوا تھا۔ اس سے یہ شواہد بھی ملتے ہیں کہ یہاں کے باشندے جو سرد موسم کے دوبارہ شروع ہونے کے بعد یہاں آئے تھے، انہیں اچانک مختلف نوعیت کے مقامی پودوں کا علم ہو گیا تھا جو مشرق وسطیٰ میں پھیل گئے تھے۔ بعض افراد کا قیاس ہے کہ زراعت کے بارے میں علم جو تیزی سے پھیلا تھا، اس کا سبب وہی ''مواصلات کا انقلاب'' تھا جو وہ لوگ تجارت کے وسیلے سے فنی نوادر اور سمندری گھونگھے ساتھ لائے اور انہی میں لاکھ بھی شامل تھی۔ جنوبی ترکی میں قیت الحیوق کے مقام پر کھدائی کے دوران میں یہ انکشاف ہوا کہ یہاں ایک بستی تھی، جس کی آبادی پانچ سے دس ہزار باشندوں کے درمیان تھی، یہ جگہ لاکھ کی تجارت کا مرکز تھی۔ یہ آبادی جہاں سانڈوں کی عبادت کی جاتی تھی، نو ہزار سال قبل دنیا کا پہلا شہر رہا ہوگا۔

قدیم ترین مہذب معاشرے

ساڑھے چار ہزار سے ساڑھے تین ہزار سال قبل از مسیح کا زمانہ شہری آبادکاری کا تھا۔ طغریث اور فرات کے دریاؤں کے وسط میں نشیب کی دلدلی زمین کو سب سے پہلے اس علاقے میں رہائش کے قابل بنایا گیا۔ دوسرے کئی شہر دریائے نیل کے ساحل پر نمودار ہوئے۔ فطری مطالبے کے تحت سمیرا اور مصر کے باشندوں نے دلدل سے پانی نکالا، کھائیاں کھودیں اور کھیتوں کو سیراب کیا۔ اس طرح کے مہماتی کاموں کے لیے اجتماعی کوشش درکار ہوتی ہے، پھر اس پر ایک حاکم طبقے کی ضرورت ہوتی ہے جو ایسے منصوبوں کے انتظامات کی نگرانی کرے۔ حکمران اشرافیہ پر ایک مقامی دیوتا کا اقتدار تھا۔ اشرافیہ کی ذمہ داری یہ تھی کہ آبادی کے لوگوں میں اور دیوتا میں ثالثی کرتے رہیں۔ سمیرا کے لوگوں کی سب سے پہلی آبادی اروک، اُر اور ایروڈو کے شہر تھے۔ ساڑھے تین ہزار، اور تین ہزار قبل مسیح کے درمیان ان کی آبادی ایک ہزار ایکڑ پر پھیل گئی اور چھ گنا بڑھ گئی۔ مصر میں آبادی زیادہ اور اچانک انداز سے بڑھ گئی۔ غالبًا ایسا سمیرا کی آبادی کے دباؤ کے نتیجے میں ہوا، بستیاں دونوں جانب بڑھیں، جنوبی ڈیلٹا میں بھی اور دریائے نیل کے بالائی اور جنوبی علاقوں میں بھی۔ چار ہزار قبل مسیح میں جو شہری بستیاں آباد ہوئیں، اس کے ساتھ پہلی بادشاہتیں آئیں، آبادی کی واضح طور پر درجہ بندی ہونے لگی۔ خاص خاص نوعیت کے پیشے پیدا ہونے لگے۔ تجارت اور کاروبار پھیلے۔ علامتی عبارت لکھی جانے لگی۔ شماریات اور قانون کا ایک نظام قائم ہوا۔ شہروں کے گرد حصار کھینچے جانے لگے۔ جنگیں بڑے پیمانے پر ہونے لگیں اور مردوں کی تدفین کا ایک زیادہ وسیع بندوبست کیا جانے لگا۔ مغرب کے مورخوں نے یہی سکھایا ہے کہ مصر اور میسوپوٹامیہ تہذیب کے اولین گہوارے تھے۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ ایک زیادہ نفیس قسم کا معاشرہ ہندوستان میں ابتدائی عہد میں موجود رہا ہو۔ رِگ وید میں بہت سے اشعار سرما کا حوالہ دیتے ہیں جب سورج نصف النہار پر تھا اور سورج کے برج حمل میں داخل ہونے کی ابتدا تھی۔ یہ حالات سات ہزار قبل مسیح کے فلکیات سے میل کھاتے ہیں۔ ہڑپہ اور موہنجو ڈارو کے آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے فنی طور پر ایک زیادہ ترقی یافتہ تہذیب کا سراغ ملتا ہے، جو تین ہزار سال قبل مسیح میں پائی جاتی تھی۔ اس کے شہر باضابطہ گلیوں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، جس میں پانی کی وافر فراہمی، نکاسی آب اور غسل خانوں کا انتظام تھا۔ اس کے باشندے گندم اور جو کھاتے تھے اور کپاس سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ ان کی تحریر جسے اب تک پڑھا نہیں جا سکا، غالبًا دراوڑی زبان سے نکلی تھی۔

اس عہد کی مہریں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ شروع میں شِو کی پوجا ہوتی تھی۔ آریاؤں سے پہلے کا ہندوستانی معاشرہ اپنے مولد سے پھیلنا شروع ہوا۔ یہ سندھ اور سرسوتی کی وادیوں تک پھیل گیا اور دریائے گنگا کے قریب کے علاقے بھی اس میں آ گئے۔ سن 2000 اور 1800 قبل مسیح کے درمیان جب سرسوتی دریا خشک ہو گیا تو یہ تہذیب بھی ناپید ہو گئی۔

چین کی تہذیب کو تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح میں اس سرزمین سے فروغ حاصل ہوا، جہاں پتھر کے زمانے کی تہذیب کے آثار تھے۔ زیا (Xia) اور ان کے بعد شان خاندانوں نے دریائے زرد کے دوآبے میں مناسب طرز کے آب پاشی کے منصوبے بنائے۔ چنانچہ پہلی شہری ریاست ایرلی ٹاو (Erlitov) کے نام سے 1900 قبل مسیح میں قائم ہوئی۔ جیسا کہ دوسری جگہوں پر بھی ہوا، سماجی طبقات میں دولت کی بنیاد پر نہایت واضح انداز سے فرق پیدا ہو گیا۔ جنگ جُو بادشاہوں نے توسیع ریاست کے لیے جنگیں لڑیں اور ان میں جو سب سے طاقت وَر تھے، انہوں نے شمالی چین کے علاقوں پر شاہانہ بالادستی حاصل کر لی۔ شانگ عہد (16 تا 11 صدی قبل مسیح) میں گھوڑے گاڑیاں متعارف ہوئیں تاکہ جنگ میں کام آئیں۔ ایک چینی سوادِ تحریر کو ترقی دی گئی، جس کے خطوط معبد میں پائی جانے والی ہڈیوں میں ملتے ہیں جو مستقبل کے زائچے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ ماہر کاری گر جستے کے برتن جن کی انفرادیت ان کے تین پائے ہوتے تھے، تیار کرتے۔ طاقت وَر بادشاہ، جن کے ساتھ قربان شدہ غلاموں کی لاشیں ہوتیں پرشکوہ مقبروں میں دفن کیے جاتے۔ چینی کسان دھان اور اس کے ساتھ گندم اور باجرے کی کاشت کرتے تھے۔ وہ سور اور بھینسیں پالتے تھے۔ شانگ کی حکومت کو 1029 قبل مسیح میں چاؤ نے ختم کر دیا۔ چاؤ ایک بڑی ریاست تھی جو وائی دریا کی وادی میں مغرب کی جانب واقع تھی۔ مغرب کے چاؤ بادشاہوں نے ماضی کی تہذیب کو بحال رکھا اور پہلے تو ہاؤ کے دارالحکومت سے (جو زیان کے قریب تھا) 710 قبل مسیح تک حکمرانی کرتے رہے، پھر لو یینگ کے مقام سے 256 قبل مسیح تک مشرقی چاؤ خاندان کے نام سے حکمران رہے۔

مینوان تہذیب، تقریباً ابتدائی چینی معاشرے کے زمانے میں ہی کریٹ اور قریبی جزیروں کے اندر سمیریوں کی طفیلی معاشرت کے طور پر بار آور ہونے لگی تھی۔ یہ تہذیب یونانی تہذیب کی پیش رو تھی، جسے اپنی فطری نقش گری اور سرامک کی ظروف سازی کی بدولت شہرت حاصل ہوئی۔ مینوز بادشاہ نے جس سے یہ معاشرہ موسوم ہوا، تقریباً 2000 قبل مسیح میں کینوس کے مقام پر ایک محل تعمیر کروایا۔ مینولوگ جستے کی دولت سے مالا مال تھے۔ انہوں نے اس کی

تجارت مصریوں، لبنان اور یونان کے ساتھ بحیرۂ روم کے راستے شروع کر دی تھی۔ یہاں تک کہ 1200 قبل مسیح کے آس پاس مسلسل کئی طبعی حادثوں اور انسان کی لائی ہوئی تباہیوں کے باعث وہ تہذیب ختم ہوگئی۔ تجارت کا ایک اور مرکز خلیج فارس تھی، جہاں میسوپوٹامیہ، شمال مشرق عربستان اور مغربی ہند کے درمیان اناج، جستے، سوتی کپڑے، قیمتی دھاتوں اور موتیوں کی تجارت دو ہزار سال قبل مسیح کے ابتدائی زمانے تک ہوتی رہی۔ ہندوستان میں جب ہڑپہ تہذیب ختم ہوگئی تو اس تجارت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ایران میں خلیج فارس کے شمال میں واقع ایلامی سلطنت ایک سیاسی اور تجارتی طاقت کی حیثیت رکھتی تھی، یہاں تک کہ اشوریوں نے 640 قبل مسیح میں اسے تباہ کر دیا۔ حتّی کے لوگ جو آج کے ترکی اور شمالی شام میں آباد تھے، ہندیورپی لوگ تھے، جنھوں نے چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح میں ایک زبردست سلطنت قائم کی تھی۔ جنوبی عربستان کی میرانی (Minaean) اور سباتین (Sabataean) سلطنتیں بھی اہم تہذیبوں سے عبارت تھیں، جن کا آغاز دو ہزار سال قبل مسیح کے اواخر میں ہوا۔

یہاں جن تہذیبوں کی تعریف اس حوالے سے کی گئی کہ ان میں سیاسی اور تجارتی سلطنتیں قائم کرنے کا رُجحان غالب تھا، وہ تہذیبیں دوسرے براعظموں میں اس کے بعد آئیں۔ افریقا کے علاقہ گھانا میں تیسرے چوتھے سن عیسوی میں تجارت خوب پھل پھول رہی تھی۔ یہ کیفیت ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک برقرار رہی۔ اس کے بعد تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں دریائے نائگر کے جہازرانی کے علاقے میں اور پھر سونگھائی سلطنت کے تحت آئندہ دو صدیوں میں تہذیب پروان چڑھتی رہی۔ نوبیا کی ایک خاندانی سلطنت نے مصر پر ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں حکومت کی، یہاں تک کہ اشوریوں نے انہیں پسپا کر کے سوڈان پہنچا دیا۔ وہاں کش سلطنت نے میرو کے دارالحکومت سے ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھا جنہیں دریائے نیل کے شمال سے آب پاشی کے لیے پانی مل رہا تھا، یہاں تک کہ چوتھی صدی عیسوی میں حبشہ کے بادشاہ ایکسم (Axum) نے وہ علاقہ فتح کر لیا۔ لوہے کو پگھلانے کے ہنر نے انہیں دوسری افریقی اقوام پر برتری دلا دی تھی۔ امریکا کے براعظموں میں پیرو کے مقام پر لافلوریڈا میں تقریباً 1700 قبل مسیح میں ایک زبردست مرکز رسومات کی خاطر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس تہذیب میں آب پاشی اور ناہموار قطعات پر کاشت شروع ہو چکی تھی۔ انڈین تہذیب میں نہایت نفیس سوتی کپڑے، برتن اور دھات کے اوزار تیار کیے جاتے تھے۔ میکسیکو میں تقریباً اس زمانے میں اولمک تہذیب اپنے طور پر ابھری۔ یہ تہذیب قبر کی بھاری

لوح کے لیے اور ظروف جن پر تینددوے کی شباہت بنی ہوتی تھی، اس کے لیے بھی مشہور ہوئی۔ اس نے پہلے میسو امریکی رسم، تحط کو ترقی دی۔ نئی دنیا کی ان دونوں تہذیبوں نے کھانے کی متنوع قسموں اور تمبا کو اور دیگر مفید پودوں کو ترقی دی۔

پہلی وسط مشرقی سلطنتیں

عالمی تاریخ اپنے پہلے عہد میں ترقی کی راہ پر چلتی ہوئی بڑی سیاسی تنظیموں کی جانب قدم بڑھا رہی ہے۔ اس عہد کا ایک یادگار واقعہ یہ تھا کہ نارمر بادشاہ نے جنوبی مصر (نیل کے دوآبے کے قریب) کو3100 قبل مسیح کے آس پاس فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ نارمر وہ پہلا فرعون قرار پایا، جس نے بیک وقت دو تاج پہن رکھے تھے۔ جب ہم فراعین کے دور کے مصر کا تصور کرتے ہیں تو پتھر کی دیو ہیکل یادگاریں آنکھوں کے آگے آ جاتی ہیں، جو ان لوگوں نے تعمیر کیں، جیسے عظیم اہرام یا لگزر کا معبد۔ گیزاہ کے مقام واقع اہرام فراعین کے وہ مقبرے تھے، جن کا تعلق چوتھے خاندان (2613 سے2495 قبل مسیح) سے تھا۔ ان عظیم بادشاہوں اور ان کے خادموں کو مومیانے کے ساتھ ہی جواہرات سے آراستہ کیا گیا اور ان کے لیے وہ کھانے مہیا کیے گئے جو دائمی زندگی کے لیے تھے۔ میسوپوٹامیہ کے معبد جو قدیم عراقی طرز کے تھے، مصنوعی پہاڑ معلوم ہوتے تھے، جن پر زینوں کا رُخ آسمان کی جانب تھا۔ وہ سورج کی کرنوں کی علامت بن گئے تھے، جنہیں مرنے والے بادشاہ سورج کے دیوتا ری سے ملاقات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ایک بار زندہ دیوتا تسلیم کیے جانے کے بعد فراعین نے اپنے لیے ری (سورج) کے بیٹے کا مرتبہ اپنا لیا۔ فرعون کو دیوتا تسلیم کیا گیا تھا کہ اسے ری نے پیدا کیا اور ایک عورت اس کی ماں تھی۔ جس کا رِی سے کوئی جسمانی تعلق نہیں تھا۔ فراعین کے خاندان نے مصر کو سیاسی اتحاد اور استحکام، چند مداخلتوں کے باوصف عطا کیا اور یہ استحکام تین ہزار سال تک برقرار رہا۔

گوشوارہ1-4 Table: 4-1

مصری سلطنت کے حکمران خاندان

	خاندان1-2	300-2700 قبل مسیح
قدیم بادشاہت	خاندان3-6	2700-2200

تعطل کے وقفے	خاندان7-10	2200-2100
درمیانی حکومت	خاندان11-12	2100-1788
	خاندان13-17	1788-1580
نئی بادشاہت	خاندان18-20	1580-1090
	خاندان21-26	1090-525
ایران کی حکمرانی	خاندان27	525-404
نیم آزاد	خاندان28-30	404-332
سکندراعظم		332-323
یونانی خاندان		323-30

پرانی بادشاہت کا آخری فرعون پے پی دوئم تھا جس نے94 سال تک حکومت کی، اس کا انتقال2184 قبل مسیح میں ہوا۔ مرنے والے ہر بادشاہ کے لیے رسوم کی ادائیگی کے لیے پجاریوں کے ایک نئے دستے کی ضرورت ہوتی تھی جو معیشت پر بوجھ ہوتے تھے۔ مقامی شہزادوں نے جو فرعون کے عہدے دار ہوتے تھے، اپنی اس حیثیت کو موروثی بنا لیا تھا۔ وہ مقامی مصری حکومت کو اپنے ماتحت رکھتے۔ انہوں نے نیوبیا کے کرایے کے فوجیوں کی مدد سے دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے فرعون کی کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا۔ مقامی شہزادوں نے اس وقت تک حکومت کی تا آنکہ وسطی حکومت (1786-1992) میں ان کا اقتدار دوبارہ بحال ہو گیا۔ فرعون خاندان کی حکومت نے، اپنا دارالحکومت تھیبس (Thebes) منتقل کر دیا تھا۔ تاہم اس نے اپنے یہاں تدفین کی بھاری رسوم دوبارہ قائم نہیں کیں۔ بادشاہوں نے احرام نہیں بنائے، قلعے نہیں بنائے، تاہم وہ شام کی جانب سے ہائکوس کے حملے کے آگے ٹھہر نہ سکے۔ ہائیکوس کے خانہ بدوشوں نے مصر کے شمال میں1567 قبل مسیح تک حکومت کی، یہاں تک کہ آموس اوّل نے ملک کو دوبارہ منقسم کیا اور نئی بادشاہت (1575-1087 قبل مسیح) قائم کی۔ مصر اس وقت ایک فوجی طاقت بن گیا، جس نے ایشیائے کوچک کی جارحانہ دھمکیوں پر قابو پا لیا۔ نئی بادشاہت کے فراعین میں راموس دوم (جس کے بارے میں خیال تھا کہ خروج کے دور کا فرعون تھا) بادشاہ ٹٹ (Tutankhamen) اور مذہبی بصیرت کا مالک اخنیاتن شامل تھے۔ آخری ہزار سال قبل مسیح میں ایک یسیا کی حکومت نے مصر پر حکمرانی کی، جس کے بعد نیوبیا، فارس اور یونان کے فرماں روا آتے رہے۔ کلوپیٹرا ہفتم یونان کی آخری حکمران تھی۔30 قبل

مسیح میں اس کی خودکشی کے بعد مصر، روم کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

میسوپوٹامیہ میں الحاق بہت سست رفتاری سے ہوا۔ لاگاش کے بادشاہ یورو کاغینہ (2378-2371 قبل مسیح) نے ہمسایے شہر اُمّہ پر قبضہ کرلیا اور سمیرا کی شہری ریاستوں کی پہلی سلطنت قائم کر لی۔ ایک اور بادشاہ لگل زگیسی (Lugalzaggisi) نے اس کا تختہ الٹ دیا اور شمال جنوب میں نئی مقبوضات حاصل کر لیں۔ لگل زگیس کی مملکت کو اگادے کے بادشاہ سرگون (2371-2316 قبل مسیح) نے فتح کر لیا۔ سرگون کی بادشاہت میں سمیر اور عکاد اور خلیج فارس اور بحیرۂ روم کے درمیان کے بیشتر علاقے شامل ہو گئے تھے۔ اس خاندان کی حکومت 2230 قبل مسیح تک برقرار رہی، یہاں تک کہ گاٹیا کے پہاڑی حملہ آوروں نے شمال کی جانب سے ان علاقوں میں داخل ہونا شروع کیا اور سلطنت پر قبضہ جما لیا۔ آمور کے قبائل نے گاٹیا کے دورِ حکومت (2230-2120 قبل مسیح) میں بابل کے شہر کی بنیاد رکھی۔ ان کا دورِ حکومت سمیرا کے ایک مقامی باشندے ازک کے اوتو کیگل کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ اس کے بعد ایلام کی رعیت نے بغاوت کر دی اور ار کے شہر کو تہس نہس کر دیا۔ وہ سلطنت بہت سی جانشین ریاستوں کے درمیان تقسیم ہو گئی، جن میں ایلام، ایسن، مری، بابل اور اسیریا شامل تھیں۔ بابل کے بادشاہ حمورابی (1792-1750 قبل مسیح) نے اپنی نو سالہ فوجی مہم کے دوران میں بیشتر صوبوں کو دوبارہ متحد کر دیا۔ بابل کی سلطنت اپنی شان دار تہذیبی کامیابیوں کے باوجود حمورابی کے انتقال کے بعد بہ مشکل برقرار رہ سکی۔ اس کے بعد کسّا کے وحشی قبائل نے بابل پر حملہ کر دیا اور سلطنت کے ایک بار پھر ٹکڑے ہو گئے۔

حمورابی کی سلطنت جب 1743 قبل مسیح میں ختم ہوئی تو اس کے بعد کے ایک ہزار سال کے دوران میں مشرق وسطیٰ میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ جب حِتّی کے بادشاہ مرسلیس اوّل (Mursilis-I) نے 1595 میں بابل کو تاراج کیا تو کسّا کے لوگوں کو یہ موقع مل گیا کہ شہر پر قبضہ کر لیں۔ انہوں نے سمیرا کی سلطنت کو دوبارہ بحال کر دیا جو 1169 قبل مسیح تک برقرار رہی۔ سولھویں صدی قبل مسیح کے وسط میں مصر سے ہائکوسس بادشاہوں کو نکال دینے کے بعد، نئی بادشاہت کے فراعین نے شام اور فلسطین کے علاقوں کو فتح کر لیا، تاکہ ان کی طرف سے آئندہ حملوں کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ حِتّی چودھویں صدی قبل مسیح میں فوجی جارحیت کے قابل ہو گئے تھے۔ 1300 قبل مسیح میں ان کی سلطنت، مصر کی حکومت کے برابر طاقت وَر ہو گئی تھی۔ تب دونوں فوجی طاقتوں کے درمیان شام پر قبضے کے لیے لڑائی ٹھن گئی۔ حِتّیوں نے کادیش

(86-1285) کے مقام پر مصریوں کو جنگ میں شکست دے دی، لیکن بعد میں شام کی تقسیم کی بنیاد پر مصریوں سے سمجھوتا کرلیا۔ یہ غالباً تاریخ کا پہلا واقعہ تھا کہ دو تہذیب یافتہ حکومتوں نے ایک دوسرے سے جنگ کی۔ اس دوران میں اسیریا بابل کی آبادیوں پر حملے کرتا رہا۔ مغرب میں میسوئنین مصریوں نے کریٹ میں مینوئن کے تعمیر کردہ محل تباہ کر دیے۔ بابل کی تہذیب کا سیاسی ڈھانچا اگرچہ کمزور تھا لیکن اس عرصے میں وہ برقرار رہی اور تہذیبی طور پر طاقت وَر بھی رہی۔ اس کا مافوق الفطرت کے بارے میں علم، سائنس اور اس کی تحریری زبان مشرق قریب تک پھیل گئی تھی۔ فراعین کو جب اپنی ایشیائی رعیت سے رابطہ پیدا کرنا ہوتا تو اکادی زبان ہی استعمال کرتے تھے۔

خانہ بدوشوں کے حملے

عالمی تاریخ میں پہلے سے علم کا ایک نمایاں موضوع وہ لڑائیاں تھیں، جو تہذیب یافتہ معاشروں اور وحشی خانہ بدوشوں کے درمیان ہوتی رہیں۔ یہ قبائل ان کی دولت کو لوٹتے رہتے تھے۔ یہ خانہ بدوش زراعتی معاشرے کے آغاز سے پہلے کی آبادیوں کی باقیات میں سے تھے، جو خوراک کے لیے شکار کرتے یا اپنے چوپایوں کو چراگاہوں میں لے کر پھرتے تھے۔ ایک ہزار سال کے اندر ان کی نسل میں اضافہ ہوا اور ان دراز قد اور مضبوط گھوڑوں کی بدولت جوشہ سواروں کے لیے موزوں تھے، ان کو ایک نیا فوجی ہتھیار ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ تک منظم انداز سے سفر کرتے۔ بلند سطح مرتفع سے نیچے اترتے اور چلتے پھرتے حملے کرتے جس میں وہ طاق تھے۔ ان کا وجود ایک مرتعش سازینے کی طرح یورپ اور ایشیا کے براعظموں تک پھیلا ہوا تھا۔ غیر آباد دور افتادہ علاقوں سے ان کی نقل مکانی اور حملوں کا سلسلہ چین، ہندوستان، مصر اور مشرقِ وسطیٰ تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وحشی وقفے وقفے سے حملے کرتے، جمی جمائی آبادیوں میں گھس جاتے، شہروں کو تاراج کرتے، ڈاکے ڈالتے اور لوٹ مار کرتے۔ تہذیب یافتہ معاشروں پر حملہ کرتے اور انہیں شکست دینے کے بعد، وہی قبائل بعض اوقات انہی کے درمیان حاکم طبقے کے طور پر جم کر بیٹھ جاتے۔ پھر فتح مند وحشی قبائل کا یہ معمول ہوتا کہ مفتوحہ لوگوں کے کلچر کو اپنا لیتے۔ دوسری طرف اگر تہذیب یافتہ معاشرہ فوجی لحاظ سے زیادہ طاقت وَر ہوتا تو حملہ آوروں کو بھگا دیتا تھا۔

وحشی قبائل کا حملہ سمندری لہروں کی طرح ہوتا تھا، مثال کے طور پر ایک وقت دوسری

صدی قبل مسیح کے وسط میں خانہ بدوشوں کے درمیان بے چینی کا تھا۔ اُس وقت ہائکوسس کے جنگ جوقبائل نے کنعان سے اٹھ کرمصر پرحملہ کر دیا۔ متّیاتی قبائل نے میسپوٹیمیا، حتّی اور کسّا پر قبضہ کر کے بابل پر حملہ کر دیا اور نامعلوم وحشیوں نے کریٹ کے مقام پر منیون (Minoan) کے قدیم محلات مسمار کر دیے۔ سنسکرت بولنے والے آریائیوں نے شمالی ہندوستان پر حملہ کیا، اور دراوڑوں کا معاشرہ جو پہلے سے موجود تھا، اس کا تختہ الٹ دیا اور ذات پات کا ایک اپنا نظام قائم کیا۔ کلاسیکی ویدک ادب کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔ وحشی قبائل کے حملوں کی دوسری لہر 1250 اور 950 قبل مسیح میں اٹھی جب بحیرۂ روم کے مشرقی علاقوں میں مختلف قومیں داخل ہوتی رہیں، انہوں نے منیون اور حتّی کی تہذیبوں کو تباہ کر دیا اور مصر کی سلطنت پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے۔ مصر پرحملہ بربر قبائل کی طرف سے اور لیبیا پر مغرب سے ہوتا رہا۔ ''سمندری اقوام'' شمال مشرق سے آئیں، جن میں اموری، فلسطینی اور غالباً اسرائیلی شامل ہوتے۔ اس دوران میں اچ اور ڈوریا قبائل نے یونان کے میسونی (Mycenaean) بستیوں پر حملے جاری رکھے۔ حتّی کی سلطنت پر تھارس، فرغانہ اور اسیریا حملہ آور ہوتے رہے۔ پھر ایک دوسری لہر آٹھویں صدی قبل مسیح میں اس وقت اٹھی جب کریمیا کے خانہ بدوشوں نے مغرب کا رخ کیا۔ وہ شتر سوار عرب تھے، جنہوں نے اسیریا کی سلطنت پر حملہ کیا۔ کلٹک قبائل جنہوں نے شمال مغربی یورپ سے ہجرت اختیار کی تھی، اٹلی، یونان اور رومانیہ پر حملے کیے اور کچھ عرصے کے لیے روم پر قبضہ کر لیا۔

مشرقِ وسطیٰ میں جنگی تیاریاں

جب شہروں میں آباد لوگ اتنے طاقت وَر ہو گئے کہ قبائل کے دباؤ کا مقابلہ کر سکیں تو تاریخ کا رخ قوموں کے درمیان فوجی مقابلوں کی طرف مڑ گیا۔ تہذیب یافتہ اقوام، مثلاً فونیشین، کالڈین (Chaldaenian) یہود اور یونانی انہی حملہ آوروں کے گروہوں سے نکلے تھے۔ جنہوں نے دوسرے ہزار سالہ قبل مسیح میں بحیرۂ روم کے علاقوں کا رخ کیا تھا۔ اسیریا کی سلطنت ملبے کے ڈھیر سے اٹھی اور مشرق قریب میں ایک زبردست طاقت بن گئی۔ جب مصر کمزور ہو گیا اور حتّی کی سلطنت برباد ہو گئی تو اسیریا کی افواج نے تین صدیوں کے اندر شام میں آرمینیا کے شہروں کو فتح کر لیا، آرمینیا کا محاصرہ کر لیا۔ بابل کے شہر کو تباہ و برباد کر دیا اور مصر کے تخت پر ایک کٹھ پتلی حکمران کو بٹھا دیا۔ اسیریوں کا سلوک مفتوحہ لوگوں کے ساتھ بہت

ظالمانہ تھا۔ بابل میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ میڈیز (Medes) اور فارس والوں نے اسیریا کے خلاف اتحاد کر لیا اور اس کے دارالحکومت نینوا کو 612 قبل مسیح میں قبضے میں لے لیا، لیکن کچھ عرصہ کے لیے بابل کے لوگ بادشاہ نبو کد نظر (Nebuchadnazzar) کی سرکردگی میں اس علاقے کی سب سے زیادہ طاقت وَر ریاست بن گئے۔ اس کے بعد طاقت میڈیز کو منتقل ہو گئی، لیکن جلد ہی ایک نئی سلطنت نے اس پورے علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا، یہ ایران کا بادشاہ سائرس دوم تھا۔ وہ 550 قبل مسیح میں لیڈیا کا بادشاہ بن گیا۔ پھر اس نے لیڈیا (Lydia) کی بادشاہت فتح کر لی اور 538 قبل مسیح میں نئی بابئیل سلطنت بھی جیت لی۔ سائرس کے بیٹے نے 525 قبل مسیح میں مصر فتح کر لیا۔

ایران کی ایش مینین سلطنت اس وقت تک سب سے بڑی، سب سے زیادہ دولت مند اور سیاسی طور پر سب سے زیادہ طاقت وَر سلطنت تھی۔ اس کے حکمرانوں نے زرتشتی مذہب اختیار کیا تھا۔ تاہم انہوں نے اپنے مفتوحہ عوام کے ساتھ نہ ہی رواداری کا سلوک کیا، اور ان میں یہودی بھی شامل تھے۔ دارا اوّل نے (486-521 قبل مسیح) میں سائرس دوم کے جانشین سمردس کو قتل کر کے تختِ حکومت پر قبضہ کر لیا۔ دارا نے سلطنت کو بیس منطقوں میں بانٹ دیا اور مقامی نظم و نسق ان کے حوالے کر دیا۔ اس نے تھریس (Therace) اور شمال مغربی ہندوستان کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا اور دریائے نیل اور بحر احمر کے درمیان نہر کھدوائی، اس کی سلطنت میں سڑکوں کی تعمیر سے شہروں کے درمیان اچھا رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔ زارس (Xerxes) کا یورپی یونان پر 480 قبل مسیح میں حملہ کرنے کا فیصلہ غلط تھا۔ یونان کی شہری ریاستوں نے ایتھنز کی سربراہی میں متحد ہو کر اس حملے کو پسپا کر دیا۔ 150 سال بعد اس کے جواب میں مقدونیہ اور یونان کی فوجوں نے مل کر سکندر اعظم کی سربراہی میں ایران کے ایشیائی مقبوضہ جات پر حملہ کر دیا۔ سکندر کی فوجوں نے 333 قبل مسیح میں آئس کے میدان میں ایران کی فوجوں کو شکست دے دی۔ اس کے بعد سکندر کی فوجوں نے آئندہ برس تک ایرانیوں اور دوسرے دشمنوں کو جنگوں میں پھنسائے رکھا اور فتح یاب ہوتا رہا۔ اس نے نہ صرف ایران میں اس کے صوبوں کو اور بابل کو فتح کر لیا بلکہ شام، مصر، افغانستان اور شمالی ہند کے بعض حصے بھی جیت لیے تھے۔

سکندر کے جرنیلوں نے 323 قبل مسیح میں اپنے سربراہ کی اچانک موت کے بعد مختلف علاقوں میں اپنی اپنی بادشاہتیں قائم کر لی تھیں۔ تاہم جنوبی یونان کی شہری ریاستوں نے

مقدونیہ کی حکمرانی کے خلاف خود بغاوت کر دی، جسے کچل دیا گیا تھا۔ پھر مقدونیہ کے فوجی سالار آپس میں لڑنے لگے۔ مقدونیہ کو یونان اسٹولین وفاق اور شمال سے آنے والے کلٹک تارکینِ وطن دونوں کو اس وقت تک برداشت کرنا پڑا تا آنکہ اس نے دوسری صدی قبل مسیح میں رومیوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ سلوکس اوّل نے ایشیا کے دور دراز علاقوں کا بیشتر حصہ حاصل کر لیا، لیکن موریہ خاندان کے بانی چندر گپتا نے جلد ہی اس کی فوجوں کو سندھ کی وادی سے نکال باہر کیا۔ سلوکس کی سلطنت اس وقت اور بھی سمٹ گئی، جب پرنی وحشیوں نے پارتھیا پر قبضہ کر لیا اور ازبکستان میں یونان کا ایک صوبہ الگ ہو گیا۔ ٹولیمی اوّل (Ptolemy-I) نے مصر میں اور شام کے نصف جنوبی علاقے میں ایک خاندان کی حکومت قائم کی۔ یہ قدیم یونانی حکمران خاندانوں میں غالباً سب سے زیادہ مضبوط حکومت تھی۔ سکندریہ میں ٹولیمی اوّل کا نیا دارالحکومت علوم کا، اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ سیلوسڈ بادشاہوں نے جنوبی شام کو مصر سے چھین لینے کی بار بار کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ یونان کی جنوبی ریاستوں اور مقدونیہ کے درمیان لڑائیاں بھی اسی قدر غیر فیصلہ کن رہیں۔

اگرچہ سکندر کی سلطنت کی جانشین ریاستیں آپس کی لڑائیوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھیں، لیکن انہوں نے یونان کے کلچر کو ایک وسیع علاقے میں نہایت مؤثر طور پر پھیلایا تھا۔ سکندر اور اس کے باپ فلپ دوئم نے مشرقی مقدونیہ میں فلپسی سے ابتدا کی اور دونوں نے مل کر تین سو نئے شہروں کی بنیاد رکھی، خاص طور پر دونوں کا الگ الگ بازار تھا، تھیٹر اور جمنازیم تھے، جہاں عام لوگ بڑی تعداد میں آتے تھے۔ جمنازیم میں جسمانی کے علاوہ ذہنی ورزشوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یونان کا کلچر، بصری فنون کی صورت میں اور فلسفے اور تحریری زبان کے تعلق سے ہر آبادی میں سماجی اشرافیہ سے مخصوص ہو گیا۔ عام لوگ اپنی مقامی روایات سے پوری طرح جڑے ہوئے تھے۔ قدیم یونانی تہذیب کے ماننے والوں اور مقامی مذہبی روایت پرستوں کی باہمی کشیدگی نے جوڈایا میں میکیبین بغاوت کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ سیلوکس بھی سکندر کی طرح یونانیوں اور مقامی لوگوں کا آپس میں گھلنا ملنا پسند کرتا تھا، لیکن قدیم یونانی اربابِ اقتدار نے اہم سرکاری عہدوں کو یونانیوں کے ہاتھوں میں ہی رکھا۔ سیلوکس کی سلطنت میں جو مشرق میں دور تک پھیل چکی تھی، سماجی میل جول خاصا بڑھ گیا تھا۔ اب وہ علاقہ بکٹیریا بادشاہت کی عمل داری میں تھا۔ ایتھنز بہ دستور فلسفے اور ڈراما کا مرکز تھا۔ ارسطو اور افلاطون کے مدارس فلسفہ کے علاوہ، ایپی کیوریز اور اسٹیوٹکس کے فکری مدارس قدیم یونانی افکار کی دنیا میں لوگوں کے

لیے بہت کشش رکھتے تھے۔

اگر چہ یونان کی خاندانی بادشاہتوں نے سکندر کے مفتوحہ علاقوں کو اپنی گرفت میں رکھا، لیکن اب جغرافیائی اور سیاسی کشش کا مرکز بحیرۂ روم کا مغربی علاقہ تھا۔ یونانیوں نے ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے دوران میں سسلی اور جنوبی اٹلی میں نوآبادیاں قائم کر لی تھیں، شمالی افریقا میں کارتھیج کی فونیشین نوآبادی نے480 قبل مسیح میں سسلی کی یونانی بستیوں پر حملہ کر دیا، لیکن سائراکوس اور امیگری کستم کی مشترکہ طاقت نے ان کو شکست دے دی۔ سائراکوس نے ڈائنی سیس اوّل (367-405 قبل مسیح) کے دورِ حکومت میں اٹلی کو متحد کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کوشش کارتھیج اور دوسری یونانی ریاستوں کی باہمی آویزش کے باعث ناکام ہوگئی۔ ڈائنوسس دوم نے افلاطون کو سائراکوس آنے کی دعوت دی تاکہ اپنے سیاسی نظریہ کو نافذ کرے۔ بہرحال کورنیتھ کے ٹائمولین نے344 قبل مسیح میں ڈائنوسیس دوم کی حکومت ختم کر دی اور یونان کے شہروں کے درمیان ایک اتحاد قائم کیا جس کے بعد کارتھیج والوں کو سسلی سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اٹلی میں یونانیوں کی تقدیر کا زوال شروع ہو گیا، حالانکہ انہیں یونان کی اصل سرزمین سے فوجی امداد ملتی آئی تھی۔ ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں حتی تہذیب کی باقیات نے شمالی اٹلی میں ابھرتی ہوئی طاقت کا روپ اختیار کیا۔ تارکوئن (Torquin) بادشاہوں نے روم پر سو سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ ایٹروکن کی یہ کوشش کہ وہ اٹلی کو فتح کر لیں، ناکام ہوگئی کیوں کہ وہ خود بھی شہری ریاستوں کا مؤثر اتحاد برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔ اس کے علاوہ (کوہِ) آلپس کی دوسری جانب سے کلٹیک قبیلوں نے اس علاقے میں یلغار کر دی تھی۔

روم کا عالمی طاقت بن جانا

روم نے ایٹروسکن کی عمل داری سے آزاد ہونے کے بعد کارتھیج سے ایک امن معاہدہ کیا، جس سے اس کو اپنے ہمسایوں کے خلاف کامیاب جارحانہ جنگیں کرنے میں بہت مدد ملی۔ ایٹروسکن کے شہر وی (Veii) اور اس کے علاقوں کی فتح سے (393-88 قبل مسیح میں) اس کی طاقت دگنی ہوگئی۔ سمنائٹ کے وفاق کے خلاف343 اور270 قبل مسیح کی ایک جنگ میں لاطینی اور کیمپے نین فیڈریشنوں کو شکست ہوئی جس سے اس کی طاقت میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور مزید زمینیں اس کے تصرف میں آ گئیں۔264 قبل مسیح تک روم ایک متحدہ جزیرہ نما

تھا۔ اس عمل کے دوران میں روم کی حکومت نے کارتھیج سمیت کئی ریاستوں کے ساتھ اپنے معاہدے توڑ دیے۔ روم اور کارتھیج کے درمیان 264 اور 241 قبل مسیح کی جنگ میں زبردست تباہی پھیلی، لیکن اٹلی اور سسلی کا بیشتر علاقہ روم کے قبضے میں ہی رہا۔ اب بحیرۂ روم کے مغربی علاقے میں روم کی بحری طاقت سب پر بھاری تھی۔ ایک اور نوعیت کا تنازعہ 221 قبل مسیح میں شروع ہوا۔ سپین کے مرکز سے کارتھیج کی فوجیں ہنی بال کی سرکردگی میں ہاتھیوں کا لشکر لے کر پیرنیس اور آلپس کے پہاڑوں سے گزر کر شمالی اٹلی کی وادی 'پو' میں داخل ہوئیں۔ ہنی بال کی فوجوں نے روم کی فوجوں کو اپنی شاندار فوجی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے تین بار شکست دی تھی، تاہم آخر میں روم کی فوجوں نے کارتھیج پر حملہ آوروں کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ روم کی فوجوں نے پبلو کارنیلیئس سکیپیو کی سرکردگی میں اسپین میں جوابی حملہ کیا اور 202 قبل مسیح میں بجائے خود کارتھیج کو فتح کر لیا۔

دوسری صدی قبل مسیح کے اوائل میں روم بحیرۂ روم کے مغربی ساحل کے بیشتر علاقوں پر قابض تھا۔ اس صدی کے ختم ہونے تک مشرق کا ساحل بھی اس کے قبضے میں چلا گیا۔ پھر یونان کی اٹولین لیگ اور مکیوڈن کی سرکردگی میں ایک مشترکہ طاقت کے درمیان 220 قبل مسیح میں جنگ چھڑ گئی۔ مکیوڈن کارتھیج سے مل گیا اور اٹولیا روم کے ساتھ ہو گیا۔ ہنی بال کی شکست کے بعد روم نے اٹولیا کی مدد سے مقدونیہ کی فوجوں کو 197 قبل مسیح میں شکست دے دی اور مقدونیہ سے جنوبی یونان اور ایشیا کوچک کے علاقے چھین لیے۔ روم نے ایسی ہی شکست اسی سال سپارٹا کو دی۔ اٹولیا اور سلوسڈ کی سلطنت مل کر 192 قبل مسیح میں روم پر حملہ آور ہوئیں۔ سیلوسڈ کے بادشاہ اینٹی کس سوم کو میگنوسیم زیر سفلس کے مقام پر شکست دینے میں دو سال اور اٹولیا کو شکست دینے میں تین سال لگ گئے۔ سیلوسڈ کی سلطنت کو روم کے حق میں بہت سے علاقے چھوڑنے پڑے اور بھاری تاوان ادا کرنا پڑا۔ اٹولین لیگ کا نہایت مؤثر طور پر خاتمہ ہو گیا۔ آخر کار روم نے ایک زبردست لڑائی میں جو 171 سے 168 قبل مسیح تک چلتی رہی، مقدونیہ کی بادشاہت سے نکلنا پڑا۔ سکندر کی آبائی سرزمین روم کا صوبہ بن گئی۔ اب روم کی شہرت ایک فوجی طاقت کے طور پر اتنی عظیم تسلیم کی جانے لگی کہ روم کے مدبر کی ایک ہی تنبیہ پر سیلوسٹہ کے بادشاہ اینٹوکس چہارم کو 168 قبل مسیح میں مصر سے نکلنا پڑا۔

اس وقت روم کا مقصد یہ تھا کہ بڑے فوجی حریفوں کی طاقت کم کرے۔ اس نے آئندہ سو برس تک خود اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ روم نے اپنی فراست اور

تدبر کے ساتھ فوجی طاقت کی بہ دولت جغرافیائی و سیاسی میدان میں برتری حاصل کر لی تھی۔ اطالوی علاقوں کو قبضے میں لینے کے لیے اس نے معاہدے کیے تاکہ امن کی یقینی ضمانت حاصل ہو۔ پھر کمزور ریاستوں کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگایا گیا۔ روم نے اس حلیف کو چھوڑ دیا جس کی خدمات کی اس کے نزدیک کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ مزید یہ کہ سیاسی طور پر پس ماندہ ریاستوں کے لوگوں کو اس کے آئین میں کشش محسوس ہوئی۔ دہری شخصیت کے نظام کی بدولت مقامی اور شاہی مفادات کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ رواج کے مطابق روم کا متمول حکمران ٹولہ دوسری ریاستوں میں ان کے دولت مندوں کی حمایت کرتا تھا۔ اس سے ان کو مخالف ریاستوں میں ایک مضبوط 'پانچویں کالم' کا تعاون یقینی طور پر حاصل ہو گیا تھا۔ روم کا معاشرہ بجائے خود واضح طور پر امیر اور غریب طبقوں میں بٹ گیا تھا۔ دولت مند اراضی کی ملکیت سے، کسانوں پر ٹیکس لگا کر، سٹے سے اور حکومت سے ملنے والے قرضے کی بہ دولت مال دار ہو رہے تھے۔ چھوٹے کسان جبراً فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے اور ان کے کھیت بے توجہی کی بنا پر دولت مند سٹے بازوں کے تصرف میں چلے جاتے تھے۔ اس طرح کسان ناداروں میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ ٹیوریس گریکس نے اس بے انصافی کا ازالہ کرنے کے لیے133 قبل مسیح میں ایک قانون منظور کروایا، جس کے تحت زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر دی گئی۔ روم کی سینیٹ کے امرا نے اسے قتل کر دیا۔

رئیس طبقے کی حکمرانی کے اس تسلسل نے ایک ایسی معیشت کی بنیاد رکھ دی جو غلاموں کی مشقت، نجی فوجوں اور نادار طبقوں کے رنگروٹوں کی بھرتی پر قائم تھی۔ جنگ میں پکڑے جانے والے غلام ہوتے تھے۔ انہیں بڑے بڑے باغات اور کھیتوں پر محنت کے لیے لگا دیا جاتا تھا، جہاں چوپایوں اور بھیڑوں کی نسل کشی کی جاتی اور زیتون اور انگور کی کاشت ہوتی۔ دوسری صدی قبل مسیح کے اواخر میں سسلی، یونان اور ڈیلوس کے جزیرے میں غلاموں نے بغاوتیں کیں۔ غلاموں کی ایک فوج نے جس کی قیادت سپارٹیکس نامی ایک ماہر تیغ زن کر رہا تھا، اٹلی کے دیہات میں71-173 قبل مسیح میں کئی علاقوں پر چڑھائی کر دی۔ ایک رومی جنرل کیاس ماریس نے جو مشیر کے طور پر کام کر رہا تھا، فاقہ مست لوگوں کی ایک فوج کھڑی کر دی۔ اپنی فوجی خدمت کے عوض وہ ان سے توقع کرتا تھا کہ اس کے مفادات کا خیال رکھیں گے۔ اس طرح انقلابی جنگ باز سرداروں کی حکمرانی کا ایک دور آیا جو180 سے30 قبل مسیح تک برقرار رہا۔ آخر ایک سہ فریقی طاقت نے جس میں عظیم پومپائی، جیولس سیزر اور مارکس کراس شامل

تھے،60 قبل مسیح میں روم کی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ پومپائی نے آرمینیا، شام اور جوڈیا کی فتوحات سے روم کا مقصد پورا کیا، یہاں تک کہ سیزر کے خلاف ایک زبردست جنگ میں ہار گیا۔ کراسس پارتھیئس کے خلاف جنگ میں 53 قبل مسیح میں ہلاک ہوگیا۔ جیولیس سیزر نے اپنی کامیاب فوجی مہمات کی بہ دولت روم کی سلطنت میں توسیع کی اور اسے آلپس کے شمال کے علاقوں تک پہنچا دیا۔ پھر وہ روم کا آمر مطلق بن گیا اور اس حیثیت میں دو سال تک حکومت کرتا رہا، یہاں تک کہ 44 قبل مسیح میں اپنے دو ساتھیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔

ایک نئی تثلیث ابھر کر آتی ہے، مارک اینٹونی ہے، لیپڈس ہے اور سیزر کا متبنیٰ بھتیجا اوکٹیوین ہے۔ اوکٹیوین نے اینٹونی کو اور مصر کی آخری ملکہ قلوپطرہ کو 33 سالِ قبل مسیح میں ایکیم کے مقام پر ایک بحری لڑائی میں شکست دے دی۔ اس نے قلوپطرہ اور جیولیس سیزر کے نوعمر بیٹے سیپیرین کو پہچان لیا اور اسے بھی ہلاک کر دیا گیا۔ اب اوکٹوین جس کو مکمل اقتدار حاصل تھا، پہلا رومن بادشاہ بن گیا۔ اوکیٹوین یا آگسٹس سیزر نے ایک نئی طرز کی رومن حکومت قائم کی، جس کی بنیاد دیوتاؤں کی پرستش پر تھی۔ اس کے ساتھ ایک پیشہ وَر فوج اور سول ملازمین تھے۔ آگسٹس نے پیشہ ور سپاہیوں کو بھرتی کر کے نجی فوجوں کا خاتمہ کر دیا۔ نجی ٹیکس اکٹھا کرنے اور بندوبست کرنے والوں کی جگہ ''سیزر خاندان'' میں غلاموں میں سے اور آزاد کیے جانے والے افراد بھرتی کیے تاکہ وہ حاکم کے ذاتی عملے کے طور پر کام کریں۔ اس نے انکسار سے کام لیتے ہوئے خود اپنا خطاب ''سینٹ کا رکنِ خاص'' اختیار کیا۔ آگسٹس نے شاہ پرستی کو جس کا آغاز اس کے چچا نے کیا تھا، ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ اس کے تین مدارج مقرر کیے جس کے ذریعے شکست خوردہ قوموں کے افراد روم کے شہری بن سکتے تھے۔ روم کی سینیٹ جو ری پبلکن (جمہوریہ) حکومت کی نشانی رہ گئی تھی، روم کے قدیم روایتی آداب کی امین تھی، لیکن حقیقی طاقت بادشاہ کو میسر تھی جسے مسلح افواج کی حمایت حاصل تھی۔ روم کی حکومتوں کو روایتی طور پر اپنے مفتوحہ علاقوں پر حکمرانی کی ذمہ داری، براہِ راست طور پر قبول کرنے میں تامل رہا ہے۔ آگسٹس اور اس کے جانشینوں نے روم کی سلطنت کو اس طرح منظّم کیا گویا خود مختار شہری حکومتوں کی ایک انجمن ہو اور ان کے لیے ایک دوسرے سے جنگ کرنے میں رکاوٹ محسوس ہو۔ روم کی مرکزی حکومت بیرونی دشمنوں کے خلاف مشترکہ دفاع کے لیے مدد دیتی تھی۔ مزید فتوحات سے پرہیز کرتے ہوئے آگسٹس نے سلطنت کی دفاعی سرحدیں قائم کی تھیں۔ اس کی کوشش تھی کہ اپنی سلطنت کی حدود کو ایلبے دریا تک لے جائے، لیکن اسے ناکام ہونا اور صدمہ

اٹھانا پڑا۔ جرمانی قبائل نے ٹٹ برگ کے جنگلات میں تین رومن فوجوں کو 9 ویں صدی عیسوی میں بالکل تباہ کر دیا۔ آخر ڈینیوب دریا کو ہی سرحد تسلیم کرنا پڑا۔ روم کی آبادی میں تخفیف جو پہلی صدی قبل مسیح میں شروع ہوئی تھی، اب فوجی ترجیحات تک محدود رہ گئی۔ 114 اور 117 صدی عیسوی کے دوران میں بادشاہ ٹراجن نے آرمینیا، بابلیبیا اور میسوپوٹامیہ کو فتح کرنے اور پاتھینز سے یہ علاقے چھین لینے کی کوشش کی۔ اس کی مہمات بھی تباہی پر ختم ہوئیں۔ ٹراجن کا جانشین ہائدریان پیچھے ہٹ کر دریائے فرات تک پہنچ گیا۔ جب پارتھین بادشاہ کو اس کے ملازم شاہ پور اوّل نے تخت سے بے دخل کر دیا تو جنوب مشرقی سرحد پر فوجی کشیدگی برقرار رہنے لگی۔ شاہ پور اوّل نے، جس نے ساسانی خاندان کی بنیاد رکھی، روم کی فوجوں کو تین مرتبہ شکست دی اور بادشاہ ویلیریان کو 206 سن عیسوی میں گرفتار کر لیا۔ تاہم روم کے حلیف شہزادہ پالمیاٹرا نے جوابی حملہ کر کے ایرانیوں کو بھگا دیا۔ روم اور ایران کی جنگیں جو 60-337 میں لڑی گئیں، غیر فیصلہ کن رہیں۔

نیرو کی موت کے بعد بادشاہوں کا جیولین خاندان 68 میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ فوجی حکمرانی کے تین عشرے گزرنے کے بعد روم پر پانچ سمجھ دار اور بُردبار بادشاہوں نے حکومت کی، جن کی ملی جلی حکومت 180 صدی عیسوی تک برقرار رہی۔ ان کا آخری حکمران مارکوئس آریلیس فلسفے پر اپنی کتاب مراقبے (Meditations) کے حوالے سے مشہور ہے۔ اس کے

گوشوارہ 4-2 Table: 4-2

رومن سلطنت کے حکمران خاندان

آگسٹس سے نیرو تک	31B.C-68 A.D.
گالبا سے ڈومیشن	68-96 A.D.
نروا سے مارکس آریلیز	96-180 A.D.
کموڈس سے ڈایوکلیشین	180-305 A.D.
کانسٹنٹائن سے تھیوڈوسیس	305-395 A.D.
ہنوریئس سے آگسٹولس (مغربی حکمران)	395-476 A.D.
آرکیڈیئس سے فوکاس (مشرقی حکمران)	395-618 A.D.

مشرقی بازنطینی حکمران

ہیراکلین خاندان	610-717 A.D.
اسوری خاندان	717-867 A.D.
میسی ڈونین خاندان	867-1081 A.D.
کمنینی خاندان	1081-1258 A.D.
پلائیولوگن خاندان	1258-1453 A.D.

بیٹے کموڈس کی حکومت سے مطلق العنان بادشاہوں اور فوجی غاصبوں کی حکمرانی کا آغاز ہوا، وہ بالعموم مسیحیت سے عناد رکھتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کی حکومت ایک یا دو سال رہی۔ ان میں ڈائی کلیشن (Diocletian) 284-305 عیسوی اور کانسٹنٹائن 306-337 مستثنیٰ تھے۔ ان دونوں لائق حکمرانوں نے بغاوتوں اور بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک متحرک فوج تیار کی تھی۔ روم کا سکہ جسے متروک قرار دیا جا چکا تھا، بحال کر دیا اور اراضیات کی دوبارہ پیمائش کروائی اور ٹیکس میں ترمیم و اصلاح کی۔ انہوں نے سلطنت کے نصف مشرقی حصے کے لیے 330 عیسوی میں ایک نیا دارالحکومت قائم کیا۔ اس کا نام کانسٹنٹینی پل پڑ گیا۔ انہوں نے اپنی وسیع سلطنت کو دو انتظامی اضلاع میں بانٹ دیا تھا۔ 250 اور 311 صدی عیسوی میں رومن بادشاہوں نے مسیحیت کو دبانے کی شدید کوشش کی تھی۔ تاہم گیلیریس (Galerius) نے 311 عیسوی میں جب وہ بستر مرگ پر تھا، ایک مسیحی مخالف قانون کو منسوخ کر دیا۔ دو سال بعد کانسٹنٹائن نے مذہبی رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ وسی گوتھس (Visegoths) کے بادشاہ نے 410 عیسوی میں روم پر حملہ کر دیا۔ آخری مغربی حکمران رومولو آگسٹلس (Romulus Augustulus) کو 476 عیسوی میں حکومت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔

ہن اور سیکنڈ نیویا میں دھماکے

مغرب میں روما کی سلطنت نے، جس کا دارالحکومت روم تھا، چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں اندرونی طور پر کمزوری دکھانی شروع کر دی۔ بڑے زمین دار کسانوں کی فالتو زرعی پیداوار ٹیکس وصول کرنے والے سے لے کر اپنے حساب میں ڈال دیتے تھے۔ فوجی ہائی کمان کے قبضے کی بنا پر ملک میں آمریت چھا گئی تھی۔ جب ویسی گوتھس نے 782 عیسوی میں ادریانوپل کے مقام پر روم کی فوجوں کو شکست دی تو روم کی یورپی سرحد شدت سے نامحفوظ ہو

گئی۔ الانک (Alanic) اور اوسٹرو گوتھک قبیلوں کی یورش سے ویسی گوتھس کو روم کے علاقے میں آنا پڑا اور وہ دونوں خود مغرب کی جانب ہنوں کی پیش قدمی کی وجہ سے اپنی مشرقی یورپی آبائی سرزمین سے نکالے جا چکے تھے۔ مشرقی جرمن قبیلے406 عیسوی میں دریائے رائن پر روم کے دفاعی مورچوں کو توڑ کر اندر آ گئے تھے۔ ونڈالوں نے جٹ لینڈ سے سفر کا آغاز کیا اور جنوبی یورپ سے گزرتے ہوئے اسپین پہنچے اور249 عیسوی میں شمالی افریقا جا پہنچے، جہاں انہوں نے ایک بحری سلطنت قائم کر لی۔ اسٹرو گوتھس اور لمبارڈز (Lombards) نے اٹلی میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ اینگلز (Angles)، سیکسن (Saxons) اور جوٹس (Jutes) نے برطانیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ادھر مغربی رومن سلطنت کو وحشی قبائل نے تباہ و برباد کر رکھا تھا۔ دوسری طرف اٹیلا اور اس کے لشکر نے452 عیسوی میں شمالی اٹلی پر حملہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ پوپ لیو اوّل نے اسے آمادہ کر لیا تھا کہ روم پر حملہ نہ کرے۔ اٹیلا، اٹلی سے دست کش ہو کر واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

روم کی شکست سے پہلے چینی معاشرے نے پورے سو سال تک ہنوں کے دباؤ کو برداشت کیا تھا۔316 عیسوی میں سونگ لو(ہُن) کے ایک حملہ آور لشکر اور وحشی قبائل کی یلغار نے مغربی چینی سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور شمالی چین کو متعدد جانشین ریاستوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ آدھی صدی بعد ایک اور ہُن قبیلے نے ڈان اور وولگا دریا کے درمیانی علاقے کے لیے نقل مکانی اختیار کی اور یہاں مغربی ہنگری میں آ کر بیٹھ گیا، جنہوں نے ساسانی بادشاہ فیروز کو 484 عیسوی میں شکست دے کر ہلاک کر دیا اور ایرانیوں سے تقریباً ایک صدی تک خراج وصول کرتے رہے۔ پھر ایرانیوں اور ترکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ انہوں نے ایفتھیلائٹ (Efthalite) سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور ان کے علاقوں کو تقسیم کر دیا۔ وہائٹ ہنس نے455 عیسوی میں ہندوستان کی گپتا سلطنت پر حملہ کر کے اسے پارہ پارہ کر دیا۔ دس سال کے اندر ہی یہ سلطنت ختم ہو گئی، اگرچہ گپتا سلطنت کی باقیات بنگال میں544 عیسوی تک موجود رہیں، ہن جنگ جوؤں نے ہندومت اختیار کیا اور راجپوت اشرافیہ کی صورت میں ان کا وجود سلامت رہا، جو ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع راجستھان کی ریاست میں مقتدر حیثیت کی مالک ہے۔

فرینک کے بادشاہ کلووس (Clovis) نے پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک گالک سلطنت بنانی شروع کی۔ اس نے رائن کے ساحل پر واقع المنی قبیلے کو496 عیسوی میں فتح کر لیا۔ ہسپانوی ویسی گوتھس کو507 عیسوی میں شکست دے دی اور511 عیسوی میں اپنی

وفات سے پہلے پرودسنی کے سوا سارے گال علاقے کو قبضے میں لے لیا تھا۔ اس کے جانشینوں نے تورنگیا اور برگنڈی فتح کر لیے۔ کلووس اور اس کے وارثوں نے جرمن بادشاہوں کے برعکس، جو آریاؤں کا عقیدہ قبول کر چکے تھے، رومن کیتھولک مذہب اختیار کیا۔ کلووس کا میرووجنیئن (Merovingion) خاندان ایک وسیع علاقہ حاصل کرنے کے بعد داخلی طور پر کمزور ہو گیا اور یہ اس دستور کی بنا پر ہوا کہ بادشاہ کی وفات کے بعد اس کے علاقے بہت سے جانشینوں کے درمیان تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ میرووجنیئن خاندان کے منتظم آرنولفنگ (آرنول فنگ) تھے، اور اس حکومت کا کاروبار مؤثر طور پر چلا رہے تھے۔ ان کے ارکان میں سے ایک رکن نے پیپن سوم (Pippin-III) پوپ زکریہ سے درخواست کی تھی کہ سلطنت کے تخت پر اس کے خاندان کے دعوے کو تسلیم کر لیں۔ اس درخواست کا ایک موافق جواب جونہی ملا، پیپن نے میرووجنیئن بادشاہ کو تخت سے معزول کر دیا اور خود اپنی کورولنگیان حکومت قائم کر دی۔ جب لومبارڈز نے اٹلی کے شمال میں راوینا فتح کیا اور روم پر قبضہ کر لینے کی دھمکی دی تو پوپ اسٹیفن دوم نے فرانسک اور پی پن والوں کو حکم دیا کہ اپنی افواج اٹلی بھیجیں اور یوں 756 عیسوی میں لومبارڈ کو ہرا دیا۔

پی پن کا بیٹا چارلس اس وقت فرانک کا بلا شرکت غیرے حکمران بن گیا جب 771 عیسوی میں اس کے بھائی نے جو شریک حکمران تھا، اچانک انتقال کیا۔ چارلس نے جسے آج چارلی میگین کے نام سے پہچانتے ہیں 4-773 عیسوی میں اٹلی کی لومبارڈ سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے 791 اور 805 عیسوی کے دوران میں ہنگری میں آوارس کا صفایا کر دیا۔ اس سے زیادہ فوجی مہم 772 اور 802 کے درمیان سیکسنی کی فتح تھی۔ اس سے چارلی میگن کی سلطنت کا براہِ راست سامنا ڈینز (Danes) سے ہو گیا، جنہوں نے اس کے علاقوں پر بحری جہاز سے حملے شروع کر دیے۔ اس سلطنت میں موجودہ جرمنی کا بیشتر علاقہ فرانس، اٹلی اور بنی لکس ممالک شامل تھے۔ عملاً بنی لکس نے مغربی رومن سلطنت دوبارہ بحال کر دی تھی۔ اس حقیقت کے اثرات میں پوپ میوسوم نے اسے 800 عیسوی میں کرسمس کے دن رومنز کا شہنشاہ کے لقب سے سرفراز کیا۔ چونکہ مشرقی رومن بادشاہ اس لقب کو اپنا حق قرار دے چکے تھے، اس لیے چارلی میگن نے بائزن تیم کو کچھ علاقائی مراعات دیں تاکہ اس لقب پر اس کا اقرار اور رضامندی حاصل ہو جائے۔ اس کی سلطنت میں لکھے پڑھے منظم لوگوں کے دستے کی کمی تھی، لہٰذا چارلی میگن نے نارتھم برئین کے دینی عالم الکوئن اور کچھ دوسرے لوگوں کو مقرر کر دیا تاکہ وہ قصر شاہی میں اور بڑے بڑے کلیسا میں سکول کھولیں۔ گشتی معائنہ کار مقامی اہل کاروں پر نظر رکھتے تھے۔

814 میں چارلی میگن کے انتقال کے بعد ان اہل کاروں نے بڑی طاقت پکڑ لی تھی۔ اس کے وارث لوئی دی پائس (پرہیز گار لوئس) نے اپنے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ وائی کنگ اور شمالی افریقا کے بحری قزاقوں کی وجہ سے مسائل بہت بڑھ گئے تھے۔

نویں اور دسویں صدی عیسوی میں وائی کنگ کا اچانک اُبھرنا، سیکسن کے علاقے میں چارلی میگین کی فتوحات تھیں، کیوں کہ اس سے پہلے یہ علاقہ سکینڈے نیویا کے وحشی لٹیروں اور رومن تہذیب کے درمیان ایک 'بفر' (تصادم کو روکنے والا علاقہ) تھا۔ اس کا پہلا ہدف مسیحی معبد تھے، جو برطانیہ، آئرلینڈ اور فرانس کے ساحل پر تعمیر کیے گئے تھے۔1880 میں روہس کے مہم جوؤں نے بحر بالٹک سے آبی سفر کا آغاز کیا اور روس کے آبی راستوں سے گزرتے ہوئے وہ کیسپئن سمندر تک پہنچ گئے۔ سکینڈے نیویا کے مہم جوؤں کے ایک اور گروہ نے شمالی اٹلانٹک کا سمندر پار کیا۔ وہ گرین لینڈ، آئس لینڈ اور شمالی امریکا میں ون لینڈ تک پہنچے۔ چارلس دی سمپل نے 911 عیسوی میں سکینڈے نیویا کے بحری مہم جوؤں کی اس جماعت کو نارمنڈی کے ساحل کے بارے میں معاملات طے کرنے کی دعوت دی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ مسیحیت قبول کر لیں گے۔ اس طرح کی ایک پیش کش ڈنمارک کے حملہ آوروں کو برطانیہ کے شاہ ایلفرڈ 878 عیسوی میں پیش کی تھی۔ سکینڈے نیویا کے تارکین وطن کو فرانک کا کلچر اور مذہب قابل قبول محسوس ہوا۔ مستقبل کی کئی یورپی اقوام کے بیج اسی عہد میں بوئے گئے تھے، پیرس کی کئی بستیوں نے سکینڈے نیویا کے حملہ آوروں کے خلاف جب 885 اور 887 عیسوی کے درمیان اپنا دفاع کامیابی سے کیا تو موجودہ فرانس کی بنیادیں انہی دنوں میں پڑی تھیں۔ رہوس کے سوئیڈ باشندے نوگورڈ اور خیف میں آباد ہو گئے۔ روس کو انہوں نے ہی یہ نام دیے۔ نارمن کے آبادکاروں کے وارثوں نے 1066 عیسوی میں انگلینڈ پر کامیابی سے حملے کیے۔ برطانیہ کی خاندانی بادشاہت کی تاریخ عام طور پر اسی واقعہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

مشرق میں رومن سلطنت کا تسلسل

جرمنی سے تعلق رکھنے والے وحشی قبائل نے جب روم کی ماتحت مغرب کی بستیوں پر چڑھائی کی تو مشرقی رومن سلطنت جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا، ختم نہیں ہوگئی۔ اس حکومت کے عملے میں پیشہ وَر لوگ شامل تھے، جو بڑے بڑے زمین داروں کے نہیں بلکہ ریاست کے وفادار تھے۔ ان کے پاس کرایے کی فوج نہیں تھی بلکہ حفاظت کے لیے ریاست کے شہری تھے۔ پانچویں صدی عیسوی میں مشرق کے رومن حکمران بڑے لائق منتظم تھے، اور قانونی مصلح تھے،

جنہوں نے ریاست کے مالی امور کو اپنے ہاتھوں میں رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے دارالحکومت کے شہر کے گرد حصار کھینچ رکھا تھا اور وحشی حملہ آوروں کو حکمت عملی کے تحت کچھ رعایتیں بھی دی تھیں تا کہ وہ بھی زندہ رہیں۔ بازنطینہ کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ معروف جسٹانیاں اوّل تھا (565-527)، جس نے ہیگیا صوفیہ کا کلیسا تعمیر کروایا اور رومن قوانین کی اصطلاحات وضع کیں۔ اس بادشاہ نے ونڈالیوں سے شمال مغربی افریقا کا علاقہ ایک بار پھر واپس چھین لیا، اٹلی سے اوستروگوتھ اور دلماٹیا سے باہر نکال دیا۔ اس نے بحیرۂ روم کے علاقے میں رومن بحریہ کی برتری دوبارہ قائم کر دی۔ بہرحال اوستروگوتھ کے خلاف 26 سال کی مہم کے نتیجے میں شاہی خزانہ خالی ہو گیا۔ لیونسٹائن کے صوبوں پر تباہ کن ٹیکس لگائے گئے۔ اوستروگوتھس کے نکالے جانے کے سات سال بعد لمبارڈ قبیلوں نے اٹلی پر حملہ کر دیا۔ 91-572 صدی عیسوی میں وہ جنگ، جو ایرانی سلطنت کے ساسانیوں سلیو اور ابوارز کے خلاف لڑی جا رہی تھی، وہ کسی مخالفت کے بغیر بلقان کے صوبوں میں داخل ہو گئی۔ روم اور ایران کی جنگ کے زمانے میں جو 28-604 عیسوی میں ہوئی، سلاو پھر واپس آ گئے، حالانکہ بعد میں نکالے گئے لیکن اس مرتبہ وہ جم کر بیٹھ گئے تھے۔

اسلامی فوجوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ابوبکر کی سرکردگی میں 638 عیسوی میں مشرقی رومن اور ساسانی سلطنت، بہ یک وقت دونوں پر حملہ کر دیا، جو حالیہ جنگوں کے باعث تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ایرانی سلطنت تباہ ہو گئی۔

مشرقی رومن سلطنت تو بچ گئی، لیکن اسے بہت سے علاقوں کے نکل جانے سے زبردست نقصان ہوا۔ عربوں نے 78-674 عیسوی میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا اور ایک بار پھر 18-717 عیسوی میں کیا لیکن وہ شہر کی دیواروں میں رخنہ نہ ڈال سکے۔ ایک اور فوجی خطرہ بلقان میں سلاو آبادکاروں کی طرف سے تھا، جب کہ ترکی بولنے والے بلغار نے جو دریائے ڈینوب اور بلیک سی کے درمیان کے علاقے پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے، ایک حریف ریاست قائم کر لی تھی۔ اس علاقے میں رومن اور بلغارین، دونوں سلاو کے ساتھ وفاداری کے باب میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ کانسٹنٹائن پنجم بیس سال کی جنگ میں بلغاریہ کی ریاست کو ختم کرنے میں ناکام ہو گیا تھا لیکن بازنطین کی سلطنت نے بعد میں یونانی علاقے میں آباد زیادہ تر سلاوز کو اپنا ماتحت بنا لیا تھا۔ ایک اور طویل جنگ پالیسیا کے عیسائیوں کے خلاف لڑی گئی، جو شمال مشرق میں آباد تھے۔ وقفے وقفے کی ان جنگوں کے نتیجے میں آبادیاں کم ہونے لگیں۔ اس

سے کسانوں کو فائدہ ہوا، جو عربوں کے حملے کے خلاف سلطنت کو بچانے کے لیے سرکاری فوج میں شامل تھے۔ جب سسلی مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا تو مشرقی رومن حکومت کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ سسلی اور بلغاریہ کے مخالفوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ پیدا نہ کرنے دے۔ بہرحال اس نے بحر روم کے علاقے میں کریٹ کو چھوڑ کر اپنے سابقہ مقبوضہ علاقوں کو واپس لینے کی کوشش کی۔

اس انتشار کے دور میں مشرقی رومن سلطنت نے منفرد نوعیت کا ایک کلچر پیدا کیا جس نے یونانی اور سلاو دونوں کے عناصر کو آپس میں جوڑ دیا۔ اس معاشرے نے اس عذاب کو جس سے مشرقی یورپ کی بڑی خلقت وابستہ تھی، بچائے رکھا، لیکن یونانی زبان کے تمام تر استعمال کا حق اپنے لیے محفوظ کر لیا۔ چوتھی صدی عیسوی میں کیپاڈوشین عیسائی پادریوں، سینٹ باسل، نیاسا کے سینٹ گریگوری اور سینٹ گریگوری نازیانزا نے نیا یونانی ادب پیدا کیا، جو آئندہ مصنفوں کے لیے مثال بن گیا۔ شام کے ایک میوری اوماس نے، جس نے مسیحی عقیدہ قبول کر لیا تھا، بازنطینہ کی طرز کا نغمہ اور حمد یہ شاعری مرتب کی تھی۔ قسطنطنیہ کے حاکم اعلیٰ فوٹیس نے عالموں کو تربیت کے لیے یوکرین بھیجا۔ اس طرح نویں صدی عیسوی میں ایک تہذیبی نشاۃ الثانیہ کا ظہور ہوا۔ یوکرین جانے والے علما واپسی میں حروف تہجی کے ساتھ لائے۔ مشنری علما یہاں سے عظیم موریویا (چیکوسلواکیہ) چلے گئے۔ جب فرانک کے کلیسا نے ان پر سختی کی تو وہ بلغاریہ چلے گئے۔ یہاں ایک نئے رسم الخط کو فروغ حاصل ہوا جو پہلے کے حروف تہجی کا آسان متبادل تھے۔ اس رسم الخط کو بعد کے سلاوک نے جو عیسائی ہو گئے تھے، استعمال کیا۔

پہلا ہزار سالہ عیسوی دور ختم کے قریب تھا، تب تک بازنطینی یونانی کلچر اور مذہب پھیل کر شمال میں روس تک پہنچ گئے تھے، حالانکہ اس کے پہلے مستقر سوئیڈز تھے۔ خیف کے شہزادہ ولاڈیر نے 989 میں یہ عقیدہ قبول کیا تھا۔ اب اس نے شاہ باسل دوم کی ہمشیرہ اناّ سے شادی کر لی۔ اس کے تبدیلی مذہب کے نتیجے میں یونان کا فن اور مناجاتیں روس پہنچیں۔

اس دوران میں ٹیکسوں کی جان لیوا شرح اور فصلوں کی ناکامی کی بنا پر کسان اپنی زمینیں بڑے زمین داروں کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ایشیائے کوچک میں رئیس مالکان اراضی نے جن کو کسانوں کی حمایت حاصل تھی، سن 963 اور 1057 عیسوی کے درمیان شاہی حکومت کے خلاف پانچ مرتبہ بغاوتیں کیں۔ حکومت نے سسلی اور کریٹ میں مسلمانوں کے مراکز پر فوج کشی کی اور کرایے کے سپاہیوں کی مدد سے بالآخر بلغاریہ فتح کر لیا۔ تاہم یہ

چالیس سالہ جنگ معاشی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی۔ کسانوں کی غیر مرتب فوج جس نے اپنی مؤثر دفاعی تدبیروں سے سلطنت کی اس خوبی سے مدد کی تھی، اب اُس میں سلطنت کی توسیع کے لیے جنگ کرنے کی تحریک باقی نہیں رہی تھی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، جب رومن حکومت نے سائراکوس پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا کہ نارمنڈی کے مہم جوؤں نے شمالی اٹلی کی کلیدی جگہوں پر قبضہ جما لیا۔ سلجوق ترک جو آرمینیا کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے، انہوں نے 1071 عیسوی میں شاہ راموس چہارم کو قید کر لیا اور ایشیائے کوچک میں اس کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

اب رومن سلطنت کا مشرقی حصہ نارمن عیسائیوں، اس کے ساتھ ہی غزّ (Ghuzz) وحشی قبیلوں اور روم بادشاہت کے سلجوق ترکوں کے حملوں کی زد میں تھا۔ صلیبی جنگ (99-1095) کے نتیجے میں مغربی مسیحی افواج قسطنطنیہ میں داخل ہوئیں۔ شاہ ایلکسس اوّل نے ترکوں کو نکالنے کے لیے ان کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن یورپی شہزادوں کی اصل دلچسپی یروشلم پر قبضے سے تھی۔ ایک لاطینی بادشاہت یروشلم میں 1099 عیسوی میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بعد سو سال سے بھی کم عرصے میں صلاح الدین نے شہر کو واپس چھین لیا تھا۔ تیسری صلیبی جنگ (92-1189) اس کے جواب میں تھی۔ لیکن وہ شہر کو مسلمانوں کے قبضے سے واپس لینے میں ناکام رہے۔ جب قسطنطنیہ میں مغرب کے تاجروں کا قتل عام ہوا تو نارمن فوجوں نے اس کے جواب میں تھیسالونیکا (Thessalonica) کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سربیا اور بلغاریہ نے بازنطینہ کی حکومت کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔ چوتھی صلیبی جنگ (04-1202) کا مقصد اب بدل گیا تھا۔ اب شاہی خاندان کو الٹ دینے کی تدبیر کی گئی تھی۔ وینس اور فرانس کے صلیبی سپاہیوں نے 1204 میں قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے اسے تہس نہس کر دیا اور اچھی طرح لوٹا۔ وینس والوں نے قیمتی زمینوں پر قبضہ کر لیا جب کہ فرانس کا باڈون اوّل قسطنطنیہ کا بادشاہ بن گیا۔ ایشیائے کوچک اور یونان کی شہری ریاستوں نے الحاق ختم کیا اور نیکیا (Nicaea) میں خود اپنی سلطنت قائم کر لی۔ نیکیا کے یونانیوں اور بلغاریہ والوں نے مل کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا اور 1261 میں اسے فتح کر لیا۔

نیکیا کے یونانیوں نے قسطنطنیہ تو واپس لے لیا، لیکن انہیں اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کے عوض ترک عثمانیوں نے ان کے بیشتر ایشیائی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ سربیا بھی یورپ میں ایک بڑی طاقت بنتا جا رہا تھا۔ یہ سب گویا کافی نہ تھا۔ چنانچہ 1347-1341 کے

دوران میں مشرقی رومن سلطنت میں خانہ جنگی پھوٹ پڑی، اس کا سبب عقائد کا اختلاف تھا اور دوسرا سبب بڑے اور چھوٹے مالکانِ اراضی کا تصادم تھا۔ حکومت تباہ ہوگئی، بادشاہ میکائیل ہشتم کو اندازہ ہوگیا کہ اسے مغرب کے عیسائیوں کی مدد درکار ہوگی۔ وہ اور دیگر متعدد جانشین پوپ کے روحانی اقتدار کو تسلیم کرتے تھے، چنانچہ مغربی کلیسا کے ساتھ فلورنس میں ایک اتحاد کا قانون منظور ہوا۔ اس پر بادشاہ کے علاوہ سرکردہ مذہبی عہدے داروں کے دستخط تھے۔ یہ 1439 عیسوی کا ذکر ہے۔

تاہم مشرق کے کٹر مذہب پرست پادریوں نے، اور ایک بڑی اکثریت نے اس معاہدے کو رد کر دیا۔ بیشتر یونانی مغرب کے عیسائیوں کی حاکمیت کے مقابلے میں عثمانیوں کی حکمرانی کو ترجیح دیتے تھے۔ روس کے قدامت پرست حکمران ٹولے نے اس شہری انتظامیہ کو جس نے معاہدے پر دستخط کیے تھے، برطرف کر کے ان کی جگہ ایک روسی کو مقرر کر دیا۔ اس دوران میں روس نے اپنی ناکہ بندی اور بھی سخت کر دی تھی۔ عثمانی ترکوں نے 1451 عیسوی میں جب قسطنطنیہ فتح کر لیا تو مشرقی رومن سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ ترک حکمرانوں نے قسطنطنیہ کے سربراہ کو غیر مسلم برادریوں پر سیاسی اختیارات دے رکھے تھے۔ اس کے بعد یونانیوں نے آئندہ سلطنت عثمانیہ کی سیاسی اور کاروباری زندگی میں ایک قیادت کا کردار ادا کیا تھا۔

پارتھیا، کشن اور ساسانیوں کی سلطنتیں

دوسری صدی عیسوی میں جب کہ رومن طاقت اپنے عروج پر تھی، چار سیاسی سلطنتیں جو آپس میں جڑی ہوئی تھیں، بیشتر پرانی دنیا پر حکمرانی کر رہی تھیں۔ روم کے علاوہ فارس میں پارتھیا باشندوں کی حکومت ہند کے شمال مغرب اور افغانستان میں کشن حکومت اور چین کے مشرق میں ہن حکومت۔ یہ چاروں سلطنتیں شمالی امریکا اور یورپ سے لے کر جنوبی ایشیا اور مشرقِ بعید تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے شمال میں ایک ویرانہ تھا جو سکینڈے نیویا اور جرمنی سے لے کر منگولیا اور سائبیریا تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کے جنوب میں سحارا اور عربستان کے ریگستان تھے، جنوبی اور مشرقی ہندوستان تھا، جنوب مشرقی ایشیا اور چین تھا۔ دور دور تک بسنے والے یہ لوگ ایک دوسرے کے وجود کا محض دھندلا سا تصور رکھتے تھے۔ پارتھیان اور کشن سلطنتیں چونکہ وسط میں تھیں اس لیے ان کا دوسروں کے ساتھ براہِ راست رابطہ تھا۔ ان کے تاجر دور افتادہ

علاقوں کے ساتھ تجارت کے لیے بیچ کے افراد کا کردار انجام دے رہے تھے۔ یہ پہلی تہذیب کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان چاروں میں سے ہر سلطنت پر موروثی بادشاہت قائم تھی، جنہیں مطلق حاکمیت اور اقتدار حاصل تھا۔ ہر سلطنت جنگ جوُ بادشاہتوں کے مابین سیاسی اور فوجی طاقتوں کے استحکام کی نمائندگی کرتی تھی کہ انہوں نے ہی علاقے میں امن اور استحکام قائم کیا تھا، ہنوں کی بغاوت کے ساتھ یہ صورتِ حال ختم ہوگئی،، ہنوں نے تیسری صدی عیسوی میں چین کی مشرقی ہن سلطنت کو تباہ کر دیا اور دو صدیوں کے بعد مغربی روسی سلطنت کو بھی ختم کر دیا۔

ان چاروں میں سے محض چین کی سلطنت رہ گئی تھی جسے سکندر کی فاتحانہ پیش قدمی نے چوتھی صدی قبل مسیح میں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ رومن، پارتھیان اور کشن سلطنتیں یونانی تہذیب کی وارث تھیں۔ یہ تینوں وسیع و عریض علاقے جنہیں سیلوکس نے سکندر سے ورثے میں پایا تھا، جزوی طور پر ٹوٹ کر بکھرتے گئے کیوں کہ سیلوکس انہیں سنبھال نہ سکا۔ اس کے بعد طویل مدت تک یونان کے کلچر کے زبردست اثرات ان جگہوں پر پائے گئے۔ مقامی روایات سے مل کر یہ اثرات ایک عالمی مذہب کی تخلیق میں یگانگت پیدا کرتے رہے۔ بیکٹیریا (شمالی افغانستان) یونانی تہذیب کے عناصر کو قبول کرنے میں سب سے دور تک گیا۔ وہاں موجود کشن سلطنت ایک تہذیبی گڑھ بن گیا، جہاں یونانی فلسفے اور بصری فنون نے مل کر بدھ مت کو ایک ذاتی نمود کا مذہب بنا دیا۔ بدھ مت ماہایانا کی شکل میں دوسری صدی عیسوی کے اندر چین میں داخل ہوا۔

جس طرح روم نے یونانی خاندانوں کے مغربی ملکیتی علاقے فتح کر لیے تھے، اسی طرح پارتھیان اور کشن سلطنتوں نے سیلوکس کی سلطنت پر خانہ بدوشوں کی طرح حملے شروع کر دیے۔ پارنی کے خانہ بدوش ترکمانستان سے ارساکیس (Arsces) کی سرکردگی میں مشرق کی جانب سے اٹھے اور اپنے آپ کو تقریباً 250 قبل مسیح میں سیلوکس کی حکومت سے آزاد کرا لیا۔ انہوں نے ایران کے شمال مشرق میں پارتھیان کی بادشاہت قائم کر لی۔ وہ لوگ زبردست گھڑ سوار تیر انداز تھے۔ پارتھیان نے 141 قبل مسیح میں مِیتھر اڈیٹس کی سرکردگی میں میڈیا اور بابل، دونوں یونانیوں سے چھین لیے۔ انہوں نے سیلوسڈ بادشاہ ڈیمٹرس دوم کو اس وقت قیدی بنا لیا جب اس نے اپنے کھوئے علاقوں کی بازیابی کی کوشش کی۔ ارساسیڈ (Arsocid) خاندان نے اپنا مستقر سٹیسی فون (Ctesiphon) منتقل کر دیا جو تغریز کا ایک دیہی مقام تھا۔ رومن،

پارتھیان کے تیراندازوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ مارکس کراسوس کی قیادت میں ایک فوج 53 قبل مسیح میں میسوپوٹامیہ پر حملے کے دوران میں تباہ ہو گئی۔ 17-114 عیسوی میں ٹراجن نے آرمینیا، میسوپوٹامیہ اور بابل کو فتح کرنے کی کوشش کی جو تباہی سے دوچار ہوئی۔ پارتھیان بھی رومن علاقوں کے اندر پیش قدمی میں ناکام رہے۔ ہاڈریان نے رومی سلطنت کی مشرقی سرحد کو دریائے فرات سے ملا دیا تھا۔ ارساسڈ پارتھیان خاندن کی حکومت 224 عیسوی تک برقرار رہی، یہاں تک کہ اس کے آخری فرماں روا ارتابانس کا تختہ الٹا گیا اور اس کی جگہ فارس کا سردار اردشیر اوّل تخت نشین ہوا۔ اس نے دوسری ساسانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

کشن سلطنت 48 عیسوی میں قائم ہوئی۔ یہ ہندوستان کے شمال مغرب پر ایک اور خانہ بدوش لوگوں کشن کے حملوں سے قائم ہوئی۔ کشن یووشی (yueh-chih) کہلاتے تھے اور بیکٹریا میں رہتے تھے۔ اس عمل کا آغاز 250 قبل مسیح میں سلوسڈ سلطنت سے بیکٹریا کے یونانی گورنر کی علیحدگی کے ساتھ ہوا جس نے اپنی الگ بادشاہت قائم کر لی۔ موریہ خاندان کے زوال سے طاقت کا جو خلا پیدا ہوا تھا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیکٹریا کے یونانیوں نے 200 قبل مسیح کے آس پاس شمالی ہندوستان کے کچھ حصے اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔ اس وقت یونانی شہزادے آپس میں لڑ رہے تھے، ریاستوں کے کمزور ہو جانے کے باعث ساٹھ سال بعد 'ساکا' خانہ بدوشوں نے سلطنت پر یلغار کر دی، جو مغربی چین میں گانسو تک پہنچ گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے قریبی پارتھیان پر بھی حملہ کیا تھا، لیکن انہوں نے ساکا حملہ آوروں کا رخ جنوبی افغانستان کی طرف موڑ دیا، جہاں یونان کی بستیاں تھیں، انہیں روندتے ہوئے حملہ آور رومن سندھ تک پہنچ گئے تھے۔ آخر پارتھیان نے ہندوستان کی ساکا ریاستوں پر اپنی حکومت قائم کر دی۔ 100 قبل مسیح میں یوشی (Yueh-chih) نے بیکٹریا، جہاں ساکا حکمران تھے، پر حملہ کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس قبیلے سے کچھ لوگ پہلی صدی قبل مسیح میں وادئ سندھ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے پارتھوساکا ریاست اور جنوب کی ایک آزاد ساکا ریاست، دونوں کو فتح کر لیا، اس طرح ان کی ریاست میں بیکٹریا اور ہندوکش کے دونوں جانب شمال مغرب کے ہندوستانی علاقے شامل ہو گئے۔ اس کے بعد کی دو صدیوں کے دوران میں کشن سلطنت کی حیثیت ہندوستان اور چین کی تہذیبوں کے درمیان ایک پل کی تھی۔

اردشیر اوّل نے 224 صدی عیسوی میں پارتھیان ارساسڈ کی حکومت ختم کر دی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ فارس کے ساسانیوں نے رومن سلطنت کے مشرقی صوبوں پر حملے کیے، لیکن

آرمینیا کے سوا ہر جگہ سے پس پا ہونا پڑا۔ اردشیر کی فوجوں کے حملے میں کشن سلطنت 241 عیسوی میں ختم ہوگئی، اگرچہ اس کی باقیات وادیٔ کابل میں گیارھویں صدی تک باقی رہ گئی تھیں۔ ساسانی خاندان سیاسی اقتدار میں آنے سے پہلے موروثی طور پر اناہیتا کے پجاریوں میں سے تھا۔ اناہیتا ایرانیوں میں پانی کا دیوتا تھا، بعد ازاں اس کا تعلق اہورامزدا سے ہوگیا، جو زرتشتیوں کا دیوتا تھا اور میگائن مسلک رکھتا تھا۔ میگائن کی شکل میں زَرتشت مذہب ساسانی سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ تاہم ایک اور بڑا مذہب مانیکی ازم (Manichaeism)، شاہ پور اوّل (273-242) عیسوی کے دور میں نمودار ہوا جب ایک ایرانی پیمبر نے جس کا نام مانی تھا، کارتر مسلک کی تبلیغ ریاست کی اجازت سے شروع کی۔ کارتر ایک زرتشتی مبلغ تھا۔ اس نے زرتشتی مذہب کو ساسانی ریاست کا مذہب قرار دیے جانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے شاہ پور دوم کے جانشین بہرام اوّل پر زور ڈالا کہ مانی کو گرفتار کرکے سزائے موت دے دی جائے۔ ساسانی بادشاہ تو خود بھی اپنے آپ کو یونانیوں سے پہلے کی شاہی خاندانی ریاست کے وارث سمجھتے تھے، جنھوں نے فارس کو عالمی طاقت بنا دیا تھا۔ رومن، آرمینین، کشن اور دوسری سلطنتوں پر براہِ راست فوجی حملوں کا مقصد فارس کی سلطنت کی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لانا تھا۔

ساسانی اور رومن قسطنطنیہ تقریباً چار سو سال تک ایک فوجی اور مذہبی جدوجہد میں مبتلا رہیں۔ رومیوں اور ایرانیوں کی جنگ 60-337 عیسوی میں کسی نتیجے کے بغیر ختم ہوگئی۔ رومن بادشاہ 362 عیسوی میں ایران پر حملے کے دوران ہلاک ہوگیا۔ اس کے جانشین جوویان کو رومی فوجوں کے انخلا کی خاطر آرمینیا کے پانچ صوبوں سے دست بردار ہونا پڑا۔ ایران میں آباد عیسائی روم کے پانچویں کالم (سازشی) شمار کیے جاتے تھے۔ روم کی سلطنت میں جو مانیکیز (Manichees) رہتے تھے، یہی سلوک ان کے ساتھ روم والوں کا تھا۔ شاہ پور دوم نے 339 میں عیسائیوں پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ پچاس سال بعد یہ سلسلہ بند کرایا گیا۔ شہنشاہ یزدگرد دوم نے 440 عیسوی سال میں ساری رعایا کو حکم دیا کہ زرتشتی مذہب اختیار کرلیں۔ اس حکم سے آرمینیا کے صوبوں میں کئی بغاوتیں ہوئیں۔ 484 عیسوی سال میں ایفتلائٹ (Ephtalite) ہنز نے سابق کشن سلطنت کے مشرقی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اس لڑائی میں بادشاہ فیروز مارا گیا اور ایرانیوں کو ہنز کی خدمت میں خراج پیش کرنا پڑا۔ اس فوجی تباہی سے ایران میں ایک سماجی انقلاب آ گیا۔ مانی مذہب کا ایک اشترا کی جیسا فرقہ مزدکی کے نام سے نمودار ہوا۔ مزدک کے ماننے والوں نے زرتشت کے پیشواؤں اور دولت مند رئیسوں کی مخالفت میں عام لوگوں کے

اندر بے چینی پیدا کر دی۔ جب بادشاہ کاوَز اوّل (Kavadh-I) نے یہ مذہب اختیار کر لیا تو اس کے پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوا۔

کاوَز کے ایک بیٹے نے جو بعد میں خسرو اوّل قرار پایا، اپنے باپ پر زور دیا کہ مزدکوں کا مذہب چھوڑ دیں، پھر وہ اس فرقے کو کچلنے کی راہ پر چل پڑا۔ چونکہ بادشاہ خسرو اوّل (79-531 عیسوی) نے فوج کی مرکزیت ختم کر دی تھی، اس نے چند اقتصادی اصلاحات کیں، تاکہ ایسے حالات دور ہوں کو مزدکی تحریک کے موجب ہوئے۔ ترکوں کے ساتھ اتحاد کر کے اس نے 67-563 عیسوی میں ایفتلائٹ (Ephthalite) سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔ اوکسس دریا کے ساتھ علاقے کی تقسیم کر دی گئی۔ خسرو نے مشرقی رومن سلطنت کے خلاف جنگ چھیڑ دی جو اٹھارہ سال تک جاری رہی۔ یہ جنگ بہت نامقبول ہوئی۔ اس کے نتیجے میں اس کا بیٹا اور تخت کا وارث ہرمزد چہارم ہلاک کر دیا گیا۔ مشرقی روم کے بادشاہ مارس نے فارس کے غاصب کو سلطنت سے برطرف کر دیا اور خسرو دوم کے بیٹے ہرمزد چہارم کو تخت پر بٹھا دیا۔ پھر بادشاہ مارس ایک بلوے میں مارا گیا۔ اپنے فیض رساں کی موت کا بدلہ لینے کے لیے خسرو دوم نے مشرقی روم کی حکومت پر حملہ کر دیا۔ رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان آخری جنگ 604 سے 628 عیسوی تک ہوتی رہی، لیکن یہ سب سے زیادہ خون ریز جنگ تھی۔ یہ خسرو دوم کی وفات پر ختم ہوئی اور یہ سمجھوتا ہو گیا کہ جنگ سے پہلے جو علاقے جس کے پاس تھے، وہ اصل حکومت کو واپس ہو جائیں گے۔ ساسانی سلطنت اس جنگ سے بہت کمزور ہو گئی تھی، اب وہ اس حالت میں نہیں رہ گئی تھی کہ عرب فوجوں کی یورش برداشت کر سکتی، جنہوں نے 633 عیسوی میں ایران پر حملہ کر دیا تھا۔ 651 عیسوی میں اسلام کی فتوحات مکمل ہو گئی تھیں۔

ہندوستان

ہندوستان کے عرب فاتحین اس سے پہلے کی تہذیب کے ملبے پر ایک نیا معاشرہ تعمیر کر رہے تھے۔ انہوں نے دوسرے ہزار سال قبل مسیح کے وسط میں اس علاقے پر حملہ کیا تھا۔ ایک موروثی ذات پات کا ڈھانچا اس میں طبقات کا تعین کر رہا تھا، برہمن پجاری تمام رسوم پر قادر تھے۔ جن کے بارے میں یقین تھا کہ ایک خوش حال اور صحت مند معاشرے کے لیے ان کی ادائیگی ضروری ہے۔ سنسکرت زبان میں ایک نہایت متمول مذہبی ادب موجود تھا جس میں بھجن، رسوم کی تفصیلات اور شاعرانہ بیانیے، نیز فلسفیانہ مباحث شامل تھے۔ تقریباً 600 قبل مسیح میں خانہ بہ دوش تارکین وطن کی ایک دوسری لہر ہندوستان کے شمال مغرب میں داخل ہو گئی۔

اس وقت سیاسی مرکز ثقل سندھ سے گنگا کی وادی تک پورے ہندوستان میں داخل ہو گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں کا ایک چھوٹا سا گروپ تھا جس پر آریائی جنگ جو حکومت کرتے تھے۔ ان میں دو مضبوط ترین حکومتیں تھیں، ایک کوسالہ (اتر پردیش) کی حکومت تھی دوسری شمال مشرق میں مگدھ (بہار) کی حکومت تھی۔ مگدھ کے راجہ بم بیاسرا نے ایک سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ چھوٹی چھوٹی جنگ جو ریاستوں کا ماحول تھا جس میں مذہبی مفکر مہاویرا اور بدھ گیان دھیان کرتے اور چھٹی صدی قبل مسیح کے اواخر میں لوگوں کے درمیان تبلیغ کرتے۔ ایران کے شہنشاہ دارا اوّل نے 518 قبل مسیح میں حملہ کر کے وادی سندھ کے مغربی حصے پر قبضہ کر لیا۔ 478 قبل مسیح میں شہزادہ وجے گجرات سے کشتی میں سوار سری لنکا پہنچا، جہاں اس نے سنگھالی حکومت قائم کی۔ سکندر اعظم 25-327 قبل مسیح میں وادی سندھ میں دور تک اپنے لشکر کے ساتھ پہنچا اور واپسی میں بہت سی فوجی چھاؤنیاں چھوڑ گیا۔

تقریباً 322 قبل مسیح میں چندر گپت اوّل نے موریہ سلطنت قائم کی اور شمال مغرب میں سکندر جو چھاؤنیاں قائم کر گیا تھا، ان سب کو باہر نکال دیا۔ اس نے مگدھ کی بادشاہت کو فتح کرنے کے لیے چڑھائی کی۔ سیلوکس اوّل نے ہندوستان میں ان علاقوں کو واپس لینے کی کوشش کی، جو اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ لیکن چندر گپت کی فوجوں نے اسے شکست دے دی۔ (سیلوکس نے ہندوستانی حکومتوں سے صلح کر لی۔ پھر اس نے پانچ سو جنگی ہاتھی خریدے تا کہ آئندہ مقدونیہ میں اینٹی جونس اوّل کے خلاف چڑھائی میں کام آئیں) چندر گپت کو اس کے عوض چند یونانی مقبوضہ جات واپس مل گئیں۔ اس کے پوتے اشوک نے 261 قبل مسیح میں کالنگا کی جنوب مشرقی ریاست کو فتح کر لیا۔ اب اشوک کی حکومت میں، تھوڑے سے جنوبی علاقے کو چھوڑ کر سارا برصغیر شامل ہو گیا تھا۔ کالنگا کو شکست دینے کے بعد اشوک کو اچانک اس پر افسوس ہوا، اس نے مزید فتوحات کا ارادہ ترک کیا اور بدھ مت کا ایک عام رکن بن گیا۔ اس نے اپنی باقی عمر بدھ مت کے فروغ اور اخلاقی اصولوں کو پھیلانے پر صرف کر دی۔ اشوک کی حکومت ایک مداخلت کار اور حاکمانہ افسر شاہی کی حکومت تھی، جو اخلاقی اصلاح پر ہمیشہ آمادہ رہتی تھی۔ اس نے مسرفانہ رسموں کو ختم کرنے اور معاشی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اشوک کے بارے میں ہمیں زیادہ تر معلومات پتھر کی تختیوں پر مختلف زبانوں میں کھدی ہوئی تحریروں سے ملتی ہے، جو اس کے علاقوں میں جگہ جگہ رکھی گئی تھیں۔ اشوک کی وفات 232 قبل مسیح میں ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس کی حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ موریہ سلطنت 185 قبل

مسیح میں ختم ہوگئی۔

اس کے بعد ہندوستان مزید پانچ سو برس تک جنگ جو بادشاہتوں کے درمیان تقسیم ہوتا رہا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں یونان کے شہزادوں نے شمالی ہند کے ایک حصے پر قبضہ کرلیا۔ آخر ساکا کے خانہ بدوش لشکر نے ان کے علاقوں پر یلغار کردی۔ کالنگا کی حکومت آزاد ہوگئی اور اس نے فوجی جارحیت شروع کی۔ سنگا حکومت نے، جس کی بنیاد ایک جنگ جو سردار نے آخری موریہ بادشاہ کو قتل کرکے رکھی تھی، بہار، اتر پردیش اور پاٹلی پتر پر قبضہ کرلیا، جو اشوک کا سابق دارالحکومت تھا۔ ایک اور خاندانی بادشاہت آندھرا ہندوستان کے بیشتر جنوبی اور وسطی علاقے پر حکمران تھی۔ ساکا کی چھوٹی ریاستوں نے جو کشن سلطنت کے ماتحت تھیں وادی سندھ کے جنوب میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر قبضہ جما رکھا تھا۔ کشن سلطنت خود شمال مغربی علاقے پر حکمران تھی لیکن یہ سلطنت اور آندھرا کی حکومتیں 284 قبل مسیح تک سب تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد سیاسی عدم استحکام کا ایک دور آیا۔ ہندوستان کی تہذیب اور مذہب اس عہد میں بڑی تبدیلیوں سے گزر رہے تھے۔ سنگا اور کانوا حکومتوں کے زمانے (27-185 قبل مسیح) میں سنسکرت ادب تجدید کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اصل بدھ تعلیمات سے ماخوذ مہایان (Mahayana) بدھ مت، جو نجات دہندہ کہلاتی تھی، فروغ پانے لگی تھی۔ برہمنوں کا اقتدار مستحکم تھا اور ان کے دیوتاؤں کی صف میں نئے دیوتاؤں کا اضافہ ہو رہا تھا۔

چوتھی صدی عیسوی میں ایک بار آور شادی کے نتیجے میں شمالی اور جنوبی بہار دوبارہ متحد ہو گئے تھے۔ اس طرح گپتا خاندان نے 320 عیسوی میں ایک اور چندر گپتا خاندان کی حکمرانی کا آغاز کیا۔ اس کے بیٹے سمدر گپتا اور پوتے چندر گپتا دوم نے جمنا اور گنگا کی وادی میں اپنی مملکت کی توسیع کی اور مغربی ساکا ریاست کو جس کا دارالحکومت اُجین تھا، فتح کرلیا۔ اس سلطنت میں شمالی ہندوستان، مشرق سے مغرب تک شامل تھا، لیکن جنوب میں بندھیا چل پہاڑ سے آگے مملکت کی توسیع نہ ہوسکی۔ اگرچہ علاقے کی وسعت کے لحاظ سے یہ سلطنت، موریہ خاندان سے کمتر تھی، لیکن تہذیبی اعتبار سے اس سے کم ممتاز نہیں تھی۔ گپتا ہندو برہمن تھے، جو دوسرے مذاہب کے معاملے میں رواداری تھے۔ سمدر گپتا نے اپنے دربار میں بہت سے پختہ کار فن کاروں اور عالموں کو اپنے گرد اکٹھا کرلیا تھا۔ ہندوستان کے فن سنگ تراشی، ادب اور جوتش کے علم کو اس کے زمانے میں نئی بلندیاں حاصل ہوئیں۔ سنسکرت کا شاعرانہ ڈراما نگار کالی داس اس زمانے میں زندہ تھا اور اس کا ہم عصر واتسیاین (Vatsyana) کاما سوترا کا مصنف بھی

موجود تھا۔ منو کے قوانین جو تقریباً 400 عیسوی میں لکھے گئے تھے، ہندوخواتین میں کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں۔ شطرنج کا کھیل اس زمانے کی ایجاد ہے اور معروف ''عربی'' ہندسے پہلی بار استعمال کیے گئے۔ 455 اور 544 صدی عیسوی کے درمیان سفید ہنوں کے حملوں نے تہذیبی لحاظ سے اس شان دار معاشرے کو تہس نہس کر دیا۔ اگرچہ اس میں ایک بار پھر تھوڑی سی روشنی راجا ہرش کے دورِ حکومت میں، ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں، آ گئی تھی۔

گپتا خاندان کی حکومت ہندوستان میں آخری دیسی حکومت تھی۔ اس کے بعد کا قرینہ یہ تھا کہ بیرونی حملہ آور مغرب کی سمت سے آتے تھے اور برصغیر ہند میں دور تک پھیلتے جاتے تھے اور ہندو کلچر میں مدغم ہو جاتے تھے۔ ہنز نے آکسس جیکارٹس (Oxus Jakartes) کے دوآبے پر لشکر کشی کی۔ جب فارس والوں اور ترکوں نے 67-563 عیسوی میں شمال میں ان کی بادشاہت ختم کر دی تو بہت سے ہنز ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے، جہاں ان کے وارث وہ راجپوت تھے، جو موروثی شہزادے کہلائے۔ شہنشاہ ہرش نے 12-606 عیسوی میں شمالی ہندوستان کو ایک بار پھر متحد کیا، لیکن اس نے جنوب کی طرف پھیلنے کی کوشش کی تو چلوکیا خاندان (Chalukya) کے پال کشن دوم نے 620 عیسوی میں اسے شکست دے دی، جسے ہندوستان کے جنوب مشرق میں پالاوا خاندان نے 642 عیسوی میں شکست سے دوچار کیا۔ اس تمام عرصے میں تامل بولنے والا پانڈیا خاندان ہندوستان کے مختصر سے جنوبی حصے پر قابض رہا۔ ہندوستان میں ہجرت کرنے والے ہنز اپنے ساتھ ہندو اور بدھ تہذیب جنوب مشرقی ایشیا اور انڈونیشیا تک لے کر گئے۔ جب ایک ہندوستانی رسم الخط تبتی زبان میں پہنچا اور ماہایانہ بدھ مذہب کے متن کو تبتی زبان میں منتقل کیا گیا تو تبت بھی ہندوستان کے تہذیبی دائرے میں شامل ہو گیا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک چینی سفارت کار کی اشتعال انگیزی پر تبت کی فوج نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور اس میں وہ کامیاب رہی۔ اس کا مقصد ہرش کی موت کے بعد 647 عیسوی میں ایک غاصب کو سزا دینا تھا، لیکن وہ خود ہندوستانی کلچر کی ''قید'' میں آ گئی۔

گوشوارہ 3-4　　Table: 4-3

پہلی تہذیب کی تاریخ کے اہم واقعات

فاراؤہ نارمر شمالی اور زیریں مصر کو متحد کرتے ہیں	C. 3000 B.C
فاراؤہ چیوپ بادشاہت کا آغاز کرتے ہیں	C. 2589 B.C

پیپی لز کی موت سے پرانی مصری بادشاہت کا خاتمہ	C. 2420 B.C.
لاگاش کے اروکا جینا سمیرین بادشاہت تخلیق کرتے ہیں	C. 2378 B.C.
لوگالزاگیسی اروکا جینا کی بادشاہت کو فتح کرتے ہیں	C. 2371 B.C.
اکاد کا بادشاہ سارگون اول سمیریوں کو فتح کرتا ہے	C. 2340 B.C.
گوتاین سارگون خاندان کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں	C. 2230 B.C.
ار۔نمو کا قانونی ضابطہ طے پاتا ہے	C. 2100 B.C.
مصری وسطی بادشاہت کا آغاز	C. 2040 B.C.
حمور بی سلطنت بابل کا حکمران بنتا ہے	C. 1792 B.C.
کسایٹ بابل میں اپنی خاندانی بادشاہت کی بُنیاد رکھتے ہیں	C. 1732 B.C.
ہیکساس قبائل مصر پر حملہ آور ہوتے ہیں	C. 1720 B.C.
حِتی بابل کو چھین لیتے ہیں	C. 1595 B.C.
احموس اول ہیکسیوں کو مصر سے نکال باہر کرتا ہے	C. 1570 B.C.
آریا ہندوستان پر حملہ کرتے ہیں	C. 1500 B.C.
میکینیان یونانی کریٹ کے محلات کو تباہ کر دیتے ہیں	C. 1400 B.C.
رعمسیس دوم حِتیوں کے ساتھ معاہدہ امن پر دستخط کرتا ہے	C. 1270 B.C.
یونان میں میکینان کے محلات چھین لیے جاتے ہیں	C. 1200 B.C.
نئی مصری بادشاہت کا تختہ اُلٹ دیا جاتا ہے	C. 1087 B.C.
چین میں چاؤ بادشاہ شانگ خاندان کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں	C. 1027 B.C.
داؤد یبوسیوں سے یروشلم پر قبضہ کر لیتا ہے	C. 1000 B.C.
روم کی بُنیاد	753 B.C.
اسیریا کا تگلاتھ پلیسیر سوم بابلونیا کو فتح کرتا ہے	745 B.C.
بابل اور میداس کے لوگ نینوا کو تباہ کر دیتے ہیں	606 B.C.
فاراوہ نیکو کو نبوکدنیزر شکست دیتا ہے	605 B.C.
فارس کا بادشاہ سائرس دوم میدیا کو فتح کرتا ہے	550 B.C.
سائرس دوم سلطنت فارس کی بنا ڈالتا ہے	539 B.C.
فارس کا کمائسس مصر کو فتح کرتا ہے	525 B.C.

یونانی یورپ پر فارس کا حملہ پسپا کر دیتے ہیں	480 B.C.
اسس کے میدان میں سکندر، داریوس کو شکست دیتا ہے	333 B.C.
سکندر کی وفات	323 B.C.
سلیوکس نیکاتور بابل پر قبضہ کر لیتا ہے	311 B.C.
چندر گپت ہندوستان میں سلیوکس کو شکست دے دیتا ہے	303 B.C.
آرسیکیس اول پارتھی بادشاہت کی بُنیاد رکھتا ہے	247 B.C.
شیہہ ہوانگ تائی چینی شہنشاہیت تشکیل دیتا ہے	221 B.C.
ہنی بال کنائی کے میدان میں رومیوں کو شکست دیتا ہے	216 B.C.
عظیم دیوارِ چین پر تعمیراتی کام کا آغاز	214 B.C.
رومی میسی ڈون کے فلپ خامس کو شکست دیتے ہیں	197 B.C.
تیسری پیونک جنگ کے بعد کارتھیج تباہ	146 B.C.
تبریس گراشیس کا قتل	133 B.C.
(غلام) سپارٹیکس کی بغاوت کو رومی کچل دیتے ہیں	71 B.C.
مارکس کراسس کو پارتھی مار دیتے ہیں	53 B.C.
پومپئی کو جیولیس سیزر مقامِ فارسلس پر شکست دیتا ہے	48 B.C.
جیولیس سیزر کا قتل	44 B.C.
انتھونی اور کلیوپیٹرا کو اوکٹیوین شکست دیتا ہے	31 B.C.
جرمن تین رومی افواج کو نابود کر دیتے ہیں	9 A.D.
ہن بادشاہت کا خاتمہ	200 A.D.
اردشیر فارس کی ساسانی بادشاہت کی بنا ڈالتا ہے	227 A.D.
چندر گپتا اول گپتا بادشاہت کی بُنیاد رکھتا ہے	320 A.D.
کانسٹنٹائن اول شہر قسطنطنیہ کی بُنیاد رکھتا ہے	330 A.D.
وِسیگوتھ بادشاہ الارک روم پر قبضہ جما لیتا ہے	410 A.D.
ایفتھالائٹ ہن ہندوستان پر حملہ آور ہوتے ہیں	470 A.D.
مغرب میں آخری رومی بادشاہ معزول	476 A.D.
چین میں سوئی بادشاہت کی تشکیل	581 A.D.

ہندوستان میں بادشاہ ہرش کی وفات	647 A.D.
تائی سنگ چین کا بادشاہ بنتا ہے	627 A.D.
سلیمان قسطنطنیہ پر قبضہ میں ناکام رہتا ہے	718 A.D.
چنگیز خان بے جنگ (پیکنگ) پر قبضہ کر لیتا ہے	1214 A.D.
منگولوں کے انخلا کے بعد منگ بادشاہت کی تخلیق	1368 A.D.
ترک خلافت کا قسطنطنیہ پر قبضہ	1453 A.D.
منگ بادشاہت کو مانچو نکال باہر کرتے ہیں	1644 A.D.
آخری چینی بادشاہ معزول	1912 A.D.
لیگ آف نیشنز کی پہلی میٹنگ	1919 A.D.
انجمن اقوام متحدہ کی تشکیل	1945 A.D.
نیورمبرگ میں جنگی جرائم کے ٹربیونل کا قیام	1946 A.D.
انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کا اجرا	1948 A.D.

گپتا سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کی سیاسی تاریخ پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب علاقائی درجہ تہذیبی اور ریاستوں کی کثرت ہے۔ دسویں صدی تک پانڈے اور پلاوا بادشاہتیں بالادست طاقتیں تھیں۔ چولا حکومت نے، جس نے پلاوا کو 897 عیسوی میں شکست دی۔ جنوب وسطی علاقے پر قبضہ کر لیا اور تین صدیوں تک قابض رہی۔ جب مسلمان شمال مغرب کی سمت سے ہندوستان کے علاقے پر قدم جما رہے تھے، اس وقت ہندوستان کو دوبارہ متحد کرنے کا ان کے پاس بہترین موقع تھا، تاہم شمال میں چلوکیہ نے ایک طویل جنگ میں چولا سلطنت کو روکے رکھا، یہاں تک کہ دونوں حکومتیں اپنے وسائل اور توانائی گنوا بیٹھیں۔ اس سے مسلمانوں کے لیے پیش قدمی کا راستہ کھل گیا۔ ہرش راجہ کی وفات کے بعد ہنز حملہ آوروں کی نسل کے وارث راجپوت خاندان تھے، جنہوں نے شمالی ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔ مہاراشٹر میں چلوکیہ خاندان دکن (جنوبی مرکزی علاقے) پر چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے 752 عیسوی تک حکومت کرتا آیا تھا، تاآنکہ ان کی حکومت کو اشراکوٹہ نے جو پہلے ایک معاون ریاست تھی، ختم کر دیا۔ یہ خاندان بھی اس وقت تک برسرحکومت رہا، جب تک 973 عیسوی میں تائلا دوم نے اس کا تختہ نہیں الٹ دیا اور چلوکیہ سلطنت دوبارہ قائم کر دی۔ شمالی ہندوستان میں آٹھویں صدی میں دو حکمران خاندان نمودار ہوئے۔ ایک راجستھان کے پراتری (Pratriparas)

دوسرے بنگال کے پالاس۔ ان کی حکومتیں گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی تک برقرار رہیں۔

مسلمان فوجیں جنوب مشرقی ایشیا پر یلغار کر رہی تھیں۔ 711 عیسوی میں وہ ہندوستان پہنچ گئیں اور نشیبی وادی سندھ پر قبضہ کر لیا۔ ہندو راجاؤں نے انہیں باہر نکال دینے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ غزنی کے ترک امیر نے 991 میں ہندوستانی راجاؤں کی ایک متحد طاقت کو شکست دے دی اور مسلمانوں کی ریاست میں توسیع کی۔ اب اس میں درۂ خیبر کا مشرقی علاقہ شامل ہو گیا تھا۔ اس کے جانشین محمود نے علاقے میں لاہور تک توسیع کر دی۔ اس نے گنگا و جمنا کے علاقے اور گجرات تک حملے جاری رکھے۔ پھر افغانستان کے غوری، جنہوں نے 1010 عیسوی میں اسلام قبول کیا تھا، غوری خاندان کی سلطنت قائم کر دی۔ مسلم افواج نے گنگا و جمنا کے میدانی علاقے اور بنگال کو 1192 اور 1202 عیسوی کے اندر فتح کر لینے کے بعد اپنی فتوحات مکمل کر لی تھیں۔ اس کے بعد محمد غوری نے اپنے ایک غلام کو نائب بنا کر حکومت کے لیے اس کا تقرر کر دیا۔ اس کی حکومت تب تک قائم رہی، جب تک خوارزم کے حکمران نے جو سلجوق ترکوں کے سابق ماتحت تھے 1215 عیسوی میں ان کی خاندانی حکومت کا خاتمہ نہیں کر دیا۔ اگرچہ ہندوستان منگولوں کی تباہ کن یورش سے محفوظ رہا، تاہم منگولوں کے خود اختیار کردہ وارث تیمور لنگ نے 99-1398 میں دہلی کو تاراج کر دیا اور اسی ہزار باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے دکن کو فتح کر لیا تھا اور دارالحکومت کو دلی سے دکن میں لے جانے کی ایک کوشش کی تھی۔ دکن کی اسلامی ریاستیں، آزاد مملکتیں تھیں، جن پر بہمن خاندان حکمران تھا۔ یہ حکمران 1482 اور 1512 عیسوی کے درمیان پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان میں سے متعدد ریاستوں نے ایک اتحاد قائم کر کے 1555 عیسوی میں وجیانگر کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔

تیمور لنگ کا ایک وارث بابر تھا۔ بابر نے 1525 عیسوی میں افغانستان سے شمالی ہندوستان پر حملہ کیا اور وہاں مغل خاندان کی حکومت قائم کر دی۔ بابر کے بیٹے کو ہندوستان سے نکال دیا گیا تھا، لیکن وہ 1555 میں ایک بار پھر کامیابی سے ہندوستان واپس آ گیا۔ ہمایوں کے بیٹے اکبر نے سلطنت میں توسیع کی، ایک مستعد انتظامیہ قائم کی اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں مفاہمت کو فروغ دیا۔ اکبر کے بعض دوسرے وارثان تخت نے اپنی رعیت کے ساتھ اتنی نرم دلی کا رویہ اختیار نہیں کیا، اورنگ زیب نے غیر مسلموں پر ایک بار پھر جزیہ نافذ کر دیا، ایک سکھ گورو

کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور راجپوتوں میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی۔ اس نے بھی دکن کی مسلمان ریاستوں اور دور افتادہ جنوبی خطے پر مغل حکمرانی کو مسلط کر دیا۔ پھر ایک جوابی حملہ ہندوؤں کی طرف سے مرہٹہ فوجی دستوں کی صورت میں سامنے آیا۔ اس نے مغل علاقے فتح کر لیے اور اپنے لیڈر شیواجی کے ماتحت ایک ہندو حکومت قائم کر لی۔

مغل سلطنت 1707 میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد بڑی تیزی سے منتشر ہونے لگی۔ برطانیہ اور فرانس ہندوستان میں تجارتی بالادستی کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ 1757 میں پلاسی کی جنگ میں فرانس کی شکست اور رابرٹ کلائیو کی کامیابی نے فیصلہ برطانیہ کے حق میں کر دیا۔ اب برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی عملاً بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکمران تھی۔ انہوں نے 65-1757 میں مغل سلطنت کی جانب سے مال گزاری وصول کرنے کی ذمہ داری اختیار کر لی تھی۔ ایک صدی بعد ہندوستان کی حکومت تاجِ برطانیہ کو منتقل ہو گئی۔ مشرق بعید کا چینی معاشرہ 221 قبل مسیح میں پہلی سیاسی سلطنت کے قیام کے بعد دو ہزار برس تک ہندوستان کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ سیاسی اتحاد کا مظاہرہ کرتا رہا۔ بادشاہت سے پہلے کی خاندانی حکومتیں، زیاشانگ اور مغرب میں چاؤ حکومت 711 قبل مسیح تک برقرار رہیں۔ یہ شمال مغرب میں قائم تھیں اور قریبی ہمسایہ ریاستوں پر ان کی بالادستی تھی۔ چاؤ خاندان جس کا دارالحکومت اوپانگ تھا 256 قبل مسیح تک حکمران رہا۔ اس عرصے میں سلطنت کے گردونواح میں بہت سی ریاستیں پروان چڑھتی رہیں۔ چاؤ حکمران کی حیثیت تقریبات کے لیے محض رسمی رہ گئی تھی۔ جب مرکزی حکومت کا اپنی ماتحت ریاستوں پر اختیار نہ رہا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنے لگیں۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد 300 سے گھٹ کر 20 رہ گئی۔ 506 قبل مسیح تک لویانگ شہر کے گرد سات بڑی ریاستیں رہ گئی تھیں۔ 506 سے 221 قبل مسیح کے دوران میں تین سو سال تک وہ مکمل قبضے کی خاطر آپس میں لڑتی رہیں۔ اس دور کو ''جنگ جُو ریاستوں کا دَور'' کہا جاتا ہے۔ اتحاد بنتے رہے اور ٹوٹتے رہے۔ 453 قبل مسیح کے بعد ریاستوں نے اپنے موروثی عہدے داروں کو برطرف کر کے اہل اور باصلاحیت افراد متعین کیے اور یوں اپنی فوجوں کی اصلاح کی۔ جی ان کے شہزادہ ہین (Hein) نے کسانوں کے طبقے کو فوج میں شامل کیا۔ پہلے گھوڑے گاڑیوں (رتھوں) میں بیٹھے ہوئے امرا مقابلہ کرتے تھے۔ ان کی جگہ فوجی دستوں نے لے لی۔ آخری مرحلے میں 230 اور 221 قبل مسیح کے دوران میں ان کی بادشاہت نے تمام مخالفوں کو زیر کر لیا۔

ہورنگ ٹی چی ان پہلا چینی شہنشاہ تھا، اس نے قانونی فلسفے کو قبول کیا اور کہا کہ قوانین نافذ کر کے معاشرے کی اصلاح کرے گا۔ اس شہنشاہ نے موروثی اشرافیہ کی جگہ عہدے داروں کا تقرر کیا۔ صوبائی نظم و نسق کا ایک نظام نافذ کیا۔ معیاری اوزان اور پیمائش کے پیمانے مقرر کیے۔ چینی رسم الخط کا معیار مقرر کیا۔ شمالی سرحدوں کی حفاظت کے لیے دیوارِ چین کی تعمیر شروع کی اور ایک مرکزی سول ملازمت قائم کی۔ اس کی حکومت نے ایک دائرہ کار بنا کر کسانوں کو اراضی کی ملکیت اور منتقلی کا اختیار دیا۔ اس کی فوج نے خاص وضع کی کمان اور تیر حاصل کیے اور رتھ کی جگہ گھڑ سوار دستے مقرر کیے۔ ہوانگ ٹی نے اپنی اصلاحات کے مطابق تمام مکاتب کے فلسفے کی کتابیں، قانون کی کتابوں کے سوا جلا ڈالیں اور یہاں تک کہا کہ ان کے عالموں کو زندہ دفن کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک متحدہ قوم وجود میں آئی، جو واضح اصولوں کی بنیاد پر منظم ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایک قومی دفتر شاہی کے قیام اور مخالف مکاتب فکر کو کچل دینے سے وہ عناصر ناراض ہو گئے۔ جو اس سے پہلے مراعات اور اختیارات کے مالک تھے۔ جنگ کی وجہ سے کسانوں کی آبادی کم ہو گئی تھی۔ ان پر مزید سختی ٹیکس اور بیگار کی تھی۔ چی ان سلطنت جو بہت بلند عزائم رکھتی تھی، صرف تیرہ سال باقی رہی۔ پہلا بادشاہ 210 قبل مسیح میں انتقال کر گیا۔ وہ ان دنوں معائنہ کرنے نکلا تھا۔ ایک سال بعد عام شورش پھوٹ پڑی جس کا مقصد پرانے نظام کی بحالی تھا۔ اب جو خانہ جنگی ہوئی تو لیو پانگ اس میں فاتح قرار پایا۔ اس نے ہن خاندان کی بنیاد رکھی۔ پہلے بادشاہ کی پالیسیوں کو تبدیل کرنے کی بجائے اس نے انہی پالیسیوں کو اعتدال کے ساتھ جاری رکھا۔ لیو پانگ نے جاگیریں ختم کر دیں اور حکم دیا کہ سب سے بڑا بیٹا ہی نہیں بلکہ باپ کے مرنے کے بعد اس کے سبھی بیٹے اراضی کے وارث ہوں گے۔ اس نے قانون پرستوں کو رد کر دیا۔ پھر پہلے تو تاؤ فلسفے کو فروغ دیا، پھر کنفیوشس کے فلسفے کو بڑھاوا دیا۔ لیو پانگ نے حکم دیا کہ تمام اضلاع اپنے ذہین ترین نوجوانوں کو انتظامی عہدوں کے لیے دارالحکومت بھیجیں۔ ان کا تقرر ایک امتحان میں کامیابی کے بعد ہو گا۔ اس کے بعد شہنشاہ وو۔ ٹی نے کنفیوشس کے کلاسکس کو امتحان میں کامیابی کی بنیاد قرار دیا۔ یہ ڈھانچا ایک حکومتی انتظامیہ کی بنیاد قرار پایا اور بعد میں آنے والے شاہی خاندانوں تک ان کے کام آتا رہا۔ اگرچہ لیو پانگ نے کمتر حیثیت کے رئیسوں کو دوبارہ تعینات کر دیا، لیکن ان کا یہ انعام دیانت دارانہ سرکاری نوکری کے عوض تھا، جسے منسوخ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اصل طاقت ایک طرف شہنشاہ کے ہاتھ میں تھی، دوسری طرف کنفیوشس کی افسر شاہی کے ہاتھ میں۔ افسر شاہی کے بہت سے

الگ الگ محکمے تھے، ان کی کارگزاری ایک دوسرے پر حاوی ہو جاتی تھی، اس سے محاسبے اور توازن کا نظام قائم تھا، یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی ہدفِ تنقید بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے ایک عہدے دار ''محتسب'' کے نام سے موجود تھا۔ چین کے شاہی خاندانوں کی فہرست یہاں ایک خاکے (4-4) میں دی گئی ہے۔ ہن خاندان جس کی بادشاہت کی بنیاد لیو پانگ نے رکھی تھی، وہ دو حصوں مغربی ہن (141-31 قبل مسیح) اور مشرقی ہن (220-25 قبل مسیح) کے ادوار میں تقسیم ہو گیا۔ کنفیوشس کے فلسفہ دان عہدے داروں نے پہلے دور میں اپنے آپ کو ایک مراعات یافتہ طبقے کے طور پر مستحکم کیا۔ انہوں نے شاہی حکومت کو مؤثر انداز سے اپنی گرفت میں رکھا اور یہ فیصلہ کرنے کی ذمہ داری اپنے پاس رکھی کہ حکمران خاندان کو کیا اب بھی آسمانی تائید حاصل ہے۔ مزید یہ کہ کنفیوشس کے ان عہدے داروں نے سرکاری حیثیت استعمال کرتے ہوئے کسانوں سے زمینیں چھین کر اپنے آپ کو مال دار کیا۔ جیسا کہ روم کے معاشرے میں تھا کہ خود کاشت والے کسان جب دورانِ جنگ میں اپنی اراضی سے غفلت برتتے تو وہ زمینیں مال دار سٹے بازوں کو دے دی جاتیں۔ ہن خاندان کے تحت کسانوں کو حکومت کے لیے ایک مہینے تک بیگار کرنی پڑتی تھی اور دو سال تک لازمی فوجی خدمت انجام دینی ہوتی تھی۔ کنفیوشس مالکانِ اراضی کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس نے کسانوں پر مزید بوجھ ڈال دیا تھا۔ 6 قبل مسیح میں ایک نیا شاہی فرمان جاری ہوا، جس کے تحت ملکیت اراضی کی حد مقرر کر دی گئی، لیکن عہدے دار جاگیردار اس امر پہ نظر رکھتے تھے کہ شاہی فرمان پر عمل درآمد نہ ہونے پائے۔

شاہی خاندان کا ایک رشتے دار وانگ مانگ تھا۔ اس نے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا اور زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی۔ کنفیوشس کی افسر شاہی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ پھر کسانوں کی فوجیں ''سبز لکڑہارے'' اور ''سرخ ابرو'' نکل آئے۔ انہوں نے شان ڈانگ صوبے میں بغاوت کر دی۔ ایک طاقت وَر جاگیردار اور جنگ باز کوانگ وو نے 25 عیسوی میں ہن خاندان کا اقتدار بحال کروا دیا اور کسانوں کی بغاوت کو کچل دیا۔ چونکہ اس کا دارالحکومت چنگن سے لویانگ منتقل کر دیا گیا تھا، اس لیے وہ مشرقی ہن خاندان سے موسوم ہوا۔ کنفیوشس کے عہدے داروں کا اقتدار بہ دستور قائم تھا۔ پھر اس پر حیرت نہ ہو گی کہ وہی مسائل جو مغربی ہن خاندان کو درپیش ہو گئے، کسانوں پر لگان کی شرح بڑھا دی گئی۔ شاہی ملازمت کے لیے امتحان میں بے ایمانی کی جاتی تھی۔ ایسے میں بہت سے کسانوں نے بڑے مالکانِ اراضی کی جاگیروں میں پناہ لی، باقی جنوبی چین کی طرف بھاگ گئے۔ تاؤ فلسفے کے ایک

معالج نے 184 عیسوی میں ملک گیر کسانوں کی ایک بغاوت منظم کی۔ اس بغاوت کا نام یلو ٹربن (پیلی پگڑی) تھا۔ یہ بغاوت نو ماہ تک جاری رہی، یہاں تک کہ بڑے زمین داروں اور فوجیوں کے ایک اتحاد نے اسے کچل دیا۔ مشرقی ہن سلطنت تین بادشاہتوں میں بٹ گئی، جن پر 23-220 عیسوی میں جنگ باز حکومت کرتے تھے۔

گوشوارہ 4-4 TAble: 4-4

حکمران چینی خاندان

1500-1028 قبل مسیح	شانگ خاندان (بادشاہت سے پہلے)
1027-249 قبل مسیح	چاؤ خاندان (بادشاہت سے پہلے)
481-221 قبل مسیح	جنگ آزما ریاستوں کا زمانہ
221-206 قبل مسیح	چی ان خاندان
206 قبل مسیح، 220 عیسوی	ہن خاندان
221-589 عیسوی	چھ خاندان (وقفوں کے دوران)
581-618 عیسوی	(سوئی خاندان)
618-906 عیسوی	تانگ خاندان
907-960 عیسوی	پانچ خاندان (وقفوں کے دوران)
960-1279 عیسوی	سونگ خاندان
1280-1368 عیسوی	یوان (منگول) خاندان
1368-1644 عیسوی	منگ خاندان
1644-1912 عیسوی	چی انگ (مانچو) خاندان

پھر ایک عام بدامنی شروع ہوئی جو تین صدیوں سے زیادہ عرصے تک برقرار رہی۔ ماہایانہ بدھ مت چین میں داخل ہوا۔ جنوبی علاقے کی دلدل والی گرم آب و ہوا میں آبادی کا رخ اس طرف بڑے پیمانے پر ہو گیا۔ چینی بادشاہت مختصر عرصے کے لیے متحد ہو گئی تھی۔ (عیسوی 80-265) لیکن دس سال بعد پھر ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد خانہ بدوش وحشیوں نے شمالی چین پر حملہ کر دیا اور وہاں اپنی بادشاہتیں قائم کر لیں۔ چن خاندان کی ایک شاخ نے (مشرقی)

چن خاندان کی حکومت دوبارہ قائم کر دی۔ اس علاقے پر پانچ شاہی خاندان حکومت کرتے رہے، ان میں شمالی ویت نام بھی شامل تھا۔ انہوں نے شمال کے وحشیانہ حملوں کا مقابلہ کیا۔ ٹی اوبا ''وائی'' خاندان نے 439 عیسوی تک شمالی چین کی دوسری تمام بادشاہتوں کو فتح کر لیا تھا۔ اس کے قبائلی سردار بڑے مالکانِ اراضی بن گئے۔ وائی شہنشاہ نے خاصے بڑے پیمانے پر زرعی اصلاحات نافذ کیں۔ ہر تندرست آدمی کو کم سے کم رقبے کا ایک قطعہ اراضی دیا گیا اور کسان تنظیمیں اجتماعی طور پر ٹیکس کی ادائیگی کی ذمہ دار قرار دی گئیں۔ تاہم جنوبی چین کو فتح کرنے کی مسلسل ناکام کوشش کے بعد 535 عیسوی میں وائی خاندان کا تختہ الٹ دیا گیا۔ سوئی خاندان کے بانی سوئی وین ٹی نے 589 عیسوی میں ملک کو متحد کر دیا۔

سوئی خاندان صرف 37 سال تک حکمران رہا۔ سوئی یانگ ٹی نے ایک بڑی نہر کی تعمیر کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ یہ نہر یلو (yellow) اور یانگ سی دریاؤں کو آپس میں ملاتی تھی۔ جبری بیگار کے لیے جب اس کے مطالبے بہت بڑھ گئے تو کسانوں کی بغاوتیں اور خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ جس کے دوران میں شہنشاہ کو اس کے نجی محافظوں نے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد لی یان اور اس کے بیٹے نے ٹی آنگ خاندان (618-906 عیسوی) کی بنیاد رکھی۔ جو بلاشبہ اس وقت تک چین کی سب سے شان دار حکومت تھی۔ ٹی آنگ بادشاہوں نے، ہن کی طرح سوئی پروگرام پر عمل جاری رکھا، لیکن معتدل رفتار کے ساتھ۔ ان کے دارالحکومت کا شہر ژیان کے قریب واقع چنگن تہذیبی طور پر گہما گہمی اور تخلیقی سرگرمیوں سے بھرپور تھا۔ آٹھ لاکھ انسانوں کا یہ شہر، شہریت کا ماحول رکھتا تھا۔ ٹی آنگ کے دور کی شاعری، خطاطی اور مجسمہ سازی نے اپنا کلاسیکی اظہار حاصل کر لیا تھا۔ تجارتی سرگرمیاں خوب پھیل پھول رہی تھیں۔ ریشم کی بُنائی، ظروف سازی، جہازوں کی تعمیر اور کاغذ سازی نے اعلیٰ درجے کے فن کی سطح حاصل کر لی تھی۔ کوریا اور جاپان کے دانش وَر جوق در جوق ٹی انگ دارالحکومت میں اکٹھا ہوتے اور ایسی تہذیبی نوعیت کی اشیا جیسے چاپ اسٹک اور کمونو ملبوسات ساتھ لے جاتے تھے۔ جاپانیوں نے تو نارہ میں اپنے دارالحکومت کے لیے اس کا ایک نمونہ 710 عیسوی میں تیار کیا تھا۔

لی یوان کے منجھلے بیٹے نے جو ٹائی سونگ کے نام سے مشہور ہوا، اپنے دو بھائیوں کو قتل کر دیا اور شاہی تخت کی خاطر اپنے باپ کو معزول کر دیا۔ تاہم اپنے باپ کی حکومت کا غاصب، وہ ایک لائق اور ذہین حکمران تھا، جس نے 649 میں اپنی وفات تک حکومت کی۔ ایک نوجوان اور جاہ پرست عورت وو (wu) جو ٹائی سونگ کے حرم میں داخل ہوگئی تھی، نئے شہنشاہ

کی داشتہ بن گئی اور پھر پانچ سال بعد ملکہ بن گئی۔683 عیسوی میں جب شہنشاہ نے انتقال کیا تو وہ نے اپنے جواں سال بیٹے کو تخت حکومت پر بٹھایا، پھر اسے معزول کر کے دوسرے بیٹے کو بٹھا دیا اور آخر میں وہ خود حکمران بن گئی۔705 عیسوی میں اس کی حکومت کا تختہ الٹا گیا۔ ٹانگ خاندان ملکہ کے پوتے سوان سونگ کے دورِ حکومت میں اپنے تہذیبی عروج کو پہنچا جس نے 713 سے755 عیسوی تک حکومت کی، تاہم اس کی فوجی اور سیاسی طاقت کو زوال آنے لگا۔ عرب فوجوں نے 751 عیسوی میں چینیوں کو سمرقند کے قریب شکست دے دی۔ شمالی صوبے کے فوجی گورنر این تو شان نے755 میں مرکزی حکومت سے بغاوت کر دی، اور چینی آبادی کو نو سال کے اندر غارت کر دیا۔ ٹی انگ خاندان اگرچہ کمزور ہو گیا تھا، پھر بھی اس نے آئندہ150 سال تک حکومت کی۔780 میں زرعی ٹیکس کے نظام نے حکومت کی مالی حالت کو مستحکم کر دیا۔ کنفیوشس کے عالموں کے ایک نئے کاڈر نے چینی قوم کو انارکی کے اس مختصر زمانے میں تباہ ہونے سے بچا لیا۔ کنفیوشس اور تاؤ کے ماننے والوں نے بدھ مت اور باہر سے آئے ہوئے دوسرے مذاہب پر حملے کیے۔

نویں صدی عیسوی کے اواخر میں بھاری ٹیکسوں کے نفاذ اور خانہ بربادی نے کسانوں میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی۔ زہودِن نامی ایک جنگ جُو سردار جب907 عیسوی میں چانگ رین میں داخل ہوا اور شہنشاہ کو برطرف کر دیا تو اس خاندان کی حکومت ختم ہو گئی۔ پانچ حکمران خاندانوں کے اس دور میں مسلسل جنگوں نے معاشرے کو بری طرح تباہ کر دیا تھا۔ دوسرا حکمران خاندان سونگ آدھی صدی کے بعد آیا۔ شاہی محافظ دستے کے کمانڈر چاؤ کوانگ نے بغاوت کی اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ کو جب شمال و جنوب کے کھیتان اور تنگوت وحشی قبائل سے حملوں کا خطرہ لاحق ہوا تو اس نے خراج ادا کر کے صلح کر لی۔ مرکزی حکومت نے آئندہ کی فوجی بغاوتوں کے روکنے کے لیے علاقائی فوجی کمان کو مستحکم کیا۔ وانگ این شیہہ (86-1021) ایک توانا اور باہمت ناظم تھا۔ اس نے متعدد اصلاحات کیں۔ شاہی ملازمت کے لیے امتحانات کا طریقہ اس نے دوبارہ شروع کیا۔ کسانوں کو کم شرح سود پر قرضے دیے۔ جبری بیگار کا نظام ختم کر دیا۔ زمین پر ٹیکس کی اصلاح کی اور کسانوں کی غیر منظم فوج کو واپس لایا۔ سونگ عہد میں ثقافتی شان و شوکت اسی طرح بحال رہی جیسی ٹی انگ کے زمانے میں تھی۔ جب جورچن کے وحشی قبائل نے1126 عیسوی میں کیفنگ کے دارالحکومت سونگ کو فتح

کر لیا تو بادشاہ کے وہ علاقے جو یانگ سی دریا کے شمال میں تھے، ہاتھ سے نکل گئے۔ سونگ خاندان جنوبی چین میں حکومت کرتا رہا تا آنکہ منگول فوجوں نے قبلائی خاں کی سربراہی میں باقی تمام علاقہ 79-1273 عیسوی تک فتح کر لیا تھا۔

منگول وہ پہلے وحشی قبائل تھے جنہوں نے پورا چین فتح کر لیا تھا۔ قبلائی خاں نے اپنا دارالحکومت منگولیا میں قراقرم سے 67-1260 میں پیکنگ منتقل کر دیا۔ منگول فوجوں نے جنوبی سلطنت کے دارالحکومت پر قبضہ کر کے یہ علاقہ بھی فتح کر لیا۔ اس کے دفاع میں بارود بھی استعمال کیا گیا۔ منگولوں کا یوان خاندان جس نے 1260 سے 1368 عیسوی تک حکومت کی، تمام چینی حکمران خاندانوں کے مقابلے میں سب سے کم نمائندہ حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا حکمران طبقہ عام چینیوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ یہ خانہ بہ دوش لوگ شہری بودو باش والے چینیوں کو حقارت سے دیکھتے تھے، انہوں نے شہری طور طریقے بھی اختیار نہیں کیے۔ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں انہوں نے شمال چین کے سارے زراعتی ڈھانچے کو تباہ و برباد کر دیا۔ چنانچہ لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ یوآن بادشاہوں نے اعلیٰ انتظامی عہدوں کے لیے کنفیوشس کے دانشوروں کی بجائے غیر ملکیوں کا انتخاب کیا۔ وہ مسلمان ملکوں کے سفارتی عہدے داروں اور مغرب والوں کا پرتپاک خیر مقدم کرتے تھے۔ یوآن خاندان کسی قدر غیر معمولی تھا کہ اس نے اپنی سرحدیں چین کی حدود سے آگے پہنچا دی تھیں۔ منگول کا علاقہ منچوریا اور شمالی ویت نام سے شام اور ہنگری کے قریبی مقامات تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس کی بحری مہمات جاپان اور جاوا کے خلاف ناکام ہو گئیں۔ مقامی بغاوتیں چین کے اندر 1340 عیسوی کے عشروں تک پھیل گئی تھیں۔ حریف جنگ آزماؤں میں چوزیان چنگ تھا، جس نے منگ خاندان کی بنیاد رکھی۔ 1382 تک اس نے منگولوں کو چین سے نکال دیا۔

منگ خاندان نے چینی معاشرہ کا پرانا اسلوب بحال کر دیا۔ شاہی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر کے لیے وہی کنفیوشس کی کلاسیکی فکر سے واقفیت کا طریقہ اور اس کے امتحان میں کامیابی کی شرط نافذ ہو گئی۔ اس خوف سے کہ منگول طرز کا حملہ دوبارہ نہ ہو جائے، منگ بادشاہوں نے شمال مغرب کے خانہ بہ دوش قبائل پر کڑی نظر رکھی۔ شہنشاہ ینگ لو (24-1403) نے ان کے خلاف پانچ فوجی مہمات کیں۔ ایک منگول سردار نے مختصر مدت کے لیے پیکنگ کا محاصرہ کیا، لیکن اس کی دیواروں میں رخنہ نہ ڈال سکا۔ منگ فوجوں نے 1414 عیسوی میں انام (ویت نام) کو دوبارہ فتح کر لیا لیکن چودہ سال بعد یہ قوم پھر آزاد ہو گئی۔ اس کے بعد کوریا اور

تبت، چین کے باج گزار رہے۔ پرتگال اور ہالینڈ نے جنوبی چین میں اپنی تجارتی چوکیاں قائم کیں۔ شاہی عدالت میں یورپ کے عالموں اور مشنریز کا خیر مقدم کیا جانے لگا۔ شہنشاہ ینگ لو نے ایک زبردست انسائیکلوپیڈیا چین کی ثقافت کے بارے میں لکھے جانے کا منصوبہ منظور کیا، جو گیارہ ہزار جلدوں پر مشتمل تھا۔ اس نے بحری جہازوں کا ایک بہت بڑا بیڑا پورے بحر ہند کی بندرگاہوں میں1405 اور1433 عیسوی کے دوران الگ الگ مہمات کی صورت میں پہنچا۔ اس کے بعد آنے والے بادشاہ گوشہ نشین اور غیر ملکیوں سے نفرت کرنے والے تھے۔ وات لی (1573-1620) شہر ممنوعہ کے داخلی علاقوں میں پس پا ہو کر بیٹھ گیا اور شہر کا انتظام ایک ہیجڑے کے حوالے کر دیا۔ آخری منگ بادشاہ نے خودکشی کر لی تھی۔ جب1644 میں مانچو کی فوجوں نے پیکنگ پر حملہ کیا۔

آخری شاہی خاندان، مانچو یا چی انگ، شکاریوں کے ایک گروہ کو اقتدار میں لے آیا۔ یہ جرچ لوگ منچوریا سے تھے۔ سترھویں صدی کے آغاز میں جرچ لوگوں کے ایک سردار نورحاچی نے ان قبائل کو جو پہلے بٹے ہوئے تھے، متحد کر دیا اور ایک نہایت منظم فوج کی مدد سے منچوریا کا بیشتر علاقہ جیت لیا۔ اس کے بعد نورحاچی نے1616 میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ مینگ چینی میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔1644 میں ایک ینگ جنرل نے بغاوت کو دبانے کے لیے منچوریا سے مدد لی۔ وہ شمالی چین میں یلغار کی صورت میں داخل ہوئے۔ جلد ہی پیکنگ پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ مانچو کی فوجوں نے1675 اور1683 کے درمیان منگ کی باقی ماندہ فوجوں کو دبا دیا، جو پس پا ہو کر جنوب کی طرف چلی گئیں۔ نئے حکمران خاندان نے چینی طرزِ حکومت کو برقرار رکھا۔ لیکن جرچ لوگوں نے اپنے مقتدر ہونے کی بنا پر خود کو چینیوں سے دور رکھا۔ دو بادشاہوں، کیانگ سی (1661-1722) اور چین منگ (1736-1796) نے فوجی اور سیاسی قائد کی حیثیت اس عہد پر اپنی بالادستی قائم رکھی۔ مانچو کے عہد میں چینی حکومت نے اپنے علاقے پر زارِ روس کی پیش قدمی کو روکے رکھا، تیوان فتح کر لیا اور مغرب کے اثرات کی حوصلہ شکنی کی۔ تاہم یورپ والوں نے چین میں تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک انہوں نے سلطنت کو سیاسی طور پر بے اثر بنا دیا تھا۔ آخری چینی بادشاہ ہنری یو ای جس نے1908 سے1912 عیسوی تک حکومت کی تھی۔1974 عیسوی میں کمیونسٹ دورِ حکومت میں وفات پائی۔

مشرق اور جنوب مشرقی ایشیا

وہ قومیں جو مشرق اور جنوب مشرقی ایشیا کی حدود میں نمودار ہوئیں، وہ تہذیبی طور پر ہندوستان اور چین دو مرکزی طاقتوں کے دائرہ اثر میں ہیں۔ ہندوستانی تہذیب تجارت، آبادیوں کی آمدورفت اور مذہب کے ذریعے پرامن طور پر آس پاس کے علاقوں میں پھیل گئی۔ پانچویں صدی عیسوی میں ہُنس کی لائی ہوئی غارت گری اور گپتا حکومت کے دوران ترکِ وطن کرنے والوں کا سلسلہ پھیل گیا، چنانچہ ہندوستان کا دائرۂ اثر بھی پھیلتا گیا۔ وہ بہت سے لوگ جو پلاوا بادشاہت سے نکل کر بھاگے تھے، وہ اپنے ساتھ گرانتھا رسم الخط بھی لے گئے۔ چینی کلچر چین کی سیاسی طاقت کا زیادہ اظہار تھا۔ اس کے زیرِ اثر علاقے فوجی فتوحات یا چینی تہذیب کے اثر سے آئے۔ چین کے طفیلیوں میں کوریا، جاپان اور شمالی ویت نام شامل ہیں۔ ہندوستان کے دائرے میں سیلون، برما، تھائی لینڈ، ملایا، کمبوڈیا اور انڈونیشیا آتے ہیں۔ ملائیشیا اور جنوب مشرق میں اسلامی تہذیب کا اثر نمایاں ہے۔ تبت ان دونوں طاقتوں کے درمیان ہے، اسے سیاسی طور پر چین نے اپنے اثر میں لے لیا ہے، اگرچہ اس پر ہندوستانی مذہب کا اثر زیادہ ہے۔

ہندوستانی مہم جوؤں نے 192 عیسوی میں ایک ہندو بادشاہت چمپا (جنوبی ویت نام) میں قائم کی تھی۔ ہن بادشاہ نے انام ویت (شمالی ویت نام) کو پہلی صدی قبل مسیح میں اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ بی سی چمپا بارھویں صدی تک ایک آزاد ملک تھا۔ بعد میں وہ کھمیر سلطنت کا باج گزار بن گیا۔ شمال میں انام کی سلطنت نے 1471 میں اسے فتح کر لیا۔ شمالی ویت نام کے لوگ چین کے زیرِ اثر ماہایانہ بودھ تھے۔ تانگ حکومت کے خاتمے تک وہ چین کا حصہ تھے۔ یوان اور لہنگ بادشاہوں نے اسے دوبارہ فتح کیا۔ 1428 میں اسے اپنی آزادی واپس مل گئی۔ کھمیر کی سلطنت کو کمبوڈیا میں نویں اور بارھویں صدیوں کے دوران دیوتا بادشاہوں کی خاندانی مملکت کے تحت طاقت اور عروج حاصل ہوا۔ اس کی خاص یادگار آنکور واٹ کے مقام پر ایک مندر کے سلسلے کی تعمیر ہے۔ اسے سوریا ورما دوم (1150-1113) نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کی مشرقی سرحد کی جانب ٹائی بادشاہت ہے۔ جس نے 1350 اور 1360 کے درمیان کھمیر ریاست کو تباہ کر دیا۔ یہ تائی، مغربی چین میں ینان لوگوں کی نسل سے تھے۔ جنہوں نے جنوب کی طرف ہجرت کی اور 1350 عیسوی میں ایوتیا کے نام سے ایک منظم اور مضبوط حکومت قائم کی۔ انہوں نے کمبوڈیا، اس کے نیچے برما اور آبنائے ملایا کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا۔

تھائی لینڈ کے مشرق میں برمی قبائل نے جو شمال مغرب سے ترک وطن کر کے آئے تھے، برما کے مقامی مان لوگوں کو اپنا محکوم بنا لیا اور 1044 میں ایک غیر مذہبی حکومت قائم کر لی۔ منگولوں نے اسے 1287 میں تباہ کر دیا۔

جنوب مشرقی ایشیا کے ان معاشروں کے برعکس، جن کی بنیاد زراعت پر ہے، انڈونیشی جزائر کے لوگوں کا ذریعہ روزگار، بنیادی طور پر تجارت پر ہے۔ ہندوستان اور چین کے درمیان سفر کرنے والے سمندری جہازوں کو ملاکا یا سنڈا کی آبنائے سے ہو کر گزرنا پڑتا جو ساترا کے انتہائی مخالف سمت میں واقع ہیں۔ سری وجے کی ساترا سلطنت نے اپنے علاقائی بحری حدود میں تجارتی جہازوں کو روک کر خوش حال ہو گئیں۔ وہ ان جہازوں پر ٹیکس لگاتے تھے۔ ساتویں اور نویں صدی عیسوی کے درمیان یہ اس علاقے کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ ہندوستان کے چولا اور جاوا کے باشندے بڑے اہم حریف تھے۔ شلندرا خاندان کے بادشاہوں نے آٹھویں صدی تک جاوا پر حکومت کی۔ ان کی یادگار بورو بندر کی پہاڑی پر تعمیر کردہ ایک بودھ مجسمہ ہے۔ ان بادشاہوں کی جگہ ہندو سجیا خاندان برسر اقتدار آیا۔ مشرقی جاوا کی سنگوساری حکومت جو نویں صدی عیسوی میں عروج پر پہنچی، انڈونیشیا کے توسیع شدہ علاقوں میں تیرھویں صدی عیسوی تک برسر اقتدار رہی۔ منگولوں نے 1293 میں جاوا پر اس وقت حملہ کیا، جب کہ اندرونِ ملک بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ متوفی بادشاہ کے داماد وجے نے باغیوں کو کچلنے کے لیے ان کی مدد کا خیر مقدم کیا اور بعد میں سازشی طریقے سے خود انہی پر پلٹ پڑا۔ جب منگولوں کو شکست ہوگئی تو وجے نے ماجاپاہت سلطنت کی بنیاد رکھی جو چودھویں صدی میں خاصے بڑے علاقے میں پھیل چکی تھی۔ 1403 میں ایک شیلندر شہزادے نے جس کا نام پرمیشور تھا، ایک ماجاپاہت شہزادی سے شادی کر لی اور ملاکہ شہر کی بنیاد رکھی اور جب اس نے اسلامی مذہب اختیار کیا تو ملاکہ اسلام کی تبلیغ کا مرکز بن گیا۔

چینی شہنشاہ ہن وو-ٹی نے 8-1909 قبل مسیح میں کوریا کے علاقے تک فوجی چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ تیسری صدی عیسوی میں جب مشرقی ہن سلطنت ختم ہوگئی تو وہ چوکیاں توڑ دی گئیں۔ تاہم کوگوریو کی شمالی ریاست نے ماہایانہ بودھ مت اختیار کیا اور 372 عیسوی میں چینی طرز کی پبلک انتظامیہ کو رواج دیا۔ پانچویں اور چھٹی صدیوں کے درمیان میں بہت سے کوریائی باشندے جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے اجداد چینی تھے، ترک وطن کر کے جاپان چلے گئے۔ ساتویں

صدی میں ٹی انگ بادشاہوں نے شیلا بادشاہوں کی مدد سے کوگوریو اور پاکچی کی ریاستوں کو فتح کر لیا۔ بعد میں شیلا بادشاہوں نے چینیوں کو نکال باہر کیا۔ مقامی حکومت کے تحت کوریا کے اتحاد کے باوجود چینی معاشرت وہاں ترقی کرتی رہی۔ ماہایانہ بودھ مت اور چینی رسم الخط دونوں نے اس عہد میں جڑیں پکڑ لی تھیں۔ نویں صدی میں شیلا سلطنت ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد کوریو خاندان، جس نے کیفیوشس کے مذہب کے مقابلے میں بودھ مت کو دبانے کی کوشش کی، کوریا پر 1213 عیسوی میں منگولوں کی آمد تک حکومت کرتا رہا۔ آخر میں 1392 عیسوی میں ای (Yi) خاندان برسر اقتدار آ گیا۔ یہ حکومت 1910 تک برقرار رہی۔ کوریا کی 'راہبانہ' بادشاہی نے جو مانچو چین کی باج گزار تھی، ساری دنیا سے عملاً الگ تھلگ رہتے ہوئے اپنا وجود برقرار رکھا۔

جاپان ٹی انگ خاندان کے دور میں متحد ہوا، اس کی سلطنت کا دارالحکومت پہلے نارا تھا، اس کے بعد کیوٹو ہو گیا۔ انہوں نے حکومت کا چینی نمونہ اختیار کیا لیکن جاپان میں تعلیم یافتہ افراد اتنی بڑی تعداد میں دست یاب نہیں تھے جو مرکزی حکومت کے عملے میں شامل ہو کر اسے مؤثر طور پر چلاتے۔ اس لیے صوبائی حکومتیں طاقت کا مرکز بن گئیں۔ مزید یہ کہ فیوجی داڑا خاندان اور بودھ پجاریوں نے بادشاہ کے اختیارات میں رخنہ اندازی کی تھی۔ ادھر فیوجی داڑا نے خود اپنی جاگیردارانہ حکومتیں پورے ملک میں قائم کرنے کی کوششیں کیں، جن کی صوبائی اشرافیہ نے مخالفت کی۔ طویل خانہ جنگی کے بعد منیا موٹو خاندان نے اپنے مخالفوں کو شکست دے دی۔ ان کے سردار یوری ٹومو منیا موٹو نے ما کترا میں فوجی آمریت قائم کر دی جو 1185 میں شوگونیٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نے شہنشاہیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ ایک متوازی حکومت کا سربراہ تھا جس کے ہاتھ میں حقیقی طاقت تھی۔ جنگ جو سرداروں کے اس نئے خاندان نے عدالتوں کی اصلاح کی اور معاشرے میں امن قائم کیا۔ انہوں نے ایک تہذیبی ابھار کو بڑھاوا دیا اور جب منگولوں نے 1274 اور 1281 میں جاپان پر بحری طاقت کے ساتھ حملہ کیا تو انہوں نے منگولوں کے حملوں کو پسپا کر دیا۔ شہنشاہ گوڈیگو نے 1331 میں اس حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ چنانچہ شوگونیٹ کو کویوتو میں اشیکاگو خاندان میں منتقل کر دیا گیا۔ ان کی حکومت دو سو سال بعد ختم ہو گئی۔ کیوٹو کے گلی کوچوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

سولھویں صدی کے وسط کے آغاز میں تین جنگی سرداروں نے شوگونیٹ کو بحال کیا

اور ملک میں امن قائم کیا۔ پہلے، اوڈانو یوناگا نے دوسرے جنگی سردار کے ساتھ جنگ میں کامیابی کے بعد جو کو یوٹو کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا، اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس نے بیس سال حکومت کی۔1582 میں اسے قتل کر دیا گیا۔ نو یوناگا کے ایک ماتحت ہیڈ وشی نو یوٹو نے اس کے قتل کا بدلہ لینے کی ٹھانی۔1590 میں شوگن بننے کے بعد اس نے کوریا پر حملہ کر دیا۔ بعد میں اس کا ارادہ جنگ خاندان پر حملے کا تھا۔ اس حملے کو پس پا کر دیا گیا۔ ہوڈیشی نے اپنے طاقتور دشمنوں کے خلاف بڑی چالاکی سے کام لیا اور عیارانہ حکمت عملی اختیار کی۔ اس نے تمام غیر سمورائی باشندوں کے لیے حکم صادر کیا کہ بدھا کا ایک پُرشکوہ دھاتی مجسمہ بنانے کے لیے اپنی تلواریں دے دیں اور عیسائی مشنریوں کو حکم دیا کہ بودھ سپاہیوں سے جنگ کریں۔ ہیڈ وشی اپنے بیٹے کو جانشین بنانا چاہتا تھا، لیکن اس کی وفات کے بعد اس کے ایک معاون ٹوکوگاوا لیوسو نے بالادستی حاصل کر لی۔ وہ شوگن کا دارالحکومت ٹوکیو لے گیا۔ اس نے دیگر سمورائی باشندوں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے انہیں حکم دیا کہ اپنی رہائش دونوں جگہ رکھیں۔ اس طرح ان کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ آخر میں اس نے پرتگالی مشنریوں کو جاپان سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس بندوبست کے نتیجے میں250 سال تک امن قائم رہا جب کہ جاپان کا وجود ساری دنیا پر بند تھا۔ تب ایک امریکی امیر البحر میتھو پیری نے جولائی1853 میں بندوقوں سے مسلح ایک بحری بیڑہ ساتھ لیا اور ٹوکیو جا پہنچا۔ اس نے حکم دیا کہ شوگن کو قوم کے لیے کھول دیا جائے۔ شاہی خاندان کی حکومت1868 میں بحال ہوگئی۔

کولمبس سے قبل کا امریکا

ہرنینڈ دکورٹس نے1519-21 عیسوی میں میکسیکو کی ازتک سلطنت کو فتح کرنے کے بعد ایک طویل عرصے کے دوران میں ریاست کو جنگ پسند بننے سے روک دیا تھا۔ دونوں امریکا کی خاص تہذیبیں ایک طرف میکسیکو اور مرکزی امریکا میں مرکوز تھیں اور دوسری طرف جنوبی امریکا کے بحرالکاہلی ساحل پر۔ پہلے ایک ہزار سالہ قبل از مسیحی زمانے میں اولمک اور چیوں معاشروں نے ان دونوں علاقوں کو آپس میں ملائے رکھا۔ (دونوں) امریکا کی پہلی عظیم سلطنت مایا گوئٹے مالا اور میکسیکو کے بری علاقے یوٹاکن میں فروغ پا رہی تھی۔ اس کا آغاز عیسیٰ کے زمانے میں یا غالباً اس کے تین صدیوں کے بعد ہوا۔ اس کا دارالحکومت ٹوٹی ہاکن

میکسیکو وامریکا کا سب سے بڑا شہر اسپین کی فتح سے پہلے تک تھا۔ مایا کے باشندوں کی امتیازی خصوصیت ریاضی اور فلکیات کے علوم میں ان کی مہارت اور فن تھے۔ مایا کا کلچر مضافات کی جنگوں میں بھی برقرار رہا، جب کہ اس کے روایتی مراکز خالی ہو چکے تھے۔ جنوبی امریکا کے دو شہروں، الکوڈرس ہواری اور بولودیا میں تو تیاہونا کو 600 عیسوی میں اپنی اپنی سلطنت تعمیر کرنے لگے۔ انہوں نے خط استوا سے شمالی چلی تک اپنے درمیان دو ہزار میل کے ساحلی مقبوضہ جات پر تسلط قائم کیا تھا۔ یہ سلطنتیں دو صدیوں تک قائم رہیں۔ میسوامریکا کی کلاسیکی مایا تہذیب تقریباً 900 عیسوی تک پہنچ کر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کی نمایاں تہذیب اس علاقے میں زیپوتک تہذیب تھی، جو میکسیکو کے جنوب میں اوکسا کا صوبے میں قائم تھی۔ اس کا دارالحکومت میکسیکو شہر کے عین شمال میں واقع تولا کا شہر تھا۔ ازتک زبان میں ٹولٹک کے معنی ہیں، ''ماہر کاریگر'' جس سے ان لوگوں کی فنی ہنرمندی کا پتا چلتا تھا۔ دارالحکومت ٹولٹک کی زینت ان کے بہت سے مندروں، محلات اور احرام کے کھنڈر اور آثار ہیں۔ تولا شہر کے بانی ٹوپل زن کو اس کے سیاسی مخالفوں نے برطرف کر دیا۔ وہ مشرقی ساحل کی طرف فرار ہو گیا۔ ایک روایت مشہور تھی کہ یہ جلاوطن بادشاہ ایک روز سمندر سے پردار سانپ دیوتا کوئٹزل کوٹل بن کر واپس آئے گا۔ دراصل ایک فاتح نے مایا زبان میں اس نام سے یوکاٹن کے ساحلی علاقے میں ایک چھوٹی سی سلطنت 987 عیسوی میں قائم کی تھی، جو 1224 عیسوی تک برقرار رہی۔ ایزٹک باشندے شمالی میکسیکو کے ریگ زار سے بارھویں صدی عیسوی میں ترک وطن کر گئے اور تقریباً 1325 عیسوی میں لیک ٹیکس کوکو کے مغربی کنارے پر آباد ہو گئے۔ یہاں انہوں نے اپنے دفاعی اسباب کے تحت جھیل کے وسط میں ایک ملبے پر وینس جیسا ایک شہر آباد کیا۔ یہ ٹینو چٹلیان یا ئیو میکسیکو کہلایا۔ جنوبی امریکا میں بہت سے بڑے شہر، جن میں چان چین اور کوئز مان کو شامل تھے، اپنی سیاسی طاقت استعمال کرتے ہوئے 1000 اور 1430 عیسوی کے درمیان ''شہر سازی'' کے عہد میں داخل ہو گئے۔

جب ازٹک باشندوں کے قائد نے دو ہمسایہ شہری ریاستوں کے ساتھ فوجی اتحاد قائم کیا تو ازٹک شہریوں نے 1430 عیسوی میں ایک سلطنت کی تعمیر کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ اس کے بعد نوے سال کے اندر ازٹک کے وفاق نے تیس شہری ریاستوں کو فتح کیا۔ ان کی جنگوں کا مقصد لوٹنا، خراج وصول کرنا اور مذہبی رسوم کی خاطر قیدی اکٹھا کرنا تھا، جن کی انسانی

قربانی کے سلسلے میں ضرورت ہوتی تھی۔ سیاسی طور پر کوئی منظم معاشرہ قائم کرنا ان کا مقصود نہ تھا۔ کیوں کہ ازٹک لوگوں کے عقیدے کے مطابق خداؤں کو یہ کائنات برقرار رکھنے کے لیے انسانی دلوں کی خوراک درکار ہوتی تھی۔ 1519 عیسوی میں اس فوجی ٹولے نے جنوبی اور وسطی میکسیکو کے درمیان بحر اٹلانٹک سے بحر الکاہل تک سارے علاقے پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ پیرو کے انکاس باشندوں نے 1438 عیسوی کے قریب اپنی سلطنت کی تعمیر کا آغاز کیا تھا کہ کزکو حکمران نے چن چا کی جانب سے انہیں ایک حملہ کا سامنا کرنا پڑا، جسے انہوں نے پس پا کر دیا اور چن چا کے علاقے کے ساتھ دیگر انڈینز باشندوں کو فتح کرنے پر چل پڑے۔ اس کے سو سال بعد انڈیز پہاڑ اور بحر الکاہل کے درمیان ان کی سلطنت اس قدر پھیل چکی تھی کہ شمالی علاقے کا بندوبست چلانے کے لیے ایک دوسرا دارالحکومت کیوٹو بنانا پڑا۔ ان دونوں دارالحکومتوں کے درمیان شاہی خاندان کے دو بھائیوں کی لڑائی جاری تھی کہ فرانسسکو پزارو 1532 میں آ گیا۔ جس سے اسپین کے لوگوں نے نہایت چالاکی سے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح میکسیکو میں گدی نشینی کی جگہ سے مادی طور پر اس صوبے کے لوگوں کو فائدہ حاصل ہوا جو ازٹک لوگوں سے نفرت کرنے لگے تھے۔

پانچواں باب

دوسری تہذیب کی مختصر تاریخ

دوسرے عہد کی تہذیب ابجدی تحریر سے متعارف ہوئی اور اب مذہبی عبادت کی نوعیت تبدیل ہوئی ۔ یہ سب پہلے ہزار سالہ قبل مسیح دور میں ہوا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ابتدائی دور کے مذاہب میں وہ رسوم بہ طور خاص شامل تھیں، جن کا مقصد زراعت کی شادابی میں اضافہ کرنا ہوتا۔ یہ لوگ آبادی کی آبائی روحوں کے وجود کو تسلیم کرتے اور انہیں خوراک بہم پہنچاتے تھے۔ دیوتا کی خوش نودی کے لیے وہ جانوروں، یہاں تک کہ انسانوں کی قربانی دیتے ہیں۔ یہ مذاہب بہت سے دیوتاؤں پر مشتمل ہیں۔ یہ دیوتا قدرت کے مختلف عناصر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہر دیوتا یا دیوی کا تعلق خاص رسوم سے ہے جن کی کارکردگی موروثی پجاریوں کی نگرانی کے تحت جاری رہتی ہے۔ رسوم کی ادائیگی کا صحیح علم انہی پجاریوں کے پاس ہوتا ہے۔ بعد میں یہی قدرتی عناصر کے نمائندہ دیوتا، قبائل کے اجتماعی تشخص کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ پھر ان کا تعلق شہری ریاستوں اور بادشاہتوں سے قائم ہو جاتا ہے۔ دیوتا اور دیویاں مخصوص آبادیوں کے سرپرست بن جاتے ہیں۔ ان کے ٹوٹکوں پر مبنی کردار، ان لوگوں کے اجتماعی تشخص کے مطابق ہوتے ہوئے ان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مختلف بت درجہ بہ درجہ اس طرح سامنے آتے ہیں، جس سے ایک سیاسی سلطنت میں ان کی قبائلی یا فوجی تشخص کی عکاسی ہوتی ہے۔ بادشاہوں کو آسمانی شخصیت یا کوئی ایسا منفرد کردار سمجھا جاتا ہے جنہیں بہ طور خاص کسی آسمانی طاقت کا اقتدار حاصل اور اختیار ودیعت ہوا ہو۔

لیکن جب پہلے ہزار سالہ دور قبل مسیح میں پرانی دنیا کے معاشروں کے اندر فلسفیانہ

افکار کی لہر دوڑنے لگی تو وہ سب کچھ بدل گیا۔ پروہتوں اور پجاریوں کے موروثی مناصب کی جگہ زیادہ جمہوری طریقے نے لے لی۔ اب مذہبی قائدین کا انتخاب ان کی اہلیت پر مبنی تھا۔ قربانی کی رسمیں اہمیت رکھتی تھیں، لیکن اخلاقی طرزِعمل سے کم تر اہمیت۔ ذات پات میں جکڑی ہوئی برادری کی جگہ ایک کھلے بھائی چارے نے لے لی۔ مذہب میں خیالات ایک ارفع کردار ادا کرنے لگے۔ چنانچہ یہ ہر شخص کے لیے ممکن ہوگیا کہ اپنی قومیت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کوئی بھی مذہب جس پر اسے یقین ہو، اختیار کرلے۔ قانون کی طرح مذہب کے بنیادی اصول بھی لاگو کیے جا سکتے تھے۔ ان اصولوں کا اظہار ہر ایک کے مخصوص طریقہ سے ہوتا۔ اعلیٰ درجے کا علم رکھنے والے ڈاکٹر خدائی سچ کے نازک نکات پر غور وفکر اور ان سے اختلاف بھی کر سکتے تھے۔ جو لوگ عام مسلمہ عقائد سے جرح کرتے انہیں بے دین کہا جاتا تھا، لیکن صحیح مذہب کا معیار کسی رسم کی ماہرانہ ادائیگی نہیں بلکہ دل کے اندر انسان کا رویہ اور رجحان ہوتا تھا۔ مغرب میں یہ بھی ہوا کہ صحیح مذہب کے لیے صحیح خدا کی عبادت شرط ٹھہری۔ اس طرح مذہبی عبادت نے وحدت پرستی کا تصور بدل دیا۔

اخناتون اور موسیٰ کی توحید پرستی

اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نئے مذہب کا پہلا ''پیامبر'' مصری فرعون اخناتون تھا جس نے 1367 صدی قبل مسیح میں حکومت کی۔ وہ پہلی بڑی تاریخی شخصیت تھی، جس نے وحدانیت کے مذہب کا پروگرام رائج کیا۔ موسیٰ سے سو سال پہلے اخناتون نے یہ اعلان کیا کہ امون ری، اس کے مورثِ اعلیٰ، کا مذہب جھوٹا تھا اور خدا صرف ایک ہے، وہ ہے ایٹن (Aton)، سورج دیوتا، جو ساری دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ اسی نے سارے زندہ اجسام کو زندگی دی ہے۔ اخناتون نے ایٹن کی تعریف میں نظمیں لکھیں، لیکن ان کی شباہتیں بنانے سے روک دیا۔ اسے شمال میں تھیبز (Thebes) سے اخاتاتون (Akhataton) یعنی طلوع آفتاب کے شہر میں لے گیا اور حکم دیا کہ وہ تمام مجسمے جن پر آمون کے نام کندہ تھے، مٹا دیے جائیں۔ اس نے جہاں امون ری کے طاقت وَر پجاریوں کو ناراض کر دیا، وہیں اس نے ریاست کے معاملات کو بھی نظر انداز کیا، حتّیوں نے مصر کے ایشیائی مقبوضہ جات پر حملہ کر دیا اور خراج دینا بند کر دیا۔ شاہی خزانہ خالی ہوگیا۔ جب اخناتون نے وفات پائی تو امون ری کے پجاریوں نے

دوبارہ اقتدار حاصل کرلیا اوراس کے جانشین توتن خامین نے پُرانے مذہب کو بحال کر دیا۔

موسیٰ جو تیرھویں صدی قبل مسیح میں مصر میں رہتے تھے، فرعون کے متبنّیٰ بیٹے تھے۔ امکان یہ تھا کہ وہ اخناتون کے مذہبی اجبار سے واقف تھے۔اب خواہ وہ آگاہ تھے، یا نہیں تھے، لیکن یہودی وحدت پرستی ذرائع سے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ موسیٰ نہایت سختی کے ساتھ صرف ایک خدا کے تصور پر یقین رکھتے تھے۔اس کے پہلے حکم ربانی میں آیا ہے،''میں مالک ہوں، تمہارا خدا جو تمہیں مصر سے باہر لایا ... میری مخالفت کے لیے تمہارے پاس دوسرا کوئی خدا نہیں۔'' احکام ربانی میں سے کسی ایک میں بھی رسوم کی ادائیگی کا ذکر نہیں۔ ہر ایک کا تعلق صحیح اعمال اور عقیدے سے ہے۔موسیٰ نے یہود کے قبیلے کو جو مشترکہ طور پر خانہ بہ دوش تھے، ایک قوم بنا دیا اور خاص اصولوں کی پابندی کو اس قوم پر لازمی قرار دیا۔اس کے احکام اگرچہ واضح طور پر فلسفیانہ نہیں تھے، لیکن اس کی ہدایات میں خدا کے نام پر اخلاقی تصورات شامل ہوتے جس طرح فلسفیوں کے یہاں ہوتے ہیں۔موسیٰ نے یہودیوں پر سخت لعن طعن کی جنھوں نے عبادت کے لیے ایک سونے کا بچھڑا بنا رکھا تھا۔اس کا خدا جہوہ (خدا تعالیٰ کا عبرانی نام) نظر نہ آنے والی روح تھی، نہ کہ پتھر پر نقش کوئی شباہت۔ایک ایسے خدا کی عبادت کے لیے جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا اور جس کا وجود عام شعور سے ماورا ہو، ایک دماغی تنظیم درکار تھی۔

یہودیوں کا خدا، جسے ابراہیم نے پہچانا اور اسحاق اور یعقوب نے جسے خدا کہا، انہوں نے ان لوگوں کو مصر کی قید سے آزاد کرایا۔اس خدا نے فرعون کی خود پرستی کو زیر کیا اور زمین پر اپنی طاقت ظاہر کی۔فرعون جیسے طاقت وَر حکمران ایک نئی طرح کے خدا کے ماتحت چلے آرہے تھے، جس کے بارے میں یقین تھا کہ عالم گیر ہے اور باجبروت ہے۔ وحدانیت کو خطرہ یہودی بادشاہ کی ایک غیر ملکی عورت کے ساتھ شادی سے پیدا ہوا جو شاہی حرم میں دوسرے دیوتاؤں کو بھی اپنے ساتھ لائی۔سلیمان کی رحلت کے بعد یہودیوں نے کنعان میں زرخیزی کے دیوتا بل اور اناس کی پوجا شروع کر دی، تاکہ اناج کی پیداوار زیادہ ہونے لگے۔ پھر ایک مذہبی فرقہ اٹھا، جس نے ایلیجاہ اور ایلشیا نامی پیامبروں کی قیادت میں یہ دعویٰ کیا کہ یہودیوں کا واحد خدا یہوا ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ یہودیوں کے لیے دوسرے خداؤں کی پرستش ایسی ہے جیسے اپنی شادی سے بے وفائی برتنا۔تب اسرائیل کے شمالی حصے میں840 قبل مسیح میں شاہی خاندان کی لادینیت کے خلاف ایک بغاوت پھوٹ پڑی جو یروشلم کے معبد تک پھیل

گئی۔ تاہم یہوا، واحد جماعت، قوم پر اپنے نظریات نافذ کرنے میں ناکام رہی۔ دینیات کے علم کے چند مصنفوں نے جن میں آموس اور ہوسی شامل تھے، حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں خدائی احکام کی توضیح کرنی شروع کر دی۔ اس طرح خدا کا ایک تصور ابھر کر سامنے آیا جو لاشریک ہے، رحم کرنے والا ہے اور جو ناداروں کے لیے انصاف چاہتا ہے۔

جب اساریہ نے722 قبل مسیح میں اسرائیل کی شمالی بادشاہت فتح کر لی تو یہوا کے مسلک نے قوم پرستی کے جذبات پر جودیہہ کی جنوبی بادشاہی میں جو ابھی تک غیر مفتوحہ علاقہ تھا، لوگوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ ایک نامعلوم شخص نے تقریباً630 قبل مسیح میں نئی آسمانی ہدایات اور قوانین تحریر کیے اور ان کی بنیاد پرانی روایات پر رکھی جو یروشلم کے معبد میں سب سے بڑے پروہت کو ملی تھیں اور جس کی بابت دس سال بعد بادشاہ جوسیہ نے فیصلہ دیا کہ مصدقہ تھیں۔586 قبل مسیح میں جب بابل والوں نے یروشلم کو فتح کر لیا تو ایک اور بحران اٹھ کھڑا ہوا۔ اس واقعے نے یہ شکوک پیدا کیے کہ خدا نے اگر اپنے ہی لوگوں کو غیر ملکی سلطنتوں کے تابع کر دیا تو یہوا یقیناً صاحبِ اقتدار اور اپنی جگہ حقیقی ہوگا۔ تاہم یہوا، واحد جماعت نے اپنے پیامبروں کے ذریعے یہ دلائل دیے کہ خدا نے یہ تکلیف دہ تجربہ یہودیوں کو ان کی پرانی لادینیت کی سزا کے طور پر اور انہیں اخلاق کا درس دینے کے لیے کیا ہے۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ خدا نے اپنے لوگوں کو قید میں بھیجا ہے تاکہ وہ دوسری قوموں میں اپنے آپ کو ظاہر کریں۔ اس وقت یہوا، بے دینوں اور یہودیوں دونوں نے خدا کے طور پر ظاہر ہوگا اور وہ پوری کائنات کا خدا ہوگا۔

اس دوران میں چونکہ قدیم دستاویز کے تحت یروشلم کے معبد میں قربانی کی رسم پر پابندی لگا دی گئی تھی، وہ یہودی جو بابل میں جلاوطن تھے، انہیں اپنی روایات کے مطابق اپنے مذہب پر عمل کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مذہبی اعمال میں غیر قربانی طریقے، عبادت، حمدیہ گیتوں اور قانون خوانی وغیرہ داخل ہو گئے تھے۔ یہودی مذہب کا اساسی نکتہ یہ تھا کہ کوئی خدا لائق عبادت نہیں سوائے یہوا کے اور خالص قوانین پر عمل واجب ہے۔ یہوا کے فرقے نے تاریخی تحریروں کا ایک محضر اپنی حمایت میں پیش کر دیا تاکہ خدا کی رضامندی کی تائید ہو۔ یہ عبارت اور پیامبروں کے دوسرے کاموں کو عہد نامہ عتیق میں مرتب کر دیا تھا، لیکن آخری نسخہ پانچویں صدی قبل مسیح تک مکمل نہیں ہوا تھا۔

زرتشتی اثرات

ایران کے بادشاہ سائرس دوم نے جب 538 قبل مسیح میں ایک سرکاری فرمان کے تحت جلاوطن یہودیوں کو یروشلم میں واپس آنے اور معبد سلیمانی تعمیر کرنے کی اجازت دے دی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہوا کے کل کائنات کے خدا کی بابت نظریے کی تصدیق ہوگئی۔ سائرس دنیا کا سب سے طاقت وَر بادشاہ تھا، چنانچہ وہ خدا کی تاکید کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ درحقیت بابل اور ایران میں جو وقت گزرا تھا، وہ یہودی مذہب کے لیے سودمند ثابت ہوا تھا۔ اس نے اس مذہب کو جو کبھی صوبائی آبادی تک محدود تھا، ایک ترقی یافتہ الوہی اوصاف عطا کر دیے۔ یہ کام بڑی حد تک ایرانیوں کے پیامبر زرتشت (628-551 قبل مسیح) کا تھا۔ اس کی زرتشتی تعلیمات ایران کا سرکاری مذہب تھیں چونکہ ایرانی حکومت سامی باشندوں پر مہربان تھی، اس لیے یہودیت نے ایرانی تہذیبی اثرات قبول کر لیے۔

زرتشت ایک تخلیقی ذہن کا مالک مفکر تھا، وہ ایک ایسے معاشرے میں سانس لے رہا تھا جو زرعی اور خانہ بہ دوشی طریقے کے بیچ ایک عبوری معاشرہ تھا۔ جفاکشی، ایمان داری اور اعتماد زرعی زندگی میں جاگزیں خوبیاں وہ خوبیاں تھیں، جنھیں وہ نیکی سے تعبیر کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ خانہ بہ دوش تھے، جو آبادیوں پر حملے کرتے اور ان کے مویشی چوری کر کے لے جاتے تھے۔ شر ان کی شناخت تھا۔ خیر اور شر کے درمیان تصادم زرتشتی مذہب کی مرکزی خصوصیت ہے۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا اہورا مزدا خیر کی قوتوں کی قیادت کرتا تھا، کم تر درجے کے دیوتا، جنھیں زوال رسیدہ فرشتے کہا جاتا ہے شر کی قوتوں پر مشتمل اور اہرمن کے پیچھے چلنے والے تھے۔ دنیا ان دونوں مخالف قوتوں کی رزم گاہ تھی۔ وہ جانور، جیسے کتے اور بیل جو آدمی کی مدد کرتے، اچھے تھے۔ جب کہ دوسرے جانور، سانپ بچھو اور دوسرے کیڑے مکوڑے شر تھے۔ زرتشت نے یہ سبق دیا کہ خون کی قربانی بند ہونی چاہیے اور انسانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ انکسار پاکیزگی اور عفو و درگزر کی خصوصیات پیدا کی جانی چاہئیں۔ تاہم انسانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ ان انسانوں، جانوروں اور جان داروں کے خلاف جو شر کے ساتھ وابستہ ہیں، اَن تھک جدوجہد کریں۔ آسمانی قوتوں اور انسانی دلوں کے درمیان ایک جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔ آخر میں خیر اپنی دائمی فتح مذہبی کے لیے شر کے مقابلے میں کامیاب ہو

گا۔اس سے پہلے شر بالا دست ہوتا نظر آئے گا، پھر ایک نجات دہندہ طاقت اہرمن سے، جب وہ جیتتا ہوا نظر آئے گا، عین وقت پر کامیابی چھین لے گی۔

یہودیت کے مستقبل شناس مصنف جو بابل میں جلاوطنی کے بعد موجود تھے، انہوں نے زرتشتی مذہب کے عناصر کو ان آئندہ واقعات کے ساتھ جن کا تعلق یہودی قوم کی واپسی سے تھا، اپنی تحریروں میں ٹانک لیا۔قومی بحالی کے خیال کی جگہ اس ماورائے فطرت بادشاہت نے لے لی، جسے خدا زمین پر قائم کرے گا۔زرتشتی تعلیم کی رو سے دنیا پر تسلط حاصل کرنے کے لیے پہلے خیر اور شر کے درمیان جنگ ہوگی۔ پھر ایک زمانہ مصائب و آلام کا ہوگا، جس میں حق پرست لوگ بڑی مصیبت جھیلیں گے۔ پھر آخری لمحے میں خدا خود مداخلت کرے گا تاکہ خیر کامیاب ہو۔ خلق کے درمیان سے ایک مسیحا نمودار ہوگا۔ کامیابی کے لمحے میں وہ خدا کا کارگزار معلوم ہوگا۔اس کے ذمہ انسان کی روحوں کا امتحان کرنا تھا کہ ان کو خدا کی مکمل بادشاہی میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے۔ یہ تصور کہ مرنے والوں کی ارواح آخری فیصلے کے لیے زندہ اٹھائی جائیں گی، زرتشت کے علم فلکیات سے ماخوذ ہے۔اسی طرح وہ تصورات جو فرشتوں اور آسمانی موجودات کے سلسلہ مراتب سے متعلق ہیں، خیر اور شر کے درمیان نہایت صریح تفریق، مذہبی افکار میں زرتشت کا خاص عطیہ ہیں۔خدا نے اس مادی دنیا کو پیدا کیا۔ پھر اس کو شیطان کے حوالے کر دیا، یہ شیطان کو ایک قلیل عرصے کے لیے خدائی نظام میں شریک کرنے کا ایک جال تھا اور پھر اسے تباہ کر دینا مقصود تھا۔انسان کا فرض اس سلسلے میں مدد دینا ہوتا۔

یہودی: غیروں کی حکمرانی میں

ایرانی معاشرے کے روادار ماحول میں یہودی دانش وَروں نے ان کے مذہبی خیالات کو اپنے اندر تیزی سے جذب کر لیا تھا۔ پھر اچانک سکندر اعظم نے ایرانی سلطنت کو فتح کر لیا۔اس کے نتیجے میں یونانی کلچر سامی اقوام کے لیے یک سَر اجنبی تھا۔روایتی یہودی مذہب کے ماننے والوں کو ایک مخالف ماحول میں پھر سے واپس بھیج دیا گیا۔167 قبل مسیح میں شاہ اینٹیوچس چہارم نے جو یونانی زبان اور تمدن کا زبردست ماہر تھا یروشلم کے معبد کو تباہ کر دیا۔ ایک پجاری میتھوتھیاس نامی اور اس کے پانچ بیٹوں نے سلوکس کی سلطنت کے خلاف گوریلا

جنگ شروع کر دی۔ ان میں سے ایک بیٹے جوڈاس میکابس نے باغی افواج کی قیادت کی اور شامی یونانی خاندان کے خلاف تیزی سے اور مسلسل کامیابیاں حاصل کیں۔ اس نے یروشلم فتح کر لیا اور اس کے معبد میں یہودیوں کی عبادت کا طریقہ رائج کر دیا۔ فتح مند مکابی خاندان نے جوڈیا میں تقریباً سو سال حکومت کی۔ آخر کار یہودیوں کی اپنی ایک قوم تھی، یہودیت ایک مشنری مذہب بن گیا جس نے نیا مذہب اختیار کرنے والے بالغ مردوں کے لیے حکم دیا کہ ان کے ختنے کیے جائیں۔ چنانچہ اس خاندان کے حکمران اپنی حکمرانی کے طریقوں میں یونانی زبان اور کلچر سے بہت قریب ہو گئے۔ 63 قبل مسیح میں ایک رومی جنرل خانہ جنگی میں شامل ہو گیا اور یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد روم نے جوڈیہ پر اپنے نائبین کے توسط سے حکومت کی۔ یونانی تہذیب کے پروردہ یہودیوں نے روم کے ساتھ تعاون کیا اور فلسطین کے شمالی حصے پر جس میں گلیلی بھی شامل تھا، حکومت کرتے رہے۔

پہلے تو یونانی سلوکس نے اور پھر روم کے اقتدار نے جوڈیہ پر دباؤ ڈالا۔ پھر قومی نجات کے مضامین جو جلاوطنی کے زمانے میں سامنے آئے تھے، نئے سرے سے اہمیت حاصل کرنے لگے۔ مسیحائی کی تب و تاب اور گرم جوشی کو قبولیت حاصل ہو گئی کہ اب داؤد کا مسکن واپس مل جائے گا۔ وہ پیغمبرانہ تحریریں جن میں دنیا کے خاتمے کا قیاس کیا جاتا تھا، زیادہ شدت کے ساتھ اور عجیب و غریب صورت میں سامنے آنے لگیں۔ اب ایک روحانی مذہب اور یہودیوں کی سیاسی زور آوری کے درمیان کشیدگی موجود رہنے لگی۔ یہودی معاشرہ پہلی صدی قبل مسیح میں بہت سے دھڑوں میں تقسیم ہو گیا اور وہ اس بنیاد پر کہ غیر ملکی قبضے کی جانب ان کا رویہ کیا تھا۔

فارس میں رہنے والے یونانیت کے شدید مخالف تھے، انہوں نے، جو ''حق پرستوں کی جماعت'' کہلاتے تھے، یہودی مذہب کو غیر ملکی اثرات سے بچانے کی کوشش میں بڑی سختیاں جھیلی تھیں۔ صدوقی فرقے والے بالائی طبقے کے یہودی تھے، ان کا تعلق معبد کی انتظامیہ سے تھا، جو مذہبی اختراعات کو مثلاً مسیحا کے ظہور کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ایک سیاسی دھڑا، جسے شدت پسند کہا جاتا تھا، مسلح مدافعت کے حق میں تھا۔ انہوں نے روم کے خلاف گوریلا کارروائی شروع کر دی۔ لیکن ٹی ٹو کی فوجوں نے 70 قبل مسیح میں انہیں بڑی بے رحمی سے کچل دیا۔ اس فرقے کے آخری لوگوں نے ساڈا کے قلعہ میں اجتماعی خودکشی کر لی۔ یروشلم کلیتاً تباہ ہو گیا۔ ساٹھ سال بعد ایک اور فرقے نے سائمن بارکوکیا کی قیادت میں اسے مسیحی

قیاس کرتے ہوئے روم کے اقتدار کو چیلنج کر دیا، لیکن اسے بھی نا کامی ہوئی۔

66-70 قبل مسیح کے اندوہ ناک سانحے میں دس لاکھ سے زیادہ یہودی فاقے اور دوسرے اسباب کی بنا پر ہلاک ہوئے ہوں گے۔ مزید ایک لاکھ یہودیوں کو روم میں غلام بنا لیا گیا تھا۔ یروشلم میں ایک فرقے فریسیوں کے قائد جوہن بن ذکائی کو ایک تابوت میں چھپا کر ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ بعدازاں اس نے شاہِ سپاسیاں سے جمنیا میں قیام کرنے اور یہاں یہودیت کی تعلیم کے لیے ایک اکیڈمی کے قیام کی اجازت لے لی۔ اب کہ یروشلم اور مصر میں سارے معبد تباہ ہو چکے تھے یا بند کر دیے گئے تھے، یہ اکیڈمی یہودی تعلیمات کا ایک بااختیار مرکز بن گئی۔ وہاں یہودیت کو عبادت گاہوں کے اندر نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ اس کی تعلیم وتدریس میں تورات پر زور دیا گیا، قوانین اور رسوم کی ادائیگی پر خاص توجہ دی گئی۔ مقدس ادب کے اصول متعین کیے گئے۔ دوسری صدی عیسوی کے پہلے پچاس برس کے دوران میں قبرص، مصر اور فلسطین میں یہودیوں کی بغاوت کے بعد روم کی حکومت کو خیال آیا کہ یہودیت پر پابندی لگا دے، لیکن اس کی بجائے ایک کمیشن نے صیہونیت کے قوانین کی چھان بین کی اور ان میں بعض تبدیلیاں تجویز کیں۔ ربی جوداوی پرنس، نے قوانین کی ایک دستاویز شائع کی جو مشناہ (Mishnah) کے نام سے مشہور ہوئی اور یونان اور روم میں ہر طرف پھیل گئی۔ فلسطین کے اسقف اعظم حلل دوم (Hillel II) نے 359 عیسوی میں یہودیوں کے کیلنڈر کو مرتب کرنے کے طریق کار شائع کیے۔ پھر جب مسیحیت روم کا مذہب قرار دے دی گئی تو یہودیوں کو اپنے خلاف بڑھتی ہوئی دشمنی کے ایک اور تجرباتی دور کا سامنا ہوا۔ تھیوڈوسس دوم نے 425 عیسوی میں یہودیوں کے سربراہ اعلیٰ کا منصب ختم کر دیا اور مشرقی رومن کے بادشاہ جسٹینین نے یہودی قوانین اور فوری نوعیت کے ضوابط متعین کر دیے۔

یہودی آبادی کے لیے آٹھویں صدی کے اندر مغربی یورپ اور ایران میں حالات بہتر ہو گئے۔ نئے غیر یہوا اور اور عرب حکمرانوں نے انہیں متنوع اور بڑی بڑی سلطنتوں کے درمیان ایک اقلیتی آبادی کے طور پر گوارا کر لیا۔ عیسائی بادشاہ اکثر اپنی یہودی رعیت کے لیے اس مضمون کے فرامین جاری کر دیا کرتے تھے کہ بعض خصوصی ٹیکسوں کے عوض انہیں ایک خودمختار برادری کے طور پر زندگی گزارنے کا حق دیا جاتا ہے۔ یوکرین میں ایک ترک حکمران خاندان نے ایک سلطنت قائم کر لی، اور اس غرض سے ایرانی مسلمانوں کی ایک فوج ملازم

رکھی۔ اس کے حکمران نے 750 عیسوی میں مسیحیت اور اسلام دونوں کو رد کرتے ہوئے یہودیت کو ریاست کا مذہب قرار دیا۔ خضر سلطنت نے مشرق اور مغرب کے درمیان تجارتی روابط قائم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ خیو (Kiev) کے شہزادہ سویتسولوف نے 970 میں اس سلطنت کو فتح کر لیا۔ عباسی حکمرانوں کے دور میں بغداد میں جس متنوع اور روادار معاشرت نے فروغ پایا، اس میں بھی یہودیت کو پھولنے اور پھلنے کا موقع ملا۔ دسویں صدی عیسوی میں اس طرح مسلمانوں کا شہر قرطبہ یہودیوں کے لیے تہذیبی طور پر پُرکشش بن گیا۔ بارھویں صدی میں بربر المعید خاندان نے پورے شمالی افریقا اور سپین پر فتح حاصل کر کے اس کلچر کا خاتمہ کر دیا۔ اس دوران میں مسیحی صلیب برداروں نے یورپ کو ''عیسیٰ کے قاتلوں'' سے نجات دلانے کے لیے پکارا جس کے ساتھ ہی یہودیوں کے خلاف مہم شروع ہو گئی۔ اس کے بعد ہی کچی بستیاں بسائی جانے لگیں۔ وہی سپین جو کبھی یہودیوں کے لیے روادار تھا 1492 میں انہی کے لیے حکم جاری ہوا کہ مسیحیت اختیار کریں ورنہ ملک سے نکل جائیں۔

مسیحیت کا ابتدائی زمانہ

جیسس (Jesus) ایک یہودی مبلغ تھے۔ اپنی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے انہوں نے مسیحا کا کردار اختیار کیا۔ یہ کردار یہودیوں کے صحیفے میں وضع کیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی مذہبی منصبی حیثیت کا آغاز اس طرح کیا کہ ''جان دی بپٹسٹ'' کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا، اس رسم کی ادائیگی کا مقصد گناہوں سے نجات حاصل کرنا اور حساب کے ایام میں بخشش پانا تھا۔ جیسس کا ایک سادہ سا پیغام تھا، 'اللہ کی بادشاہت آنے ہی والی ہے۔'' عذاب و آزمائش کا ماجرا وقتی ہوگا۔ ان حالات میں مسیحی آسمانی طاقت کی مقرر کردہ وہ شخصیت ہوگی جو انسانی تاریخ کو تکمیل کے مرحلے میں لے جائے گی اور زمین پر خدا کی بادشاہی کا آغاز ہوگا۔ جیسس نے اپنی اپنی مصروفیت کے تین سال خدا کی بادشاہت کے لیے اپنے مقلدوں کو تیار کرنے اور صحائف میں درج کردہ شرائط کے مطابق حالات کی تکمیل میں صرف کر دیے جو عیسیٰ کی آمد کے وقت رونما ہو سکتے ہیں۔ آسمانی کتب کے مطابق جیسس نے اس زمانے کی یہودیت کے مطابق خود کو یونانی عقائد کی مخالفت سے الگ کر دیا تھا۔ انہوں نے فراسیوں کی مذمت کی جو زبردست یہود دشمن تھے، ساتھ ہی انہوں نے ایسے معاملات میں، مثلاً ٹیکسوں کی ادائیگی وغیرہ میں رومی حکام کے ساتھ تعاون کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے یروشلم کی سخت مذمت کی جو

پیغمبروں کے قتل کے لیے بدنام ہو چکا تھا۔ چنانچہ جیسس نے صریح مذہبی قوانین خود توڑے۔ بعض پہلوؤں سے فراسیوں کی قانون پرستی پر ان کا محاسبہ افلاطون کی مثالیت پسندی سے ملتا ہے، جس نے لازمی صداقتوں پر خاص توجہ دی تھی۔

تاہم جیسس جو کہ جوزف کے توسط سے شاہ راڈا کا وارث تھا، اپنے کردار کے لحاظ سے یہودی مذہب کی روایت پر پورا اترتا تھا۔ صحیفوں میں مسیحا کا حوالہ جس طرح آیا تھا، اس کا زمینی کردار اس کے مطابق تھا اور ان توقعات سے جڑا ہوا تھا جو خدا کی بادشاہی میں پوری ہونے والی تھیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ایسا کوئی واقعہ رونما ہوتا جیسس کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ دو دن بعد اس کے پیروکاروں نے دیکھا کہ اس کا مردہ جسم مزار سے غائب تھا۔ اسے اس امر کی علامت سمجھا گیا کہ خدا کی طاقت سے جیسس کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور یہ کہ اب وہ ایک مافوق الفطرت مسیحا ہے۔ جیسس کے حلقے کے شاگردوں کے دل اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی خبر سے بڑھ گئے، چنانچہ انہوں نے اس نیک خبر کو پھیلانے کے لیے ایک روحانی مشنری تحریک شروع کر دی۔ پال نے جو ابتداً حواریوں کے حلقے میں شامل نہ تھے، مسیحائی کے اس واقعہ کی ایک نئی توجیہہ کی۔ پال نے لکھا کہ جیسس نے صلیب پر جب کہ وہ معصوم تھے، اپنی جان دے کر دوسرے لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ ان کی ذات کی یہ قربانی خدا کی مملکت میں ان کے تمام ماننے والوں کے داخلے کی قیمت ادا کرے گی، خواہ وہ کتنے ہی گناہ گار ہوں۔ اس کے باوجود ابتدائی دور کی عیسائی برادری زمین پر جیسس کی واپسی کی منتظر رہی۔ ابتدائی مسیحائی توقعات اب جیسس کی دوبارہ واپسی کی طرف منتقل ہو گئیں اور یہ کہ اس وقت ان کی عظمت اور طاقت ظاہر ہو جائے گی۔ پہلی صدی عیسوی کے آخری ایام میں جان پیٹموس نے ایک کتاب انکشافات (Revelation) کے نام سے لکھی، جس میں آخری دنوں (یوم حساب) کے تعلق سے رونما ہونے والے واقعات کو روحانی نقطۂ نظر سے، مسیحائی فکر کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔

خدا کی مملکت بر وقت ظہور میں آنے سے کیوں ناکام رہی؟ پال نے اس کی عقلی توجیہہ یہ پیش کی کہ جیسس کی دوبارہ واپسی کے وقت دنیا زمینی سے روحانی حالت کی جانب تبدیلی کے عمل سے گزر رہی تھی، اور وہ ایسا ہی تھا جیسے ایک نئے دن کے ظاہر ہونے میں ہوتا ہے کہ وہ تبدیلی ابتداً نظر نہیں آتی۔ دنیا میں روحانیت بتدریج بڑھتی جائے گی اور تب ایک نقطے پر پہنچ کر لوگ صاف دیکھ لیں گے کہ خدا کی مملکت آ گئی ہے۔ پھر یومِ خمیس پر ایک لمحے کے

لیے ہر شخص الوہیت کی زبردست فراوانی کو دیکھ لے گا لیکن یہ جلوہ نمائی بیشتر مادی دنیا کے اندر پابند ہوگی۔ ایک ایسی زبان میں جو افلاطون کی یاد دلاتی تھی، پال نے عیسائیوں پر زور دیا کہ ''اپنی آنکھیں صرف انہی اشیا پر مرکوز نہ کریں جو نظر آتی ہیں، بلکہ ان اشیا کو بھی دیکھیں جو نظر نہیں آتیں۔'' انہوں نے عیسائیوں کو تاکید کی کہ پاک باز بنیں تاکہ اپنے وجود کو گوشت کی محکوی سے آزاد کرا لیں۔ اس عہد کی متجسس روح بھی جیسس کی شخصیت پر مرکوز رہی۔ جان کی کتاب (Gospel) لوگوس یا خدا کے لفظ سے شروع ہوتی ہے۔ عقیدے کی رو سے وہی لفظ مجسم جیسس ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں فلسفے کی شدت سے عمل داری تھی، مسیحیوں نے یہ سوال کرنا شروع کر دیا کہ جیسس کس طرح کا فرد یا خدا تھا؟ کیا وہ ایک آدمی تھا جس کا ایک جسمانی وجود تھا، یا وہ خدا تھا، یعنی خالصتاً روح، یا شاید دونوں ہی تھا۔

سکندریہ جیسے مقامات پر جہاں یہودیوں اور یونانی آبادیوں کی کثرت تھی، اس طرح کے سوالات لوگوں کے ذہنوں میں اکثر پیدا ہوتے رہتے تھے۔ مختلف مذاہب اور فلسفیانہ مکاتب پہلو بہ پہلو موجود تھے اور نئے دینیاتی افکار میں گھل مل رہے تھے۔ افلاطون کے ایک یہودی مبلغ فیلو نے لوگوس کے بارے میں قیاس کیا کہ یہ کتاب دوامی اور عارضی دونوں صورتوں کو جوڑتی ہے۔ اس کلچر میں فلسفے کی کارفرمائی کو دیکھتے ہوئے یہ امکان نظر آتا تھا کہ مذہب کے تعلق سے بہت سے سوالات اٹھائے جائیں گے اور لوگ کئی مختلف نتائج پر پہنچیں گے، جن میں سے بعض کو الحاد سمجھا جائے گا۔ ملحدانہ موقف کا تعلق روحانی مسیحیت (Gnostic Christianity) سے تھا۔ اس پر جدید افلاطونی افکار کے اثرات نظر آتے تھے۔ ''روحانی'' مسیح جیسس کے انسانی وجود سے انکار کرتے تھے۔ بائبل میں جو تاریخی واقعات درج ہیں، انہیں بھی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ خدا صرف انسانی معاملات میں شریک ہوتا نظر آتا تھا اور جیسس صرف ایک آدمی ظاہر ہوتا تھا۔ آرین مسیحی (Arian) دوسری جانب جیسس کی الوہیت پر بھی شک کرتے تھے۔ جیسس جو بیٹا تھا، باپ کے تابع تھا، جو واحد اور صرف واحد خدا تھا۔ مارکون (Marcon) نے جو خالص مسیحیت کا قائل تھا، موسیٰ کے قوانین (Law of Moses) کو بدی پر مبنی اثر قرار دیا تھا۔ ویلز کے ایک بے دین پلاگیوس کا خیال تھا کہ بدی آزاد خواہش کی غلط روی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مونٹینس کا دعویٰ تھا کہ صداقت کی روح جان کے یہاں موجود تھی۔ دنیا کے خاتمے کی توقع کرتے ہوئے اس نے زبانیں بولنے کی مشق کی۔

کانسٹنٹائن اوّل نے 325 عیسوی میں نیکیا کی کونسل (Council of Nicea) بلائی تا کہ آریئس (Arius) کی تعلیمات میں جو سوالات اٹھائے گئے تھے، ان کو حل کیا جائے۔ آریا کا نقطۂ نظر ان دنوں حاوی تھا اور ایتھنز کے چرچ کا، جو سکندریہ میں قائم تھا، مخالف تھا، وہاں کلیدی سوال یہ تھا کہ آیا جیسس اپنی فطرت میں ''خدا کی طرح'' تھا، جو آرین کا موقف تھا یا ''خدا جیسا ہی'' تھا۔ کونسل نے آریئس اور اس کے طرف داروں کی مذمت کرنے کا فیصلہ کیا اور تثلیث کے افکار و نتائج کو تسلیم کر لیا۔ نائیسین کا موقف یہ تھا کہ جیسس ''خدا کا بیٹا'' ہے، اسی سے پیدا ہے، بنایا نہیں گیا ہے، بلکہ اس سے بنا ہے اور اپنے باپ کا ہی جز ہے۔'' ایفیسس کی کونسل نے 431 عیسوی کے اجلاس میں نیسٹوریس (Nestorius) کی تعلیمات کی مذمت کی، جو میری کے اس منصب کو کہ وہ ''خدا کی ماں'' جیسی ہے، تسلیم نہیں کرتے تھے اور عیسیٰ کی اس دوگونہ حیثیت کو سر بلند کیا کہ وہ انسان تھے اور خدا بھی تھے۔ 451 عیسوی میں کارلیوڈون (Charleodon) کی کونسل نے اس ملحدانہ خیال کی مذمت کی کہ عیسیٰ کا صرف ایک آسمانی وجود تھا۔ ایسے سوالات سیاسی اور مذہبی دونوں اسباب سے اہم تھے۔ بہت سے جرمن/ اینگلو سیکسن قبائل نے جن کے بادشاہوں نے مسیحیت اختیار کر لی تھی، آرین کے عقیدے کو تسلیم کر لیا۔ جرمن باشندوں نے جن کو پوپ کی حمایت حاصل تھی، نائیسین کے موقف کو تسلیم کیا اور قدامت پرستی پر قائم رہے۔ دوسری جگہوں پر عیسائی جو عام عقیدے کے خلاف رائے رکھتے تھے، چند اہم مذہبی آبادیوں میں بٹ گئے۔

نسٹوریس ان دنوں قسطنطنیہ کا سب سے بڑا پیشوا تھا۔ اس نے اس عقیدے پر حملہ کیا کہ کنواری مریم ایک آسمانی بیٹے کو جنم دے سکتی تھیں۔ اس پر نسٹوریس پر مسیحی برادری کے عذاب نازل ہوا۔ ایفیسس کی کونسل نے اس کی تعلیمات کی شدید مذمت کی جس کے بعد انٹیوک میں مسیحی قوم کے اندر زبردست تفرقہ پڑ گیا۔ نسٹوریس کے بہت سے ماننے والے ترک وطن کر کے عراق چلے گئے، جہاں ساسانی سلطنت قائم تھی اور مسیحی عیسائی چرچ کے نسٹورین عقیدہ کو بالادستی حاصل ہو گئی۔ یورپ میں ناکامی کے بعد یہ عقیدہ ایک مشنری مذہب بن گیا اور ہندوستان، چین اور وسط ایشیا تک پھیل گیا۔ مارکو پولو کا بیان تھا کہ نسٹورین گرجے بغداد اور پیکنگ کے درمیان تجارتی راستے میں قطار میں جگہ جگہ قائم تھے۔ اس کے ردِعمل میں مونوفزائٹ عقیدہ ابھرا۔ یہ عقیدہ شام، مصر، آرمینیا اور اہی سینیا میں بہت زور پکڑ گیا تھا۔ مونوفزائٹ

عقیدہ، ایوٹیچ (Evityches) کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ پانچویں صدی کے وسط میں جب جیکب بارادوس ایڈیسا کا بشپ مقرر ہوا تو اس نے شام میں مونو فائٹس کے لیے جیکو بائٹ چرچ منظم کیے۔ یہ چرچ مصر میں چرچ کا متبادل ہے۔ مشرقی رومن سلطنت نے 476 عیسوی میں کارلیوڈون کی کونسل ناجائز قرار دے دیا۔ پھر مونو فزائٹ مسیحیوں کو عقیدے سے خارج کرنے اور انہیں سزائیں دینے کے نتیجے میں یہ مذہبی برادری رومن سلطنت سے دور ہو گئی۔ یوں مسلمانوں کے لیے راستہ کھل گیا کہ شام اور مصر کو تیزی سے اور آسانی کے ساتھ فتح کر لیں۔

مغربی چرچ کا ارتقا

رہبانیت کی زندگی کا آغاز دنیا داری کو ترک کر دینے کے رویے سے ہوا جو بعض لوگوں کے خیال کے مطابق مسیحی چرچ کو اس وقت مسموم کرنے لگی تھی، جب اسے روم کا ریاستی مذہب قرار دیا گیا تھا۔ یہ نئی افلاطونیت اور روحانی مسیحیت کی عکاسی کرتی ہے۔ جس کے اذیت ناک اثرات جسم اور روح کے حوالے سے ذہنوں پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات پر بھی غور کیجئے کہ اشوک نے تیسری صدی قبل مسیح میں بودھ مشنریاں مصر بھیجی تھیں، اس طرح راہبوں کی برادری کا تصور ہندوستان سے وہاں پہنچا ہوگا۔ ایک مصری پادری سینٹ اینتھونی نے اس طرح کی مسیحی زندگی کا عمل 285 عیسوی میں کیا۔ وہ ریگستان کے ایک ویرانے میں چلا گیا تاکہ تنہائی کی زندگی گزارے، جہاں اسے عورتوں کے خیالی خاکے، بھوت پریت، گوشت کی خواہش ترغیبات میں مبتلا کرتی رہی، دارندوں نے اس پر حملے کیے۔ اس کی بے جگری کی اس مثال سے اس کی نقل کرنے والوں کو بھی ترغیب ہوئی اور کئی راہب اس کے آس پاس رہنے لگے۔ ان کی موجودگی کو بیس سال تک نظر انداز کرنے کے بعد آخر وہ اپنی طویل تنہائی کے خول سے باہر نکلا اور اس نے ان لوگوں کو راہبوں کی ایک برادری کی صورت میں منظم کیا۔ یہ ''اولین'' راہب سینٹ اینتھونی کے ماننے والے تھے، جنہیں اپنی ذات کی نفی کے شان دار مظاہرے کا موقع ملا۔ مثال کے طور پر سائمن اسٹالائٹس پتھر کے ایک ستون پر پینتیس سال تک بیٹھا رہا۔ اس زاہدانہ زندگی نے بالآخر مذہبی برادریوں کو متاثر کیا، جو دنیا داری سے الگ ہوتی گئیں اور لوگوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ تقدس کی زندگی گزاریں۔ سینٹ بینیڈکٹ نے اٹلی کے مونٹی کیسینو میں ایک خانقاہ قائم کی۔ جہاں خدا کی اطاعت کی زندگی گزارنے پر زور دیا گیا۔ آئرلینڈ کی

خانقاہیں ایونجلک عقیدے کے مراکز تھے۔

مسیحی شخصیت کی ایسی پرکشش مثالیں پیش کر کے ان راہبوں نے چرچ کو وہ اعتبار دیا کہ رومن شہادت کے طویل زمانے گزر جانے کے بعد بھی اس نے انسانوں کے دل جیت لیے۔ مسیحیت کو ترقی چرچ کے ڈاکٹروں اور دینیات کے عالموں سے بھی ملی، جنہوں نے کفرو الحاد کا مقابلہ کیا اور نہایت دشوار اخلاقی سوالوں کے جواب مہیا کیے۔ اس کو فروغ دلیر اور لائق انتظامی ماہروں سے بھی ملا۔ جیسے سینٹ ایمبروز، میلان کا بشپ جس نے بادشاہوں کے ساتھ ملاقات سے اس وقت انکار کر دیا جب یہ دیکھا کہ ان کی حکمت عملی چرچ کے مفادات کے خلاف جا رہی تھی۔ پوپ لیو اوّل نے بازنطینی سلطنت سے الگ رومن چرچ کو طاقت کا مرکز بنایا اور سیکولر اقتدار سے الگ اس کا روحانی اقتدار قائم کیا۔ بربر قبائل کے یورپ پر حملوں کے بعد مسیحی چرچ زوال رسیدہ سلطنت کی تہذیبی اقدار کی نمائندگی کر رہے تھے۔ انہوں نے ان بربر قبائل کو قائل کر دیا کہ مسیحی عقیدہ قبول کرنے کے بعد ہی وہ مہذب معاشرے میں شامل ہو سکیں گے۔ ابتدا میں چرچ کے زیرِ اثر علاقے ہی تھے جو رومن سلطنت کی حدود میں آئے تھے، لیکن اس کے بعد ان کی مشنریاں رومن سلطنت کی حدود سے بہت آگے نکل گئیں اور لامذہب علاقے میں خدا کی روحانی سلطنت کو پھیلا دیا۔ سینٹ پیٹرک نے آئرلینڈ کے باشندوں کو عیسائی بنایا اور ان کی مشنریوں کو شمالی انگلستان بھیجا۔ ایک انگریزی مشنری سینٹ بونی فیس نے جسے ہالینڈ میں شہید کر دیا گیا تھا، آٹھویں صدی میں پہلی کلیسائی عمل داری قائم کی تھی۔

جس طرح یہودی مبلغوں نے ایک زمانے میں یروشلم کے سقوط کو روحانی فیضان سے بدل دیا تھا، اُسی طرح جب روم کو شکست ہوئی تو اس وقت سینٹ آگسٹائن کی تحریروں سے بہت فائدہ اٹھایا گیا۔ آگسٹائن پال کے بعد سب سے بڑا مسیحی عالم دینیات تھا۔ ایک زمانے میں وہ مانی کے عقیدے پر کاربند اور نئی افلاطیت کا قائل تھا۔ اس کی کتاب ''اعترافات'' سے معلوم ہوتا ہے کہ کارتھیج میں جب وہ جوان تھا اس نے بڑی ہنگامہ پرور زندگی گزاری۔ پھر سینٹ ایمبروس اور اس کی والدہ سینٹ مونیکا کے اثر سے وہ عیسائی ہو گیا۔ دینیات پر اس کی بعد کی کتابیں اس کے راسخ العقیدہ مسلک نجات کی تعلیم اور پہلے گناہ کے حوالے سے سامنے آئیں۔ اٹلی اور شمالی افریقا میں جب بربر قبائل زبردست تباہی پھیلا رہے تھے۔ آگسٹائن نے خدا کا شہر(The City of God) لکھی اور یہ وضاحت کی کہ روم نے جب کفر

کے خداؤں کو چھوڑ دیا اور مسیحیت اختیار کی تو یہ عظیم شہر کیوں زوال کو پہنچا۔ آگسٹائن نے اس کے جواب میں ایک خطِ تفریق دنیادار شہروں، جیسے روم اور ''خدا کا شہر'' کے درمیان کھینچ دیا۔ یہ شہر کبھی تباہ نہیں ہوگا کیوں کہ اس کی تخلیق خدائی مسیحیت سے ہوئی تھی اور وہ کبھی تبدیل نہیں ہو گا۔ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ یہ دنیاوی شہروں سے یک سر مختلف ہوگا، اس کے مقابلے میں وہ شہر لازمی طور پر فنا ہو جائیں گے جو خود غرضانہ خواہشوں اور تکبر کی بنیاد پر تعمیر کیے گئے تھے۔ اسی لیے جب روم کی سیکولر سلطنت زمین بوس ہوگئی، انسانیت اس کے ساتھ وابستہ رہی جو بدعنوانی اور زوال سے محفوظ تھی۔

چرچ کا غالباً سب سے زیادہ لائق منتظم پوپ گریگوری اعظم تھا، جس کا اعزاز یہ تھا کہ ایک نہایت اندوہ ناک زمانے میں رومن چرچ کو دوبارہ تعمیر کیا۔ گریگوری ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوا تھا، لیکن اس نے ایک راہب کی سخت کوش زندگی اختیار کی اور اس کے بعد برتر روحانی منصب کے زینے طے کرتا چلا گیا۔ پوپ ہوتے ہوئے اس نے چرچ کے ڈسپلن کو مستحکم کیا، چرچ کی املاک کی از سر نو تنظیم کی، دو ونز دیک مشنریاں بھیجیں، روم کی سیاسی آزادی کے لیے لومبارڈ بادشاہوں سے معاملات طے کیے اور بازنطینی پادریوں کے حریفانہ مطالبوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کا ایک قابلِ ذکر کارنامہ برطانیہ کو کیتھولک عقیدے کا پابند بنانا تھا۔ گریگوی نے 597 عیسوی میں ایک بنی ڈکٹ فرقے کے راہب آگسٹائن کو ایک مشن کی خاطر جزائر برطانیہ بھیجا۔ بادشاہ ایتھی برٹ نے آگسٹائن اور اس کے چالیس مہم سفر راہبوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور انہیں کینٹر بری کے مقام پر چرچ کی تعمیر کے لیے زمین بھی دی۔ برطانیہ میں اس کی بروقت آمد نے آئرلینڈ کی مسیحی تہذیب کو پھیلنے سے روک دیا، جو بہ صورت دیگر مغربی مسیحیت میں قیادت کے لیے کیتھولک فرقے کے آگے ایک چیلنج بن جاتی۔ 664 عیسوی میں ویٹ بائی کی مجلس عمومی (Synod) ایک معاہدہ طے پایا کہ ایسٹر کی تاریخ کا شمار کس طریقے سے کیا جائے اور یہ کہ راہبوں کے سر مونڈے جائیں۔ ان دونوں باتوں کے طے ہونے سے روم کا پلہ بھاری ہو گیا۔

رومن چرچ کی طاقت

فنی اعتبار سے پوپ، روم کا بشپ اور اس شہر میں عیسائیوں کا سربراہ تھا۔ پھر اس نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے تابعین ہونے کی حیثیت پوری مسیحی دنیا کی قیادت سنبھال لی۔

ابتدا میں قیادت کا کردار یروشلم کے چرچ نے اختیار کر لیا تھا۔ جیسس کے بھائی جیمز اس کے قائد تھے۔ یروشلم کی جگہ روم نے مسیحیت کا مرکز ہونے کی بنا پر اہمیت اختیار کر لی، کیوں کہ پیٹر اور پال جیسے راہب اس شہر میں گئے تھے، جہاں ان کو شہید کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا روم کا چرچ ایک روحانی حکومت بن گیا تھا، جس کا تعلق ایک تسلسل کے ساتھ پیٹر کے ساتھ جا ملتا تھا، جو روم کا پہلا بشپ تھا۔ میتھو کی گوسپل (صحیفے) کی ایک مشہور عبارت یہ ہے کہ ''تم پیٹر ہو، ایک چٹان۔ وہ چٹان جس پر میں اپنا چرچ تعمیر کروں گا۔ میں خدا کی بادشاہی کی کنجی تمہارے حوالے کروں گا۔ جس کو تم زمین پر روک دو گے، اسے جنت میں داخلے سے روک دیا جائے گا اور جس کی تم زمین پر اجازت دو گے، اس کی اجازت جنت میں ہو گی۔'' زمانہ وسطیٰ کے فنون میں سینٹ پیٹر کو اکثر ہاتھ میں چابیاں پکڑے ہوئے دکھایا گیا تھا، جو جنت کی چابیاں تھیں۔ بائبل کے حوالے کی رو سے جیسس کو پیٹر کی سپردگی میں دیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں پیٹر کی روحانی نیابت ثابت ہو گئی اور یہ طے ہو گیا کہ جنت میں داخلے کی اجازت کا اختیار کسے حاصل ہو گا۔

جب مسیحیت کو روم کا ریاستی مذہب تسلیم کر لیا گیا تو چرچ کے اقتدار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ تاریک زمانوں میں زوال رسیدہ ریاست کی حیثیت روم کے جائز وارث کو منتقل کر دی جاتی تھی۔ رومن چرچ ایک پُرشکوہ سلطنت کی باقیات میں سے تھا، جواب باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پوپ دنیاوی حکمرانوں کے ساتھ اتحاد کی بنا پر ان کے منصب اور اختیار استعمال کر رہا تھا۔ اس طرح حکمرانی کا ایک دہرا نظام قائم ہو گیا تھا۔ ایک عالم گیر چرچ جس کی روحانی عمل داری ایک زوال رسیدہ ریاست کے نصف مغرب پر حاوی تھی اور اس کا اشتراک لاتعداد سیکولر ریاستوں کے ساتھ تھا، جنہیں وحشی قبائل نے بنایا تھا، وہی لوگ جو روم کے زوال میں شامل تھے۔ بعد میں اس ریاست کی از سر نو تعمیر کا خیال یورپ کی تاریخ کا ایک مستقل موضوع تھا۔ ایک جرمن شاہی خاندان نے جو روم کے چرچ کا حمایتی تھا، آٹھویں صدی میں مغربی یورپ کے بڑے حصے پر سیکولر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ پھر جب 800 عیسوی میں پوپ لیوسوم نے شارلیمین (Charlemagne) کو مقدس رومن سلطنت کا تاج دار بنایا تو اس وقت یہ معلوم ہو رہا تھا کہ شاہی اقتدار دوبارہ واپس آ جائے گا۔ تاہم شارلیمین کے مرنے کے بعد سیکولر حکومت پھر تقسیم ہو گئی اور بعد میں اس کے تین پوتے تخت کے وارث قرار پائے۔ زمانہ وسطیٰ میں اقتدار دو اداروں کے درمیان تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک چرچ، دوسرا ریاست۔ چرچ لوگوں کی روحانی

ضروریات کی نگہداشت کرتا تھا اور سیکولر حکومتیں انہیں جسمانی طور پر تحفظ فراہم کرتی تھیں۔

گوشوارہ 5-1 TAble: 5-1

دوسری تہذیب کی تاریخ میں نمایاں واقعات

فاراوہ اخناتون جدی حکومت کی ابتدا کرتا ہے	C. 1375 B.C.
عبرانی فلسطین پر حملے شروع کرتے ہیں	C. 1250 B.C.
سلیمانؑ کی وفات اور عبرانی سلطنت کی تقسیم	C. 925 B.C.
زرتشت پر مذہب کا نزول	C. 600 B.C.
نبوکدنصر یروشلم پر قبضہ کرتا ہے	586 B.C.
بدھا کو نروان حاصل ہوتا ہے	530 B.C.
سقراط پر مقدمہ چلا کر اسے موت کی سزا دی جاتی ہے	399 B.C.
شہنشاہ اشوک بدھ مت اختیار کر لیتا ہے	261 B.C.
بدھ مت کے ماننے والے پالی ضوابط اختیار کرتے ہیں	250 B.C.
مسیح کا مصلوب ہونا اور نئی زندگی پانا	30 A.D.
سینٹ پال مشنری اسفار کا آغاز کرتا ہے	45 A.D.
روم میں سینٹ پیٹر کو سزائے موت	67 A.D.
رومی یروشلم کو تباہ کر دیتے ہیں	70 A.D.
کنِشک مہایانہ بدھ مت کی ترویج کرتا ہے	C. 100 A.D.
مانی نئی فکر کی تبلیغ کا آغاز کرتا ہے	242 A.D.
کانسٹنٹائن مسیحیت کو قانونی حیثیت دے دیتا ہے	313 A.D.
نیسیا میں ایک مسیحی کونسل تثلیث کی فکر اختیار کر لیتی ہے	323 A.D.
سینٹ آگسٹائن "خدا کا شہر" (City of God) تصنیف کرتا ہے	411 A.D.
ایفی سس کی کونسل نستورین فرقہ کی مذمت کرتی ہے	431 A.D.
سینٹ پیٹرک آئرلینڈ میں مشن کا آغاز کرتا ہے	432 A.D.
فرانکوں کے بادشاہ کلووس کو بپتسمہ دے کر مسیحی بنایا جاتا ہے	496 A.D.

بینیڈکٹ مونٹ کسینو پر بھکشو گھر تعمیر کرتا ہے	529 A.D.
گریگوری اول پوپ بنتا ہے	590 A.D.
آگسٹین کو پوپ گریگوری انگلینڈ کی مہم پر روانہ کرتا ہے	596 A.D.
غارِ حرا میں حضرت محمد ﷺ پر وحی کا نزول	610 A.D.
حضرت محمد ﷺ کی مدینہ کی جانب ہجرت	622 A.D.
حضرت محمد ﷺ کی وفات	632 A.D.
قران پاک کی ترتیب	650 A.D.
حضرت معاویہ بنی اُمیہ کی حکمرانی کا آغاز کرتے ہیں	658 A.D.
خلیفہ سوم حضرت علیؓ کی شہادت	661 A.D.
سائینوڈ اور وائٹ بائی انگلینڈ کو روم سے وابستہ کرتا ہے	664 A.D.
یروشلم میں ڈوم آف راک کی تعمیر	691 A.D.
بازنطینی بادشاہ لیو اوّل آئیکونز پر حملہ کرتا ہے	726 A.D.
تورز کے میدان میں فرانک مسلمانوں کو شکست دیتے ہیں	732 A.D.
بغداد میں عباسی حکمرانی کی تشکیل	749 A.D.
عرب، چینیوں کو ثمرقند میں شکست دیتے ہیں	751 A.D.
شارلیمین مقدس رومن بادشاہت کا شہنشاہ بنتا ہے	800 A.D.
چین میں غیر ملکی مذاہب پر تعدی	841 A.D.
کلونی میں رہبانیت کی تحریک کا آغاز	910 A.D.
قرلوک ترک سنی مذہب اختیار کر لیتے ہیں	960 A.D.
مصر میں فاطمی حکمرانی	969 A.D.
کیف کے ولادی میر کو بپتسمہ، آرتھوڈاکس مذہب اختیار	989 A.D.
کانسٹنٹی نوپل اور رومن چرچ میں علیحدگی	1054 A.D.
سلجوقی ترک بغداد پر قبضہ کر لیتے ہیں	1055 A.D.
سپین میں المراوی خاندان کی حکمرانی	1086 A.D.
(گناہ سے) شرم سار شہنشاہ ہنری کو (پوپ) گریگوری ہفتم معاف کرتا ہے	1087 A.D.

پوپ اربن دوم پہلی صلیبی جنگ کا آغاز کرتا ہے	1095 A.D.
صلاح الدین صلیبیوں سے یروشلم واپس چھین لیتا ہے	1187 A.D.
دہلی میں مسلمان ریاست کی تشکیل	1206 A.D.
سینٹ تھامس ''سماتھیالوجیکا'' (Summa Theologica) لکھتا ہے	1273 A.D.
پاپائیت روم سے فرانس میں ایویگنون کو منتقل	1309 A.D.
پاپائیت کی روم کو واپسی	1377 A.D.
مارٹن پنجم کے بطور پوپ انتخاب سے ''عظیم تقسیم'' کا خاتمہ	1417 A.D.
بازنطینی شہنشاہ پاپائیت کی بالادستی تسلیم کر لیتا ہے	1439 A.D.
ترک خلافت کا قسطنطنیہ پر قبضہ	1453 A.D.
سپین سے مُوروں کی بے دخلی	1492 A.D.
مارٹن لوتھر کلیسیا کے دروازے پر 95 خطبات چسپاں کرتا ہے	1517 A.D.
ہندوستان میں بابر مغل حکمرانی کی بنیاد رکھتا ہے	1525 A.D.
ہنری ہشتم چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ بنتا ہے	1534 A.D.
سکھوں کے پہلے گورو بابا نانک دیو کا انتقال	1538 A.D.
اِگنےشیئس لویولا پہلی مسیحی مجلس قائم کرتا ہے	1540 A.D.
ہندو بادشاہت وجے نگر پر مسلمانوں کا قبضہ	1565 A.D.
مغل بادشاہ اکبر نئے مذہب کا اعلان کرتا ہے	1582 A.D.
جوزف سمتھ نے Mormon tablets ایجاد کیں	1827 A.D.
چارلس ڈاروِن اپنی تحقیق Origin of Species شائع کراتا ہے	1859 A.D.
یہودی ریاست کے طور پر اسرائیل کی تشکیل نو	1948 A.D.
پال ٹِوچل ایکنکار کو مغرب میں لاتا ہے	1965 A.D.

اگرچہ چرچ اور ریاست دونوں ایک دوسرے کے تعاون سے کام کر رہی تھیں، لیکن ان میں طاقت کے لیے کھینچا تانی بھی ہوتی تھی۔ رومن چرچ کے سربراہ پوپ کی کوشش یہ تھی کہ اپنے مسلمہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے اور اس سے زیادہ شدت کے ساتھ غیر تابع وار حکومتوں کو دین کے دائرے سے خارج کرتے ہوئے سیکولر حکومتوں پر برتری ثابت کرے۔

تاریخ میں یہ بات درج ہے کہ شہنشاہ ہنری چہارم کتنی تذلیل کے احساس اور پشیمانی کے ساتھ پوپ کے سامنے پیش ہوا اور کس طرح گریگوری ہفتم نے اسے 1076 میں مسیحیت کے دائرے سے خارج کر دیا تھا۔ اگر چرچ کسی بادشاہ کو سزا دینا چاہتا تو اس کو اور اس کی رعیت کو عشائے ربانی دینے سے انکار کر دیتا، اس طرح انہیں جنت میں داخلے کے حق سے محروم کر دیتا۔ دوسری طرف بادشاہ اور شہنشاہ اپنے زمینی اقتدار کی بہ دولت چرچ کے ساتھ لڑائی کرتے۔ ایک خاص اختلافی نقطہ جس پر پوپ اور یورپی شہنشاہوں میں لڑائی جاری رہتی تھی، یہ تھا کہ مقامی چرچ عہدے داروں کے تقرر کا اختیار کس کے پاس ہونا چاہیے۔ کلیسا اور ریاست کے مصالحتی ادارے نے اس مسئلہ کو پوپ کے حق میں طے کر دیا لیکن بادشاہوں کو اجازت دے دی کہ وہ چرچ کے انتخابات کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ انصاف کا بندوبست روحانی اور سیکولر عدالتوں کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ایک کے کچھ اختیارات تھے اور دائرۂ اختیار تھا۔ پوپ بنی فیس ہفتم نے روحانی اور سیکولر حکومتوں کو چرچ کی ''دو تلواریں'' کہا تھا۔ یہ علامت تھی، طاقت کے دو ایوانوں کی جس کا اظہار اس دور کے سکوں میں اکثر ہوتا تھا کہ پوپ کی شباہت ایک طرف ہوتی، مقدس رومن بادشاہ کا چہرہ سکے کی دوسری طرف۔

ذاتی سطح پر رومن چرچ اپنے اختیار کا استعمال مقدس رسوم کی ادائیگی کے ذریعے کرتا تھا۔ کچھ ایسی رسوم تھیں، جنہیں پادری انجام دیتے، جو نجات کے لیے ضروری ہوتی تھیں۔ ان میں سات رسوم سب سے زیادہ اہم تھیں، بپتسمہ، توثیق، عشائے ربانی کی تکمیل، اعترافِ گناہ اور ادائے کفارہ، تدفین۔ روغن وغیرہ ملنے کا عمل اور رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا۔ چرچ کے اصولوں میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ انہی رسوم کے ذریعے سے خدا اپنے بندوں پر رحمتیں نازل کرتا ہے۔ رحمت سے مراد گناہوں کی غیر مستحق معافی۔ ان رسوم کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ تمام بندے گنہ گار ہیں اور بخشش کے حاجت مند ہیں، لیکن صرف اپنی طاقت سے اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ عشائے ربانی کی ادائیگی، جو جیسس کی اپنے شاگردوں کے ساتھ آخری عشایے کی طرز پر تھی، تمام دیگر رسوم میں سب سے اہم قیاس کی جاتی ہے۔ ابتدائی دور کے مسیحیوں نے اس رسمی کھانے کو خاص طور پر عزیز رکھا کہ عقیدے کی رو سے عیسیٰ انہی تقریبات کے درمیان ظہور کریں گے۔ ایک راہب ریڈبرٹس نے ایک مقالہ لکھا جس میں یہ دلیل پیش کی کہ 'ماس' کے جشن میں جو روٹی کھائی گئی، وہ جیسس کا گوشت اور جو شراب پی گئی، وہ عیسیٰ کا خون تھا۔ ایک دوسرے راہب نے یہ بتایا کہ یہ دونوں اشیا عیسیٰ کے جسم اور خون کے حوالے

سے محض علامتی تھیں۔1215 میں جب چوتھی بڑی کونسل منعقد ہوئی تو اس لفظی توجیہہ کو جواز منۂ وسطیٰ کی روح کے مطابق تھی، تسلیم کر لیا۔

چرچ کا یہ دعویٰ تھا کہ جیسس اور ان کے حواریوں کے درمیان مضبوط رابطہ ہونے کی بنا پر تمام دینی سوالوں کے جواب دینے کے صحیح حق دار وہی ہیں۔ بائبل میں خدا کے الفاظ کا تاریخی اندراج، صداقت کی سند ہے۔ اس کے ساتھ ہی رومن چرچ نے چرچ کی روایتی تعلیمات پر بہت زور دیا۔ ایسے اصول جن کے محرک روح القدس ہوں، مقدس صحائف کے برابر اختیار رکھتے ہیں۔ ''چرچ نے کبھی غلطی نہیں کی اور تا قیامت غلطی نہیں کرے گا،'' گیارھویں صدی میں پوپ کے ایک اعلان میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ ''جیسس کی طرح پوپ بھی روح القدس کے سایے سے اپنی ماؤں کے بطون سے جنم لیتے ہیں۔ آسمانوں اور زمینوں کی ساری طاقت ان کو دی جاتی ہے۔ اس طرح کے رویے کی بنا پر یہ بات حیران کن نہ ہوگی کہ رومن چرچ کے رہنماؤں نے سرکاری سطح پر تفتیش شروع کی اور بے دینوں کو آگ میں جلا دیا۔ اس کے باوجود کہ چرچ نے عقیدے پر اپنی اجارہ داری کو نافذ کرنے کی بہترین کوششیں کیں، لیکن عقلی سطح پر چھان بین کی صورت میں بے یقینی معاشرے کے اندر پھیلتی چلی گئی۔ اس بنا پر کہ سینٹ پیٹر کے پوپ کے ساتھ روابط تھے، 1378-1417 کے دوران میں زبردست تفرقہ پڑ گیا جس میں دو متحارب پوپ اپنی اپنی مقتدر حیثیت کا دعویٰ کر رہے تھے، اس سے پاپائیت کے ادارے میں اعتماد کا شدید بحران پیدا ہو گیا۔

رومن چرچ ایک دنیاوی طاقت بنتا جا رہا تھا جس کا غالباً بہترین ثبوت اس کے طریقۂ استدلال اور فوجی طاقت کے استعمال میں تھا۔ چرچ بجائے خود اٹلی کے چند شمالی اور وسطی علاقوں میں قابض تھا۔ 756 عیسوی میں پپن سوم نے پوپ کو کچھ اراضی جو اس نے لومبارڈس سے جیتی تھی، عارضی طور پر بطور انعام اس لیے دے دی تھی کہ پوپ نے جرمنی کے تخت حکومت پر کورولنگنس کے دعوے کی تائید کی تھی۔ پھر پوپ کی ریاستوں اور مقدس رومن بادشاہوں کے درمیان ان زمینوں اور دیگر علاقوں کی ملکیت کے لیے طویل عرصے تک جنگ ہوتی رہی۔ بہر حال چرچ صلیبی جنگ کو شروع کرنے اور اسے برقرار رکھنے کا بھی ذمہ دار تھا۔ ان جنگوں کا رخ گیارھویں اور تیرھویں صدیوں کے درمیان فلسطین کے مسلمان حکمرانوں کی طرف تھا۔ پیٹر ''دی ہرمٹ'' اور دوسرے افراد کی ان شکایات کے جواب میں کہ ترک، مسیحی زائرین کو ہراساں کرتے رہتے ہیں، پوپ اربن سوم نے ایک اپیل یورپ کے عیسائیوں کے

نام1095 میں جاری کی کہ وہ اس مقدس شہر کو مسلمانوں سے واپس چھین لیں۔ بولئین کے گوڈ فرائی کی زیر قیادت ایک زبردست فوج اس مشن کی تکمیل کے لیے قسطنطنیہ میں جمع ہوئی، ان کا نعرۂ جنگ تھا: ''اگر خدا نے چاہا''۔ عیسائی صلیب برادروں نے1099 میں یروشلم کو ایک زبردست جنگ کے بعد فتح کر لیا جس میں ستر ہزار شہری ہلاک ہو گئے۔ ایک فرانسیسی بادشاہ کو مفتوحہ شہر کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ پہلی صلیبی جنگ کے بعد آٹھ دوسری جنگیں ہوئیں، جو بتدریج کم سے کم کامیاب ہوتی رہیں۔ آخر میں مسلمانوں نے اس علاقے پر قبضہ برقرار رکھا۔

راسخ العقیدہ عیسائیت

مشرقی روم کی سلطنت نے پانچویں اور چھٹی صدیوں کے دوران میں بربر قبائل کی یورش کا مقابلہ کیا اور اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ وہ قسطنطنیہ میں روم کی عمل داری سے وابستہ رہے۔ ایک چرچ کونسل کا اجلاس381 عیسوی میں ہوا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ پاپائے روم کی حاکمیت کے بعد اس کا درجہ دوسرے نمبر پر ہے۔ چرچ کونسل نے451 عیسوی میں کالیڈان میں ایک اجلاس بلایا اور قسطنطنیہ کی برتری مغربی ترکی اور آبنائے بلقان پر تسلیم کر لی۔ اس میدان میں سیاسی قائدین مذہبی اداروں پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت وہ جسٹینین (Justinian) کے اس اصول پر عمل کرتے ہیں کہ ''چرچ میں کوئی بات شہنشاہ کے حکم اور خواہش کے خلاف نہیں ہونی چاہیے''۔ اب چرچ کی حیثیت حکومت کے ایک ادارے کی سی ہو گئی جو مذہبی رسوم کی ادائیگی کا ذمہ دار تھا۔ قسطنطنیہ کی شہری انتظامیہ روم کے کلیسا کے برابر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتی تھی اور ایسے کسی اختیار کی مالک نہ تھی جو صحائف کے مندرجات کے منافی ہوتی۔ شہری انتظامیہ کی عمل داری صرف جغرافیائی حدود تک تھی۔ اس کے اختیارات کا دائرہ بس اتنا تھا کہ شاہی اقتدار کے مقرر کردہ خطوط کی پابندی کریں۔ نتیجہ یہ کہ مشرقی چرچ میں اقتدار کا مرکز اس وقت ماسکو منتقل ہو گیا، جب پندرھویں صدی میں قسطنطنیہ ترکوں کے قبضے میں چلا گیا۔

راسخ العقیدہ عیسائیت نے چرچ کے اختیار، اس کی ہیئت ترکیبی، اس کے فرامین، میثاق، پادریوں کی پاک بازی اور دیگر دنیاوی امور پر جو مذہب سے متعلق تھے، مغربی چرچ کے مقابلے میں زیادہ زور نہیں دیا بلکہ ان کا زیادہ زور دین سے متعلق سوالوں پر تھا۔ مشرقی چرچ نے عیسیٰ کے وجود کے بارے میں کلسیڈان کے اس حل کو تسلیم نہیں کیا کہ دو طبائع کے اندر ایک ہی ہے، کسی تبدیلی کے بغیر، کسی تقسیم کے بغیر۔ انہوں نے نائیسین کے مسلک میں اس شق کو بھی تسلیم نہیں کیا کہ مقدس روح، ''باپ سے بیٹے تک'' چلتی آئی تھی۔ کٹر اصول دین میں اس

واحد نوعیت پر زور دیا گیا تھا کہ یسوع کی زمینی حیثیت نظر انداز کرتے ہوئے اس کی آسمانی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ راسخ العقیدہ چرچ کے حوالے سے ایک متنازعہ مسئلہ بت شکنی کا تھا۔ آسمانی ہستیوں کو بصری انداز ے پیش کرنے کے معاملے کو مسیحی چرچ نے بہت عرصہ گوارا کیا تھا جو قدیم یہودی عقیدے کے خلاف تھا۔ شاہ لیوسوم نے اس توقع پر کہ انہیں یہودی اور مسلمان رعیت میں زیادہ تعاون حاصل ہو جائے گا726 عیسوی میں کلیسا کے اندر بت رکھنے کے خلاف ایک ذاتی مہم شروع کر دی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ تمام بت تلف کر دیے جائیں اور کلیسا کے جو عہدے دار اس کی مخالفت کریں، انہیں برطرف کر دیا جائے۔ بت شکنی پر مبنی اس پروگرام کی مزاحمت اور مخالفت معبدوں میں زیادہ شدت سے کی گئی۔

ڈیماسکس کے جان نے کہا کہ یہ بت مذہب کی تفہیم میں مدد کرتے ہیں۔ ''جب ہم کسی جگہ پر مسیح کی شباہت رکھتے ہیں'' تو ہم لوگوں کے حواس سے خطاب کرتے ہوتے ہیں، شباہت بہرطور ایک طرح کی یاد دہانی ہوتی ہے۔ یہ ایک ان پڑھ کے لیے وہی چیز ہے، جو ایک خواندہ کے لیے کتاب ہوتی ہے اور سننے والے کے لیے ایک لفظ اور نابینا شخص کے لیے نظر آنے والی شے، لیکن لیو ایسے دلائل سے قائل نہیں ہوا، حالانکہ اُس کی زبردست مخالفت ہوئی اور مغربی کلیسا میں تفرقہ بڑھتا گیا، لیکن اس نے بت شکنی کی مہم جاری رکھی۔ اس کا بیٹا کانسٹنٹائن تو اور بھی زیادہ کٹر بت شکن نکلا۔ آخر ہیرا کے پادری نے753 میں رسمی طور پر بادشاہ کے موقف کی تعریف کی۔ تین دہائیوں کے بعد کانسٹنٹائن کا پوتا بادشاہ بن گیا، لیکن وہ ابھی حکومت کرنے کے لیے بہت چھوٹا تھا، لہٰذا اس کی ماں آئرین نے اقتدار سنبھال لیا۔ جب یہ ظاہر ہونے لگا کہ نوعمر شہزادے کو بت شکنی کا منصوبہ بہت پسند آنے لگا تھا تو اس کی والدہ نے اس کی راہ روکنے کے لیے اقدامات کیے۔ اس نے چرچ کی عام مشاورت کا اجلاس بلایا تاکہ سابقہ فیصلوں کو منسوخ کر دیا جائے۔ خود اپنے خاندان میں مخالفت کو ناکام بنانے کے لیے اس نے نوجوان شہزادے کو یعنی خود اپنے بیٹے کو اندھا کروا دیا اور تختِ حکومت سے محروم کر دیا۔ مذہبی شباہتوں کو استعمال کرنے کی اجازت پھر دے دی گئی۔ پھر لیو پنجم کے دورِ حکومت میں بت شکنی کی مہم کی تجدید کی گئی، لیکن اور بت پرست شہزادی اور والیٔ تخت تھیوڈورا کی مداخلت پر اس مہم کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ آخر اس بات پر سمجھوتا ہو گیا کہ دو حجم والی شباہتیں استعمال کی جا سکیں گی، لیکن تین حجم کی شباہتوں کی نمائش ممنوع ہو گی۔

مسیحیت کی مغربی اور مشرقی شاخوں کے درمیان تفرقے کے جو اسباب تھے، بتوں

پر شور شرابا ان میں سے ایک سبب تھا۔ جہاں بازنطینی ریاست میں مشرقی اکابر کے دنیاوی اختیارات بہت محدود کر دیے گئے تھے، مغربی چرچ رفتہ رفتہ زیادہ طاقت وَر ہوتا جا رہا تھا۔ جب پاپائے روم نے پیٹر کے وارث ہونے کی بنا پر اولیت کا دعویٰ کیا تو اس طرح قسطنطنیہ کے حاکم اعلیٰ نے اس بنیاد پر اقتدار کا دعویٰ کیا کہ رومن سلطنت کی باقیات سے اس کی رشتہ داری ہے۔ اس طرح مقدس رومن سلطنت کی بادشاہت کے لیے جب پوپ کی تاج پوشی کا معاملہ اٹھا تو یہ بازنطینی سلطنت اور اس کے محروسہ چرچ کے دعووں کے لیے باقاعدہ چیلنج بن گیا۔ تصویروں کے ذریعے علم کی ترسیل کا عمل، روم سے آزادی کا اعلان، چرچ کی دونوں شاخوں کے درمیان فوری طور پر علیحدگی کا سبب بن گیا۔ دینی اعتبار سے ان میں تفرقہ اس بنا پر پیدا ہوا کہ مشرقی چرچ نے ''فیلیو'' کے ضابطے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ عظیم تقسیم سرکاری طور پر 1054 عیسوی میں ہوئی۔ اس وقت جب پوپ لیونہم سے میکائیل سیرولیپر لیس کو جو مشرقی کلیسا کے سربراہ تھے، مسیحیت کے دائرے سے نکال دیا تھا۔ جب جرمن صلیبی جنگ آزماؤں نے 1204 میں قسطنطنیہ کو تباہ و برباد کر دیا تو مسیحیت کے ان دونوں دھڑوں کے درمیان کسی طرح کی مفاہمت ناممکن ہو گئی۔ بازنطینی فرمان روا نے پندرھویں صدی میں روم کے روحانی اختیار کو تو تسلیم کر لیا، لیکن سلطنت کو عثمانی ترکوں کی فتح سے بچانے کے لیے اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی تھی۔

اب بازنطینی چرچ کے لیے نجات کی صورت یہ تھی کہ سلاوک لوگوں تک پہنچیں۔ نویں صدی میں قسطنطنیہ کے دینی سربراہ نے دو صاحبانِ علم بھائی تھیسا لونیکا سے قسطنطنیہ اور متھیوڈس، ہمسایہ آبادیوں میں تبلیغ کے لیے بھیجے تھے۔ وہ پہلے خضریہ گئے۔ لیکن وہاں کے حکمرانوں نے اس کی بجائے یہودیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد ان دونوں بھائیوں کو عظیم موراویا (چیکوسلواکیہ اور ہنگری) کی سلاوک حکومت سے اپنے یہاں آنے کی دعوت ملی۔ کانسٹنٹائن جو سیرل کے نام سے بھی پہچانے جاتے تھے، اپنے ساتھ گلیکول زبان کے حروف تہجی لائے، جنھیں انہوں نے یونان میں رہنے والے سلاوَ باشندوں کے لیے ایجاد کیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے اس رسم الخط کو اپنے مقامی محاورے کے مطابق وضع کر لیا۔ اگرچہ جرمن پادریوں کے دباؤ کی بنا پر انہیں موراویا سے نکال دیا گیا، لیکن چند بچے ہوئے بنیاد پرست پادری اپنے مسودے کے ساتھ بلغاریہ چلے گئے۔ بلغاریہ کے باشندوں نے 863 عیسوی میں مشرقی بنیاد پرست مسیحیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے فرمان روا خان بورس میکائیل

نے موراویا کے پناہ گزین پادریوں کا اس خیال سے خیر مقدم کیا کہ سلاوک زبان کے مسودے کی مدد سے بلغاریہ کے لوگ اپنا قومی کلیسا قائم کرلیں گے اور سیاسی اعتبار سے قسطنطنیہ اور روم دونوں کے اثر سے آزاد ہوں گے۔ بلغاریہ کے لوگوں نے 885 عیسوی میں گلیگول کے رسم الخط کو آسان بنایا اور سیرل کے نام کی رعایت سے اسے سیرلک کا نام دیا۔ بنیادی طور پر یہی وہ رسم الخط تھا جس کی بہ دولت روسی بنیاد پرست مسیحیت کے دائرے میں شامل ہوئے۔ بلغاریہ کے کسانوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کی قوم کے لوگ کٹر مسیحی ہو گئے ہیں تو ان پر اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ انہوں نے بوگومل ازم اختیار کرلی، جسے ایک بنیاد پرست پادری بوگومل نے 927 اور 954 عیسوی کے درمیان وضع کیا تھا۔ یہ مذہبی کارپردازوں کے مخالف تھے۔ بولوگومل ازم کا موقف یہ تھا کہ اس دنیا کی تخلیق شیطان نے کی تھی، جو خدا کا بڑا بیٹا تھا اور چھوٹے بیٹے جیسس کو زمین پر اس لیے بھیجا گیا تھا کہ شیطان کی حکمرانی کو ختم کرکے انسانیت کو اس سے نجات دلائے۔ ایک اور نقطۂ نظر یہ تھا کہ خیر اور شر دونوں مساوی ہیں۔ بوگومل ازم کے ماننے والوں نے مسیحیت کو رد کرنے کے ساتھ ہی تجرد اور زہد اختیار کرنے کی تلقین کی، شاید اس لیے کہ بنیاد پرست پادریوں کی ناپسندیدہ عادتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو ان سے الگ دکھانا چاہتے تھے۔ بوگومل مشنری نے اس مذہب کو بلقان کے دوسرے علاقوں میں پھیلا دیا اور خاص طور پر بوسنیا میں فروغ دیا، جہاں کے حکمران خاندانوں نے اس مذہب کو ہنگری کے کیتھولک اور سربیا کے کٹر بنیاد پرستوں کا متبادل سمجھا تھا۔ فرانس کے البیگنیز (Albigenses) بھی اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ بلقان کے علاقے میں جب اسلام پھیلا تو بوگومل کے اس ملحدانہ مسلک کو سختی سے دبا دیا گیا اور وہ ختم ہو گیا۔

ہزار سالہ سن عیسوی کے آخری دنوں میں مشرقی یورپ رومن کیتھولک فرقے کے لوگوں اور یونان کے کٹر بنیاد پرستوں کے درمیان میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ پولینڈ اور بوہیمیا کے لوگوں نے سلاوٓ سے قطع تعلق کرلیا اور رومن کیتھولک چرچ سے وابستہ ہو گئے۔ پولینڈ کے علاقے برکس میں پیش قدمی کو روکنے کے لیے ڈیوک میزکو اوّل (992-960) نے اپنی قلم رَو کو براہِ راست پوپ کی حفاظت اور اختیار میں دے دیا۔ پولینڈ کی خاندانی بادشاہی (Piast) نے خیوتک کے علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا اور بحر بالٹک کے ساتھ جرمنوں کی پیش قدمی کا راستہ روک دیا۔ روس کا مشرقی راسخ العقیدہ، مسیحیت اختیار کرنا اور خیو کے شہزادہ ولاڈیمیر کا بپتسمہ (987) دونوں واقعات ایک ساتھ رونما ہوئے۔ شہزادے نے بہت سے متبادل مذاہب

کے درمیان اس مذہب کا انتخاب شاہ باسل دوم کی ہمشیرہ انا کے ساتھ رشتہ ازدواج کی پیش کش موصول ہونے کے بعد کیا۔ اس وقت ولاڈمیر نے حکم جاری کیا کہ اس کی مملکت کے تمام لوگ اجتماعی طور پر نیا مذہب قبول کریں۔ بلغاریہ کی مشنریاں اپنے ساتھ خیو میں قدیمی چرچ کی لسانیت اور سیرلک حروف تہجی لائیں۔ منگولوں نے یوکرین کو تیرھویں صدی میں فتح کر لیا اور اسے دوصدیوں تک اپنے ماتحت رکھا۔ جب منگولوں کی طاقت گھٹ گئی تو ماسکو کے ڈیوک نے ان علاقوں کو فتح کرنا شروع کر دیا جو بعد میں روسی ریاست کہلائیں۔ جب آئیون سوم نے آخری بازنطینی بادشاہ کی بھتیجی سے شادی کر لی تو اس نے 'زار' کا لقب اختیار کیا اور ماسکو بنیاد پرستی کا نیا مرکز بن گیا۔ قسطنطنیہ کے دینی سربراہ کو سلطنت عثمانیہ میں آباد تمام عیسائیوں کے بارے میں مکمل اختیارات دے دیے گئے۔

ایران میں بعد میں آنے والے مذاہب

زرتشتی مذہب نے پہلے ایرانی شاہی خاندان کی حمایت کی تھی۔ دوسرے بیشتر فلسفیانہ مذاہب کی طرح زرتشتی عقیدے کو بھی ذاتی احوال کے ذریعے معتدل کرنا ضروری تھا تاکہ وہ عبادت کے لیے سازگار ہو جائے۔ اگرچہ زرتشت موحد تھا، لیکن بعد میں اس کے مذہب نے کئی پہلو بدلے اور اہورا مزدہ (Ahura Mazda) کو بہت سی دیویوں میں تبدیل کر دیا۔ ماگی اس مذہب کے موروثی پجاری تھے، عیسائی ان کو اس طرح جانتے تھے کہ تین دانش مند لوگ تھے جو بیت اللحم کے ستارے پر گناہ کرتے ہوئے نومولود جیسس کے لیے تحائف لے کر آئے تھے۔ ارساسد (Arsacid) خاندان نے، جس نے چار صدیوں تک حکمرانی کی، ماگی زرتشتی مذہب کو ذاتی طور پر اختیار کر لیا لیکن وہ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی روادار تھا۔ ساسانی خاندان جس نے 221 میں ارساسد کو تخت حکومت پر بٹھایا تھا، زرتشت سے پہلے کی ''پانی دیوی'' کا پجاری تھا۔ اناہتا (Anahita) نامی اس دیوی کو زرتشتی مذہب کے اندر شامل کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے حکمران اس مذہب کو فروغ دینے میں بہت پرجوش تھے۔

ایک ایرانی نے جس کا نام مانی تھا 240 عیسوی میں یہ تبلیغ کرنی شروع کر دی کہ اس نے روح القدس کے طور پر دوبارہ ظہور کیا ہے۔ وہ زرتشت، بودھ اور عیسیٰ، ان سب کا خود ساختہ وارث تھا اور اس پر خدا کا آخری اور مکمل پیغام نازل ہوا ہے۔ شہنشاہ شاہ پور اول نے ساری مملکت میں اس مذہب کی تبلیغ کی اجازت دے دی، اس کی تبلیغی ٹولیاں مانی مذہب کو

پھیلانے کے لیے مصر، وسط ایشیا اور رومن سلطنت تک پہنچ گئیں۔ زرتشتی مذہب کی طرح اس کی دینیات کا مرکز بھی بدی کی مخالفت، نیکی کی حمایت اور روشنی و تاریکی کے حوالے سے تھا۔ انسان کو مسیح کی الوہی روشنی کے ذریعے اپنی مادی سرشت سے نجات کی ضرورت تھی۔ شاہ پور کی موت کے بعد زرتشت کے ریاستی مذہب کے پجاریوں نے شاہ بہرام اول سے کہا کہ مانی کو گرفتار کر کے اسے پھانسی دے دیں۔ بہر طور عیسیٰ ہی کی طرح مانی کی موت اور اس کے مقلدوں کی گرفتاری اور سزا کے نتیجے میں، اس مذہب کے پھیلاؤ پر مثبت اثر پڑا۔ شمالی افریقا میں آگسٹائن کا مستقبل بھی مانی مذہب ہی کی طرح مختصر تھا۔ مانی عقیدہ، مغربی چین میں آباد یوغر (یا اویغور) ترکوں کا قومی مذہب بن گیا تھا۔ اس نے دیگر مسیحی عقائد کو بھی متاثر کیا۔

چونکہ بت پرستانہ مذاہب پر 391 عیسوی میں تھیوڈوسس اول کی جانب سے پابندی کے بعد مسیحیت رومن ریاست کا سرکاری مذہب بن گئی تھی، لہٰذا ساسانی بادشاہوں نے ایران میں آباد عیسائیوں کو دشمن کا جاسوس سمجھا۔ اس طرح رومن بادشاہ زرتشتوں پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ ایرانی بادشاہوں نے مانی کو پھانسی دے دی تھی اور اس کے ماننے والوں پر سخت عذاب کیا تھا لیکن ڈیوکلیشیئن (Diocletian) نے مصر میں مانی مذہب اختیار کرنے والوں کو ایرانیوں کا خیر خواہ سمجھ لیا تھا۔ کونسل آف ایفیسس (Council of Ephesus) نے 431 عیسوی میں نسٹورین مسیحیوں کی مذمت کی۔ چنانچہ وہ سرحد عبور کر کے ایران کے مقام نیسیبیس (Nisibis) چلے گئے۔ وہاں بطور پناہ گزین ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ روم میں ان پر ہونے والے مظالم کو دیکھتے ہوئے ان کے بارے میں شکوک و شبہات دور ہو گئے۔ تاہم 440 عیسوی میں یزد گرد دوم نے اپنی تمام رعیت کو حکم دیا کہ زرتشتی مذہب اختیار کریں۔ اس حکم سے آرمینیا میں جہاں کی آبادی عیسائی تھی، بغاوت پھوٹ پڑی، جسے کچل دیا گیا۔ ایران کو 484 عیسوی میں ہنوں سے جو فوجی شکست ہوئی تھی، اس کی بنا پر ساسانی حکومت مجبور ہو گئی کہ اپنے موقف سے پیچھے ہٹ جائے اور غیر ایرانی عیسائیوں کو بھی برداشت کرے۔ وہی فوجی تباہی ایک اور سماجی بحران کا سبب بنی۔ جس کے ساتھ ہی مزدک کی سربراہی میں ایک مذہبی تحریک شروع ہوئی۔ مزدک مانی کے ایک اور فرقے ڈرسٹ ڈن (Drist Den) کا سربراہ تھا۔ ایران کے معاشرے میں عدم مساوات کی بنا پر یہ ایک کمیونسٹ تحریک تھی۔ شہنشاہ کاواد اوّل (Kavadh I) نے اسے اختیار کر لیا اور اس کے اصلاحی پروگرام کو نافذ کرنے لگا۔ ایران کی اشرافیہ اور زرتشت کے پجاریوں نے بہم مل کر اس کی مخالفت کی۔ بالآخر خود بادشاہ نے اپنے بیٹے اور جانشین خسرو اوّل کے اصرار پر مزدک کی

عقیدہ ترک کر دیا اور معبد میں اس تحریک کو کچل دیا۔ خسرو اوّل نے 572 میں مشرقی رومن سلطنت کے خلاف جنگ چھیڑ دی جو 590 تک جاری رہی۔ مسیحی رومن اور زرتشتی ایران، ان دونوں کے درمیان ایک اور جنگ 604 میں چھڑ گئی تھی۔ اس جنگ کا فیصلہ 628 تک نہیں ہو سکا تھا۔ آخر پانچ سال بعد عربوں نے ان دونوں حکومتوں پر بہ یک وقت حملہ کر دیا، ایرانی سلطنت فنا ہوگئی اور 637 میں ساسانی دارالحکومت ختم ہو گیا۔

ایران میں بہت سے زرتشتوں نے مسلمانوں کی حکومت کو بہ خوشی تسلیم کر لیا۔ ان میں سے کچھ بھاگ کر شمال مغربی ہندوستان چلے گئے، جہاں انہیں اس شرط پر پناہ دے دی گئی کہ تبلیغ سے باز رہیں گے۔ یہاں ان کو پارسی فرقے کے نام سے پہچانا گیا۔ آج ان کی تعداد دس لاکھ سے بھی کم ہے، ان کا ایک اور گروہ مغرب کی طرف ترکمانستان سے ہوتا ہوا چین پہنچ گیا۔ اس مقام کو خسرو اوّل نے اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔ ایک ساسانی شہزادہ 674 میں پناہ گزین کے طور پر چانگ این پہنچ گیا جو چین کا دارالحکومت تھا۔ ایران کے تینوں بڑے مذاہب زرتشتی، مانی ازم اور نسطورین مسیحیت نے، ٹانگ حکومت کے اوائل میں مغرب کی جانب سے چین میں نفوذ کیا تھا۔ مانی ازم یلغر ترکوں کا قومی مذہب تھا، چنانچہ سب سے زیادہ اس نے اپنے لیے راہیں نکالی تھیں۔ تاہم کرغیز خانہ بہ دوشوں نے یلغر کی حکومت کو 840 میں شکست دے دی۔ چینی حکومت نے 845-841 میں تاؤ مذہب کے پیشواؤں کے بھڑکانے پر باہر کے تمام مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف فوجی کارروائی کر ڈالی، بدھوں کا تو خاص طور پر اقتصادی نقصان ہوا، لیکن چین میں جمے جمائے مذاہب کے خلاف یہ کارروائی مہلک ثابت ہوئی۔

اسلام

ساتویں صدی عیسوی کے اوّلین دور میں عربوں کے اندر مذہبی اور سیاسی آویزشیں جاری تھیں۔ مشرقی رومن اور ایران کی ساسانی حکومتوں کے درمیان جنگ 604 اور 628 عیسوی کے درمیان لڑی گئی تھی۔ عرب دونوں طرف کی فوجوں میں کرایے کے سپاہی تھے، اس سارے عمل کے دوران میں انہوں نے لڑائی اور آلاتِ حرب کے استعمال کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ ایک طرف جہاں عیسائی، یہودی، زرتشتی اور مانی کے مقلد اپنی اپنی بالادستی کی جنگ لڑ رہے تھے، وہیں عرب مذہبی تنازعوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ عرب کے علاقے میں یثرب (مدینہ) اور خیبر جیسے شہروں کے اندر یہودیوں کی خاصی بڑی تعداد رہتی تھی۔ جنوب میں یمن پہلے ایک عیسائی

ملک تھا، اس کے بعد ایرانی سلطنت کے ماتحت ہو گیا۔ تیسری صدی عیسوی میں مانی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ مانی بودھ اور عیسیٰ کے سلسلے کا پیغمبر ہے۔ بعد میں یہی خیال زیادہ مؤثر انداز سے اسلامی مذہب کے بانی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔

اسلام کے معنی ہیں خدا کے حضور میں اپنے آپ کو جھکا دینا۔ خدا جس کا نام اللہ ہے اسلامی تعلیم کی رُو سے وہی ہے، جو یہودیوں اور مسیحیوں کا خدا ہے، تاہم یہ دونوں ابتدائی مذاہب دیگر عناصر سے آلودہ ہو چکے ہیں، لہٰذا ایک نئے پیغمبر کی آمد ضروری تھی جو ایسا پیغام لے کر آئے جو انسانوں کو سیدھی راہ پر لگائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں رہتے تھے، جو مغربی عرب میں یمن اور شام کے درمیان تجارتی شاہراہ پر واقع تھا، ان کی بیوی خدیجہ ایک دولت مند بیوہ تھیں، جن کی خاطر وہ شام اور فلسطین کے درمیان تجارتی قافلوں کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ شام اور فلسطین میں وہ یہودی اور مسیحی مذاہب سے واقف ہوئے۔ ان کے مقابلے میں انہیں عربوں کی بت پرستی دیکھ کر شرم آتی تھی، جو انتہائی قدیمی معلوم ہوتے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال کی عمر میں مکہ کے قریب ایک غار میں روشنی کا ایک ہیولا دیکھا جو خدا کے فرستادہ فرشتہ جبریل تھے۔ انہوں نے یہ حکم دیا کہ مکہ کے لوگوں کو خدا کا نیا پیغام پہنچا دیں۔ یہ وحدت پرستی کا پیغام تھا جو اس سے پہلے کی یہودی تعلیمات کی توثیق کرتا تھا۔ جبریل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو طویل ہدایات لکھوائیں، انہیں تحریری طور پر عربی زبان میں مرتب کیا گیا، جو قرآن کے نام سے معروف ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب میں سخت خدائی نظم ونسق پر زور دیا گیا ہے، جیسے شراب نوشی کی ممانعت، یا سور کے گوشت سے اجتناب، اور مذہبی فرائض کی بجا آوری جن میں روزانہ نمازیں، سالانہ روزہ اور مکہ میں حج ادا کرنا شامل ہیں۔ اس نے سود کی بھی ممانعت کی اور ناداروں کے استحصال سے منع کیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اپنے ساتھ رہنے والوں کو بارہ سال تک اس بات پر آمادہ کرتے رہے کہ وہ نیا مذہب اختیار کر لیں، لیکن انہیں اپنی کوششوں میں بہت محدود کامیابی ہوئی۔ اگرچہ ان کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا، لیکن جو لوگ شہر کو اپنی گرفت میں رکھتے تھے، وہ ان کے حلقے کے اندر شامل نہ تھے۔ اس کے علاوہ اسلام کی رو سے وحدت پرستی کے اصول کعبہ میں بتوں کی پرستش کے مسلک سے متصادم تھے۔ کعبہ میں ایک بڑا سیاہ پتھر تھا جس کا ہر سال جشن منایا جاتا تھا، معاشی طور پر مکہ والوں کے لیے بہت اہم تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدیر اچانک بدل گئی جب 622 عیسوی میں انہیں مدینہ کی حکومت کی سربراہی کی دعوت دی گئی۔ مدینہ نواح کا

ایک شہر اور سیاسی آویزشوں کی آماج گاہ تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک لائق منتظم تھے۔ مدینہ میں ان کی مذہبی حکومت نے آپس میں متصادم فریقوں کو متحد کر دیا اور وہ فوجی اعتبار سے مضبوط ہو گئے۔ ان کی فوجوں نے جارحانہ جنگیں پہلے مکہ کے خلاف اور پھر دیگر عرب شہروں کے خلاف لڑیں۔ ان کی کامیابی میں معاون ایک عنصر یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے ماننے والوں کو غزوات میں شریک ہونے اور مال غنیمت جمع کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ مدینے کے دولت مند یہودی، جو خدا کی توحید کے قائل ہونے کے باوجود اسلام قبول کرنے سے منکر تھے، خاص طور پر ان کا ہدف تھے۔632 عیسوی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت تک اسلامی سلطنت عرب علاقے پر پھیل چکی تھی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مقامی عربوں نے بغاوت کر دی۔ مکہ اور مدینہ کے شہروں نے جو قبیلہ قریش کے نئے مسلمانوں کے تابع تھے، اسلام کے سچے وفادار محافظ ہوتے ہوئے باغیوں کا مقابلہ کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عارضی جانشین یا ''خلیفہ'' نے دوسرے عربوں کو آمادہ کیا کہ وہ بغاوت ترک کر دیں اور ان فوجوں میں شامل ہو جائیں جو مشرقی رومن سلطنت اور ساسانیوں کی فارسی سلطنت کے خلاف فوجی حملے کر رہی تھیں۔ یہ دونوں طاقتیں آپس میں بیس سال سے زائد عرصے تک لڑنے کے بعد بالکل بے دم ہو چکی تھیں۔ اب مسلمان فوجوں کے لیے راستہ کھلا تھا۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ پورے ایران پر قابض ہو گئیں۔ انہوں نے مشرقی رومن سلطنت کو بھی شمال میں ترکی کے اندر تو روس کی پہاڑیوں تک دھکیل کر پہنچا دیا تھا۔641 تک شام، فلسطین، میسوپوٹامیا اور مصر سب مسلمانوں کے ماتحت آ چکے تھے۔651 تک ساسانی سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد نصف صدی میں اسلامی فوجوں نے آرمینیا اور جارجیا کو بھی فتح کر لیا۔ انہوں نے شمال مغرب افریقا میں مشرقی رومن سلطنت کے تمام علاقے فتح کر لیے تھے۔ اسی طرح سپین اور جنوب مغربی فرانس میں Visigothic بادشاہتوں کو زیر کر لیا تھا۔ مشرق میں انہوں نے ازبکستان میں Ephthalite ہنز کے مقبوضہ جات کو اور بحرارل کے جنوب مشرقی علاقوں اور دریائے سندھ سے ملحقہ علاقوں کو فتح کر لیا تھا۔ تاہم وہ دو مواقع پر قسطنطنیہ میں ناکام ہوئے۔ فرانس سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف ان کی پیش قدمی 732 میں تورس کی جنگ میں روک دی گئی۔

یورپ میں رائج ایک رائے کے برعکس مسلمانوں کی یہ مہم لوگوں کو اسلام کی طرف جبراً لانے کے لیے نہیں تھی۔ دیگر مذاہب کے لوگوں کو اس وقت تک برداشت کیا جاتا تھا جب

تک وہ اسلامی حکومت کی اطاعت کریں اور جزیہ دیتے رہیں۔ ان لوگوں کی اپنی خود انتظامی جمعیتیں تھیں، ان کے شہری قوانین تھے اور مذہبی رہنما تھے۔ عرب فوجی کمانڈر مفتوحہ علاقوں کے گورنر ہوتے تھے۔ لکھے پڑھے منتظمین کا دستہ ان کے پاس کم ہوتا تھا، لہٰذا انہوں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے شہری انتظامات خواندہ عیسائی اور ایرانی رعیت کو سونپ دیے تھے۔ عیسائیوں کے مظلوم فرقوں نستورین اور مونوفزائٹ وغیرہ نے بالعموم حکومت میں ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا۔ بہت سے لوگ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے، کیوں کہ ایسا کرنا ان کے لیے فائدہ مند تھا۔ عرب فاتح مذہب سے اپنی وابستگی کا اظہار فوجی تفاخر کے طور پر کرتے تھے۔ امیہ خاندان کی حکومت میں جس کی بنیاد معاویہ نے دمشق میں 661 عیسوی میں رکھی تھی، عرب مسلمانوں کو ایک الگ مراعات یافتہ طبقہ قرار دیا گیا تھا۔ انہیں ٹیکسوں کی ادائیگی سے معافی تھی بلکہ سرکاری خزانے سے باقاعدہ ادائیگیاں بھی ہوتی تھیں۔ جب خلیفہ دوم عمرؓ نے غیر عرب مسلمانوں پر سے ٹیکس معاف کر دیا تو اس سے مالی بحران پیدا ہو گیا۔ خزانے میں اس کمی کی تلافی کے لیے غیر عرب پر خلیفہ ہشتم نے اراضیاتی ٹیکس نافذ کر دیا۔ اس سے بے چینی پیدا ہوئی، چنانچہ 750-747 میں عربوں کی خانہ جنگی کے دوران میں امیہ حکمرانوں کی جگہ عباسی خاندان برسر اقتدار آ گیا۔

نظریاتی اعتبار سے عباسیوں کی بغاوت ان کی حکمرانی کے جواز پر تھی۔ خلافت پر ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کے وارث تھے جو نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے، جب کہ امیہ حکمران اپنا نسبی سلسلہ قبیلہ قریش سے جوڑتے تھے، جن کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ 634 عیسوی میں ابوبکرؓ کی وفات کے بعد عمرؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ وہ ایک دانش مند اور مؤثر حکمران تھے۔ انہیں ایک ایرانی غلام نے 644 میں شہید کر دیا تھا۔ ان کے بعد آنے والے خلیفہ عثمانؓ نسبتاً کم اہلیت کے مالک تھے۔ انہیں 656 میں شہید کر دیا گیا۔ ان کے بعد علیؓ خلیفہ مقرر کیے گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوہ عائشہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چند رفقا ان کے مخالف تھے۔ انہیں 661 میں شہید کر دیا گیا۔ علیؓ کے سب سے بڑے بیٹے حسنؓ کو ان کی جانشینی کے لیے منتخب کیا گیا، تاہم شام کے گورنر معاویہ کو دمشق میں خلیفہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ معاویہ نے حسنؓ کو آمادہ کیا کہ ایک شاہانہ پنشن اور مدینے میں حرم کے عوض خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ بندوبست 680 میں معاویہ کی وفات تک برقرار رہا۔ پھر علیؓ کے چھوٹے بیٹے حسینؓ اپنے حامیوں کو ساتھ لے کر خلافت کے منصب کے لیے مدینے سے روانہ ہو گئے۔

معاویہ کے بیٹے اور جانشین یزید نے ایک مختصر سی فوج روانہ کی جس نے کربلا میں حسین کو راستے میں روک دیا۔ حسینؓ نے جب مدینہ واپس جانے سے انکار کر دیا تو یزید کی فوجوں نے انہیں اور ان کے حامیوں کو شہید کر ڈالا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کا سر لے کر دمشق میں یزید کے پاس پہنچے۔

اس لرزہ خیز واقعے نے اسلامی برادری میں ایک خلیج پیدا کر دی۔ شیعہ مسلمانوں نے جن کی ایران میں اکثریت تھی، امیہ خاندان کو خلافت کا غاصب قرار دیا۔ انہوں نے علی کے وارثوں کے دعوے کی اس بنیاد پر حمایت کی کہ ان کے خون کا رشتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ 680 میں حسین کا قتل، امیہ دورِ حکومت میں غیر عرب اقلیتوں کے ساتھ بے انصافیوں کی علامت تھا۔ دوسری طرف سنی مسلمان امیہ کے وفادار ٹولے کی نمائندگی کرتے تھے۔ عربوں کے سلسلہ حکمرانی میں اصل حیثیت انہی کی تھی۔ 50-747 کی ایک شورش میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے ایک وارث عباس جو شیعہ تھے، خلیفہ بن گئے۔ انہوں نے عباسی خاندان کی خلافت قائم کی۔ عباس کے جانشین منصور نے سلطنت کا دارالحکومت دمشق سے بغداد منتقل کر دیا۔ اس کے بعد تین ایرانیوں نے سیاسی اور تہذیبی سربلندی حاصل کی۔ اس دوران میں ایک اموی پناہ گزین عبدالرحمٰن فرار ہو کر لائبیریا جا پہنچا جہاں اس نے ایک سنی ریاست قائم کی۔ اب دو خلیفہ برسر اقتدار تھے، ایک شیعہ، دوسرا سنی۔ اور یوں مسلمانوں کا سیاسی اتحاد ختم ہو گیا۔ خلافت کے منصب پر جانشینی کا معاملہ اسلام کے دائرے میں دیگر تمام فلسفیانہ مباحث سے زیادہ موجب نزاع بن گیا۔ عیسائی مذہب کے مقابلے میں اسلام میں مسلمہ عقائد کی حیثیت کم تر ہے۔ غالباً اس لیے کہ عیسیٰ کے مقابلے میں جو دوسری دنیا کے حوالے سے زیادہ تبلیغ کرتے تھے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے دنیاوی امور کے متعلق واضح ہدایات دی تھیں۔

یہوا کی روایت میں دیگر مذاہب کی طرح اسلام بھی آخری یومِ حساب اور جنت و جہنم پر عقیدہ رکھتا ہے۔ جو لوگ مذہب سے وفادار ہوتے ہیں، خاص طور پر وہ اس کی راہ میں ہلاک ہو گئے، ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا، جب کہ کافر جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ اسلام قانون کی تفسیر پر بہت زور دیتا ہے۔ قرآن، جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی روحانی تعلیمات اور انتظامی ہدایات شامل ہیں، اسلامی قوانین کا اصل وسیلہ ہے۔ اس کے علاوہ عالموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حکایات اور ان سے منسوب اقوال یک جا کیے

ہیں۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار کہا تھا،''میری قوم کبھی کسی غلطی پر متفق نہیں ہوگی۔''اس بیان نے ان قانونی توضیحات کو بھی تسلیم کر لیا ہے، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں شامل نہیں اور جنہیں اسلامی معاشرے میں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ کلچر اصولی اختلافات کے سلسلے میں روادار ہے۔ سنّی روایت میں چار مختلف مکاتیب ہیں جو مساوی طور پر جائز تسلیم کیے جاتے ہیں۔ دینی سوالوں کا فیصلہ علما کے اتفاق رائے سے ہوتا ہے۔ خلیفہ سیاسی اقتدار کا مالک ہوتا ہے۔ابن تیمیہ نے یہ سبق سکھایا تھا کہ کوئی بھی ریاستی حکومت جو اسلامی قانون کے مطابق قائم ہو، وہ اسلامی ہے، خواہ اس کا سربراہ کوئی خلیفہ ہو یا نہ ہو۔

750 میں عباسی خاندان کی حکومت کے قیام سے اسلامی کلچر کا فروغ دیکھنے میں آیا۔ بغداد ان دنوں ملی جلی آبادی کا شہر تھا، جہاں تجارتی اور دانش ورانہ سرگرمیوں کو تحریک مل رہی تھی۔ اگرچہ عرب سرکاری مراعات سے محروم ہو چکے تھے لیکن ان کی زبان کو ایک ثروت مند ادب میسر آ گیا تھا، کیوں کہ عربی میں بہت نظمیں لکھی جا رہی تھیں اور دوسری زبانوں کا کلچر بھی اس میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں یونانی فلسفیانہ تحریریں، ترجمے کی مدد سے دستیاب تھیں۔ مذہب اسلام نے ایک نئی دینیات مرتب کر لی تھی، جس کا مقابلہ دیگر مذاہب سے کیا جا سکتا تھا۔معتزلہ کے علما جبر و اختیار اور ارادے کی آزادی جیسے سوالوں پر مناظرے کرتے تھے۔ یہ اصول کہ ''تخلیق شدہ'' قرآن، خدا کے حرف کی علامت تھا، آرین مسیحیت میں عیسیٰ کے کردار سے ملتا جلتا ہے۔

مذہبی فکر میں ایک میلان قانون کی طرف تھا، دوسرا معتزلہ کی طرح دینیات میں استدلال کی طرف تھا۔ تیسرا میلان ان دونوں سے یکسر مختلف تھا، جو خدا کے وجود کا براہِ راست تجربہ چاہتا تھا۔ ایران کے شیعوں نے دسویں صدی کے اواخر میں صوفیوں کی ایک ایسی برادری بنا رکھی تھی جو اپنے مذہب پر عمل شاعری کے ذریعے کرتے تھے، عالمِ وجد میں گاتے اور رقص کرتے تھے۔

اسلامی سلطنتیں

750 عیسوی میں عباسیوں کے انقلاب کے ساتھ ہی ایک دور سیاسی افراتفری کا آیا۔ امیہ خاندان کے ایک پناہ گزین نے 756 میں لائبیریا کے میدانی علاقے میں جہاں سنی آبادی کی اکثریت تھی، ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھ دی۔ تاہم اس حکومت پر جرمن عیسائیوں

کا زبردست دباؤ تھا کہ اس علاقے سے دست کش ہو جائیں۔ الجزائر میں 757 اور 786 کے درمیان تین نئی مسلمان ریاستیں تھیں، جن پر شیعہ علیحدگی پسند حکمران تھے۔ مراکش 788 میں علوی (علی خاندان) کے شاہ ادریس اوّل کے تحت ریاست بن گیا۔ 800 میں تیونس میں ایک سنی ریاست جس نے عباسی خاندان کی بالادستی تسلیم کر لی تھی اغلابید (Aghlibid) عربوں نے قائم کی۔ اسماعیلی شیعوں (سات ائمہ کے ماننے والے) نے عباسی خلیفہ کی جائز حیثیت تسلیم نہیں کی اور کوئی سو سال بعد اس کی حکومت ختم کر دی۔ ایران میں جہاں سے عباسی خاندان کا انقلاب شروع ہوا تھا دوسرے خلیفہ کے مخالف بہت سی بغاوتیں اٹھیں، منصور نے ان 754 افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جنہوں نے امیہ خاندان کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکائی تھی۔
اسلام کی سیاسی سلطنت اگرچہ شکستہ تھی، لیکن اس میں توسیع ہو رہی تھی۔ 751 عیسوی میں عباسی خلیفہ کی فوجوں نے سمرقند کی لڑائی میں چینی فوجوں کو شکست دے دی تھی۔ اموی مسلمانوں نے جنہیں آئبیریا سے نکالا گیا تھا، 826 میں مشرقی رومن سلطنت سے کریٹ کا علاقہ چھین لیا۔ اغلابید نے تیونس سے سسلی کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا۔ قرموق ترک، جنہوں نے تریم کے میدانی علاقے پر قبضہ کر لیا تھا، 960 میں سنی فرقے سے وابستہ ہو گئے۔

اسلامی دنیا کے لیے دسویں گیارھویں صدی عیسوی سخت مصائب و آلام کی صدی تھی۔ اس کے حکمرانوں نے پہلے مشرقی رومن سلطنت سے اور پھر سسلی، شام اور فلسطین پر قبضے کے لیے مغرب کے صلیبی جنگ جوؤں سے لڑائی کی۔ خانہ بہ دوش قبائل جن میں ترک، عرب اور بربر بھی شامل تھے، ان کی سلطنت کے وسیع علاقوں کو پامال کر چکے تھے۔ مغربی ایران کے بواحد حکمرانوں نے عباسی سلطنت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اس طرح تیونس کے بربر اور ایران بیشتر اسلامی دنیا کے مکمل تابع ہو گئے تھے۔ البتہ اس میں سپین شامل نہ تھا۔ قرلوق اور غز ترک (Ghuzz Turks) اور سلجوق خاندان کے طرف داروں کا ایک دستہ ایشیائے کوچک میں داخل ہو گیا۔ سلجوق ترکوں نے جو سنی تھے 1055 میں بغداد کے تخت پر سے بواحد شیعوں کو برطرف کر دیا۔ ترک مسلمانوں نے ایرانی انتظام کاروں کو اپنے یہاں رہنے دیا۔ سلجوقوں نے 1057 میں اناطولیہ میں رم کی سلطنت قائم کر دی، ساتھ ہی انہوں نے ترک قبائل کو آرمینیا میں داخلے کی اجازت دے دی۔ واپس ہوتے ہوئے انہوں نے ایران میں تباہی پھیلا دی۔ عرب خانہ بہ دوشوں نے شمالی افریقا سے گزرتے ہوئے زیتون کی کاشت کو تباہ کر دیا، جو زمانہ قدیم سے چلی آ رہی تھی۔ اس ہنگامہ خیز دور میں اسلام کو ایک نسبتاً نرم اور متعدل پہلو مل گیا۔ یہ ایک ایرانی

عالم غزالی کا فیض تھا، جنہوں نے سنی روایات میں تصوف کا عنصر شامل کر دیا۔ ان کی تصنیف Restoration of the Science of Religion (مذہب کی سائنس کی جانب واپسی) دینیات کی مقبول ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں، عیسائیوں نے خوف ناک حملوں میں بھی اپنے علاقوں کو بچائے رکھا۔ سلجوق سلطنت کے ایک ترک افسر نے جرمن صلیبیوں کو شام میں ان کے مضبوط ٹھکانوں سے اکھاڑ کر باہر نکال دیا اور مصر میں ایک نئی سلطنت قائم کر دی۔ بعد میں صلاح الدین نے جو ایک کرد سالار اور اس سلطنت میں ملازم تھا، اپنی الگ سلطنت قائم کر لی

چکاتے ہوئے اس نے مسیحی فوجوں کو پس پا کر
کے فوجی غلاموں، یعنی مملوکوں کے درمیان تقسیم
اور بڑا خطرہ اسلامی علاقوں کے لیے منگولوں کی
خاں کے ہاتھوں خوارزم کی ہول ناک تباہی
جاری کیا، یعنی اس فوجی خطرہ سے مقابلہ کر۔
منگولوں کے ہاتھوں ختم ہو گئیں۔ 1258 میں عب
مملوکوں کی مدافعت کی وجہ سے شام اور مصر کو فتح
مغربی عیسائی ایک بڑا اتحاد بنا لیں گے، سلطن
حکومتیں بعد میں مسلمان ہو گئیں۔

ایشیائے کوچک میں آباد عیسائیوں

(Monophysite) فرقے جو بڑی اکثریت میں تھے، چودھویں صدی کے اندر مسلمان ہو گئے، بہت مختصر سی تعداد مسیحی عقیدے پر کاربند رہی۔ دوسری طرف مسیحی بادشاہوں کی پیش قدمی کے باعث مسلمانوں کو لائبیریا سے نکالا جا رہا تھا۔ سیاسی مخالفت مسلمانوں کی سلطنت کے خاتمے سے پہلے ان کی تہذیب کو پھلنے پھولنے سے نہ روک سکی۔ مسلمانوں کا آخری مضبوط مرکز گرانیڈا 1492 میں اراگان اور کیسٹائل کی مسیحی سلطنتوں کے آگے شکست سے دوچار ہو گیا۔ پھر اسلام نے ریگ زار صحارا کی جنوبی آبادیوں میں اپنی راہ بنانی شروع کر دی۔ مملوکوں کے مصر میں کاپٹک (Coptic) عیسائی بتدریج ختم ہوتے جا رہے تھے۔ مصر سے نوبیا میں داخل ہونے والے عربوں نے رفتہ رفتہ ان کو مسلمان بنا لیا۔ نوبیا کے جنوب میں واقع ابی سینیا کی بادشاہت سولھویں صدی عیسوی تک Monophysito عیسائیت پر قائم رہی۔ اسلام نے ملایا اور انڈونیشیا

میں عام لوگوں کو پرامن طریقے سے مسلمان بنالیا اور وہ بودھوں اور ہندوؤں کے درمیان بقائے باہمی کے اصول کے تحت رہنے لگے۔ کچھ تبدیلی مذہب کے واقعات مغربی جرمنی میں ہوئے۔

گیارھویں صدی میں جب سلجوق ترکوں نے عباسی سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا، وسط ایشیا سے آنے والے ترک خانہ بہ دوش ایشیائے کوچک کی جمی جمائی آبادی میں شامل ہو چکے تھے۔1261 اور1300 عیسوی کے درمیان ترک عوام جو دوسروں سے کچھ زیادہ جنگ جو معلوم ہوتے تھے، وہ منگولوں کے زیر حکمرانی رہ چکے تھے۔ یہ بیشتر وہی علاقہ تھا، جو آج ترکی کہلاتا ہے۔اس زمانے میں مشرقی رومن سلطنت، مغربی عیسائیوں سے قسطنطنیہ کو دوبارہ واپس لینے کی کوشش میں مصروف تھی اور اپنے ایشیائی صوبوں کو نظر انداز کر رہی تھی۔1335 عیسوی میں جب منگولوں کی حکومت ختم ہوگئی تو اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ترک قبائل کے درمیان کھینچا تانی شروع ہوگئی۔عثمانیوں نے جہاد کے جذبے کے ساتھ جنگ کی اور چودھویں صدی کے پہلے نصف عرصے میں بہت سے کلیدی شہر فتح کر لیے۔انہوں نے اپنی فوجوں کے لیے دوسرے ترکوں کو بھی بھرتی کیا اور اس طرح اپنی طاقت کا اضافہ کیا اور اپنے اقتصادی معاملات کو درست رکھنے کے لیے عیسائیوں کو استعمال کیا۔ چودھویں صدی میں ایک نئی آفت جو تمام تر وحشت تھی، تیمور لنگ کی صورت میں سامنے آئی۔ وہ چنگیز خاں کا خود ساختہ وارث تھا۔اس نے مسلمان فوجوں کو لے کر وسط ایشیا سے لوٹ مار، قتل و غارت گری شروع کی اور ہندوستان، روس اور مشرق بعید تک تباہی پھیلاتا چلا گیا۔ تیمور کے لشکر نے ایشیا میں عثمانیوں کے مقبوضہ جات پر عارضی مدت کے لیے قبضہ کیا تھا۔ پھر جب یہ خطرہ کم ہوگیا تو ایشیائی علاقوں کو دوبارہ فتح کر لیا گیا۔ پھر عثمانیوں کی حکومت کے خلاف بلغاریہ میں ایک نئی بغاوت شروع ہو گئی، جسے سنّی روحانیت پرستوں نے منظم کیا تھا۔ ایک صدی بعد ایک اور بغاوت ایشیائے کوچک میں شروع ہوگئی تھی، عثمانی ترکوں نے دونوں بغاوتوں پر قابو پالیا تھا۔

دوسری بغاوت جو1511 اور1513 میں شروع ہوئی تھی، اس میں شاہ اسماعیل کے شیعہ حمائتی شامل تھے، شاہ اسماعیل ایران کی صفوی حکومت کا بانی تھا۔1500 اور1513 کے درمیان اس حکومت نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور اس کی حدود شمال مشرق میں ان علاقوں تک پہنچ گئیں جہاں ازبک خانہ بہ دوش آباد تھے اور مغرب میں اس کی حکومت عثمانی حکومت کی سرحد سے جا ملی۔اس علاقے میں جہاں کبھی غالب اکثریت سنّیوں کی تھی، شاہ اسماعیل نے

اپنی ایرانی رعیت سے کہا کہ وہ شیعیت قبول کر لیں۔ صفوی فوج میں قزلباش سپاہی شامل تھے، جو سرخ رنگ کی ٹوپی پہنتے تھے، جو کسی زمانے میں عثمانیوں کی حکومت کے ماتحت رہ چکے تھے۔ وہ بڑے پرجوش لوگوں کا گروہ تھا، جو صوفیوں کی شریعت سے تعلق رکھتے تھے، جس کے سربراہ شاہ اسماعیل تھے۔ عثمانی ترکوں نے قلدیران کے مقام پر 1514 میں صفوی فوجوں کو شکست دے دی، پھر بعد میں عراق پر بھی قبضہ کر لیا۔ شاہ عباس اوّل نے جب 1623 میں ترکوں سے بغداد واپس چھین لیا تو اس نے ایک نیا خوبصورت دارالحکومت اصفہان میں تعمیر کیا۔ ایک اور صفوی شہنشاہ شاہ جہاں نے آگرہ میں تاج محل تعمیر کروایا۔ اصفہان میں اس حکومت کا تختہ افغان خانہ بہ دوشوں نے 1722 میں الٹ دیا۔ تاہم اسے کچھ عرصہ بعد ایک ترک سپاہی نادر قلی نے ہندوستان پر حملہ کر کے دوبارہ واپس لے لیا۔ پھر اس کی وارث افغان حکومت نے ایران اور ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔

ایک تیسری اسلامی سلطنت، یعنی مغل سلطنت ہندوستان میں تیمور لنگ کے ایک وارث بابر نے قائم کی۔ بابر نے شمالی ہندوستان پر افغانستان سے حملہ کیا اور 1526 میں پانی پت کے میدان میں دلی کے سلطان کو شکست دے دی۔ اس نے آگرہ اور دلی کے شہروں پر قبضہ جمانے کے بعد جلد ہی پورے شمالی ہندوستان کو اپنے تصرف میں لے لیا، تاہم بابر کے بیٹے ہمایوں نے یہ سارا علاقہ ایک بنگالی افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کے ہاتھوں گنوا دیا۔ مغل خاندان کی حکومت مستحکم بنیاد پر اس وقت قائم ہوئی، جب ہمایوں نے 1555 میں دلی کا تخت دوبارہ فتح کر لیا۔ ہمایوں کے بیٹے اکبر نے سلطنت کی حدود میں توسیع کی اور اس میں افغانستان، بلوچستان اور ہندوستان کے جنوب میں دریائے گوداوری تک کے علاقے کو شامل کر لیا۔ اکبر کا شاہی دربار علم وفن کا مرکز بن گیا۔ چونکہ اکبر کی سلطنت میں بہت بڑی آبادی ہندوؤں کی تھی، لہٰذا اس کی حکومت کو فوجی اور انتظامی معاملات کے لیے ہندوؤں پر بہت زیادہ بھروسا کرنا پڑتا تھا۔ ایک مسلمان ریاست کے ساتھ ہندوؤں کی وفاداری کے معاملے پر سوچتے ہوئے اکبر نے مسلمانوں، ہندوؤں، زرتشت کے ماننے والوں اور رومن کیتھولک عیسائیوں کے درمیان مکالمے اور مناظروں کا اہتمام کیا اور ان کے درمیان ایک مشترکہ اساس معلوم کرنے کی کوشش کی۔ 1582 میں اکبر نے ایک نئے توحیدی مذہب کی تخلیق کا اعلان کیا، جسے اس نے دین الٰہی کا نام دیا۔ اکبر اس کا پیغامبر بنا۔ مسلمان حلقوں میں اس سے بغاوت کی لہر دوڑ گئی اور اس نئے

شریعت نے چل کر نہیں دیا۔

سترھویں صدی کے آغاز میں اسلامی دنیا تین عظیم سلطنتوں کے درمیان تقسیم ہو چکی تھی۔ ترکی کی عثمانی سلطنت تھی، ایران کی صفوی سلطنت تھی اور ہندوستان میں تیموریہ مغلوں کی سلطنت تھی۔ عثمانیوں کی سلطنت کا آغاز چودھویں صدی میں ہوا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ سلطنت ورسیلز کے معاہدۂ صلح پر ختم ہوگئی۔ یہ سنی مسلمان سلطنت جس نے مملوک مصریوں کو مشرقی رومن سلطنت دونوں کو فتح کر لیا تھا، اس کی حکمرانی کی حدود میں مشرقی بحیرۂ روم اور بلیک سی کی سرحدوں تک کا علاقہ، اس کے علاوہ شمالی افریقا میں مصر، آبنائے عرب اور ہنگری اور بلقان تک کے علاقے شامل کیے جا چکے تھے۔ اس کا دارالحکومت استنبول تھا، وہی جس کا نام پہلے قسطنطنیہ تھا۔ عثمانی حکمرانوں نے اپنی پالیسی کے مطابق اس آزاد مسلم آبادی کے لوگوں کو فوج میں اعلیٰ عہدوں سے اور اپنی انتظامیہ میں بھی اعلیٰ مناصب سے دور رکھا۔ اس فوج میں خاص طور پر چنے ہوئے غلام بھرتی کیے جاتے تھے۔ جنھیں ینچ ہزاری کہا جاتا تھا۔ جو خاص طور پر عیسائی ہوتے تھے۔ انہیں لڑکپن میں اپنے کسان ماں باپ سے چھین لیا جاتا تھا۔ اس کے نتیجے میں یونانی عیسائیوں نے اس اسلامی ریاست کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔ عثمانیوں کے اقتدار کو اس وقت مزید خطرہ لاحق ہو گیا جب پرتگالی بحری بیڑے نے سولھویں صدی میں بحرِ ہند کے ساحلوں پر واقع ان کی تجارتی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ زار روس، آئیون چہارم نے 1550 کے عشرے میں کازان اور استراخان کو فتح کر کے سلطنت کا ازبک مسلمانوں کے ساتھ رابطہ ختم کر دیا۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں ہسپانیہ کی جانب سے چاندی کی کانوں میں کھدائی کے باعث کرنسی کی شرح گر گئی اور اقتصادی بحران پیدا ہو گیا۔

ایران اور ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنتیں اٹھارھویں صدی کے دوران میں ختم ہو گئی تھیں۔ 1747 میں نادر قلی کی وفات کے بعد افغان زند خاندان نے، جس کی حکومت کی بنیاد احمد شاہ درانی نے رکھی تھی، ہندوستان میں ہندو مرہٹوں سے جنگ کرنے کے ساتھ ہی ایران پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ایک زنخے آغا محمد خان نے 1794 میں اس حکومت کو ختم کر دیا اور کاچار خاندان کی حکومت دوبارہ قائم کی، جو 1925 تک برقرار رہی۔ آخری بادشاہ رضا شاہ پہلوی کو آیت اللہ خمینی کے حامیوں نے 1979 میں حکومت سے برطرف کر دیا۔ اکبر کے مغل جانشینوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ اکبر کی دی ہوئی رواداری کی پالیسی ترک کر

دی تھی۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب نے ہندوستان کے جنوب میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کی تو ہندوؤں کی طرف سے اس کا شدید ردِعمل ہوا۔ تاہم زند خاندان کی جانب سے افغانی ایرانی افواج نے شمالی ہندوستان پر حملہ کر کے ہندوؤں کی فوجوں کو 61-1758 میں شکست دے دی۔ تقریباً اسی زمانے میں برطانوی فوجوں نے رابرٹ کی سرکردگی میں فرانسیسیوں کو شکست دے دی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ جنگوں کے باعث مغل سلطنت تباہ ہو چکی تھی۔ ہندوستان کی حکومت کو ایسٹ انڈیا کمپنی یکے بعد دیگرے آنے والی کٹھ پتلی حکومتوں کے نام پر چلا رہی تھی۔ تاج برطانیہ نے 1877 میں ہندوستان کی حکومت اپنے قبضے میں لے لی۔ اور ستر برس بعد اس نوآبادی کو آزادی دے دی۔ یوں ہندو انڈیا اور مسلم پاکستان دو الگ الگ قومیں وجود میں آ گئیں۔

ہندو اور بودھ مذاہب

دوسرے ہزاری سال قبل مسیح کے نصف آخر میں ایک انتہائی قدیمی مذہب نے ہندوستان کے شمال میں مقبولیت حاصل کی۔ آریائی جنھوں نے ہندوستان فتح کیا، اپنے ساتھ فلسفے کے دور سے پہلے کا ایک مذہب جو عملی نتائج کے لیے رسومات اور عبادات پر انحصار کرتا تھا، لائے تھے۔ یونانیوں کی طرح اس مذہب میں دیویوں اور دیوتاؤں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ بھجن، دیومالا، عبادات اور کویتائیں، جو مدتوں سے پجاریوں کے ذہنوں میں محفوظ چلی آ رہی تھیں بالآخر ویدی کی زبان اور ادب میں لکھی گئیں، جسے رِگ وید کا نام دیا گیا۔ اس مذہب میں ایک نہایت مضبوط برہمنی روایت اور ذات پات کی تمیز موجود تھی، جسے ایک بڑے سماجی کردار کو برقرار اور جاری رکھنا تھا۔ عوامی رسوم، مثلاً گھوڑے کے حوالے سے رسم، جس کے اندر فوجی فتوحات کو ڈرامائی انداز سے پیش کیا جاتا تھا، آریائی اقدار کو مستحکم بناتی تھیں۔ برہمنوں اور آریاؤں کے حوالے سے پجاریوں کے بھجن اور ان کی اجتماعی عبادات میں کائنات کے عجائب و اسرار زیر بحث لائے جاتے تھے۔

وید کے آخری باب میں جسے اپنشد کہا گیا ہے، فلسفیانہ مباحث شامل ہیں، جن میں انسان اور خدا کے مابین تعلق سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ایک فرد یا اس کی روح کی ایک آسمانی سفر کے تجربے سے گزرتی ہے، اس میں اس دنیا کی زندگی بھی شامل ہے۔

یہ زندگی ایک موہوم وجود کی قید میں ہے، ہر فرد کی روح اجتماعی طور پر اس کائنات کی مثال ہے۔ ہندو علم فلکیات میں یہ عقیدہ شامل ہے کہ انسانی روحیں بار بار پیدا ہوتی اور ایک دائرے میں گردش کرتی ہیں۔ دوسری دنیا میں کسی شخص کے درجے کا انحصار موجودہ دنیا میں اس کے اخلاقی کردار اور اعمال پر اور اس کے ماضی پر ہے۔ کرما کے قانون نے یہ بتایا کہ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، جس سے اس روح کے آئندہ تجربے کی نشان دہی ہوتی ہے، غلط یا نقصان رساں کاموں کا نتیجہ آئندہ کسی کم تر حیثیت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ جب کہ خیر کے کاموں کا اچھا صلہ ملے گا۔ اس کی دوسری جانب کسی فرد کی حالیہ زندگی، پچھلے جنم میں اس کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہو گی۔ اس عقیدے نے بہتر طرزِ عمل کی ترغیب دی۔ اس توضیح سے افراد کو موجودہ ذات پات کی تخصیص کے نظام میں اپنی حیثیت کو ذہنی طور پر قبول کرنا آسان ہو گیا۔ تاہم اچھے طرزِ عمل کا مقصد نتائج کے مسلسل عمل سے نجات حاصل کرنا اور اس الوہی کل تک پہنچنا تھا۔ یوگا کی بعض مشقیں اور کچھ طریقے پجاریوں کے علم میں ہوتے تھے، جن کی مدد سے مذکورہ مقصد تک پہنچنے میں تیزی اور آسانی ہو گی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندو مذہب کے اندر دو ''بدعتیں'' پیدا ہوئیں، ایک بودھ مت، دوم جین ازم۔ ہندو مذہب کی رُو سے نجات، نروان، یعنی زمین پر بار بار پیدا ہونے کے چکر سے رہائی عام لوگوں کو میسر نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ''سلسلہ کار'' کی پابندی کرے گا تو پھر بھی اسے برہمن کے روپ میں پیدا ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد میں مرنے پر اسے نروان ملے گا۔ اپنشد میں درج علم کا راستہ اختیار کرنے کے بعد مراقبے اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن بدھا نے اور جین مذہب کے بانی نے ہر فرد کو نجات کی پیش کش کی۔ بدھا نے کہا ''کوئی برہمن پیدائشی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ ایک برہمن اپنے اعمال کی بنا پر ایسا ہوتا ہے۔'' جین مذہب کا تقاضا مکمل زہد اور ترک دنیا ہے۔ بدھ مت نے رہبانیت اور دنیا داری کے درمیان ایک ''درمیانی راستہ'' بتایا ہے۔ بدھ نے خود غرضی اور سچائی کی محبت کے درمیان دو فردیت دیکھی تھی، اس نے کہا، ''اپنے نفس اور صداقت کے درمیان فرق کرنا سیکھو۔ اگر ہم اپنی روحوں کو چھوٹی چھوٹی خواہشات سے آزاد کرا لیں، دوسروں کے لیے اپنے اندر بدخواہی نہ رکھیں اور ہیرے کی طرح صاف ہو جائیں، جس سے سچ کی روشنی پھوٹتی ہے، تو اپنے اندر ایک تابناک تصویر نظر آئے گی اور اس میں ہر شے جیسی ہے، ویسی ہی نظر آئے گی۔ اس میں دہکتی ہوئی

خواہشوں کی ملاوٹ نہیں ہوگی۔ مسخ شدہ پرفریب ہیولے نہیں ہوں گے۔ کسی خلش یا اضطراب کی اذیت نا کی نہیں ہوگی۔''

سدہارتھ گوتم، بدھا، نیپال میں567 قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک راجا کے بیٹے تھے۔ ایک سنیاسی نے باپ کو بتایا تھا کہ بدھا تاریخ میں سب سے بڑا بادشاہ بنے گا۔ تاہم اگر اس نے یہ چار چیزیں دیکھ لیں، یعنی: بیماری، بڑھاپا، موت اور سنیاس تو وہ اس تقدیر سے دستکش ہو جائے گا اور دنیا بھر کے لیے دائمی نجات کا راستہ تلاش کر لے گا۔ بدھا کا باپ اپنی راج گدی کے لیے ایک وارث کا خواہش مند تھا۔ اس نے بیٹے کو ان تمام تجربوں سے بچائے رکھا۔ لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ بدھا نے ایک بار باغ میں شہ سواری کرتے ہوئے انسانی مقدر کی مذکورہ چاروں صورتوں کو دیکھ لیا تھا۔ بس اس نے راج پاٹ کو تج دیا۔ بیوی اور ایک مولود بچے کو چھوڑا اور چھ سال روحانی آداب پر عمل کرنے میں صرف کر دیے، جس میں جسمانی خود اذیتی اور ایک خانہ بہ دوش اور سنیاسی کی طرح کا فلسفیانہ مطالعہ بھی شامل تھا۔ آخر سات ہفتے ایک استغراق کے عالم میں برگد کے سایے تلے گزارنے کے بعد اس نے اپنے اندر ایک روشنی محسوس کی۔ انسانوں کے مصایب و آلام کے حوالے سے ایک بصیرت پیدا ہوئی۔ بدھا دنیا میں واپس آ گئے۔ پھر483 قبل مسیح میں اپنی وفات تک وہ جگہ جگہ گھوم کر اپنی تعلیمات لوگوں میں پھیلاتے رہے۔ شاگردوں کا وہ گروہ جو ان کے ہمراہ ہوتا تھا، پھر وہی بدھ مت کے فروغ کا حلقہ بن گیا۔ بدھ کے پرستاروں نے اپنی یادداشت سے کام لیتے ہوئے ان کی تعلیمات کا ایک صحیفہ مرتب کر لیا تھا۔

بدھا کو برگد کے درخت کے نیچے جو بصیرت ملی تھی، اس کو صریح الفاظ میں چار فلسفیانہ اصولوں کے اندر بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان میں یہ خیالات شامل ہیں کہ: (1) زندگی مصائب سے بھری ہوئی ہے۔ (2) ذاتی خواہشوں کے اندر سے رنج پیدا ہوتا ہے۔ (3) رنج دور ہو جاتا ہے، جب خواہش مر جاتی ہے۔ (4) خواہشوں سے نجات پانے کے یہ آٹھ راستے ہیں۔ اس راستے میں یہ عناصر شامل ہیں: (1) صحیح عقیدہ، (2) صحیح ارادہ، (3) صحیح گفتگو، (4) صحیح طرزِ عمل، (5) صحیح پیشہ، (6) صحیح کوشش، (7) صحیح تفکر، (8) صحیح مراقبہ۔ اگر کوئی شخص اپنے اندر خواہشوں کو مکمل طور پر ختم کر دے، تو وہ نروان کی خوش گوار کیفیت سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا سے قطع تعلق کا ایک رویہ تھا، جس نے اذیت سے نجات دلائی۔ اپنے روحانی مقصد تک

پہنچنے کے بعد انسان کی روح مزید پیدائشوں سے نجات حاصل کر لے گی۔

بدھا اگرچہ نیپال میں پیدا ہوئے، لیکن انہوں نے اپنی بیشتر زندگی شمالی ہندوستان میں گزاری جو آج کا صوبہ بہار ہے، اور جو دریائے گنگا کے قریب ہے۔ یہ زبردست مگدھ سلطنت کا علاقہ تھا۔ بدھا اکثر سارناتھ کے ایک باغ میں جہاں ہرنوں کی کثرت تھی، اپنا درس دیتے تھے۔ یہ جگہ بنارس کے مقدس شہر کے قریب تھی۔ بدھا اور ان کے چیلے، کنفیوشس کی طرح جنگ جو بادشاہتوں کے درمیان بھی آزادی سے بے روک ٹوک گھومتے رہتے تھے۔ بدھا اور مہاویر دونوں کا برہمن طبقے سے تعلق نہیں تھا۔ دونوں ذات پات کے نظام کے مخالف تھے، ان کے ماننے والوں کی صف میں عورتیں اور مرد مختلف طبقاتی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ ہنایانا، بدھ کی اصل تعلیم کی نمائندہ تھی۔ اسے ایک مجلس مشاورت نے مرتب کیا تھا۔ اس کے اصولوں کے درست ہونے کی ضمانت دی تھی اور سنگھا (راہبوں کی برادری) کے لیے ضابطے بنائے تھے۔ تیسری مجلس مشاورت بدھ کی وفات کے دوسو برس بعد ہندوستانی شہنشاہ کے زمانے میں قائم ہوئی تھی۔ وہ بدھ مت کا زبردست سرپرست تھا۔

اشوک (عرصہ حکومت 232-269 قبل مسیح) موریہ خاندان کے بانی چندر گپت کا پوتا تھا۔ اس نے آس پاس کے تمام علاقوں کو فتح کر لیا، یہاں تک کہ اس کی سلطنت میں برصغیر ہند کا بیشتر علاقہ شامل ہو گیا تھا۔ کالنگا کو فتح کرنے میں بہت خون ریزی ہوئی تھی، جس پر اشوک بہت پشیمان تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اب وہ جنگی فتوحات سے دُور رہے گا اور اس کی بجائے مذہب کے ذریعے فتوحات کرے گا۔ اشوک بدھ مت میں ایک عام فرد کے طور پر شامل ہو گیا اور اس نے اپنے حلقے میں بدھ مت کا پرچار کیا۔ اس نے بودھوں کے تبلیغی گروہ شام، مصر، یونان اور سلجوق بھیجے۔ اگرچہ بدھ مت موریہ سلطنت کا ریاستی مذہب تھا، لیکن اشوک نے دوسرے مذاہب کے طور طریقوں کو بھی برداشت کیا۔ اس نے ایک سخت اخلاقی ضابطہ نافذ کیا۔ جس میں جانوروں کے ساتھ رحم دلی کا برتاؤ شامل تھا۔ ہندوستانی معاشرے کی نئی تعمیر کے سلسلے میں اشوک کی پرجوش کوششیں چین کے پہلے بادشاہ شیہہ ہوانگ ٹی (Shih Hwang Ti) سے ملتی جلتی تھیں اور وہ بھی اس صدی میں زندہ تھا۔ لیکن اس کے برعکس اشوک نے سیاسی سلطنت کا ایسا کوئی دیرپا نمونہ نہیں چھوڑا، جس کی بنا پر ریاست خاندانی سلطنت کے زوال کے بعد ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوتی۔ اس کی بجائے اس کی مصالحانہ پالیسیوں کے نتیجے میں سیاسی

ٹوٹ پھوٹ پیدا ہوئی۔ اشوک کے مرنے کے پچاس سال بعد سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا لیکن بدھ مت کو ریاستی مذہب اختیار کرنے کی یہ دولت آنے والے وقتوں کے لیے ایک اچھی مثال قائم ہوگئی۔

ابتدائی بدھ مذہب میں اصول، تلقینات اور روایات، جن کا تعلق بدھ مت کے ماہایانہ شعبے سے تھا اور جسے بعد میں تھیراوادن (Theravadin Budhism) کہا گیا، یہ سب شامل تھے۔ یہ پالی کے اصولوں کو تسلیم کرتا ہے، جسے اشوک کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا۔ مذہبی راستہ جس کا میلان فلسفے کی طرف ہے، صرف ان چند افراد کو جو ترک دنیا کے معاملے میں بدھ کی سختی کے ساتھ پیروی کرتے ہوں، نروان پانے کی اجازت دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص شادی کرتا ہے، اس کے بچے ہیں اور وہ روزی کماتا ہے تو وہ بدھ مت کا ایک عام مقلد ہوسکتا ہے۔ (جیسا کہ اشوک تھا) لیکن ایسا شخص روحانی نجات اور دائمی برکات کے حتمی مقصد کو نہیں پا سکتا۔ بدھ مت کو عام لوگوں کا مذہب بنانے کے لیے ضروری تھا کہ اس میں نجات کا کوئی ایسا طریقہ رکھا جائے جس کی پابندی ہر ایک کے امکان میں ہو۔ ماہایانہ، یا ''عظیم تر سواری'' جسے عیسیٰ کے زمانے میں بیکٹریا میں فروغ دیا گیا تھا، ایک ذاتی نجات دہندہ کے توسط سے نجات کا راستہ دکھاتی تھی۔ اس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ بدھ نے اپنے شاگردوں کے ایک اندرونی حلقے کے اندر اعلیٰ معیار کا درس دیا جس نے ہر ایک کے لیے نجات کا حصول آسان کر دیا۔ اس میں یہ خیال پوشیدہ تھا کہ بدھ جو دوسرے مصیبت زدہ لوگوں سے رحم اور مروت کا سلوک کرتے تھے، انہوں نے صرف دوسروں کے نجات کی خاطر زمین سے اپنی روانگی کے وقت میں تاخیر کر دی تھی۔ چونکہ یہ مدد بدھ کی طرف سے سب کے لیے حاصل ہے، اس لیے بدھ کے ماننے والے دنیاداری میں زندگی گزارنے کے باوجود نروان کے راستے کا نیا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔

بدھ مت اشوک کی وفات کے بعد شمال مغربی ہندوستان میں باختر کی سلطنت تک پھیل چکا تھا۔ باختر کا بادشاہ میناندر (160-130 قبل مسیح) خود بھی بدھ مت میں شامل ہو چکا تھا۔ بعد میں کشن بادشاہ کنشک (100 قبل مسیح) بدھ مت کا زبردست سرپرست بن گیا۔ باختر کے علاقے کی تہذیب میں یونان کا زبردست اثر پایا جاتا تھا، جس کا اظہار تحریر کی زبان، فلسفے اور بصری فنون میں ہوتا تھا۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں ماہایانہ بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا۔ یونانی فلسفے اور زرتشت کے علم نجوم اور جنت و دوزخ کے تصور نے بدھ مت کو ایک فلسفیانہ

مذہب کی بجائے ذاتی نجات دہندوں کا مسلک اور بودھوں کا استھان بنا دیا۔ یعنی بودھ جیسی شخصیتیں جو روشن ضمیری کی نمائندگی کرتی ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بودھ کا گیان حاصل کر لیا تھا لیکن نروان حاصل کرنا اس وقت تک قبول نہیں کیا، جب تک دوسرے صاحب ادراک لوگ جو ان سے پہلے موجود تھے، اسے حاصل نہ کر لیں۔ ماہایانہ بدھ مت نے بہت جلد دیگر مذاہب کے دیوتاؤں کو ان کے کردار کی بنا پر اپنے درمیان شامل کر لیا۔ یونان کے بصری فنون کے زیر اثر بدھ مت نے گوتم بدھ کے مجسموں اور مورتیوں کے ذریعے جس میں انہیں مراقبے کی حالت میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا، اپنے وجود کو نمایاں اور مقبول کیا۔ ایسی شباہتیں بہت سے مندروں اور گپھاؤں میں مل جاتی ہیں۔ ماہایانہ فرقے نے موت کے بعد دوسری زندگی کا سبق دیا، جس سے عوام میں اس کی کشش بڑھ گئی۔ ''مہربان بدھا'' جس کے معاون بہت سے دیگر بودھ اوتار ہیں ان لوگوں کے لیے نجات کا راستہ نکال لے گا، جو ان سے مدد مانگیں گے۔

183 قبل مسیح میں موریہ خاندان کے زوال کے بعد برہمن روایات ایک بار پھر واپس آنے لگی تھیں، چنانچہ سنگا اور کانوا خاندان نے سنسکرت کی تجدید شروع کر دی۔ سنسکرت جو قدیم ویدک زبان کی تحریری صورت تھی، ہندوستان کی مقدس زبان بنا دی گئی، جب کہ پراکرت جو دیسی زبان تھی اور بدھ اور جین کے متون سے منسلک رہ چکی تھی، کم تر پیمانے پر استعمال ہونے لگی۔ شمالی ہندوستان کے گپتا خاندان (320-544 قبل مسیح) نے ہندو کلچر کو ترقی دینے اور پھیلانے میں بہت کام کیا۔ اس کا مذہب دو بڑی شاخوں میں منقسم تھا۔ ایک شیوا ازم، دوسرا ویشنوا ازم۔ پہلے میں شیوا کی عبادت ہوتی تھی جو مردانہ عضو تناسل کی عبادت تھی اور اس کا تعلق موت سے بھی تھا۔ دوسری شاخ کا تعلق ویشنو کی عبادت سے تھا، جو زندگی بخش دیوتا ہے اور مختلف انسانی روپ میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اس طرح کی اختراعات بودھ مت سے مقابلے کے لیے کی گئی تھیں۔ یہ سارے دیوتا بودھوں کے پجاریوں کی مانند تھے۔ خود بودھ کو بھی ویشنو کا اوتار سمجھا جانے لگا تھا۔ دیوتا اور اس کے پجاریوں کے درمیان ایک جذباتی تعلق پایا جاتا تھا۔ نویں صدی کے ایک فلسفی شنکر نے یہ دلیل دی تھی کہ اس طرح کی ذاتی شناخت محض موہوم ہوتی تھی لہٰذا افراد اور دیوتاؤں کے درمیان کوئی خصوصی تعلق غیر ضروری تھا۔ اس کی بجائے ہر فرد کی شناخت براہِ راست طور پر ایک حتمی حقیقت کی نسبت سے ہوتی تھی۔ گیارھویں صدی میں راما نوجا نے شنکر کو یہ الزام دیا کہ وہ در پردہ بودھ کا مقلد تھا۔

جنوبی ہندوستان میں تامل بولنے والوں نے زیادہ جذباتی قسم کے مذہب کی راہ نکالی۔ ساتویں صدی میں پانڈیا اور پلّا وہ کی جنوبی بادشاہتوں میں جہاں بودھ اور جین مذاہب کا کسی زمانے میں بہت زور تھا، ہندو پوجا پاٹ کا زبردست ابھار دیکھنے میں آیا۔ چٹانوں میں کھدائی اور مامل پورم اور کنچی پورم کے مندروں کی نقش گری ہندو تعمیرات کے چند نادر اور بیش بہا نمونے ہیں۔ شنکر جو ہندو عبادات کا بڑا عالم تھا، جنوب مغرب کی بستی کیرالہ کا رہنے والا تھا۔ غیر ملکی حملہ آوروں کی لائی ہوئی تباہی کی وجہ سے ہندوستان میں بدھ مت ختم ہو گیا۔ ان حملوں کا آغاز چھٹی صدی میں سفید فام ہنز سے ہوا۔ بدھ مت کا آخری مضبوط مرکز بنگال کی پالا بادشاہی تھی، جس پر مسلمان افواج نے 1202 میں قبضہ کر لیا تھا۔ بنگالی (Tantric Budhism) یعنی بدھ کی قدیم طلسماتی تحریروں کے ماننے والے تھے۔ جن میں جادو اور منتر پر بہت زور تھا، اور آسمانی وجود کی عبادت کی جاتی تھی۔ انہوں نے مذہب کی اس قسم کو تبت کے باشندوں کے حوالے کر دیا۔ پالا کے مقلدوں کی نویں صدی کے اوائل میں شمالی ہند پر بالا دستی تھی، لیکن پھر راجستھان اور وسطی ہند میں پرتیہاما خاندان کی حکومت آ گئی جہاں شیوا اور وشنو کی عبادت کی جاتی تھی۔ تب پالا والوں کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ جین مذہب کی سرپرستی بھی اس حکومت نے کی، لہٰذا جب بدھ والوں کا انخلا شروع ہوا تو جینی بچ گئے۔ ہندوستان میں تقریباً بیس لاکھ جینی اب بھی موجود ہیں، تاہم برہمنی مذہب نے تجدید نو کے بعد ہندوستان کی غالب اکثریت کے اندر اپنے قدم جمائے تھے۔

جب محمد غوری نے 1192 میں راجپوت بادشاہوں کے ایک اتحاد کو شکست دی تو ہندوستان کے اندر بہت سے مذاہب کے درمیان اسلام کا بھی اضافہ ہو گیا۔ مسلمانوں کو جو ایک نہایت ترقی یافتہ مذہب رکھتے تھے، ہندوستانی کلچر کے اندر جذب نہیں کیا جا سکا۔ لیکن ہندو آبادی بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ ہندوستان متضاد عناصر پر مبنی ایک ایسی ریاست بن گیا، جس کے حکمران ایک مذہب کے ماننے والے تھے اور عام باشندے دوسرے مذہب پر کاربند۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے ایک بالاتر تہذیب کے احترام میں اور سیاسی مصلحت کے تحت بھی اپنی ہندو رعایا کو جو بہت سے خداؤں کو ماننے والے تھے، ''صاحب کتاب'' قرار دے دیا۔ اکبر نے اپنے ترک سالاروں کو گرفت میں رکھنے کے لیے ہندو راجپوت راجاؤں سے اتحاد قائم کیا۔ اس نے ہندوؤں پر سے خصوصی ٹیکس ختم کر دیا اور انہیں مندر تعمیر

کرنے کی اجازت دے دی۔ مولویوں نے اسے کفر قرار دیا۔ ایک مغل جانشین اورنگ زیب نے یہ ساری مراعات ختم کر دیں، جس کا نتیجہ ہندو مرہٹوں کی جانب سے شدید ردعمل کی صورت میں سامنے آیا۔ مذہبی گرو اور شاعروں، جیسے نانک اور کبیر نے دونوں مذاہب کے درمیان عناصر میں ہم آہنگی پیدا کی، نیچی ذات کے ہندوؤں نے اس میں کشش محسوس کی اور اسلام کو بھی انہوں نے پرکشش پایا۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کو مسلح افواج میں اور ایرانی طرز کی مسلم ریاستوں کے انداز میں انتظامی عہدوں پر ملازم رکھا گیا۔

ہندوستان کا مذہب: ہندوستان سے باہر

کشن حکومت، جس نے باختر اور شمال مغربی ہندوستان کو آپس میں متحد کر دیا تھا، تیزی سے ابھرتے ہوئے ماہایانہ بدھ مت کا مرکز بن گئی۔ اس میں مغربی افغانستان اور ازبکستان کی سرزمین جو مشرق میں چین کی سرحد سے جا ملتی ہے، شامل تھی۔ ماہایانہ بدھ مت مقامی روایات اور مسالک کے لیے قابل قبول تھا۔ اس مذہب کے لیے نہایت بامحل اور موزوں حالات تھے کہ دوسری صدی عیسوی کے آغاز سے چین کی تہذیب میں داخل ہو کر اپنی جگہ بنا لیتا۔ مغربی چین سے مشرقِ وسطی اور یورپ تک تجارتی راستہ تریم کے میدان اور سوغد سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ مقامات کشن سلطنت کے عین شمال میں واقع تھے۔ بدھ مت اسی علاقے سے سنسکرت کی دستاویزات اور گندھارا یونانی طرز کے مصری فن پاروں کی صورت میں چین پہنچا ہو گا۔ چینیوں اور ہندوستانیوں کا اندازِ فکر قطعی مختلف تھا۔ چین کے خیالات کا اظہار واضح طور پر حروف تہجی جیسے پیرائے سے ہوتا تھا۔ ہندوستانی خیالات نسبتاً زیادہ تجریدی ہوتے تھے۔ تمام چینی فلسفوں میں بودھ کا اندازِ فکر تاؤ ازم (Taoism) سے نہایت قریب تھا۔ چنانچہ ابتدائی زمانے کی بدھ مت کی تحریروں میں تاؤ ازم کے تصورات اور اصطلاحات استعمال کیے گئے تھے۔ ان دنوں بہت سے علما بودھوں کے صحیفوں کو چینی زبان میں منتقل کرنے پر مامور تھے۔

جب تیسری صدی عیسوی میں مشرقی ہن خاندان پر زوال آیا تو چین میں ایک روحانی خلا پیدا ہو گیا تھا، جسے ماہایانہ بدھ مذہب نے پُر کیا۔ کنفیوشس کے نظریے کو اس بنا پر ناپسند کیا جانے لگا کہ اس کا تعلق ماضی کی بددیانت شاہی انتظامیہ سے رہ چکا تھا اور تاؤ ازم کے ماننے والے اس بنا پر اپنا اعتبار کھو چکے تھے کہ عوام کے مسائل کے حوالے سے ان کا رویہ بے عملی اور مجہولیت کا تھا۔ پُرجوش بودھ مشنریوں کی ملاقات ان چینیوں سے ہوئی جو نئے خیالات کو سننے

پر آمادہ رہتے تھے۔ ایک چینی یاتری (سیاح) فاہ سن نے414-399 عیسوی کے درمیان بدھ مت کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لیے ہندوستان کا رخ کیا۔ ایک ہندوستانی عالم کمار جیوا نے جسے چینی چھاپہ ماروں نے382 عیسوی میں گرفتار کر لیا تھا، اپنی باقی زندگی چین میں ہی گزار دی اور وہاں بودھوں کی کلاسیکی تحریروں کا ترجمہ کرتا رہا۔ چینی بودھوں نے اپنا الگ فرقہ بنا لیا تھا۔ ان میں سے ایک ''پاک زمین'' اسکول تھا، جس نے بودھستوا امیتابھا عقیدے کے ذریعے ایک مغربی جنت میں پناہ دلانے کی پیش کش کی تھی۔ ایک اور اسکول 'زین' کہلاتا تھا، جس میں مراقبے اور نفس کی تنظیم پر بہت زور دیا گیا تھا۔ بودھوں کی عبادت گاہوں نے خاصی دولت اکٹھا کر لی تھی۔ سوئی اور تانگ خاندانوں کے بادشاہ ذاتی طور پر بودھ مت کی طرف مائل تھے، اگرچہ وہ دوسرے مذاہب کے فلسفوں کو بھی گوارا کرتے تھے، تاہم مصیبت کے موقعوں پر کنفیوشس اور تاؤ دونوں کے ماننے والے بدھوں کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لیے ایک سازش کے تحت آپس میں متحد ہو جاتے۔ چین کی شاہی حکومت نے842 اور845 عیسوی کے درمیان بودھ اداروں کے خلاف زبردست کارروائی کی۔ بھکشوؤں اور پجاری عورتوں کو ان کے عہدوں سے محروم کر دیا گیا اور عبادت گاہوں سے املاک چھین لی گئیں۔ بدھ مت ہندوستان سے باہر ایک بالادست مذہب بن چکا تھا، جن پر اصلاً ہندوستانی یا چینی تہذیب کا اثر تھا۔ ہندوستان کی تہذیب پہلی صدی عیسوی میں جنوب مشرقی ایشیا اور انڈونیشیا تک پھیل گئی تھی۔ یہ رجحان تیسری صدی تک بڑھتا گیا جب گپتا معاشرہ کے تہذیبی اثرات اپنی روشنی پھیلا رہے تھے۔ تبت اس وقت ہندوستان کے تہذیبی دائرہ اثر میں آ گیا جب تبت کے بادشاہ نے راجہ ہرش کے انتقال کے بعد647 عیسوی میں شمالی ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ تبت نے اپنی زبان کے لیے ہندوستان طرز کا رسم الخط وضع کر لیا تھا۔ اس رسم الخط کو ماہایانہ بدھ مت کی تحریروں کے ترجمہ کی غرض سے استعمال کیا گیا۔ بعد میں منچوریا اور منگولیا کے خانہ بدوشوں نے تبتی یا ''تانترک'' بدھ ازم کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اس سے ان لوگوں کے اندر پلتی ہوئی وحشیانہ روح کی تہذیب ہوتی رہی اور یوں ان کے ہاتھوں مہذب معاشروں کی تباہی کا خطرہ جاتا رہا۔ بدھ مت سری لنکا میں پہلی بار تیسری صدی قبل مسیح میں آیا۔ پالا حکومت کی تبلیغی جماعتیں آٹھویں صدی کے دوران میں ماہایان بدھ مذہب کو لے کر جاوا پہنچیں۔ وہ بھکشو جو سری لنکا جا چکے تھے، انہوں نے1190 عیسوی میں تھیراواد بدھ مت کو برما اور کمبوڈیا میں متعارف کرایا۔ ویت نام

نے ماہایانہ بدھ مت کو اختیار کیا، جس سے جنوبی ایشیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں ویت نام پر چینی اثرات کا زیادہ پتا چلتا ہے۔

چین نے بھی ہمسایہ ممالک کوریا اور جاپان پر اپنا تہذیبی اثر ڈالا۔ شہنشاہ ہان ووٹی (Han Wu Ti) نے دوسری صدی قبل مسیح میں کوریا میں ایک نوآبادیاتی چوکی قائم کی۔ اگرچہ بعد میں کوریا نے چینیوں کو وہاں سے نکال دیا لیکن ان کا تہذیبی اثر باقی رہا۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں کوریائی باشندوں کی ایک خاصی بڑی تعداد جاپان ہجرت کر گئی اور اپنے ساتھ چینی ماہایانہ بدھ مت کا وہ مسلک جو کوریا میں رائج تھا، لے گئی۔ بدھ مت، جاپان کے معاشرے میں ساتویں صدی عیسوی میں متعارف ہوا۔ تانگ چین میں اس وقت تک بلاک کی چھپائی کا طریقہ ایجاد ہو چکا تھا، چنانچہ بودھ مت اور کنفیوشس کے متون بڑے پیمانے پر چھاپے جانے لگے۔ اس ادب کا کچھ حصہ جاپان پہنچ گیا۔ جہاں کے عالموں نے بول چال کی جاپانی میں چینی الفاظ رائج کیے۔ اس کے نتیجے میں جو سوادِ تحریر سامنے آیا، وہ چین کے بصری حروف اور آوازوں اور اس زمانے کی جاپانی بول چال کے اشتراک کی بنیاد پر قائم تھا۔ جاپان کے بودھوں نے چین کی مذہبی تعلیمات کو سادہ قرینے سے مرتب کیا، تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دلچسپی پیدا ہو۔ زین بدھ ازم، جو چان اسکول سے لی گئی تھی، 1191ء میں کماکورا کی سمورائی عدالت میں متعارف ہوئی۔ اس کے سخت ذہنی اور جسمانی آداب اور ضوابط سپاہیوں کے لیے خاص طور پر پرکشش تھے۔ ہونین اور شینران (Honen & Shinran) بدھ ازم عام لوگوں میں رائج مسلک تھے، جن میں ان لوگوں کے لیے جنت میں داخلے کا وعدہ شامل تھا جو بودھوں کے سربراہ امیدا (Amida) کے نام کا جاپ کرتے ہوں۔ نچیرن (Nichiren) فرقے میں نجات کا سبق یہ تھا کہ لوٹس سترا (Lotus Sutra) بھجن گاتے رہو۔

ایک دوسرے کے حریف بودھ فرقوں نے اپنی سلطنتیں قائم کر لی تھیں۔ وہ مارشل آرٹ (جنگ جوئی کے فن) کے ذریعے ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ بودھ پجاریوں نے ننجا جنگ جوؤں کے دستے تیار کیے تھے، جو دشمن کے مراکز میں چپکے سے داخل ہو جاتے تھے اور اکا دکا لوگوں کو اغوا کر لے جاتے یا وہیں ہلاک کر دیتے تھے۔ سولھویں صدی کے تین بڑے شوگنز (موروثی جنگی سالاروں) میں سے ایک ایاسو نے ان جنگ بازوں کو اس خدمت پر مامور کر دیا کہ مخالف جنگی سردار کے بچوں کو اغوا کر کے لائیں۔ اس طرح اپنے مغوی بچوں کی

واپسی کے لیے سودے بازی ہو سکے گی۔ بہرطور اس نے اور اس کے جانشینوں نے نئے کنفیوشس فلسفے کو فروغ دیا کیوں کہ اس کے خیال میں اس فلسفے کے اخلاقی اصول اس کے اقتدار کو مستحکم کریں گے۔ پرتگال کی مشنریاں مسیحیت کو سولھویں صدی میں جاپان لے کر آئیں۔ نوبناگا، تین شوگنز میں سے ایک تھا جس نے مسیحیت کو اس لیے گوارا کر لیا کہ اس سے بودھوں کی طاقت ڈانواں ڈول ہو گی۔ لیکن اس کے جانشین ہیڈ وئشی کا کچھ اور خیال تھا۔ مغربی مشنریوں کے لیے اس کے دل میں بداعتمادی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس طرح کی تبدیلی مذہب کے نتیجے میں، وہ سیاسی اقتدار بھی سنبھال لیں گے، جیسا کہ فلپائن میں ہوا۔ چنانچہ ہیڈ وئشی کے بندوبست میں1597 میں عیسائیوں کے خلاف کارروائی شروع ہو گئی۔ جب1638 میں شیما بارا میں کیتھولک فرقے والوں میں ایک بغاوت پھوٹ پڑی تو حکومت نے عیسائیوں کو اور غیر ملکی تجارت کو کچل دیا۔ بدھ ازم کو نہیں دبایا گیا، بلکہ تمام جاپانیوں کو ہدایت کی گئی کہ اپنے نام کسی بودھ معبد میں ایک عام شریک کے طور پر درج کرا لیں، تاکہ اس امر کی تصدیق ہو جائے کہ وہ عیسائی نہیں ہیں۔

ہنیایانہ بدھ ازم برما سے نکل کر ہمسایہ ملکوں، یعنی تھائی لینڈ، لاؤس اور تیرھویں صدی کے اندر کمبوڈیا تک پہنچ گیا۔ جہاں سے اس نے ہندو مذہب اور ماہایانہ بودھ ازم دونوں کو نکال دیا۔ تھائی لینڈ کے لوگ مغربی چین سے آئے تھے، لیکن انھوں نے برمی طرز کا مذہب اختیار کیا۔ دیوتا بادشاہوں کی ایک خاندانی حکومت کمبوڈیا کی کھمیر ریاست میں کہ اس پر ہندوستانی تہذیب کا اثر تھا، پانچ سو سال سے بھی زیادہ عرصے تک حکمران رہی۔ ویت نامیوں نے جنوب میں جب چمپا بادشاہت کو فتح کیا تو چینی طرز کا ماہایانہ بدھ ازم اپنے ساتھ لائے۔ چمپا کے لوگ مسلمان ہو گئے۔ سماترا میں سری وجیا سلطنت جس کی بنیاد ساتویں صدی میں رکھی گئی تھی اور سیلندرا کی بادشاہت، جس کی بنیاد جاوا میں اس کے بعد کی صدی میں رکھی گئی، وہ دونوں ماہایانہ بدھ مت پر قائم رہے۔ تاہم ایک ہندو سلطنت، جس کا تعلق شیو سے تھا، سنجایا کے نام سے مشرقی جاوا میں اٹھی اور اس نے آٹھویں صدی کے اواخر میں سیلندر بادشاہت کو برطرف کر دیا۔ ماجا پاہت کی سلطنت جاوا میں1293 میں قائم ہوئی۔ یہ منگولوں کی بحری جنگ میں شکست کے بعد ہوا۔

اس دور افتادہ سلطنت کی بنیاد ایک ماہایانہ بودھ شہزادے نے رکھی تھی، لیکن ہندو

مذہب اور دیگر مخالف مذاہب بھی بہت طاقت وَر تھے۔ پندرھویں صدی میں اسلام، ہندوستان سے ملایا میں مؤثر طور پر داخل ہوا، اور انڈونیشیا کے مجمع الجزائر تک پھیل گیا۔ یہاں اس سرزمین پر اس نے مذہب کی آخری پرت رکھ دی۔ بندرگاہوں اور ساحلی علاقے کے سرکردہ لوگوں نے اپنا رشتہ ان مسلمان تاجروں کے ساتھ جوڑ لیا، جن کی تجارت پر ان لوگوں کے روزگار کا انحصار تھا۔

تیرھویں صدی میں ایک پرکشش امکان یہ نظر آتا تھا کہ دُنیا کی سب سے بڑی سیاسی حکومت اس مذہب کو اجتماعی طور پر قبول کر لے گی، جو مغل حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگی۔ منگول اگرچہ اپنی اصل میں شمان مذہب (ارواح پرست) کے ماننے والے تھے، لیکن قبلائی خاں کی ماں نستوریائی عیسائی تھی۔ خانِ اعظم نے مارکوپولو کے باپ اور چچا سے کہا کہ وہ پوپ کو دعوت دیں کہ وہ اپنے عالم فاضل عیسائیوں کا ایک وفد اس کے دربار میں بھیجے جو اسے اس مذہب کی خوبیوں کا قائل کریں۔ اس دعوت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور قبلائی نے ذاتی طور پر بودھ مت کو ترجیح دی، خاص طور پر تبت کے لاما بودھ فرقے کا انتخاب کیا۔ سولھویں صدی میں منگولوں نے ''زرد کلیسائی'' بودھ ازم جس کا تعلق دلائی لامہ کے ساتھ تھا، اختیار کیا۔ اگرچہ اس کے بہت سے وارثوں نے مغرب میں اسلام قبول کیا، البتہ ایک سابق بودھ بھکشو چو، یان چنگ نے جنوب مشرقی چین میں منگول خاندان کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور 1368 میں اپنے منگ خاندان کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ نیا کفیوشس ازم ایک بار پھر ریاست کا مذہب قرار دے دیا گیا۔ مسیحیت کو چین سے دیس نکالا مل گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں ایک مذہبی مفکر ہنگ لیو چوآن نے جس کا خیال تھا کہ وہ یسوع مسیح کا چھوٹا بھائی تھا، کسانوں اور بے روزگار مزدوروں کا ایک لشکر تیار کیا اور مانچو حکومت کے ساتھ ہی تمام غیر مسیحی مذاہب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ''تی پنگ بغاوت'' کے سپاہیوں نے یانگ سی کی وادی کو دس سال سے زیادہ عرصے تک اپنے تصرف میں رکھا، لیکن مغرب کی مدد سے اس بغاوت کو کچل دیا گیا۔

چھٹا باب

تہذیب سوم
تیسری تہذیب کی مختصر تاریخ

عالمی تاریخ کے تیسرے عہد میں مغربی یورپ پر بہ طورِ خاص توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ تہذیب، اس سے پہلے کہ باقی دنیا میں پہنچتی، یورپ میں اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس عہد کے آغاز میں یورپ کی برتری نے ایک عدم توازن پیدا کر دیا تھا، جس کا آخر میں ردِعمل ظاہر ہوا، کیوں کہ یہ بات نا قابل برداشت تھی کہ ایک قوم کی تاریخ ساری بنی نوع انسان کی تاریخ بن جائے۔ ہمارے نظریے کی رُو سے مغربی یورپ میں نئی تہذیبی ٹیکنالوجی کا متعارف ہونا ایک نہایت اہم واقعہ تھا، یہ تھا گٹنبرگ میں حرکت کرتے ہوئے حروف کے ساتھ چھاپے خانے کی ایجاد۔ اگرچہ اس سے پہلے چین اور کوریا میں چھاپے کی ٹیکنالوجی استعمال میں آ گئی تھی، لیکن وہ مشرقی یورپ کے معاشروں میں اس طرح اپنی جگہ نہیں بنا سکی، جس طرح مغرب میں پھیلی اور اس کی وجہ رسم الخط کا اختلاف تھا۔ مذہبی تہذیبی پابندیوں کی وجہ سے اسلامی معاشروں میں چھپائی ترقی نہ کر سکی۔ اس وجہ سے مغربی یورپ کو ٹیکنالوجی استعمال کرنے اور اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے میں نسبتاً تاخیر ہو گئی۔ اس وقت جو مخصوص کلچر ظاہر ہوا، وہ ابھی پیدائش کے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ وہ تھا یورپ اور باقی دنیا میں مستقبل کا کلچر، اس کا رخ سیکولرازم اور تجارت کی طرف تھا۔

مذہبی کٹر پن میں بتدریج کمی

یورپی اقوام زمانہ وسطیٰ میں مذہبی نظریے کی گرفت میں آ گئی تھیں۔ یہ نظریاتی

گرفت ان کی اجتماعی زندگی میں سرایت کر گئی تھی۔ معاشرے پر بوجھل نظریہ پرستی طاری تھی۔ فلسفیانہ تصورات جو کسی زمانے میں یونان والوں یا یہودیوں کے ذہنوں کو منور کر رہے تھے، اب وہی تصورات منجمد ہو چکے تھے۔ مسیحیت کی لابدی صداقتیں، جنہیں استدلال سے چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا، اب ان پر عقیدے کی ایک تہہ چڑھا دی گئی تھی۔ لیکن اس کے نیچے زندگی میں تلاطم موجود تھا۔ یہ دراصل انسانی روح کی ایک توانا اور صحت مند متلاطم کیفیت تھی۔ زمانہ وسطیٰ کی زندگی پر روحانیت کی ایک پرت پڑی ہوئی تھی، لیکن اس زندگی میں ایک ہوس پرست مادیت کی گہما گہمی پائی جاتی تھی۔ مذہبی دفاتر، تعیش کے اسباب اور بزرگان دین کے آثار بیچے اور خریدے جا رہے تھے۔ مقدس نام، مقامات اور اشیا ان سب کی برابر بے حرمتی کی جا رہی تھی۔ چرچ نوجوان جوڑوں کے لیے ملاقات کی ایک جگہ بن گیا۔ تہوار کے دنوں میں وہاں عریاں تصویریں بیچی جاتی تھیں۔ جوہن ہوزنگا نے لکھا ہے کہ روزمرہ زندگی میں مذہب کے بے تحاشا استعمال سے یہ ہوا کہ جس بات سے روحانی شعور کی افزائش مقصود تھی، وہ گھٹتے گھٹتے ایک المناک اور سستی قسم کی مذہب بیزاری میں بدل گئی، مقدس چیزیں اتنی عام ہو گئیں کہ ان سے احساس کی شدت جاتی رہی۔

اس طرح ازمنہ وسطیٰ کے اواخر میں، یا اسے تہذیب کے تیسرے دور کی فصل بہار کہہ سکتے ہیں، مذہب کا کلچر ایک گلیشیئر کی طرح پگھلنے لگا۔ کٹر مذہبیت کے ٹھوس اجسام پر جہاں بھی دلائل کی تیز روشنی پڑی، جگہ جگہ سے دراڑیں پڑنے لگیں۔ کچھ دراڑیں تو اتنی کشادہ تھیں کہ تازہ فکر کی ایک پتلی دھار اس کے اندر سے بہنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ پانی کا وہی چشمہ طوفانی لہروں میں بدل گیا اور اس نے عقائد کے پشتوں کو توڑ ڈالا۔ اس سارے سلسلہ کار کو چند نہایت مضبوط دانش اور محکم عزم رکھنے والے افراد سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا ہی شخص پیٹر ایبلارڈ (1079-1142) تھا۔ پیٹر پیرس کی یونیورسٹی میں دینیات کا استاد تھا۔ دوسرا شخص فرانسسکو پیٹرارکا یا پیٹرارک (1304-1374) تھا۔ وہ ایک اطالوی عالم اور شاعر تھا۔ دیگر افراد میں شہنشاہ فریڈرک دوم (1194-1250) بھی شامل تھا۔ وہ ایک آزاد خیال بادشاہ تھا جس نے پوپ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ راجر بیکن (1214-1294) تھا، یہ ایک انگریز درویش تھا، جس نے تجرباتی سائنس کا نظریہ مرتب کیا اور دانتے الیگری (1265-1321) تھا جس نے Devine Comedy لکھا۔ (ملاحظہ کیجیے جدول 6-1) اس دوران میں جرمن چرچ اپنی

گوشوارہ:6-1 TAble: 6-1

نشاۃ الثانیہ کے دَور کی شخصیات

دانتے الگیری	Dante Alighieri	1265-1321	شاعر
گیوٹو ڈی بونڈون	Giotto de Bondone	1266-1337	مصوّر
پیٹرارک		1304-1374	شاعر
فیلپو برونی لسکی	Fillippo Brunelleschi	1377-1446	ماہر تعمیرات
کوسیموڈی میڈی سی		1389-1464	مدبر
جان گٹنبرگ		1397-1468	چھپائی کا موجد
پوپ جولیس دوم		1443-1513	مذہبی رہنما
سینڈرو بوٹیسیلی		1444-1510	مصور
لورنزو ڈی میڈیسی		1449-1492	مدبر
کرسٹوفر کولمبس		1451-1506	بحری سیاح
لیونارڈو ڈی ونچی		1452-1519	مصور
پیکو ڈیلا میونڈولا		1463-1494	مصنف
ایریسمس ڈی اٹرڈیم		1466-1536	مصنف
واسکو ڈی گاما		1469-1524	بحری سیاح
نکولو میکاولی		1469-1524	مصنف
البرخت ڈیورر		1471-1528	گرافک آرٹسٹ
نکولس کوپر نکس		1473-1543	ماہر علم نجوم
میکائل اینجلو بونارٹی		1475-1564	مصور
بلڈیسارے کسٹوگلین		1478-1529	مصنف
رافیل سانچ		1483-1520	مصور
مارٹن لوتھر		1483-1546	مذہبی رہنما
فرنکوئس رابنسن		1490-1553	مصنف
سینٹ اگنیشیئس لویولا		1491-1556	مذہبی رہنما

بنیووینیو سلینی	1500-1571	سنار
جان کالون	1509-1564	مذہبی رہنما
میگوئل ڈی سرونٹس	1547-1616	مصنف
ولیم شیکسپیئر	1564-1616	ڈراما نگار

اخلاقی حیثیت سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ روم میں مخالف پوپ اور ایوگنان نے زبردست تفرقہ (Great Schism) لکھا، جس سے پوپ کی مصدقہ حیثیت پر سخت ضرب لگی۔ عام لوگ، بددیانت پادریوں سے بے زار ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور نقدی کی طلب بھی ان کے لیے پریشان کن تھی۔ چرچ کے ماحول میں تشدد اور جبر کی کیفیت پائی جاتی تھی، جو اس کے بانی کی شان کے منافی تھی۔

مشاہدے کا انقلاب

نشاۃ الثانیہ سے ہمارے ذہن میں تہذیب کی از سرِ نو پیدائش کا خیال آتا ہے۔ دنیا کی نئی دریافتیں اس زمانے میں ہوئیں۔ انسانیت نے ایک نومولود بچے کی طرح ایک بار پھر سے دنیا کو دیکھنا سیکھا۔ مغربی یورپ کی تہذیب نے زمانہ وسطیٰ کے مقدس خول سے نکل کر اس انسانی تصور کو اپنے گلے سے لگا لیا کہ ''انسان ہی ہر وجود کے لیے میزان ہے۔'' نشاۃ الثانیہ کی تہذیب نے فلسفیانہ قیاس آرائیوں کو رد کر دیا اور اس نئی دنیا شناسی کو قبول کر لیا، جو تلاش علم میں فطری مشاہدے کو بنیاد بناتی ہے۔ لیونارڈو ڈی ونسی نے اس وقت اعلان کیا تھا کہ ''وہ دماغی علوم، جنہیں حواس نے قبول نہ کیا ہو، محض لاحاصل ہیں اور ان سے کوئی صداقت، سوائے مضرت کے حاصل نہیں ہوتی۔'' اس سے پہلے کا عہد ایک فلسفیانہ انقلاب سے شروع ہوا تھا۔ اس نے ان سے ''ان دیکھی چیزوں'' کی قدر کی۔ اس کی مذہبی تہذیب نے خیالات کو ہی خیر اور صدق تک رسائی کا ذریعہ سمجھا، جب کہ جسم اس کے نزدیک گناہ آلود کمزوری کا ذریعہ تھا۔ عقیدت مند لوگوں کو یہ تاکید کی جاتی تھی کہ خدا کے وعدے پر بھروسا کریں اور دنیاوی تجربوں سے جو شکوک پیدا ہوتے ہیں، انہیں دبا دیا کریں۔ اس کے برعکس تیسرے عہد کی تہذیب کا آغاز مشاہدے سے ہوا۔ دنیاوی اشیا کی جانب اس کی از سرِ نو توجہ گذشتہ تہذیب سے یک سر مختلف تھی۔

مشاہدے کے انقلاب کا پہلا پھل ان بہت سی خوبصورت اشیا کا نظارہ تھا جو مصوروں نے تخلیق کیں۔ مصور جن کی آنکھیں رنگ، اشکال اور حسن تناسب کے نئے امکانات کو کھلتا ہوا دیکھ رہی تھیں، مصور نے انسانی جسم کو جس طرح تصویر کیا، وہ مسرت اور راحت کا سبب بنا۔ مادی دنیا میں جو کچھ بھی تھا، انسانی ذہن کو اس کے ہونے کا یقین دلایا گیا۔ اب سے پہلے بازنطینی فن میں ایک ہی رنگ سے اشکال بنائی جاتی تھیں بلکہ انسانی جسم کو ایک روحانی پیکر بنا کر دکھایا جاتا تھا، شمالی اٹلی کے فن کاروں نے جن میں ابتدا گیوٹو نے کی، انسانی اجسام کو ان کے گوشت پوست کے ساتھ دکھایا۔ مائیکل اینجلو، لیونارڈو، راخیل، تیتیان، بوکیشیو، برتو لیچی اور دیگر فن کاروں کے نام آئیں تو ذہن میں دلآویز رنگ اور حسین اشکال اور ان کے درمیان حسن تناسب کا خیال آتا ہے۔ آلپس کے شمال میں باصلاحیت فن کاروں کا ایک اور گروہ، جس میں جان دان آئک، پیٹر برغیل اور البرٹ ٹریور شامل تھے، نہایت نفیس اور حقیقت پسندانہ تصاویر بنانے میں مصروف تھے۔ نشاۃ الثانیہ کے دور کا فن اور اس کا موضوع حقیقت پسندی (ریلزم) تھا، لیونارڈو نے انسانی جسم کا گہرا مطالعہ کیا تاکہ بالکل حقیقت پر مبنی اپنے موضوعات پیش کر سکے۔ البرٹ، برتو لیچی اور دوسرے فن کاروں نے ابعاد کی ٹیکنیک اختراع کی، یہ دکھانے کے لیے کہ اشیا کو حقیقی زندگی میں مختلف فاصلوں کی بنا پر کیسا نظر آنا چاہیے۔ ادب میں ان کلاسیکی مصنفوں کی تحریروں سے پردہ اٹھا دیا گیا، جنہیں عام لوگ محض ان کی شہرت کے حوالے سے یا عربی سے ترجموں کی بہ دولت جانتے تھے۔ پیٹرارک نے لاطینی اور یونانی زبانیں سیکھیں تاکہ زمانۂ قدیم کے صحیفوں کو پڑھ سکے۔ انہیں پڑھتے وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ان مصنفوں کو ذاتی طور پر جانتا ہو۔ اس نے اپنی مشہور عشقیہ نظموں میں، جسے اس نے لارا کے نام معنون کیا، زمانہ وسطٰی کی درباری روایات کو ترک کرتے ہوئے عورت کو اپنے حقیقی رنگ میں دکھایا ہے۔ پیٹرارک کی اس مثال سے دوسروں میں بھی یونانی رومن کتابوں کے کلاسیکی مطالعہ کی تحریک پیدا ہوئی۔ زمانہ وسطٰی کے دانش وَر مسودوں کی نقل کرنے یا انہیں مرتب کرنے میں لاپرواہی برتتے تھے، ان کے مقابلے میں پیٹرارک اصل متون کی صحت کا پورا پورا خیال رکھتا تھا۔ اس کی دلچسپی اصل متن کی صداقت کے ساتھ تھی اور یہ جاننے کی لٹک ہوتی کہ مصنف کے بیان کا اصل مقصد کیا تھا۔ دانتے نے ڈیوائن کامیڈی لاطینی کی بجائے اپنی مقامی ٹسکن زبان میں لکھی، جس سے اس کی شاعری نسبتاً زیادہ تعداد میں لوگوں کے لیے قابل فہم ہوگئی۔ ایک اور

انقلابی واقعہ دیسی زبانوں میں بائبل کے تراجم تھے۔ اس سے عام لوگ اس قابل ہوئے کہ خدا کے اقوال خود پڑھیں اور اپنے لیے صداقت اور نجات کی راہ خود نکالیں، نہ کہ چرچ کے مقررہ رسوم کے پابند بنے رہیں، اور یوں عام لوگوں کے لیے رومن چرچ کے اختیار کو چیلنج کرنا ممکن ہو گیا۔

زمانہ وسطیٰ کے معاشرے میں جب سچائی کی تلاش پیدا ہوئی تو ان کا پتا ارسطو کی سائنسی تحریروں میں ملا۔ راجر بیکن نے متبادل راستہ دکھاتے ہوئے ارسطو کے رویے کو چیلنج کیا، جو تجرباتی سائنس کا راستہ تھا۔ اس نے کہا ''مسلمہ اقوال اور احکام کی اطاعت چھوڑو اور دنیا کو دیکھو۔'' بیکن کے اس بیان پر عمل کرتے ہوئے تجرباتی سائنس کو صداقت طبعی دنیا کے مشاہدے ملی اور ان نظریات میں ملی جنہیں تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جا سکے۔ کیمیا دان اور نجوم کے ماہر ایک زمانے سے قدرت کے بارے میں حقائق معلوم کرنے میں مصروف تھے۔ اس تجرباتی کاوش اور ریاضی کے ساتھ ہی اس خواہش نے کہ جو عقائد فطری مشاہدے کے منافی ہوں انہیں ترک کر دیا جائے، براہِ راست جدید سائنس کا راستہ کھول دیا۔ پولینڈ کے ماہر فلکیات نکولس کوپر نکس نے جدید نظام شمسی کا عمل دریافت کیا، جس نے اس امر کی تردید کر دی کہ زمین اس نظام کا مرکز ہے۔ گیلیلیو نے یہ جاننا چاہا کہ آیا افلاطون کا یہ سبق درست ہے کہ اشیا زمین پر اپنے وزن کے مطابق مختلف رفتار سے گریں گی۔ لیکن اسے تجربے سے جو کچھ معلوم ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ پیسا ٹاور سے مختلف اوزان کی گیندیں بیک وقت پھینکی گئیں اور وہ سب ایک ہی وقت میں زمین پر گریں۔

یورپ والوں نے نشاۃ الثانیہ کے دور میں اس مذہبی کلچر کو جس پر علامتی یا نامعلوم معانی کا بوجھ تھا، ترک کر دیا اور اس مادی دنیا کو دریافت کیا۔ اٹلی کے بحری سیاح کرسٹوفر کولمبس نے سپین کی ملکہ کو اس امر پر آمادہ کیا کہ بحر اٹلانٹک کو عبور کرنے کے سفر میں اس کی مالی کفالت کرے۔ اس کے خیال میں سمندر کی دوسری جانب مشرقی ایشیا ہوگا، لیکن انڈیز پہنچنے کی بجائے وہ ایک نئی دنیا کے اجنبی ساحل پر جا پہنچا۔ کولمبس نے اس مغربی نصف کرۂ ارض میں دیکھا کہ وہاں مختلف نسل کے لوگ آباد تھے، نئی طرح کے کھانے کھاتے تھے۔ نامعلوم امراض میں مبتلا ہوتے تھے۔ تمباکو، اون، عمارتی لکڑی، اندرون ملک آبی گزرگاہیں، سمندر، چاندی، سونا بہ کثرت دست یاب تھے۔ کولمبس نے کہا تھا کہ جاپان میں سونے کے اتنے ذخیرے ہیں جو کبھی ختم نہ

ہوں گے۔ فلارنس کا ایک نقشہ جس کے اندر زمین کے طول وعرض کا ایک نہایت غلط تخمینہ درج تھا اور جس میں جاپان کو عین یورپ کے مغرب میں دکھایا گیا تھا۔ اس سفر میں اس کے ساتھ تھا۔ دنیا کے گرد میگالن کے اس سفر میں ایک نئے براعظم کے وجود کا انکشاف ہوا، جسے اس کے انتہائی جنوب تک دیکھا جا سکتا تھا۔ کرۂ ارض کی تلاش کے ضمن میں سپین اور پرتگال کے سمندری سفر بھی، دریافت کی نئی روح کی علامات تھے، جن سے ایک نئی تہذیب فیض یاب ہو رہی تھی۔

دریافتوں کی اس صدی کو تجارت کے ولولے سے بھی بہت فیض پہنچا۔ یورپ میں مشرق کے الائچی اور گرم مسالوں کی زبردست مانگ تھی، جن سے گوشت کو محفوظ کیا جا سکتا تھا اور ان سے ذائقہ بھی دو چند ہو جاتا تھا۔ اس طرح چینی ریشم کی بڑی طلب تھی، جو شاہانہ ملبوس میں استعمال ہوتے تھے۔ جب عثمانی ترکوں نے 1453 میں قسطنطنیہ فتح کیا تو ایک مخالف حکومت نے چین کی تجارتی شاہراہ بند کر دی جو یورپ کے تاجروں کے لیے ہمیشہ کھلی رہتی تھی۔ آخر پرتگال کے بحری سیاحوں نے سمندر سے ایک متبادل راستہ نکال لیا، جو افریقا کے انتہائی جنوب کے قریب سے نکلتا تھا اور جلد ہی بحرِ ہند میں مسلمانوں کی تجارتی بندرگاہوں کو ان سے چھین لیا۔ کولمبس گینوا کا رہنے والا تھا، اس کے تجارتی راستے کریمیا میں کفاّ کے مقام سے لے کر بحرِ روم کے مغربی ساحل اور ایڈیات تک واقع تھے۔ وینس کے تاجروں نے بھی جنہیں سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ تجارت میں بالادستی حاصل تھی، اپنے جہاز شمالی اٹلانٹک بھیجنے شروع کر دیے۔ اس دوران میں ایک تیسرا تجارتی فریق تیار ہو گیا۔ بالٹک اور شمالی سمندر کی بہت سے تجارتی بندرگاہوں پر اس فریق کا قبضہ تھا۔ شمالی اٹلی اور فلانڈرس سوتی کپڑے کی تیاری کے زبردست مراکز تھے اور ایسے تجارتی منطقے تھے جہاں ہمیشہ بڑی گہما گہمی لگی رہتی تھی۔ تجارت، بنکاری اور صنعتوں سے زبردست دولت پیدا ہوئی، جس سے سامانِ تعیش کی مانگ میں بھی اضافہ ہوا۔ اب دولت اور عیش وعشرت کے اسباب ایسے نہ تھے کہ ان سے نفرت کی جاتی یا اس لیے خوف آتا کہ روح ان کی طرف مائل ہوتی تھی۔ دولت کی مانگ اور اس کی کشمکش سامنے کی چیز تھی، نظر آتی تھی اور فوری حصول کا تقاضا کرتی تھی، کوئی آخرت کی بات نہیں تھی۔

لوتھر کا احتجاج

دولت اور خوب صورت اشیا کے ساتھ دلچسپی نے رومن چرچ پر بھی اثر ڈالا، جس کا صدر دفتر وسط اٹلی میں تھا۔ چرچ کو اپنے دنیاوی منصوبوں پر کام کرنے کے لیے کثیر رقم کی

ضرورت تھی۔ چرچ کو اپنی زمینوں اور املاک سے مطلوبہ مقدار میں رقم مہیا نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے فنڈ اکٹھا کرنے کے دوسرے طریقے وضع کیے، مثلاً یہ کہ چرچ کے عہدوں کی اور پوپ کے اسباب آسائش کی فروخت۔ نشاۃ الثانیہ کے دور میں پوپ صاحبان کو مہاجنوں سے معاملہ کرنے کی اکثر ضرورت رہتی تھی۔ انوسنٹ چہارم ان لوگوں کو ''رومن چرچ کی انوکھی اولادیں'' قرار دیتا تھا۔ پوپ کی دولت کا رشتہ بورگیا اور ڈی میڈی سی خاندانوں کے سرمایے کے ساتھ جڑ گیا تھا۔ پوپ کالسٹس سوم اعلیٰ انہیں اعلانیہ خویش پروری کا ملزم گردانتا تھا۔ پوپ الیگزینڈر چہارم، اس کا بھتیجا اور سیزر بورگیا کا باپ تھا اور میکاولی کے نمونے کے عین مطابق ایک سفاک شہزادہ تھا۔ 1490 کے عشرے میں چرچ کی دنیا داری کے مقابلے میں ایک ڈومینیک پادری گیراموسوانا رولا بڑے دبدبے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، جس نے فلورنس میں اپنے ساتھیوں سے تقاضا کیا کہ فن کارانہ شباہتوں سے درگزر کریں، عیش و عشرت ترک کر دیں اور سادہ مسیحی رہن سہن اختیار کریں۔ الیگزینڈر چہارم نے اسے حکم دیا کہ رومن چرچ کے خلاف درس دینا بند کرے، لیکن پادری نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ حکم عدولی پر اسے مسیحیت سے خارج کر کے جلا دیا گیا۔

جولیس دوم نے سینٹ پیٹرس برگ کی دوبارہ تعمیر کا زبردست منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی تکمیل میں ایک سو پچاس سال درکار تھے۔ اس کے لیے برونیٹ، مائیکل اینجلو، رافیل اور برونیئی جیسے فن کاروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اتنے بڑے منصوبے کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کی خاطر ایک نئی کوشش درکار تھی۔ پوپ نے 1509 میں ایک خصوصی جوبلی کا اہتمام کیا۔ ایک ڈومینکن مبلغ جس کا نام جان ٹڑل تھا، اکتوبر 1517 میں سیکس کوئی پہنچا تا کہ لیو دہم نے جن صنافتی تکلفات کی ادائیگی کی اجازت دی ہے، ان میں اضافہ کرے۔ یہی وہ واقعہ تھا جس نے مارٹن لوتھر میں ابال پیدا کیا اور اس نے ڈنبرگ کے کلیسا کے دروازے پر اپنا ''95- تھیسس'' آویزاں کر دیا۔ اس کی یہ تحریر بڑے پیمانے پر تقسیم کی گئی۔ لوتھر کو مسلمہ طور پر بے دین کہا گیا لیکن مسیحی چرچ کی اصلاح کا مطالبہ اب اتنی طاقت اختیار کر چکا تھا کہ لوتھر کو سوانا رولا جیسے پادری کو سیاسی طور پر اکیلا کر دینا ممکن نہیں رہا تھا۔ پوپ لیو دہم نے 1521 میں ایک مسودہ قانون جاری کیا جس میں لوتھر کے نظریات کی شدید مذمت کی گئی تھی اور اسے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر اس نے ساٹھ د

دائرے سے نکال دیا جائے گا۔ لوتھر اور اس کے ساتھیوں نے اس حکم نامے کی ایک کاپی لی اور سرعام جلا دی۔ سیکسن الیکٹر فریڈرک سوم نے لوتھر کو اپنے وارٹ برگ کے قصر میں پناہ دی۔

لوتھر کے مذہبی دلائل کے خطوط پر ایک نیا مسیحی عقیدہ جسے شمالی یورپ کے بادشاہوں کے ایک نہایت طاقت وَر گروہ کی حمایت حاصل تھی، مرتب ہونے لگا۔ ان میں ایک اصول عشائے ربانی کی مافوق الفطرت طاقت سے انکار، کلیسا میں میثاقِ مسیحی کی نفی اور گناہ گاروں کی یہ اہلیت کہ وہ اچھے کام کر کے بخشش حاصل کر سکتے ہیں اور رومن پادریوں کی یہ فرضی طاقت کہ وہ خدا اور انسانوں کے درمیان ثالثی کی طاقت رکھتے ہیں، ان سب کا انکار۔ لوتھر کے نظریے کے مطابق نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ''عقیدے سے اس کی توثیق ہو۔ تاہم عقیدے پر یقین کچھ لوگوں کے لیے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا اور وہ بچ گئے، لیکن دوسرے نہ بچ سکے۔ رومن چرچ کو آسمانی طاقت کی نیابت کے تعلق سے اقتدار حاصل تھا لیکن پروٹسٹنٹ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ مذہبی اقتدار اور صداقت کی اساس ''صرف آسمانی صحیفہ'' ہے۔ ہر صاحب عقیدہ فرد کے وجود میں اس بات نے کہ وہ پڑھ سکتا ہے اور بائبل کی عبارت کی توضیح کر سکتا ہے، انفرادیت کی روح زندہ کر دی تھی۔ اب عقیدہ رکھنے والے لوگ فرداً فرداً مسیحی تعلیمات کے وسیلے تک پہنچ سکتے ہیں، اور دیکھ سکتے ہیں کہ عیسیٰ نے دراصل کیا کہا تھا۔ تھامس ہوبس نے یہ دیکھا کہ جب بائبل کا ترجمہ انگریزی میں آ گیا تو ہر آدمی نہیں بلکہ ایک عام چھوکری بھی جو انگریزی پڑھ سکتی تھی، یہ سوچنے لگی کہ وہ خدائے ذوالجلال سے براہِ راست کلام کر سکتی ہے۔'' اس کے بعد تو عام لوگوں کے درمیان زبردست بحث مباحثے کا دور آ گیا اور پروٹسٹنٹ یا کیتھولک، دونوں کی مدافعت میں کتابچے چھپنے لگے۔ اس کے باوجود افراد کو یہ اجازت نہ تھی کہ اپنے عقیدے کا خود انتخاب کریں۔ یورپ کے علاقائی حکمران ہی یہ اختیار رکھتے تھے کہ ان کی رعایا کو کون سا عقیدہ اختیار کرنا چاہیے۔

قومی ذہن رکھنے والے افراد نے مسیحی صداقت کی اپنی توجیہہ اور تبلیغ شروع کر دی، اس طرح مغربی مسیحیت افسوس ناک طور پر بہت سے فرقوں میں بٹ گئی۔ 1650 عیسوی میں پروٹسٹنٹ عقیدے کے کم از کم 180 فرقے بن گئے تھے۔ لوتھر کے اپنے ماننے والے جرمن کا جماعَ جرمنی اور اسکینڈے نیویا میں تھا، قدامت پرست گروہ میں شامل تھے۔ ان کے مقابلے میں کالونسٹ تھے، ذونگلین (Zwinglians)، اناببپٹسٹ (Anabaptists)، مینونائٹس

(Mennonites) اور کاکرز (Quakers) تھے۔ ذونگلی، عشائے ربانی کی تفسیر کے باب میں لوتھر سے اختلاف رکھتے تھے۔ انابیپٹسٹ بچپن کی بپتسمہ کی رسم کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لوتھر کے بعد دوسری پروٹسٹنٹ، شخصیت جان کالوِن کی تھی، جو شہر جنیوا میں دینیات کا سربراہ تھا۔ اس کی تعلیمات ایک مقالے میں درج ہیں۔ اس مقالے کا نام ہے، ''مسیحی مذہب کے ادارے''۔ دینی اعتبار سے کالون کا عقیدہ یہ تھا کہ نسل انسانی اخلاقی برائی میں مبتلا ہے، اس وجہ سے وہ دائمی طور پر عذاب میں گرفتار رہے گی، لیکن عیسیٰؑ اسے عذاب سے نجات دلا دیں گے۔ دائمی عذاب کے بارے میں کالوِن کا موقف یہ تھا کہ وقت کا جب سے آغاز ہوا، اس وقت سے خدا نے انسانی روح کے لیے یہ بات مقدر کر دی کہ یا تو اسے بچالیا جائے گا یا اسے عذاب میں مبتلا رکھا جائے گا۔ اب کسی فرد کی کوششوں سے قطع نظر اس پختہ ارادے کو تبدیل کر دینا ممکن نہیں۔

رومن چرچ کے اندر جو طاقتیں کام کر رہی تھیں، وہ پروٹسٹنٹ کے اس تفرقے کو بچا سکتی تھیں، اگر انہوں نے عام لوگوں کی ناداری اور مسیحی خدمات کے سلسلے میں، جن کی بابت ان کا وعدہ تھا، مستعدی سے اور بروقت کام کیا ہوتا۔ بشپ کرافا نے جو بعد میں پوپ پال چہارم بنا، اطالوی پادریوں کے ایک گروہ کے ساتھ مل کر لوتھر کے مخالفانہ اقدام سے بھی پہلے کلیسا کے طور طریقوں میں اصلاح کی خواہش کی تھی۔ 1545 اور 1563 کے درمیان کونسل آف ٹرنٹ کے اجلاس وقفے وقفے کے ساتھ ہوتے رہے، جن میں پروٹسٹنٹ کے احتجاج کی روشنی میں چرچ کے عقائد اور احکام کا جائزہ لیا جاتا رہا۔ ''وہ اصلاح کے مخالف'' اقدام کی ایک معتدل تحریک تھی جس کا مقصد چرچ میں حرکت و عمل کی خوبیاں پیدا کرنا تھا۔ اس کی اہم ترین شخصیت سینٹ اگنائیٹیس لویولا (1491-1556) ایک ہسپانوی تھا۔ جس نے 1540 میں جیسوئٹ آرڈر (Jesuit Order) کی بنیاد رکھی۔ جیسوئٹ کے عقیدے میں روحانی نظم و ضبط اور تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ چرچ کے خود ساختہ سپاہیوں نے جیسوئٹ کی مشنریوں نے بہت کھل کر امریکا کے مقامی لوگوں میں مسیحیت پھیلانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے مشن ساتھ لے کر ہندوستان اور مشرقِ بعید میں بھی گئے، یہ انہی جیسوئٹس کا فیضان تھا کہ سپین اور پرتگال کے نوآبادیاتی حکمران جہاں بھی گئے، اپنے مذہبی عقیدے کی گرفت سخت رکھی۔ انگریز اور ہالینڈ کے نوآبادیاتی حکمران اپنے آپ کو خالصتاً کاروباری مقاصد تک پابند رکھتے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ لوتھر کی شکایت دراصل چرچ کے اندر بڑھتی ہوئی کاروباری سرگرمیوں سے تھی، کیسا المیہ ہے کہ کیتھولک ملکوں

کے مقابلے میں پروٹسٹنٹ ملکوں کے اندر کاروباری طور طریقے بہت مضبوط تھے۔ دانش وَروں نے تحقیق کے بعد کالوِن ازم اور تجارتی ترقی، ان دونوں کے درمیان ایک تعلق ڈھونڈ نکالا ہے۔ غالباً سب سے زیادہ معروف توجہ میکس ویبر کے مقالے میں ملتی ہے، جس کا عنوان ہے۔ پروٹسٹنٹ کی اخلاقیات اور سرمایہ داری کی روح (Protestant Ethics and the Spirit of Capitalism)۔ ویبر نے دلیل یہ دی کہ نیو انگلینڈ کے پیورٹن جیسے لوگ، جن کی تربیت سخت پروٹسٹنٹ کلچر میں ہوئی، غالب امکان ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں وہی لوگ پیسا کمانے کو ایک مفید سرگرمی خیال کریں گے۔ دولت کا حصول ان کے نزدیک ایک ناگزیر اخلاقی ضرورت ہوگی۔ ویبر کے قیاس کے مطابق کالوِنسٹوں کا عقیدہ یہ ہے کہ نجات حاصل کرنے کے لیے اچھے کام بھی بے نتیجہ ہوں گے۔ اس لیے وہ اس امر کی شدید یقین دہانی چاہتے ہیں کہ وہ خدا کے منتخب لوگوں میں سے ہیں۔ اگرچہ کسی بھی پروٹسٹنٹ کے لیے عقیدے کی پختگی اور روحانی عقیدت مندی نجات کے حصول کے لیے کافی ہوگی، لیکن کالوِن کے ماننے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ''عقیدے کو معروضی نتائج کے ذریعہ ثابت کرنا ہوگا۔'' اگر کوئی شخص زندگی کے ہر لمحہ میں، باضابطہ، ضبط نفس کے تجربے سے گزرتا ہے تو اس کے اندر، اپنی نجات کا یقین محکم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس مذہب کے سچے پیروکار وہ زاہد ہیں، جو دنیا کے کاروبار میں سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں، جیسے مسیحی تاجر جان ڈی راک فیلر جو دولت بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ اس سے جسمانی آسائش میسر آئے بلکہ خود اس زراندوزی کے عمل سے تسکین حاصل ہوتی رہے۔

کاروباری رقابت: شمالی اٹلانٹک کے ملکوں کے درمیان

پندرھویں صدی میں یورپ نے دریافتوں کا جو سمندری سفر آغاز کیا تھا، اس سے دُور دراز کی سرزمین میں معلومات کے حصول اور نوآبادکاری کا نیا عہد آ گیا۔ ہر قوم میں علاقائی مفادات سر اٹھانے لگے۔ پرتگال اور سپین نے بحری سراغ رسانی میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی اس لیے نئے علاقوں کی ملکیت پر ان کا پہلا حق تھا۔ پوپ الیگزینڈر ششم نے 1493 میں یورپ سے باہر کی ساری دنیا کو دو خودمختار اقوام کے درمیان اس شرط پر تقسیم کر دیا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقے کے باشندوں کو عیسائی بنائیں گی۔ پوپ نے ایک فرمان کی رُو سے (جس کی

توثیق بعد میں ایک معاہدے کے تحت ہوگئی) خط طول البلد کے مشرق کا علاقہ جواب برازیل کہلاتا ہے، پرتگال کو دے دیا اور اس خط کے مغرب کا علاقہ سپین کو۔ ان دونوں قوموں میں ایک زبردست مقابلہ شروع ہوگیا کہ غیر یورپی دنیا میں اپنی نوآبادیات قائم کرو اور ان کا معاشی استحصال کرو۔ اس وقت توجہ کا مرکز بحر روم کے علاقے میں سیاسی رقابت سے تبدیل ہو کر شمالی بحر اٹلانٹک کی طرف منتقل ہوگیا، جس کے طویل ساحلوں پر بہت سی کثیر آبادیوں والی اقوام آباد تھیں۔

پرتگال کی پہلی نمایاں دریافت 1488 میں جنوبی افریقا میں کیپ آف گڈ ہوپ کی گزرگاہ تھی۔ جسے بورتھولومیو دیاز (Bartholomev Dias) نے سر کیا۔ 1498 میں پرتگال کے بحری بیڑے نے واسکوڈی گاما کی سرکردگی میں کیپ سے گزرتے ہوئے ہندوستان کے مغربی ساحل کا سفر کیا۔ پرتگالیوں کو معلوم ہوگیا کہ عرب تاجر جو بحر ہند کے ساحل پر تجارت کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں، اس طرح کے تجارتی مال اسباب میں دلچسپی نہیں رکھتے، جو ان کے پاس ہوتے ہیں، چنانچہ پرتگالیوں نے اپنی بندوقیں پکڑیں اور کئی سال بعد واپس آئے اور عربوں کی تجارتی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے 1510 میں گوا (ہندوستان) پر، 1511 میں ملاکا پر اور 1515 میں ہرمز پر قبضہ جما لیا۔ پرتگالی تاجروں نے باقی پوری صدی میں مشرق کے گرم مسالوں کی تجارت کو اپنے قبضے میں رکھا۔ اس سفر میں تاجروں کے ساتھ مسیحی مشنریاں بھی جاتی رہیں تاکہ ایشیائی باشندوں کو عیسائی بنائیں۔ سینٹ فرانسس زیویئر نے مغربی ہندوستان، جزائر ملاکا اور جاپان میں 1541 اور 1552 کے درمیان مسیحی مشن قائم کیے۔ مٹیو رِکی (Metteo Ricci) نے 1582 میں چین کا سفر اختیار کیا، جہاں اس نے مسیحی صحیفوں کو چینی زبان میں منتقل کرتے ہوئے تیس سال گزار دیے۔ اس چینی تہذیب پر مقالے لکھے اور منگ کے دربار میں اس کا تقرر ایک ریاضی دان اور جوتشی کے طور پر ہوگیا۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ جب کلیسا کے عہدے داروں نے دینیات میں مقامی روایات کو شامل کرنے سے انکار کر دیا تو ان علاقوں سے عیسائیوں کو نکال دیا گیا۔

کرسٹوفر کولمبس اور اس کے ہسپانوی رفقا 1492 میں ویسٹ انڈیز کے جزیرہ سان سلواڈ پر لنگر انداز ہوئے۔ انہیں سونے کی تلاش تھی۔ (اس جگہ کو انہوں نے غلطی سے ہندوستان کا حصہ سمجھ لیا) وہاں انہیں جو تھوڑا سا سونا ملا اس سے ان کے اندر مزید تلاش کی خواہش پیدا

ہوئی اور ساتھ ہی غلام مزدوروں کا ایک نیا نظام وجود میں آیا۔ بیگار میں پکڑے ہوئے وہ لوگ ہسپا نائلہ کی کانوں میں کھدائی کرتے تھے۔ ہسپانوی مہم جو ہرنینڈو کورٹس کی قیادت میں جنوبی میکسیکو جا پہنچے اور اکثر آبادی والی اس قوم سے رابطہ پیدا کر لیا۔ یہ ان کی دلیری، بہتر آلات و اوزار کا فیض تھا کہ انہوں نے ایزٹک سلطنت کو دو سال سے بھی کم عرصے میں فتح کر لیا۔ اس کے علاوہ انہیں ان اقوام کی مدد بھی حاصل ہو گئی تھی جو ایزٹک حکومت اور اس کے لوگوں سے بیزار تھے اور ایک خوش قسمتی یہ بھی ہوئی کہ ایک خاص سال اور دن پر کورٹس کی آمد سے ایزٹک سلطان کو یقین آ گیا کہ وہ کوئٹزا کوٹل دیوتا کا نیا روپ ہے۔ چنانچہ فرانسسکو پیزارد نے جنوبی امریکا میں انکا سلطنت1532 اور1535 کے درمیان فتح کر لی۔ وہ دونوں ریاستیں چاندی اور سونے سے مالا مال تھیں۔ ہسپانویوں نے دولت کے اس وسیلے کو منظم انداز سے بروئے کار لانا شروع کیا۔

امریکا کی کانوں سے ہر سال کئی کئی ٹن قیمتی دھاتیں جہاز میں لاد کر سپین پہنچائی جانے لگیں، لیکن اس سارے سامان کی بہ دولت دولت مند ہونے کی بجائے سپین کے بادشاہ نے محسوس کیا کہ وہ رفتہ رفتہ غریب ہوتا جا رہا تھا۔ کان کنی اور جہاز پر لادنے کے مصارف، ہسپانوی تجارتی جہاز کی فوجی حفاظت اور کانوں کے نجی مالکوں کے منافع میں کمی کے سبب سے اتنی لاگت آ رہی تھی جو وہاں ملنے والی چاندی اور سونے سے کہیں زیادہ تھی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ ان دھاتوں کی بڑھتی ہوئی فراہمی سے ان کی قیمتیں گر گئی تھیں۔ سپین کی چاندی سے شدید افراطِ زر نہ صرف یورپ بلکہ سلطنت عثمانیہ میں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ سپین کی پارلیمنٹ نے بڑھتے ہوئے مصارف کے جواب میں قیمتی دھاتوں کو ملک سے باہر لے جانے پر پابندی لگا دی۔ اس کے بعد بادشاہ نے قرضے کی ادائیگی کو معطل کر دیا اور قرض خواہوں کے درمیان بانڈ تقسیم کر دیے۔ چونکہ ریاست کی مالی حالت بگڑتی جا رہی تھی، لہٰذا فلپ دوم اور اس کے مشیروں نے اس صورتِ حال کا ذمہ غیر ملکی تاجروں، سود خوروں اور سٹہ بازوں پر ڈال دیا۔ ان کا تقاضا یہ تھا کہ امریکی نو آبادیات صرف سپین سے مال خریدیں۔ انہوں نے امریکا کے درآمدی مال پر ڈیوٹی لگا دی، جنگی جہاز جو تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے ساتھ چلتے تھے، ان پر فیس عائد کر دی اور دوسرے نئے ٹیکس لگا دیے۔ اس دوران میں جو تجارتی میلے پہلے بڑی دھوم دھام سے لگتے تھے، اب ان میں آنے والوں کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ گندم کی کاشت کے

رقبے میں اتنی کمی ہوگئی کہ سپین کے لیے اپنے لوگوں کا پیٹ پالنا بھی ممکن نہیں رہا۔

سپین کی حکومت نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر انگریز تاجروں کو نئی دنیا کے ساتھ تجارت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ پھر 1567 میں معاملہ تصادم تک آ گیا جب ویرا کرز کے گورنر نے ان برطانوی جہازوں پر قبضہ کر لیا، جن میں افریقی غلام بھرے ہوئے تھے اور ساتھ ہی ان کے عملے کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے دو جہاز بچ کر نکل گئے، جن کا کمانڈر آ کواڈان لیڈر جان ہاکنز تھا اور ایک نوجوان کیپٹن فرانسس ڈریک تھا۔ ڈریک نے اور بعد میں انگریز بحری قزاقوں نے بحرالکاہل اور بحر اٹلانٹک کے کناروں پر واقع سپین کے قصبات پر زبردست لوٹ مار کی۔ قزاقی تو اٹلانٹک میں بہت عرصے سے ایک طریق زندگی تھی۔ سپین اور فرانس کے درمیان جب 1521 میں جنگوں کا آغاز ہوا تو سپین کے جہازوں کے خلاف تجارتی جہاز رانوں کو اس مضمون کا شاہی فرمان دے دیا گیا کہ سپین کے جہازوں کے خلاف مسلح قزاقی کرتے رہیں۔ ادھر فرانس کے قزاق تو لوٹ مار میں لگے رہے، لیکن ان کے انگریز رفیقوں نے ہاتھ روک لیے کیوں کہ ہنری ہشتم کی بیٹی، جو آئندہ ملکہ میری کہلائے گی سپین کے فلپ دوم کی زوجیت میں جانے والی تھی۔ لیکن 1558 میں میری کی وفات کے بعد یہ رکاوٹ دُور ہوگئی۔ نئی ملکہ ایلزبتھ نے تو کچھ عرصے تک معاملے کو بڑی نزاکت کے ساتھ اس طرح سنبھالے رکھا کہ انگریز جہازیوں کی حمایت بھی کرتی رہی اور سپین کے ساتھ صلح بھی برقرار رکھی۔ لیکن جب اس نے 1580 میں فرانسس ڈریک کو اس کے قزاقی کے جہاز کے حوالے سے 'نائٹ ہڈ' کا خطاب عطا کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سابقہ پالیسی ختم ہوگئی۔ اس کے جواب میں فلپ دوم نے 1588 میں 130 جہازوں کا ایک زبردست جنگی بیڑہ آرمیڈا، انگلینڈ کو فتح کرنے کے لیے روانہ کر دیا، لیکن برطانوی بیڑہ، جو نسبتاً چھوٹا، چست اور پھرتیلا تھا، اس نے حملہ آوروں کو شکست دے دی۔

مشرق کے ممالک سے گرم مسالے کی نفع بخش تجارت پر عربوں کا قبضہ ختم کرنے کر دینے کے بعد پرتگالیوں نے اسے پوری طرح اپنے تصرف میں لے لیا۔ البتہ ڈنمارک نے سولھویں صدی کے آخر تک پرتگالیوں کی ملکیت کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ فلپ دوم 1580 کے بعد پرتگال اور سپین دونوں ملکوں کا بادشاہ تھا۔ اب اس نے ہالینڈ میں اپنی باغی رعایا کو سزا دینے کی کوشش کی اور اس کے لیے حکم دیا کہ ہالینڈ کے جہاز اگر سپین یا پرتگال کے سمندر میں دیکھے

جائیں تو ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ ہالینڈ کے ایک تاجر جان ہائی غم وین سن شوٹن جس نے پانچ سال گوا میں گزارے تھے، 1595 میں ایک کتاب لکھی، جس میں یہ مشورے شامل تھے کہ اس کے ہم وطن کس طرح انڈیز کے ساتھ پرتگالیوں کی تجارتی اجارہ داری کو ختم کر سکتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہالینڈ کو ہندوستان میں پرتگالیوں کی فوجی چوکیوں کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کے بجائے انڈونیشیا اور ملایا میں جہاں ان کا دفاع نہیں کیا جا رہا ہے، نسبتاً محفوظ جگہوں پر اپنی تجارتی چوکیاں قائم کرنی چاہئیں کیوں کہ مسالوں کی تجارت انہی جگہوں سے شروع ہوئی تھی۔ 1602 میں نیدرلینڈ کے اسٹیٹ جنرل نے یونائٹیڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ اختیار سپرد کیا کہ وہ ہندوستان کے راجاؤں کے ساتھ معاہدے کریں، اپنے فوجی دستے بھرتی کریں، چوکیاں بنائیں اور اپنے گورنروں اور ججوں کا تقرر کریں۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے فوراً اپنے چودہ جہاز ایشیا روانہ کر دیے۔ بینٹم (جاوا) میں پتھروں کی تجارت کی ایک منڈی بنا دی گئی۔ یہ ایک مرکز تھا، جہاں سے ہمسایہ ملکوں میں مہم جاری کی جا سکتی تھی۔ ہالینڈ کے دیگر بحری بیڑوں نے جن پر بھاری توپیں نصب کی گئی تھیں، پرتگالیوں کے قلعوں پر حملے کر دیے، ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے اور گوا کی ناکہ بندی کر دی۔ ہالینڈ نے سپین اور پرتگال کے بحری بیڑوں کو کئی بحری جھڑپوں میں شکست دی۔ آخر سپین کے بادشاہ نے جس پر سخت دباؤ تھا، 1609 میں ہالینڈ کے ساتھ بارہ سال کے لیے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ ہالینڈ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور انڈونیشیا کے طول وعرض میں تجارتی چوکیاں اور قلعے تعمیر کر لیے۔ اب انہوں نے گرم مسالوں کی ایک نفع بخش تجارت کو فروغ دیا، جس کی بنیاد محض دھونس پر نہیں تھی بلکہ کھلی منڈی میں سودمند خریداری اور فروخت کے اصولوں پر تھی۔ سپین کے ساتھ صلح کے معاہدے کی تجدید 1621 میں نہیں ہوئی۔ پرتگال اور سپین نے ایک بار پھر ہالینڈ کے تاجروں کو ان کی بندرگاہوں میں آنے سے روکنا شروع کر دیا۔ اب ہالینڈ نے افریقا اور جنوبی ایشیا میں پرتگال کی تجارتی بندرگاہوں کے خلاف زبردست بحری ناکہ بندی کر دی۔ جب 1645 میں امن قائم ہو گیا، اس وقت تک پرتگال کی تجارت تباہ ہو چکی تھی۔ سمندر پر ہالینڈ کی حکمرانی تھی۔

نئی دنیا کے ساتھ انگلینڈ کی دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب جان کیبٹ 1498 میں بحر الکاہل کی جانب جانے کے لیے شمال مغرب سے راستے کی تلاش میں نکلا۔ وہ اس مقصد میں تو ناکام رہا، تاہم اس نے نیو فاؤنڈ لینڈ کے ساحل کے قریب دنیا میں کاڈ مچھلی کا سب سے بڑا

ٹھکانا پالیا۔ کاڈ مچھلی کا شکار سولھویں صدی میں چاندی کی کان کنی سے کہیں زیادہ نفع بخش تھا۔ جان کے بیٹے سیبیسچیئن کیٹ نے انگلینڈ کی طرف سے سمندر کے راستے مشرق بعید میں پہنچنے کی ایک اور کوشش کی۔ اس نے ناروے کے شمال سے سفر کا آغاز تین جہازوں کے بیڑے کے ساتھ کیا۔ دو جہاز تو بحر آرکیٹک میں ڈوب گئے، لیکن تیسرا آرکینگل پہنچ گیا۔ جہاز کے کپتان نے وہاں سے خشکی کی راہ پکڑی اور ماسکو پہنچ گیا۔ جہاں زار آئیون دی ٹربل نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ روسیوں نے محسوس کیا کہ انہیں یورپی اشیا کے حصول کا متبادل ذریعہ ہاتھ آ گیا ہے۔ ادھر انگلینڈ کو اپنے فراوراونی مصنوعات کی ایک زبردست منڈی مل گئی۔ چنانچہ مسکوئی کمپنی کے نام سے ایک کمپنی، جو انگلینڈ کی پہلی عظیم حصہ دار کمپنی تھی، 1555 میں قائم ہو گئی، تاکہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں میں دوسری بہت سی کمپنیاں برطانیہ کے تجارتی مفادات کی نمائندگی کے لیے قائم ہو گئیں۔ لیونٹ کمپنی نے ترکوں کی حکومت کے ساتھ تجارت کے لیے ایک شاہی فرمان سالانہ پانچ سو پونڈ کے محصول کے عوض حاصل کر لیا۔ انگلینڈ نے شام اور مصر میں قونصل خانے کھول دیے۔ سرکاری رکاوٹوں کے باوجود اس کے تاجروں نے بحر روم کے نواحی ملکوں کے ساتھ تجارت کی اور بہت نفع کمایا۔ لیکن ناقابل شکست آرمیڈا اور سپین کی بندرگاہوں پر انگلینڈ کی جوابی کارروائی کے نتیجے میں سپین اور پرتگال کے ساتھ قانونی تجارت کا راستہ بند ہو گیا اور افریقا اور امریکا میں بھی ان کی نوآبادیات سے تجارت ختم ہو گئی۔ اب کوئی انگریزی جہاز آبنائے جبرالٹر سے گزر کر بحر روم میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا لیونٹ کمپنی نے مشرقی اشیا کی تجارت کے لیے دوسرے راستوں کی تلاش شروع کی۔

جان نیوبری نے اپنی انتظامیہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اسے اور پانچ دیگر کمپنیوں کو جنوبی افریقا کے گرد ایک مہم کی تکمیل کے لیے بھیجا جائے۔ وہ مہم تو ناکام ہو گئی لیکن انگریزوں نے اس موقع پر ہندوستان کی دولت کو بہت قریب سے دیکھا۔ انہوں نے 1592 میں ایک پرتگالی کشتی ازورس کے ساحل سے کچھ دور پکڑی اور اس کی مدد سے چین کے حالات بہت تفصیل سے معلوم کیے اور ساتھ ہی کشتی بنانے کا طریقہ بھی سیکھا۔ ملکہ ایلزبتھ نے چین کے ساتھ تجارت کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے جہازوں کا ایک بیڑہ بھیجا، لیکن بدقسمتی سے وہ ایک طوفان میں گھر کر تباہ ہو گیا۔

گوشوارہ:6-2 TAble: 6-2

تہذیب کے تیسرے عہد میں
رونما ہونے والے چند اہم واقعات

1215 عیسوی	شاہ جان نے میگنا کارٹا پر دستخط کیے
1295	مارکو پولو چین سے اٹلی واپس آ جاتا ہے
1341	پیٹرارک کو روم میں سرکاری شاعر کے خطاب سے نوازا جاتا ہے
1454	گانبرگ بائبل کی کاپیاں چھاپتا ہے
1492	کولمبس امریکا دریافت کرتا ہے
1498	واسکوڈی گاما افریقا کے جنوب سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچ جاتا ہے
1503	لیونارڈو ڈی ونسی مونا لیزا پینٹ کرتا ہے
1511	پرتگالی ملاکا میں اپنا اڈہ قائم کرتے ہیں
1513	میکاولی نے ''دی پرنس'' لکھنے کا آغاز کیا
1543	کوپرنیکس نظام شمسی پر اپنی کتاب شائع کرتا ہے
1588	برطانیہ نے سپین کے آرمیڈا کو شکست دے دی
1600	ملکہ ایلزبتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا فرمان جاری کر دیا
1605	شیکسپیئر نے میکبتھ اور کنگ لیئر تصنیف کیے
1649	انگلینڈ کے چارلس اوّل کا سر قلم کر دیا گیا
1681	ولیم پن کو نوآبادی قائم کرنے کا فرمان مل گیا
1687	نیوٹن نے اپنی Principia Mathematica شائع کی
1694	بنک آف انگلینڈ کا قیام
1757	پلاسی (ہندوستان) کی جنگ میں کلائیو کی فتح
1769	واٹ نے بھاپ سے انجن کی ایجاد کو پیٹنٹ کرا لیا
1776	امریکی اعلانِ آزادی جاری کرتے ہیں
1815	نپولین کو واٹرلو کی جنگ میں شکست ہوئی

1819	برطانوی پارلیمنٹ پہلا فیکٹری ایکٹ منظور کرتی ہے
1825	پارلیمنٹ ٹریڈ یونینوں کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرتی ہے
1842	چین کی جنگ افیون ختم ہوتی ہے
1848	کیلفیورنیا میں سونے کی دریافت
1863	ابراہیم لنکن کا اعلان آزادی: سب کے مساوی حقوق
1886	امریکی مزدوروں کی "مے ڈے" ہڑتال
1914	ہنری فورڈ 5 ڈالر یومیہ اجرت منظور کرتا ہے
1917	روس میں بالشویک انقلاب
1929	نیویارک میں اسٹاک مارکیٹ کا دیوالہ نکل گیا
1947	برطانیہ نے ہندوستان کو آزاد کر دیا

انگریز تجارت کے مواقع معلوم کرنے کے درپے رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو برطانوی تاجروں کی ایک انجمن تھی، 31 دسمبر 1600 کو برطانیہ کی ملکہ سے ایک پروانہ حاصل کیا جس میں ان کو مشرقی کرۂ ارض میں تجارت کی اجارہ داری سونپی گئی تھی۔ اس مہم میں پہلے تو اس بنا پر رکاوٹ پڑ گئی کیوں کہ کالی مرچ اور گرم مسالے کی قیمتیں گر گئی تھیں، دوسرے یورپ کی حریف طاقتوں نے مخالفت کی اور پھر اس بنا پر رکاوٹ آ گئی کہ جنوبی ایشیا کے لوگوں کو ادنیٰ مال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہالینڈ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ انڈونیشیا میں انگریزوں کی موجودگی کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے، لہٰذا ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ طے کیا کہ اپنی تجارت کو صرف ہندوستان تک محدود رکھیں گے، جہاں یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ سامان حاصل کریں گے تا کہ جاوا کے مسالوں کے عوض اس کا سودا کر سکیں۔ مڈنال نامی ایک انگریز نے مغل بادشاہ اکبر اعظم سے دوستانہ مراسم پیدا کیے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے جہاز ہندوستان بھیجنے شروع کر دیے لیکن پرتگالیوں نے گوا میں اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ انہوں نے مغربی ہندوستان میں تجارتی چوکیاں قائم کرنے کی کوششوں کو روک دیا۔ تاہم ایک انگریز کمانڈر ہاکنز نے آگرہ جا کر اپنے معاملے کی پیروی ہندوستان کے بادشاہ کے آگے کی۔ اکبر کے جانشین شہنشاہ جہانگیر نے انگریزوں کے لیے تمام تجارتی مراعات، ان کے حسب خواہش منظور کر دیں۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور مغل سلطنت کے ساتھ ایک طویل اور نفع بخش ملاپ کی ابتدا تھی۔

اگرچہ پوپ نے اپنے 1493 کے فرمان میں سپین کو برازیل کے سوا تمام امریکی علاقے تفویض کر دیے تھے لیکن سپین کا بادشاہ میکسیکو اور جنوبی امریکا کی نوآبادی کے بندوبست میں بے حد مصروفیت تھا اور شمالی امریکا پر توجہ دینے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا، دوسری یورپی اقوام جس کی ابتدا فرانس سے ہوئی، براعظم کے ساحلی اور داخلی آبی راستوں کی تلاش میں سرگرم رہیں۔ تاج دار برطانیہ نے سترھویں صدی عیسوی میں شاہی فرمان جاری کیا، جس کی رو سے افراد کو یہ اجازت دے دی گئی کہ شمالی امریکا میں قیام کر کے وہاں کے قطعہ اراضی پر اپنا تصرف قائم رکھیں تا آنکہ ان کا یہ فعل برطانیہ کے قوانین سے متصادم نہ ہو۔ چنانچہ ایک اسی نوع کی کالونی 1607 میں جیمس ٹاؤن میں قائم ہوگئی اور دوسری 1620 میں میسوسی چیوٹس میں۔ مذہبی منحرفین کے گروہ جنہیں چرچ آف انگلینڈ کے ظلم کی شکایت تھی، نئی دنیا میں جوق در جوق آنے لگے۔ ایسے پہلے بڑے گروہ نے جس میں 20 ہزار سے زائد انگریز شامل تھے اور بیشتر پیورٹینز تھے نیو انگلینڈ میں کالونی آباد کی اور 1642 میں انگلش سول وار کے آغاز سے پہلے کر لی تھی۔ دوسری مذہبی اقلیتوں کو جن میں کاکر اور رومن کیتھولک شامل تھے، جلاوطن ہونے اور ان نوآبادیات میں آباد ہو جانے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ چارلس دوم کے دورِ حکومت میں برطانیہ نے ان نوآبادیات پر اپنے ضابطوں کی گرفت سخت کرنی شروع کر دی تھی۔ آبی شاہراہوں سے متعلق قوانین جو 1660 اور 1696 کے درمیانی زمانے میں منظور ہوئے ان کا تقاضا یہ تھا کہ امریکا کا تجارتی مال صرف ان جہازوں پر لایا جائے جو برطانیہ میں بنائے گئے ہوں اور جنہیں چلانے والے انگریز تھے۔ تاج برطانیہ نے بہت سے نوآبادیاتی احکام یا تو بدل دیے یا انہیں منسوخ کر دیا اور شمالی امریکا کی رعایا کو مقرر کردہ گورنروں کے تصرف میں دے دیا اور ان کی تقدیر حکومت کے مقرر کردہ گورنر کے حوالے کر دی۔

امریکا میں سپین کے مقبوضہ جات پر حکومت کی گرفت بہت سخت تھی۔ ابتدا سے ہی سپین کے بادشاہ نے اپنی امریکی سلطنت پر قوانین اور ضوابط کی ایک مضبوط کاٹھی ڈال رکھی تھی۔ جو لوگ ترک سکونت کر کے امریکا جانا چاہتے تھے، انہیں اجازت نامے کے لیے درخواست دینی پڑتی تھی۔ ایک سپریم کونسل جس کا سربراہ خود بادشاہ ہوتا تھا، سپین میں بڑے انتظامی فیصلے کرتی تھی۔ جب کہ وائسرائے، جج اور دوسرے اعلیٰ عہدے داران کے احکام برمحل بجا لاتے تھے۔ پوپ نے بھی سپین کے بادشاہ کو مذہبی اور سیاسی دونوں امور پر مکمل اختیارات دے رکھے تھے،

لیکن اس شرط کے ساتھ کہ چرچ کے ساتھ کیا ہوا عہد برقرار رہے گا۔ مقامی اقوام کے ساتھ سلوک میں خاص توجہ دی جاتی تھی۔ عام طور پر چرچ انہیں شدید استحصال سے بچاتا تھا اور چاہتا تھا کہ تبدیلی مذہب کا عمل جبر سے نہیں بلکہ سمجھانے بجھانے سے پورا ہو۔ دوسری جانب مقامی لوگوں نے ہسپانوی حکومت کی پہلی صدی میں اطاعت سے کھلا انکار کیا۔ پرتگالی برازیل حکومت زیادہ کھلی ڈلی تھی، وہاں اصل طاقت بڑے بڑے باغات کے مالکوں کے ہاتھوں میں تھی۔ شمال کی برطانوی نوآبادیات کے مقابلے میں یورپی اور مقامی امریکی باشندے آپس میں آزادی سے ملتے جلتے تھے، جس سے ایک ملی جلی نسل وجود میں آئی۔ ہسپانوی امریکا کی آبادی 1800 تک ایک کروڑ اسی لاکھ ہوگئی تھی۔ اس کے شہر اپنی وسیع آبادی، معاشرت اور دولت کے اعتبار سے یورپ کے شہروں کا مقابلہ کرتے تھے۔

امریکا میں فرانس کی نوآبادیاں کیوبا میں سینٹ لارنس دریا کے کنارے آباد تھیں۔ فرانس نے گریٹ میکس کے علاقے میں انڈین شکاریوں سے بال دار جانوروں کے سمور حاصل کرتا اور ان کے عوض، رائفل، چاقو اور لوہے کی اشیا فراہم کرتا۔ یہ کھال یورپ کی اشرافیہ کے لیے کھال کے چھجے دار ہیٹ بنانے میں کام آتی تھی اور بہت مہنگی ہوتی تھی۔ فرانس کے لوئی چہاردہم نے یورپ میں فیشن کو خاصا فروغ دیا تھا۔ ان کی نظریں سمندر پار نوآبادیات کے مقابلے میں یورپ کے اندر فتوحات پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے نہایت پرآسائش اور مرصع محلات تعمیر کروائے تھے، جیسے کہ ورسیلز کی شاہی قیام گاہ تھی۔ بادشاہ نے وزیر خزانہ ہپسٹ کولبرٹ کے بڑے شان دار عزائم تھے کہ فرانس کو ایک بڑی اقتصادی طاقت بنا دے گا۔ اس نے 1664 میں ایک یادداشت لکھی، جس میں ایک فرانسیسی ایسٹ اور ویسٹ کمپنی بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ کولبرٹ نے ایک اقتصادی منصوبہ بنایا تھا، تاکہ فرانس کو اقتصادی طور پر خود کفیل بنا دیا جائے۔ اس زمانے میں فرانس کے سوتی کپڑے اور دیگر اشیائے صرف منڈی کی قیمتی اشیا سمجھی جاتی تھیں۔ کولبرٹ کو یہ امید تھی کہ وہ سپین سے امریکی چاندی، فرانس کے ساتھ اس کے تجارتی خسارے کی بنیاد پر حاصل کر لے گا، جسے ایشیا کے ساتھ گرم مسالوں کی خریداری میں استعمال کیا جا سکے گا، لیکن کولبرٹ کی تاجرانہ حکومت عملی، جس کا مقصد درآمدات میں کمی اور برآمدات میں اضافہ تھا، اس وقت الٹی پڑ گئی جب دوسرے ملکوں نے بھی اس کی پیروی شروع کر دی۔ بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے شان دار اور وسیع انتظامی فیصلوں نے فرانس کی معیشت کو

ڈھیر کر دیا۔ جب لوئی چہاردہم نے 1715 میں انتقال کیا، اس وقت فرانس دیوالیہ ہو چکا تھا۔

نوآبادیاتی تجارت

جنگیں، قومی معیشت پر بھاری بوجھ ڈال دیتی ہیں۔ فرانس کے خلاف طویل جنگ لڑنے کے لیے سرمایے کی ضرورت تھی، جسے اکٹھا کرنے کے لیے برطانیہ کی حکومت نے 1664 میں تاجروں کے ایک گروہ کو یہ اختیار دے دیا کہ اپنی سرمایہ کاری کی مقدار کے مطابق بنک نوٹ چھاپ لیں۔ بنک نے بارہ کروڑ پونڈ اسٹرلنگ چھاپ کر فوراً حکومت کو قرض میں دے دیا۔ پھر اس نے کاغذی نوٹ قیمتی دھاتیں خریدنے اور غیر ملکی زرمبادلہ کی خاطر چھاپنے شروع کیے۔ یہ تھا بنک آف انگلینڈ کا آغاز۔ لوئی چہاردہم کی وفات کے بعد اسکاٹ لینڈ کے ایک ماہر مالیات جان لا نے ڈیوک آف اورلینز کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ایسا ہی ایک بنک فرانس میں کھولا جائے۔ فرانس کی معیشت ان دنوں معیشت کے سخت بحران میں مبتلا تھی۔ لا نے تجویز کیا کہ سرمایے کے برابر کرنسی نوٹ جاری کیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے مئی 1716 میں بنک کھولا گیا، یہ تھا The Banque of Generale Law۔ اگرچہ بنک نوٹ کا وصول کرنا رضاکارانہ تھا، لیکن لا کا منصوبہ کامیاب رہا۔ فرانسیسی حکومت نے 1718 میں بنک کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ لا، مالیات کا کنٹرولر جنرل تھا۔ اس نے شاہی بنک کو سٹاک کمپنی میں شامل کر دیا جو اس نے لوسیانا میں زمینوں کی فروخت کے کاروبار کو ترقی دینے کے لیے بنائی تھی۔ زمین پر سٹہ زوروں پر چل رہا تھا۔ جس سے سٹاک کی قیمت ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئی تھی۔ جب 1720 میں قیمتیں گر گئیں تو لا ملک سے بھاگ گیا۔ انگریزوں کا ساؤتھ سی ببل (جنوبی سمندر کا بلبلہ) بھی اسی طرح پھٹ گیا تھا۔

اگرچہ مالیات میں سٹے کی وجہ سے لا پر زوال آ گیا تھا، لیکن اس کی مسی سی پی کمپنی کے پیچھے جو خیال کام کر رہا تھا، وہ بہت پختہ تھا۔ لا کا ارادہ یہ تھا کہ فرانس کے آبادکاروں کو لوسیانا جانے کی ترغیب دے، جہاں وہ اس طرح کی فصلیں اگائیں، جنہیں یورپ میں فروخت کیا جا سکے۔ ان میں خاص فصلیں کافی، چینی اور تمباکو کی تھیں۔ لا کا ارادہ تھا کہ کاشت کار بڑے بڑے قطعات پر وہ فصلیں اگائیں اور جب تک فصلیں پک کر تیار نہیں ہوتیں، لا ان کو یورپ سے اشیائے ضروری کی خریداری کے لیے قرض فراہم کرے گا۔ وہ آبادکاروں کو افریقا

سے غلاموں کی خریداری کے لیے بھی قرضے دے گا جوان کے کھیتوں پر کام کریں گے۔ لا نے فرانس کی تمام کمپنیوں کو، جو سمندر پار تجارت کرتی تھیں، ایک ساتھ ملا دیا۔ لوسیانا میں کالونی خرید لی۔ تمباکو کی اجارہ داری حاصل کر لی اور غلاموں کی تجارت سے متعلق فرانس کے کاروبار میں توسیع کی۔ اگرچہ مسی سی پی کمپنی نے صرف دو سال کام کیا لیکن اس نے یورپ کی تجارت کا رخ بدل دیا۔ اس سے پہلے یورپ کے تاجروں کی توجہ مشرقی جزائر سے محض گرم مسالوں کی تجارت پر مرکوز تھی۔ لا کی کاروباری مہم نے ان کی توجہ مغربی جزائر کی طرف موڑ دی۔ یورپ والوں کو نئی اور نادر اشیا کا ذائقہ مل گیا۔ ارنسٹ سمر بھر نے کیا خوب لکھا ہے، ''مرطوب علاقوں کی پرفریب حرارت اور زندگی کی شیریں کسل مندی، مغرب کے سرد ماحول میں ڈھل گئی۔''

فرانس اور برطانیہ اب تصادم کی راہ پر چل سکتے تھے۔ پہلے تو وہ سپین کے خلاف متحد تھے، لیکن لوئی چہاردہم کے خلاف جب برطانیہ ''عظیم اتحاد'' میں شامل ہو گیا تو دونوں قومیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ فرانس کا انڈینز کے ہورون قبیلے سے ایک پرانا اتحاد تھا، جو فرانس کو داخلی آبنائے سے اود بلاؤ کی کھالیں مہیا کرتے تھے۔ انڈینز کے دوسرے قبیلے آئرِوکوئز نے ہورون پر حملہ کر دیا جس میں فرانس کو مجبوراً ایک فریق کا ساتھ دینا پڑا۔ ہالینڈ کے کھالوں کے تاجر جوان دنوں نیو ایمسٹرڈم میں تھے اور بعد ازاں انگریز بھی آئرِوکوئیز کے ساتھ مل گئے، جنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ سمور کی تجارت کو سینٹ لارنس دریا سے نکال کر دریائے ہڈسن کی طرف منتقل کر دیں گے۔ اس طرح تجارت میں بالا دستی کی خاطر یورپ کی طاقتیں ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔ یہ تنازعہ ایک صدی بعد اُس وقت ختم ہوا جب انگریز جنرل وولف نے 1759 میں کوبے فتح کر لیا اور یوں ''فرانس اور انڈینز'' کی جنگ بند ہوگئی۔ جب امریکا میں واقع برطانیہ کی کالونیاں 1770 کے عشرے میں اپنی ''ماں'' سے ٹوٹ کر الگ ہوگئیں تو برطانیہ اور اس کے حلیف آئرِوکوئز نے نوآبادیاتی باغیوں سے جنگ کی جنہیں فرانس مدد دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کے تنازعہ میں ایک انگریز افسر جارج واشنگٹن امریکی نوآبادکاروں کا کمانڈر انچیف تھا۔ جب یہ جنگ ختم ہوگئی تو کناڈا کی حیثیت ایک برطانوی مقبوضے کی ہی رہی، جس کے صوبہ کوبے میں فرانسیسی بولنے والوں کی ایک بڑی اقلیت آباد تھی۔

برطانیہ اور فرانس دونوں کی تجارتی کمپنیاں ہندوستان میں تھیں، جب اٹھارھویں صدی میں مغل سلطنت کمزور ہوگئی تو ان کمپنیوں نے حسب موقع ہندوستانی راجاؤں سے اتحاد

بنائے اور فوجی کارروائیوں میں شامل ہو گئے۔1748 اور1760 کے درمیان فرانس اور ہالینڈ پر رابرٹ کلائیو کی فتوحات سے برطانیہ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے شمالی ہندوستان کے صوبوں کا بندوبست مغل بادشاہ کی جانب سے خود سنبھال لیا۔اس کے نمائندے سرکاری ذمہ داریوں کی انجام دہی کے دوران میں دولت مند ہونے لگے۔ کرپشن ختم کرنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ نے1774 میں ہندوستانی حکومت کا (مشترک) انتظام خود سنبھال لیا اور حکمرانی کے لیے گورنر جنرل مقرر کرتی رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے عام نظم ونسق کی انجام دہی ایک غیر نفع بخش کام تھا۔اسے چائے کی تجارت سے منافع مل رہا تھا۔1720 کے عشرے کی ایک تشہیری مہم میں انگریزوں کو آمادہ کیا گیا کہ کافی کی بجائے چائے پیا کریں۔ برطانوی حکومت کو جب بھی روپوں کی ضرورت ہوتی، چائے پر ٹیکس میں اضافہ کر دیتی۔ یہ حکمت عملی اس وقت الٹی ہو گئی جب1774 میں امریکی نوآبادکاروں کے ایک گروہ نے جو انڈینز کے روپ میں آئے تھے،ٹیکس میں اضافے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے چائے کے ایک جہاز کو بوسٹن کی بندرگاہ میں ڈبو دیا۔ برطانیہ نے جوابی کارروائی کی اور یوں امریکا کی جنگ آزادی شروع ہو گئی۔

نوآبادیاتی زمانے میں شمالی امریکا انتہائی نفع بخش طور پر تین اطراف سے تجارت کر رہا تھا۔ جہاز انگلینڈ سے سوتی کپڑے، منکے،موتی اور دھات کے بنے ہوئے سامان لے کر روانہ ہوتے اور پہلے مغربی افریقا کے ساحل پر اترتے۔ وہاں سے وہ مال کا تبادلہ، غلاموں کی صورت میں کرتے،اس کے بعد جہاز بحر اٹلانٹک سے گزر کر کیریبین کے جزائر، برازیل یا شمالی امریکا کی برطانوی نوآبادیات تک پہنچتے،جنہیں اپنے بڑے بڑے فارموں پر کام کرنے کے لیے افریقی غلاموں کی ضرورت ہوتی۔ امریکا میں وہاں کے تاجروں سے اس طرح کی چیزیں مثلاً چینی، کافی اور تمباکو،عمارتی لکڑی اور مچھلی خریدی جاتی تھی۔ یہ چیزیں واپس برطانیہ پہنچ جاتیں۔اس طرح ایک دائرہ مکمل ہو جاتا۔ یورپ والوں کے لیے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مشرق کے روایتی اسباب تعیش، یعنی گرم مسالوں اور ریشم کے مقابلے میں اب کہیں زیادہ کشش ویسٹ انڈیز کی اشیا خاص طور پر چینی سے چھنی ہوئی وہاں کی شراب سے محسوس ہونے لگی تھی اور اس میں کاروباری منافع بھی زیادہ تھا۔ پھر نئی دنیا میں غلاموں کی مانگ بھی یقینی تھی۔اس تجارت میں کامیابی کی کلید، ایسی اشیا دریافت کرنا تھا، جن میں مغربی افریقا میں

غلاموں کا شکار کرنے والے سرداروں کو دلچسپی ہو اور جنہیں وہ غلاموں کے عوض لینا پسند کریں، ہر سردار کی اپنی اپنی پسند ہوتی تھی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ مغربی افریقا کی داخلی بستیوں سے دہومی اور اشنتی قبائل کے سربراہوں نے سفید فام تاجروں کو لاتعداد غلام فراہم کرنے کی پیشکش کر دی۔ ان کے عوض انہیں اسلحہ چاہیے تھا تا کہ مخالفوں کے خلاف وہی اسلحہ استعمال کریں۔ انسانوں کی منظم پکڑ دھکڑ کے نتیجے میں غلاموں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ پرتگال کے جہاز رانوں نے پندرھویں صدی میں غلاموں کی تجارت شروع کی تھی۔ ہالینڈ نے اس میں توسیع کی۔ انگریزوں نے انسانوں کی تجارت کو عروج پر پہنچا دیا۔ سولھویں صدی کے اندر تقریباً نو لاکھ غلام افریقا سے امریکا تک جہازوں میں بھر کر پہنچائے جا چکے تھے۔ سترھویں صدی میں ان کی تعداد 17 لاکھ ہو گئی اور اٹھارھویں صدی میں ستر لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ انیسویں صدی میں یہ تعداد گھٹ گئی۔ 1833 میں برطانوی انڈنیز میں غلامی ممنوع قرار دے دی گئی اور امریکا میں سول وار کے بعد 1865 میں اور پھر برازیل میں 1888 میں غلامی پر پابندی لگا دی گئی۔ زیادہ تر افریقی غلام ویسٹ انڈیز کے جزیروں میں اور برازیل میں لائے گئے تھے۔ دس لاکھ سے کچھ کم امریکا بھیجے گئے اور بہت سارے بحر اٹلانٹک کے سفر میں ہلاک ہو گئے۔

برطانیہ میں غلاموں کی تجارت اور مصنوعات کا مرکز لیور پول تھا۔ 1783 اور 1793 کے درمیان بحری جہازوں سے لیور پول تین لاکھ سے زائد غلام لائے گئے، تاہم اس کے بعد اسباب کی نوعیت بدل گئی۔ اب جو سامان برطانیہ لایا جانے لگا، اس میں کافی کی بجائے کپاس کی گانٹھیں ہوتی تھیں۔ ویسٹ انڈیز میں کپاس کی کاشت کے لیے زمین ناکافی تھی۔ چنانچہ اس کی کاشت امریکا کے جنوب میں کی جانے لگی۔ بدقسمتی سے اس علاقے میں جس طرح کی کپاس اگتی تھی، اس میں سے بنولے کے بیج نکالنا مشکل ہوتا تھا۔ ایلی وِھٹنی نے روئی دُھننے کی مشین ایجاد کر کے یہ مشکل دور کر دی۔ سوتی کپڑے کی بُنائی کے لیے مزدوروں کی ناکافی تعداد ایک اور مسئلہ تھی۔ مشینیں ایجاد کرنے والے ایک بار پھر مدد کو آ گئے، ان میں ہارگریوز کی تکلے والی مشین اور کراپٹسن کی ہیول (خچر) مشین شامل تھیں۔ مشینیں بھاپ کے انجن سے چلتی تھیں۔ اب اونی کپڑے کی جگہ سستے سوتی کپڑے نے لے لی، جو برطانیہ کے برآمدی سامان میں سب سے زیادہ تھی۔ ہندوستان اب سے پہلے سوتی کپڑے برآمد کرتا تھا لیکن مشینی

مصنوعات نے، مقامی مصنوعات کو پیچھے چھوڑ دیا اور لاکھوں جولاہے بے روزگار ہو گئے۔ برطانیہ کی بیشتر اونی تجارت آسٹریلیا منتقل ہو گئی۔ 1787 میں وہاں میرینو نسل کی بھیڑیں، جن کی کل تعداد 29 تھی، بھیجی گئی تھیں۔ بھیڑوں کے اتنے بڑے گلے جو آج نظر آتے ہیں، انہی کی نسل سے ہیں۔

صنعتی عہد اور تجارت میں مقابلے کی دوڑ

ایک صنعتی انقلاب ان ٹیکنالوجیز کے نتیجے میں آیا جو قدرتی سائنس کی دین تھیں۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے بقول سترھویں صدی کے یورپ میں جو مذہبی جنگیں ہوئیں، ان کے نتیجے میں اتنی نفرت اور شدت پیدا ہوئی کہ بالآخر زمینی لوگوں نے اپنی توجہ اس طرف سے ہٹا کر فطری سائنس کی طرف مرکوز کر دی۔ اگرچہ دینی نوعیت کے سوالات صریحاً تفرقہ پیدا کرنے والے تھے، لیکن عام لوگ تو پھر بھی دوست اور فطرت کے شاگرد بھائی ہو سکتے تھے۔ ٹوائن بی نے لکھا کہ ''سترھویں صدی کے ختم ہونے تک مذہب کی جگہ ٹیکنالوجی نے لے لی تھی۔ مغرب کے معاشرے میں اب یہ نہایت درجہ اہم اور قائدانہ روح کا درجہ رکھتی تھی۔'' رائل سوسائٹی آف لندن جس کے قیام کی تجویز پہلے فرانسس بیکن نے 'نیو اٹلانٹس' میں پیش کی تھی، ان چند افراد کے گروہ نے قائم کی، جو مذہبی تنازعات سے عاجز آ چکے تھے اور جن کے نتیجے میں سول وار ہو چکی تھی، چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بجائے ہماری مادی دنیا کے معاملات پر بحث ہو۔ قبل ازیں اس صدی میں گیلیلو نے ایک ایسا ٹیلی سکوپ بنا لیا تھا، جس کی مدد سے انسان اجرامِ فلکی کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ ہالینڈ کے ایک عدسہ تیار کرنے والے شخص اینٹس وان لیون ہک نے مائکرو سکوپ کی مدد سے خلیوں، جراثیم اور دوسری نہایت خفیف اشیا کا مشاہدہ کیا۔ رائل سوسائٹی کے صدر سر آئزک نیوٹن نے ریاضی کی مساوات پر کام کیا اور وہ بنیادی تعلق دریافت کیا جو کشش ثقل، بینائی اور حرکت کے درمیان پایا جاتا ہے۔

سائنس میں اس دلچسپی میں جب ایک صدی گزر گئی، تب اسے ٹیکنالوجی کی بہتری کے لیے استعمال کیا جانے لگا، جو عام لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے تھے۔ سترھویں صدی کے آخر میں ہالینڈ میں فصلوں کو وقفے کے ساتھ اگانے کا طریقہ متعارف ہوا جس سے انگلینڈ میں گندم کی پیداوار بڑھ گئی اور اتنی خوراک پیدا ہونے لگی، جو مویشیوں کو موسم سرما میں زندہ

رکھنے کے لیے کافی ہوتی۔1760 کے عشرے کے آغاز سے اندرونِ ملک نہروں کو کانوں سے کوئلہ نکال کر صنعتی مراکز مثلاً مانچسٹر پہنچانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ سٹافورڈ شائر کے جیمس برنڈلے نے تقریباً چار سو میل لمبی نہروں کے نقشے بنائے اور ان کی تعمیر کی۔ لوہاروں کی ایک نئی نسل پیدا ہوگئی، جس نے دریاؤں پر لوہے کے پل بنائے۔ ایسے سائنس دان، مثلاً جوزف پریسٹلے، جوزیا ویج وڈ اور بنجمن فرینکلن نے مختلف گیس، دھات، سرامک پر سائنس تجربے کیے اور ان کا عملی استعمال دریافت کیا۔ ٹیکنالوجی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت جیمس واٹ کی ایجاد تھی، جس نے بھاپ کا انجن بنایا اور جسے 1785 میں ایک انگلش کاٹن مل میں استعمال کیا گیا۔ بھاپ کے انجن کو 1802 میں ایک کشتی کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور پھر 1804 میں ریل کی پٹڑی پر چلنے والے انجن سے لگا دیا گیا۔ انیسویں صدی کے پہلے ہی عشرے میں دُخانی کشتیاں برطانیہ اور امریکا دونوں ملکوں میں استعمال ہونے لگی تھیں۔ 1820 کے عشرے میں ریل روڈ کا دور شروع ہوگیا تھا۔

جس چیز کو صنعتی انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا آغاز برطانیہ کی سوتی ملوں سے ہوا۔ نہ صرف واٹ کے دُخانی انجن کی بہ دولت بلکہ دیگر بہت سی مشینی ایجادات کی وجہ سے جن میں اسپننگ جینی، اسپننگ فریم، لیول اور انجن سے چلنے والا کرگھا بھی شامل ہے، پیداوار کی ٹیکنیک نے بہت ترقی کی۔ برطانیہ کی اس ٹیکنالوجی کو سیموئل تھریڑ نے چوری کر کے 1790 میں امریکا پہنچا دیا۔ کپاس کی بنائی اور سوتی کپڑے کی تیاری خاص مشینوں سے ہونے لگی تھی، اس لیے ایک گھنٹا مشین چلانے پر پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ کپڑا تیار ہوتا تھا۔ اس طرح تیار ہونے والا کپڑا روایتی انداز سے تیار ہونے والے کپڑے کی بہ نسبت کم قیمت پر فروخت ہونے لگا۔ اس طرح کاروبار کا رخ نئے پیداواری طریقوں کی طرف مڑ گیا۔ سوتی فیکٹریوں کو مشین چلانے کے لیے آدمیوں کی ضروری ہوتی تھی۔ اس لیے کچھ ایسے لوگ دیہات سے آنے لگے تھے، جن کی گھریلو صنعتیں اور دست کاریاں فیکٹری کی مصنوعات کے ساتھ مقابلے کی بنا پر تباہ ہوگئی تھیں۔ کچھ دوسرے افراد تھیڈی سے آئے۔ کمرشل قانون میں اصلاح کے بعد بزنس منیجروں کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ باقاعدہ قانونی معاہدوں کے تحت اشیائے صرف، اور ان میں مزدور کی لیبر بھی شامل تھی، خرید و فروخت کر سکتے تھے۔ چونکہ فیکٹری کے نظام کی بنیاد تجارتی معاہدوں پر تھی، لہٰذا کاروباری افراد غلاموں کی طرح مزدور بھرتی کرتے تھے، بلکہ ان مزدوروں

کی خدمات حاصل کرتے جو اجرت کے عوض ایک خاص مدت کے لیے اپنی محنت اور مہارت بیچنے پر تیار ہوتے تھے۔

زیادہ تر ملکوں نے، جن میں امریکا بھی شامل تھا، اپنی نوزائیدہ صنعتوں کو بچانے کے لیے بھاری محصولات عائد کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ حالانکہ اس سے ان کی غیر ملکی تجارت اور سمندری بار برداری کی صنعت کے ختم ہو جانے کا اندیشہ موجود تھا۔ نپولین بونا پارٹ نے ''کانٹی نینٹل سسٹم'' بنا کر برطانیہ کی تجارت کا گلا گھونٹ دینے کی کوشش کی۔ اسی سسٹم کے تحت فرانس کے ماتحت کسی بھی ملک میں برطانیہ کے ساتھ تجارت ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے صارفین کافی، چینی اور تمبا کو سے محروم ہو گئے۔ یہ وہی اشیا تھیں جنہیں برطانیہ نے کسی زمانے میں فرانس کی زراعت کو تباہ کرنے کے لیے مہیا کرنا شروع کر دیا تھا۔ نپولین نے بہ امر مجبوری بہت سے لائسنس جاری کیے، بجز اس کے کہ کسی خاص صورتِ حال میں ایسا نہیں کیا۔ بہر حال جنگ کے بعد تجارت بحال ہو گئی۔ یورپ اپنی تباہی کی بنا پر بہت نادار ہو گیا تھا اور اب اندرون ملک بننے والی اشیا کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ اس صورتِ حال نے تجارت میں تحفظ کی پالیسیاں جاری کیں۔ 1815 میں برطانیہ میں متمول اور بڑے بڑے زمین داروں نے پارلیمنٹ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ اندرون ملک گندم کی درآمد پر پابندی لگا دیں، جب کہ اس کی قیمت ایک خاص سطح سے کم تھی۔ برطانیہ میں گندم کی قیمتیں چڑھ گئیں اور شہروں میں بھوکوں کی تعداد بڑھ گئی۔ فرانس میں قیمتیں گر گئیں، جہاں کسانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ تجارت میں تحفظ کی یہ پالیسی سارے یورپ میں پھیل گئی۔ اس سے تجارت اور روزگار دونوں گر گئے۔ اگرچہ انقلاب فرانس نے افراد کا یہ حق مان لیا تھا کہ وہ جو بھی پیشہ پسند کریں اسے اختیار کر لیں، لیکن اقتصادی صورتِ حال جب اتنی حسرت ناک ہو تو محنت کشوں کے لیے پیشے کے انتخاب کا حق کوئی معنی نہیں رکھتا۔

برطانوی صنعت کار، بہت سی متنوع مصنوعات کے معاملے میں دوسروں سے بہتر حیثیت میں تھے۔ انہوں نے ''آزاد تجارت'' کی ایک مہم کی حمایت کی، جس کی بہ دولت ان پر غیر ملکی تجارتی منڈیوں کے دروازے کھل جائیں گے اور درآمدی اشیا کی فروخت میں مقابلہ بڑھ جائے گا۔ مانچسٹر میں کپاس کے ایک سابق تاجر رچرڈ کوبڈن نے اجناس کے بارے میں قوانین کی تنسیخ کے لیے 1846 میں ایک مہم چلائی۔ اس نے فرانس کے بادشاہ نپولین سوم کو

1860 میں اس امر پر آمادہ کیا کہ دونوں مل کر محصولات میں کمی کا معاہدہ کریں۔ دو سال بعد فرانس نے ایسا ہی ایک معاہدہ پرشیا کے ساتھ کیا۔ اس سے عالمی تجارت میں غیر معمولی طور پر توسیع ہوئی۔ گزشتہ ادوار کے برعکس اس مرتبہ تجارت میں غذائی اجناس، فولاد اور دیگر اشیائے ضرورت شامل ہونے لگیں اور محض اسباب تعیش پر انحصار نہ تھا۔ مشرق بعید میں آزاد تجارت کے لیے جو مہم چلائی گئی، اس میں فوجی طاقت کا استعمال بھی شامل تھا۔ امریکا کے ایڈمرل میتھو پیری نے جاپان کو صدیوں کی علیحدگی سے نجات دلائی اور اس کے دروازے غیر ملکی تجارت اور تہذیبی اثرات کے لیے کھول دیے۔ جاپان نے جسے خود بھی اپنی پس ماندگی کا اقرار تھا، بڑے اشتیاق سے اپنے معاشرے کو مغرب کے خطوط پر جدید بنایا۔ چین نے جب 1839 میں افیون پر پابندی لگا دی تو پھر برطانیہ نے فوجی طاقت استعمال کی، توپ بردار کشتیوں سے حملہ آور ہوا اور چین کو مجبور کر دیا کہ اپنے یہاں ہندوستان سے افیون کی درآمد کو تسلیم کرے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو چینی چائے کی تجارت کے لیے کوئی جنس تجارت درکار تھی۔

انیسویں صدی کے اندر یورپ اور شمالی امریکا کا نیا صنعتی نظام ساری دنیا پر چھا گیا تھا۔ کاشت کاری کا پرانا نظام پس پا ہو رہا تھا۔ غلامی ختم ہو چکی تھی۔ جنوبی امریکا پھلوں کی کاشت کے وسیع قطعات جن پر انڈین لیبر کام کرتی تھی اور زراعتی مال، برآمدی تجارت کے لیے پیدا کرتا تھا۔ اب وہ سارا قرینہ گزشتہ صدی میں واپس چلا گیا۔ فرانس میں سوسائٹی جب مارٹینک میں اپنے سٹے میں کاروبار کے اندر نقصان اٹھا کر قرض واپس کرنے کے قابل نہ رہی تو فرانس کے بادشاہ نے 1764 میں جیسوئٹ آرڈر پر پابندی لگا دی۔ 1860 کی دہائی میں جب امریکی وفاق کو شکست ہوئی تو امریکا کے جنوب میں کپاس کے وسیع قطعات تباہ ہو گئے۔ امریکا میں گندم کاشت کرنے والے کسانوں نے، جو مشینی زرعی آلات سے لق و دق قطعات اراضی پر فصلیں اگاتے تھے، گندم کی بھاری مقدار مال بردار ٹرینوں کے ذریعے ملک کے اندر اور بیرون ملک بھی بھیجنی شروع کر دی۔ اس زمانے میں زمین کے دور افتادہ علاقوں میں کانیں دریافت ہونے لگیں۔ بار برداری اور مال و اسباب کی ترسیل کا ایک پورا نظام وجود میں آ چکا تھا۔ اس میں پہلے اندرونِ ملک نہروں کا جال تھا، پھر ریل گاڑیاں آ گئیں جن میں مصنوعات کو جائے پیداوار سے دور دور کی منڈیوں تک کم خرچ میں پہنچانا آسان ہو گیا۔ تار برقی کی لائنوں کے آ جانے سے اطلاعات کی فوری ترسیل ممکن ہو گئی۔ نئی دھات اور پیداواری عمل میں بہتری

کے نتیجے میں فولاد کی لاگت اور اس کا معیار دونوں بہتر ہو گئے۔

اب بڑی بڑی دیو ہیکل کارپوریشنیں جو تازہ ایجادات پر مبنی مصنوعات تیار کرنے لگیں۔ امریکا میں نو وارد اسکاٹ لینڈ کے ایک تارکِ وطن اینڈریو کارنیگی نے یونینوں پر قابو پاتے ہوئے فولاد کی لاگت اور اس کے معیار پر گہری توجہ دی، اس طرح فولاد کی قومی پیداوار کے ایک چوتھائی حصے کا مالک بن گیا۔ اس نے برطانیہ سے بیسمیر (Bessemer) کا عمل اپنے لیے درآمد کیا، اس طرح خام لوہے سے فولاد بنانے لگا۔ جان ڈی راک فیلر نے اسٹینڈرڈ آئل ٹرسٹ بنایا۔ اس کے لیے بہت سے کارخانوں کو آپس میں مدغم کرنا پڑا۔ اس نے پیداوار میں مستعدی اور چابک دستی سے کام لیا اور کاروباری مسابقت میں جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ جرمنی میں بیئر (Bayer) بی اے ایف ایف اور ہوئسٹ جیسی کمپنیوں نے عالمی منڈی میں مصنوعی رنگوں کی تجارت پر قبضہ جما لیا۔ سنتھیٹک ادویہ جیسے اسپرین اور اس طرح کا مال جیسے سلولائیڈ کیمیکل ریسرچ کے نتیجے میں حاصل ہوئے۔ ٹامس ایڈیسن کی تجربہ گاہوں میں جو نیلو پارک اور نیو جرسی کے ایسٹ اورینج میں واقع تھیں، ایسی متعدد اشیا پیدا کی جانے لگیں، جن میں بجلی استعمال ہوتی تھی۔ ایک امریکی قلعی گر اور ریس کاروں کے ڈرائیور ہنری فورڈ نے کاریں بنانے والی ایک فرم قائم کی، جو اس کے نام سے منسوب ہے۔ اس کی ایجاد کے نتیجے میں پیداوار قطار در قطار شروع ہو گئی۔ اس کی ماڈل ٹی فورڈ نمونے کی گاڑی وہ قابلِ اعتماد گاڑی تھی، جسے عام لوگ خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ ہنری فورڈ نے اپنے کاری گروں کو زیادہ اجرتیں دیتے ہوئے ان کی محنت کے اوقات کم کر دیے۔ اس طرح اس نے موٹر گاڑیوں کے لیے ایک مارکیٹ تیار کر دی۔ اس کارکردگی کے نتیجے میں اس کا شمار دنیا کے امیر ترین لوگوں میں کیا جانے لگا۔

مزدور تحریک

صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جس کا آغاز برطانیہ میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ہوا، پیداواری عمل میں زیادہ مستعدی آ گئی اور دولت میں بھی اضافہ ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دولت کی غیر مساوی تقسیم بھی بڑھ گئی۔ فیکٹری میں پیدا ہونے والے سستے مال نے ان اشیا کی قیمت گرا دی جو دستی کارخانوں میں کم تر مستعدی سے تیار ہوتی تھیں۔ پارلیمنٹ کے

متعدد قوانین کے تحت عام اراضی نجی ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی، جس سے دیہات کے لوگوں کے لیے یہ موقع نہیں رہا کہ وہاں رہتے ہوئے اپنے لیے روزی پیدا کر سکیں۔ اس طرح وہ عام لوگ بہت بڑی تعداد میں دیہات سے نکل کر صنعتی شہروں کا رخ کرنے لگے، جن کے پاس اپنی محنت بیچنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اصولی طور پر تو یہ نیا نظام جس کی بنیاد ٹھیکے کی محنت پر تھی، مزدوروں کی آزادی اور ان کی حیثیت کا احترام کرتی تھی، لیکن عملاً مزدور انفرادی طور پر اپنے آجر کے ساتھ سودا چکانے میں نقصان میں رہتے تھے۔ دیہات میں چونکہ کوئی متبادل ذریعہ روزگار نہیں تھا، لہٰذا آجروں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ ملازمت کے لیے درخواست دہندگان میں سے خود انتخاب کریں۔ ایک کے مقابل میں دوسرے سے سودے بازی کریں اور اگر ضروری ہو تو عدم تعاون کرنے والے ایک ایک مزدور کو "بلیک لسٹ" کر دیں۔ پیداوار میں اضافی مستعدی اور تیزی کا تقاضا یہ تھا کہ مشینوں کو چلانے کے لیے کم تعداد میں مزدور بھرتی کیے جائیں۔ اس طرح بے روزگاری میں اضافے کا امکان پیدا ہوا۔ آجروں میں حساب کتاب کرتے وقت یہ تحریک پیدا ہوتی تھی کہ مزدوروں کو کم سے کم اجرت دیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ مشقت لیں۔ اس طرح محنت کے مقررہ اوقات تیزی سے بڑھتے چلے گئے۔ 1800 کے آس پاس مزدور رواج کے مطابق فیکٹریوں میں یومیہ چودہ گھنٹے اور کبھی اس سے بھی زیادہ وقت تک مزدوری کرتے تھے۔

اس ناقابل برداشت صورتِ حال کا ایک ممکن علاج بہت سے مزدوروں کے لیے یہ تھا کہ اپنے آجر سے بات کریں اور زیادہ قابلِ قبول شرائط طے کریں۔ تاہم برطانوی پارلیمنٹ نے 1799 میں ایک قانون منظور کرتے ہوئے ان دونوں "جوڑ" کو ممنوع قرار دے دیا، جس کا مقصد اجرتیں اور قیمتیں دونوں میں اضافہ کرنا تھا، جس کے باعث تجارت میں رکاوٹ آ رہی تھی۔ اس قانون کے زیر اکثر کچھ مزدور آجر سے نجی طور پر سودا کر کے کم تر اجرت پر کام کرتے اور دوسرے مزدوروں کی حیثیت گرا دیتے۔ مزدوروں کے لیے یہ بات ضروری تھی کہ خفیہ طور پر ہی سہی، آپس میں رابطہ رکھتے۔ لہٰذا سب سے پہلے مزدوروں کی تنظیمیں خفیہ جماعتیں ہوتی تھیں، جو غیر قانونی تھیں اور اکثر تشدد کا حربہ بھی استعمال کرتیں۔ پارلیمنٹ نے 25-1824 میں مزدور یونین کی قانونی حیثیت تسلیم کر لی، اس طرح اجتماعی سودے کاری اعلانیہ طور پر ہونے لگی۔ اس عرصے میں اصلاحات کے لیے پارلیمنٹ نے جو قوانین منظور کیے، ان

میں مزدوروں کے معاملات میں شامل ہوتے۔ ارل آف شافٹس بری نے 1833 میں پارلیمنٹ میں فیکٹری ایکٹ پیش کیا، جس سے مختلف عمروں کے بچوں کے اوقات کار متعین کیے گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے 1848 میں دس گھنٹے کے اوقات کار کا قانون منظور کیا۔ فیکٹری کے مزدور رفتہ رفتہ معاشرے میں ایک سرگرم اقتصادی اور سیاسی طاقت بن کر ابھر رہے تھے۔ مزدوروں کا احتجاج اس وقت انتہا پر پہنچ گیا جب اصلاحی تحریک کی تنظیم انگلش چارٹسٹ نے مردانہ حق رائے دہی اور دیگر اصلاحات کا پروگرام پیش کیا۔

برطانیہ میں مزدور تحریک کے اولین زمانے کا غالباً سب سے اہم فرد ایک مزدور نہیں، بلکہ رابرٹ اوون نامی ایک سوتی فیکٹری کا مالک تھا۔ اوون نے 1880 میں اپنے سُسر کی سوتی مل جو نیولانارک اسکاٹ لینڈ میں تھی، خریدی اور اسے 29 سال تک چلاتا رہا۔ اوون نے ایک مثالی صنعتی برادری قائم کی، جہاں اس کی فرم کے ڈھائی ہزار مزدوروں کو اعلیٰ درجے کے مکان، صفائی اور سٹور، جہاں سے وہ رعایتی قیمت پر ضرورت کی چیزیں خرید سکتے تھے، اور مفت تعلیم کی سہولتیں حاصل تھیں۔ جہاں اس کی حریف ملوں میں تیرہ سے چودہ گھنٹے یومیہ کام لیا جاتا تھا، نیولانارک کی مل میں مزدور ساڑھے دس گھنٹے کام کرتے تھے۔ اوون وہ اصل حمایتی تھا جس نے 1819 کا فیکٹری ایکٹ منظور کرایا، جس کے تحت عورتوں اور بچوں کے اوقات کار کی حدیں مقرر کی گئیں۔ اس نے ٹریڈ یونینوں کی حمایت کی، زراعتی، صنعتی کوآپریٹوز کی بھی طرف داری کی اور آٹھ گھنٹے یومیہ محنت کے قانون کی زبردست وکالت کی۔ بعد کے برسوں میں اوون نے نیو ہارمنی، انڈیانا میں ایک یوٹوپیائی برادری کی بنیاد رکھی، جہاں مالی لین دین کے لیے سونے کی بجائے محنت کو معیار مقرر کیا گیا۔ اوون اور دیگر افراد کی مثالیت پسندی نے مزدوروں کی تحریک کو برابر تقویت دی جس سے دانش وَروں میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور بالآخر یہ ایک سوشلسٹ تحریک بن گئی۔

ایک دوسری طاقت بجائے خود ٹریڈ یونین تحریک تھی۔ جب 1824 میں مزدور یونینوں کو قانونی قرار دیا گیا تو برطانوی مزدوروں نے نہایت تیزی سے، اور خاص طور پر کان کنی اور سوتی کپڑوں کی صنعتوں میں منظم ہونا شروع کیا۔ لیبر پالیسیوں میں قومی سطح پر رابطہ پیدا کرنے کے لیے 1868 میں ٹریڈ یونین کانگریس قائم ہوئی۔ 1845 کے انقلاب کے بعد ٹریڈ یونینیں جرمنی میں اور براعظم یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی قائم ہونے لگیں۔ ساتھ ہی اس

کا آغاز شمالی امریکا میں ہوا۔ ابتدا میں مزدوروں کے احتجاج کا اصل مسئلہ اوقات کار میں کمی کا تھا۔ بوسٹن میں 1825 میں لکڑی کے مزدوروں نے دس گھنٹے یومیہ اوقات کار کے حق میں ہڑتال کی جو ناکام رہی، تاہم اس مسئلہ پر 1835 میں ایک عام ہڑتال ہوئی جس نے فلاڈلفیا کی شہری حکومت سے 6 گھنٹے کی محنت، دو گھنٹے کا وقفہ اور پھر مزید 6 گھنٹے کی محنت کے اصول کو منوا لیا۔ صدر مارٹن وین ہورن نے 1840 میں ایک حکم نافذ کیا جس کے تحت وفاقی حکومت کے انتظامی شعبے میں تمام مکینکس اور مزدوروں کے لیے دس گھنٹے یومیہ کے اوقات کار مقرر ہوئے۔ امریکا میں، سول وار (خانہ جنگی) کے زمانے میں ہی ایک اور سرگرمی شدت سے ابھری جب آٹھ گھنٹے یومیہ کی قومی تحریک کو فروغ حاصل ہوا، جس کا سرغنہ بوسٹن کا ایک مستری تھا۔ ایرا اسٹیورڈ نے بہت سی قانونی فتوحات حاصل کی تھیں، لیکن وہ سب محض کھوکھلی ثابت ہوئیں۔ یومیہ آٹھ گھنٹے کی محنت کی جنگ 1870 کی پوری دہائی میں جاری رہی۔ 1870 کے موسم بہار میں نیو یارک شہر کے اندر تعمیرات کے ایک لاکھ سے زاید مزدوروں نے تین مہینے کی جدوجہد کے بعد یہ رعایت حاصل کر لی۔

یکم مئی 1886 میں امریکا اور کینیڈا کی یونینوں کے کارکنوں نے بہت سے بڑے بڑے شہروں میں آٹھ گھنٹے یومیہ محنت کی حمایت میں عام ہڑتال کی۔ اس ''یوم مئی'' کی ہڑتال میں تقریباً ساڑھے تین لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا۔ اس کا سب سے زیادہ یادگار واقعہ ہڑتال کے تین روز بعد شگاگو کے ''ہے مارکیٹ سکوائر'' میں بم کا پھٹنا تھا اور وہ مقدمہ تھا جس میں چار مزدوروں کو تشدد پر اکسانے کے جرم میں موت کی سزا دی گئی۔ اسی سال کے اواخر میں سولھویں امریکن فیڈریشن کی کانفرنس کے مندوبین کو خبر ہوئی تو انہوں نے اس منصوبے کی تائید کر دی۔ یورپ کی ٹریڈ یونین نے، جنہیں سوشلسٹوں کی حمایت حاصل تھی اسی روز آٹھ گھنٹے یومیہ کے حوالے سے عام ہڑتال کر دی، جس روز شمالی امریکا کے مزدوروں نے ہڑتال کی تھی۔ اس طرح یوم مئی بین الاقوامی طور پر مزدوروں کی چھٹی کا دن قرار پا گیا۔ سوشلسٹوں کا سیاسی احتجاجیوں کا ایک گروہ تھا، جو یہ کہتے تھے کہ مزدوروں کی حامی حکومتیں جہاں بھی ہوں، پیداواری اداروں پر قبضہ کر لیں۔ اس بے تال پروگرام کو امریکی فیڈریشن آف لیبر نے مسترد کر دیا اور اپنی تحریک کو بڑی حد تک اپنے ارکان کے معاشی مفادات کی خاطر آجروں کے ساتھ سودے بازی تک محدود رکھا۔

پہلی عالمی جنگ کے زمانے تک بیشتر صنعتی ملکوں میں آٹھ گھنٹے یومیہ محنت کے اصول کو تسلیم کیا جا چکا تھا۔ انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن نے 1919 میں اپنے پہلے کونشن کے موقع پر اسے تحریری شکل دے دی۔ دو سال قبل مارکسسٹ سوشلسٹوں نے روسی ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے لیبر سے متعلق سوالات عالمی سیاست کے منظر نامے میں آ گئے۔ جب دوسری عالمی جنگ کے بعد روسی اشتراکیت نے دیگر ممالک کو اپنے سیاسی دائرہ اثر میں لے لیا تو دنیا بھر کی قومیں سوشلسٹ اور سرمایہ دار کمپنیوں میں تقسیم ہو گئیں۔ ہر ایک بہ ظاہر کسی مذہبی اقتصادی فلسفے کے تابع تھی۔ کارل مارکس اور اس کے ساتھیوں نے انٹرنیشنل ورکنگ مین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی تھی، جسے بعد میں لندن کی پہلی انٹرنیشنل بہ تاریخ 1864 کے نام سے شہرت ملی۔ دوسری انٹرنیشنل کارل مارکس کی وفات کے بعد وجود میں آئی۔ اس کے سربراہوں میں 1890 اور 1919 کے دوران میں اس وقت کی بیشتر یورپی سوشلسٹ پارٹیاں شامل تھیں۔ پھر بالشوازم کی کامیابی کے بعد ''تیسری انٹرنیشنل تشکیل دی گئی تاکہ سوویٹ ریاست کے نظریاتی مقاصد کی معاونت کرے۔ لیکن سابق سوویٹ یونین میں سٹالن کی سلطنت کے خاتمے اور مشرقی یورپ کی ریاستوں کے زوال کے باعث ان نظریات کو زبردست دھچکا لگا۔ اس عرصے میں مغرب کی مزدور تحریک اس بنا پر کمزور ہو گئی ہے کہ یونین کے رکن مزدوروں اور اس سے باہر کے مزدوروں کی آمدنیوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے اور ایک اور سبب لیبر کے درمیان مقابلے کے اندر گلوبلائزیشن کا عمل ہے۔

تعلیم

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مغرب کی مزدور تحریک خود اپنی کامیابی کی شکار ہو گئی ہو۔ اس کا مقصد اقتصادی محرومی پر قابو پانا تھا۔ اجرتیں بڑھوانے اور اوقاتِ کار میں کمی کے مطالبوں میں یونینوں کو کامیابی ہوئی۔ چنانچہ مزدور طبقے کو زیادہ پر آسائش زندگی میسر آ گئی۔ متوسط طبقے کی نئی حیثیت اختیار کر لینے کے بعد اب یہ امید پیدا ہوئی کہ مزدوروں کے فرزندوں کو معاشرے میں آگے لے جانے میں پہلے سے کہیں زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ مختلف نسلوں کی اس بہتر حیثیت کا سبب تعلیم تھی۔ تعلیم نے ذہنوں کی تربیت کی اور انہیں شان دار کامیابیوں کے حصول میں مدد دی اور اس کا اہل بنایا۔ اگرچہ ان کے والدین غریب تھے، لیکن یونیورسٹی میں تعلیم و تربیت

حاصل کرنے کے بعد مزدوروں کے بچے وکیل، ڈاکٹر یہاں تک کہ وزیراعظم ہو سکتے تھے۔ ایک ایسی تنظیم کے مقابلے میں جس کے مزدور ہاتھ اور بدن سے محنت کرتے تھے اور معاہدے میں کامیابی کے بعد اجرتوں میں اضافہ حاصل کر لیتے تھے، خواہ اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں، کسی ایسے ادارے سے وابستہ ہونا زیادہ تسکین بخش تھا، جس میں نجی محنت اور ذہانت کے ذریعے کامیابی یقینی تھی۔ چنانچہ ٹریڈ یونینوں کے متمول ارکان نے اس ورثے سے دست کش ہو گئے، جس کی بنیاد محرومی کے وعدے پر تھی اور اس زیادہ شان دار مستقبل کی طرف قدم بڑھایا، جدھر تعلیم نے دروازہ کھول دیا تھا۔

مغربی تعلیم کی بنیادیں زمانہ وسطیٰ کے اداروں میں پیوست ہیں، جس کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا تعلق چرچ کے ساتھ ہے۔ دینیات کی تربیت اور اس کے ساتھ علاج معالجے کا فن، قانون اور دیگر سماجی علوم، پیرس یونیورسٹی کے نصاب کے عین بنیاد میں شامل تھے۔ یونان اور روم کی کلاسیکی تحریروں سے آگہی کی بہ دولت، انسان دوستی کی ایک مضبوط روایت کو فروغ ہوا۔ سیسرو (Cicero) اور آگسٹس کے درمیانی عرصے میں لاطینی زبان کے مصنفوں نے جو اسلوب وضع کیے تھے، یورپ کے مصنفوں نے اس کی تقلید کی۔ پروٹسٹنٹ فرقے کی اصلاحی تحریک نے جس کی قیادت دینی علما کر رہے تھے، تعلیم کو ہی مسیحی علم سے آگہی کا براہِ راست وسیلہ سمجھا۔ یورپ کے شہزادوں کو تعلیم یافتہ ناداروں پر چنداں اعتماد نہ تھا، لہٰذا انہوں نے سکولوں کا بندوبست خود سنبھالنے کی کوشش کی اور ان میں ایسے طریقے وضع کیے کہ تیز طرار نوجوانوں کو ان میں کشش محسوس ہو اور وہ معاشرے کی خدمت میں سرگرم ہو جائیں۔ ایچ جی ویلز کا بیان تھا کہ ''جامعات، امرا کے مسلمہ نظام کار کا حصہ تھا۔ ان (جامعات) پر پُرشکوہ کلاسیکیت کا دکھاوا بھونڈے انداز میں طاری رہتا تھا۔ ان کا مبلغ علم محض لاطینی اور یونانی کلاسکس کے متن کی خواندگی تھا، جو تجسس اور تنقید سے عاری ہوتا اور ایک اچھے اسلوب بیان کی آزمائش تھا اور بیان بھی وہ جس میں بہت سے اقتباسات، موہوم عبارت اور رٹے رٹائے فقرے ہوں... ایسی ہی تربیت کے بعد دنیا اس آئینے کی طرح تھی، جس میں سب کچھ مسخ شدہ نظر آتا ہے اور تاریخی مشابہتیں بھی غلط ہوتی ہیں۔''

پرشیا نے نپولین کی فوجوں سے شکست کھانے کے بعد اس چیلنج کا جواب مختلف طریقوں سے دیا، ان میں ایک طریقہ اپنے اسکولوں کی تنظیم نو کا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کو بہتر بنایا

گیا اور جمنازیم کی تربیت کو مرکزی حیثیت دی گئی جسے سماجی مرتبے کی علامت سمجھا گیا۔ درسی نصاب میں علمی سائنس کا اضافہ کر دیا گیا۔ جرمن اپنے علمی اداروں کی بدولت کیمیاوی ٹیکنالوجی میں سب سے آگے نکل گیا۔ جب سیکسے کوبرگ کے شہزادہ البرٹ نے برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ سے شادی کی تو اس نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس ملک کو جس کی شہریت اس نے اختیار کی تھی، تعلیم میں ان کی کوتاہیوں سے مطلع کیا۔ اس نے 1850 میں ایک یونیورسٹی کمیشن قائم کیا اور ایک سال بعد لندن کے ہائیڈ پارک میں پہلی بین الاقوامی نمائش کا اہتمام کیا، جس کا مقصد انگریزوں کو یہ بتانا تھا کہ دوسری یورپی اقوام نے فن اور صنعت میں کیسی کیسی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں برطانیہ اور جرمنی کی بحری رقابت کے درمیان انگریزوں کو یہ تحریک ملی کہ اچھی طرح اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ برطانیہ کے ماہرین تعلیم نے اس وقت اپنا محاسبہ کرنا شروع کیا جب جرمنی نے بحری طاقت میں برطانیہ پر سبقت حاصل کرنے کے لیے مقابلہ شروع کر دیا۔ قومی سطح پر مقابلے کے عمل نے نیچرل سائنس میں زیادہ پرمشقت تربیت کا تقاضا کیا۔ اب برطانیہ کے عام لوگوں کی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہونے لگا کیوں کہ اس وقت تک بھاپ کے انجن کی بہ دولت زور بازو سے محنت کرنے والوں کی مانگ کم ہوگئی تھی اور ایسے مزدوروں کی مانگ بڑھ گئی تھی، جو قوت فیصلہ اور مہارت رکھتے تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ برطانیہ اور فرانس دونوں کے درسی نظام میں ادب اور کلاسیکی تعلیمات پر بہت زور دیا گیا تھا لیکن سائنسی دریافتوں کا راستہ انہوں نے ہی دکھایا اور علم کی بنیاد پر مفید ٹیکنالوجی کی اختراعات انہی کی بدولت ہوئیں۔ تجرباتی سائنس کے عظیم اور سرکردہ بیشتر لوگ وہ تھے، جن کے پاس تعلیم زیادہ نہ تھی۔ نہ تو کیپلر کسی یونیورسٹی سے وابستہ تھا اور نہ ڈسکارٹ تھا۔ بنجمن فرینکلن، میکائیل فراڈے اور تھامس ایڈیسن، یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جنھوں نے علم اپنی محنت سے حاصل کیا تھا۔ جیمس واٹ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ نہیں تھا، اگرچہ وہ گلاسگو میں کیمسٹری کے پروفیسر جوزف بلیک سے مشورہ کرتا رہتا تھا۔ پریسٹلے ایک دینی سکول کا پڑھا ہوا تھا۔ تاہم جرمنی نے سائنس میں جو عالمانہ تربیت حاصل کی تھی، اس کا انگریزوں پر گہرا اثر پڑا۔ ابتدا میں عام تعلیم کا تصور برطانیہ کی تعلیم یافتہ اشرافیہ کے نزدیک ایک مضحکہ خیز بات تھی۔ ویلز کا بیان ہے کہ وکٹوریہ عہد کے نصف زمانے تک یہ خیال انتہائی مسخرا پن لگتا تھا کہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہوا دکان کا ملازم پڑھا ہوا بھی ہو اور گاہک عورتوں سے یہ کہے کہ فرینچ نہ بولیں کیوں کہ وہ یہ

زبان بھی جانتا ہے..." بعد میں جب جرمنی کے ساتھ مقابلہ شروع ہوا تو اس لطیفے سے مزاح کا عنصر جاتا رہا۔ ملکہ وکٹوریہ کی وفات سے بھی پہلے، دکان کے انگریز ملازموں کو زور دے کر کہا جاتا تھا کہ شام کی کلاسوں میں جا کر فرنچ سیکھیں۔"

مغرب کی ایک یونیورسٹی میں تعلیم کا مقصد کچھ اور بھی ہے، جس کے مابعد غیر معمولی تاریخی اثرات نہیں۔ مغربی سائنس کے فروغ اور خاص طور پر فوجی سائنس کی ترقی کی بنا پر دنیا میں سیاسی طاقت کا توازن فیصلہ کن طور پر مغرب کی طرف جھک گیا ہے۔ مغرب کے علاوہ دیگر ملکوں کے رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی قوموں کو اپنی بقا کی خاطر جدید خطوط پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان قوموں کو خاص طور پر مغربی طاقتوں کی جارحیت کے مقابلے میں اپنے تحفظ کے لیے اسلحہ کی ٹیکنالوجی حاصل کرنی ہوگی۔ بعض صورتوں میں تو انہوں نے اپنے یہاں مغرب کے کسی ماہر فن کو فوجی مشیر بھی مقرر کیا۔ مراکش کے سلاطین نے سولھویں صدی میں مغرب کے اسلحہ کی ٹیکنالوجی اور ان کے رنگروٹوں کی مدد سے پرتگال کی حملہ آور فوج کو شکست دے دی تھی۔ انیسویں صدی میں رنجیت سنگھ نے نپولین کی فوج کے آزمودہ کار سپاہی اپنی فوج کو تربیت دینے کی خاطر ملازم رکھے تھے تاکہ ہندوستان میں انگریزوں کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن انجام کار ان غیر مغربی حکومتوں نے یہ دیکھا کہ محض ٹیکنالوجی حاصل کر لینا کافی نہیں۔ ایک منظم فوجی دستہ، حفظانِ صحت کا نظام، کافی مالی وسیلہ، معاون صنعتی سہولیات اور مغربی معاشرے کی دیگر خصوصیات، یہ تھیں ان کی ضرورتیں۔ ان کو تو پورے کا پورا مغربی کلچر اختیار کرنا تھا۔ لیکن جس چیز کی ان کو طلب نہ تھی، وہ تھا مغرب کا مذہب، کیوں کہ مسیحی بننے کے معنی تھے اپنی روحانی شناخت سے محروم ہو جانا۔

چند غیر معمولی حکومتوں نے مکمل طور پر جدید بننے کا فیصلہ کیا۔ اس کی مثال روس کا پیٹر اعظم (1725-1682) ہے۔ اس جواں سال زار نے مغرب کا سفر کیا اور ایڈرلینڈ میں ایک شپ یارڈ کے اندر بڑھئی کے طور پر مزدوری بھی کی تاکہ اپنے ملک میں واپس جانے سے پہلے مغرب کے طریقوں کا تجربہ کر لے، جہاں اس کا پروگرام جدت کو رواج دینے کا تھا۔ انیسویں صدی کی دیگر شخصیات میں سلطنت عثمانیہ کا بادشاہ محمود دوم، تھائی لینڈ کا بادشاہ منگ کٹ اور جاپان کے مسیحی اصلاح پسند بھی شامل تھے۔ غیر مغربی اقوام میں مغرب کے طریقوں سے باعلم ہونے کا ایک عام طریقہ یہ تھا کہ اپنے نوجوانوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ

بھیج دیتے تھے۔اس میں ایک رکاوٹ یہ تھی کہ بیشتر مغربی یونیورسٹیوں میں طلبا کے لیے مذہبی تعلیم سے باخبر ہونا لازمی تھا۔مثال کے طور پر آکسفرڈ یونیورسٹی میں1871 تک داخلے کے ہر امیدوار کے لیے ضروری ہوتا کہ برطانوی چرچ کے نافذ کردہ 39 دفعات کو ذاتی طور پر تسلیم کرنے کا اقرار کرے۔ البتہ ایک استثنا وینس کے علاقے میں واقع پاڈووا یونیورسٹی میں تھی۔ جہاں غیر کیتھولک طلبا کو بھی داخل کرلیا جاتا تھا۔ چنانچہ وینس اور عثمانیہ سلطنت میں یونانی طلبہ کے لیے یہ جگہیں ان کی پسندیدہ تھیں۔ یورپ میں مذہبی رواداری جیسے جیسے بڑھتی گئی، مزید یونیورسٹیوں نے اپنے اپنے علاقے کی نافذہ مسیحیت کوقبول کرنے کی شرط ختم کر دی۔ چنانچہ مغربی تعلیم غیر ملکی طلبہ کے لیے پرکشش ہوتی گئی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مغرب کی ٹیکنالوجی اپنی برتری کا مظاہرہ کررہی تھی۔

جس عمل کا آغاز آہستگی سے ہوا تھا، وہ ایک طوفانی دھارے کی طرح چل نکلی۔ دنیا بھر کے غیر مغربی معاشروں میں مغرب کے تعلیم یافتہ مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد نکل آئی۔ روس میں اس گروہ کو''انٹیلی جنشیا'' (دانش وَر) کا نام دیا گیا۔ دو دُنیاؤں میں رہنے والے یہ افراد گویا دو تہذیبوں کا نقطہ اتصال بن گئے۔ ایک مغرب کا معاشرہ اور دوسرے ان کے اپنے معاشرے کی تہذیب۔ ان میں سے بیشتر اعلیٰ سرکاری منصب پر فائز ہوئے اور تجدید کے پروگرام پرعمل درآمد کیا۔ اگرچہ غیر مغربی حکومتوں نے بالعموم اس طریقے سے تعاون کیا، لیکن انٹیلی جنشیا نے کبھی کبھی خود اپنے ایجنڈے پرعمل کیا۔ مغرب کے پروردہ دیوتاؤں نے شہزادہ سیلانٹی (Psilanti) کی قیادت میں1821 میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ روسی افسروں کے ایک دستے نے1825 میں زار الیگزینڈر اوّل کے خلاف سازش کی۔ دونوں بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا گیا۔ یورپ میں غیر ملکی طلبہ نے اس زمانے کی دانش اور تہذیبی فیشن کو اختیار کرلیا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ کے دانش وَروں کو مارکسزم میں بہت کشش محسوس ہوئی۔ چاؤ این لائی اور ہو چی منہ دونوں نے پہلی عالمی جنگ کے فوری بعد پیرس سے اپنی انقلابی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ سن یات سن نے ہونولولو میں تعلیم پائی تھی۔ موہن داس گاندھی نے لندن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ نہرو، ہارورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھنے گئے تھے۔ گھانا کے نکرومہ نے امریکا کی لنکن یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف اٹھنے والی تحریکیں، قوم پرستی

اور مغربی تعلیم بہ یک وقت دونوں کی پیدا کردہ تھیں۔

مغربی کلچر میں اوّلین کشش تو اس کی ٹیکنالوجی اور خاص طور پر گولے بارود اور آلاتِ حرب کے حصول میں تھی۔ نمائش میں جرمن انداز کی تربیت سے برطانوی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا، چنانچہ ایک صدی بعد جب سوویت روس نے خلا میں سپوتنک بھیجا تو امریکا کے اسکولوں اور کالجوں میں اس نظریے پر جوش وخروش سے بحث ہونے لگی کہ روسیوں نے اپنے یہاں سائنس کی تعلیم وتربیت کہیں زیادہ سختی سے کی ہے۔1930 اور 1940 کے عشروں میں یہ نظر آنے لگا کہ ٹیکنالوجی میں ترقی کی کلید، سائنس کی اعلیٰ تعلیم میں ہے۔ یہی وہ دور تھا جب ایٹم بم بنایا گیا۔ پہلے پہل کمپیوٹر کو ترقی دی گئی۔ لیکن آخرکار امریکا کو زیادہ دلچسپی ایک ہموار اور یکساں معاشرے کے قیام سے ہے۔ اس نے تارکینِ وطن کی ایک بڑی آبادی کو اپنے یہاں رکھا ہے اور انہیں امریکی بننے کی تربیت دی ہے۔ اس نے کاشت کاروں کے مثالی فارم تیار کیے۔ جنگ کے بعد محاذ سے واپس آنے والے سپاہیوں، نسلی اقلیتوں اور دیگر مختلف اقسام کے لوگوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ شہروں میں رہنے اور پیشہ ورانہ روزگار اختیار کرنے کے قابل بن جائیں۔ یہ کام غیر ملکیوں کو مغرب کے معاشرے میں رہن سہن کے قابل بنانے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس معاشرے میں جس قدر طاقت اور دولت موجود ہے، وہ اس فرد کے لیے، جو تربیت یافتہ ہے اور آگے جانے کا صحیح طریقہ جانتا ہے۔

قومی تاریخیں

یہ یورپ کا ایک سیاسی خواب رہا ہے کہ براعظم یورپ وایشیا کی آخری حد پر یعنی چین میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی نقل اپنے یہاں بھی کریں۔ پہلے چی ان بادشاہ نے ایک ہی بار ایک متحدہ سلطنت قائم کی تھی۔ حقیقتاً یہ کبھی ٹوٹ کر الگ نہیں ہوئی، یوں بھی ہوتا کہ ایک خاندان کی حکومت ختم ہو جاتی، وحشی قبائل درمیان آ جاتے اور ایک سلطنت بہت سی چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں میں بٹ جاتی، لیکن آخر میں لامحالہ یہی ہوتا کہ چینی حکومت کی نئے سرے سے تعمیر ہو جاتی۔ دوسری طرف مغربی یورپ میں پانچویں صدی عیسوی سے رومن سلطنت پر بیرونی حملوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اور سلطنت سیاسی ٹکڑیوں میں بٹ گئی تو یہ تسلسل موجودہ زمانے تک برقرار رہے۔ سیاسی سلطنتیں جیسے کہ شارلیمین (Charlemagne) کی حکومت

تھی، جس میں مغربی یورپ کا بیشتر حصہ شامل تھا، وہ محض چند روزہ ثابت ہوئیں۔ پاپائے روم نے یورپ کو سیاسی اور مذہبی سلطنت کے طور پر متحد کرنے کی کوشش کی لیکن چودھویں صدی کے عظیم تفرقے اور پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک نے وہ خواب چکنا چور کر دیا۔ ستم ظریفی یہ کہ یورپ کے بادشاہوں نے جس طرح کی سلطنت کے قیام کا خواب یورپ میں دیکھا تھا، اس کی تکمیل اجتماعی طور پر اور عالمی سطح پر دنیا کی تاریخ کے تیسرے عہد میں ہوئی۔ یہ واقعہ بھی بیسویں صدی میں رونما ہوا۔

تیسرے عہد کی سیاسی تاریخ کی خصوصیت متحدہ سلطنتوں کا قیام نہیں بلکہ قوموں کی یک جائی ہے۔ اس کا ''پیغمبر'' ایک اطالوی مصنف اور کسی زمانے میں ایک سیاسی مشیر بھی رہ چکا تھا، اس کا نام نکولو میکاولی تھا۔ وہ فلورنس کے سیاسی رہنما کو دس سال تک مشورے دیتا رہا یہاں تک کہ میڈیکی خاندان نے 1512 میں انتظام خود سنبھال لیا۔ میکاولی کی تصنیف ''دی پرنس'' جو اس کی وفات کے بعد 1532 میں شائع ہوئی، ہمیں میکاولی کے اس دور کے تجربوں سے آگاہ کرتی ہے۔ میکاولی نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ اس کے آدابِ حکمرانی کا مقصد مسیحی عقائد کو فروغ دینا یا ایک بہتر معاشرہ قائم کرنا تھا۔ سیاست، جیسا کہ اس زمانے کا معمول تھا اقتدار حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے کی غرض سے ہوتی تھی۔ لہٰذا سربراہانِ مملکت کے لیے لازم تھا کہ نجی سیاسی مفاد کی خاطر کسی تکلف یا تاسف کے بغیر اپنے مقصد کے لیے عمل پیرا ہوں۔ میکاولی طاقت کے توازن کی حکمت عملی کی بھی سفارش کرتا تھا، جس نے آئندہ صدیوں تک یورپی ڈپلومیسی میں رہنمایانہ کردار ادا کیا۔ اس حکمت عملی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم خیال شہزادے آپس میں مل کر اس شہزادے کی مخالفت کریں جو بہت طاقت وَر ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر لورینزو ڈی میڈکٹ وینس اور نیپلز کے خلاف فلورنس اور میلان کو آپس میں متحد کر کے امن قائم رکھا تھا۔ شہنشاہ چارلس پنجم اور فرانس کے فرانسس اوّل کی جنگی آویزش میں جو 1520 کے عشرے میں جاری تھی، چارلس کی حمایت پوپ اور انگلینڈ کے ہنری ہشتم نے کی اور فرانس کا عثمانی ترکوں نے ساتھ دیا۔ ایک مرتبہ جب یہ محسوس ہوا کہ چارلس اس کھینچا تانی میں جیت جائے گا تو ہنری اور پوپ نے پینترا بدلا اور فرانس کی حمایت کرنے لگے۔

شارلیمین خاندان اور خاندانی حکومت کے وارثوں نے ایک ایسا جغرافیائی ڈھانچا بنا رکھا تھا، جس میں یورپ کی قومی حکومتیں وجود میں آئیں۔ شارلیمین کی سلطنت 843 میں اس

کے تین پوتوں کے درمیان تقسیم ہو گئی، وہ بیشتر علاقہ جو آج فرانس کہلاتا ہے چارلیس دی بالڈ (گنجے چارلس) کے حصے میں گیا۔ لیوس جرمن والے کو مشرقی جرمنی کے علاقے حصے میں ملے۔ وسطی علاقہ جو بلجیم سے گزر کر اٹلی تک جاتا ہے، لوتھیئر کے حوالے کیا گیا اور اسے مقدس رومی شہنشاہ بھی قرار دیا گیا۔ دسویں صدی میں جرمن علاقے اور اٹلی کا بیشتر علاقہ عظیم اوٹو (Otto The Great) کی سلطنت کے اندر متحد تھے۔ اس وقت کا فرانس ایک شاہی راج دھانی تھی، جو پیرس کے نواح میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں بڑی بڑی جاگیریں بہ شمول برگنڈی، نارمنڈی، برٹنی اور اکیوٹین شامل تھیں۔ نارمن قوم نے اکیسویں صدی میں جنوبی اٹلی اور سسلی کو فتح کر لیا تھا، تاکہ سسلی کی دو حکومتیں قائم کر لیں۔ نارمنڈی کے ڈیوک ولیم نے 1066 میں ہیسٹنگز کے میدان جنگ میں انگریز بادشاہ ہیرولڈ کو شکست دے دی۔ اس کے نارمن خاندان نے برطانیہ کو متحد کیا۔ انگریزوں اور برگنڈی کے حکمرانوں نے مل کر فرانس کے کیپٹ خاندان (Hugh Capet) کا میدان جنگ میں مقابلہ کیا۔ ایک کسان لڑکی جون آف آرک نے انتہائی نازک مرحلے میں انگریزوں کو باہر نکال کر فرانس کو تباہی سے بچا لیا۔ بعد ازاں فرانس کے لیو یاز دہم (83-1461) نے برگنڈی کو اپنے دائرہ اقتدار میں لے لیا۔ اس کے بعد سے فرانس ایک مستحکم اور مضبوط سلطنت کے طور پر برقرار رہا۔

پندرھویں صدی کے آخری زمانے میں فرڈیننڈ اور آئزبلا کی شادی کے نتیجے میں کیسٹائل اور اراگان کی حکومتیں متحد ہو گئیں جو چار سو سال سے موروں (مسلمانوں) کو شمالی افریقا کی طرف دھکیلتی آئی تھیں۔ ان کا یہ کام 1492 میں تکمیل کو پہنچا۔ ان دونوں کا پوتا چارلس پنجم آسٹریا کے علاقہ ہیبسبرگ کے بادشاہ میکسمان اوّل کا بھی پوتا (نواسا) تھا۔ 1519 میں میکسمان کی وفات کے بعد چارلس، یورپ کی سلطنت کا واحد جانشین قرار پایا۔ اس سلطنت میں سپین، آسٹریا، ہنگری، بوہیمیا، نیدرلینڈ، دونوں سسلی اور سپین کی امریکی مقبوضہ جات شامل تھیں۔ اس کے علاوہ روم کا مقدس شہنشاہ ہونے کی بنا پر وہ بالواسطہ طور پر وسطی یورپ کی جرمن ریاستوں کو اپنے دائرۂ اختیار میں رکھتا تھا۔ فرانس کا بادشاہ فرانسس اوّل، چارلس کا اصل حریف تھا۔ چارلس کی اصل بدقسمتی یہ تھی کہ جب پروٹسٹنٹ کی اصلاحی تحریک نے زور باندھا تو وہ کیتھولک شہنشاہ اور حکمران تھا۔ اس کو جرمن شہزادوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا، جو لوتھر کی مدد کر رہے تھے۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فوجوں کے درمیان 1546 میں جنگ چھڑ گئی اور دوسری

بار1552 میں جنگ ہوئی۔ اس وقت چارلس نے حکومت سے دست بردار ہو کر خانقاہ میں جا بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔1554 اور1556 کے درمیان اس نے اٹلی، سسلی، نیدرلینڈ اور سپین کے علاقے اپنے بیٹے فلپ کے سپرد کر دیے۔ وسطی یورپ میں ہیسبرگ کے مقبوضہ جات اس نے اپنے بھائی فرڈینینڈ کے نام لکھ دیے، دو سال بعد چارلس کا انتقال ہو گیا۔

مذہبی جنگیں اس کے بعد کی صدی میں جاری رہیں۔ ہنری ہشتم کا پوپ سے ایک طلاق کے مسئلہ پر جھگڑا ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں انگلینڈ پروٹسٹنٹ ہو گیا۔ تیس سالہ جنگ نے جس کی ابتدا1618 میں ہوئی تھی، وسطی یورپ کو بری طرح تباہ کر دیا تھا۔ اس کا آغاز اس وقت پروٹسٹنٹ بوہیمین شہزادوں سے ہوا جب ہیسبرگ کے کیتھولک بادشاہ فرڈینینڈ نے اس کے اقدام کی مزاحمت کی اور اس میں ڈنمارک، سویڈن، فرانس، سپین اور بیشتر جرمن حکومتیں شامل ہو گئیں۔ اس جنگ میں ایک طرف کیتھولک ڈٹے ہوئے تھے، ان کے مقابل پروٹسٹنٹ صف آرا تھے اور بیشتر یورپ (بشمول فرانس) ہیسبرگ خاندان کے خلاف جنگ آزما تھا۔ دو عظیم کیتھولک طاقتوں، فرانس اور آسٹریا کے درمیان جنگ آئندہ صدی تک ہوتی رہی۔ سپین نے جو کیتھولک تھا اور جس نے1580 میں پرتگال سے اتحاد کیا تھا، فلپ دوم کی سربراہی میں کچھ عرصے کے لیے اپنے یورپی ہمسایوں پر فتح پانے کی کوشش کی تھی، تاہم1567 ،1648 میں ہالینڈ کی خانہ جنگی کے باعث اس کی طاقت بہت کم رہ گئی تھی۔ اس خانہ جنگی میں سپین نے انگلینڈ اور ہالینڈ کے خلاف بحری جنگی بیڑے استعمال کیے اور بہت تباہ ہوا۔ مزید نقصان اسے پرتگال اور کیٹلونیا کی بغاوتوں سے ہوا۔ سترھویں صدی کے آخری زمانے میں اب فرانس کی باری تھی کہ یورپ میں تہذیبی بالا دستی اور اس کے مطابق سیاسی اقتدار حاصل کرے۔ لوئی چہاردہم، دی سن کنگ (The Sun King) نے اپنے مشرقی ہمسایوں پر پے در پے جارحانہ حملے کیے لیکن ہالینڈ، سویڈن، سپین اور برطانیہ نے مؤثر طور پر اس کی مدافعت کی۔ فرانس جو اس وقت یورپ کا سب سے خوش حال ملک تھا اس وقت کمزور ہو گیا جب اس نے جفاکش پروٹسٹنٹوں کی اقلیت کو اپنے علاقے سے نکال دیا۔

اس کے بعد برطانیہ اور فرانس کے درمیان بالادستی کی جنگ شروع ہو گئی۔ برطانیہ نے فرانسیسیوں کو شمالی امریکا سے1690 اور1763 کے درمیان، اور ہندوستان سے1746 اور1761 کے درمیان نکال دیا۔ آسٹریا کے شاہی خاندان نے ویانا اور ہیسبرگ میں بار بار

حصار بند ہو کر ہنگری کو بچا لیا، لیکن عثمانیہ سلطنت ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ سپین کی مقبوضہ جات جو نیدر لینڈ کے جنوب اور لومبارڈی میں تھیں، اس نے ورثے میں پائیں۔

لیوپولڈ اول نے سربیا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ہیبسبرگ کی سلطنت میں شامل ہو جائے، اس کے بدلے اسے مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ زار پیٹر اعظم نے سویڈن کو 1700 اور 1722 کے درمیان شکست دے کر بحر بالٹک کے ساحلی علاقے اپنے قبضے میں کر لیے۔ روسیوں نے کیتھرین اعظم کے ماتحت عثمانیہ سلطنت سے بیلو رشیا اور یوکرین کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا۔ پھر برینڈن برگ پرشیا کی ابھرتی ہوئی طاقت کا تصادم آسٹریا، روس اور فرانس کے ساتھ ہو گیا۔ پولینڈ کو پرشیا، روس اور آسٹریا کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ انقلاب فرانس کے نتیجے میں نپولین برسر اقتدار آ گیا۔ اس کے اصل حریف، جرمنی، روس اور برطانیہ تھے۔ نپولین کی سلطنت میں تقریباً پورا براعظم یورپ شامل ہو گیا تھا، لیکن بدقسمتی سے روس کے حملے نے اس کی فوجی طاقت ختم کر دی۔ اس زمانے تک یورپ کی جنگوں میں مذہبی مقاصد کا نمایاں کردار نہیں تھا۔ جنگیں اصلاً سیاسی اور تجارتی مفاد کے لیے لڑی جاتی تھیں۔ جنگ آزما فریق شہری آبادی کو شامل کیے بغیر بے وردی سپاہی بھرتی کر لیتے تھے جو اپنے وسائل خود استعمال کرتے تھے اور متعینہ حدود کے اندر رہ کر جنگ کرتے تھے۔

نپولین کی فتوحات نے جرمن اور اطالوی باشندوں میں قوم پرستی کی روح بیدار کر دی تھی۔ اٹلی 1859 اور 1870 کے درمیان وکٹر ایمنول دوم کے دورِ حکومت میں ایک متحدہ قوم بن گیا تھا۔ شہزادہ اوٹو وان بسمارک نے 1866 اور 1871 کے درمیان جرمن ریاستوں کو پرشیا کی حکومت کے تحت متحد کر دیا تھا۔ جرمنی نے 71-1870 کے درمیان فرانس کو شکست دے کر یورپ کی سب سے بڑی فوجی طاقت بن گیا تھا۔ اس دوران میں فرانس اور انگلینڈ نے افریقا میں نئی نو آبادیاں حاصل کر لی تھیں اور چین میں بھی تجارت کا ایک گوشہ پیدا کر لیا تھا۔ ایشیا میں جاپان نے جو مغربی قرینہ اختیار کر لیا تھا 95-1894 میں چین میں مانچو کو شکست دے دی تھی اور مغربی طاقتوں کے لیے اب اس کی تقسیم کا مرحلہ قریب آ گیا تھا۔ پھر اس نے 05-1904 میں روس کو بھی شکست دی اور اس صدی کے آخر تک سپین کو کیوبا اور فلپائن سے بھی نکال دیا۔ برطانیہ اور جرمنی کی باہمی تجارتی رقابت میں فرانس اور روس کے ساتھ برطانیہ کا گٹھ جوڑ بھی شامل ہو گیا تھا، تاہم میکاولی کی دی ہوئی توازن طاقت کی حکمت عملی نے اپنا کام کیا۔ پھر یہ ہوا

کہ نئی صدی کے پہلے پندرہ سال میں ایک خون ریز عالمی جنگ یورپ کے اندر شروع ہو گئی، تہذیب اپنے آپ کو خود ہی مسمار کر رہی تھی۔

پہلی عالمی جنگ کا یورپ کے سیاسی منظر نامے پر ایک واضح اثر پڑا۔ جنگ کے ختم ہونے پر چار نہایت طاقت وَر سلطنتیں ختم ہو چکی تھیں۔ ان ساری سلطنتوں کا تعلق مرکزی طاقت سے تھا۔ یہ تھیں جرمنی کے قیصر، آسٹریا وہنگری کی ہیسبرگ سلطنت اور ترکی کی سلطنت عثمانیہ۔ ان کے علاوہ زار روس کی جگہ سوویت یونین نے لے لی۔ پہلے کیرنسکی کی عبوری حکومت آئی اور پھر بالشوکوں نے اقتدار چھین لیا۔ امریکا نے جو فاتح فریق کے ساتھ جنگ میں شمولیت کی تھی، نظر آتا تھا کہ وہ مستقبل کی طاقت ہے۔ یورپی بادشاہتوں کے پرانے نظام پر جمہوریت نے فتح پالی تھی۔ ہیسبرگ خاندان سے باہر معمولی جرمن اشرافیہ سے نسلی تعلق رکھنے والے بیشتر افراد باقی رہ گئے تھے۔ جرمنی کا قیصر ولیہلم اور انگلینڈ کا جارج پنجم، دونوں ملکہ وکٹوریہ کے پوتے تھے۔ قیصر کا خیال یہ تھا کہ اس کے شاہی ارباب خاندان، عم زاد بھائیوں یعنی انگلینڈ کے بادشاہ اور زارِ روس کے ساتھ شائستہ گفت وشنید کے ذریعے جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا لیکن یہ نہ ہوتا تھا، نہ ہوا۔ جنگ نہ صرف یہ کہ اس کی حکومت کو بلکہ اس خواب کو بھی بہا لے گئی جو یورپی باشندے شارلیمین کے زمانے سے دیکھتے آئے تھے۔

جمہوریت اور انقلاب

تیسرے عہد کے آغاز میں جو سیاسی صورتِ حال پائی جاتی تھی، اس کے خاتمے پر صورتِ حالات اس کے عین برعکس تھی۔ سولھویں صدی کے اوائل میں تین نہایت طاقت وَر سلطنتیں، یعنی جرمنی اور سپین پر مقتدر چارلس پنجم، فرانس کا فرانسس اوّل اور برطانیہ کا ہنری ہشتم، پورے مغربی یورپ پر پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے۔ ہر ایک کا سلطنت پر دعویٰ یہ تھا کہ اسے تخت وتاج خدا کی تائید سے بجا طور پر ورثے میں ملا ہے۔ پوپ کی طاقت میں کمی ہونے کے ساتھ، دنیاوی طاقت ہی حقیقی اور کلی طاقت رہ گئی تھی، اس کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ اپنی رعیت کے مذہب کا انتخاب بھی وہی کرتی تھی۔ لیکن اس عہد کے ختم ہونے تک بادشاہت کا ادارہ لب گور نظر آیا۔ جمہوری حکومت (یا نام نہاد جمہوری آمریت) اس کی جگہ لے رہی تھی۔ سیاسی حکمران اب خدا کی مرضی سے نہیں بلکہ عام لوگوں کی خواہش کے تحت منتخب ہوتے تھے۔

اس تہذیب کے اوائل میں حکومت جو ایک استبداد کے ادارے کے طور پر ابھری تھی، اب اس نے بازار کا سا قرینہ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے تحکمانہ اندازِ حکمرانی کی جگہ ایک ایسی حکمرانی نے اختیار کر لی تھی، جس میں طاقت کی اساس اس امر پر ہے کہ اس کے لیے عام لوگوں میں کتنی قبولیت ہے۔

مکمل بادشاہت اور جمہوریت کے درمیان کا عبوری زمانہ تہذیب کے تیسرے دور کی ایک اور سرگزشت ہے، میگنا کارٹا جس پر شاہ جان نے 1215 میں بغاوت پر آمادہ رئیسوں کی خوش نودی کے لیے دستخط کیے تھے، اب اس سے ایک ایسے نظام حکومت کی جانب پیش رفت کا آغاز ہوا، جسے عام لوگوں کے آگے جواب دہ ہونا تھا۔ یورپ کے بادشاہ اپنے پُرآسائش محل تعمیر کرنے اور خاندانی جنگیں لڑنے کے لیے کثیر رقم اکٹھا کرنا چاہتے تھے اور اس لیے ضروری تھا کہ ٹیکس کی شرح بڑھا دیں یا متمول تاجروں اور بنکوں سے قرضے لیں۔ پارلیمانی ادارے بھی اس غرض سے بنائے گئے کہ ان کی مدد سے ٹیکس اکٹھا کرنے میں سہولت ہو۔ یہ پارلیمنٹ اس سے پہلے ان لوگوں کی اسمبلیاں تھیں جو اپنے اپنے علاقے کی نمائندگی کرتے تھے اور اپنے لوگوں کے ٹیکس ادا کرنے کی صلاحیت کا تخمینہ لگاتے تھے۔ بادشاہ کو جب مزید رقم کی ضرورت ہوتی تو پارلیمنٹ کا اجلاس بلا لیتا۔ اور اس ادارے کو انکار کا کسی قدر اختیار حاصل تھا۔ البتہ سترھویں صدی میں جب کراموئیل کی فوجوں نے شاہ پرستوں کو شکست دے دی اور چارلس اوّل کا سر قلم کر دیا گیا، اُس زمانے سے پارلیمانی حکومت نے برطانوی بادشاہ کے اختیارات میں مداخلت شروع کر دی۔ ایک ایسا ہی عمل فرانس میں 1790 کے عشرے میں ظاہر ہوا جب لوئی شانزدہم کے اسٹیٹس جنرل نے اس کے اجلاس طلب کیے جانے پر اقتدار کلیتاً سنبھال لیا۔ امریکا میں اسی دور میں ایک نئی حکومت قائم کی جا رہی تھی جس میں بادشاہ کی جگہ ایک منتخب صدر نے سنبھال لی۔

عالمی تاریخ کے پہلے دور میں جس طرح آباد بستیوں پر خانہ بہ دوشوں کے حملے اکثر و بیشتر رونما ہوتے رہتے تھے، اسی طرح تیسرے عہد کی تاریخ کی ایک نمایاں خصوصیت وہ سیاسی نشیب و فراز ہے، جسے تاریخ والوں نے ''انقلاب'' کہا ہے۔ جب روس کے زار نے اور مانچو چین نے سترھویں صدی میں خانہ بہ دوش گلہ بانوں کی چراگاہوں کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا تو تہذیب یافتہ معاشروں کو باہر کے وحشی قبائل کے حملوں کا ڈر کم ہو گیا، بلکہ عملاً ختم ہو گیا۔ نئے

وحشیوں سے خطرہ خود ان کے اندر پیدا ہونا شروع ہوا۔ تجارت کی یہ دولت ترقی کرنے والے یورپ کے معاشروں میں، بعض طبقات کے درمیان اقتصادی اور سماجی طور پر فاصلے پیدا ہونے لگے۔ ''کم تر'' طبقات جو معاشی طور پر دبے ہوئے اور اپنی حالت سے نامطمئن تھے، وہ اپنی طاقت سے سماجی استحکام کے لیے خطرہ بن گئے۔ یورپ کی سلطنتوں کا ان نوآبادیاتی اقوام سے تصادم ہوا، جو اپنی سیاسی آزادی سے محروم ہو گئے تھے۔ تہذیب کے تیسرے عہد میں ان دو طرح کی شکایات نے باہم مل کر نئی طرح کی ''بربریت'' کو جنم دیا۔ یورپ کی عالمی سلطنت کے اندر نامطمئن عوام گروہ در گروہ معاشرے کو مختلف انداز سے للکار رہے تھے۔ ان متعدد سیاسی اور سماجی انقلابات نے تہذیب یافتہ دنیا کو سر کے بل کھڑا کر دیا تھا۔

ان انقلابات میں یہ مثالیں شامل ہیں: سولھویں صدی میں سپین کے خلاف ہالینڈ کی بغاوت، سترھویں صدی میں انگریزوں کا پیورٹن انقلاب، اٹھارھویں صدی کے اواخر میں امریکا اور فرانس کے انقلابات اور بیسویں صدی میں روس اور چین کے انقلابات (ملاحظہ کیجیے جدول 6.3)

تیسرے تہذیبی دور کے انقلابات

ملک	بادشاہ کا قتل	جمہوریہ کا قیام	مذہبی آزادی	نوآبادیات کے خلاف	طبقاتی جنگ
نیدرلینڈز (بلجیم سویڈن، ہالینڈ)	نہیں	ہاں	ہاں	ہاں	نہیں
برطانیہ	ہاں	ہاں	ہاں	نہیں	ہاں
فرانس	ہاں	ہاں	ہاں	نہیں	ہاں
روس	ہاں	ہاں	نہیں	نہیں	ہاں
چین	نہیں	ہاں	نہیں	ہاں	ہاں

ان سب میں اقتدار کے خلاف بغاوت کے عمل میں خون ریزی ہوئی۔ اقتدار پر قبضہ کرنے میں سبھی کامیاب رہے۔ برطانیہ کے پیورٹن اور فرانس کے انقلابات میں بالآخر یہ ہوا کہ اقتدار لیڈر کی موت کے بعد پھر گزشتہ نوعیت کے حکمرانوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ چین کے سوا تمام انقلابات کا رخ بادشاہت کے ادارے کے خاتمے کی طرف تھا، برطانیہ فرانس اور

روس کے انقلابات میں قانونی حکمران کو قتل کر دیا گیا۔ بعض حالات میں بادشاہت کی جگہ پارلیمانی حکومت نے لے لی، دوسری صورت میں آمریت آ گئی۔

ہالینڈ اور برطانیہ کے انقلابات میں مذہبی آزادی کی امنگوں کا بھی ایک کردار تھا۔ دوسری جانب فرانس کے انقلابی مذہب اکابر کے خلاف تھے۔ روس اور چین کے مارکسسٹ لامذہب تھے۔ اس نشیب و فراز میں مذہبی مسائل کا کردار عام طور پر کم ہی تھا، کیوں کہ اب جو فت آیا تھا اس میں اقتصادی مسائل بتدریج اہمیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔

ہالینڈ، امریکا اور چین کے انقلابات دراصل نو آبادیاتی نظام کے خلاف تحریکیں تھیں۔ سپین کے خلاف ہالینڈ کی بغاوت میں یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ ایک کیتھولک سلطنت میں پروٹسٹنٹ مذہب کے لیے رواداری برتی جائے، آئینی حکومت قائم کی جائے اور مقامی آبادی کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ اس بغاوت کے نتیجے میں ہالینڈ کی ایک آزاد جمہوریہ وجود میں آئی۔ امریکا کے انقلاب نے ایک حاکمانہ نو آبادیاتی حکومت کی مخالفت کی اور نمائندگی کے بغیر ٹیکس لگانے کو بلا جواز قرار دیا۔ اس مثال کی روشنی میں اس کے رہنماؤں نے ایک آزاد جمہوریہ قائم کی۔ دونوں نے تاجر طبقے کے مفادات کی تائید کی اور اس طبقے کے مقاصد کو آگے بڑھایا۔ دوسری طرف چینی انقلاب میں مارکسی انقلاب کا اشرافیہ مخالف رویہ، مغربی اثر و رسوخ سے انکار اور جاپان کی بادشاہت سے ہونے والی جنگ کے عناصر شامل تھے۔ تینوں انقلابات، ہر ایک ملک میں داخلی بغاوتیں تھیں۔ انگریزوں کے پیورٹن ریوولیوشن میں ایک جدوجہد تو مذہبی آزادی کے لیے تھی، دوسری پارلیمانی حکومت کے فروغ کے لیے تھی۔ انہی میں شامل ایک عنصر سماجی مساوات کا تھا۔ فرانس کے انقلاب نے تیسری ریاست کے ابھرتے ہوئے مقاصد کو آگے بڑھایا، اس تیسری ریاست میں تاجر، مزدور اور کسان شامل تھے۔ وہ جاگیردارانہ مراعات کے خلاف تھے جو اشرافیہ کو اور ساتھ ہی عیسائی پادریوں کو حاصل تھیں۔ 1917 کا روسی انقلاب مسلسل جنگ سے اکتائے ہوئے لوگوں کی بغاوت تھی، جنہیں ایک نظریاتی پارٹی کے پختہ کار اور سوشل ازم کے حامی سیاسی کارکنوں نے اکسایا تھا۔

گزشتہ تہذیبی دور کے احساسات، یہ خیال کہ نچلے متوسط طبقے کے لوگ غیب کی مقرر کی ہوئی حکومتوں کے خلاف ہول ناک بغاوت کر دیں گے، رسوا کن ثابت ہوا، صدمے کی بات یہ تھی کہ اس طرح کی بغاوتوں میں قانونی حیثیت کے حامل بادشاہوں کو بھی سزائے موت

دے دی گئی۔ ایک بار جب مقتول بادشاہ کے بیٹے چارلس دوم کو برطانوی تخت دوبارہ حاصل ہو گیا تو اس کے پیورٹن، بادشاہوں کی گردنیں اڑانے والے بدترین مجرم ثابت ہوئے، تاہم تاریخ کا فیصلہ اس حقیقت سے آلودہ ہے کہ وہ انقلابات کامیاب تھے۔ تاریخ چونکہ فاتحین لکھتے ہیں، اس لیے اپنی خون ریزی اور غیر قانونی افعال کو اپنے مرغوب انقلابی اصولوں کی آڑ میں بہت کم کرکے دکھاتے ہیں۔ انگریزی پیورٹن مذہبی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ امریکی انقلاب کے جاں باز سپاہی ایک غیر منصفانہ نوآبادیاتی حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ فرانس کے انقلابی حقوقِ انسانی کی سربلندی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ انقلابات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خون ریزی اور بدنظمی اُس وقت الجھن میں ڈال دیتی ہے، جب اس سارے عمل کو اعلیٰ آدرشوں کو ملا کر دیکھتے ہیں۔ سماج کے ایرے غیرے اور اٹھائی گیرے، جنہوں نے اپنے سربراہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، وسیع تر معنوں میں انہوں نے بھی انسانی ترقی میں اپنا حصہ ادا کیا۔

مغرب کی نوآبادیات کا منکشف ہونا

تاریخ کے عہد اکثر جن مسائل و افکار کے ساتھ اپنا آغاز کرتے ہیں، پھر بیشتر انہی سے پلٹ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر تیسرے عہد کا آغاز تین نہایت مضبوط یورپی بادشاہتوں کے ساتھ شروع ہوا تھا، (بشمول بابر اور سلیمانِ اعظم) اس عہد کا اختتام یورپ میں مطلق العنان بادشاہت کے خاتمے سے ہوا۔ سونے اور مادی دولت کی طلب نے بالآخر انیسویں اور بیسویں صدی میں اشرافیہ کے مخالف ذہنی رویے کا راستہ ہموار کیا۔ یہی دور یورپ میں بحری سفر اور نئی سرزمین کی دریافت سے شروع ہوا، نوآبادیاتی حکومتیں قائم ہوئیں اور مقامی آبادیوں کو محکوم بنایا گیا۔ اسی عہد نے نئی دنیا میں نسلی بنیاد پر غلامی کو رواج دیا۔ اگر تہذیب کا تیسرا عہد یورپ کی بالادستی سے شروع ہوا تو یہ بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کا خاتمہ اس سے بالکل مختلف صورتِ حال میں ہوگا۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے، بیسویں صدی کے آخری دور میں ''مغربی سامراج'' کے خلاف غم و غصہ غیر مغربی دنیا میں شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اب سے پانچ سو برس قبل جب پہلے افریقی غلام کو امریکا لے جایا گیا تھا، تب سے بہت سے غلاموں کی اولادیں پوری سفید فام تہذیب اور اس کی ثقافت پر اور تاریخی اعتبار سے گزشتہ دور کے عوام پر ہونے والے مظالم کے

خلاف ان سفید فاموں پر لعنت بھیجتی ہیں۔

آج جو یورپ مخالف رویے نظر آ رہے ہیں، وہ اس حقیقت کا ردِعمل ہیں کہ تیسرے عہد کی تاریخ کا جھکاؤ غیر معمولی طور پر یورپ کے تجربات کی طرف رہا ہے۔ ایک وقت تھا جب سفید فام یورپی فاتح ساری دنیا میں تہذیب پھیلانے والے تھے۔ ان کا سیکولر کلچر جس میں ہر طرح کے تجربات کو سمیٹنے کی صلاحیت تھی، نشاۃ الثانیہ سے شروع ہوا، اور وہی عالمی کلچر بن گیا۔ یہ فطری بات ہے کہ دنیا کے وہ بیشتر لوگ جو یورپی نہیں ہیں، اس بات کو اپنے لیے اجنبی محسوس کریں گے اور اس سے ان کے اندر مخاصمت پیدا ہو گی۔ یورپ والوں نے اپنی اعلیٰ ترٹیکنالوجی اس کے ساتھ ہی بے انتہا حرص اور اس فوجی جذبے کے ساتھ جو صدیوں تک مسلمان افواج سے لڑنے کے دوران میں پیدا ہوا تھا، دوسری اقوام کی زمینوں کو فتح کیا۔ یورپی حملوں کی پہلی لہر میں سپین اور پرتگال شامل تھے، ان کے حملوں کا محرک جزوی طور پر مذہبی فتوحات تھیں۔ چونکہ انہوں نے مسلمانوں کو حال ہی میں شکست دی تھی، لہٰذا وہ مذہبی جنگوں میں بہت قریب تھے۔ اس کے بعد پہل کاری کا عمل ہالینڈ اور برطانیہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ اب کے ان جنگوں میں تجارت کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ یہ لوگ تاجر تھے اور مہم جوُ تھے۔ اس کے ساتھ ہی عیسیٰ کے مشنری بھی تھے، جو تجارت کے ذریعے دولت مند ہونا چاہتے تھے، ان کے زیر حکومت تجارت کا کلچر خوب پھولا پھلا۔

یورپ نے تلاش اور دریافت اور تجارت کی جس مہم کو آگے بڑھایا، ظاہر ہے اس کے پیچھے طاقت کا عنصر بھی کام کر رہا تھا۔ یورپ کے ان مہم پسندوں کے پاس بندوقیں اور توپیں تھیں، قوانین تھے، تحریر کی زبان تھی اور سمندروں میں سفر کرنے والے جہاز تھے۔ میکسیکو اور پیرو کی شاندار فتوحات کے بعد دونوں امریکا میں جہاں کم آباد رقبے بھی دور دور تک نظر نہیں آتے تھے، انہوں نے آباد کاری شروع کی۔ انگریزوں نے اپنے ٹیکس اکٹھا کرنے والے بندوبست کو جو مغل سلطنت سے جڑا ہوا تھا، برصغیر ہند میں بادشاہت سے تبدیل کر دیا۔ انہوں نے پہلے تو سکھ حکومت ساز رنجیت سنگھ سے معاہدہ کیا کہ وہ دریائے ستلج کو دونوں حکومتوں کے درمیان حد تسلیم کریں گے اور اس کا احترام کریں گے۔ پھر ایک نسل گزر جانے کے بعد برطانیہ نے 1845 اور 1849 کے درمیان پنجاب کی سکھ حکومت پر قبضہ کر لیا۔ روس اور ترکی کے درمیان 74-1768 کی جنگ میں روس کی مغربی طرز کی فوج نے عثمانی ترکوں کو فیصلہ کن شکست

دی۔ اس کے ردِعمل میں سلطان سلیم سوم نے اپنی مسلح افواج کو جدید خطوط پر منظم کرنے کے لیے اسی طرح کے اقدامات کیے۔ نپولین کی افواج نے مصر کو فتح کر لیا اور پھر واپس آ گیا۔ محمد علی، سلطنت عثمانیہ کے وائسرائے کے طور پر مصر میں برسر اقتدار آیا۔ برطانیہ اور فرانس نے عثمانیوں کی قیمت پر اسے شام اور فلسطین پر قبضہ کرنے سے باز رکھا۔ برطانیہ نے بعدازاں اس علاقے میں سوڈان کو شامل کر کے ایک پروٹکٹریٹ (زیر تحفظ علاقہ) قائم کر دیا۔ فرانسیسی 1830 تک الجزائر پر قابض رہے۔ انگریزوں نے چین کے ساتھ 1839-42 کی جنگ افیون کے بعد ہانگ کانگ میں اپنی کالونی قائم کر دی۔

انیسویں صدی، یورپی نیشنل ازم کا سنہری زمانہ تھا۔ سال کے ان عشروں میں نپولین کی افواج نے برطانیہ، آسٹریا، پرشیا، سپین اور روس کی افواج سے پے در پے جنگیں لڑیں۔ ان مختلف قوموں کو ان جنگوں میں احساسِ تفاخر پیدا ہوا کہ انہوں نے ایک عظیم فرانسیسی جرنیل کو شکست دی۔ جرمنی کے باشندوں میں یہ احساس فتح مندی کچھ زیادہ ہی تھا۔ جرمنی کے موسیقاروں، فلسفیوں، سائنس دانوں اور شاعروں نے اس دور میں تہذیبی سربلندی حاصل کی۔ جرمن ادب کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اس دور کا روپ تخلیقی طور پر بہترین اور فرانسیسی ادب کے اثرات سے پاک تھا۔ اس طرح کا رویہ امریکا کے جواں سال کلچر میں نفوذ کر گیا تھا۔ روس کے ناول نگار اور سمفنی مرتب کرنے والوں نے اس زمانے میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کیا اور مختلف اصناف میں کلاسیک پیدا کیے۔ اطالوی قوم پرستی کا اظہار ورڈی اور بیکی نی کے اوپیرا میں اور گیری بالڈی جیسے سیاست دان کی فکر میں ہوا۔ یونانیوں نے اپنی قومی آزادی کی خاطر سلطنت عثمانیہ سے جنگ کی۔ اس صدی کے اوائل میں ہیٹی کے گوریلا سپاہیوں نے توسینٹ، ایل اوورفر (Toussaint L'Ouverfure) کی زیر قیادت نپولین کے شکستہ دستوں کو ہرا دیا۔ سائمن بولیور اور جوزی ڈی کان مارٹن نے جنوبی امریکا میں سپین کی نوآبادیاتی حکمرانی ختم کر دی۔ امریکی سول وار (خانہ جنگی) کے دوران میں میکسیکو میں ایک فرانسیسی حکومت قائم کرنے کی کوشش ہوئی تھی، لیکن اسے ناکام بنا دیا گیا۔

قوم پرستی دوسری غیر مغربی اقوام میں بھی بیسویں صدی کے اندر پھیل گئی۔ 1905 میں روس پر جاپان کی فوجی فتح نے ایشیائی اقوام کو یہ دکھا دیا کہ ایک بڑی یورپی طاقت کو بھی شکست دی جا سکتی ہے۔ یہ بات تو اس وقت مزید واضح ہو گئی جب یورپی معاشرے نے پہلی

عالمی جنگ کے میدان میں اپنے بہترین نوجوان قربان کر دیے۔ ورسیلز کی امن کانفرنس میں وڈرو ولسن نے چودہ نکات پیش کیے۔ یہ ایک بیان تھا جس میں اقوام کے حق خود اختیاری کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی میں قوم پرستی کا ابال آ گیا اور کمال اتاترک کی قیادت میں ''ینگ ترک'' تحریک شروع ہوگئی۔ سن یات سن کی زیر قیادت قوم پرستوں نے چین میں ایک جمہوری قوم کی تعمیر کی کوشش کی۔ ہندوستان میں موہن داس گاندھی سے برطانوی راج کے خاتمے کے لیے عدم تشدد پر مبنی احتجاج شروع ہوا۔ یورپ کی دوسری عالمی جنگ کے اندر لہو میں نہانے کا ایک اور تجربہ ہوا۔ اس وقت نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف تحریک صحیح معنوں میں شروع ہوگئی تھی۔ برطانیہ اور فرانس اپنی سلطنت میں نوآبادیات سے دست کش ہو گئے تھے۔ فلپائن کو امریکا نے اور انڈونیشیا کو ہالینڈ نے آزاد کر دیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان 1947 میں خود مختار حکومتیں بن گئے۔ ایک سال بعد فلسطین میں ایک آزاد یہودی ریاست وجود میں آئی۔ کمیونسٹ فوجوں نے قوم پرست چینیوں کو نکال باہر کیا۔ 1960 کے عشرے میں ماضی کی نوآبادیات سے بہت سی نئی افریقی قومیں وجود میں آئیں۔ ویت نام کے کمیونسٹوں نے انڈونیشیا سے فرانس اور امریکا کی فوجوں کو نکال دیا۔

مادیت پرستی اور افتراق

تہذیب کے تیسرے عہد میں ایک نئی طرح کے فلسفے کا تصور سامنے آیا۔ ''مادیت'' کا فلسفہ تمام جدید سماجی سائنسوں کی ماں ہے۔ اس مہم میں ایک کلیدی شخصیت سکاٹ لینڈ کے ایک فلسفی اور تاریخ دان ڈیوڈ ہیوم کی تھی، جو اقتصادیات کا ایک اہم عالم تھا اور آدم سمتھ جیسے عالم کی ذہنی تربیت اس نے کی تھی۔ دوسرے مادہ پرست فلسفیوں کی طرح ہیوم کی فلسفیانہ فکر یہ تھی کہ انسان کا ذہن ایک مشین کی طرح ہوتا ہے۔ جہاں افلاطون نے یہ درس دیا تھا کہ خیالات حقیقی وجود رکھتے ہیں اور فطری دنیا کی تخلیق انہی سے ہوتی ہے، مادہ پرست فلسفیوں کا مؤقف یہ تھا کہ خیالات ذہنی عمل کی پیداوار ہوتے ہیں۔ دماغ کچھ عملی مراحل سے گزرتے ہیں، جو یہ بتاتے ہیں کہ انسان کیسے سوچتا ہے۔ ڈسکارٹس (Descartes)، سپنوزا (Spinoza) اور لیبنز (Leibnitz) کے افکار نے جنہیں بعض اوقات ''عقلیت پرستانہ فلسفے'' کہا گیا ہے، برطانوی عقلیت پرستوں کی راہ ہموار کی، جنہوں نے معروضی سوالات پر اور

بھی تابڑتوڑ حملے کیے۔ ان کے نزدیک آگہی کا بنیادی وسیلہ اعداد وشمار تھے۔ خیالات دنیاوی تجربے کی فطری پیداوار تھے۔ خیالات کی مجرد حیثیت ختم ہوگئی۔

جب رومان پرستی کی آگ ذرا ٹھنڈی ہوئی تو انیسویں صدی کے یورپی قلم کاروں نے ادب وفن میں حقیقت نگاری پر توجہ دی۔ اب وہ جذباتی پیرایۂ اظہار جس میں حسن اور خیر کا بیان ہوتا، رخصت ہوگیا۔ اب عام لوگ برہنہ اور بدصورت حقیقت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ چارلس ڈکنز اور وکٹر ہیوگو کے ناولوں میں نادار بستیوں کی زندگی تفصیل سے بیان کی گئی۔ حقیقت پسند فنِ مصوری کے مشہور آرٹسٹ فرانس کے گستادے کوربیٹ اور جین فرانکوئس ملٹ تھے۔ یہ زمانہ کارل مارکس اور چارلس ڈارون کا تھا۔ ان کی تخلیق نگاری میں بنیاد کو اہمیت حاصل تھی۔ پھر جب فوٹوگرافی ایجاد ہوگئی، دماغ سے عاری مشینیں دنیاوی مناظر کو اس طرح دکھاتی تھیں کہ برہمن آرٹسٹ بھی حقیقت نگاری میں مشینوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ ان کیمروں سے متاثر ہوکر ڈیگاس جیسے مصوروں نے ایسے مرقعے پیش کرنے شروع کیے، گویا انہیں غیر متوقع زاویوں سے دیکھا ہو۔ تاثر پسند مصوروں نے صاف وصریح اشیا کو تصویر کرنا چھوڑ دیا، اس کی بجائے انہوں نے کینوس پر رنگین لفظوں سے سورج کی کرنوں کا تاثر ابھارا کہ کوئی تصویر سورج کی روشنی میں کیسی نظر آئے گی۔ روایت شکن مصوروں نے نئے تجرباتی مکاتیب وضع کیے، جن میں کیوبزم، سرّیل ازم اور ڈاڈا ازم نمایاں ہیں۔

یہ سارے "جدید آرٹ" پہلی عالمی جنگ شروع ہونے سے ذرا قبل سامنے آچکے تھے۔ ان بے ہنگم اشکال میں جو مفروضہ خوبصورتی پوشیدہ ہوتی، عام لوگ ان کی تہہ داری کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ پکاسو کی بدہیئت تصویریں، کارل یونگ کی ان ذہنی "جراحتوں" کی یاد دلاتیں، جنہیں اس نے اپنے پاگل مریضوں میں دیکھا تھا۔ شاعر ایٹس نے یہ اندیشہ بیان کیا کہ "اشیا اپنی جگہ سے ٹوٹ کر الگ ہوجائیں گی۔ مرکز انہیں جوڑ کر نہ رکھ سکے گا۔" فن کارانہ اظہاریوں کو دلآویز پیرایے میں اس طرح جوڑ دیا جاتا تھا کہ بہ ظاہر ان کی کوئی شکل نہیں بنتی تھی۔ اسے محض اتفاق نہیں سمجھنا چاہیے کہ معمے (کراس ورڈ پزل) اس زمانے کی اختراع تھے۔ ایسے کھیلوں میں الفاظ مشینی انداز سے اس ترتیب کے ساتھ رکھ دیے جاتے تھے کہ ان کا کسی طرح کا حوالہ نہیں بنتا تھا۔ یا کسی طرح کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فن کار عام لوگوں کو طعنے دے رہا ہو، کہ ہو سکے تو اس کے کام سے کوئی معنی پیدا کرو۔ نشاۃ الثانیہ کے دور میں جو

خوبصورت فن پارے تیار کیے گئے تھے، جن کی اشکال کو مکمل گولائی میں تیار کیا جاتا تھا اور ان میں رنگ بھرے جاتے تھے، موجودہ دور میں فن کاری اس سے یک سر مختلف تھی۔ یہ علامات تھی ایک عہد کے خاتمے کی، جس کا کلچر آج ''تہذیب'' کے ہم معنی نظر آتا ہے۔

ساتواں باب

چوتھی تہذیب کی مختصر تاریخ

برطانیہ کے جارج پنجم کی سب سے بڑی بیٹی کو یاد آیا کہ اس کے والد کو گویا پیدائشی طور پر ہر طرح کی تبدیلی سے نفرت تھی۔ اس نے بتایا کہ جنگ کے بعد کی دنیا ان کے لیے نہایت مکروہ اور نفرت انگیز تھی۔ انہوں نے سوویت روس کو ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ ناخنوں پر پالش، اعلانیہ سگریٹ پیتی ہوئی عورتیں، کاک ٹیل اور بھڑک دار ہیٹ، انہوں نے ان سب کو مان کے نہیں دیا۔ اس طرح امریکی جاز موسیقی اور ہر ہفتے کے اختتام پر سیر کے لیے باہر نکل جانا، یہ بھی ان کے لیے قابل قبول نہ تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد، کہ اس کی لائی ہوئی تباہی اور خون ریزی سے لوگوں کے ذہن سن ہو گئے تھے، دنیا کے لوگ اب ایک مختلف تجربے سے دوچار ہوئے۔ اب ہوا ہلکی اور لطیف تھی۔ اس عہد کے لیے ایک مختلف طرح کا احساس، غیر سنجیدہ اور معمولی سا، ذہنوں میں جگہ پا رہا تھا۔ اچانک انسانی شعور پر جدت کے احساس نے دستک دی۔ گھوڑے گاڑیوں کی جگہ کاریں لے رہی تھیں۔ پہلے ریڈیو اسٹیشن نے اپنی نشریات کا آغاز کر دیا تھا۔ عظیم جنگ کے بعد کے برسوں میں رنگا رنگ تفریحی پروگرام شروع ہو گئے۔ نیو اورلینز کے جاز، کورلس کے نغمے اور ایک نئی طرح کی تفریح، جسے مووی کہا جاتا تھا، لوگوں کی دلچسپی کے لیے آ گئے تھے۔ اپنے انداز میں، سنجیدگی سے دور، یہ ایک مقبول عام کلچر کا زمانہ تھا۔ انیسویں صدی میں جب اعلیٰ درجے کے کلچر نے غلبہ حاصل کیا تھا، اس کے برعکس یہ ایک مقبول عام کلچر کا دور تھا، جو عام لوگوں کے لیے بہت سکون بخش تھا۔ تہذیب کا چوتھا عہد اس طرح آیا کہ گزشتہ کلچر کا ملبہ بھی اس کے ساتھ تھا، جب یہ نظر آتا تھا کہ مغربی معاشرہ خودکشی کرنے جا رہا تھا۔ خون ریز عالمی جنگ، ٹائٹانک کا سمندر میں غرق ہونا، موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں اختلاف

اور بہ اعتبار مجموعی پرانے نظام کے زعم باطل کی نمائش نے اس بے ساختہ خواہش کو جنم دیا کہ تاریخ کے اس راستے سے ایک جست لگا کر الگ ہو جائیں اور کوئی مختلف قرینہ اختیار کریں۔ یورپ میں پرانی عداوتیں مسلسل بھڑک رہی تھیں۔ ورسیلز کے صلح نامے میں جرمنی پر جو کڑی پابندیاں لگائی گئی تھیں، اس کے نتیجے میں ہٹلر برسر اقتدار آ گیا۔ میسولینی اور اس کے فاشسٹ حامیوں نے پارلیمنٹ میں اپنے مخالف ارکان کو ڈرا دھمکا کر تابع دار بنا لیا تھا۔ بالشویک پارٹی کے ارکان نے اس دعوے کے ساتھ کہ ان کے ''دشمن تاریخ کے کوڑے دان کے حوالے کر دیے جائیں گے،'' روس میں ایک بغاوت کھڑی کر دی۔ مختلف انداز کے خشم گین نظریات نفاست و شائستگی کو ختم کیے دے رہے تھے۔ تہذیبی انحطاط اور معاشی بحران نے معاشرے کو اس کی جڑوں سے ہلا دیا تھا۔ دوسری طرف امریکا میں عام لوگ غیر معمولی خوش حالی کے دن گزار رہے تھے۔ یونہی کبھی کبھار قانون سے انحراف کی شکایت سننے میں آ جاتی، مثلاً نشہ آور مشروبات پر پابندی کے قانون کی خلاف ورزی، ہارلم سے آنے والے نئے رقص کے فیشن اور فلمیں۔ امریکیوں نے لینن کے معاندانہ اور فکری طور پر پُرغرور پیغام کو رد کر دیا اور اپنی روش میں پہلے سے زیادہ کھل گئے۔

اس تاریخ کے بیان کرنے میں چند مشکلات

تہذیب کے چوتھے عہد کے بیان کرنے میں چند خصوصی نوعیت کی دشواریاں درپیش ہیں۔ تفریح کا عنصر اپنی سرشت میں مختلف افراد کے لیے مختلف طریقوں سے پُرکشش ہوتا ہے۔ دلچسپیوں کی نوعیت اتنی مختلف ہے کہ تاریخ دانوں کے لیے کسی ایک طرح کے واقعات کا ادراک بہت مشکل ہوگا، جسے پوری جمعیت کا تجربہ مان لیا جائے۔ ایک قرین عقل طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ناظرین کی تعداد کی بنیاد پر کسی تفریح کا انتخاب کر لیا جائے۔ لہٰذا کلچر کی تاریخ میں چند انتہائی مقبول ''شوز'' کی تفصیل شامل کرنی ہوگی۔ بیشتر تاریخی واقعات کے برعکس، تفریح کے کلچر میں اسٹیج کی پروڈکشن اور مووی تھیٹر میں، یا مختلف جگہوں پر بیٹھے ہوئے ٹی وی کے ناظرین کے تجربے شامل ہیں۔ مثال کے طور پر 17 دسمبر 1969 کی ایک شام امریکیوں کی کثیر تعداد ٹائنی ٹم، مس وکی بڈنگر کی شادی کو ''ٹونائٹ شو'' میں دیکھنے کے لیے امنڈ پڑی تھی۔ تفریحی شو کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بہت حد تک ٹیلی وژن کے کسی دلچسپ پروگرام کے نشریے میں، جس کے ناظرین جغرافیائی طور پر دور تک پھیلے ہوئے ہیں، کیا انہیں اسی طرح ایک ''ایونٹ'' شمار کیا جائے گا، جیسے اس سال سے ذرا پہلے میکس اسگور کے فارم پر ہونے والا

''وڈ اسٹاک'' راک کنسرٹ تھا؟

لہٰذا تفریحات کی تاریخ میں ان خاص شباہتوں اور آوازوں کا حوالہ بھی شامل ہوگا، جنہیں ناظرین نے بہ غور دیکھا۔ ہر جگہ کا اپنا داخلی تجربہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میجر لیگ بیس بال کی تاریخ میں 1956 کی ورلڈ سیریز کے اندر ڈان لارنس کا مکمل کھیل بھی شامل ہوسکتا ہے، جو نہایت سنسنی خیز تھا۔

کھیلوں پر لکھنے والے وقائع نگاروں کے پاس ہر کھیل کے یادگار واقعات کی فہرست یقینی طور پر موجود ہوتی ہے، تاہم بیشتر لوگ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ بیس بال کے میجر لیگ کی تاریخ بھی، اس کے تجربوں کے ساتھ اس میں شامل ہونی چاہیے۔ صرف میجر لیگ بیس بال پر کئی عدد جلدوں پر مشتمل تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔

لیکن تفریحات کے کلچر میں اس سے کہیں زیادہ معاملات شامل ہیں۔ اس میں ڈراما، کھیل، مقبول عام (پاپ) میوزک، رقص، چلتی پھرتی کامیڈی، ہیجان خیز یا عریاں اجسام کی نمائش، یہ سب شامل ہیں۔ ان سب کے علاوہ، وہ شے جسے ہم خبر یا ''نیوز'' کہتے ہیں رفتہ رفتہ کرکے اسے بھی تفریح کے دائرے میں شامل کیا جانے لگا ہے۔ جس طرح شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کی کہانی سادگی کے ساتھ بیان کر دی جاتی ہے، کھیل اپنی خصوصیات کی بنا پر ایسے نہیں کہ ان کی تفریحی نوعیت کو آسانی سے بیان کر دیا جائے۔ ہر ایک کھیل اور اس کے میدان کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ امریکا جیسے وسیع اور بھرے پرے معاشرے بھی تفریح کے تجربوں کی ایک متعین کیفیت ہوگی، غیر حقیقت پسندانہ ہوگا۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ ہر معاشرے یا قوم کے اپنے مشاغل ہوتے ہیں۔ ہندوستان، افریقا، لاطینی امریکا اور مشرقِ وسطیٰ کے باشندے ایک ہی طرح کی موسیقی، ڈرامے یا کھیل میں اس طرح دلچسپی نہیں لیتے ہوں گے جس طرح امریکا کے لوگ دلچسپی لیتے ہیں، ہر ایک کا مختلف مذاق اور بہلاوے کے طریقے ہیں، لہٰذا دنیا کی ایک تاریخ جس میں تفریحات کو نمایاں اہمیت دی گئی ہو، اس طرح مربوط اور مبسوط نہیں ہوگی، جس کی عام لوگ توقع کریں گے۔

دنیا کی تاریخ کو کہانیوں کے مجموعوں، بصری مرقعوں، موسیقی کے نمونوں اور ان یادگار عبارتوں کے ذریعے ہی پیش کیا جا سکتا ہے جو عوامی کلچر کی نمایاں خصوصیات ہیں، لیکن تاریخ کسی تسلسل کے ساتھ اگر محض سمعی و بصری سحر انگیز نمونوں پر مشتمل ہوتی تو بھی اس میں

قابل شناخت متن کی کمی محسوس ہوتی۔ فوٹو جرنلسٹ اکثر ایسے بصری نمونے پیش کرتے ہیں، جن میں وقت کی حیثیت جوڑنے والے عنصر کی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ٹی وی کی ایک دستاویزی فلم میں سال 1957 کے تجربوں کو جو امریکیوں کی زندگی میں آئے، ان مرقعوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی صدر آئزن ہاور وفاق کے فوجی دستوں کو لٹل راک اس لیے بھیج رہے ہیں کہ سکولوں میں نسلی تفریق کے خاتمے کا حکم بروئے کار لایا جائے، ایلوس پریسلے نغمہ سرا ہیں، مکی مینٹل یانکی سٹیڈیم میں تیز رفتاری سے دوڑ رہا ہے، روسی راکٹ خلا میں اسپوتنک بھیج رہے ہیں۔ اس سال کی گاڑیوں کے ماڈل نئے طرز کے آگئے ہیں۔ اس طرح تاریخ تمام نسلوں کا مشترکہ تجربہ بن جاتی ہے اور الگ الگ ہر عمر کے لوگوں کے لیے پُرکشش ہوتی ہے۔ ہر عشرہ اپنی خاص پاپ موسیقی، فیشن کے ملبوسات اور سیاسی قیادت ساتھ لاتا ہے۔ اب یہ ایک صحافی کا کام ہے کہ بامعنی انداز سے ہر عشرے کی خصوصیت متعین کرے اور یہ اندازہ لگائے کہ اس کے بعد کیا ہونے یا آنے والا ہے۔ چنانچہ امریکا میں سال کا دوسرا عشرہ جہاں ''رورنگ ٹوینٹیز'' (ڈانس گروپ) کا تھا، تیسرا عشرہ کساد بازاری کا تھا، چوتھا عشرہ جنگ کی نذر ہوا، پانچواں عشرہ نرم اور خوش حالی کی جانب بڑھتا ہوا تھا اور چھٹا عشرہ نوجوانوں کے کلچر اور جنگ کے خلاف باغیانہ فکر سے منسوب ایک طوفان خیز عشرہ تھا۔

لیکن کتابی تاریخ لازمی طور پر دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے۔ یہ کتاب آپ کو نہ صرف تفریحات کے بارے میں بلکہ جس ڈھانچے پر یہ قائم ہیں، ان کے متعلق بھی بتائے گی۔ مقبول عام تفریحات کی حیثیت ایک تجارتی صنعت کی ہے، لہٰذا اپنے پروگراموں کے مصارف پورے کرنے کے لیے اسے خاصی آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے مالی مصارف براہِ راست طور پر ٹکٹ فروخت کر کے یا بالواسطہ طور پر کمرشل اشتہاروں کے ذریعے اور اس نوعیت کے حیلوں سے مثلاً جوئے یا لائسنس یافتہ اشیا کی فروخت کے ذریعے پورے کر لیے جاتے ہیں۔ ایک اور معاملہ واقعات کو پیش کرنے سے متعلق ہے۔ کیا ناظرین ان سے براہِ راست لطف اندوز ہو رہے ہیں یا اس تفریح کا تجربہ ریڈیو، ٹیلی وژن، متحرک تصاویر یا کیسٹ ٹیپ کے ذریعے کر رہے ہیں؟ یہاں بھی سال گزرنے کے ساتھ معمولات بدل گئے ہیں۔ اس باب کی بیان کردہ تاریخ میں، امریکا میں تفریحات پر توجہ مرکوز کی گئی ہے اور گفت گو کو زیادہ طول نہیں دیا گیا اور اس حقیقت کا اقرار کیا گیا ہے کہ مواصلات کی ٹیکنالوجی نے امریکا کے تفریحی

پروگراموں کو دنیا میں دور دور تک پہنچا دیا ہے، دوسرے قومی کلچر سے زیادہ کھیلوں کا یہ کلچر ایک عالم گیر تہذیب کی بنیاد بن گیا ہے۔

شوقیہ اور پیشہ ورانہ کھیل

ورزشی کھیلوں کے مقابلے دنیا کے سبھی ملکوں میں عام لوگوں کی تفریح کا باعث ہوتے ہیں۔ سترھویں صدی میں جب نیو ایمسٹرڈم میں ہالینڈ نے نوآبادیات قائم کیں تو گھڑ دوڑ کا آغاز ہوا۔ ارل آف ڈربی نے1779 میں، جب انگلینڈ میں اپنی جاگیر اپسن ڈاؤنز کے مقام پر گھڑ دوڑ کی ابتدا کی تو یہ ایک سالانہ معمول بن گیا۔1823 میں جب لانگ آئی لینڈ میں ایک گھڑ دوڑ ہوئی تو اس کے تماشائیوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ امریکا میں کھیلوں کے مقابلوں میں تماشائیوں کی یہ سب سے بڑی تعداد تھی۔ گھڑ دوڑ کا باقاعدہ آغاز سارا توگا سپرنگس میں 1863 میں اور کنٹکی میں چرچل ڈاؤنز کے مقام پر1875 میں ہوا۔ امریکا کے بہت سے شہروں میں مرغوں کی لڑائی بھی لوگوں میں بہت پسند کی جاتی تھی، یہاں تک کہ1836 میں میسی چیوسٹس کے قانون کی رُو سے اس پر پابندی لگا دی گئی۔ ان لڑائیوں میں کثیر رقم داؤ پر لگا دی جاتی تھی۔ باکسنگ نے اس وقت ایک باضابطہ کھیل کی صورت اختیار کر لی، جب اٹھارھویں صدی میں اس کے لیے باقاعدہ قوانین نافذ کیے گئے۔ لندن میں ٹوٹن ہم کورٹ ووڈ کے قریب جیکب براؤٹن کی ملکیت ایک کھلی چھت کا اکھاڑہ نما تھیٹر تھا، جہاں انگریزی طرز کی باکسنگ ہوتی تھی۔1743 میں جب یہاں باکسنگ کے قوانین مرتب کیے گئے تو سو سال سے زیادہ عرصے تک ان پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ پھر1865 میں مارکوئس آف کوئنز بری نے نئے ضوابط نافذ کیے، جن میں کھلاڑیوں کے لیے دستانے رکھے گئے اور مقابلوں کو الگ الگ راؤنڈ میں تقسیم کر دیا گیا اور گرے ہوئے باکسر کو اٹھنے کے لیے دس سیکنڈ مہلت دی گئی۔ جان ایل سلوان اُس زمانے میں دنیا کا سب سے بڑا ہیوی ویٹ باکسر تھا، جو کھلی کلائیوں سے مقابلہ کرتا تھا۔ آخر وہ کوئنز بری قوانین کے تحت مقابلہ کرتے ہوئے جیمز کاربٹ سے ہار گیا۔

باکسنگ، کشتی، تلوار زنی، تیر اندازی، یہ سارے کھیل جن میں جسمانی شہ زوری یا اسلحہ کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے، مہارت کا تقاضا کرتے ہیں، جن کی ایک زمانے میں بڑی فوجی اہمیت تھی۔ گیارھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان انگریزی بادشاہوں کی طرف

سے اپنی رعیت کو یہ ہدایت ہوتی تھی کہ تیر اندازی سیکھیں۔ انگریزوں نے لمبی لمبی کمانوں کے ساتھ جو مہارت حاصل کی تھی، اس کی بنا پر انہوں نے فرانس کے خلاف سو سالہ جنگ میں متواتر کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ جوڈو اور کراٹے ایشیائی کھیل ہیں، جو مارشل آرٹس کہلاتے ہیں، لیکن کسی قدر مختلف انداز کے کھیل، چینیوں کے بودھ آرٹ جیو جِتسُو سے یہ کھیل نکلے ہیں، ان میں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کی مشقیں شامل ہیں، جو جاپان کے سمورائی جنگ جُو سپاہیوں میں بہت مقبول تھیں۔ ان میں فوجوں کو یہ دکھایا جاتا تھا کہ اپنے سے زیادہ طاقت وَر کا مقابلہ کرتے ہوئے فتح کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ کراٹے کے فن کو اوکیناوا میں اس وقت ترقی دی گئی جب وطن دوست عناصر نے بیرونی غلبے کی مزاحمت شروع کی۔ چونکہ جاپان کے فاتحین نے پابندی لگا دی تھی کہ وہ ہتھیار اپنے پاس نہیں رکھ سکتے، لہٰذا اوکیناوا کے حب الوطنوں نے رات کے وقت ایسے جسمانی حربوں کی مشق شروع کی، جن میں اسلحہ استعمال نہیں ہوتا۔ تاہم یہ کھیل محض دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں اور ان کے مقابلے بہت زیادہ انفرادی نوعیت کے ہوتے ہیں، نیز ان میں تماشائیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی۔ ایسے مقابلے، جن میں تفریح کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، ٹیم والے مقابلے ہیں۔ ان میں ٹیمیں علامتی طور پر خود کو ان جمعیتوں سے جوڑ لیتی ہیں، جن سے ان کا کوئی تعلق ہوتا ہے۔ فٹ بال ایک ایسا ہی کھیل ہے۔ زمانہ وسطیٰ میں، برطانوی دیہات کے باشندے اسے کھیلتے تھے، جس کی نوعیت ابتدائی ہوتی تھی۔ ان دنوں پورا گاؤں کھیل کا میدان ہوتا تھا۔ دونوں طرف سے لاتعداد کھلاڑی گیند کو کک لگا کر مخالف سمتوں میں گول کے اندر پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس میں دھینگا مشتی بہت ہوتی تھی، لہٰذا شاہ ایڈورڈ دوئم نے 1314 میں اس پر پابندی لگا دی۔ لیکن نوجوان اسے غیر رسمی انداز سے انیسویں صدی تک کھیلتے رہے۔ پھر اس کھیل کو انگلش پبلک سکولوں، مثلاً ایٹن، ہیرو اور رگبی، نے اختیار کر لیا۔ ہر سکول میں کھیل کا اپنا طریقہ تھا۔ فٹ بال کے معیاری ضابطے مقرر کرنے کا کام غالباً 1848 میں کیمبرج یونیورسٹی کی ایک کانفرنس میں ہوا۔ اس میں چودہ مختلف سکولوں کی نمائندگی ہوئی تھی۔ 1862 میں ایک اور کانفرنس ہوئی جس میں فٹ بال کے دس ضوابط منظور کیے گئے۔ یہی بعد میں کیمبرج یونیورسٹی فٹ بال رولز کے نام سے متعارف ہوئے۔ اکتوبر 1863 میں لندن کے علاقے سے فٹ بال کے کھلاڑیوں نے اولڈ فری میسن ٹیورن میں اکٹھا ہو کر فٹ بال ایسوی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح ایسوی ایشن فٹ بال یا ''ساکر'' کی رسمی طور پر تنظیم ہوئی۔

ساکر طلبہ کا ایک بول چال کا لفظ ہے جو... ایس، او، سی... انگریزی کے تین حروف سے مل کر بنا ہے۔ انگریز کھلاڑی اس کھیل کو لے کر دنیا میں پہنچے۔

فٹ بال کے ایک نوجوان کھلاڑی نے 1823 میں واروک شائر انگلینڈ کے رگبی سکول میں غیر ارادی طور پر ایک ایسی حرکت کی جس نے کھیل کا رخ ہی بدل دیا۔ ولیم ویب ایلس نے گیند کو پکڑ لیا اور تمام ضابطوں کے خلاف میدان کے اندر دور تک بھاگتا گیا۔ اس وقت فٹ بال کے ضابطوں میں صرف کک لگانے اور گیند کو اچھالنے کی اجازت تھی۔ لیکن ایلس کی یہ بے ضابطگی، ضابطے کے طور پر دوسرے سکولوں میں بھی پھیل گئی۔ چند دیگر طلبہ نے بھی فٹ بال اسی طرح کھیلنے کا فیصلہ کیا جیسے رگبی میں کھیلا گیا تھا۔ رگبی کی طرز کا فٹ بال اب صرف رگبی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے اپنے ضابطے بن گئے اور کھیلنے والے پیدا ہو گئے۔ 1872 میں اس کے اکیس کلب موجود تھے، جنہوں نے رگبی یونین بنا لی تھی۔ اس وقت تک رگبی شوقیہ کھلاڑیوں کا کھیل تھا۔ شمالی انگلینڈ کے صنعتی مزدوروں میں یہ کھیل بہت مقبول ہوا لیکن ایسے بہت سے کھلاڑی جو اپنے ملک کی طرف سے کھیلنے کے لیے بے چین رہتے ہیں، بلا معاوضہ چھٹی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ شمال کے ملکوں نے اپنے کھلاڑیوں کو سفر خرچ اور اجرت میں کٹوتی کی تلافی کے طور پر کچھ رقم دینی شروع کر دی۔ 1893 میں جب رگبی یونین کے سالانہ اجلاس میں کھلاڑیوں کو رقم دینے کا سوال اٹھایا گیا تو ایک ووٹ کے ذریعے اس طرح کی ادائیگی کی ممانعت کر دی گئی۔ دو سال بعد شمال کے رگبی کلبوں کے کئی مندوبین نے کھلاڑیوں کے لیے ادائیگی کی بنیاد پر اپنی الگ لیگ بنا لی، چنانچہ یہ شمالی یونین عملاً پیشہ ور کھلاڑیوں کی لیگ بن گئی۔

امریکا میں فٹ بال کا کھیل اسی رگبی سے نکلا ہے۔ 1869 میں جب رٹگرز اور پرنسٹن کے درمیان پہلا انٹر کالجییٹ فٹ بال ہوا تو یہ دونوں ٹیمیں ساکر ہی کھیل رہی تھیں، جس میں گیند لے کر بھاگنے کی ممانعت تھی۔ رگبی طرز کا فٹ بال امریکا میں کینیڈا کے راستے آیا۔ مئی 1894 میں ہاورڈ یونیورسٹی کے کھلاڑیوں نے مونٹریال کی میکگل یونیورسٹی کے کھلاڑیوں کو اپنے یہاں کھیلنے کی دعوت دی۔ کینیڈا والوں کے کھیل کو بہ غور دیکھتے ہوئے ہارورڈ کے کھلاڑیوں کو اندازہ ہوا کہ وہ ٹیمیں دو الگ الگ کھیل کھیل رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک سمجھوتا کیا۔ دونوں ٹیمیں کھیل کا پہلا نصف ہارورڈ کے قواعد کے مطابق اور دوسرے نصف حصے کا کھیل

میکگل رگبی کے قواعد کے مطابق کھیلیں گی۔ہارورڈ کے کھلاڑیوں نے یہ طے کیا کہ رگبی ان کے لیے زیادہ پسندیدہ ہے۔ چنانچہ امریکا کے کالجوں میں دیگر کھیلوں کے درمیان اسے بھی شامل کر لیا گیا۔اس کا پہلا کوچ والٹرکیمپ، امریکی فٹ بال کا بابا آدم شمار ہوتا ہے۔گیارہ رکنی ٹیم کا تصور اس نے دیا۔کھیل کے جدید طور طریقے اس کے وضع کیے ہوئے ہیں۔ جب کالج کے کئی طلبہ یہ کھیل کھیلتے ہوئے ہلاک ہو گئے تو صدر تھیوڈور روز ولٹ نے جانوں کی حفاظت کے طریقوں کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ایک کانفرنس طلب کی۔کھیل کے عین وسط میں دونوں طرف کے کھلاڑیوں کے جمگھٹے کو روکنے کے لیے والٹرکیمپ کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے فارورڈ پاس کی اجازت دے دی۔نوٹرڈیم کے نیوٹ راکنی نے1913 میں ایک فوجی ٹیم کو شکست دیتے ہوئے اس طریقے کو مقبول بنا دیا۔

ایک قابل احترام روایت یہ بھی ہے کہ ایک سول وار جنرل ابنر ڈبل ڈے نے 1839 میں کوپرسٹسن کے مقام پر امریکی بیس بال کا کھیل ایجاد کیا۔ یونین کی فوج کے سپاہی لڑائی کے وقفوں میں یہ کھیل تفریحاً کھیلتے رہے۔ جنگ ختم ہو گئی، تو یہ کھیل اپنے ساتھ لے گئے۔ تاہم ایک کتاب میں جو1834 میں شائع ہوئی، بیس بال سے ملتے جلتے ایک کھیل کے قواعد نظر آئے اور لکڑی کے چھاپے سے ایک تصویر بھی چھاپی گئی ہے، جس میں بوسٹن کامنز میں لڑکوں کو اسے کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس سے زیادہ امکان اس بات کا نظر آتا ہے کہ یہ کھیل ''راؤنڈرز'' سے لیا گیا ہے، جسے برطانوی سکولوں کے لڑکے زمانہ وسطیٰ سے کھیلتے آئے تھے۔ایک اور کھیل ''بوڑھی بلیاں'' تھا۔اس میں لکڑی کی ایک بلی چرخی کی طرح ہوتی تھی جسے لکڑی سے مارتے تھے۔جس طرح برطانیہ میں کرکٹ کے کھیل میں ہوتا ہے، گیند کو ہٹ لگانے والا، دو مرکزوں کے درمیان تیزی سے بھاگتا تھا، اگر مخالف ٹیم کا کوئی کھلاڑی گیند کو بیچ سے ہی پکڑ لیتا یا کیچ کر لیتا تو ہٹ لگانے والا لڑکا آؤٹ ہو جاتا۔امریکی بیس بال میں بیس یا مراکز کی تعداد چار کر دی گئی۔ گیند کو ہٹ لگانے کے بعد کھلاڑی تیزی سے چاروں مراکز کا ایک چکر لگاتا، اس طرح کہ پکڑا نہ جائے۔ وہ پہلے دائرے میں گھومتا تھا، پھر اس کی سمت بدل دی گئی۔ کچھ نوجوانوں نے1842 میں نشیبی مین ہٹن میں تفریحاً بیس بال کھیلنا شروع کیا۔تین سال بعد انہوں نے ''نکر بوکرز'' کے نام سے اپنی ایک تنظیم بنالی۔ یہ شوقیہ کھلاڑیوں کا کھیل تھا۔ایسے ہی کلبوں نے مل کر بیس بال کے کھلاڑیوں کی ایک نیشنل ایسوی ایشن بنالی، جس نے پہلی بار اس

کھیل کے اصول اور ضابطے مرتب کیے۔

امریکا میں بیس بال کے کھیل کی ابتدا بالکل سرے سے ہوئی۔ اس کا موجد جیمس نائی سمتھ میسی سی چیوٹس کے مقام سپرنگ فیلڈ میں دائی وائی ایم سی اے کا فزیکل انسٹرکٹر (جسمانی ورزش کی تربیت دینے والا) تھا۔ اسے کسی ایسے کھیل کی جستجو تھی جسے نوجوان سرما کے موسم میں یا رات کے وقت کھیل سکیں۔ مروجہ کھیلوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد جیمس نے بیس بال ایجاد کیا۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ کن چیزوں کی ضرورت ہوگی، اس نے بیس بال کے ضابطے مرتب کیے۔ سپرنگ فیلڈ کے وائی ایم سی اے جمنازیم سے دسمبر 1891 میں پہلا بیس بال گیم کھیلا گیا۔ میدان کے دونوں سروں پر باسکٹ کے لیے پول نصب کیے گئے۔ ہر مرتبہ جب باسکٹ میں گیند جاتا تو ایک آدمی سیڑھی پر چڑھ کر گیند کو باہر نکالتا۔ 1906 میں لکڑی کے تختے پر کھلی ٹوکریاں لگائی گئیں اور ایک ٹیم میں کھلاڑیوں کی تعداد سات سے کم کر کے پانچ کر دی گئی۔ باسکٹ بال کا کھیل سنسنی خیز طور پر مقبول ہوگیا۔ 1920 کے عشرے میں امریکی سکولوں کا یہ مقبول ترین کھیل تھا۔ ہائی سکول باسکٹ بال ٹورنامنٹ 1926 کے عشرے میں شہر میں سب سے مقبول ورزشی کھیل شمار کیا جانے لگا۔ رابرٹ اور ہیلن لینڈ نے 1923 میں مڈل ٹاؤن کا ایک سماجی منظر نامہ مرتب کیا تھا، جس میں لکھا تھا کہ ''شہر میں وفاداری کے مراکز میں جو شہرت باسکٹ بال کو حاصل ہے، کسی اور مرکز کو نہیں۔''

فٹ بال، بیس بال، باسکٹ بال، ہاکی اور گولف اور دیگر کھیل ٹیلی وژن پر تفریح کے نہایت اہم ذرائع ہیں۔ مردوں میں یہ خاص طور پر مقبول ہیں۔ کیوں کہ ہر مقابلہ کسی پہلے سے لکھے ہوئے متن کے مطابق نہیں ہوتا، اس لیے تحیر اور بے یقینی کا عنصر آخری لمحے تک برقرار رہتا ہے۔ ٹیم میں کھیل کی ایک روایت، اس کا اخلاقی عنصر بھی ہے جس کے تحت اپنی برادری کے وسیع تر مفاد میں بے غرضی اور بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ ہر کھلاڑی زبردست کاوش کرتا ہے۔ یہ کھیل امریکی ہائی سکولوں اور کالجوں میں پابندی کے ساتھ کھیلے جاتے ہیں، جہاں تماشائیوں کے درمیان ''سکول سپرٹ'' کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ پیشہ ورانہ کھیلوں میں ایک یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ پیشہ ورانہ ٹیمیں شہر یا علاقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مختلف علاقوں کے باشندوں پر ان کی شہریت کے آداب کا تقاضا ہوتا ہے کہ اپنی گھریلو ٹیم کو بڑھاوا دیں۔ پیشہ واریت سب سے پہلے بیس بال میں آئی۔ 1876 کی نیشنل لیگ میں پیشہ ور

کھلاڑیوں کی ٹیمیں شامل تھیں جو بعض امریکی شہروں کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ امریکن لیگ کا قیام1900 میں عمل میں آیا۔ کھیلوں کا پہلا عالمی سلسلہ1903 میں رونما ہوا۔ نیشنل فٹ بال لیگ کی پیش رو امریکن پروفیشنل فٹ بال ایسوسی ایشن1920 میں قائم ہوئی اور امریکن فٹ بال لیگ کا قیام1960 میں عمل میں آیا۔ نیشنل باسکٹ بال ایسوسی ایشن دو گروپوں کے ادغام سے 1949 میں قائم ہوئی۔

بین الاقوامی اولمپک گیم جو ہر چار سال بعد ہوتے ہیں، ان میں مختلف قوموں کی ٹیمیں نمائندگی کرتی ہیں۔ کھیلوں کی یہ عالم گیر تقریب اس روایت کی تجدید کرتی ہے جس کا آغاز آٹھویں صدی قبل مسیح میں یونان میں ہوا تھا۔ اس زمانے میں ورزشی جوان یونان کی شہری ریاستوں کی نمائندگی کرتے اور اس طرح کے مقابلوں، مثلاً دوڑ، چھلانگ لگانا، وزنی اشیا کو دور تک پھینکنا اور پہلوانی میں شریک ہوتے تھے۔ وہ کھیل اگرچہ یونان کے قدیمی دیوتاؤں کے احترام میں کھیلے جاتے تھے، لیکن وہ یونان کی تہذیبی یگانگت اور بقائے امن کی علامت بن گئے تھے۔1896 میں اس کی تجدید فرانس کے ایک رئیس پیری ڈی کوبرٹن کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ برطانیہ کے پبلک سکولوں میں رگبی جس جوش وخروش سے کھیلی جاتی تھی وہ رئیس اس سے بہت متاثر ہوا۔ اولمپک مقابلوں کے لیے اس کے اندر اس بنا پر تحریک پیدا ہوئی کہ انھی دنوں اولمپس پہاڑ کے قریب قدیم آثار کی کھدائی کی جا رہی تھی اور آزاد تجارت کے اختلافی سوال پر بحث کی جا رہی تھی۔ بیرن ڈی کوبرٹن نے اس وقت کہا تھا، ہمیں اپنے کشتی ران، اپنے لمبی دوڑ لگانے والے، اپنے شمشیر زن دوسرے ملکوں کو بھیجنے چاہئیں۔ مستقبل کی آزاد تجارت یہی ہے۔ اولمپک کھیلوں کی تجدید کے بارے میں بیرن کی اس تجویز کو بین الاقوامی کھلاڑیوں کی ایک کانگریس میں منظور کر لیا گیا جو1894 میں منعقد ہوئی تھی۔ جدید دور کے اولمپک مقابلے پہلی بار اپریل 1896 یونان میں ایتھنز کے مقام پر ہوئے۔

انیسویں صدی کے امریکا میں دیگر تفریحات

امریکا میں تفریح کی ایک ابتدائی شکل سلسلہ وار لیکچر ہوتے تھے۔ مشہور مصنف، سائنس دان، مبلغ، مدرس اور دیگر ذی علم لوگ دورے پر نکلتے اور دلچسپی کے موضوعات پر فیس لے کر لیکچر دیتے تھے۔ ارسطو کے سلسلۂ درس سے منسوب اس تحریک کا آغاز نیو انگلینڈ میں 1820 کے عشرے میں ہوا۔ چنانچہ1830 کے عشرے تک اس میں تین ہزار مقامی گروپ شامل

ہو چکے تھے۔ انگریزی زبان کے ناول نگاروں تھیکرے اور ڈکنز میں عام لوگوں کو زیادہ کشش محسوس ہوتی تھی۔ رالف والڈو، ایمرسن، ہوریس مان، تھیوڈور پارکر اور مارک ٹوین وہ امریکی مشاہیر تھے، جن کی بہت مانگ تھی۔ یہ تقریبات تعلیمی نوعیت کی معلوم ہوتی تھیں، لیکن ان کا سماجی پہلو بھی بہت اہم تھا۔ یہ اُن جوڑوں کے لیے تفریح کا موزوں ذریعہ تھا، جو شادی کرنے کے ارادے سے میل جول رکھتے تھے۔ نیو یارک سٹی میں کوپر یونین کے لیکچر محنت کشوں کے لیے اپنی شخصیت کی اصلاح کا مؤثر ذریعہ ہوتے تھے۔ اس سے ذرا کم تر سنجیدہ سفری کھیل تماشے ہوتے تھے، جیسے رقاصوں کی کمپنیاں، جسمانی کرتب دکھانے والے، مومی عجائب گھر، گویے، صوتی شعبدہ باز اور مسخرے آرٹیمس وارڈ۔ 1830 کے عشرے میں، گھڑ سوار نٹ اور ان کے ساتھ جسمانی کرتب خاصے مقبول تھے۔ انوکھے جانور یا فن کے نادر نمونے گشتی سرکس میں دکھائے جاتے تھے یا عجائب گھر میں ان کی نمائش ہوتی تھی، جن کا مقصد بہ ظاہر اخلاقی ہوتا تھا، لیکن بہ ہر طور ان کی تفریحی نوعیت ہوتی تھی۔

چلتے پھرتے تھیٹر یا نوٹنکیاں، امریکا میں 1840 کے عشرے میں بہت مقبول ہو گئی تھیں، لیکن ابتدا میں انہیں قابلِ اعتراض سمجھا جاتا تھا۔ تھیٹر کے انداز کی پیش کش مذہبی اعتبار سے معیوب سمجھی جاتی رہی ہے اور اس کا آغاز تو 1600 کے عشرے میں ہی ہو چکا تھا۔ تھیٹر کا اہتمام بلیئرڈ والے برآمدے میں یا بڑے کمرے میں ہوتا تھا۔ اصل کھیل کے علاوہ اداکار چھوٹے چھوٹے چٹکلے بھی پیش کرتے تھے، جن میں برجس پہنے ہوئی عورتیں عامیانہ دھنوں میں گانے گاتی تھیں۔ اطالوی اور فرانسیسی بیلے اپنی وضع میں ایسے ہوتے کہ ان سے سکینڈل کو تقویت ملتی۔ ان میں رقاصائیں تنگ اور ادھورے لباس پہن کر اپنی عریاں ٹانگوں کی نمائش کرتیں۔ بہت سے ابتدائی نوعیت کے تھیٹر کھیل برطانیہ سے درآمد کیے گئے تھے۔ مشہور برطانوی المیہ ڈرامے جیسے ایڈمنڈ کین اور جونیئس بروٹس بوتھ (آخر الذکر لنکن کے قاتل کا باپ تھا) امریکی سٹیج پر پابندی کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں ہالی وڈ میں ہوا، زندہ تھیٹر میں بھی مقبول اداکاروں کی اجارہ داری قائم ہونے لگی۔ امریکا کے گشتی تھیٹر میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے مردانہ کردار ادا کرنے والے دو اداکار ایڈون وارسٹ جو المیہ اداکاری کرتا تھا اور چارلٹ کش مین سب سے زیادہ مقبول اور جانے پہچانے تھے۔ امریکی تھیٹر میں کچھ طے شدہ لگے بندھے کردار ہوتے تھے، جیسے کہ فسادی یانکی تھا، یا ڈیوی کراکٹ کی طرح کے دیہاتی

کردار۔انیسویں صدی کے آخر تک زیادہ تر امریکی شہروں میں اپنے اوپیرا ہاؤس بن گئے تھے، جن میں ہر ہفتے کئی کئی تھیٹر ہوتے تھے۔

امریکا میں تفریحات کے شعبے میں 1890 کے عشرے کے اندر خود کار آلات نے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی۔ ایک تو مصر کی بیلے ڈانسرز (نیم عریاں رقاصائیں) بہت مقبول ہوئیں، دوسرے 1893 میں عالمی کولمبین ایکسپوزیشن کو بہت شہرت ملی۔ اس میں فیری وھیل (پانی پر تیرنے والا پہیہ) بھی شامل تھا، یہ جھیل مشی گن کے ساحل پر دو سو فٹ تک بلندی پر پہنچ جاتا تھا۔اس کھیل میں کارنیوال بھی آتا تھا۔ بہت سے امریکی شہروں میں، بیرون شہر تفریحی پارک ہوتے تھے، جنہیں کرائے پر کاریں چلانے والی کمپنیاں چلاتی تھیں۔ کچھ یوں ہوتا تھا کہ ویک اینڈ پر ایک پورا کنبہ ٹرالی میں بیٹھ کر پارک میں پہنچ جاتا تھا، جہاں وہ مل جل کر پکنک مناتے، گاڑی میں بیٹھ کر گھومتے پھرتے اور کنسرٹ کے ساز ینے سنتے۔ بہت سی انوکھی مشینی تفریحات ایک ایک پنی کے عوض دیکھنے کو مہیا ہوتیں۔ انہی میں ایک مووی مشین ہوتی۔لکڑی کے ایک فریم میں فوٹو گراف تلے اوپر جماتے اور اسے گھماتے تھے، جس سے حرکت کا گمان ہوتا تھا۔ایک مشین قسمت کا حال بتاتی تھی۔ وہ کھیلنے والے کی ہتھیلی کی تحریر پڑھ کر قسمت کا حال بتا دیتی۔ایک اور مشین سے مردوں کے بازو کی طاقت اور قوتِ برداشت کا پتا چلتا تھا۔ایڈیسن کی ایجاد میں اختراع کر کے ایک فونو گراف بنایا گیا تھا، جو سکے سے چلتا تھا۔اس میں سے پہلے سے ریکارڈ کی ہوئی آواز نکلتی تھی۔ سنسنی خیزی کے شوقین ایک سکہ دے کر اس کے مزے لیتے۔ وہ دو دستی سلاخیں مضبوطی سے پکڑتے تو خفیف سا بجلی کا جھٹکا محسوس ہوتا۔ اور تاک جھانک کے کھیل میں ''فرانسیسی پوسٹ کارڈ'' بھی ہوتے، جن میں عورتوں کو کپڑے اتارتے ہوئے مختلف صورتوں میں دکھایا جاتا تھا۔

نسلی عصبیت کے اشارے

امریکی ذرائع تفریح میں ایک تفریح یہ بھی تھی کہ سیاہ فام اداکار یا گورے اداکار ایک دوسرے کی نقالی کرتے تھے اور اسے دیکھنے والے تماشائی بھی زیادہ تر گورے ہی ہوتے تھے۔ ابتدا میں گورے امریکی نیگرو غلاموں کے گانوں اور رقص کو محض طفلانہ تفریح سمجھتے تھے، لیکن پھر ڈیڈی رائس کے ''جم کراؤ'' کھیل نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ بھانڈوں کے تماشوں کی طرح پسند کیا جانے لگا۔ گورے اداکار بیسیوں کی تعداد میں اپنے چہروں پر سیاہی مل کر سارے ملک

میں گھومتے اور جنوب کے نیگرو کے گانوں کی نقالی کرتے تھے۔ یہ امریکا میں کوئی نصف صدی تک ان کی انتہائی پسندیدہ تفریح تھی جس میں وہ کالوں کی طرح رقص کرتے، انہی کی طرح بات چیت کرتے اور مزاح پیدا کرتے تھے۔ یہ بھانڈوں کی نقالی کا تماشا دو حصوں میں دکھایا جاتا تھا۔ پہلے حصہ میں کوئی درجن بھر مسخرے نصف دائرے میں کھڑے ہو کر جھانج بجاتے تھے۔ پھر ایک شخص بھڑ کیلے لباس پہنے وسط میں کھڑے ہو کر بات چیت شروع کر دیتا۔ وہ دو مسخروں، مسٹر ٹمبو اور مسٹر بونز کے درمیان مصالحت کراتا، دونوں کھڑک دار کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ کھیل کے اس حصے میں بہت کچھ ہوتا۔ فقرے بازی، بینجو بجانا، گیت اور رقص، اداکار اپنے کردار ادا کرتے ہوئے نہایت خوب صورتی کے ساتھ ایک ایک کر کے دائرے سے نکل جاتے۔ کھیل کے دوسرے حصے میں خود کلامی ہوتی، چٹکلے بازی ہوتی، گیت اور رقص ہوتے اور ایک زور دار ہنسی ٹھٹے والا تماشا ہوتا جس میں ایک مردانہ کردار، سر پر وگ اور چولی پہن کر سکرٹ پھڑ پھڑاتا ہوا، عورتوں کی سی حرکتیں کرتا دکھائی دیتا تھا۔

1843 میں نیو یارک شہر میں ورجینیا نوٹنکی کا بڑا چرچا تھا، اس میں مارٹن ایسٹ اور جم کرا بہت مشہور ہوئے۔ اس کے بعد کنٹکی نوٹنکی آ گئی، حبشہ کی نوٹنکی آ گئی اور ایسی ہی بہت سی نوٹنکیاں آ گئیں، جن میں سبھی اداکار سفید فام مرد ہوتے تھے۔ کالے اداکار سول وار کے زمانے تک ان کھیلوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ وہ پہلی کمپنی، جس میں سبھی کالے شامل تھے، پلانٹیشن کمپنی تھی، جس کے اداکاریوں تو کالے ہی ہوتے تھے، پھر بھی چہروں پر سیاہی ملتے تھے اور اپنی نسلی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لیے ہونٹوں کے گرد سفید یا سرخ رنگ لگا دیتے تھے۔ کچھ اس طرح کی بات ''ٹام شو'' میں ہوتی تھی۔ جس میں ہیریٹ بیچر سٹوو کی کتاب ''انکل ٹام کی کیبن'' سے ماخوذ بہت سے ڈرامائی کوائف پیش کیے جاتے تھے۔ ان کھیلوں میں وہ سنسنی خیز مناظر بھی شامل ہوتے، جن میں شکاری کتوں کو برف کے میدان میں ایلزا کا پیچھا کرتے ہوئے دکھایا جاتا تھا اور بہت سے کوڑے لگانے کے مناظر بھی ہوتے۔ ایک انتہائی یادگار کردار غلام لڑکی ٹاپسی کا ہوتا جو ایک جعل ساز عورت کا کردار ادا کرتی تھی۔ ایک منظر ننھی ایوا کے بہشت میں داخلے کا ہوتا، جس پر تماشائیوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ''انکل ٹام کی کیبن'' نامی ڈراما پہلی بار 1853 میں نیو یارک میں ٹرائے کے مقام پر دیکھا گیا۔ اس میں کورس گانے والوں میں کالے موسیقار شامل ہوتے۔ اداکاری عام طور پر گورے کرتے تھے۔ نوٹنکی کے

گوشوارہ 7-1　Table: 7-1

چوتھی تہذیب کی تاریخ کے چند اہم واقعات

واقعہ	سال
ضوابط کی خلاف ورزی سے رگبی (کھیل) کی ابتدا	1823 A.D.
بارنم جارج واشنگٹن کے ''نرس'' کی نمائش کرتا ہے	1835 A.D.
لندن کے کرسٹل پیلس میں عظیم نمائش	1851 A.D.
میوزیکل ڈراما ''انکل ٹام کی کوٹھری'' کا افتتاح	1853 A.D.
ملرڈ فلمور شمالی دریائے مس سسی پی میں کشتیوں کے دورے کی رہنمائی کرتا ہے	1854 A.D.
ایملی بلونڈن رسے کے ذریعے آب شار نیا گرا عبور کرتا ہے	1859 A.D.
پہلے امریکن کالجیٹ فٹ بال کھیل	1869 A.D.
برنم ''روئے زمین پر سب سے بڑا شو'' منعقد کرتا ہے	1871 A.D.
پہلی کینٹکی ڈربی ریس دوڑی جاتی ہے	1875 A.D.
فلاڈیلفیا میں صدی کی نمائش منعقد کی جاتی ہے	1876 A.D.
بفیلو بل ''وائلڈ ویسٹ شو'' شروع کرتا ہے	1883 A.D.
جیمز نے سمتھ باسکٹ بال کا کھیل ایجاد کرتا ہے	1891 A.D.
سلیوان — کاربٹ ہیوی ویٹ باکسنگ مقابلہ	1892 A.D.
ایتھنز میں اولمپک کھیلوں کا دوبارہ اجرا	1896 A.D.
پہلی بیس بال ''ورلڈ سیریز''	1903 A.D.
کالج فٹ بال مقابلوں میں نوٹرے ڈیم فوج کو اپ سیٹ کر دیتا ہے	1913 A.D.
ڈی، ڈبلیو گفتھ کی ''برتھ آف اے نیشن'' کا آغاز	1915 A.D.
''بلیک ساکس'' بیس بال سکینڈل	1919 A.D.
کمرشیل ریڈیو سٹیشن پر پہلی نشریات	1920 A.D.
بی بی سی ریڈیو پر نشریات کا لائسنس حاصل کرتا ہے	1922 A.D.
ہاوڈنی ''سیدھی جیکٹ'' سے فرار ہوتا ہے	1923 A.D.
پہلے امریکن ریڈیو نیٹ ورک این بی سی کا قیام	1926 A.D.
بابی رُتھ ایک سیزن میں ساٹھ ''ہوم رنز'' بناتا ہے	1927 A.D.

نواڈا میں جوا قانونی قرار دیا جاتا ہے	1931 A.D.
ایم جی ایم کی گرینڈ ہوٹل کا ہالی ووڈ میں افتتاح	1932 A.D.
ریڈیو پر فرینکلن روزویلٹ کا ''Fireside Chats''	1933 A.D.
برلن اولمپکس میں جیسی اوون طلائی تمغہ جیت لیتا ہے	1936 A.D.
ٹیلی وژن پر کھیل کی پہلی نشریات	1937 A.D.
اورسن ویلز کی نشریات ''مریخ سے حملہ'' کی ہیبت پیدا کر دیتی ہیں	1938 A.D.
اٹلانٹا میں Gon With the Wind کا افتتاح	1939 A.D.
براڈوے پر ''اوکلاہوما'' کھلتا ہے	1943 A.D.
فرینک سناترا کی سٹیج پرفارمنس پر Bobbysoxer ہنگامہ	1944 A.D.
کینز میں پہلا فلمی میلہ	1946 A.D.
جیکی رابنس کا بروک لین ڈاگرز کے ساتھ معاہدہ	1947 A.D.
سینراما اور تھری ڈی فلموں کی ابتدا	1952 A.D.
ٹیلی وژن پر Birth of Lucilly Ball's baby	1953 A.D.
کیلیفورنیا میں ڈزنی لینڈ پارک کا افتتاح	1955 A.D.
ایلوس پریسلے قومی سطح پر گلوکاری سے ہنگامہ برپا کر دیتا ہے	1956 A.D.
64 ہزار ڈالر کا سوال نامی کوئز شو منسوخ کر دیا جاتا ہے	1958 A.D.
ٹیلی وژن پر کینیڈی اور نکسن کا مباحثہ	1960 A.D.
Fcc کا چیئرمین ٹیلی وژن کو "vastwasteland" قرار دیتا ہے	1961 A.D.
ایڈورڈ سلیوان کے پروگرام میں بیٹلز پہلی مرتبہ نظر آتے ہیں	1964 A.D.
گرین بے پیکرز Superbowl I جیت لیتے ہیں	1967 A.D.
ووڈ سٹاک اور ایلٹامونٹ کا موسیقی میلہ اور چاند سے پہلی ٹی وی نشریات	1969 A.D.
بلی جین کنگ اور بابی رگز کا ٹینس مقابلہ	1973 A.D.
ایول نیوال سنیک دریا کو جمپ کر کے پار کرنے کی کوشش کرتا ہے	1974 A.D.
''سٹار وار'' فلموں کا آغاز	1977 A.D.
ٹیڈ ٹرنر ''کیبل نیوز نیٹ ورک'' کا آغاز کرتا ہے	1980 A.D.
جیرالڈ ریویرا ٹی وی پر براہِ Al Capone's Safe شروع کرتا ہے	1986 A.D.

MCA کی متسوشیتا کو فروخت	1990 A.D.
جونی کارسن "Tonight Show" سے ریٹائر ہو جاتا ہے	1992 A.D.
او جے سمپسن کی فورڈ برانکو میں ''خودکشی'' سواری	1994 A.D.
مارک میک گوائر اور سیمی سوسا کا مقابلہ	1998 A.D.

کھیلوں کی مقبولیت کم ہوتی گئی، اس کے باوجود رنگا رنگ تفریحی پروگرام جو پوری شام کے لیے کافی ہوتے، ان کا سلسلہ معمول کی طرح جاری رہا۔ سفید فام اور کالے لوگوں کی اپنی اپنی کمپنیاں تھیں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد ''دی تھیٹر اونرز بکنگ ایسوسی ایشن'' کالے اداکاروں کی طرف سے رنگا رنگ پروگراموں کی نمائش کا ذریعہ تھی۔ پینٹاجز، لیوز اور کیتھ آرفیم عام طور پر سفید فام اداکاروں کی بھرتی کرتے تھے۔ رنگا رنگ پروگرام سڑک پر ہوتے اور بڑے بڑے شہروں کے تھیٹر میں بھی۔ ان کی پیش کش میں اعلیٰ درجے کے رقص، کامیڈی، سانپ کا تماشا اور بھاری بھرکم چیمپین مکے بازوں کے ہنر کا مظاہرہ، غرض سبھی کچھ شامل ہوتا۔ کالے اداکاروں میں سب سے مہنگا رابنسن تھا۔ 1880ء کے عشرے کے بعد 1930 کے برسوں تک زندہ ناچ گانے تفریح کا سب سے اہم ذریعہ تھے۔ ریڈیو کے مشہور کامیڈین جیسے جیک بنی اور جارج برنس نے اپنے فن کا آغاز زندہ ناچ گانوں کی ٹولی سے ہی کیا تھا۔ ریڈیو کا پہلا مقبول ترین کھیل آموس این اینڈی 1928 میں شروع ہوا۔ اس نے امریکا کی اس روایت کو برقرار رکھا جس کے تحت کالے لوگوں کے مزاح کو گورے مسخروں کی زبان سے ادا کیا جاتا تھا۔ تاہم 1951ء میں جب اسی کو ٹیلی وژن پر پیش کیا گیا تو اس کے اداکاروں میں کالے شامل تھے۔

کالے اداکار لامحالہ اپنی ہی پروڈکشن میں کام کرتے تھے، چنانچہ گورے جوان کی نقالی کرتے تھے، رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہو گئے۔ بہت عرصہ قبل کالوں کے ایک تھیٹر گروپ نے جس کا نام افریکن کمپنی تھا، نیویارک سٹی میں شیکسپیئر کے ڈرامے پیش کیے۔ مارا ایلڈرچ نامی ایک اداکار نے جو افریقی روسکین کے نام سے مشہور ہوا پورے یورپ کا دورہ کیا اور بہت شہرت پائی۔ کالے گویوں کی ایک نہایت مقبول ٹولی لوسا فیملی تھی جس نے ملکہ وکٹوریہ کے لیے اپنا پروگرام پیش کیا۔ اس صدی کے خاتمے تک کالے اداکار اپنے کھیلوں میں چہرہ کالا کیے بغیر پیش ہونے لگے تھے۔ گانے والے مسخرے جیسے برٹ ولیمز اور جارج واکر ''کون شوز'' میں آتے تھے۔ اس میں ایک اداکار نہایت خوش لباس، جس کے دائیں بائیں دو حسینائیں ہوتی

تھیں، کورس کے گیت میں چھڑی ہلاتا اور ایک خاص وضع میں آگے آگے چلتا تھا۔ ایک اور رقص جس نے یورپ میں سنسنی پھیلا دی تھی ''کیک واک'' کہلاتا تھا۔ گانے والیوں میں ایتھل واٹرز، فلورسن ملز اور جوزفین بیکر نے جوفولیز برجریز میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں، اپنے مزاحیہ پروگرام بنائے اور 1920ء کے عشرے میں گورے تماشائیوں میں زبردست مقبولیت حاصل کی۔ ہارلم کلوپ ٹواٹرز باسکٹ بال کی مزاحیہ پیش کش سے تماشائیوں کو محظوظ کرتے تھے۔ کالوں کے ثقافتی پروگرام میں زیادہ سنجیدہ پیش کش میں پال رابسن کے پروگرام ہوتے۔ وہ امپر رجونز اور جارج گریشوِن کے سوشل آپرا ''پورگی اینڈ بیس'' میں پیش ہوتا تھا۔

امریکا کی مقبول عام تفریحات میں سیاہ فام ثقافت کا سب سے زیادہ اثر موسیقی پر ہوا ہے۔ نیگرو غلام کچھ دھنیں اپنے ساتھ افریقا سے لاتے تھے جن میں گوروں کو بہت کشش محسوس ہوئی۔ 1800 کے ابتدائی عشروں میں غلاموں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نیویارک کے ''کانگو اسکوائر'' میں اکٹھا ہو کر سیاحوں کے لیے اپنے گیت پیش کرتے تھے۔ کالوں کے نغموں کو اسٹیون فاسٹر جیسے موسیقی کی دھن بنانے والے گوروں نے مقبول عام دھنوں میں منتقل کر دیا۔ غلاموں کی ایک دھن جو ابتدا میں اولڈ زپ کون کے نام سے مشہور تھی، بعد میں ''ٹرکی ان دی اسٹرا'' کے نام سے مقبول ہوئی۔ اس صدی کے ختم ہونے تک ایک نئی طرح کی پیانو میوزک، ''ایگ ٹائم'' کہتے تھے جاز کی دھن میں شامل ہوگئی۔

مسوری میں گانے کی دھنیں بنانے والا ایک گورا اسکاٹ جوپلن رہتا تھا۔ پیانو میوزک کو اس نے بہت مقبول بنایا۔ ریگ ٹائم نے جاز کی موسیقی کا دروازہ کھول دیا، اس کے ماہروں میں بڈی بولڈن اور ڈبلیو سی ہینڈی جیسے کالے شامل تھے۔ کلف کلب کے سنکوپیٹڈ آرکسٹرا نے جاز کو 1912 میں کارنیگی ہال میں متعارف کرایا۔ نیو آرلینز سے وی آرمسٹرانگ آ گیا جس نے ڈیوک النگسٹن، مائلز ڈیوس، چارلی پارکر، کاؤنٹ بیسی اور ایلیا فز گرالڈ کے ساتھ مل کر جاز کو امریکا کی موسیقی کا ایک مخصوص اسلوب بنا دیا۔ گورے اس ساز کے ساتھ اپنی آواز ملاتے تھے۔ ہارلم کے سیوائے پال دوم کو 1920ء کے عشرے میں ''تھرکتے ہوئے پاؤں کی سرزمین'' کہا جانے لگا تھا، چارلسٹن اور لنڈے ہوپ نے وہیں ایک نئے انداز کے رقص کا آغاز کیا، جس میں جوڑے الگ الگ رقص کرتے تھے۔

1920ء کے عشرے کے اواخر میں بگ بینڈ کا عہد شروع ہوا۔ اس میں سوئنگ میوزک کی مرکزی حیثیت تھی، جس کا قرینہ قدرے کم بے ساختہ تھا۔ ساز بجانے والے گوروں

کی اس زمانے میں بالا دستی تھی۔ دھیمے سروں میں گانے والے گوروں، جیسے بنگ کراسبی اور پیری کومو نے عوام پسند موسیقی کو رواج دیا۔ جنجر راجرس اور فریڈ سٹائر نے اپنے رقص کے انداز میں ایک خنک اور نہایت درجہ نفیس پیکر تراشی سے کام لیا۔ فرینک سناترا نے ٹومی ڈورس کے بینڈ کے ساتھ مل کر جاز کے نغمہ گانے والے کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی۔ سیاہ فام موسیقاروں کو اس زمانے میں ایک ثقافتی پاڑے کے اندر دھکیل دیا گیا تھا۔ البتہ وہ افراد بچ رہے تھے، جن کے فن سے نئے نئے خیالات پھوٹ رہے تھے۔ سوئنگ کی موسیقی کو1930ء کے عشرے کے اواخر میں بے باک میوزک نے چیلنج دیا۔ مہالیا جیکس کی مناجاتیں اتنی مقبول ہوئیں کہ ان کے دس لاکھ سے زاید ریکارڈ فروخت ہو گئے۔ بہت سے ہوٹلوں نے اپنے رت جگے کلبوں میں جانی میتھس، لینا ہورتے اور نیٹ کنگ کول جیسے سیاہ فام موسیقاروں کو یہ مواقع فراہم کیے کہ یہاں سے اپنے لیے کام تلاش کریں۔ وہ ریڈیو سٹیشن جن پر کالوں کی عمل داری تھی ایک خاص طرح کی موسیقی نشر کرتے تھے، جو بہت سے گورے دل دادگانِ فن کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ ہیری بیلافونٹے نے1950ء کے اواخر میں کیریبین موسیقی کی تھاپ پر ایک نئی دھن کو رواج دیا جس پر لوگ فریفتہ ہونے لگے۔

گورے موسیقار: کالوں کی موسیقی کے ذائقے کے ساتھ

1930ء کے عشرے سے لے کر1950ء کے اواخر تک امریکا کی مقبول عام موسیقی پر بنگ کراسبی، فرینک سناترا اور دوسرے گورے موسیقاروں کی گہری چھاپ تھی، جنھوں نے جاز کے سیاہ فام موسیقاروں کے خنک اسلوب پر ماہرانہ گرفت حاصل کر لی تھی۔ بنگ کراسبی بظاہر اپنے آپ کو سنجیدگی سے موسیقار مانتا ہی نہیں تھا۔ شادی شدہ اور مال دار تھا، لیکن اسے نشہ کرنا اور کورس گانے والی لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا بہت اچھا لگتا تھا۔ مائیکروفون میں اس کا نرمی سے زیرلب گنگنانا ایسا تھا کہ ایک پوری نسل نے اس کی نقالی شروع کر دی تھی۔ اس کی آواز بڑی رسیلی تھی جس نے گانے کو اس کے لیے بہت آسان بنا دیا تھا۔ لفظ کی جگہ آواز کے استعمال کی عادت اس نے لوئی آرمسٹرانگ سے لی ہوگی۔ بنگ کراسبی جب اسٹیج پر آتا تو ایک نفیس، خوش طبع اور لاابالی فن کار لگتا تھا۔ اس نے ہلکی پھلکی کامیڈی فلموں میں باب ہوپ کے ساتھ ایک تیز طرار فقرے باز کا کردار ادا کیا تھا۔ جاز کے آخری دور میں اس کے کھلے ڈُھلے اور بے تکلف انداز نے امریکا کی روح کو گویا اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ فرینک سناترا نے کراسبی

کے بے تکلف انداز میں موسیقی کے ساتھ جنسی کشش کو بھی شامل کیا۔ اس کے انداز میں ایک طرح کا لڑکپن تھا جس نے سن بلوغ کو پہنچنے والی نسل کے لڑکوں کو بہت متاثر کیا۔ نوجوان سیاترا نے1944ء میں کولمبس ڈے کے موقع پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ بعد کے زمانے میں اس کی ڈین مارٹن اور سیمی ڈیوس جونیئر سے خوب گاڑھی چھننے لگی۔ ان سب نے لاس ویگاس سے دھوم مچا رکھی تھی۔ ان کی مقبولیت اتنی زبردست تھی کہ راک این رول کے آئندہ زمانے میں بھی برقرار رہی۔

سام فلپس ایک ریکارڈ بنانے والا تھا۔ اوائل1953 میں اس سے یہ بیان منسوب ہے، ''اگر مجھے کوئی گورا مل جاتا جس کی آواز کالوں کی طرح ہوتی اور محسوس ہوتا کہ وہ کالوں کی طرح ہے تو میں اربوں ڈالر کما سکتا تھا۔'' ایلوس پریسلے میں اسے ایسا ہی ایک شخص مل گیا۔ یہ تھا ایلوس پریسلے جو اسی سال فلپس اسٹوڈیو میں ایک گانے کی ریکارڈنگ کے لیے آیا تھا، جسے اب بھلایا جا چکا ہے، یہ تھا، ''مائی ہیپی نس''۔ (میری خوشی) ایک سال بعد ایلوس نے ایک اور گیت ریکارڈ کرایا، ''آل رائٹ ماما''۔ اس نے لوگوں کی اچھی خاصی توجہ حاصل کی۔ یہ تیز دھن میں گایا جانے والا گیت تھا، جس طرح کالے لوگوں کے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتا تھا، اس پر دیسی ماحول کی گہری چھاپ تھی۔ دو سال تک زیادہ تر جنوب میں گانے کے بعد ایلوس علاقائی پس ماندگی کا حصار توڑ کر باہر نکلا اور پورے ملک میں سنسنی پھیلا دی۔ کنپٹی کے لمبے خط اور ادھوری مسکراہٹ کے ساتھ جس میں تمسخر کا شائبہ بھی ہوتا، اس نے امریکا کی جواں سال نسل کا ایک سرکش روپ پیش کیا۔ جب اس کا کنسرٹ ہوتا تو نوعمر لڑکیوں کے غول ہلڑ مچاتے ہوئے آ جاتے۔ تہذیبی آداب کے اس دور میں سٹیج پر اس کی پیش کش میں کولہے مٹکاتے ہوئے جنسی ترغیب کے اشارے بھی شامل ہوتے، لہٰذا ایلوس جب ستمبر1956 میں ایڈ سلیوان شو میں آیا تو ٹی وی کے کیمرہ مینوں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ اس کے جسم کے صرف بالائی حصے کو پردے پر دکھائیں۔ اس کے گانے بے چین نوجوانوں کے دلوں کو چھو لیتے تھے۔ اس نے امریکا میں نسلی تعلقات کی کیمیا ہی بدل دی تھی۔

ایلوس پریسلے کو1958 میں امریکی فوج میں بھرتی کر دیا گیا تھا۔ اس نے شادی کی، پھر امریکا واپس آ کر گانے اور اداکاری کے دونوں شوق پورے کیے۔ لاس ویگاس میں اس کا نام اخبار کی شہ سرخیوں میں آتا۔1977 میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس بات کا شک تھا کہ اس

نے دوائیں اور نشہ کی خوراک زیادہ لے لی تھی۔ راک این رول کے جس انقلاب کی ابتدا ایلوس نے کی تھی موسیقی میں وہ ایک مختصر عرصے کے تجرباتی تعطل کے بعد 1960 کے اوائل میں پھر شروع ہو گیا۔ ان دنوں ایک نوجوان کھیل تماشے کا رسیا اور ہارورڈ کا گریجویٹ وہائٹ ہاؤس میں براجمان تھا۔ کالوں کی جانب سے شہری حقوق کی تحریک جس کی بھرپور تائید مثالیت پسند گورے نوجوان کر رہے تھے، جنوب میں زور وشور سے جاری تھی۔ ''زمانے بدل رہے ہیں'' باب ڈائلان کے اس عوامی نغمے نے، ایسا لگتا تھا کہ، اپنے زمانے کی نسلی اور پشت در پشت رُونما ہونے والی تبدیلیوں کی روح کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ بالکل اچانک سمندر پار سے راک میوزک کی ایک نئی لہر امریکا آ گئی۔ انہیں ایڈسلیوان شو میں اپنا فن پیش کرنے کے لیے دعوت دی گئی تھی۔ بیٹلز کے نام سے ایک برطانوی بینڈ، جسے بیٹلز کا نام دیا گیا تھا، نیویارک سٹی کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر نمودار ہوا۔ اخباری نمائندوں اور تماشائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان کا خیر مقدم کیا۔ 9 فروری 1964 کو سات کروڑ سے زاید ناظرین نے ٹیلی وژن پر ان کا پروگرام دیکھا۔ بیٹلز کی دھنوں نے اولیت حاصل کر لی اور پھر دوسرے انگریزی گروپوں کے نغمے تھے، جیسے ہرمنز کا ہرمٹ اور رولنگ اسٹونز۔ برطانیہ اس ''حملے'' میں روک این رول کو اپنے آبائی وطن میں واپس لے آیا۔ اس وقت اس کی مقبولیت اپنے شباب پر تھی۔

اس کے بعد پانچ سال تک روک این رول سے ایک کلچر پیوست ہو گیا۔ اس کی موسیقی، منشیات کے تجربے سے گھل مل گئی۔ اس کا رنگ نسلی احتجاج میں شامل ہو گیا اور نوجوانوں کے کلچر میں جن چیزوں کی اہمیت تھی یعنی آزادانہ محبت اور جنگ کی مخالف تحریک کی حمایت اور دوسرے امور، یہ سب روک این رول میں شامل ہو گئے۔ اب بیٹلز کے الگ الگ مقبول گانوں کے البم بننے لگے۔ انھوں نے ماریجوانا اور مشرق کے مراقبے میں بھی اپنے تجربے کیے۔ بیٹلز کے انفرادی تجربوں میں امریکی نوجوان بھی شریک ہو گئے، جنھوں نے بیٹلز کے سیاسی نظریوں کو پسند کیا۔ ان کے بے تکلف مزاج اور کھلے ڈُھلے لباس کو منشیات میں ان کی دلچسپی اور موسیقی میں ان کے انداز کو سراہا۔ سن 60 کی دہائی میں راک کلچر کے اندر کالے اور گورے سب اس طرح گھل مل گئے کہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ سیاہ فام ''موٹاؤن'' فن کاروں نے جن کے ساتھ ڈیانا راس اور سپریمز بھی شامل تھے، رومانوی گانوں کی روایت کو برقرار رکھا جب کہ جمی ہینڈرکس نے اپنی اولیت پر اصرار کیا۔ 1967 میں جب پھول پیش کرنے والے

بچے سان فرانسسکو آئے اس کے بعد تو احتجاج کا لہجہ بہت تیز ہو گیا۔ جنگ کے خلاف احتجاج میں شدت آ گئی اور دو سیاسی قتل بھی ہوئے۔ کئی بڑے شہروں میں نسلی فسادات پھوٹ پڑے۔ شکاگو پولیس نے ڈیموکریٹک نیشنل کنونشن کے موقع پر احتجاج کرنے والوں کو دبا دیا۔ پھر یہ ہوا کہ جولائی 1969 میں وڈ سٹاک کنسرٹ کے موقع پر روک کے شیدائی ایک زبردست ریلی کے لیے اکٹھا ہوئے۔ یہ ایک پرامن تقریب تھی جس میں پانچ لاکھ تماشائی شریک تھے۔ ایسی ہی اور اتنی ہی بڑی تقریب کیلیفورنیا میں الٹامونٹ کے مقام پر ہوئی اور وہ پُرتشدد ثابت ہوئی۔

روک اینڈ رول کی موسیقی اب ایک بین الاقوامی کلچر کا حصہ ہے جس میں تمام نوجوانوں کے لیے، ایشیا، مشرقی یورپ، برطانیہ اور امریکا، ہر جگہ کے نوجوانوں کے لیے کشش پائی جاتی ہے۔ البتہ امریکا میں اب اس کے اندر پختگی آ گئی ہے۔ اب یہ نہیں ہوتا کہ چالیس جوان ''ہٹ پریڈ'' کرتے نظر آئیں۔ میجر بووس کے شوقیہ فن کاروں کے اوقات بھی نہیں رہے جس میں فرینک سناترا پہلی بار نمودار ہوا تھا، یا ٹیلی وژن کے وہ رنگا رنگ پروگرام بھی نہیں رہے جیسے ایڈ سلیوان کے ہوتے تھے، جس میں ایلوس پریسلے کو گویا ایک شوکیس میں پیش کیا جاتا تھا۔ بڑے کاروباری اداروں کے منیجر جو اس موسیقی پر کامل اختیار رکھتے ہیں وہ ریڈیو کے مختلف سامعین اور مختلف ذوق کے شائقین کے لیے الگ الگ آوازیں ٹیپ میں بھر رہے ہوں گے۔ گزشتہ دہائیوں میں محبت کے سادہ سے گیت مقبول تھے۔ وہاں سے 1970 کے عشرے میں لاؤڈ سپیکر کی گرجتی گونجتی آوازیں آ گئیں۔ وڈیو میں راک کے مناظر دکھائے جانے لگے۔ 1980 کے عشرے میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والے البم مائیکل جیکسن کے تھے، عنوان تھا ''تھرلر''۔ (سنسنی خیز) اس کے فروغ میں ایم ٹی وی سے بھی مدد ملی۔

کالی نسل کا ایک چھوٹا سا لڑکا ایک وقت میں جیکسن فائیو کے ساتھ کام کرتا تھا۔ یہ جیکسن اسی کی ایک ذرا بڑی شکل ہے۔ حیرت انگیز طور پر معصوم، جس کی سادگی نوعمر لڑکوں کو بہت پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ برطانیہ میں راک موسیقی کے مانے ہوئے فن کاروں ایرک کلیپٹن اور ایلٹن جان کے ساتھ امریکی فن کاروں کی ایک نئی نسل شامل ہو گئی ہے، اس میں میڈونا اور پرنس بھی شامل ہیں، جو نوجوانوں میں اور پھر ملے جلے تماشائیوں کو بہت اچھے لگتے ہیں۔

تماشے: براڈوے کے سٹیج پر

روایتی تفریح تو زندہ تھیٹر ہیں۔ امریکا میں سرگرمیوں کا مرکز نیویارک شہر میں مختلف

تھیٹروں کا اجتماع تھا جسے مجموعی طور پر ''براڈ وے'' کہتے تھے۔ اس نام کی ایک سڑک مین ہٹن کو لمبائی میں کاٹتی ہوئی گزرتی ہے۔ ٹائمز سکوائر (42ویں سٹریٹ) تک پہنچ کر اس کا نام ''گریٹ وہائٹ وے'' ہو جاتا ہے۔ براڈوے تھیٹر کی روایت کا سلسلہ انیسویں صدی سے جا ملتا ہے۔ اس کی روح ہمیشہ علمی نہیں بلکہ کاروباری رہی ہے، یعنی ہر مرتبہ چالو قسم کے کھیل پیش کرنا البتہ ہر نئے کھیل کی پہلی شام، تھیٹر کا ایک مبصر اس کی ایک تجزیاتی رپورٹ ضرور پیش کرتا ہے۔ مارچ 1915ء میں شوبرٹ برادرز نے جو نیویارک سٹی میں تھیٹر کی مارکیٹ پر حاوی تھے اسی روایتی طریقے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی اور نیویارک ٹائمز کے تھیٹر کے ناقد کو اپنے تھیٹر میں داخل ہونے سے روک دیا، کیوں کہ اس نے شوبرٹ برادرز کے ایک کھیل پر ناپسندیدہ تبصرہ کیا تھا۔ ٹائمز نے اس کا بدلہ یوں چکایا کہ شوبرٹ برادرز کے اشتہارات چھاپنے بند کر دیے۔ آخر ایک سال بعد شوبرٹ کو اپنا موقف بدلنا پڑا۔ اس سے ناقد کی آزادی پر سچائی کی مہر لگ گئی اور اخبار کی ادارتی ساکھ کے حوالے سے اس کی شہرت میں اضافہ ہو گیا۔

براڈوے تھیٹرز میں بہ یک وقت دو خواہشیں کام کرتی نظر آتی ہیں، ایک تو یہ کہ اعلیٰ معیار کا کھیل پیش کیا جائے، دوسرے کھیل کے اندر بنیادی انسانی احساسات کے لیے کشش پیدا کی جائے۔ ایسے کھیل جنہیں سمجھنے کے لیے بڑی ذہانت درکار ہو، کاروباری لحاظ سے پٹ جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں تھیٹر کا ایک کامیاب پروڈیوسر جان ڈی ولیمز تھا۔ اس نے ایک بار کہا، ''امریکا میں کہیں بھی ذہانت اور خوش ذوقی کا استعمال کسی کامیاب کھیل کے لیے قاتل ثابت ہوتا ہے کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی خصوصیت اگر آپ کے ساتھ چپک گئی تو آپ اپنے زعم میں ایسا کھیل پیش کریں گے، جسے کالج کے گریجویٹ دیکھیں گے۔'' اس طرح کا کھیل ناکام ہو گا، کیوں کہ ہر کالج گریجویٹ ایسے تمام ڈراموں کی صفوں کو پھلانگتا ہوا گزر جائے گا، جنہیں کسی کالج گریجویٹ نے کالج گریجوئٹس کے لیے بنایا ہو اور آخر میں کسی ''احمقانہ'' کھیل پر جا کر ٹک جائے گا اور اگر وہاں ناکامی ہوئی تو وہ لڑکیاں، لڑکیاں اور صرف لڑکیاں دیکھنا چاہے گا، جیسے ''او یُو گرلز'' یا ''دی سکنڈنگ آف ٹوٹی کف ڈراپ''۔ اس کے باوجود جب کہیں ذہانت نظر آئے، جیسے اونیل کا کھیل ''بی یانڈ دا ہورائزن''، جس میں نئے المیہ موضوعات پیش کیے گئے ہوں یا جان بیری مور جیسے اداکار نے جس میں اپنی ذات سے کشش پیدا کر دی ہو، جس کا مظاہرہ ''ہملٹ'' میں ہوا، تو ویسا کھیل باکس آفس پر بھی کامیاب رہتا

ہے۔ اونیل کی ذہانت نے دوسرے سنجیدہ کھیل پیش کرنے والوں جیسے آرتھر ملر اور ٹینیسی ولیمز کے لیے اسٹیج تیار کر دیا تھا۔

ڈرامے کا ایک اہم عنصر، جیسا کہ دیگر تفریحات میں بھی ہوتا ہے، انفرادی کشش ہے۔ یہ حقیقت اس پر کھل کر سامنے آ گئی، جب ایکٹرز ایکویٹی ایسوسی ایشن نے جس کے ارکان انفرادی طور پر اپنے ''باس'' سے بھی کہیں زیادہ معروف تھے، اگست 1919ء میں براڈوے تھیٹرز کے مالکان سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ پھر کسی قانونی کارروائی کے اندیشے کے تحت وہ اپنا موقف لے کر عوام کے آگے پیش ہوئے۔ ہڑتالی اداکاروں نے فنڈ اکٹھا کرنا شروع کیا، گلیوں میں مفت تماشا دکھایا اور براڈوے کے بازار سے امریکی جھنڈے لہراتے ہوئے گزرتے رہے۔ تیس دنوں کے بعد تھیٹر کے مالکان نے ہتھیار ڈال دیے۔ چند اداکاروں نے مل جل کر ایک تھیٹر ''گلڈ'' بنا لیا تھا اور ہڑتال کے دنوں میں ایک تھیٹر کرائے پر لے کر کھیل پیش کرتے رہے۔ اس تجربے نے امریکا اور یورپ کے ڈرامہ نگاروں جیسے چیخوف، ابسن یا جارج برنارڈ شا کے لیے زیادہ تخلیقی اور جرات مندانہ کھیل پیش کرنے کی خاطر فضا تیار کی۔ ان کا خیال تھا کہ تھیٹر کو ایک جمہوری ادارۂ امدادِ باہمی کی شکل دے دی جائے، جو منتخب ناظرین کے لیے کھیل پیش کرے۔ اس تصور کو بہت تقویت ملی اور ایک تھیٹر گروپ بن گیا۔ یہ سیاسی جذبات کی حامل وہ کمپنی تھی جسے امریکا کے محنت کش طبقے کو متعارف کرایا۔ کلیفورڈ اوڈٹ نے 1935ء میں اپنا کھیل ''ویٹنگ فار لیفٹی'' پیش کیا، جس میں نیویارک کے ہڑتالی ٹیکسی ڈرائیوروں کو، جنھوں نے ایک سال قبل ہڑتال کر دی تھی ڈرامائی انداز سے پیش کیا۔ ان طریقوں نے اداکاری کے فن کی تربیت کا بھی کام کیا اور مارلن برانڈو، پال نیومین، رابرٹ ڈی نیرو اور دیگر اداکار پیدا کیے۔

بہ ہر حال براڈوے تھیٹرز تفریح کے کاروبار میں تماشائیوں کو رجھانے اور پیسا کمانے میں مصروف رہے۔ یہی کام زیگفلڈ فولیز نے اس طرح کیا کہ کورس گانے والوں میں خوبصورت عورتوں کی قطار لگا دی۔ اس کے باوجود ایک ایسے کھیل کی ضرورت ہمیشہ رہی جو زبردست مقبولیت کا حامل ہو اور ساتھ ہی امریکیوں کو اپنے آپ پر نئے انداز سے نظر ڈالنا سکھائے۔ فلورنز زیگفیلڈ نے 1927 میں شو بوٹ پیش کیا، موسیقی پر مبنی براڈوے کے کھیلوں میں وہ پہلا کھیل تھا جس میں سماجی بیداری کے حوالے سے نسلی تعلقات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ کھیل ایڈنا فربر کے ناول کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ اس میں آسکر ہمرسٹین اور جیروم کرل جیسے تخلیقی

صلاحیت کے اداکاروں کی ذہانت سے فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ کھیل میں مسی سی پی دریا کے جنوبی ساحلوں پر آباد عام لوگوں کی زندگی اور محبت کو پیش کیا گیا تھا۔ پال جو کہ ایک اور نغماتی لیکن اختلافی کھیل تھا۔ یہ 1940ء میں بہت چلا، اس کے اداکاروں میں گینی کیلی نمایاں تھا۔ وہ ادنیٰ درجے کا ایک عورت باز شخص تھا، بہ ظاہر پھڑکیلا اور شوخ جو ہنستا گاتا عورتوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنا لیتا، ہمرسٹین نے 1943 میں رچرڈ راجرز کے اشتراک سے زرعی فارم پر زندگی کا ایک نقشہ پیش کیا تھا۔ اوکلا ہوما نامی اس ڈرامے نے اپنے مغربی طرز کے ملبوسات، پھرتیلے رقص اور یادگار دھنوں سے تماشائیوں کو ششدر کر دیا تھا۔ اس میں امریکا کی میدانی زندگی کو کسی عذر خواہی کے بغیر روایتی انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ اس تخلیقی ذہن کی حامل ٹیم براڈوے کے ایسے مقبول عام کھیل، کاروسل، ساؤتھ پیسفک اور دی ساؤنڈ آف میوزک پیش کیے۔ ہمرسٹین کا 1960ء میں انتقال ہو گیا۔

فلمیں

امریکا میں تفریحات کے شعبے میں بیسویں صدی کے دوران میں ایک نیا عنصر شامل ہوا۔ یہ تھی وہ ٹیکنالوجیز جو نہایت لطیف اور حساس پیکروں کو پیش کرنے پر قادر تھیں۔ ایڈیسن نے دو ایجادات کیں، ایک تو فونوگراف، متحرک تصویریں، جن کے تحت مناظر روانی سے سامنے آتے اور ان کے ساتھ آواز بھی، جسے برقی مشین پر منتقل کرنا ممکن ہو گیا۔ سب سے پہلی فلم کی تیاری مشرق میں ہوئی، غالباً اس لیے کہ ایڈیسن کا سٹوڈیو وہیں تھا۔ پہلے مختصر دورانیے کی فیچر فلمیں بنائی گئیں۔ پھر طویل دورانیے کی پروڈکشن، جس میں کہانی بھی ہوتی تھی۔ جب الاسکا کی مہم کی ایک فلم جو آٹھ ریل پر بنائی گئی تھی اور جس کا نام دی سپائلرز (The Spoilers) تھا پیش ہوئی تو نیویارک الستریٹڈ تھیٹر میں پہلے ہی ہفتے کے اندر چالیس ہزار افراد نے وہ فلم دیکھی۔ ڈبلیو ڈی گریفتھ کی فلم برتھ آف اے نیشن (Birth of a Nation) ڈھائی گھنٹے کی تفریحی فلم تھی جسے بارہ ریل پر بنایا گیا تھا، اس فلم میں کوکلکس کلان (Ku Klux Klon) (سفید فام قاتلوں کی نسل پرست تنظیم) کو بہت تاب ناک اور شان دار بنا کر پیش کیا گیا تھا، چنانچہ بوسٹن میں اس کی نمائش پر کالوں نے بلوہ کر دیا۔ دوسری طرف سینما کی تاریخ مرتب کرنے والے مصنف گریفتھ کو اس بنا پر لائق ستائش قرار دیتے ہیں کہ اس نے پہلی بار فلم سازی کی تکنیک میں اس کے وسیع امکانات پیش کیے تھے۔ اس نے ایک کے بعد دوسرے

'شاٹ' کی تعداد میں خاصا اضافہ کیا اور کہانی میں نمایاں واقعات پیش کرنے کے لیے کیمرے کو ایک سے دوسری جگہ منتقل کرنا شروع کیا۔ وہ گریفتھ ہی تھا جس نے پہلی بار کلوز اپ شاٹ پیش کیے اور بہ یک وقت رونما ہونے والے مناظر کو فلمایا۔ اس نے ایک نئے اسلوبِ فن کی تخلیق کی تھی، چنانچہ اس کی بہ دولت فلم کی صنعت میں ناظرین کی تعداد بڑھتی گئی۔

نیویارک میں زندہ ناچ گانے کے کھیلوں کے ایک پروڈیوسر جیسی ایل لاسکی نے 1913 میں ایک اپنی آزاد فلم کمپنی بنائی جس میں سسل بی ڈیمل کو کریٹیو ڈائریکٹر اور سیموئیل گولڈفش (جو بعد میں گولڈون کہلایا) کو اپنا سیلز ایجنٹ مقرر کیا۔ اس کی پہلی فلم، مغرب کے ایک سٹیج پلے دی سکیو مین (The squaw Man) پر مبنی تھی جس کا اداکار ڈسٹن فارنم تھا۔ ڈی مل نے یہ مشورہ دیا کہ فلم کو مغرب میں بنایا جائے جہاں حقیقی مناظر کی فلم بندی ہو سکے گی۔ ایڈیسن کے اسٹوڈیو میں جو برانکس (Bronk) میں واقع تھا ایک سہ پہر گزارنے اور فلم سازی کی تکنیک کا اچھی طرح مشاہدہ کر لینے کے بعد ڈی مل اپنے رفیقوں کو ساتھ لے کر فلیگ سٹاف اریزونا کے مغرب میں روانہ ہو گیا، جہاں انہیں نوے منٹ کی ایک فلم اٹھارہ دنوں میں مکمل کرنی تھی۔ ایڈیٹنگ کے لیے ہالی وڈ کی ایک لیبارٹری کرائے پر حاصل کر لی گئی، مشرق میں فلم بندی کی جگہوں کے مقابلے میں ہالی وڈ کو بہتر مواقع حاصل تھے۔ ایک تو بیرونی مناظر کی فلم بندی کے لیے اس کے موسم کا دورانیہ طویل تھا۔ پھر یہاں اجرت کی شرح بھی کم تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ آزاد فلم سازوں کے لیے یہ جگہ ان پابندیوں سے دور تھی جہاں موشن پکچرز پیٹنٹ کمپنی سے لائسنس لینا پڑتا تھا، جہاں مکمل آزادی کے ساتھ فلم بنانے کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی اور ایسا کرنے والے فلم سازوں کی ڈرایا دھمکایا اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی جاتی تھی۔ یہ جگہ چونکہ میکسیکو کی سرحد سے قریب تھی، اس لیے اگر امریکی عدالت کام روکنے کی کوشش کرتی تو فلم ساز میکسیکو کی قربت سے فائدہ اٹھاتے اور امریکی عدالت کے حکم سے بچ نکلتے۔ البتہ ڈی مل کے معاملے میں یہ ضرور ہوا کہ ایک نامعلوم اٹھائی گیرا دروازہ توڑ کر ان کی لیبارٹری میں گھس آیا اور ان کی فلم دی سکیو مین کے نیگیٹیو تباہ کر دیے تھے۔ خوش قسمتی سے ڈی مل نے ایک اور نیگیٹیو بنا لیا تھا۔

لاسکی کی پروڈکشن کمپنی نے ایڈلف ذوکور کے فیمس پلیز میں شمولیت سے پہلے آئندہ دو برس کے اندر بیس سے زیادہ فلمیں بنائیں۔ ادغام کے بعد 1917ء میں ان کا نام پیراماؤنٹ پکچرز رکھا گیا۔ بعد میں سام گولڈفش اور ایک شریک کار ایڈگر سالوِن پیراماؤنٹ سے

الگ ہو گئے اور گولڈون کے نام سے اپنا الگ اسٹوڈیو بنا لیا۔ اس کا بھی ادغام لوئی بی میئر پروڈکشنز کے ساتھ 1922 میں ہو گیا۔ اب اس کا نام ایم جی ایم تھا۔ ایک تیسرا ہالی وڈ سٹوڈیو یونائٹڈ آرٹسٹس 1919 میں قائم ہوا، اس میں اسٹوڈیو مینجر بنجمن شلیرگ کی کوششوں کا دخل تھا، جس نے پیراماؤنٹ کے سرکردہ اداکاروں اور ڈائریکٹروں کو باور کرا دیا کہ وہ اپنی الگ کمپنی بنا لیں۔ چنانچہ یونائٹڈ آرٹسٹس کی تکمیل عمل میں آئی۔ جس کے مشترکہ مالکان میں چارلی چپلن، ڈگلس فیئر بینکس اور میری پک فورڈ شامل تھے۔ خاموش فلموں کے دور کے یہ تینوں سب سے بڑے اداکار تھے۔ پھر ان کے ساتھ ڈبلیو ڈی گریفتھ تھا اور جنرل مینجر ولیم جی مکڈو۔ اس وقت تک یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ بعض اداکاروں اور اداکاراؤں کی موجودگی فلم کی مقبولیت کے لیے بت اہم ہوتی ہے۔ فلم کے بڑے اداکاروں کو جب اپنی اہمیت کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے مطالبے کے مطابق بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرنی شروع کیں۔ مثال کے طور پر پک فورڈ نے پیراماؤنٹ کے ساتھ دس فلموں کا معاہدہ دو ہزار ڈالر فی ہفتہ اور کل منافع کے نصف کی بنیاد پر کیا۔ چارلی چیپلن نے ایک سال کے کام کا معاہدہ 670,000 ڈالر کے عوض کیا۔ یونائٹڈ آرٹسٹس کا خیال یہ تھا کہ بڑے اداکار اگر خود اپنی کمپنی میں کام کرتے ہوتے تو سارا منافع خود ہی رکھتے۔

تھامس ایڈیسن سے شروع ہو کر اس کے بعد کئی موجدوں نے متحرک تصویروں کے ساتھ آواز کو شامل کرنے کا تصور کیا تھا، لیکن فلم سٹوڈیوز نے اس کوشش کو آگے نہیں بڑھایا، کیوں کہ خاموش فلمیں بجائے خود بہت مقبول تھیں۔ ریڈیو کی ٹیکنالوجی کے ایک موجد اعلیٰ لی ڈی فارسٹ نے 1923ء میں ایک فونوفلم کمپنی بنائی جس نے بصری ریکارڈنگ شروع کی، جس سے چلتی پھرتی تصویروں میں آواز شامل کی جا سکے گی۔ اس طریقے کو بل لیبارٹریز نے آگے بڑھایا اور اس کا نام ویٹافون قرار پایا۔ وارنر برادرز نے ویٹا فون ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے 1926ء میں ایک تجرباتی فلم بنائی، اس کا دوسرا بڑا کام آواز کے ساتھ مکمل مووی تیار کرنا تھا۔ وارنر برادرز نے سام ریفل سن کے نہایت مقبول کھیل دی جاز سنگر کو فلم میں پیش کرنے کا حق حاصل کر لیا۔ اس کھیل میں جارج جیسل شامل تھا۔ لیکن فلم کے لیے جیسل سے معاہدہ نہ ہو سکا۔ لہٰذا سٹوڈیو نے لجالسن سے معاملہ کر لیا۔ یہ وہی موسیقار تھا جس کی زندگی پر فلم بنائی گئی تھی۔ جالسن نوٹنکی کا ماہر اداکار اور اسٹیج پر فقرے بازی کا عادی تھا۔ جس بات نے فلم میں غیر معمولی کشش پیدا کر دی، وہ جالسن کی اپنی ماں کے ساتھ بے تکلف گفتگو تھی۔ یہ بات چیت

اتنی بے ساختہ تھی کہ جالسن کے نام سے ملک بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ اس بے تکلف گفتگو نے ناظرین کے دلوں کو چھولیا تھا۔ اب فلم انڈسٹری کے لیے آواز سے روگردانی ممکن نہیں تھی۔

موشن پکچرز کا عوامی ثقافت پر گہرا اثر پڑا۔ جیسے جیسے اس کی نمائش بڑھتی گئی دیگر تفریحات کی طرف عام لوگوں کا جانا کم ہو گیا۔ نسبتاً سستے تھیٹر میں مغرب کی مہماتی فلموں اور کامیڈی کی نمائش ہونے لگی۔ البتہ ''سوسائٹی'' (اعلیٰ طبقے کی) فلمیں اعلیٰ درجے کے تھیٹر میں دکھائی جاتی تھیں۔ نوجوان خواتین فلم میں یہ سیکھنے کے لیے جاتی تھیں کہ جدید سوسائٹی میں ڈیٹنگ (شادی سے پہلے عورت اور مرد کے اختلاط) کے مسائل سے کس طرح نپٹتے ہیں۔ ال جالسن کی دوسری فلم ''دی جاز سنگر'' کے بعد ''دی سنگنگ فول'' تھی جس میں اس نے ''ڈینی بوائے'' (Danny Boy) گایا۔ یہ انہی دنوں اس کے کردار کے انتقال کر جانے والے بیٹے پر تھا۔ دہشت ناک فلمیں بھی مقبول ہو رہی تھیں۔ جمعہ 13 فروری 1931 کو جب ڈریکولا کو پہلی بار دکھایا گیا، جس میں بیلا لوگوسی نے اداکاری کی تھی تو مریضانہ بے کیفی اور اداسی کے مارے ہوئے ناظرین کو ایک نیا موضوع مل گیا۔ ڈریکولا وہ خوف ناک عفریت تھا جس میں کچھ انسانی خوبیاں بھی تھیں، جس سے تماشائیوں میں ایک ہمدردانہ ردعمل پیدا ہوتا تھا۔ تھیٹر چلانے والوں نے اپنی فلم کو اس طرح بڑھاوا دیا کہ ناظرین سے کہتے کہ اس سے دور ہی رہیں اور تھیٹر کے اندر نرسوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ خوف کے مارے بے ہوش ہو جانے والے تماشائیوں کو ہوش میں لاتی رہیں۔ اس کامیاب طریقے نے ایسی ہی بعد کی فلموں کو راستہ دکھایا، جیسے فرنکینسٹائن (Frankenstein) بورس کارلف کے خوف ناک چہرے کی دہشت ناکی اور بھی بڑھ گئی جب اس نے میک اپ سے اپنا چہرہ گردے کی ساخت کا بنا لیا۔

1930ء کے عشرے کو فلم پروڈکشن کا زریں عہد کہا جاتا ہے۔ باصلاحیت فلم کار، اداکار اور کامیڈین نیویارک سٹیج سے اتر کر جوق در جوق قسمت آزمائی کے لیے ہالی وُڈ پہنچنے لگے۔ تھیٹر میں گاہکوں کو ترغیب دے کر لانے کے لیے ایم جی ایم کے مین پروڈکشن کے شعبے کے سربراہ ارونگ تھل برگ نے ایک منصوبہ یہ بنایا کہ صف اول کے متعدد اداکار ایک ہی فلم میں ڈال دیے تاکہ اس سے فلم کے شان و شکوہ کا اندازہ ہو اور تماشائیوں کے لیے اس میں زبردست کشش پیدا ہو۔ اس فلم کا نام گرانڈ ہوٹل تھا، اور جو 1932 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس زبردست فلم میں سوئیڈن کی اداکارہ گریٹا گاربو، جون کرافورڈ، جان لائنل، ہیری مور اور ایم جی

ایم کے دیگر بہت سے اداکاروں کو ساتھ ملا کر دھوم دھام سے پیش کیا گیا تھا۔ اسے چالاکی سے فروغ دیا گیا۔ چنانچہ لاکھوں ڈالر کی آمدنی ہوئی اور آئندہ صف اول کے اداکاروں کو ایک ہی فلم میں شامل کرنے کی ایک طرح پڑ گئی۔ ہالی وڈ کا بہترین سال 1939ء تھا۔ اس کے سات بڑے اسٹوڈیوز نے اس سال 341 فلمیں بنائیں۔ ان میں سے بہت سی یورپ والوں کے مزاج کی اور دوسرے درجے کی تھیں۔ لیکن انہی میں ''ڈارک وکٹری'' جیسی فلم بھی تھی، جس میں بیٹی ڈیوس اور ہمفری بوگرٹ نے کام کیا۔ انہی میں جان وائن کی ''سٹیج کوچ'' تھی اور ''مسٹر چپس'' بھی، اور ایسی دیگر یادگار فلمیں۔ یہ ہالی وڈ کی دو یادگار فلمز کا بھی سال تھا۔ ایک فلم تھی ''گان وِد دا وِنڈ'' اور دوسری ''وزرڈ آف اوز''۔ ''گان وِد دا وِنڈ'' امریکا کے جنوب کے بارے میں شفاف تجربہ پر مبنی فلم ہے جس نے اب تک کی ریکارڈ فلمی آمدن کی۔ ''وِزرڈ آف اوز'' نے جوڈی گارلینڈ کو تہذیب کی ایک سربرآوردہ شخصیت بنا دیا۔

فلمی صنعت نے نہایت اعلیٰ درجے کی اور سب سے زیادہ سستی تفریح مہیا کی تھی، چنانچہ اسے عروج حاصل ہوا۔ تاہم اس کی کامیابی پر مختلف طرح کے اعتراضات بھی ہوئے۔ پہلا حملہ اس پر مذہبی گروہوں کی طرف سے ہوا۔ اعتراض اس کی پروڈکشن میں ''بداخلاقی'' کا تھا اور یہ کہ ان کے اداکاروں کا طریقہ زندگی ''مبتذل'' تھا۔ ممکن ہے اس تنقید کو اس بات سے تقویت ملی ہو کہ کامیڈین ''موٹا'' آربکل 1921ء میں قتل کے ایک مقدمے میں ماخوذ تھا۔ ایک ایکٹریس آربکل کے سان فرانسسکو ہوٹل میں ایک رات کی شہوت پرستی اور بدمستی کے بعد دوسرے دن مردہ پائی گئی۔ چنانچہ کانگریس کی ایک کارروائی کے نفاذ کی خاطر انڈسٹری نے ایک کمیٹی سابق پوسٹ ماسٹر جنرل ول ہیز کی نگرانی میں فلم کی پروڈکشن میں خود احتسابی کی غرض

گوشوارہ 7-2　Table: 7-2

بیسویں صدی کی 10 اعلیٰ ترین فلمیں

(1996 میں آمدنی کے لحاظ سے ترتیب)

فلم	سال	آمدنی
گان وِد دی وِنڈ	1939	859 ملین ڈالر
سٹار وارز	1977	628 ملین ڈالر
ٹین کمانڈمنٹس	1956	570 ملین ڈالر
دی ساؤنڈ آف میوزک	1965	568 ملین ڈالر
جاز	1975	557 ملین ڈالر
ای ٹی	1982	552 ملین ڈالر
ڈاکٹر ژواگو	1965	540 ملین ڈالر
جنگل بک	1967	483 ملین ڈالر
سنو وائٹ	1937	474 ملین ڈالر
بن حر	1959	468 ملین ڈالر

(حوالہ: یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ)

سے قائم کر دی۔ کیتھولک چرچ نے ایک ادارہ شائستگی یعنی لیجن آف ڈیسنسی قائم کر دیا جس نے غیر اخلاقی فلموں کو بائیکاٹ کرنا شروع کیا۔ اگرچہ ان اقدامات سے بے ویسٹ کا کیریئر تباہ ہو گیا، لیکن ان پر عمل درآمد بہت تاخیر سے ہوا۔

قبل اس کے کہ کسی طرح کا احتساب ہوتا سسل بی ڈی مل نے1932ء میں ایک فلم دی سائن آف کراس بنائی، یہ نیرو کے روم کے بارے میں ایک سنسنی خیز فلم تھی جس میں کلاڈٹ کولبرٹ کو جس میں اس کے سینے عریاں تھے دکھایا گیا، ساتھ ہی دو برہنہ ہم جنس پرست عورتوں کا رقص تھا۔ فلم میں چالاکی سے یہ درسِ اخلاق بھی دیا گیا تھا کہ یہ قرینہ قابل مذمت ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ انڈسٹری پر ایک دوسرا حملہ امریکا کے جسٹس ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے ہوا۔ ایک انٹی ٹرسٹ ڈوژن نے1938 میں ہالی وڈ کے آٹھ سٹوڈیوز اور اس کے بہت سے عہدے داروں کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا کہ وہ آزاد تجارت میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ اس اقدام نے تھیٹر کے مالکان کو اپنی املاک دوسری طرف منتقل کرنے اور بکنگ کے انتظامات تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

فلم انڈسٹری کو اس سے بھی بڑا چیلنج ٹیلی وژن کے ساتھ مقابلے کی صورت میں درپیش ہوا۔ چنانچہ فلم بینوں کی تعداد سالانہ آٹھ کروڑ سے کم ہو کر1952 میں صرف چار کروڑ ساٹھ لاکھ رہ گئی، اس لیے کہ نئی ٹیکنالوجی آ گئی تھی۔ ٹیلی وژن کی یہ صلاحیت جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، تفریح کو آزادانہ طور پر ٹی وی سیٹ رکھنے والے کے گھر میں مہیا کرنا ہے۔ لیکن اس میں دو کوتاہیاں بھی تھیں، ایک تو اس کا پردہ بہت چھوٹا ہوتا ہے، دوسرے اس میں شباہتیں ان کے اصل رنگ میں نہیں آتیں، چنانچہ فلمی صنعت نے اپنی ٹیکنیکل اختراعات کے ساتھ بصری فن میں اپنی برتری کا ثبوت دیا۔ ان میں ایک تھا ''سائنے راما''۔ اس تکنیک میں رنگین فلم ساتھ لگے ہوئے تین پردوں پر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ایک نہایت وسیع منظر نامہ سامنے آ جاتا ہے، اس میں تھیٹر کے اندر بیٹھے ہوئے ناظرین کو یوں محسوس ہوتا جیسے سچ مچ کے رولر کوسٹر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک سال بعد1953 میں سینما سکوپ کی تکنیک آ گئی، جس میں ایک ہی کیمرہ نہایت کشادہ منظر پیش کرنے پر قادر تھا۔ اس طرح کی نمائش کے لیے سیکڑوں تھیٹر تبدیل کر دیے گئے۔ فلم بین کاغذ کی عینکیں لگا کر بیٹھتے تھے اور انہیں سہ سمتی فلم نظر آتی تھی۔ بہ ہر حال فلم کے منظر اور آواز کو بہتر بنانے کا عمل برابر جاری رہا۔ اور1970ء کے عشرے میں ای میکس(Imax) آ گیا۔

بہ ہر حال ہالی وڈ ٹیلی وژن کے دور میں بھی پھیلتا پھولتا رہا، کیوں کہ اس کے وڈیو کرائے پر چل رہے تھے، فلمیں باہر بھی جا رہی تھیں۔ فلم لائبریریوں کے لیے اور ٹیلی وژن فیچر کی ضرورت کے تحت بھی فلمیں بنائی جاتی رہیں، لیکن ٹیلی وژن کے لیے ''شو'' تیار کرنے میں فلم انڈسٹری نے سستی سے کام لیا۔ اس سے آزاد پروڈیوسروں کے لیے راستہ کھل گیا۔ انھی میں سے ایک ریویو پروڈکشنز ہے، جو میوزک کارپوریشن آف امریکا کا ایک ذیلی ادارہ ہے اور ٹیلنٹ فراہم کرنے والی ایجنسی ہے۔ ہالی وڈ کے نمایاں اداکار (سٹار) کی نمائندگی کرنے والے ایجنٹوں کو ابتدا میں پروگرامنگ میں شرکت کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ سکرین ایکٹرز گلڈ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ ایم سی اے (میوزک کارپوریشن آف امریکا) نے گلڈ کے پریذیڈنٹ رونالڈ ریگن سے بات چیت کر کے مذکورہ پابندی ختم کرا دی۔ اس طرح ایم سی اے نے ٹیلی وژن کی صورت میں پاور ہاؤس کی صورت اختیار کر لی تھی اور 1950 کے اواخر میں نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے ایک تہائی شو وہی ایم سی اے تیار کرتا تھا۔ اس ٹیلنٹڈ ایجنسی نے ایک وقت میں پیراماؤنٹ پکچرز کی 1948 سے پہلے کی تمام فلمیں 1958ء میں اور یونیورسل پکچرز کا ہالی وڈ اسٹوڈیوز اور اس کے ساتھ ہی بعد میں اور بہت کچھ خرید لیا، لیکن جب اس نے 1962ء میں ڈیکا ریکارڈز خریدنے کی کوشش کی تو یونیورسل پکچرز کی آبائی کمپنی یعنی امریکی ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس نے حکم امتناعی جاری کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ایم سی اے کو ڈیکا اور یونیورسل پکچرز حاصل کرنے کے لیے ٹیلنٹ ایجنسی کے طور پر اپنا کاروبار چھوڑنا پڑا۔ ان شرائط کو تسلیم کرنے میں جو ذہانت پوشیدہ تھی اس کی تصدیق 1990ء میں ہوگئی جب ویسرمین نے متسوشیتا کے ساتھ ایم سی اے کی فروخت کا معاملہ 6 بلین ڈالر میں طے کیا۔

چنانچہ ہالی وڈ، فلم سازی کے پرانے سٹوڈیو سسٹم سے نکل کر نئے نظام میں داخل ہو گیا، جس کی اساس تخلیقی صلاحیتوں کو یک جا کر لینا تھا۔ باکس آفس میں کامیابی کا آغاز اسٹارز (صف اوّل کے اداکاروں) سے ہوتا ہے اور اسٹارز کی فراہمی کے وسیلے پر ٹیلنٹ ایجنسیوں کا کنٹرول ہوتا ہے۔ کامیاب فلم سازی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ صحیح صحیح اسکرپٹ دست یاب ہو، ڈائرکشن صحیح ہو، کیمرہ مین اور موسیقار اپنے اپنے فن کے ماہر ہوں۔ جو شخص، اپنے روابط، معاہدوں کا مالک ہو اور معاملات طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور ان تمام عناصر کو یک جا کر سکتا ہو، وہ فلمی صنعت میں صحیح طاقت کا مالک ہوگا، آج کل کی پروڈکشن میں ایک اضافی عنصر

کمپیوٹر سے خصوصی اثرات پیدا کر لینا ہے۔ جارج لوکاس نے1977 سے اپنی فلم ''سٹار وارس'' کے ساتھ کمپیوٹر فلموں کے رجحان کا آغاز کیا۔ اسٹیون اسپل برگ نے ''ای ٹی'' اور ''جیراسک پارک'' جیسی فلمیں، جن میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے، بنا کر ہالی وڈ کے انتہائی کامیاب ڈائریکٹر کا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔1990ء کے عشرے میں متحرک کارٹون آ گئے اور یہ ان کا نشاۃ الثانیہ تھا، اس دور میں ڈزنی سٹوڈیوز نے دی لٹل مرمیڈ، الہ دین، دی لائن کنگ اور دوسری فلمیں بنائیں، جن میں بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے یکساں کشش تھی۔ وہ تخلیقی اظہار جو ماضی میں براڈوے کی کامیاب نغماتی فلموں میں نظر آیا اب اس نے ایک نیا پیکر تلاش کر لیا ہے۔

ریڈیو کے نشریے

نشری ٹیکنالوجی کے آنے کے بعد بیس برس تک شوقیہ ریڈیو چلانے والوں کا دوردورہ رہا۔ پھر پہلے کمرشل ریڈیو سٹیشن کے ڈی کے اے(KDKA) نے نومبر1920 سے پیٹس برگ کے مقام سے اپنی باقاعدہ نشریات کا آغاز کیا۔ ابتدا میں ریڈیو ریسیور کی فروخت سے ہی منافع ہاتھ آتا تھا۔ ریڈیو سیٹ کی فروخت جوں جوں بڑھتی گئی، اضافی سٹیشن قائم ہوئے جن میں کمرشل نشریوں کا لائسنس لینا ہوتا تھا۔ امریکا کے ریڈیو کارپوریشن نے ڈیوڈ سرنوف کی سربراہی میں1926 میں پہلا ریڈیو نیٹ ورک (نشریات کا سلسلہ) این بی سی کے نام سے قائم کیا۔ فلاڈلفیا میں سگار بنانے والے ایک شخص سام پالے نے1928 میں یونائٹڈ انڈی پنڈنٹ براڈ کاسٹرز کو خرید لیا اور اسے اپنے بیٹے کے حوالے کر دیا۔ ولیم پالے نے اس نئے نیٹ ورک کا نام کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم رکھا۔1927 کے ریڈیو ایکٹ کے تحت ریڈیو سٹیشنوں کی لائسنسنگ وفاق کے حصے میں آئی۔ چنانچہ کمرشل نشریات چلانے والوں کو اپنے پروگرام نشر کرنے کے لیے الگ سے وقت دے دیا گیا۔1934ء کے وفاقی کمیونیکیشن ایکٹ کے تحت ایک آزاد ایجنسی قائم کی گئی جو تمام نشریات پر اپنی گرفت رکھے گی۔ مڈل ٹاؤن کے مصنف1920 کے عشرے کے نشری پروگراموں کو اس طرح بیان کرتے ہیں: ''راگ راگنی والے کنسرٹ، ڈاکٹر فوسڈک کا وعظ، یا صدر کولج کا انتخابات سے ایک شام پہلے اپنے باپ کو الوداع کہنا۔'' اس کے بعد امریکا کی نشریات میں نوٹنکی والوں جیسی کامیڈی، کھیلوں کا بیانیہ اور کچھ ڈرامائی تشکیل شامل ہوتی گئیں۔

برطانیہ میں1904 کے وائرلیس ٹیلی گرافی ایکٹ کے تحت تمام وائرلیس پیغام رسانی

کے لیے پوسٹ آفس کے لائسنس کا حصول ضروری قرار دیا گیا۔ ایجنسی نے ریڈیو بنانے والوں سے کہا کہ سب مل جل کر اپنا کارٹل (اتحاد) بنالیں اور اس ہڑبونگ سے بچ جائیں جو امریکا میں نشریات پر پابندی نہ ہونے سے دیکھا گیا ہے۔ برطانیہ کی براڈکاسٹنگ کمپنی جس نے بعد میں بی بی سی کا نام پایا،1922 میں لائسنس یافتہ ہوگئی۔ براڈکاسٹنگ کو مفاد عام کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ بی بی سی کے مینجنگ ڈائریکٹرز جان ریتھ کے تحت ریڈیو کو "کلچر کا خادم" بنا کر کام کرنا تھا، اس طرح ایک متحدہ اور مساوات پر مبنی معاشرے کی تشکیل ممکن ہوگی۔

بی بی سی کے لائسنس میں ایک شق کی رو سے اسے اپنے پروگراموں میں اخلاقی معاملات میں دخل اندازی سے روک دیا گیا تھا۔ اگرچہ 1928 میں اس شق میں قدرے نرمی پیدا کر دی گئی تھی لیکن بی بی سی کے نشریوں پر گرفت اتنی سخت تھی کہ اسے حکومت برطانیہ کی ہی توسیع سمجھا جانے لگا تھا۔ ونسٹن چرچل نے شکایت کی کہ سیاست دان، جیسے وہ خود، پارٹی لیڈر کے لیے ناقابل قبول ہونے کی صورت میں بی بی سی تک رسائی سے محروم کر دیے گئے تھے۔ بی بی سی کی پالیسی یہ تھی کہ (خبری) نشریوں سے ایسے تمام جرائم کو اور حادثات کو خارج کر دیا جائے جن کی کوئی ملکی یا بین الاقوامی اہمیت نہیں۔" ایک اور پالیسی یہ تھی کہ سیاست دانوں کے بارے میں اشتہارات، امریکی پابندی، طبی امور اور سکاٹ کے لوگوں یا ویلش والوں (ان میں آئرش لوگ شامل نہیں) کے حوالے سے لطیفے نشر نہیں ہوں گے۔

1938 میں میونخ کا بحران آنے تک بی بی سی کو دیگر حریف نشری اداروں سے مقابلے میں بہتر سمجھا جانے لگا تھا۔ امریکا میں خبروں کے نشریوں میں زیادہ کشادگی تھی، جن سے امریکی رائے عامہ کو یورپ میں ہونے والے واقعات کی، برطانوی نشریوں کے مقابلے میں زیادہ واضح تصویر نظر آ جاتی تھی۔1930 کے سال کے وسط میں دو غیر ملکی کمرشل ریڈیو، ریڈیو نارمنڈی اور ریڈیو لگزبرگ کے باہمی مقابلے نے بی بی سی کو بھی اپنی پالیسی میں نرمی برتنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے مدتوں خبری نشریوں میں انسانی احساسات کے عنصر کو شامل ہونے سے روک رکھا تھا، تاکہ سامع کی توجہ تمام تر پالیسی کے امور پر ہو۔ اب 1938 میں تبدیلی شروع ہوئی۔ بی بی سی نے جس کا 1934 تک کوئی الگ سے خبروں کا شعبہ بھی نہیں تھا، انٹرویو ریکارڈ کرنے اور خاص طرح کے آلات سے لیس گاڑیوں میں چشم دید رپورٹیں مرتب کرنی شروع کر دیں۔ اب اس کے نشریوں میں زیادہ تفریحی فیچر شامل کیے جانے لگے۔ ان میں نہایت مقبول

کھیلوں کی نشریات بھی شامل تھیں۔ اس وقت ورائٹی آرٹسٹس فیڈریشن نے1923 میں اس ڈر سے کہ ریڈیو کے ہاتھوں کہیں ان کا روزگار نہ ختم ہو جائے اپنے ارکان سے کہا کہ بی بی سی کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ کامیڈین تو اس بات کے عادی تھے کہ سامنے بیٹھے ہوئے ناظرین سے برجستہ داد مل جائے، اب انہیں ریڈیو کے سٹوڈیو میں کام کرنا بہت مشکل لگا۔ بی بی سی نے بڑی کاوش کے بعد ایک ایسی موسیقی دریافت کی جو مختلف مزاج رکھنے والوں کو پسند آئے۔ پہلے اس کے موسیقی کے پروگراموں میں ہلکے پھلکے نغمے اور رقص کے ساتھ موسیقی شامل ہوئی تھی، اب اس میں گراموفون کے ریکارڈ زیادہ آنے لگے اور زندہ ناچ گانوں کی طرح تفریحی پروگرام بھی۔

امریکی ریڈیو زیادہ شاطر تھا جس نے نوٹنکی کے پرانے اسلوب کو نئے اسلوب میں ڈھال لیا۔ یورپ میں پائے جانے والے بحران پر ایڈورڈ آرمرو اور ولیم شیرر جیسے غیر ملکی نامہ نگاروں کی رپورٹیں نشر کر کے اس نے اپنی ساکھ بڑھالی تھی۔ جب نیول چیمبرلین نے میونخ میں ہٹلر سے ملاقات کی تو اس کے بعد تین ہفتوں کے اندر اتنے ریڈیو سیٹ فروخت ہوئے جو اتنے دنوں میں پہلے کبھی فروخت نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت ''دی نیشن'' نے لکھا کہ امریکا کے اندر خبروں کی ترسیل کے نظام میں ریڈیو نے بالادستی حاصل کر لی ہے۔ اکتوبر1938 میں اس وقت ریڈیو کی طاقت تو اور بھی ثابت ہوگئی جب اورسن ویلز اور ان کی مرکزی تھیٹر کمپنی نے ایچ جی ویلز کے ناول ''دی وار آف دی ورلڈز'' پر مبنی ایک ریڈیائی کھیل نشر کیا۔ اس کھیل میں مریخ کے خلائی جہاز کے نیو جرسی میں اترنے کی فرضی خبریں شامل تھیں۔ ملی جلی چیزوں کی جھلکیاں، منتشر انداز میں طلسماتی آوازوں کے ساتھ سنائی دیں اور پھر سناٹے کا ایک طویل وقفہ آ گیا، چنانچہ نیویارک کے ہراساں شہریوں نے جب شہر سے بھاگنے کا ارادہ کیا تو سڑک پر ایک میل لمبا ٹریفک جام ہو گیا۔ خبروں اور انٹرویوز کو تیزی کے ساتھ عام لوگوں تک پہنچانے کا ایک مثالی ذریعہ یہی ریڈیو تھا۔ جس کی مثال مشہور اخباری کالم نگار والٹر ونچل سے ملتی ہے جو ایک چھوٹی سی صنعت میں شہرۂ آفاق اور موضوع گفت گو شخص بن گیا۔ اس نے جیک بنی اور باب ہوپ جیسے ذہین فقرہ بازوں کو دل نشین انداز میں پیش کیا اور 'دی شیڈو'، یا 'دی لون رینجر' جیسے خیال افروز ڈرامے پیش کیے۔ چنانچہ اس نے ''تھیٹر آف دی مائنڈ'' کی شہرت پائی۔

ٹیلی وژن

1930 کے عشرے میں، جو ریڈیو کا دور شباب تھا، ڈیوڈ سرنوف اور اس کے آر سی اے انجینئر، الیکٹرانک ٹیلی وژن کے موجد فیلوفارنز ورتھ کے ساتھ اس ٹیکنالوجی کے حصول کی خاطر ایک جنگ میں مصروف تھے۔ وہ اس کے پیٹنٹ حاصل کرنا چاہتے تھے یعنی اس کے استعمال کا حق مانگ رہے تھے۔ سرنوف نے 1939 میں نیویارک کے عالمی میلے میں کمرشل ٹیلی وژن کے حوالے سے آر سی اے کے نظام سے پردہ اٹھایا ہی تھا کہ دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی اور اس کا سلسلہ معطل ہوگیا۔ وفاقی مواصلاتی کمیشن نے کمرشل ٹیلی وژن کو ڈبلیو ایچ ایف (انتہائی طاقت کی فریکوئنسی) کے استعمال کی اجازت دے دی جس کے مطابق پورے ملک کے لیے صرف بارہ چینل استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ سی بی ایس نے یو ایچ ایف (غیر معمولی فریکوئنسی) کے لیے رنگین ٹیلی وژن نشریوں کی خاطر تاخیر کا تقاضا کیا تا کہ اس دوران میں ڈبلیو ایچ ایف کے تحت براڈ کاسٹنگ میں مزید ترقی ہو چکی ہو۔ ٹیکنیکل امور میں غیر یقینی صورت حال کے ہوتے ہوئے ٹیلی وژن کی صنعت جمود کا شکار ہوگئی۔ اپریل 1947 میں جب ایف سی سی (وفاقی مواصلاتی کمیشن) نے سی بی ایس کی درخواست مسترد کر دی تو اسے ساٹھ نئی درخواستیں اسٹیشن قائم کرنے اور ڈبلیو ایچ ایف کے سیٹ فروخت کرنے کے لیے موصول ہوئیں۔ اس سال صرف ساٹھ ہزار سیٹ استعمال میں تھے جن کی دو تہائی تعداد نیویارک میں تھی۔ ان کی بھی نصف تعداد متمول افراد کے پاس تھی اور باقی نصف شراب خانوں میں وہاں آنے والے بیشتر مردوں کے لیے تھی، جو زیادہ خبریں یا کھیلوں کے پروگرام دیکھتے تھے۔ چونکہ وسائل بہت محدود تھے، لہٰذا ایک مقبول رجحان یہ تھا کہ صلاحیتوں کو بدل بدل کر نئے انداز سے پیش کیا جائے اور کامیڈی اور ورائٹی شو کی خاطر پرانے زندہ ناچ گانوں کو نئے روپ میں ڈھالا جائے اور کمرشل ٹیلی وژن میں ریڈیو کا مواد بھی استعمال کیا جائے۔

این بی سی اور سی بی ایس دونوں نے ریڈیو سے جو منافع کمایا تھا، ٹیلی وژن کے ابتدائی دور کے پروگراموں کی خاطر اسے خرچ کیا۔ اس زمانے میں ہالی وڈ نے ایک کوشش یہ کی کہ مووی تھیٹر میں متبادل تفریح مہیا کرنے کی خاطر بڑے اسکرین کے ٹیلی وژن رکھنے شروع کیے۔ کمرشل ٹیلی وژن نے ان کی اس کوشش کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ اس طرح ہالی وڈ کی فلم

کمپنیوں کو ٹیلی وژن اسٹیشن قائم کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس طرح ایک تو ڈبلیو ایچ ایف (وہری ہائی فریکوئنسی) کے لائسنسوں کی قلت تھی، دوسرے 1948 سے 1952 کے درمیانی عرصے میں نئے سٹیشنوں کی تنصیب پر ایف سی سی نے پابندی لگا دی تھی، لہٰذا کمرشل ٹیلی وژن انڈسٹری مشتہرین اور پروگرام پیش کرنے والے پروڈیوسرز، دونوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں پوری طرح بااختیار تھی۔ اب مشتہرین پروگرام پیش کرنے میں پوری طرح مالک و مختار نہیں تھے، لہٰذا انھوں نے اپنے اختیارات ٹیلی وژن نیٹ ورک کے حوالے کر دیے۔ البتہ موضوع کے اعتبار سے پروگراموں کے مواد، کردار اور زبان کے سلسلے میں ترمیم و تنسیخ کے کچھ اختیارات اپنے پاس رہنے دیے۔ پروگرام پروڈیوس کرنے والوں سے ٹی وی نیٹ ورک کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ حق ملکیت اور اس کے استعمال کا اختیار ان کے پاس ہوگا، اس کے عوض نیٹ ورک پر انہیں کچھ وقت فراہم کیا جائے گا۔ 1952 کے زمانے میں ''آئی لولوسی'' اور ڈریگنٹ جیسے کھیلوں کی کامیابی نے پہلے سے فلم بند کیے ہوئے ڈراموں کی مقبولیت میں اضافہ کر دیا۔ ان ڈراموں کو بار بار دکھانے اور خاص طور پر بیرون ملک دکھانے کا اختیار اس طرح نفع بخش ثابت ہوا۔

1950 کے عشرے کے وسط میں ٹیلی وژن کے ناظرین کی صف میں ایک اضافہ ہوا۔ اب ان میں نچلے اور متوسط طبقے کے ناظرین بھی شامل ہو گئے۔ اس سال جس قدر لوگوں نے ٹی وی سیٹ خریدے، ان میں نصف تعداد ادھار پر خریدنے والوں کی تھی۔ ایک صحافی کے بقول، ٹی وی غریب لوگوں کا تھیٹر بن گیا ہے۔ تخلیقی اور طبع زاد کھیل، جیسے پیڈی چایا وسکی کا کھیل ''مارٹی'' 1950 کے اوائل میں کمرشل ٹی وی پر دکھایا گیا۔ لیکن نیٹ ورک چلانے والوں میں اعلیٰ عہدے داروں نے یہ دیکھا کہ کوئی پروگرام اگر تسلسل کے ساتھ چلتا رہے تو ناظرین کی تعداد میں اس سے اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً 'گن سموک' جو ایک مقبول ڈراما تھا 1956 سے 1975 تک مسلسل چلتا رہا۔ بونینزا 1960 سے 1973 تک نشر ہوتا رہا۔ 1930 کے عشرے میں 'سوپ آپرا' دریافت ہوا۔ دوپہر کے نشریے کے سامعین کے لیے یہ خاص طور پر بنایا گیا، جس کے ذریعے عورتوں میں کپڑوں کی دھلائی کے لیے صابن کا برادہ فروخت کرنا مقصود تھا۔ کمرشل ٹیلی وژن کی وضع حاوی ہوگئی۔ ٹیلی وژن کی مقابلے کی دوڑ میں سی بی ایس نے بہت تاخیر سے این بی سی کا پیچھا کیا تھا، لیکن 1950 کے عشرے میں بڑی دھوم سے آگے آ گیا اور نیٹ ورک میں صف اول کی جگہ لے لی۔ اس کے چیئرمین ولیم پیلے کو ناظرین کے ذوق اور پسند کا بڑا صحیح اندازہ

تھا۔ اس نے اوّل درجے کے کامیڈین، مثلاً رَیڈ سکیلیٹن، جیک بنی، برنز اور ایلن،1940 کے عشرے میں این بی سی ریڈیو سے توڑ کر اپنے یہاں ملازم رکھ لیے۔ پھر بعد کے عشرے میں انہی لوگوں کو ٹیلی وژن پر پیش کیا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے اداکار کی شخصیت ہی ناظرین کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ناظرین اپنے شناسا چہروں کو ہفتے کے ہفتے دیکھتے اور آسودہ ہو جاتے ہیں۔

سی بی ایس نے اپنا ایک سٹائل نفنی نٹ ورک بنایا، کیوں کہ اس کے پروگراموں، خاص طور پر ٹیلی وژن کی خبروں میں ایک اعلیٰ معیار پیش کیا جاتا تھا۔ پیلے کی گہری دوستی ایڈورڈ آرمرو کے ساتھ تھی اور اس کا تعاون بھی اسے حاصل تھا۔ ایڈورڈ آمرو ایک نام وَرصحافی اور تفتیشی صحافت میں منفرد تھا، اور بڑی زبردست خبریں چھان بین کے بعد لاتا تھا۔ مثال کے طور پر اس نے ''سی اِٹ ناؤ'' نامی پروگرام میں جو مارچ1954 میں نشر ہوا جوزف میکارتھی کے خلاف بڑھتی ہوئی رائے عامہ کا رخ موڑ دیا۔ میکارتھی اشتراکیت کے خلاف باقاعدہ جنگ کر رہا تھا۔ سی بی ایس کے شان دار خبرناموں اور پُروقار پروگراموں کو مالی امداد مقبول عام پروگراموں سے حاصل ہوتی تھی، جیسے معمے اور بوجھو تو جانیں، کھیلوں کے نشریے اور ایکشن (مار دھاڑ والے) ڈرامے۔ نیٹ ورک میں زیادہ سے زیادہ ناظرین کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے اتنا سخت مقابلہ ہوا کہ بالآخر پروگراموں کو کم تر درجے کے لوگوں کے لیے نہایت پست سطح پر لانا پڑا، جن کے بارے میں نیوٹن مینو نے1961 میں کہا تھا کہ یہ ایک ''بنجر اور لق و دق صحرا ہے۔'' ناقدوں نے کمرشل ٹیلی وژن کے ایک متبادل کا مطالبہ کیا۔ ایف سی سی نے اس کے جواب میں242 چینل صرف اسی لیے مختص کر دیے جو تعلیمی براڈ کاسٹنگ کے لیے تھے۔ پہلے غیر کمرشل سٹیشن نے 1953 میں اپنی نشریات کا آغاز کیا، لیکن پبلک ٹیلی وژن کوئی دس سال تک عذاب میں مبتلا رہا۔ 1960 میں امریکا کے صرف7 فی صد ٹی وی سیٹ ایسے تھے جن میں یو ایچ ایف سگنل نصب تھے۔ پھر جب کمرشل ٹیلی وژن کے کوئز شو پروگراموں میں سکینڈل کی شکایت آنے لگی تو کانگریس نے تعلیمی نشریات کے لیے زرِ تلافی کی منظوری دے دی اور شرط عائد کر دی کہ امریکا میں جو نئے ٹی وی سیٹ فروخت کیے جائیں گے، ان میں یو ایچ ایف کے آلات ضرور نصب ہوں گے۔

1940 کے عشرے میں جب امریکا کے محکمہ انصاف نے نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ اپنے چھوٹے نیٹ ورک کو منتقل کر دے تو اے بی سی یعنی امریکن براڈ کاسٹنگ کمپنی نے دو بڑے کمرشل ٹی وی نیٹ ورکس کو آپس میں ملا دیا۔ اور پھر

1986 میں روپرٹ مروک نے آزاد نشریاتی سٹیشنوں کو جوڑ کر فاکس نیٹ ورک بنا لیا۔ 1970 کے عشرے تک اے بی سی کی حیثیت واجبی سی رہ گئی تھی، یہاں تک کہ اولمپک کھیلوں کی سپانسر شپ اسے مل گئی اور پروگرام کی ڈائریکشن فریڈ سلور مین نے سنبھال لی، جو ایک زمانے میں تفریحی پروگراموں کا ماہر تھا۔ چنانچہ اس نے اے بی سی کو صف اول میں پہنچا دیا۔ ہالی وڈ کے ایک سابق پروڈیوسر گرانٹ ٹنکر کی ڈائریکشن کی بہ دولت این بی سی کی شہرت ایک بار پھر عود کر آئی۔ ٹیڈ ٹرنر نے جو انڈیانا میں ایک مقامی نشریاتی سٹیشن کا مالک تھا، کیبل نیوز نیٹ ورک کے نام سے محض خبروں پر مبنی چینل کا آغاز کیا، جو رات دن کے 24 گھنٹے بین الاقوامی واقعات کی رپورٹیں نشر کرتا تھا۔ ٹرنر کو پانچ سال تک نقصان اٹھانا پڑا۔ بالآخر 1985 میں اس کی نشریات نفع بخش ثابت ہونے لگیں۔ اس کے ذریعے سے عالمی مرتبے کے سیاسی رہنما آپس میں بات چیت کرتے ہیں اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات پر اپنی نگاہ رکھتے ہیں۔

بی بی سی نے اندرون ملک اپنے ناظرین کے لیے ٹی وی نشریوں کا آغاز امریکا سے بھی پہلے کر دیا تھا۔ جنگ کے زمانے میں اس سلسلے کو منقطع کرنا پڑا لیکن 1946 میں اسے دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ 1950 میں صرف امریکا، برطانیہ، فرانس اور سوویت یونین میں ٹی وی نشریات باقاعدگی سے دیکھی جاتی تھیں، روسیوں نے ٹی وی کو مارکسی لینینسٹ اندازِ فکر پیدا کرنے اور سیاسی وتہذیبی ترقی کو تمام سوویت عوام تک لے جانے کے لیے استعمال کیا۔ فرانس نے بھی اپنے پروگراموں میں سیاست کی چاشنی حل کی۔ ان کے متعدد ٹیلی وژن سٹیشنوں کے مالک سیاست دان تھے یا خود حکومت تھی۔ برطانیہ نے تعلیمی اور تہذیبی نشریات پر زیادہ زور دیا۔ امریکا نے، جس کی نظریں بازار کے مطالبوں پر تھیں، ایسے ٹی وی شو تیار کیے جو زیادہ سے زیادہ تماشائیوں کے لیے باعث کشش تھے۔ گھریلو زندگی پر مبنی کھیل جیسے 'دی ایڈونچرز آف اوزی اینڈ ہیریٹ' اور 'فادر نوز بیسٹ' 1950 کے عشرے میں خاصے مقبول ہوئے۔ اے بی سی کے ڈزنی لمیٹڈ نے 1954 میں پہلی بار اپنا پروگرام پیش کیا، اس میں ہالی وڈ کی تفریحی فلموں کو ڈزنی کے پہلے پارک کی اجرائی کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ امریکی ٹیلی وژن کے نشر مکرر دوسرے ملکوں میں بہت پسند کیے گئے۔ گن اسموک، رن ٹن ٹن اور لون رینجر کا شمار میکسیکو کے دس بہترین ٹی وی شوز میں کیا جاتا تھا۔ 1985 میں جاپانی معاشرے کے لیے کہا گیا کہ ٹی وی ان کے اعصاب پر حاوی ہو گیا ہے۔ (ٹیڈ ٹرنر کی مدتوں سے یہ آرزو تھی کہ ایک ٹیلی وژن نیٹ ورک خرید لے۔

جب اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی تو اس نے1985 میں ایم جی ایم کو اس کی لائبریری سمیت خریدنے کا سودا کیا۔ لائبریری میں 3,301 فلمیں تھیں اور مزید1450 فلمیں آر کے او اور وارنر برادرز کی لائبریریوں میں تھیں، وہ بھی مل گئیں۔ لیکن ٹرنر پر جب قرض کا بوجھ بہت بڑھ گیا تو اس نے مجبور ہو کر ایم جی ایم کا سٹوڈیو اور دیگر املاک فروخت کر دیں۔ اب اس کے پاس صرف فلم لائبریریاں رہ گئیں تھیں جن کی لاگت 1.2 بلین ڈالر اس نے ادا کی، جو بہ ظاہر بہت بھاری رقم تھی۔ بہ ہر حال ٹرنر کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے گان ود دی ونڈ اور کاسابلانکا اور ایسی ہی کلاسیکی فلمیں جو خریدی ہیں اپنی جگہ منفرد اثاثے ہیں۔ اس صنعت میں جو پختگی کے اولین مراحل سے گذر رہی تھی، ان فلموں کی حیثیت لازوال ستاروں کی طرح تھی، جس کی نمائش بیش بہا ہو سکتی تھی۔ ٹرنر نے بہت سی بلیک اینڈ وہائٹ فلموں کو رنگوں میں منتقل کیا، جس سے ان کی دوبارہ نمائش زیادہ بیش قیمت ہو گئی۔ اس نے ایک کیبل ٹیلی وژن نیٹ ورک قائم کیا۔ اور مستقل بنیادوں پر ان فلموں کی نمائش شروع کر دی۔ وہ لوگ جو بڑے نیٹ ورک پر ہونے والے پروگراموں کے عادی تھے کیبل ٹیلی وژن کی وجہ سے ان کی تعداد کم ہونے لگی۔ اس نے ایک نئی طرح کے تفریحی پروگراموں کو متعارف کرایا تھا۔ فلموں کے مکرر نشریے کیبل کا ایک اہم جزو تھے، جیسے کہ کھیل، خبرنامے اور تعلیمی پروگرام۔ ایم ٹی وی نوجوانوں کا ایک پروگرام تھا، جس نے راک وڈیوز پیش کیے۔ اپنی فن کارانہ صورت گری اور بلند آہنگ موسیقی کی بدولت اس نے تفریح کی صنعت میں انقلاب برپا کر دیا۔ جون1992 میں سوال و جواب کے ایک کھلے عام پروگرام نے جس میں ایم ٹی وی پر دس نوجوانوں نے حصہ لیا، بل کلنٹن کے لیے امریکا کی صدارت کا دروازہ کھول دیا۔

ٹیلی وژن کوریج نے سیاسی مہم کی نوعیت ہی بدل دی۔ اس کا سب سے انوکھا واقعہ ستمبر1960 میں رچرڈ نکسن اور جان ایف کینیڈی کے درمیان صدارتی مناظرہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے جو اسے ریڈیو پر سن رہے تھے، اسے برابر کا مقابلہ قرار دیا، پھر بھی اس مذاکرے نے کینیڈی کی مہم میں ان کو بہت شہہ دی۔ کیوں کہ جن ساڑھے سات کروڑ امریکیوں نے اسے ٹیلی وژن پر دیکھا انہیں کینیڈی زیادہ چاق و چوبند اور مستعد نظر آیا، جب کہ نکسن جس نے اپنے چہرے پر میک اپ کرانے سے انکار کر دیا تھا، بیمار سا نظر آیا۔ کینیڈی کو اچھی طرح سمجھایا گیا تھا کہ اپنے آگے ناظرین کی طرف دیکھو، جب کہ نکسن زیادہ وقت کینیڈی کو ہی دیکھتا رہا۔ اس میں

امیدواروں کے لیے ایک سبق یہ تھا کہ ٹیلی وژن پر ایک فرد کی شباہت اس قدر اہم ہوتی ہے جتنے اہم اس کے الفاظ ہوتے ہیں۔ دوسری جانب رچرڈ نکسن کا1960 کے عشرے میں دوبارہ سیاسی عروج غالباً اس لیے بھی تھا کہ اس نے ٹو نائٹ شو میں جیب پار کے ساتھ موثر گفت گو کی۔ ذرا دیر پیانو پر اپنا ہنر دکھاتے ہوئے اس نے کاٹ دار انداز میں کہا کہ یہ بات میرے سیاسی مستقبل کے لیے یقیناً تباہ کن ہوگی کیوں کہ ہیری ٹرومین کے بعد ری پبلکنز بھلا کسی اور کو وہائٹ ہاؤس میں پیانو بجاتے ہوئے دیکھنا گوارا کیسے کر لیں گے۔ 1988 میں صدارتی امیدواروں کے درمیان جو مناظرہ ہوا اس میں جارج بش، میکائل ڈوکاکس کے مقابلے میں زیادہ مناسب امیدوار نظر آیا۔ اگرچہ ڈوکاکس کی گفتگو کی اہلیت نہایت شان دار تھی، لیکن اس کی جسمانی حرکات سے اس کے جذباتی روکھے پن کا پتا چلتا تھا۔

ٹیلی وژن کی خبریں اینکر مین (رابطہ قائم کرنے والے فرد) کے ساتھ گردش کرتی ہیں۔ سی بی ایس کے نیوز اینکر نرم خو اور مشفق والٹر کرنکائٹ کی شہرت ''امریکا کے سب سے زیادہ معتبر فرد'' کی تھی۔ کرنکائٹ پر قدامت پسندوں کا الزام یہ تھا کہ وہ لبرل ہے اور خبر سناتے ہوئے آواز کے اتار چڑھاؤ سے یا ابروؤں کی جنبش سے خبر میں ایک خاص سنسنی پیدا کر دیتا تھا۔ خبر رساں تنظیموں نے ایک خاص اسلوب وضع کر لیا تھا جس کی بہ دولت سرکاری عہدے دار عام لوگوں سے آوازوں کی مدد سے پیغام رسانی کر لیتے تھے۔ ان آوازوں کے ٹکڑوں کا انتخاب ٹیلی وژن کے ایڈیٹرز خود کر لیا کرتے تھے۔ وہ ہوشیاری کے ساتھ رپورٹروں کے سوالوں سے کنی کترا کر نکل جاتے تھے۔ اپنے سوالوں سے جارحانہ حملہ کرنے کے لیے سام ڈونالڈسن مشہور تھا۔ جب ماحول بہت گرما گرم ہوتا تو سیاسی امیدوار خبروں کی تشہیر کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ یہی توقع کر سکتے تھے کہ ان کے خوش گوار مرقعے پیش کر دیے جائیں اور یوں وہ اپنا مضحکہ اڑوانے سے بچ جائیں۔ اس بات کا اختیار نیوز ایڈیٹر اپنے پاس رکھتے تھے کہ ان کی وہ کون سی شباہتیں ہیں جنہیں عام لوگوں کو دکھانے کی اجازت ہوگی۔ نشریات کے مبصر اور ماہرین معنی کو اپنا رنگ دینے پر قادر ہوتے تھے۔ لہٰذا اگر کوئی انتخابی امیدوار چاہتا کہ اس کا بیان بہ جنسہٖ اپنی اصل صورت میں عام لوگوں تک پہنچ جائے تو اسے کمرشل پروگراموں کی طرح اس کے لیے وقت خریدنا ہوتا تھا۔ لیکن ٹی وی کے کمرشل بہت مہنگے ہوتے تھے، چنانچہ ذرائع ابلاغ میں مہم چلانا اتنا مہنگا ہوتا تھا کہ سیاست دان مجبوراً فنڈ جمع کرنے پر زیادہ وقت صرف کرتے اور جن آدمیوں کی طرف سے زیادہ فنڈ ملتا، بہ تدریج ان پر توجہ بڑھتی جاتی تھی۔

سماجی اور سیاسی رویوں کی تشکیل میں ٹیلی وژن نے بڑی طاقت اختیار کر لی ہے۔ خواہ وہ 1950 کے عشرے میں فوج اور میکارتھی کے سلسلے میں ہونے والی سماعتیں ہوں یا 1960 کے عشرے میں ہونے والی ویت نام کی جنگ، یا1970 کے عشرے میں واٹر گیٹ کے مقدمے کی سماعت، 1980 کے عشرے کی کلیرنس تھامس اور انیتا ہل کے درمیان تصادم یا 1990 کے عشرے میں او جی سمپسن کا مقدمہ، ہر موقع پر ٹیلی وژن کی کوریج نے قومی اخلاقیات کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ ایسے مواقع پر رائے عامہ نظریاتی بنیاد پر یا آبادی کے کسی حصے سے اپنے تعلق کی وجہ سے آپس میں بٹ گئی۔ اس کے پروگراموں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ پروگرام سپانسر کرنے والے (اسے قیمتاً چلانے والے) بنیادی طور پر 25 سے 54 سال تک کے ناظرین کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ ٹی وی کے کمرشل میں جن اشیا کے اشتہارات آتے ہیں، ان کے خریدار بنیادی طور پر اس عمر کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے نمائش کے اصل وقت میں اور دن کے باقی اوقات میں پروگرام نشر کرتے وقت عورتوں کی دلچسپی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ ان پروگراموں میں عورتوں کو نہایت بااختیار پیشہ ورانہ کردار کا مالک دکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ عورتیں ذہانت میں مردوں کا مقابلہ کرتی ہیں اور جیت جاتی ہیں۔ بد حال بستی کے مرد کو ٹی وی پر ہفتہ کے آخر میں کھیلوں کے پروگرام میں دکھایا جاتا ہے۔ مخصوص نسلی کرداروں کے حوالے سے سٹیپن فیچٹ نے یہ راہ دکھائی ہے کہ ایسے شوز میں کالے مرد کو نہایت خود اعتماد اور فوج یا پولیس کے عہدے دار کے طور پر پیش کیا جائے۔ دوسری طرف تھامس انیتا ہل کے تنازعے میں یا او۔جی۔ سمپسن کے مقدمہ قتل میں ایک طویل اور پرانی روایت کے مطابق گورے امریکیوں نے کالوں کو مسخرا بنا کر پیش کیا ہے۔

خبر اور تفریح، ان دونوں کے درمیان فرق رفتہ رفتہ دھندلا پڑتا جا رہا ہے۔ خبروں کے نشریے کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ ناظرین کی تعداد زیادہ ہو اور تفریحی فیچر کے انداز میں اسے پیش کیا جائے، لہٰذا مقامی ٹیلی وژن نشریوں میں زیادہ توجہ جرائم، سکینڈل، حادثات اور جذباتی نوعیت کے وقوعوں پر دی جاتی ہے۔ سنسنی خیز صحافت اور مذاکروں کے پروگرام، جس طرح جیری سپر نگر کے ہوتے ہیں، بعض اوقات خصوصیات کے ساتھ ہوش ربا قسم کی تفصیلات پیش کرتے ہیں، جو افراد کے لیے پریشان کن ہو سکتی ہیں۔ ''حقیقت پر مبنی'' نئے پروگرام، جیسے حالاتِ حاضرہ یا ان سائڈ ایڈیشن (پس پردہ واقعات) نسبتاً کم خرچ سے پیش کیے جا سکتے ہیں، کیوں کہ اس ضمن میں کچھ کام معمول کا اخباری عملہ انجام دے سکتا ہے۔ بہ ہر حال اس طرح

کے شو ان معروف شخصیات کی موجودہ کیفیت کو بیان کرتے ہیں جو اب مقبول نہیں رہیں۔ یہ ان کی مصنوعی فطرت کا ردِعمل بھی ہوسکتا ہے۔ تفریح کی دنیا کی رونق نوجوان، صحت منداور دل کش مردوں اور عورتوں کے وجود سے ہے، جو تیز طرار اور چال ڈھال میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ اس کے باوصف ناظرین جانتے ہیں کہ یہ دنیا اپنی اصل میں وہ نہیں ہے، جو نظر آتی ہے۔ تھیٹر کے اسٹیج پر یا پردہ سیمیں پر اداکاری کرنے والے افراد جو عام لوگوں کو نظر آ رہے ہیں، اپنی اصل زندگی میں اس سے مختلف ہوں گے۔ ایسے میں عام لوگ ان اداکاروں کی ذاتی زندگی کے کوائف جاننے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں، خاص طور پر ان ستاروں کی انسانی کمزوریوں کے بارے میں، جو ان کے لیے مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے ''ٹو نائٹ شو'' میں ایک موقع مشہور شخصیات سے انٹرویو کرنے کا نکل ہی آتا ہے۔

کھیلوں کی نشریات

ایک اہم نوعیت کا تفریحی پروگرام یہ ہے کہ اس کی پیش کش مصنوعی ہو، لیکن ان میں ہونے والے واقعات پہلے سے لکھے نہیں جاتے اور تماشائی نہیں جانتے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ اس طرح کی تفریح ورزشی کھیلوں کے مقابلے مہیا کرتے ہیں۔ ٹیلی وژن پر اس طرح کا پہلا پروگرام ومبلڈن میں ٹینس کے مقابلے کا بی بی سی نشریہ ہوسکتا ہے، جسے 1937 میں 21 جون کو دکھایا گیا تھا۔ اُس وقت تک لندن کے صرف دو ہزار متمول لوگوں کے پاس ٹیلی وژن سیٹ تھے۔ تصویریں دھندلی نظر آتی تھیں۔ چنانچہ بی بی سی نے فٹ بال ایسوسی ایشن کو اس امر پر آمادہ کیا کہ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے درمیان 9 اپریل 1938 کو جو مقابلہ ہوا تھا، اسے دوبارہ دکھانے دیا جائے۔ ان دنوں یہ بھی تشویش درپیش ہوتی تھی کہ اس طرح کے کھیل نشر کرنے سے لندن کی حدود میں ہونے والے مقامی اور نسبتاً کم اہم کھیلوں میں حاضری متاثر ہوگی۔ کھیلوں کے نشریوں کو اس زمانے میں نشری آلات کے ناقص اور غیر یقینی ہونے کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ ٹیکنیکل عملہ اپنے کیمرے، جن میں موٹے موٹے کیبل لگے ہوتے اونچائی پر نصب کرتا، لیکن کبھی کبھی کیبل سے ان کا رابطہ ٹوٹ جاتا اور پردے پر سیاہی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن نے اس امکان سے بچنے اور فٹ بال کا مقابلہ دکھانے کے لیے 50 گز کے اندر دو کیمرے لگائے تھے۔ ایک اور رکاوٹ ناکافی روشنی کے سبب سے تھی۔ ان سب دشواریوں کے باوجود ابتدائی ٹی وی پروگراموں کا خاص موضوع یہی کھیلوں کے

پروگرام ہوتے تھے، کیوں کہ وہ نسبتاً کم خرچ تھے۔ نشریاتی اداروں کے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ قابلِ قبول پروگراموں سے اوقات پورے کرتے، چنانچہ کھیلوں کی مہیا کی ہوئی دلچسپی کے لیے انہیں کچھ دینا نہیں پڑتا تھا۔ شراب خانے کا مالک اپنے گاہکوں کو رجھانے کے لیے کشتی اور باکسنگ کے مقابلے اپنے ٹی وی سیٹ پر بالعموم دکھاتا تھا۔

ٹی وی سیٹ پر کھیلوں کے مظاہرے تفریح کے نہایت کامیاب ذرائع ہیں، کیوں کہ ناظرین کی آنکھوں کے آگے انسانی ڈراما ہیجان انگیز طریقے سے تمام وقت ہوتا رہتا ہے۔ ہر مقابلہ فوری طور پر فتح وشکست کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ ان کے جسمانی دباؤ اور تھکن کو دیکھ کر ایک زبردست جذباتی ردِعمل پیدا ہوتا ہے۔ 1972 کے اولمپک کھیلوں کو دکھانے سے امریکا کی براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو مقبولیت میں اوّل درجہ حاصل ہوگیا، حالانکہ پہلے اس کی حیثیت تیسرے درجے کی تھی۔ کارپوریشن کے اعلیٰ عہدے داروں نے اندازہ کرلیا کہ ٹی وی نشریات میں اوّل حیثیت حاصل کرنے کے لیے کھیلوں کی نمائش بلاشرکت غیرے بہت ضروری ہوگی۔ 1972 کے میونخ اولمپک میں دہشت گردوں کی جانب سے اغوا کی وارداتوں کی بنا پر عام لوگوں کی دلچسپی ان مقابلوں کے حوالے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ ٹیلی وژن کے ایڈیٹروں نے نہایت چالاکی سے اپنی توجہ انفرادی ورزشی کھیلوں کی طرف مثلاً اولگا کوربیٹ پر مرکوز کردی۔ وہ برف پر سکیٹنگ اور جمناسٹکس برابر دکھاتے رہے۔ کھیلوں کی براڈ کاسٹنگ میں وہ بہت سی ٹیکنیک جو آج استعمال کی جارہی ہیں، مثلاً کسی منظر کو سلوموشن میں (آہستگی سے) دکھانا یا فی الفور دوبارہ دکھانا اور مناظر کو کمپیوٹر کی مدد سے پھیلانا اور سٹیڈیم میں دُور تک پھیلے ہوئے تماشائیوں کو اس طرح دکھانا گویا ٹی وی کے ناظرین سے ان کا گہرا تعلق ہے، یہ سارے ہنر اے بی سی کے سپورٹس ڈائریکٹر رونی آرلیج نے وضع کیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ڈان میریڈتھ اور ہووارڈ کوسل نے شخصیات کی اہمیت کو نمایاں کرنے پر بہت زور دیا۔ اسی طرح کھلاڑیوں اور کھیلوں پر رواں تبصرہ کرنے والوں کی اہمیت اجاگر کی۔ کوسل نے خود کہا تھا، ''ٹی وی کے پرائم ٹائم (انتہائی مصروف اوقات) میں کھیلوں کو محض کھیل کی طرح پیش کرکے تم ایلزبتھ ٹیلر اور ڈورس ڈے سے آگے نہیں نکل سکتے۔''

ناظرین کو ذاتی طور پر شریک کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ورزشی کھیلوں کے مقابلوں کو کھلاڑیوں کے بارے میں قصے کہانیوں سے ملا دو، مثال کے طور پر 1984 کے اولمپکس میں

ریس کے دوران جنوبی افریقا کی رنر زولا بڈ نے اتفاقاً میری ڈیکر سلینی کوٹھوکر لگا دی اور کھیلوں کے مبصرین نے اولمپک سمیت آئندہ کھیلوں میں اسے "کینہ پروری کا مقابلہ" قرار دیا۔ 1998 کے سرمائی اولمپکس میں جو ناگانو (جاپان) میں ہوا، اس میں بھی مقابلوں کی رپورٹوں کے بجائے کھلاڑیوں کے بارے میں دستاویزی فلمیں زیادہ دکھائی گئیں۔ کھیلوں کے پروگرام نشر کرنے والوں کی ایک عام ترکیب یہ ہوتی ہے کہ کچھ "شہد جیسے میٹھے شاٹ" اپنے ساتھ رکھتے ہیں، یعنی کیمرے کا رخ ادھر ادھر موڑ دیتے ہیں، خاص طور پر ایک لمحے کے لیے کسی خوب صورت تماشائی کے چہرے کی طرف، تاکہ مرد تماشائی اس دوران میں کسی دوسرے ٹی وی پروگرام کی طرف نہ چلے جائیں۔ یہ ٹی وی پروڈیوسر شہرت یافتہ ہوتے ہیں اور اپنی اس حیثیت کی بنا پر زیادہ بڑی تنخواہ اور مالی منفعت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ پیشہ ورانہ کھیلوں میں کتنی رقم پھنسی ہوئی ہوتی ہے، اس بنا پر ٹکٹ کی قیمت بڑھتی رہتی ہے۔ اور ٹیم کے مالکان پر برابر دباؤ پڑتا رہتا ہے کہ نئے اور بڑے سٹیڈیم کی تعمیر کے لیے پبلک کو زیادہ زرِ تلافی دیں۔ ٹی وی پر لگے ہوئے سرمایے نے کھیلوں کی نوعیت ہی بدل دی ہے۔ اب یہ ایک پُر لطف مشغلہ سے زیادہ ایک بہت بڑی تفریح کا ذریعہ بن گیا ہے۔

جوا

ٹیلی وژن کی تفریح کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لوگوں کی توجہ ایک خاص واقعہ پر مرکوز کر دی جاتی ہے اور چابک دستی یہ ہے کہ اس صورتِ حال سے رقم بنائی جاتی ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی پروگرام کے بعد ایک کاروباری پیغام جو بامعاوضہ ہوتا ہے، لگا دیا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ رقم خرچ کرنے کے اس عمل میں تفریح کا عنصر براہِ راست طور پر شامل کر لیا جاتا ہے۔ اگر ناظرین کی کثیر تعداد میں سے بہت سے لوگ چھوٹی چھوٹی رقمیں ڈالتے جائیں تو کسی جوئے میں جیتنے والے کے لیے کثیر رقم جمع ہو سکتی ہے۔ چونکہ نتیجہ پہلے سے تحریر نہیں کیا جاتا لہٰذا ہر وہ شخص جو ایک چھوٹی سی رقم لگاتا ہے، اس کے لیے ایک بڑا انعام جیتنے کا امکان بہ ہر طور موجود ہوتا ہے۔ کسی بھی معقول فرد کے اندر، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، یہ بات اسے یقین دلانے کے لیے موجود ہوتی ہے کہ اس طرح کے اتفاقی کھیل پر پیسا لگا دینا، جس کا نتیجہ ناموافق ہوگا محض ایک کھیل ہے۔ ماہر جواری اس "گرما گرمی" کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو پیسا لگانے والے کے اندر یہ ناقابل برداشت احساس کو اجاگر کر دیتی ہے کہ پچھلا گھاٹا پورا کرنے

کے لیے، یا مزید رقم جیتنے کے لیے داؤ پر رقم لگاتے رہنا چاہیے۔ بہ ہر حال جوئے چلانے والے افراد اپنے لیے اچھا خاصا منافع الگ کر کے ایک خاص سطح تک رقم تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ ان کھیلوں میں افراد قسمت سے جیتتے ہیں اور ہارتے ہیں، لیکن جوا خانہ ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

کھیلوں کے ساتھ جوئے کا تعلق بہت پرانا ہے۔ بیس بال، باسکٹ بال اور فٹ بال کے پیشہ ورانہ مقابلوں کو دیکھنے کے لیے مجموعی طور پر جتنے لوگ جاتے ہیں، ان سے زیادہ تعداد میں امریکی ہر سال ریس دیکھنے جاتے ہیں۔ جوئے کا ان سے بھی زیادہ مقبول عام کھیل لاٹری ہے۔ کانٹی نینٹل کانگریس نے ایک لاٹری جاری کی تھی، اس کی آمدنی سے امریکی انقلاب کو مالی امداد مل گئی۔ ایک اور لاٹری نے واشنگٹن شہر کی تعمیر میں سرمایہ فراہم کیا۔ لاٹریاں، برطانیہ میں 1826 میں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ امریکا میں بھی 1830 کے عشرے میں اس پر پابندی لگ گئی۔ کانگریس نے 1895 میں لاٹری کے مال کی بین الصوبائی تجارت بند کر دی۔ تاہم بیسویں صدی میں خیراتی منصوبوں کی مالی معاونت کے لیے لاٹری کو دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ آئرلینڈ کی سویپ سٹیکس (Sweepstakes) نے جس کی تنظیم 1930 میں ہوئی تھی، جوئے کی آمدنی کو ہسپتال چلانے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ نیو ہمپشائر اور نیویارک کی ریاستوں نے 1960 کے عشرے میں پبلک سکولوں کی مالی مدد کے لیے لاٹریاں قائم کیں۔ آج دو امریکی ریاستوں اوتھہ (Utah) اور ہوائی (Hawai) کو چھوڑ کر سبھی نے جوئے کو کسی نہ کسی شکل میں قانونی حیثیت دے دی ہے۔ جوئے بازی کی سب سے بڑی ریاست نواڈا ہے، جہاں اس طرح کی سرگرمیوں کو 1931 میں ہی قانونی حیثیت دے دی گئی تھی۔ یہاں زیادہ تر رقم کیسینو میں لگائی جاتی ہے، جہاں کمروں میں اور ہال میں قطار در قطار کارڈ ٹیبل سلاٹ مشینیں اور قیمت کی چرخی موجود ہوتی ہیں۔

جس برس ہوور ڈیم کی تعمیر شروع ہوئی، اس برس نواڈا میں جوئے کو قانونی حیثیت دے دی گئی۔ تعمیرات کے مزدور جو قریب ہی لاس ویگاس آتے تھے، تاکہ اپنی کمائی مزے سے خرچ کریں، جوئے کی سرگرمیوں سے بھی دور نہ رہ سکے۔ نیلس کا فوجی ہوائی اڈہ یہاں سے زیادہ دُور نہ تھا، شہر کا پہلا مکمل اور بڑا اقامتی ہوٹل ایل رانچو ویگاس اپریل 1941 میں امریکی ہائی وے 91 پر کھولا گیا تھا۔ مزید تین ہوٹل، دی لاسٹ فرنٹیئر، فلیمنگو اور تھنڈر برڈ اس کے فوراً بعد ہی کھل گئے تھے۔ لاس ویگاس کو سرحدی قصبے کی شہرت حاصل ہوگئی، جہاں جوئے کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ ہالی وڈ کے سلسلے کی تعمیر اس وقت شروع ہوئی جب کلارا بو (Clara Bow) 'ایٹ گرل' کی شہرت یافتہ اور اس کے شوہر ریکس بل نے شہر کے پاس ہی ایک بڑا سبزہ زار

خرید لیا۔ یہاں مشہور فلمی لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔1946 میں ایک مار دھاڑ کرنے والے اوباش بنام ''بگسی سیگل'' نے جس کے ہالی وڈ سے بھی تعلقات تھے، مشہور فلیمنگو ہوٹل تعمیر کرایا۔ یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ اس کے سارے منصوبے پر غبن کی ہوئی رقم لگی ہے، چنانچہ ایک سال بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ تاہم بگسی سیگل نے جوئے اور تفریحات کے سب سے بڑے مرکز کی تعمیر کا جو خواب دیکھا تھا، وہ خواب زندہ رہا۔ جمی ڈورانٹے، فلیمنگو میں پہلا سر کردہ اداکار جس کا نام شہ سرخیوں میں آتا تھا، ابھر کر آیا۔ لینا ہارنے، سوفی ٹکر، ڈین مارٹن اور جیری لوئس اور ایلیا فزگرالڈ، وہ چند اداکار تھے، جنھوں نے لاس ویگاس کے لیے اس زمانے میں کام کیا۔ پھر اندرونِ شہر جوئے کے کلب جو فری مونٹ اسٹریٹ کے کنارے کھل گئے تھے، گلیٹن گلچ، (چمک دار پرنالے) کے نام سے مشہور ہوئے۔

لاس ویگاس کے اقامتی ہوٹلوں کی اصل دل کشی اس کے جوئے خانے تھے، باقی تفریح اضافی تھی، تاہم آپس کے مقابلوں نے ہوٹلوں کے منیجروں کو مجبور کر دیا تھا کہ اپنے یہاں تفریح کا معیار بلند کریں۔ دوسرے ہوٹلوں سے جواریوں کو اپنی طرف کھینچ کر لانے کے لیے ایک ہی پرکشش بات ہو سکتی تھی اور وہ تھے مشہور اداکار۔ کیسینو کے اعلیٰ عہدے دار تخمینہ لگاتے رہتے تھے کہ ایک صفِ اوّل کا اداکار، ان کے جوئے کے منافع پر کس حد تک اثر انداز ہو سکتا تھا۔ دوسری بار اس سے معاملہ کرتے وقت وہ معاوضہ اس حساب سے دیتے تھے۔ لاس ویگاس کے اداکاروں کے لیے بعض اوقات اس کا نتیجہ بھاری معاوضے کی صورت میں نکلتا تھا۔ جب کہ وہ نائٹ کلب جن میں جوا نہیں ہوتا تھا، ان اداکاروں کی خدمات حاصل کرنے کی توقع کر سکتے تھے، جن کے لیے ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا، جیسے فرینک سناترا یا سیمی ڈیوس جونیئر۔ ایک یادگار واقعہ نومبر 1956 میں لائبریس (Liberace) اور ایلوس پریسلے (Elvis Presley) کا اچانک ایک دوسرے کا رول اسٹیج پر ادا کرنا پڑا۔ اس موقع پر پریسلے نے لائبریس کی بھڑک دار جیکٹ پہنی، گویا فرض کر لیا کہ اس نے پہلی بار یہ وضع اختیار کی ہے، جس کی بہ دولت وہ خود اور ایلوس کی نقل کرنے والے بہت سے لوگ شہرت حاصل کرتے آئے ہیں۔ لاس ویگاس کھیلوں کے بڑے بڑے مقابلوں کا مرکز بھی بن گیا، جیسے گولف چمپئن ٹورنامنٹ اور بہت سے ہیوی ویٹ باکسروں کے مقابلے۔

بالغوں کی دلچسپی کا مقبول ترین کھیل آج امریکا میں جوا ہے، کیسینو میں آنے والے

افراد کی تعداد پچھلے پانچ سال میں دگنی ہوگئی ہے۔ تین کروڑ دس لاکھ سے زیادہ لوگ لاس ویگاس سیاحت کے لیے آتے ہیں۔ یہ امریکا کا سب سے زیادہ تیزی سے بڑھنے والا شہر ہے۔ دنیا کے بارہ سب سے بڑے ہوٹلوں میں گیارہ لاس ویگاس میں ہیں۔ امریکا میں ہر سال جوئے پر جتنی رقم کھیلی جاتی ہے، وہ اس ملک میں گاڑیوں اور مکانوں پر خرچ ہونے والی مجموعی رقم سے زیادہ ہے۔ اپنی تمام تر بدگمانیوں کے باوجود جوئے کا دیوہیکل کاروبار جزوی طور پر جاری رہتا ہے، کیوں کہ وہ بہت سے لوگ جو آبادیوں کی نگہ داشت پر مامور ہیں، وہ خود جوئے کی میز پر براجمان ہیں۔ ریاست کے اندر چلنے والی لاٹریوں کو بڑے پیمانے پر ٹیکسوں کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ قانون بنانے والوں کے لیے ان کی حیثیت بہ آسانی ہاتھ آنے والے سرمایے کی ہے۔ انڈین قبائل جس کے کیسینو کی حیثیت صنعت کے انتہائی تیز رفتار ترقی پذیر شعبے کی ہے، کبھی کبھی جوئے کو ''بھینس کی واپسی'' کہتے ہیں۔ آج کے لاس ویگاس کے اقامتی ہوٹلوں کے مالک شورہ پشت قسم کے لوگ نہیں بلکہ ان کی تعمیر بڑی بڑی کارپوریشنوں نے کی ہے اور ان میں پنشن کی رقوم شامل ہیں۔ دو سال کے اندر لاس ویگاس میں 56 بلین ڈالر سے نئی تعمیرات ہوئی ہیں اور ''نیویارک نیویارک'' جیسی پرکشش یادگاری تعمیر دیکھنے میں آئی ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دس سال میں جوئے کے متعلق جسے یہاں کے بعض صنعت کار ''گیمنگ'' کہتے ہیں، کوئی اختلاف رائے باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ جوا دوسری اقتصادی سرگرمیوں میں شامل ہو جائے گا اور تفریح کی تلاش میں نکلنے والوں کے لیے ''ایک سٹاپ کی شاپنگ'' بن جائے گا، کہ چلتے چلتے تفریح حاصل کر لی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی متنوع تفریح کی سرگرمیاں، جن میں جوا، عریاں شو اور غالباً جسم فروشی اور نشہ خوری شامل ہیں، لاس ویگاس اور ایسے ہی دیگر مقامات پر ''بالغ تفریح'' کے نام سے اپنے قدم جما لیں۔ اگر منظم جرم کی مدد سے ان پر قابو نہیں پایا گیا تو ان قانونی سرگرمیوں کا انتظام اور در و بست نہایت پختہ کار تاجر پیشہ لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، جنہیں ان کے سماجی اثرات کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔ اس دوران میں متنوع سرگرمیوں کا ایک اور مرکز نکل آیا ہے، جو ڈزنی لینڈ میں واقع ہے، جو ممکن ہے ''خاندان کے افراد کے لیے'' تفریح کا ذریعہ ہو، یہ تفریح بچوں کے لیے بلکہ بہ قول شخصے ''ہر عمر کے بچوں کے لیے'' موزوں ہے۔ جب 1954 میں ڈزنی لینڈ کا اجرا ہوا تو ریڈرز ڈائجسٹ نے لکھا تھا کہ ڈزنی نے اوّل درجے کے ٹیلی وژن شو اور نہایت کامیاب فلمی کاروبار کے ساتھ پارک کی تفریح کو شامل کر کے

تفریحات کی صنعت میں پہلا ''سہ طرفہ'' کھیل دکھایا ہے۔ (اس کمپنی نے اس کے بعد ہی سے کھیلوں کی ایک پیشہ ورانہ ٹیم اور ٹیلی وژن کے ایک بڑے نیٹ ورک کا اضافہ کیا ہے) لاس ویگاس اور ڈزنی لینڈ دونوں اپنی اپنی جگہ الگ شہر ہیں، جنہیں عوامی تفریحات کے کلچر نے جنم دیا ہے۔ جہاں کہیں تفریحی تقریبات کے لیے خاص جگہوں کی ضرورت درکار ہوتی، جیسے آڈیٹوریم یا ہجوم اکٹھا کرنے کے لیے میلے کا میدان، تو اب یہ عمل اپنا دائرہ مکمل کر چکا ہے کہ ڈزنی لینڈ نے ایسی پراسرار تمثیلی جگہ بنا دی ہے، جہاں سے نشریات ہر جگہ پہنچ رہی ہیں۔

Narrow Casting۔ دائرہ سمٹ رہا ہے

ٹیلی وژن نشریات کی صنعت، جس کی بالادستی امریکا میں تفریحات کے کلچر پر مدتوں رہی ہے، اب اس ٹیلی وژن کی تہذیبی گرفت کم زور پڑتی جا رہی ہے۔ امریکا میں ٹیلی وژن کے تین سب سے بڑے نیٹ ورک ہیں۔ سی بی ایس، اے بی سی اور این بی سی۔ جب 1980 کے عشرے کا آغاز ہوا تو ان کے ''پرائم ٹائم'' کے 85 فی صد پر ٹیلی وژن کا قبضہ تھا۔ عشرے کے ختم ہونے تک ناظرین کی تعداد گھٹ کر صرف 67 فیصد رہ گئی۔ 1992 کے موسم گرما تک یہ تعداد مزید سمٹ کر 54 فیصد اور 1997 میں 40 فیصد رہ گئی۔ 1997 میں امریکیوں کی تقریباً اتنی ہی تعداد کیبل ٹیلی وژن شو، بڑے بڑے نیٹ ورک پر دیکھ رہی تھی۔ کیبل ٹیلی وژن کے ساتھ مقابلہ، نئے فاکس نیٹ ورکس کی آمد اور پرسنل کمپیوٹر نے مل کر نیٹ ورک ٹیلی وژن کے لیے سخت آزمائش پیدا کر دی ہے، چنانچہ نیٹ ورک کے ناظرین کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ ایک اوسط امریکی کنبے میں دو سے تین ٹیلی وژن سیٹ ہوتے ہیں جہاں چالیس سے زاید مختلف چینلز سے پروگرام لیے جاتے ہیں۔ 80 فی صد لوگوں کے پاس وی سی آر ہیں، 94 فی صد کے پاس ریموٹ کنٹرول ہیں، اب صوفے پر لیٹے لیٹے بٹن دبا کر ایک چینل سے دوسرے چینل میں پہنچنا کوئی بات ہی نہیں۔

کیبل ٹیلی وژن درجنوں مختلف چینل مہیا کرتا ہے اور ہر ایک میں مخصوص دلچسپی کے اسباب ہوتے ہیں۔ ویب سائٹس نمبر ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ اب کہیں زیادہ تعداد میں لوگ اپنے ٹیلی وژن پر یا کمپیوٹر کی اسکرین پر رونما ہونے والے مناظر دیکھتے ہیں، لہٰذا اب رجحان ریڈیو اور ٹیلی وژن سے گزر کر نیرو کاسٹنگ کی طرف جا رہا ہے۔ اب وہ ناظرین جو مخصوص مفادات رکھتے ہیں، ان کا مقابلہ تفریح حاصل کرنے والوں سے ہوتا ہے، جن کے لیے

وقت کے دائرے تنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس رجحان سے مشتہرین کو بہت فائدہ ہوتا ہے، کیوں کہ ان کے لیے ایسے لوگوں تک پہنچنا بہت آسان ہو جاتا ہے جو اُن کی جیسی مصنوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کا پیغام نشریات کی کوئی اضافی رقم دیے بغیر متوقع خریداروں کے مخصوص گروہ تک پہنچ جاتا ہے۔ نیورو کاسٹنگ کا یہ رجحان جزوی طور پر کمرشل ٹیلی وژن کے خاموش کلچر پر پبلک کے ردعمل کی نمائندگی کرتا ہے۔ اب ناظرین ایسے پروگراموں سے عاجز آ چکے ہیں جن میں بہ یک وقت سب کے لیے دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔ وہ اپنے پروگرام میں تنوع چاہتے ہیں جو ان کی مخصوص دلچسپیوں کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہو۔ جزوی طور پر اس سے مواصلات کی ٹیکنالوجی میں بدلتی ہوئی صورتِ حال کی عکاسی ہوتی ہے۔ اب کمپیوٹر بہت اہم ہو گئے ہیں۔ کمپیوٹر پیغام کی ترسیل میں مزید اثر پیدا کر دیتا ہے۔ افراد کے درمیان وہ مختلف سطح پر ابلاغ کا وسیلہ بنتا ہے اور بالآخر یہی موثر ترین وسیلہ ابلاغ ہے۔

اب رجحان یہ آ گیا ہے کہ افراد کو بالکل وہی تفریحی عنصر چاہیے، جسے وہ اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ناظرین کی پسند کی بنیاد پر مارکیٹنگ کی حکمت عملی تیار کی جاتی ہے اور پروگرام کے ایسے مواد تیار کیے جاتے ہیں جو مختلف ناظرین کے درمیان فروخت کیے جا سکیں۔ اس سارے عمل میں کمپیوٹر بہت اہم آلہ ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے تفریح مہیا کرنے والے عہدے دار اور مشتہرین افراد کی ترجیحات کو آسانی سے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ناظرین کے جائزے اور مصنوعات کی فروخت کے اعداد و شمار کمپیوٹر کی فائل میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس تجزیے کی بنیاد پر مختلف آبادیوں کے شخصی خاکے تیار کیے جاتے ہیں، تاکہ انہیں بعد میں مارکیٹنگ کی مہم میں استعمال کیا جا سکے۔ مطلوبہ ناظرین تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے ایسے افراد جو اس غرض سے موزوں ہوں، شامل کر لیے جاتے ہیں۔ چونکہ ایک خاص وضع کے لوگوں کے رویوں کو سمجھنے کے بعد پیغام مرتب کیا جاتا ہے، اس لیے پیغام دینے والے کو بجا طور پر یقین ہوتا ہے کہ اس کا ہمدردانہ ردعمل سامنے آئے گا۔ کمرشل اشتہار بازی کا بالکل یہی مقصد ہے۔ اب ہم ایک فرد نہیں رہے، جن تک نشری پیغام پہنچ جایا کرے، بلکہ ایک آبادی ہیں، جو مختلف آبادیوں کی جداگانہ ساخت اور نجی مفادات کے تحت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں سے ہر وضع کے لوگوں کے ساتھ اشتہار دینے والا الگ الگ مکالمہ کرتا ہے۔ اس نئے دلیرانہ معاشرے میں ہمیں فرداً فرداً پہچانا جاتا ہے۔ ڈاک

سے بھیجے جانے والے مراسلوں کی فہرست میں ہمارے نام بھی شامل ہوتے ہیں۔

کمپیوٹر: پیدا کردہ تفریح

کمپیوٹر میں یہ اہلیت ہوتی ہے کہ سنی ہوئی باتوں اور دیکھے ہوئے مرقعوں کو حسب خواہش تبدیل کر دیتا ہے اور یوں تفریح کو ایک بلند تر سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ آواز کے نمونوں کو پرکھنے کے ماہران کو الگ الگ محفوظ کر لیتے ہیں اور فلاپی ڈسک میں رکھتے ہیں، جن کے لیے الگ کوڈ ہوتے ہیں۔ اس کوڈ کے تحت آواز کو بلند اور مدھم کر سکتے ہیں، اس کے اتار چڑھاؤ میں سبک روی یا تیزی لا سکتے ہیں۔ ان میں موسیقی کے نئے ٹکڑے ڈال سکتے ہیں یا آرکسٹرا کا تاثر دینے کے لیے اسے اوور پلے کر سکتے ہیں۔ اس طرح موسیقی پہلے سے زیادہ واضح اور صاف ہوتی ہے۔ اس طرح کمپیوٹر سے پیدا کردہ مرقعے فلم سازی میں انقلاب پیدا کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ٹیکنیشنز جو کی بورڈ پر کام کر رہے ہوں، وہ انٹرویو ود اے ویمپائر (مردم خور سے ملاقات) نامی فلم میں پانچ سیکنڈ کے اندر تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں، جہاں ٹام کروز کو دکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے شکار کو کھانے کے لیے اس پر جھک رہا ہے تو وہ اس کی جزئیات میں تبدیلی لا سکتے ہیں، جیسے کروز کے چہرے پر پھیلے ہوئے خون کا رنگ شوخ اور اس کے لمبے لمبے دانتوں کو اور لمبا کر کے دکھاتے ہیں، تاکہ دہشت کا عنصر دو چند ہو، جیتے جاگتے اداکار اور اداکارائیں، کارٹون کے کرداروں کے نمونے بن گئے ہیں۔ اس طرح انہیں زیادہ حقیقی شباہتیں دے دی گئی ہیں۔ جب جارج لوکاس نے اسٹار وارز نامی فلم بنائی، تب ہی سے ہالی وڈ کے فلم ساز نہایت کامیابی کے ساتھ کمپیوٹر میں محفوظ مناظر کو استعمال کر رہے ہیں، جب کہ کیمرے سے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ایکشن فلمیں جو باکس آفس پر سب سے زیادہ چلتی ہیں، ان میں خاص طرح کے تاثرات پیدا کرنا کمپیوٹر سے ہی ممکن ہوا۔

کمپیوٹر کے ٹیکنیشنز تفریح کے معیار کو ایک اور بلند سطح پر لے گئے ہیں۔ انہوں نے ایک ٹیکنالوجی وضع کی ہے، جس کو ورچوئل ریئلیٹی (Virtual Reality) کا نام دیا گیا ہے۔ جس کے تحت ناظر کی جسمانی حرکت کی تبدیلی کے ردِعمل میں شباہتوں کو تبدیل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ 1980 کے عشرے میں کیلیفورنیا کی ایک فرم نے جس کا نام وی پی ایل ریسرچ ہے، دھوپ کی عینکوں اور دستانوں کے سیٹ، جو ایک خاص وضع کے تھے، ایجاد کیے۔ اگر تماشا کرنے والا اپنا سر ادھر ادھر گھماتا ہے تو عینک کے اندر چھپا ہوا سنسر، اس کی اطلاع کمپیوٹر کو پہنچا دے گا، اس کے

بعد کمپیوٹر بدلے ہوئے منظر کے مطابق عینک میں مطلوبہ شباہتیں پیدا کر دے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دستانوں کے اندر انگلیوں کی حرکت بندوق چلانے کا اشارہ کرے اور پردے پر نظر آنے والے ہدف پر خیالی گولیاں چل پڑیں۔ وی پی ایل کی ایک تحقیق ڈاٹا سوٹ ہے، جو کسی ہواباز کے جمپ سوٹ کی طرح ہے، جس کی وائرنگ میں پچاس مختلف نوعیت کے سنسر کمپیوٹر کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اداکار یا ناظر کے ایکشن کے ساتھ مناظر بدلتے رہتے ہیں۔ ماضی کی ٹیکنالوجی کے برعکس، جس میں احساسات اور تاثرات ریکارڈ کر لیے جاتے ہیں، اب کمپیوٹر حقیقی زندگی کے کوائف حاصل کرنے کے لیے ان میں تبدیلی بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

1990 کے عشرے میں امریکا کے طول و عرض میں تفریح کے مناظر پارک اور شاپنگ مال ہوا کرتے تھے۔ فلمی صنعت پہلے ہی نوجوانوں کی بہ دولت اچھی خاصی کمائی کر رہی ہے، جس میں رہائش گاہوں کو مشینوں میں بدل دیا گیا ہے، حقیقت پسندانہ ایکشن گیم وہ ہوتے ہیں، جس میں جنگی پروازوں کو مبالغے کے ساتھ دکھایا جاتا ہے اور جو ایک سنسنی خیز ٹیکنالوجی ہے۔ شکاگو میں اگست 1990 میں ایک بیٹل ٹیک سنٹر (Battle Tech Center) کھولا گیا تھا، جو ایک مقبول تفریح کے اظہار کی ابتدائی صورت تھی۔ اس مرکز میں آنے والے تماشائی حقیقی، لیکن فرضی میدانوں میں جنگی مقابلے دیکھتے تھے۔ اس کے لیے ان کے کنٹرول پینل میں بٹن لگے ہوتے تھے، جسے وہ حسب منشا استعمال کرتے تھے۔ انگریز ماہر کاری گروں نے ڈنگنز اینڈ ڈریگنز (Dungeons & Drabons) کے نام سے ایسا ہی ایک کھیل نکالا ہے جس میں مافوق الفطرت کردار زمانہ وسطیٰ کے پس منظر میں کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ لاس ویگاس کے ایکس کلیر ہوٹل میں مرلن کی جادوئی موشن مشین اپنے ناظرین کو ایک خیالی برق رفتار ٹرین اور رولر کاسٹر کی سیر کراتی ہے۔ اس کی نشستوں کے ساتھ مضبوط حفاظتی دستے لگے ہوتے ہیں۔ اس وقت ڈزنی لینڈ کی سب سے مقبول اور پرکشش تفریح سٹار ٹورز (ستاروں کی سیر) ہے۔ بلاک بسٹر انٹرٹینمنٹ کارپوریشن جو وڈیو رینٹل کا دیوہیکل ادارہ ہے، اس نے بالغوں کے اعلیٰ فنی کھیل کے میدان کا انتخاب کیا ہے۔ یہ اپنے شائقین کو شہر کی مصنوعی حقیقی سیر کراتے ہیں۔ ایک اور فرم لونا کارپوریشن ہے جس نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ وہ چاند کی سطح پر ریت میں چلنے والی بگھی رکھیں گے، جسے شائقین زمین پر واقع اپنے مقررہ پارک سے ریموٹ کنٹرول چلائیں گے۔

حصہ سوم

آٹھواں باب

عوام کے تجربے پر تہذیبی ٹیکنالوجی کا اثر

سقراط کے ساتھ ایک مکالمہ

تہذیبی ٹیکنالوجیز (culturaltechnologies) کے تعلق سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شخصی تجربے میں اضافے کا یہ ایک طریقہ ہے۔ شخصی تجربے کا آغاز رُوبہ رُو گفت گو سے ہوتا ہے۔ ذرا دیر کو فرض کر لیتے ہیں کہ آپ، جو جلد اثر قبول کرنے والے ایک نوجوان مرد یا خاتون ہیں، میز پر ایک نہایت ذہین اور اثر آفریں شخص کے مقابل بیٹھے ہیں، جو سقراط بھی ہو سکتا ہے۔ وہ زندگی کا مقصد فکر انگیز پیرائے میں اور بھرپور انداز سے پیش کر رہا ہے، اس طرح آپ کی توجہ اس کے ہر لفظ پر لگی ہوئی ہے۔ آپ جس طرح سقراط کے دلائل کو سنتے ہیں اور اس کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں، زندگی کے بعض مسائل اچانک آپ پر روشن ہو جاتے ہیں، آپ کی فکر بدل جاتی ہے۔ ان خیالات کے تحت آپ احساسات کی شدت سے گویا پھٹ پڑنے لگتے ہیں۔ پھر گفت گو ختم ہو جاتی ہے۔ رخصت ہوتے وقت سقراط کے الفاظ آپ کے کانوں میں گونجتے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض خیالات آپ کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ابھی ذرا دیر پہلے آپ غیر معمولی تجربے سے دوچار ہو چکے ہیں اور اس وجدانی کیفیت کو جتنے عرصے تک ممکن ہے، اپنے وجود میں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

آپ کے پاس اب جو کچھ فوری طور پر موجود ہے، وہ حافظے میں محفوظ آپ کا تجربہ ہے، لیکن باتیں تیزی سے بھولتی جاتی ہیں۔ لہٰذا آپ کاغذ اور پنسل پکڑتے ہیں اور وہ باتیں جس قدر یاد آتی ہیں، کاغذ پر لکھتے جاتے ہیں۔ آپ باہمی گفت گو کے ٹکڑوں کی دوبارہ تعمیر

کر کے انہیں آپس میں جوڑتے ہیں۔ ممکن ہے اس وقت آپ کو سقراط کے کچھ اصل فقرے بھی یاد آ جائیں۔ اسے دوبارہ لکھنے کے بعد آپ کے پاس اپنے تجربوں کا ایک تحریری ریکارڈ موجود ہے۔ یادداشتوں کو تازہ کرنے کے لیے اسے آئندہ استعمال کیا جا سکے گا۔ اگرچہ یہ گفت گو اختصار پر مبنی ہے، لیکن اس میں بعض خیالات، محاورے اور توضیحات، جنہیں آپ نے اہم سمجھا تھا، یاد رہ گئی ہوں گی۔ پانچ یا دس سال بعد اس بات کو سوچتے ہوئے آپ کو بعض تفصیلات یاد آ جائیں گی، جو اس وقت تک ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔ آپ کی تحریر پڑھتے وقت کسی بھی خواندہ شخص کو سقراط سے آپ کی ملاقات کا تاثر مل جائے گا۔ اگرچہ اسے اس ملاقات کا ذاتی تجربہ نہیں۔ تحریر نے تہذیبی ٹیکنالوجی کے طور پر اب تک دو نتائج حاصل کیے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کی بہ دولت آپ اپنے تجربے پر مبنی یادداشت کو محفوظ کر لیتے ہیں، دوسری بات یہ کہ اس تجربے کے علم کو آپ دوسرے فرد کو منتقل کر سکتے ہیں۔ اشارے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی تحریر نے زمان و مکان کے تجربے کو وسعت دے دی ہے۔

افلاطون، جب ایتھنز کے شہریوں کے ساتھ فلسفیانہ مباحث میں مصروف ہوتا تو سقراط سامنے میز کے دوسرے سرے پر نہ سہی، لیکن افلاطون کے قدموں پر یا بہت قریب ہی بیٹھا ہوتا۔ افلاطون کے مکالمات ان سوالوں پر مبنی ہیں جو سقراط اور گفت گو میں شامل دوسرے افراد سے منسوب ہیں اور اس میں وہ بیانیہ بھی شامل ہے، جس سے پس منظر میں ایک ڈرامائی عنصر پیدا ہو گیا ہے۔ اگرچہ مصنف کی یادداشت کی طاقت کی بنا پر اس کی صداقت محدود ہے لیکن مکالمے جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔ کوئی بھی شخص یہ فرض کر سکتا ہے کہ چوبیس سال پرانے تجربوں کو پوری صداقت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح افلاطون کی تحریر کی بہ دولت سقراط کی چوبیس سال پرانی گفت گو کو ایک اثر انگیز دنیاوی وجود مل گیا۔ مکانی طور پر یہ مکالمے نقل شدہ مسودے اور چھپے ہوئے متون لاکھوں کروڑوں پڑھنے والوں تک پہنچ چکے ہوں گے، اور بہت سے لوگوں نے بھی مکالمات کے ذریعے سے سقراط کی باتیں ''سن لی ہوں گی،'' حالانکہ اصل گفت گو جس وقت ہو رہی تھی، جسمانی طور پر انہیں سننا ممکن نہیں تھا۔ تحریری زبان خیالات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ کسی تجربے کے حیاتی پہلو کو بہ خوبی بیان کرنا اگرچہ اس کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ سقراط سے گفت گو کرتے وقت ہمارے اندر ابھرنے والی بہت سی کیفیت اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی آواز کے لحن اور اتار چڑھاؤ سے پیدا ہو سکتی

تھی۔ حافظے کے اس پہلو کو وسعت دینے کے لیے کسی اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہوگی۔ بجلی کی دریافت اور برقیاتی کیفیت (electromagnetic impulses) کے توسط سے یا کیمیاوی ردِعمل کی بہ دولت کلچرل ٹیکنالوجیز کی ایک نئی شکل پیدا ہوگئی ہے، جو حسیاتی تجربوں کو گرفت میں لے سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک فوٹوگرافر نے جو کیمرے سے لیس تھا، گفت گو کے دوران میں سقراط کے چہرے کی ایک خاص کیفیت کو اپنی تصویروں میں محفوظ کر لیا۔ چونکہ گفت گو کا مفہوم جزوی طور پر چہرے کی کیفیت سے ادا ہوگیا، اس لیے سننے والے کے تجربے میں کچھ ایسی بات ضرور شامل ہوگئی جسے وہ یاد رکھے گا اور جس کی مدد سے وہ بولنے والے کے چہرے کو اپنے ذہن میں لا سکے گا۔ اب یہاں سقراط کی بصری شباہت بھی وقت کے ساتھ اسی طرح طویل ہوسکتی تھی، جس طرح افلاطون کی تحریر کو طوالت حاصل ہوئی۔

اب کچھ دوسرے طریقے سوچے جاسکتے ہیں، جن کی مدد سے جدید ٹیکنالوجی سقراط کے ساتھ گفت گو کے تجربے میں توسیع کرتی——

☆ سقراط جہاں بیٹھا تھا، اگر کوئی شخص وہاں میز پر ایک ٹیپ ریکارڈر رکھ دیتا تو انسانی معاشرے کے لیے مکالمات کے دوران میں پیدا ہونے والی آوازوں کو مستقل طور پر محفوظ کر لیا جاتا۔ تب معلوم ہوتا، جب سقراط بول رہا تھا تو اس کے اصل الفاظ کیا تھے اور یہ کہ اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ اور لہجے کی کیفیت کیا تھی، کہاں وہ رکتا تھا، اور گفت گو کے دوسرے عناصر کیا تھے جو احساس کی سطح سے نیچے کی کیفیت کو بھی بیان کرتے تھے۔ اس ٹیکنالوجی سے افلاطون کے اصل الفاظ ذہن میں تازہ اور بہتر طور پر اظہار میں آتے اور یہ ایک طریقہ جسمانی تجربوں کو محفوظ کرنے کے لیے ہوسکتا تھا۔

☆ اگر چند فلم بنانے والے وہاں موجود ہوتے، جن کے پاس کیمکارڈر (تصویر اور آواز کو بیک وقت ریکارڈ کرنے والا آلہ) ہوتا اور وہ اس ساری گفت گو کو عکس بند کر لیتے تو عالم انسانیت کے پاس اس سارے تجربے پر مبنی لسانی اور بصری مرقعے مستقلاً محفوظ ہوتے، چہرے کے تاثرات اور جسم کی حرکات بھی محفوظ ہو جاتیں۔

☆ اگر وہیں میز پر مائیکروفون رکھا ہوتا تو گفت گو کی آواز دوسرے کمرے میں رکھے ہوئے مائیکروفون کے ذریعے دوسرے لوگوں تک پہنچ جاتی اور بہت بڑی تعداد میں بیٹھے ہوئے لوگ انہیں سنتے۔

☆ اگر میز پر ایک سپیکر ٹیلیفون لگا ہوتا تو یہ بات سینکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے لوگوں کو ٹیلیفون ریسیور پر سنائی دیتی۔

☆ اگر یہی گفت گو ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے نشر ہوتی تو نشریے کی حدود میں رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی اسے سن سکتی تھی۔

☆ اگر یہی گفت گو ٹیلی وژن ٹرانسمیٹر سے نشر ہوتی، تو عام لوگوں کی اتنی ہی بڑی تعداد، جن کے پاس ٹیلی وژن سیٹ ہوتے، سقراط کی گفت گو نہ صرف سن سکتے تھے، بلکہ اسے دیکھنے کا تجربہ بھی انہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں، سقراط کے پاس بیٹھنے کا اور اس سے رُوبہ رُو بات چیت کا جو تجربہ ہے، کوئی اور بات اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پس اس میں یہ کمی ضرور ہے کہ ذاتی حافظے سے قطع نظر گفت گو ختم ہوتے ہی، وہ سارا تجربہ حافظے سے محو ہو جائے گا۔ کلچرل ٹیکنالوجی حافظے کو توسیع دیتی ہے اور متنوع تجربوں کو دوسروں تک پہنچاتی ہے، البتہ یہ بات یاد رہے کہ اوپر بیان کردہ ٹیکنالوجیز میں سے کوئی ایک بھی سقراط کے ساتھ دوطرفہ بات چیت کی اجازت نہیں دیتی۔ سقراط کے الفاظ کو مکالمات میں جس طرح لکھے ہوئے ہیں ہم پڑھ تو سکتے ہیں لیکن ہم درمیان میں اپنا تبصرہ اس میں داخل نہیں کر سکتے، یا سوال نہیں کر سکتے۔ ہم سقراط کی شباہت کو وڈیو ٹیپ پر دیکھ سکتے ہیں لیکن اس منظر میں اپنے آپ کو داخل نہیں کر سکتے۔

صرف کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی میں یہ اہلیت ہے کہ وہ اس کوتاہی پر قابو پا لیتی ہے۔ اس میں اتنی طاقت ہے کہ اپنے تماشائیوں کو ذہنی مشینوں کی مدد سے باہمی مباحثے میں شریک کر سکتی ہے۔ سقراط کے دماغ میں جو فکر موجود تھی اگر کمپیوٹر کا حافظہ (memory) اس فکر کو دہرا سکتا تو اس صورت میں ہر وہ شخص جو آج زندہ ہے یا آئندہ موجود ہو گا وہ اس عظیم فلسفی کے ساتھ دوطرفہ بات چیت کے تجربے کو قریب آتا ہوا دیکھے گا۔

اظہار کے سلسلے میں اقدار پر مبنی تبدیلیاں

حقیقی تجربے کی بجائے ایک مصنوعی ذریعہ اظہار کے تجربے میں کم از کم تین نتیجے نکلتے ہیں۔ یہ مصنوعی ذریعہ اظہار تخیل کو زمان و مکان میں وسعت دیتا ہے۔ اس کی بہ دولت لوگوں کے پھیلے ہوئے گروہ تک پیغام پہنچتا ہے۔ یہ تخیل محض ان افراد تک محدود نہیں رہتا جن کا

انہیں براہِ راست تجربہ ہو بلکہ یہ پوری برادری کا تجربہ ہو سکتا ہے۔ دوسری بات، یہ کہ ایک مخصوص ذریعے سے کسی تجربے کا اظہار تجربے کی نوعیت کو بدل دیتا ہے۔ اظہار کے اس ذریعے میں جو مخصوص صفات موجود ہیں وہ اس تجربے میں رنگ آمیزی کرتی ہیں۔ ذریعہ اظہار بجائے خود متن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تیسری بات، کہ مصنوعی ذریعہ اظہار سے جو تخیل یا تجربہ حاصل ہوا ہے، اس کی ایڈیٹنگ بھی ہوتی ہے۔ عام طور پر بدلی ہوئی شباہت خود کو اصل سے بہتر انداز میں پیش کرتی ہے۔ دوسری طرف وہ تخیلات، جنہیں مصنوعی طریقہ سے بہتر صورت دی گئی ہے، ایک مسخ شدہ تجربے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جہاں تک پہلے تجربے کا تعلق ہے، دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ایک شباہت یا خیال، اپنی توسیع کی بنا پر بہت سے لوگوں تک پہنچ جاتا ہے اور عام لوگوں کے تجربے کی بنیاد بن جاتا ہے۔ افراد کا جو ذاتی تجربہ ہوتا ہے، تہذیبی ٹیکنالوجی اس سے الگ ایک دنیا تعمیر کرتی ہے۔ وہ معاشرے کی بلند ترین سطح پر رہنے والے افراد کی سرگرمیوں کو عام لوگوں کے سامنے لے کر آتی ہے۔ تاریخ اس سطح پر تجربات درج کرتی ہے۔ یہ وہی کچھ ہے جسے اخبارات میں پڑھتے یا ٹیلی وژن پر دیکھتے ہیں اور جو عوامی زندگی کے وقوعوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس سے کم تر سطح پر معاشرے میں وہ افراد آتے ہیں جو ذاتی طور پر دوسرے افراد کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔ عام لوگ جوں جوں ایک وسیع تر معاشرے سے آگاہی حاصل کرتے ہیں، ذاتی تجربوں سے گزر کر افراد کی برادری کے بارے میں ان کا مطمحِ نظر وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور ان تجربوں سے آگاہ ہوتے ہیں جس سے ان کا پاس پڑوس، شہر، قومیں اور پوری دنیا متاثر ہوتی ہے۔ اس سے بلند تر سطح پر جہاں تاریخ مرتب ہوتی ہے اور عام لوگ تقریباً پوری طرح تہذیبی ٹیکنالوجی کے ذریعے ان تجربات سے گزرتے ہیں، جو ان کے اور تاریخی شخصیات کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

سقراط کے ساتھ گفت گو کا جو مرقع ہم نے پیش کیا، اس میں، ہم نے یہ دیکھا کہ میڈیا (وسیلہ اظہار) تجربات کی محض توسیع کرتا ہے۔ کلچرل ٹیکنالوجیز کسی خیال کو وقت اور فاصلے، دونوں کے لحاظ سے وسعت دیتی ہیں اور اس میں کوئی رد و بدل نہیں کرتیں۔ دوسرے الفاظ میں جب کوئی بات اظہار کے ایک وسیع ذریعے کی گرفت میں آجاتی ہے تو اس میں تجربے کی مقدار تو بدل جاتی ہے، اس کی کوالٹی یا اصل حیثیت نہیں بدلتی۔ یہ مفروضہ درست نہیں ہے۔ تعداد میں اضافے کے ساتھ اکثر اس کی کیفیت بھی بدل جاتی ہے۔ ایک طرح کی تبدیلی کا تعلق اس

ذریعہ اظہار سے ہے، جس میں کسی خیال کو بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور کتب بینی کی دنیا کمرشل ریڈیو کی دنیا سے یک سر مختلف ہوتی ہے۔ طباعت کا کلچر اپنے ساتھ کسی تجربے کے منطقی اور مدلل پہلو لے کر آتا ہے۔ برقی ذریعہ اظہار اس کے جذباتی پہلو اور اس کی مترنم کیفیت کو ہمراہ لاتا ہے۔ اسی لیے آپ عالمی تاریخ پر اس طرح کی بحث ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوتے ہوئے نہیں سنیں گے، خواہ نظری طور پر ایک اناؤنسر یہی الفاظ زبان سے دہرا دے۔ ابلاغ کے ماہر دانش وَروں نے مارشل میکلوہن کی سرکردگی میں اس لازمی رابطے پر بہت زور دیا ہے، جو کیا اور کیسے کے درمیان پایا جاتا ہے، یعنی کیا بات کس طرح کہی جا رہی ہے۔ اس تعلق کو میکلوہن کے اس مشہور دانش ورانہ قول میں بیان کیا گیا ہے کہ ''ابلاغ ہی پیغام ہے۔''

کسی شے کی مقدار میں اضافے کے ساتھ فی نفسہٖ اس کے معیار میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ ذاتی سطح پر جو تجربے حاصل ہوتے ہیں، وہ نشری ذریعے سے حاصل ہونے والے تجربوں سے جداگانہ احساس رکھتے ہیں۔ پہلا تجربہ حقیقی تھا، جب کہ یہ دوسرا مصنوعی ہے، تاہم مصنوعی تجربے جو کلچرل ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں، ایک معنی میں، حقیقی سے بہتر ہوتے ہیں۔ ایک گھریلو مثال لیجیے۔ اگر آپ کا تہذیبی افق صرف خاندان تک محدود ہے، تو تہذیبی طور پر آپ زیادہ سے زیادہ جس تجربے کی توقع کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آنٹی ایلس سے پیانو پر کوئی پرانی دھن سن لیں۔ لیکن آپ کا رابطہ اگر ٹی وی نیٹ ورک سے ہے تو یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہی دھن عالمی شہرت کا حامل ایک پیانو کا ماہرفن آپ کو دے۔ اس لیے کہ ٹی وی نیٹ ورک ناظرین کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لیے کشش رکھتا ہے اور اسی تہذیب سے اسے اشتہارات ملتے ہیں اور آمدنی ہوتی ہے، چنانچہ وہ اپنے پروگراموں کے لیے بہترین ماہرفن کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس صنعت کے ماہر ڈیوڈ سرناف اور بی بی سی کے لارڈ ریتھ کے خیال میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اعلیٰ ترین تہذیبی نمونے نشر کیے جائیں، یعنی ہر رات نیویارک کے فِل ہارمونک آرکسٹرا سے یا ویانا سٹیٹ اوپیرا سے کچھ نہ کچھ نشر ہوتے رہنا چاہیے۔ اگر نیٹ ورک ٹیلی وژن کسی اور طرف مائل ہو تو بھی ان کے پروگرام نہایت درجہ احتیاط سے مرتب کیے جاتے ہیں، یہاں آپ کو وہ پروگرام نظر نہیں آئیں گے، جو بالکل اصل کے مطابق، غیر پیشہ ورانہ اور سستے قسم کے ہوں۔

عام زندگی میں تو انتشار، بدسلیقگی اور پھوہڑپن آ ہی جاتا ہے۔ واقعات تھکا دینے

کی حد تک یکسانیت کے ساتھ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ٹیلی وژن کی فرحت بخش دنیا میں، معمول کی کوتاہیوں سے بچنا پڑتا ہے، اس کے لیے بہترین پروڈیوسر اور اداکاروں کی خدمات مول لینی پڑتی ہیں اور غلطیوں کو ایڈیٹنگ کی مدد سے دور کرنا ہوتا ہے۔ ٹی وی کی دنیا کو معمول کی تفریح اور دلچسپی سے اور مقبول عام شخصیتوں کی مدد سے بھرنا پڑتا ہے۔ یہ دنیا کلچر کی تمازت گاہ ہے جس میں اسلوب اور انداز بڑی تیزی سے پک کر پختہ ہو جاتے ہیں۔ یہ حسین اور شوخ و شنگ عورتوں اور توانا اور پُرکشش مردوں کی دنیا ہے، جو بھڑک دار انداز سے خود کو پیش کرتے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر لوگ جس طرح کی بے ہنگم زندگی گزارتے ہیں، اس کا مقابلہ شوبز کی دنیا سے نہیں کرنا چاہیے۔ ایک عام آدمی جس طرح کی زندگی گزارتا ہے، اس کے مقابلے میں ٹی وی نشریے کی اقتصادیات اس طرح کے وسائل مہیا کرسکتی ہے جن میں کہیں زیادہ توانا، بھرپور بھڑکیلی زندگی گزاری جاتی ہے۔ اس طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ طباعت کی ٹیکنالوجی تحریر کے پیکر کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے، چنانچہ کتاب کی اشاعت کی ایک ایک کاپی پر لاگت کئی گنا گھٹ جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مصنّفین، جن کی تحریریں زیرِ اشاعت ہیں الفاظ کے انتخاب میں ایک عرصہ لگا سکتے ہیں اور ان میں زیادہ گہری معنویت اور بلاغت پیدا کر سکتے ہیں۔ طباعت کے لیے جانے والا مسودہ بار بار کی نظرِ ثانی کا حاصل ہوگا، اس طرح تحریر کی دنیا غیر فطری احساسات کی دنیا ہوگی۔ جہاں صناعی نے اظہار کی دل آویزی میں پختگی حاصل کی ہے اور غالباً اس میں چھپے ہوئے علامتی معانی پیدا کر دیے ہیں۔

اب جو بات گہری معنویت پیدا کرنے میں مانع ہوتی ہے، وہ یہ اصلیت ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے کشش ہونی چاہیے۔ لہٰذا اس کا تعلق عام لوگوں کی دنیا سے ہونا لازمی ہے۔ عوامی کلچر کو فروغ دینے والے فن کے عالم نہیں ہوتے، بلکہ عوام ہوتے ہیں۔ ٹی وی کے پروڈیوسروں کی پہلی فطری خواہش یہ تھی کہ ایسے ڈرامائی فن پارے پیش کریں جو تنقید کے معیار پر پورے اترتے ہوں، یا پھر ایسی بھڑک دار اور دھوم دھام والی تفریح پیش کریں، جس میں قیمتی ملبوسات کی نمائش ہوتی ہے، لیکن عام لوگوں نے انہیں اپنے ڈھب کی چیز نہیں سمجھا۔ وہ تو اس طرح کے کھیل دیکھنا چاہتے تھے، جیسے مثلاً 'آئی لولوسی' اور 'دی ہنی مونرز'؛ جن میں مزاحیہ اداکار چہرے پر بوکھلاہٹ لیے معمول کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ ایسی شخصیت جو گھسی پٹی ہونے کے باوجود لوگوں کے لیے قابلِ اعتبار ہیں، ٹیلی وژن کلچر کا خاص حصہ بن گئی

ہیں۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ایسے پروگرام جن کی ایڈیٹنگ انتہائی احتیاط سے کی گئی ہو، ان پروگراموں کے مقابلے میں لازمی طور پر معیاری ہوں گے، جن کی ایڈیٹنگ نہیں کی جاتی، یا جو لائیو پروگرام ہوتے ہیں، لہٰذا سارے تفریحی پروگرام اس نمونے کے گرد گھومتے ہوں گے، لیکن تمام مفروضوں میں اس بات کو بھلا دیا جاتا ہے کہ کلچرل پروگراموں کی پیش کش میں اعتبار کے عنصر کی بڑی اہمیت ہے۔ لائیو پروگرام زیادہ بے ساختہ اور حقیقت کے مطابق ہوتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے کسی ایک مصنف یا اداکار کا ایک بڑے ہجوم سے براہِ راست مکالمہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایسی بڑی بڑی برادریاں بنائی جا سکتی ہیں، جن میں عوامی شعور مشترک ہو۔ وہ معاشرے، جن میں تحریر کا چلن نہیں، دیہی ساخت کی آبادیوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہ بادشاہتیں جن کے قبضے میں وسیع علاقے ہوتے ہیں، ان کے ساتھ مواصلات کے لیے زیادہ تعداد میں لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا وسیع سیاسی وحدتوں کے ساتھ تحریر کی زبان کا وجود بھی ضروری ہو جاتا ہے اور ان وحدتوں کی تنظیم جدی پشتی حوالے سے ہوتی ہے۔ اس تحریر کی زبان کے ذریعے بادشاہ اپنی دور افتادہ رعیت کے نام احکام بھیج سکتے ہیں۔ چنانچہ چھپائی کے آنے سے عام لوگوں کو کثرت سے خبریں اور اطلاعات ملنے لگیں کہ یہ ایک جمہوری حکومت کے لیے لازمی ہوتی ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے کہ تہذیبی ٹیکنالوجی عوام کے تجربوں میں کچھ ذائقہ شامل کر دیتی ہے تو اس حقیقت کی بنا پر ان ٹیکنالوجیز میں جو تاریخ کے مختلف زمانوں میں ایجاد کی گئیں اور رائج ہوئیں، ان کے اندر ہر زمانے کا مختلف ذائقہ بھی شامل ہوتا رہا۔ جب چھپائی کی ٹیکنالوجی آئی اور پھر جب برقی مواصلات کا ذریعہ بالعموم استعمال ہونے لگا تو انسانی تہذیب ہاتھ کے لکھے ہوئے پیغامات کے زمانے سے مختلف تھی۔ بدلتی ہوئی تہذیبی ٹیکنالوجیز عوامی تجربوں کے اسلوب میں بھی تبدیلی پیدا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک کے بعد دوسری تہذیبی ٹیکنالوجیز کی آمد سے نئی تہذیبوں کے آغاز کا پتا چلتا ہے۔ ہر تہذیب کی ساخت میں وہ ملی جلی ٹیکنالوجیز شامل ہوں گی، جو اس زمانے کے کلچر میں رائج ہوں۔ انسانی آبادیوں کا داخلی شعور، ہر ذریعہ مواصلات کے ملے جلے ذرائع سے، جو عوامی زندگی میں رائج ہوں، اثر قبول کرے گا۔ تاریخ کے ادوار جو مستقلاً تہذیبی ذائقوں اور اپنے دور کے موضوع سے عبارت ہیں، ان ٹیکنالوجیز کی تقلید کرتے رہیں گے، جن سے ان کے پیغامات کی ترسیل ہوتی رہے گی اور رونما ہونے والے واقعات کو انہی کی عینک سے دیکھیں گے۔

تہذیبی ٹیکنالوجیز کا تسلسل

آثارِ قدیمہ کے برطانوی ماہر سر ایلس منس نے لکھا ہے، ''اگر یہ بولنے کی صلاحیت ہے جو انسانوں کو جانوروں سے ممیز کرتی ہے، تو تحریر کی ایجاد اور ایک عملی نظام میں اس کی بہ تدریج بہتری کے عمل کو مکمل تہذیب کی جانب ایک قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ تقریر نجی زندگی میں مواصلات کا ذریعہ ہے۔ جب کہ تحریر انسانوں کے درمیان وسیع تر زندگی کے دائرے میں مواصلات کا وسیلہ ہے۔ (کم از کم یہ بات ٹیلیفون، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی آمد سے پہلے تک درست تھی) بول چال کی زبان اہم ترین تہذیبی ٹیکنالوجی ہے۔ گھر کے اندر یہ ٹیکنالوجی غیر رسمی ماحول میں بھرپور طور پر سکھائی جاتی ہے۔ تقریباً ہر انسانی قبیلے کے اندر بول چال کی ایک زبان ہوتی ہے۔ بیشتر افراد ایک خاص عمر میں بولنا سیکھ لیتے ہیں۔ تحریر کے معاملے میں یہ بات درست نہیں۔ یہ ٹیکنالوجی صرف پانچ یا چھ ہزار سال پہلے ایجاد ہوئی تھی اور قبیلے نہ سہی لیکن بہت سے افراد ناخواندہ رہ گئے ہیں۔ تقریر کے برعکس پڑھنے اور لکھنے کے فن عام طور پر ایک کلاس روم میں سیکھتے ہیں۔ تہذیبوں اور ابتدائی معاشروں میں یقینی طور پر تفریق کا پیمانہ خواندگی معلوم ہوتا ہے۔

مشینی فنون (مکینیکل آرٹس) کے برعکس کلچرل ٹیکنالوجیز کا تعلق، خیالات، تخیلات، الفاظ، اعداد، مشاہدے کی قوت اور احساسات سے ہے۔ بولی جانے والی زبان اظہار کے لیے کسی آلے کی محتاج نہیں، لیکن تحریر کے لیے کسی اوزار کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی چکنی سطح پر علامتی نشانات ابھارے جا سکیں۔ تقریباً ہر ترقی یافتہ معاشرے نے اپنا ایک نظام تحریر مرتب کیا ہے۔ بعض معاشروں نے اپنے اصل ذریعے سے کام لیا اور اس کی ٹیکنیک کی نقل کی (وہ ذریعہ میسوپوٹامیا تھا)، لیکن دیگر معاشروں نے آزادانہ ایجاد سے یا کسی نامعلوم تہذیبی تبادلے کے تحت اسے حاصل کیا۔ مختلف معاشروں نے تحریر کا فن کب حاصل کیا، اس کی تاریخیں ہمارے علم میں نہیں۔ تحریر سے پہلے معاشروں کی اپنی تہذیبی اساس تھی اور اس کی بنیاد قبائلی یادداشتوں کو مستقلاً زبان سے ادا کرنے کی بہ دولت تھی۔ اس کے بعد دوسری تہذیبی ٹیکنالوجیز ایجاد ہوئیں، جو بنیادی تحریر میں اصلاح کی نمائندہ تھیں، یا جن سے احساسات کی ترجمانی ہوئی اور کیمیاوی یا برقی ذرائع سے ہوا کی لہروں پر اظہار ہوتا رہا۔

ٹیکنالوجی کی تمام ایجادات اس پائے کی نہیں کہ اپنی طاقت سے تاریخ کو بہا لے جائیں، تاریخی تبدیلیوں کی تفہیم کے لیے اس کتاب میں پانچ طرح کی تہذیبی ٹیکنالوجیز پیش کی گئی ہیں۔ ان پانچ کے زمرے میں درج ذیل شامل ہیں۔

1) تحریر: یہاں میری مراد تحریر کی ابتدائی صورت سے ہے، یعنی حروف کی لکھاوٹ سے پہلے کی تحریر، خیالات کو علامتوں کے ذریعے پیش کرنے کے دور سے پہلے بصری اظہار، ہر علامت اس کے مماثل ایک بولے جانے والے لفظ کی نمائندگی کرتی ہے۔ علامت ایک پورے لفظ کی نمائندہ ہے محض آواز کی نہیں۔ تحریری زبان کی ابتدا چار ہزار قبل مسیح سمیریوں اور مصریوں کے دور میں خیالات کو تصویروں کے ذریعے ادا کرنے سے ہوئی۔

2) حروف کی تحریر: یہ ایک نئے طرز کی تحریر تھی، جس میں الفاظ حروف سے جڑ کر بنتے ہیں اور حروف اس کے مطابق آوازوں سے، بول چال میں الفاظ جس ترتیب سے آتے ہیں، تحریر میں بھی الفاظ اس ترتیب سے آتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حروف سے متعلق آوازوں کو سمجھتا ہے تو وہ الفاظ کو آوازوں کی مدد سے پڑھ کر بول چال سے اپنی سابقہ واقفیت کی بنا کر اس کے معنی جان لے گا۔ حروف پر مبنی تحریر ایک ہزار سال قبل مسیح میں مشرقِ وسطیٰ، یونان اور ہندوستان میں بالعموم استعمال ہوتی تھی۔

3) چھپائی: تحریری زبان میں حروف کی ساخت تو تبدیل نہیں ہوئی، لیکن عبارت کو دوبارہ پیش کرنے کا ایک طریقہ دریافت کر لیا گیا۔ چھاپے خانے میں کسی تحریر کی بہت سی نقلیں، کسی نقل نویس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے اور کم خرچ پر چھاپی جانے لگیں۔ اس طرح کی مشین متن کا ایک پورا صفحہ اس وقت ''تحریر'' کر دیتی ہے، جب اس کے ٹائپ کو روشنائی لگائی جائے اور نیچے کاغذ رکھا ہو۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جوہن گوٹن برگ نے چھپائی کی ٹیکنیک کی اصلاح کی اور یورپ میں مطبوعہ لٹریچر کو عام کیا۔

4) برقی مواصلات: اس کے زمرے میں بہت سی ایجادات آتی ہیں۔ ان میں فوٹوگراف، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، سینما، ٹیپ اور وڈیو ریکارڈنگ، ریڈیو اور ٹیلی وژن آتے ہیں۔ (ان سارے طریقوں میں دکھائی اور سنی جانے والی شباہتوں کو (اور ان میں

بولے جانے والے الفاظ بھی شامل ہیں) ایک ایسے میڈیم کی گرفت میں لے لیا جاتا ہے، جو روشنی اور آواز کے ضمن میں نہایت حساس ہیں، پھر ان کے تاثر کو ایک کیمیاوی عمل، برقی رو میں یا برقی مقناطیس میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس طریقے میں میڈیم کے اندر محفوظ کیا جانے والا متن دوبارہ بحال کیا جا سکتا ہے۔ بعض طریقوں (Devices) کے تحت، خیالات کو برقی مقناطیسی رو کے ذریعے دھات کے تاروں کی مدد سے یا ہوا کی لہروں کے ذریعے طویل فاصلے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ یورپی یا امریکی موجدوں نے ان ٹیکنالوجیز کو انیسویں اور بیسویں صدی کے اندر فروغ دیا۔

5) کمپیوٹر: اس برقی مقناطیسی (electromagnetic) کے میڈیم میں کمپیوٹر بھی خیالات کی ترسیل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شباہتوں کو اور معلومات کو توڑ دیتے ہیں اور جو فرد انہیں حسب عادت استعمال کرتا ہے اس کی ضرورت کے مطابق وہی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اعداد و شمار کو برتنے میں کمپیوٹر ریاضی اور منطق کے طریقے استعمال کرتے ہیں اور دوطرفہ مواصلات رکھتے ہیں۔ اس طرح کی مشین کو بیسویں صدی کے نصف آخر میں فروغ حاصل ہوا۔

حافظے کا کلچر: ماقبل تاریخ کے دور میں

تحریر کی ایجاد سے پہلے کے زمانے کو ہم ''ماقبل تاریخ'' کا زمانہ کہتے ہیں، کچھ اس بنا پر بھی کہ ہمارے پاس انسان کے داخلی تجربوں کا کوئی پختہ ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ انسان زمین پر کئی ہزار سال سے آباد ہے، لیکن اس کی سرگرمیوں کا صرف کم وبیش چھ ہزار سالہ ریکارڈ محفوظ کیا جا سکا ہے۔ صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے کہ انسان پتھر کے اوزاروں، ہڈیوں اور دوسری باقیات کے ساتھ جو کھدائی کے دوران ملی ہیں، کس طرح زندگی گزارتا ہو گا۔ ان گم شدہ معاشروں کی زندگی کے بارے میں مکمل تصویر تحریر کی زبان میں ملتی ہے، جسے آثار قدیمہ کے ماہر اور مؤرخ پڑھ لیتے ہیں۔ بہت حد تک ہمارے علم اور مختلف اقوام کی تاریخی اہمیت سے واقفیت کا انحصار انہی لوگوں پر ہے، جنہوں نے آئندہ نسلوں کے لیے اپنے ادب کا سرمایہ چھوڑا ہے۔ ہندوستان میں آریائی اقوام سے پہلے کے لوگوں کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم

نہیں اور ان کی تاریخ کا بھی علم نہیں، کیوں کہ ان کی تحریر پڑھی نہیں جا سکتی ہے۔

خواندگی سے پہلے کا زمانہ ماضی میں اس حد تک پھیلا ہوا ہے جب ہمارے مفروضے کے مطابق انسان بڑی حد تک اپنی جبلت کے مطابق زندگی گزار رہا تھا، اس کا علم اس کی جین میں محفوظ تھا۔ تہذیبی بصیرت ایک سے دوسری اور پھر بعد کی نسل کو کہانیوں، مناجاتوں، دعاؤں اور بولی جانے والی زبان میں اکثر ایک طے شدہ رسمیات کے مطابق منتقل ہوتی رہی۔ ایک بچہ اپنے ماں باپ سے بولنا سیکھتا ہے، جس طرح اس کے والدین نے اپنے والدین سے سیکھا تھا۔ آج ہم جس چیز کو اعلیٰ وارفع شاعری قرار دیتے ہیں، وہ ایک زمانے میں یادداشت کو تازہ رکھنے کی ایک ترکیب تھی۔ ہومر نے اپنی نظمیں اوزان میں مسدس کے انداز میں لکھیں جس میں چھ ارکان ہر مصرع میں تکرار کے ساتھ آتے ہیں۔ الفاظ کی اس مترنم ترتیب سے شعری محفلوں میں اسے یاد کرنا آسان ہو گیا۔ ہومر کی رزمیہ نظم، جدید شاعری کی طرح کسی متعین ڈھانچے میں نہیں لکھی گئی، بلکہ یہ بے ساختہ شاعری کے وہ نمونے ہیں، جو مختلف موسیقار اپنے اپنے طریقے سے گاتے آئے ہیں۔ حافظے میں الفاظ کی عروضی ترتیب کو برقرار رکھنا اور کہانی کے کرداروں سے ان کی مطابقت اس تعلق سے گانے والے نظم کو اپنی تخلیق کے پیرائے میں پیش کرتے، چنانچہ ہر موسیقار نے نئے سرے سے ایک نئی نظم کی تخلیق کی۔

خواندگی کے آغاز سے پہلے کی اقوام تصویروں کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ رکھتی تھیں، لیکن وہ تصویریں تجریدی علامتوں کی سطح سے کچھ زیادہ نہ تھیں۔ دنیا بھر میں غاروں کے اندر ہزاروں برس پرانی جانوروں کی تصویریں اقلیدس کے انداز میں انسانی شباہتوں کے ساتھ دریافت ہوئی ہیں۔ اس تصویر سازی کا مقصد غالباً زبانی پیغام رسانی سے زیادہ رسوم کی ادائیگی یا کسی جادوئی تقریب کے حوالے سے تھا۔ جانوروں کی ہڈیوں پر جو نشانات لگائے گئے تھے اور جو غالباً تیس ہزار برس پرانے ہیں، ان کا مقصد اعداد کو یاد رکھنا تھا۔ تحریری زبان سے پہلے مختلف اشیا پر حافظے کی مدد کے لیے نشانات لگانا اس لیے تھا کہ پیچیدہ اطلاعات کو یاد رکھنا ممکن ہو۔ پیرو کے انکا (امریکی انڈین) ایک طریقہ اختیار کرتے تھے، جسے کیوپس (Quipus) کہتے ہیں۔ اس میں ایک افقی ڈنڈے پر مختلف رنگوں کے دھاگے جن میں گرہیں لگائی جاتی تھیں، بندھے ہوتے تھے۔ اروکئی انڈینز (Iroquois Indians) کے پاس ایک طرح کی پیٹی یا کمر کا پٹکا ہوتا تھا، جسے 'وامپن' کہتے تھے، جس کے حوالے سے تصویروں کے

ذریعے کہانیاں مرتب کی جاتی تھیں اور وہ تصویریں رنگین منکوں سے بنائی جاتی تھیں۔ مالی تبادلے کے لیے اس پیٹی کی قیمت دگنی ہو جاتی تھی۔ دیگر اقوام نے بھی نشان زدہ چھڑیوں، گرہ لگے ہوئے رومال یا چمڑے کی پیٹی، دھاگے میں پروئے ہوئے منکوں یا سیپ سے اپنی یادوں کو زندہ رکھا ہے۔

بہت سی قدیم اقوام کے قیاس کے مطابق تحریر کی ایجاد کسی دیوتا کی مرہونِ منت یا کسی الوہی شخصیت کا عطیہ تھی، جو زمانہ قدیم میں گزرا تھا۔ مصری اسے دیوتا تھیوتھ (Theuth) کی دین سمجھتے تھے۔ افلاطون کی تصنیف فیدرس (Phaedrus) میں لکھا ہے کہ مصری بادشاہ نے کس طرح تھیوس دیوتا کے ساتھ اس معاملے میں بات چیت کی۔ اس کی تہذیبی ایجادات میں سے کیا چیز انسانیت کے سپرد کرنی چاہیے۔

جب تھیموس نے تجویز پیش کی کہ اسے تحریر کا فن دیا جائے تو تھیوتھ نے جواب دیا ”اے بادشاہ! یہ علم کی وہ شاخ ہے جو مصر کے باشندوں کو زیادہ دانش مند بنائے گی اور ان کے حافظے کو درست کرے گی۔“ لیکن تھیموس بادشاہ نے جواب دیا کہ تحریر کے سلسلے میں تھیوتھ کی سفارش کا بالکل برعکس اثر پیدا ہوگا۔ ان کی روح میں خود فراموشی پیوست ہو جائے گی، وہ اپنے حافظے سے کام لینا چھوڑ دیں گے، کیوں کہ وہ صرف لکھے ہوئے پر تکیہ کرتے ہیں، جو کچھ ان کے اندر موجود ہے، حافظے کی مدد سے اسے ہارا نہیں کرتے، بلکہ باہر کی نشانیوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ تم نے جو کچھ دریافت کیا ہے وہ یادداشت کو برقرار رکھنے کا نسخہ نہیں بلکہ یہ تو یاددہانی ہے۔

افلاطون کے زمانے میں مصری تقریر و تحریر کے کلچر کی درمیانی حد پر پہنچ گئے ہیں، اس لیے حافظے کی مدد کے لیے تحریر کے استعمال میں ایک بات تو تھی۔ آرنلڈ ٹوائن بی نے لکھا ہے کہ ”یونان اور روم کی مشترکہ دنیا میں لکھے ہوئے لفظ کا عمل اس ٹائپ شدہ مسودے سے مختلف نہیں، جسے ایک مقرر نشر گاہ میں ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھ لیتا ہے۔ آج کل کے براڈکاسٹر کے مسودے کی طرح یونانی و رومن 'کتاب' دراصل یاددہانیوں کا ایک نظام تھی جس پر پرواز کرتے ہوئے الفاظ کو پرچایا جائے۔ ہمارے آپ کے مفہوم کے مطابق وہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہوتی تھی، جسے پڑھ کر دوسروں کو سنانا مقصود ہو۔“ اس کے برعکس آرمینیائی اور عبرانی باشندے دسویں صدی قبل مسیح مسلسل خواندہ چلے آ رہے تھے۔ ان کا مقدس

ادب تو اس سے بھی زیادہ قدیم بابل اور سمیری تہذیب سے ماخوذ تھا۔ اس لیے ٹوائن بی کے بیان کے مطابق، ''شام کی دنیا میں جس پر یہودیوں کا تسلط تھا، ایک کتاب انسانوں کے درمیان گفت وشنید کے لیے محض یاددہانی کی خاطر نہیں تھی، اس کے برعکس وہ خدا کا الہامی لفظ تھی۔ ایک مقدس شے جس میں ہر حرف اور تحریر شدہ ورق کی عبارت اپنے اندر جادو کی طاقت رکھتی تھی اور اس لیے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔''

ناخواندگی کی دو آرا

خواندگی سے پہلے کی تہذیب یا ناخواندہ تہذیب کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی ایسے فرد کی آنکھوں سے دیکھا جائے جسے دونوں دنیاؤں میں زندگی گزارنے کا تجربہ ہو۔ جین لیونگ، ایک چینی امریکی صحافی ہے جس کی ماں کی پرورش چین میں ہوئی، لیکن اس زمانے سے پہلے جب نادار خاندانوں کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔ صحافی خاتون نے لکھا کہ جدید معاشرے میں ایک ناخواندہ عورت نے کس طرح زندگی گزار دی۔ ہمارے معاشرے میں بیشتر بالغ افراد خواندگی کو ایسا ہنر سمجھتے ہیں جو از خود آ جاتا ہے۔ بہ ہر طور ایک ناخواندہ شخص کو اپنی گزر بسر کرنے کے لیے لاتعداد مواقع پر حالات سے مناسبت اور سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ لیونگ نے لکھا: ''میں اس بات کی شکرگزار ہوں کہ میری خواندگی کی استعداد نے مجھ پر بہت سی نئی دنیاؤں کے دروازے کھول دیے ... اور میرے دماغ کو کھول دیا۔''

''وہ شخص جو لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتا ایک خواندہ معاشرے میں اس کی زندگی کیسی ہوگی؟'' لیونگ نے سوال کیا کہ ''آپ نے اپنے کاموں کی فہرست آخری بار کب مرتب کی تھی۔ اب ذرا دیر کے لیے یاد کیجیے کہ وہ کام کیا تھے، کیوں کہ لکھی ہوئی عبارت یاد نہیں آ رہی ہے۔ کریانے کی دکان میں میری ماں بعض اشیا کی فہرست نہیں بناتی۔ اس کی بجائے وہ شیلف کی قطاروں کے درمیان سے اشیا کا معائنہ لیتی جاتی ہے، جنہیں دیکھ کر اسے یاد آ جاتا ہے کہ اسے کیا خریدنا ہے۔ آپ تصویروں کو تمام تر اپنے حافظے کی بنیاد پر ترتیب سے رکھتے ہیں، میری ماں نے اپنی زندگی کو یومیہ معمولات میں تقسیم کر رکھا ہے۔ صبح سورج کا طلوع ہونا ماں کے لیے محض خوب صورت منظر نہیں، انہی مناظر سے وہ اپنے وقت کی پیمائش کرتی ہے، سورج کا ہر سات مرتبہ نکلنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کی پوتی اس وقت چرچ میں ہوگی۔ اس

کے بعد دوسرا پھیرا شروع ہو جاتا ہے۔ جب روزمرہ زندگی میں اتنا بہت سا وقت علم سے خالی حافظے میں خرچ ہو جاتا ہے تو تخیل کی صلاحیت کو استعمال میں لانے کے لیے بہت کم وقت بچ رہتا ہے۔ اس سے تخلیقی صلاحیت پامال ہو جاتی ہے۔ ہر مرتبہ جب زندگی میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو بیش قیمت حافظہ اس کی نذر ہو جاتا ہے۔ ان پڑھ لوگ قدامت پرست ہوتے ہیں، وہ ہر تبدیلی سے بچتے ہیں، کیوں کہ اسے پھر یاد رکھنا پڑ جائے گا۔ اگر بس سٹاپ دو بلاک آگے بنا دیا جائے تو زیادہ لوگوں کے لیے وہاں پہنچنا آسان ہو جائے گا لیکن اس سے میری ماں کو چڑ ہوتی ہے۔ یہی معاملہ سٹور کے کھلنے اور بند ہونے کا ہے۔''

مارٹن پرکٹل کسی زمانے میں گوئٹے مالا میں عامل ہوا کرتا تھا۔ اپنے تجربات پر مبنی ایک کتاب میں اس نے دیہی زندگی کے متعلق لکھا ہے۔ اس زندگی پر زبانی معاشرت اور روایت کا غلبہ تھا۔ خواندگی کے بارے میں اس کا خیال مصر کے بادشاہ تھاموس کی یاد دلاتا ہے۔ تھاموس کی دلیل یہ تھی کہ لکھنے سے روح میں ''فراموشی جڑ پکڑ لیتی ہے۔'' پرکٹل نے لکھا، ''مایان کے لوگ جانتے تھے کہ جو افراد کسی بات کو یاد رکھنا نہیں چاہتے، وہ لکھنے کے ساتھ آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ انہیں یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس سے لوگوں کو انتخاب کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ جب چاہیں کسی بات کو یاد کر لیں، لیکن مایا کے نزدیک کسی متبرک بات کو بھلا دینا اس کی توہین ہوگی۔ ہم اس طرح کا انتخاب نہیں چاہتے، لہٰذا کسی حقیقی بات کو لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔''

مایا کے روایت پرستوں نے دنیا کو اس طرح دیکھا تھا کہ دیوتاؤں نے چار دوسری دنیائیں بنائی تھیں، لیکن اس سے پہلے ایک پانچویں دنیا بھی تخلیق کی تھی، یعنی پھل دار زمین جو ایک فطری جنت تھی جس میں انسان رہتا تھا۔ گاؤں میں جو بھی بچہ پیدا ہوتا وہ اپنے وجود کے الگ الگ مراحل سے گزرتا تھا۔ وہ مورتیوں کا ایک جوڑا ہوتا، پھر ایک بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت، اپنے بکھرے ہوئے وجود کو جوڑتے ہوئے اور جادوئی الفاظ اور منتر ادا کرتے ہوئے ''پھر وہی کچھ بن گئے جو وہ چاہتے تھے۔ دیوتاؤں نے مسلسل ان کے نام کا جاپ کرتے ہوئے دنیا کو زندہ کر دیا۔'' یہ پانچویں دنیا ''اتنی خوش مزہ تھی کہ دیوتا اس پر ریجھ گئے۔ گاؤں کے باشندوں اور دیوتاؤں کے درمیان ایک روحانی معاہدہ ہو گیا۔ دیوتاؤں نے کہا کہ وہ ہمیں زندگی دیتے رہیں گے اور ہمارے پاس آتے رہیں گے، اگر ہم انہیں اپنی یادیں بھیجتے رہیں

گے۔ (رسوم، عبادات، کھانے اور تخلیقی کاموں کی صورت میں) پھر ہم نے یہ سیکھا کہ دیوتاؤں کو فراموش نہیں کریں گے اور انہیں زندہ رکھنے کے لیے ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔ تمام دیوتاؤں نے مرحلہ وار ہماری یاددہانیوں کے چڑھاوے کھائے... ایک فراموش شدہ دیوتا ناراض دیوتا تھا، یا وہ مر چکا تھا، دونوں صورتوں میں زندگی کی رطوبت خشک ہوگئی اور پھر زندگی ویسی ہی رہ گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔ گاؤں میں ادا کی جانے والی ہماری ساری رسومات خواہ وہ نجی ہوں یا اجتماعی روحوں کے لیے یادداشت کی ضیافت ہے۔ یاد کیا جانا ہی ان کی غذا ہے۔''

تحریری زبان کا رواج دراصل ایک طریقہ تھا، علم کو کلچر میں مستقلاً پیوست کرنے کے لیے، تاکہ پھر اس سے کوئی تعلق نہ رہے۔ دوسری جانب دیوتاؤں کو یاد رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کی برابر خدمت کی جائے، اگرچہ دیوتاؤں نے خود ہی اپنی تخلیق کی ہے اور ''زندگی کے مقدس نام کا برابر جاپ کرتے ہوئے اسے برقرار رکھا ہے۔'' چنانچہ پرکٹل نے یہ مشاہدہ کیا کہ ''مایان جیسے قدیم کلچر کی از سرِ نو تخلیق کی جائے۔ اس کے لیے قبیلے کو حقیقی آزمائشوں اور تجربوں سے گزر کر، جن سے ان کے آبا و اجداد گزر چکے تھے، ہر سال تازہ جذبات شامل کیے جائیں۔ انسان کو ہر سال بہ طور ایک نسل کے دوبارہ بنایا گیا اور اس میں وہ کہانیاں ڈالی گئیں اور مخصوص آوازیں شامل کی گئیں، جن سے یہ ساری زندگی وجود میں آئی۔ مغرب کے خواندگی کے کلچر کے برعکس مایان کی روایت کا تعلق کسی شان دار مستقبل کی طرف قدم بڑھانے سے نہیں۔ دیوتاؤں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے اور ہم ان کے ساتھ زندہ ہیں۔ ہماری دلچسپی ایک شان دار زمانہ حال کو برقرار رکھنے سے تھی اور اس کا تعلق اسے یاد کرتے ہوئے غذا پہنچانے سے تھا، جس نے یہ زندگی دی۔ دنیا کا یہ گھر، ہمارے دیہات کے جھونپڑوں کی طرح اور سارے انسانی اجسام کی طرح، خواہ وہ کتنا ہی پرشکوہ بنایا گیا ہو، لیکن بہت عرصہ تک رہنے کے لیے نہیں۔ اسی لیے دیہات کے لوگ سال بھر میں کم از کم ایک بار اکٹھا ہوتے ہیں، تاکہ مل جل کر کسی کے جھونپڑے کی مرمت کریں، آپس میں بات چیت کریں، قہقہے لگائیں، دعوتیں کریں اور دھیرے دھیرے متین انداز میں جہاں بھی ضروری ہو، ایک دوسرے کی مدد کریں۔''

خواندگی اور زبان کا تعلق کسی سرزمین میں اس کے معاشرے کی نوعیت سے ہے۔ خواندہ تہذیبیں علم کے ترقی پذیر خزانوں کو سمیٹ لیتی ہیں، جسے مشینیں بنانے والے طبعی نظام کو

تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حسابی علم کی یہ دولت املاک پر نظر رکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔ جنگ جو سردار سیاسی سلطنتیں تعمیر کر سکتے ہیں۔ ایسا معاشرہ جس میں زبردست توانائی موجود ہو مہذب انداز سے ''ترقی'' کی اہلیت رکھتا ہے، تاہم اگر معاشرہ آسمانی روحوں کے آزمودہ طریقوں کے مطابق اپنے آپ کو برقرار رکھنے پر بہ ضد ہو تو پھر ایک لسانی تہذیب عام لوگوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ یادداشت کی رسوم میں پرجوش طور پر شامل ہو جائیں۔ یادوں کو تازہ رکھنے کا یہ اجتماعی کام، جسے تہذیبیں محض کوششوں کا زیاں سمجھتی ہیں، زندگی کو اس کی معنویت اور مقصد عطا کرتا ہے۔ اس طرح یہی ''زمانہ اولیٰ'' کے باشندے اپنی خارجی حالت کی بنا پر، جس سے پس ماندگی ظاہر ہوتی ہے، روحانی طور پر متمول ہو جاتے ہیں۔ اگر خون ریزی، جنگیں اور فطری ماحول کی پامالی ہی ترقی کا معیار ہے تو بہتر یہ ہوگا کہ تہذیب یافتہ لوگ اس فیصلے کو معطل رکھیں کہ کس طرح کا معاشرہ بہتر ہے۔ مارٹن پرکٹل جب اپنے مایان کے گاؤں سے نکل کر آ گیا تو اس کے 1800 باشندے گوئٹے مالا کی خانہ جنگی میں ہلاک ہو گئے۔ اس نے لکھا کہ ''اٹکلان اب دنیا کے لیے ایک مثال نہیں رہا۔ بلکہ آپس میں جنگ آزما عیسائیوں کا کثیر آبادی والا گاؤں بن گیا ہے، جس کے باشندے خوراک اور سکوں کے حصول کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، تاکہ وہ تمام چیزیں خرید لیں، جن کی ضرورت کا بھی انہیں پہلے علم نہیں تھا۔''

علامتی تحریر

مالی ڈوما سوم (Malidoma Some) نے اپنی تصنیف ''آف واٹر اینڈ سپرٹ'' میں خواندگی سے پہلے اور خواندہ تہذیب کے درمیان سفر کا تجربہ بیان کیا ہے۔ وہ جن دنوں مغربی افریقا میں ایک چھوٹا سا لڑکا تھا، اسے والدین سے الگ کر کے فرانسیسی پادریوں کے ایک سکول میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ وہاں اس نے پڑھنا اور لکھنا سیکھا اور یورپ کی تہذیب سے بہ خوبی واقف ہو گیا۔ مالی ڈوما نے، جن دنوں وہ اسکول میں تھا، یہ محسوس کیا کہ ''سامنے کی باتوں کو تراشنے کی اہلیت ایسی ہی تھی، جیسے کسی خفیہ عمل کا آغاز۔ بہت دور سمندر پار کا دیوتا ایک عالم فرد تھا، جس نے اپنے عقیدت مندوں کو خواندگی دان دی ہے۔'' نوبلوغت کے زمانے میں اپنے گاؤں واپس آتے ہوئے مالی ڈوما کو معلوم ہوا کہ خواندگی نے اس کو خود اپنے لوگوں کے درمیان اجنبی بنا دیا تھا۔ ''میرے گاؤں کے لوگ میرے خواندہ علوم کو گوروں کا اور غیر قبائلی

لوگوں کا کاروبار سمجھتے تھے۔'' وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا، ''اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر بات یہ کہ وہ خواندگی کو جسم سے روح کی بے دخلی سمجھتے تھے، یعنی یہ کہ اس کے جسم کو کسی اور روح نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ میرے اپنے لوگوں کے نزدیک خواندہ ہونے کا مطلب ایک سفاک شیطنیت کی گرفت میں چلا جانا تھا۔ پڑھنے اور لکھنے کی استعداد نے ایک خواندہ شخص کو کسی خوف ناک چھوت کی بیماری میں مبتلا کر دیا تھا، جو جادو کی ایک اور ہی قسم تھی۔ اس کے باوجود ڈاگارا گاؤں کے دیہاتیوں نے مالی ڈوما سے کہا کہ ہمارے دوستوں کے نام جو دور کے شہروں میں رہتے ہیں، خط لکھ دو۔

اب وہ اچھا ہو یا برا، لیکن خواندگی کی عادت ذہنوں کو بدل دیتی ہے۔ جہاں بہ ظاہر کچھ حاصل ہوتا ہے، وہیں کچھ جاتا رہتا ہے۔ ذہن کو اپنے فوری تصورات کے بارے میں زیادہ کرید نہیں رہتی، تجریدیت پر اپنی پختہ گرفت کے ساتھ ہی ایک خواندہ شعور دوسرے علاقوں سے ناواقف ہو جاتا ہے یا اسے بھولنے لگتا ہے، پھر اس طرح کی سوچ میں جب شدت آ جائے تو آدمی ''غائب دماغ پروفیسر'' بن جاتا ہے۔ افلاطون نے یہ مان لیا تھا کہ فلسفی کا ساری دنیا مذاق اڑاتی ہے کیوں کہ وہ روزمرہ زندگی کے معاملات سے بے خبر ہوتا ہے... اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا قریبی ہمسایہ کیا کر رہا ہے۔ خادماؤں کے ساتھ سارا مجمع اس پر قہقہے لگائے گا کیوں کہ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ اندھے پن میں چلتا رہے گا اور ہر گڑھے میں ٹھوکر کھا کر گرے گا۔ اپنے خوف ناک بے ڈھنگے پن کی وجہ سے وہ احمق معلوم ہوگا۔'' جب بچوں پر کتابت خوانی کو بچوں کے ذہنوں میں زبردستی ٹھونسا جاتا ہے تو ان کے دماغ کی چستی اور پھرتیلے پن کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہندوستان سے ایک کمپیوٹر انجینئر نے جو وہیں کا ہے، لکھا کہ یہاں علمی استعداد حاصل کرنے پر بہت زور دیا جاتا ہے، نتیجہ یہ کہ پانچویں یا چھٹی جماعت میں پہنچنے تک بچے میں تخیل کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ چینی دانش وَر لاؤ سی کے خیال میں عالم لوگ ریاست کے برے سربراہ ہوتے ہیں کیوں کہ ''لوگوں کو جس قدر چالاکی اور چابک دستی کے کام درپیش ہوتے ہیں، اتنی ہی عجیب وغریب اور پرفریب صورتِ حال پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ایسے میں، میں تو لوگوں سے کہوں گا کہ ڈوری میں گرہیں لگانے کے عمل کی طرف واپس آ جائیں۔''

اس کے باوجود خواندگی، معلومات کو ایک نظم کے ساتھ محفوظ کرنے اور بعض

معاملات میں صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔ ماضی سے جو وسیع تجربات حاصل ہوتے آئے ہیں، خواندگی ان تک پہنچنے کی راہ دکھاتی ہے اور علم کو دوسروں تک پہنچانے میں معاون ہوتی ہے۔ ہر لکھنے والا ابتدا سے ہی خیالات کو علامتوں کے ذریعے ادا کرنے میں خصوصی مہارت حاصل کر چکا ہے۔ یہ بات اس زمانے کے لیے خاص طور پر درست تھی، جب تحریر، علامت نگاری تھی۔ علامت نگاری پیشہ ور ماہروں کے لیے ایک روزگار تھی۔ اس طرح کی تحریر میں منفرد نوعیت کی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ہر علامت ایک لفظ کی نمائندگی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر چینی رسم الخط میں 45 ہزار علامتیں ہوتی ہیں، جن میں سے تقریباً نو ہزار علامتیں برابر استعمال میں آتی ہیں۔ ہر علامت کو الگ الگ یاد رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ جہاں ایک عام آدمی کا ذہن بولے جانے والے الفاظ کی بڑی تعداد کو محفوظ کر لیتا ہے، ایک طالب علم کو وہی الفاظ سیکھ کر لکھنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ دوسری جانب حروف تہجی کی تحریر میں زبان اپنی ساخت کی بنا پر گفت گو کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ انگریزی میں حروفِ علت اور باقی صوتیہ حروف، سب ملا کر 26 کافی ہوتے ہیں۔ اس سے الفاظ کو حافظے میں محفوظ کرنے اور سیکھنے میں کم وقت لگتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن معاشروں میں، مثال کے طور پر قدیم سمیرائی، مصری یا چینی معاشرے میں، جہاں تحریر کا فن علامت نگاری کی سطح سے کبھی آگے نہیں بڑھا، پیشہ ور محرروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔ چونکہ انہیں طویل عرصے تک تربیت کی ضرورت ہوتی تھی، لہٰذا یہ محرر ایسے اداروں سے وابستہ ہو جاتے تھے، جو ان کے مصارف برداشت کر سکتے تھے۔ اس طرح کی تحریر اسے پڑھنے والے لوگ پیدا نہ کر سکی۔ ان کا مقصد تو علم کو محفوظ کر لینا تھا، کلام کرنے اور حظ اٹھانے کے لیے نہ تھا۔ اس سے نسبتاً کم تعداد میں محرروں نے معلومات کو تحریر کی زبان میں سیاسی یا مذہبی اشرافیہ کے فائدے کے لیے لکھنا شروع کیا۔ سمیرائی لکھاریوں نے مٹی کی تختیاں بنائیں، جن پر کاروباری نوعیت کے اعداد وشمار، مثلاً پالتو سؤروں کی یومیہ خوراک، مزدوروں کی محنت کے ایام، زمین کا رقبہ اور اناج کی وصولی کا حساب لکھتے رہے۔ مٹی کی لوح پر لکھی ہوئی یہ مخروطی تحریر، ریاضی کے طریقے، قواعد کے اصول، طبی علاج کی فہرست اور دیگر عملی معلومات کے لیے کام میں لائی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی تہذیبی ٹیکنالوجی نے تعمیرات عالم کے درمیان رابطے میں مدد دی، جیسے آب پاشی کے لیے گڑھوں اور نہروں کی

کھدائی اوران کی دیکھ بھال۔ مصریوں کے مذہب کا تقاضا تھا کہ مرنے والوں کے لیے ہر روز دعا کی جائے تا کہ مردہ فرعون اور اس کے ماننے والے از سرِ نو زندگی سے ہم کنار ہوں۔ یہی دعائیں بعد میں مقبروں کی اندرونی دیواروں پر لکھی گئیں، تا کہ اگر دعائیں نظر انداز کر دی گئی ہوں تو فرعون عالم مرگ میں انہی الفاظ کو خود بھی دہرا سکتا تھا۔

تحریر کی زبان بادشاہتوں کے عروج کے ساتھ فروغ پاتی رہی، جب سیاسی رہنماؤں کے تصرف میں وسیع اور متنوع آبادیاں آ گئیں تو سماجی نظم وضبط کو برقرار رکھنے کے لیے قبائلی رسوم و رواج کافی نہیں رہے۔ بادشاہوں کی ضرورت یہ تھی کہ تحریری قوانین کے ذریعے حکومت کریں۔ ان کی یہ بھی ضرورت تھی کہ ٹیکس کی وصولی کا گوشوارہ رکھیں۔ منشیوں کی خدمات کی ضرورت تھی کہ پیغامات کو بادشاہ کے کمان داروں تک حالت جنگ میں پہنچائیں یا علاقائی ناظموں تک ان کی ترسیل کریں۔ علامتی تحریر میں مہارت پیدا کرنا اگرچہ مشکل ہوتا تھا، لیکن فائدہ اس میں یہ تھا کہ قوموں کو، جیسے چین کو، تحریر کی ایک مشترکہ زبان مل گئی، جس میں بہت سی بولیاں بولنے والے شامل تھے۔ سلطنت کے ہر حصے کے عالم اگرچہ ایک دوسرے کی گفت گو نہیں سمجھ سکتے تھے، لیکن تحریر کی مدد سے مافی الضمیر ادا کر لیتے تھے۔ چینی قوم کو ایک مشترکہ تحریری تہذیب مل گئی۔ اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ چونکہ خواندہ لوگوں کو تحریر کردہ علوم پر اجارہ داری حاصل تھی، لہٰذا محرروں، پادریوں اور شاہی دربار کے ناظموں کے ہاتھ میں طاقت اس کے ناجائز استعمال کی حد تک مرکوز ہوتی گئی۔ چین کی قدیم ترین سرکاری زبان بولنے والا طبقہ شاہی دربار سے وابستہ تھا، لہٰذا اس نے قدیم تر اشرافیہ سے اقتدار چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان علما نے جن کی تربیت کنفیوشس کی کلاسیکی تعلیمات کے تحت ہوئی تھی، حکومت کو اپنے فائدے کے لیے نہایت بے شرمی سے استعمال کیا۔ اس کی بہ دولت بہت سے افراد موروثی مالکانِ اراضی بن گئے، جنھوں نے بے دریغ لگان وصول کر کے کسانوں کا استحصال کیا۔

حروف تہجی پر مبنی تحریر نے فلسفے اور مذہب کے فروغ میں کس طرح مدد کی

حروف تہجی پر مبنی تحریر سامی نسل کی قوموں نے دو ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں وضع کی تھی۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ مصر کی روزمرہ بول چال کی تحریر سے، جو پروہتوں کی

مختصر نویسی کی طرح تھی، اخذ کی گئی۔ کنعان کے باشندے جو مصری معاشرہ کے مضافات میں جزیزہ نما سینائی میں آباد تھے، پہلی بار انہوں نے ہی اس تحریر کو استعمال کیا۔ موسیٰؑ نے کئی سال ان کے درمیان بسر کیے۔ کنعان اور قدیم شامی قوم کے لوگوں میں یہ حروف تہجی مکمل صورت میں موجود تھے۔ (سوائے حروفِ علت کے) یہ غالباً عبرانی اسلاف کا زمانہ تھا۔ حروف تہجی کی تحریر بادشاہ داؤد کے زمانے میں ایک ہزار قبل مسیح میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی رہی۔ قدیم سامیوں کے اس رسم الخط کی نقل بعد میں مصریوں نے کی جنہوں نے حروف علت کی آوازیں پیدا کرنے کے لیے حروف کا اضافہ کیا۔ ان برسوں میں یہودیوں اور یونانیوں نے ادب تخلیق کیا، جن کا مغرب کے کلچر پر گہرا اثر پڑا۔ سامی حروف جب شامیوں سے مصریوں تک پہنچے تو اس کے پانچ چھ سو برس بعد رابرٹ لوگون کی تصنیف ''دی ایلفبیٹ ایفکٹ (the alphabet effect) کے مطابق ''وہ انسان کا انتہائی تخلیقی دور تھا۔ اس مختصر زمانے میں ہی مغربی تہذیب کے بہت سے عناصر رونما ہونے لگے تھے۔ یعنی مجرد سائنس معمول کی منطق، اقلیدس، فلسفہ اور وہ صوری فنون جو اشیا یا موضوع کی مادی صورت کی عکاسی کرتے ہیں۔''

ان تجریدی تحریروں کے برعکس، حروف تہجی کی عبارت عملی کام کرنے والوں مثلاً تاجروں کے لیے بہت اہم تھی۔ یہ فوری ذہانت استعمال کرنے والے لوگ تھے، جنہوں نے بیشتر دنیا دیکھی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی شخص حروف کی نسبتاً کم تعداد میں ان کی آوازوں سے الفاظ کے معنی نکال لیتا تھا۔ حروف تہجی کی تحریر نسبتاً آسانی سے سیکھی جا سکتی تھی، لہٰذا اس کا استعمال محض پیشہ وَر محرروں تک محدود نہیں رہا۔ انہی حروف کی طاقت سے علم جمہوری بن گیا۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں برہمن پجاریوں نے انہی رٹے ہوئے رسمی الفاظ پر اجارہ داری کی بہ دولت خود کو مراعات یافتہ طبقے میں تبدیل کر لیا تھا۔ ایک نیم تہجی رسم الخط براہمی کے نام سے ساتویں صدی قبل مسیح میں، جو کاروباری رابطوں کا زمانہ تھا، رائج ہوا۔ ہندوستان میں چھٹی صدی میں جو مذہبی انقلاب آیا، وہ طویل رسومات اور قربانیوں پر پجاریوں کی بالادستی کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ گوتم بودھ اور مہاویر دونوں نے تمام لوگوں کو اپنے اندر کی روشنی کی بہ دولت نجات کے راستہ دکھایا۔ اس سے قطع نظر کہ کون کہاں پیدا ہوا، شرط یہ تھی کہ وہ سچائی کی راہ پر چلتا رہے۔

مغرب میں بھی جب عبرانیوں میں حروف تہجی کی خواندگی رائج ہوئی تو مذہب میں تبدیلی آئی۔ موسیٰؑ نے مصر کے شاہی ماحول میں اپنی تربیت کے دوران میں یا کچھ عرصہ قوم ماد

کے درمیان رہنے سے یہ ہنر حاصل کر لیا ہو گا۔ عبرانیوں کو مصر سے باہر نکالنے کے بعد اس نے ان لوگوں کو وہ الواح دیں، جن پر خدائی اخلاقی ہدایات کندہ تھیں۔ دس ہدایات (Ten Commandments) یہودیوں کے لیے تحریر کردہ قوانین کا خلاصہ تھے۔ ان لوگوں نے خدا کو ایک جامد شکل میں نہیں بلکہ ایک مجرد روح کی طرح سمجھا۔ خدا کو اپنی اصل میں انہی ہدایات سے پہچانا گیا۔ وہ ایک کہانی کا کردار تھا جس نے خود دین کے اکابر سے اور موسیٰؑ سے باتیں کیں۔ اب وہی خدا تحریر شدہ قوانین کا مصنف تھا، کیوں کہ عبرانی وہ پہلے لوگ تھے، جنہوں نے تحریر کا ہنر حاصل کیا تھا۔ انہوں نے ایک طرح کی تہذیبی اور اخلاقی برتری حاصل کر لی تھی۔ اپنے نو فرامین (Denteronemy 17) میں خدا نے اسرائیل کے آئندہ بادشاہوں کو یہ تاکید کی تھی کہ بہت سی بیویاں رکھیں اور کثیر مقدار میں چاندی اور سونا جمع نہ کریں، جس طرح دوسرے بادشاہوں نے کیا۔ اس کی بجائے وہ (اسرائیل کا بادشاہ) اس قانون کی نقل کتاب میں شامل کرے گا اور اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھے گا اور اسے تا زندگی پڑھتا رہے گا، تاکہ وہ خدائے بزرگ سے ڈرنا سیکھ لے۔

مسیحیت اور اسلام، ان دونوں مذاہب کی اساس بھی صحیفوں پر ہے۔ عیسیٰ کا ابتدائی دور یہودی مذہبی مصنفوں کی روایت کا پیدا کردہ تھا۔ انہوں نے اپنا مسیحی مشن اس صحیفے سے اخذ کیا تھا۔ یوں ادب اور زندگی کے ایک یہودی عبادت خانے میں ایک پارچے پر تحریر یہ عبارت دیکھی۔ یہ عیسائیہ کی پیش گوئی خدا کے خاص کرم کے حوالے سے تھی۔ تب انہوں نے یہ اعلان کیا ''آج، تمہاری سماعت میں یہ عبادت درست ثابت ہوتی''۔ (لوقا کی انجیل) اگرچہ عیسیٰ نے خود کوئی تحریری کام نہیں چھوڑا، لیکن ان کے ارشادات لکھنے والے نے ان کے اقوال کو ایک بیانیہ میں مرتب کیا اور ان کی مصروفیات کو ایک پُرعظمت خوب صورت ادب پارے میں رقم کیا۔ جوَن کے صحیفے میں عیسیٰ کو خداوند کا ''لفظ'' بنا کر پیش کیا گیا یا وہ نظام فلکی میں شامل لوگوں سے پہلے بھی اپنا وجود رکھتا تھا۔ بائبل کا پڑھنا، مسیحی عبادت کا ایک اہم حصہ ہے۔

اسلامی مذہب زمینی تعلق سے ایک احساسِ کم تری کے ساتھ ظہور میں آیا، کیوں کہ عرب ناخواندہ تھے۔ یہ عربی مذہب کو مسیحی اور یہودی مذاہب کی تہذیبی سطح پر لانے کی ایک کوشش تھی۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اس وقت ایک ناخواندہ تاجر تھے۔ چالیس سال کی عمر میں ان پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ ایک دن جبرائیل علیہ السلام ان پر ظاہر ہوئے اور

اللہ کا یہ فرمان سنایا، ''پڑھو''۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، ''میں پڑھ نہیں سکتا''۔ جبرائیل علیہ السلام نے پھر کہا، ''پڑھو، اللہ تعالیٰ کے نام پر، جس نے انسان کو ایک قطرۂ خون سے پیدا کیا۔ پڑھو، اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ فیض رساں ہے، جس نے قلم سے سکھایا''۔ مزید احکام سنانے کے بعد فرشتے نے کئی سال کی مدت میں اللہ کا پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا جو قرآن میں درج ہے۔ قرآن کے مطابق قرآن جنت میں رکھی ہوئی لوحِ محفوظ سے نقل کی ہوئی عبارت ہے۔ کسی اور نے اسے کھجور کے پتوں پر لکھ دیا ہوگا، جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ''وحی کے عالم'' میں وہ الفاظ ادا کر رہے ہوں گے۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفر کی بنا پر بائبل کے صحیفے کے مندرجات سے واقف تھے۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی عزت ''اہل کتاب'' کے طور پر کرتے تھے۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی دور میں ان کے ماننے والے فن حرب کے طالب علم تھے، جنھوں نے تحریر کو مکہ کی قریش اشرافیہ کے درمیان مقبول بنایا۔ قرآن سے بھی عربوں میں، مکہ کی قریش اشرافیہ کے درمیان تحریر کے فن کو مقبول بنایا۔ قرآن نے ہی عربوں میں خواندگی کو متعارف کرایا۔

زبانی اور تحریری ذریعہ اظہار کے عبوری عرصے میں جو اہم مذہبی ادب پیدا ہوا، یہ ہے اس کا بیان۔ چونکہ قرآن کی ابتدا اس معاشرے میں ہوئی، جو تحریر کے طریقہ سے نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ اس طرح ہزار سال قبل مسیح کے درمیانی زمانے میں فلسفے کا انقلاب رونما ہوا۔ ان سے حروف تہجی کی تحریر کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ پہلا عبرانی ادب ہزار سالہ دور کے آغاز میں تخلیق ہوا۔ اس کے چند صدی بعد زرتشت، گوتم بدھ، کنفیوشس، سقراط اور اس دور کے دوسرے عظیم مفکر پیدا ہوئے۔ فلسفے سے سرشار، فلسفیوں کی اتنی بڑی تعداد تاریخ کے کسی اور عہد میں پیدا نہیں ہوئی۔ وہ سب اس مقام اور اس زمانے میں زندہ تھے، جب حروف تہجی کی تحریر معاشرے میں متعارف ہو رہی تھی۔ عظیم فلسفیوں اور مذہبی مفکروں کے درمیان ان کی تعلیمات میں اختلاف کے باوجود ایک بات مشترک تھی، خیر اور صداقت کی قدروں پر ان کا اتفاق۔ وہ دنیاوی طاقت پر اخلاقی قدروں کو فوقیت دیتے تھے۔ لکھے ہوئے الفاظ اس وقت تک نایاب تھے، چنانچہ وہ خیالات بھی عام نہ ہوئے تھے۔

دانش کی تحریک میں مغرب کی بصیرت کے مطابق افلاطون کی حیثیت مرکزی تھی۔ اپنے تمام تر تنوع کے ساتھ افلاطون کی دانش ایک خیال پر آ کر ٹھہر گئی۔ وہ ایک خیال کا خیال

تھا۔ افلاطون نے خیالات کا مطالعہ اس طرح کیا جیسے وہ اشیا ہوں اور ان کا ایک خاص وجود ہو۔ وہ ان کی ماہیت جاننا چاہتا تھا۔ افلاطون کے خیال میں خیالات فطری اشیا کے برعکس، خاص وجود رکھتے تھے۔ وہ عالم گیر تھے اور اپنی خالص حالت میں لافانی تھے۔ افلاطون کے فلسفے سے پراسرار معانی اخذ کیے گئے۔ افلاطونی افکار دنیا سے اوپر تیرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ سے موجود ہیں مگر اوجھل ہیں اور نظر نہیں آتے۔ اس بات کو سادہ طریقے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک خیال یا ایک افلاطونی ہیئت محض ایک لفظ ہے۔ انصاف کا خیال یا اس کی افلاطونی ہیئت وہی ہے جو لفظ ''انصاف'' کے معنی ہیں، افلاطون کو لفظ کے ظاہری وجود سے کوئی غرض نہ تھی، کسی اور شے کے ساتھ اس کے حوالے سے تعلق تھا۔ ''مکالمہ'' میں سقراط اکثر الفاظ کے معنی کریدتا رہتا تھا، اسے ان کے سچے تعارف کی تلاش رہتی تھی۔ ''انصاف'' کیا ہے؟ ''بہادری'' کیا ہے؟ وہ اکثر یہ سوالات کرتا۔ جواب دینے والا انصاف یا بہادری کی مثالیں پیش کرتا، جیسے وہ ایک نمونہ مرتب کرنا چاہتا تھا۔ افلاطون کی دلچسپی اس نمونے سے ہی ہوتی تھی۔ وہ نمونہ ایک مجرد خیال ہوتا جس کا اظہار لفظ سے ہوتا۔

یاد رہے کہ یونان کا معاشرہ عبرانیوں کے معاشرے کے مقابلے میں، جب اس طرح کے سوالات اٹھائے جا رہے تھے، کم تر خواندہ تھا اور ذرا دیکھئے کہ ایک ایسے معاشرے میں، جو ابھی حال میں علم سے بہرہ مند ہوا تھا، افلاطون کس طرح اس معاشرے سے نکل کر آیا اور کس طرح اس کا دماغ ایسے سوالوں سے الجھتا رہتا تھا۔ لکھے ہوئے الفاظ ان دنوں بڑی ندرت رکھتے تھے اور حیران کن ہوتے تھے۔ یونانی فلسفی کچھ عرصے تک فطرت کے بارے میں فلسفیانہ سوالات اٹھاتے رہتے تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ بنیادی ''مسالہ'' کیا تھا، جس سے دنیا کی تعمیر ہوئی۔ تب یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ سقراط جیسا کوئی فرد الفاظ کی طرف توجہ کرتا اور اشیا کی ماہیت کے بارے میں سوال کرتا۔ ٹھیک ہے کہ بول چال کی زبان میں الفاظ تو بہت عرصے سے موجود تھے، پھر فلسفیوں نے ان کا مطالعہ تقریر کے عنصر کے طور پر کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب شاید اس حقیقت میں پوشیدہ ہو کہ لکھے ہوئے الفاظ کے مقابلے میں گفت گو میں آنے والے الفاظ کا معائنہ اس آسانی سے نہیں ہوتا، الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ حافظے پر ان کا ایک سمعی اثر باقی رہ جاتا ہے۔ الفاظ کاغذ پر تحریر ہوں یا پتھر پر کندہ کیے جائیں، ان کا زیادہ دیرپا وجود باقی رہتا ہے۔ ان کی حیثیت مجسم اشیا کی طرح محسوس ہوتی

ہے۔ یہ الفاظ اپنی جگہ پر اتنے طویل عرصے تک باقی رہتے ہیں کہ کوئی بھی شخص ان کا معائنہ کر سکتا ہے، ان میں پائیداری ہوتی ہے۔ چونکہ لکھے ہوئے الفاظ اپنی جگہ جمے ہوئے لگتے ہیں، اس لیے کوئی فلسفی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ "یہ کس طرح کی چیز ہے؟"

تحریر کے فن نے معاشرے میں خواندگی کی شرح بالعموم بلند کی، چنانچہ زندگی کے مختلف شعبوں کے بہت سے صاحب دماغ اور متجسس لوگ تحریر کی زبان سے روشناس ہوئے۔ نقطہ ہائے نظر میں تصادم بھی ہوا، جو کہ کسی معبد کے ماحول میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ حروف نے تجزیاتی ذہن کو بڑھاوا دیا کیوں کہ بولی جانے والی زبان کو تحریر میں منتقل کرتے ہوئے متعلقہ فرد کے لیے ضروری ہو گا کہ تسلسل سے آنے والی آوازوں کی شناخت کرے، ہر آواز کو حرف کے ساتھ جوڑے اور پھر ان کو دوبارہ الفاظ کے ساتھ جوڑے۔ لوگان نے مشاہدہ کیا کہ بولے جانے والے الفاظ میں آوازوں کے مسلسل تجزیے سے اور اسے ہر بار لکھے جانے سے تجزیے کی عبارت میں اضافہ ہوتا ہے، جو سائنسی اور منطقی فکر اور ناقدانہ تجزیے کے فروغ کے لیے بہت اہم ہے۔ مزید یہ کہ حروف، جن سے مل کر لفظ بنتا ہے، ایک نمونہ مہیا کرتے ہیں کہ خیالات منطقی استدلال کی خاطر اس طرح جڑتے ہیں۔ نثری تحریر، جو علم کے اظہار کے لیے شاعری کے مصرعوں کی طرح پابند نہیں، منطقی استدلال کے ساتھ اپنا اظہار کر سکتی ہے۔ درجہ بندی کی ضرورت کے تحت حروف تہجی اپنی روایتی ترتیب میں یہ آسانی رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے طریقے سے برتا جائے جو لغات اور حوالے کی مطبوعات کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کاغذ کی تحریر الگ کر کے پیش کی جا سکتی ہے اور ان کا معروضی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور قارئین کے لیے غیر جانبدارانہ طور سے دست یاب ہوتی ہیں۔

طباعت اور مصنف

دو ایجادات جو چین میں ہوئیں، انہی کے نتیجے میں چھپائی کا فن پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں آیا۔ ایک ایجاد تو سستے کاغذ کی تیاری تھی اور دوسرا متحرک ٹائپ۔ یورپ والوں نے چینیوں کے مقابلے میں اس ٹیکنالوجی کو زیادہ مؤثر انداز سے استعمال کیا کیوں کہ ان کی تحریری زبان حروف تہجی کے نظام پر تھی۔ اس رسم الخط میں حروفِ تہجی بھی کم تعداد میں تھے، جس سے یہ ممکن ہوا کہ اس کم خرچ چھپائی کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا جائے اور اس کے

ٹائپ کے لیے جو حروف ڈھالے گئے ہیں، انہیں دوبارہ برتا جائے۔ ابتدا میں چھاپے والوں نے وہی کیا جو مسودہ نقل کرنے والے کرتے تھے، لیکن زیادہ کفایت سے کیا۔ ان کے سستے کام نے نقل نویسوں کی قیمت بھی گرا دی۔ چھپائی ان کے پیشے کے لیے خطرہ بن گئی، چونکہ ایک ہی پلیٹ سے بہت سارے چھپے ہوئے اوراق نکل آتے تھے اس لیے چھپائی والوں کو یہ تحریک ملی کہ متن کی عبارت کو ذرا غور سے دیکھ لیا کریں۔ پندرھویں صدی کے اواخر میں ایک اطالوی پبلشر آلڈس مانٹئیس (Aldus Manuntius) نے جب کلاسیکی کتابوں کے جیبی سائز ایڈیشن چھاپنے شروع کیے تو مسودوں کی پڑتال کے لیے عالموں کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے پروف پڑھنے والے بھی ملازم رکھے۔ اب چھاپے والوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ متن کی عبارت کو کس قدر احتیاط سے چھاپیں۔ اس نئی صلاحیت نے نشاۃ الثانیہ کے دانش وَروں کو یہ اہلیت دی کہ اصل متن کی صداقت کو برقرار رکھیں۔

چینی ادب میں یہ ممکن نہ تھا کہ متحرک چھپائی کا طریقہ برتا جا سکے۔ ابتدا میں تو اسے ایک سپاٹ ورق پر چھاپا گیا۔ چینی رسم الخط کی علامتی نوعیت لکھنے والے سے ماہرانہ خطاطی کا تقاضا کرتی تھی، چنانچہ خطاطی نے فن کا درجہ پایا۔ اہل قلم اس سے امتیازی حیثیت حاصل کر سکتے تھے۔ ژیان کے مقام پر کنفیوشس کے ایک معبد میں بہت سے مشہور عالموں کی تحریر کے نمونے رکھے گئے ہیں۔ پتھر کے نقوش جو کاغذ پر منتقل کیے گئے ہیں، خطاطی کے مختلف اسالیب کا پتا دیتے ہیں۔ مصنف سال ہا سال سے ان نمونوں کی نقل کرتے آئے ہیں۔ اس طرح ٹائپ کے کلچر سے پہلے لوح پر کندہ عبارت کو معیار تسلیم کیا جاتا تھا۔ منفرد تحریروں کی چھپائی میں خطاطی کی حیثیت گر جاتی ہے۔ چھاپے کے حروف تقریباً مکمل صورت میں معیاری تحریری پیش کرتے ہیں۔ الفاظ میں یکسانیت اور سطور کے درمیان برابر کا فاصلہ ہوتا ہے۔ حاشیے اوپر سے نیچے تک بالکل سیدھے ہوتے ہیں۔ پیراگراف کے لیے پوٹ چھوڑ دی جاتی ہے۔ الفاظ اوپر سے نیچے تک پورے صفحے پر یکساں نظر آتے ہیں۔ ان کی ترتیب اس طرح کی جاتی ہے کہ آرام سے پڑھے جا سکیں، اس سے پہلے لکھے ہوئے مسودوں کو بلند آواز سے پڑھنے کا دستور تھا تا کہ انہیں مفصل طور پر سمجھا جا سکے۔ مطبوعہ ادب کا تقاضا ہے کہ اسے خاموشی سے پڑھا جائے۔ اب عالم اور دانش وَر اپنا کام زیادہ مستعدی سے کر سکتے ہیں۔

چھپائی نے زبانوں کے معیار متعین کرنے میں مدد دی، چھپی ہوئی لغات میں الفاظ

کے صحیح ہجے اور معنی درج ہوتے ہیں۔ ادب قومی تہذیب کا وسیلہ اظہار بن گیا ہے۔ مصنفوں میں ایک رجحان دیسی زبانوں میں لکھنے کا پروان چڑھ رہا ہے، اس طرح مختلف یورپی زبانوں کو اپنے اپنے ادب کا سرمایہ مل گیا ہے، جس سے زبان کو استحکام حاصل ہوا ہے۔ چھپائی نے سائنسی علم کو جذب کرنے اور اس میں اضافے کا کام کیا ہے۔ اس نے دنیا کے منظر نامے کو الگ الگ جز میں درجہ بہ درجہ اور بڑی احتیاط سے پروان چڑھایا ہے۔ پابندی سے شائع ہونے والے جریدے سائنسی معلومات کے تبادلے کا کام بڑی تیز رفتاری سے کرتے ہیں۔ مطبوعہ مواد کی تیاری میں زیادہ احتیاط نے سائنس دانوں کی ایک ضرورت پوری کر دی ہے، وہ فطرت کا مشاہدہ زیادہ غائر نظر سے اور اپنے مشاہدات کو نہایت مہارت سے تفصیل کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں۔ مطبوعہ ادب سے معلومات کو محفوظ کر لینے اور اسے ناظرین کے وسیع تر حلقے میں پہنچانے میں مدد ملی۔ مطبوعات کو کثیر تعداد میں چھاپنے سے یقین ہو گیا کہ اب یہ کبھی ضائع نہیں ہو گا۔ کتابوں کی یہ کثرت اشاعت سے عالموں کو مطلوبہ کتاب کی تلاش میں جگہ جگہ بھٹکنا نہیں پڑا۔ مسودوں کی نقل بنانے سے انہیں فرصت ہو گئی، اس طرح وہ اپنا وقت زیادہ بڑے علمی کاموں میں لگا سکتے تھے۔

چھاپے خانے سے پہلے عام لوگوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سال میں سانس لے رہے ہیں۔ کتابیں اتنی مہنگی ہوتی تھیں کہ انہیں ڈیسک کے ساتھ زنجیر سے باندھ کر رکھتے تھے۔ سستے مطبوعہ ادب نے انسانیت کی لاعلمی اور خیالات کی یک رنگی سے بچا لیا۔ اب محض دولت مندوں یا مذہبی عالموں کی کتابوں تک رسائی نہیں رہی۔ مسودے کا کلچر بڑی حد تک محض خانقاہوں، جامعات اور شاہی دربار تک محدود تھا، لیکن چھپائی زیادہ لوگوں کی دست رَس میں آ گئی، ہر وہ شخص جو پڑھنا جانتا تھا، کتاب خرید سکتا تھا۔ اب ناشر کو مالی مدد کے لیے کسی سرپرست کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ جب تک اس کی پیدا کی ہوئی شے نفع بخش طور پر فروخت ہوتی رہتی، وہ بازار میں موجود رہتا تھا۔ سٹڈی میں مختلف طرح کی کتابوں کی سرپرستی ہوتی رہتی تھی۔ چھپائی سے ادب کو عام لوگوں کی اپنی زبان میں مہیا کرنے کے مروجہ رجحان کو تقویت ملی۔ اس سے اپنے آپ کو خود تعلیم دینے کا چلن بڑھ گیا۔ آئندہ عالم بننے والوں کے لیے یہ لازمی نہیں رہا کہ دوسرا علمی مواد پڑھنے سے پہلے ایک ثانوی زبان (لاطینی) ضرور پڑھیں۔ چھپی ہوئی کتابوں نے عام تعلیم کے مطالبے کو فروغ دیا۔ مطبوعہ اخبارات حالاتِ حاضرہ سے

متعلق کوائف کو اجتماعی طور پر دور تک پھیلا دیتے تھے۔ ایک تعلیم یافتہ اور باخبر شہری معاشرہ کسی غلط کار حکومت کے مقابلے میں اپنے حقوق کا بہتر طور پر دفاع کر سکتا تھا۔ طباعتی انقلاب کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمانی حکومت کو عروج حاصل ہوا اور جمہوریت کا فروغ ہوا جس میں رائے عامہ نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

روم کے معاشرے میں طبقہ اشرافیہ نے عام لوگوں میں خواندگی نہ ہونے سے بہت فائدہ اٹھایا۔ مال دار لوگ ایک دوسرے کو خط بھیجنے کے لیے ہرکارے اور نجی پیغام رساں ملازم رکھ لیتے تھے۔ عام لوگوں کو ان کے ساتھ معاملات طے کرنے میں دھوکا ہوتا تھا، لہٰذا ان کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ روم کے بارہ قوانین دوبارہ لکھے جائیں۔ جیولیس سیزر ناداروں کا بڑا طرف دار تھا۔ اس نے روم کے سینیٹ کی کارگزاری کو سینیٹ کے دروازے پر آویزاں کر دیا، چونکہ کھلے عام لوگوں کی آرا کا آپس میں تبادلہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جمہوریت کے ساتھ یونان اور روم کے تجربات ناکام ہو گئے۔ جمہوری حکومت نشاۃ الثانیہ کے بعد ہی کامیاب ہوئی، کیوں کہ اس وقت مطبوعہ ادب نے ایک باخبر رائے عامہ پیدا کر دی تھی۔ اب ابلاغ کے ذرائع نکل آئے تھے جس کے ذریعے مقبول عام جذبات کا مؤثر طور پر اظہار ہو سکتا تھا۔ مذہبی اور سیاسی دونوں قائدین نے اس وقت منفی ردِعمل کا اظہار کیا، جب ان کے اختیارات کو خطرہ لاحق ہوا۔ فلیپو ڈی اسٹراٹا نے وینس کی سینیٹ پر زور دیا کہ چھپائی کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے۔ اس نے کہا، ''پریس ایک زنِ فاحشہ ہے اور قلم ایک باعصمت دوشیزہ۔'' اگرچہ بادشاہوں اور پادریوں نے تخریبی مواد کو سنسر کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے تھے، غیر قانونی چھاپے کھل گئے، جو عوام کے حسب منشا مواد شائع کرتے تھے، بالآخر حکام مجبور ہو گئے کہ رائے عامہ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنے مصنف اور چھپائی کرنے والے ملازم رکھیں۔

جب بودھ مت حروف تہجی کی تحریر سے مسلح ہو گیا تو اس نے ہندوؤں کے ذات پات کے نظام پر حملہ کر دیا۔ اسی طرح پروٹسٹنٹ مصلحین نے مطبوعہ ادب کو کلیسائے روم کے اقتدار کو چیلنج کرنے کے لیے استعمال کیا۔ ازمنہ وسطیٰ کا کلیسا مسیحی دستاویزات اپنے قبضے میں رکھتا تھا، جو ذاتی نجات کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے اور ان کو دنیاوی اقتدار کے لیے استعمال کرتا تھا۔ مسیحی تعلیمات مقررہ زبانی طریقے سے اجتماعی دعا کے موقع پر عبادت گزاروں کو فرداً فرداً منتقل کی جاتی تھیں۔ خود بائبل لاطینی زبان میں لکھی گئی تھی۔ جب ریفارمیشن

(اصلاح) کی تحریک سے پہلے کے مصلحین مثلاً وائکلف اور جان ہنس نے بائبل کا ترجمہ عام لوگوں کی زبان میں کیا تو کلیسا نے انہیں بے دین قرار دیا اور ان کی سخت مذمت کی۔ چھاپے کی ایجاد نے بائبل کا ایک اور مترجم پیدا کیا۔ مارٹن لوتھر نے زیادہ استقامت کے ساتھ چرچ کے اقتدار کو چیلنج کیا۔ ایک ہی مہینے کے اندر سارے یورپ نے سن لیا تھا کہ اس نے اپنا 95 نکاتی مقالہ وٹن برگ کلیسا کے دروازے پر چسپاں کر دیا تھا۔ لوتھر اور اس کے حامیوں نے اپنے مطبوعہ مذہبی پراپیگنڈے سے یورپ کو جیسے سیلاب سے شرابور کر دیا۔ اب ہر عقیدت مند کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ اپنا بائبل کا نسخہ خود پاس رکھے جو اس کی اپنی زبان میں لکھا ہوتا۔ پروٹسٹنٹ عقیدے دانوں نے مذہبی لوگوں کو یہ حوصلہ دیا کہ اپنے عقائد کی بنیاد اُن دستاویزات پر رکھیں جو انہوں نے خود پڑھیں نہ کہ کلیسا کے صحیفوں پر اعتماد کریں۔ اب مذہب، افراد کے ضمیر اور عقیدے کا معاملہ تھا۔

فلسفے کے عہد میں عام لوگ عمومیت کے وسیلے پر انحصار کرتے تھے۔ عمومیت کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی تصور مختلف صورتِ حالات پر یکساں منطبق ہوتا ہے۔ اس سے حافظہ کے استعمال میں کچھ کفایت نکل آتی ہے۔ کاغذ کی تحریریں اپنے وجود کی وحدت کی بنا پر مختلف عناصر کو یکجا رکھتی ہیں۔ یہ بجائے خود کاغذ کے ایک ہی ٹکڑے پر درج ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں ایک مصنوعی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کے ملاپ کو یاد رکھنا ضروری نہیں۔ مطبوعہ ادب اسی طرح الفاظ کے پورے ڈھانچے کو آپس میں جڑا ہوا رکھتا ہے۔ ان کا اتحاد تحریر کے اندر موجود ہوتا ہے۔ چونکہ مطبوعہ متن کو تیار کرنے اور شائع کرنے کے لیے معمول سے قدرے زیادہ احتیاط برتی جاتی ہے، اس لیے ہر فرد یقین کر سکتا ہے کہ مصنف نے جو کچھ بھی لکھا اس کو بہ عینہٖ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کے جدید قرینے میں یہ بات بہت اہم ہو جاتی ہے۔ ہماری ملاقات ایسے مصنفوں سے ہو جاتی ہے، جو تخلیقی لوگ ہوتے ہیں اور جو دنیا کو ایک مخصوص انداز سے دکھانے کے لیے اپنے موضوعات اور الفاظ کے انتخاب میں گہری بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں فن کارانہ صلاحیت ہوتی ہے جو ان کے پیرایۂ اظہار کی پیچیدگی اور نفاست میں پیوست ہوتی ہے، جسے ہم ذاتی اسلوب کہتے ہیں۔ اگر الفاظ کے بالکل درست پیکر کاغذ پر محفوظ نہیں کیے جا سکتے تو ایسی تحریر کی قدر و قیمت کا کوئی فائدہ نہیں۔

زمانہ وسطیٰ میں تصنیف غیر اہم تھی۔ ازمنہ وسطیٰ کے لکھاری ایک دوسرے سے اس کا

متن آسانی سے مانگ لیتے تھے۔ مسودوں کی نقل اتارنا ایک اجتماعی کام تھا، جس میں مصنف نہ صرف یہ کہ دوسرے لوگوں کی تحریروں سے نقل کر لیا کرتے تھے بلکہ ان میں اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔ مطبوعہ کتب کے عنوان یا مصنف کی شناخت کے لیے، کوئی کوشش نہیں ہوتی تھی۔ اس روایت کے تحت جس کا آغاز بائبل میں ہوا تھا، مسودوں کی شناخت متن کے ابتدائی الفاظ سے ہوتی تھی۔ چھاپے کی بہ دولت مصنفوں پر زیادہ توجہ ہونے لگی۔ اب کتاب کا آغاز سرورق سے ہوتا، جس پر مصنف کا نام درج ہوتا۔ کاپی رائٹ کے قوانین نے لکھے ہوئے لفظ پر اس کے مصنف کا مالکانہ مفاد وابستہ کر دیا۔ سرقہ یا حوالے کے بغیر کسی اور کی تحریر کی نقل کر لینا اور چھاپ لینا ایک قانونی معاملہ بن گیا۔ چونکہ چھپائی کی ٹیکنالوجی نے تصنیف کو بے مثل صداقت کے ساتھ محفوظ کر لینا ممکن بنا دیا، اس سے کسی مصنف کے منفرد طریقہ اظہار کو اس کی تہذیب کے اندر تسلیم کیا جانے لگا۔ اشعار کے الفاظ کا حوالہ بالکل اسی طرح دیا جانے لگا جیسے انہیں شاعر نے استعمال کیا تھا۔ مصنف اور موسیقار اپنے زمانے کے ہیرو بن گئے کیوں کہ تخلیقی فن میں ان کا ذاتی اظہار بیش قیمت سمجھا جانے لگا۔ اگر مصنف کے بیان کردہ الفاظ میں تحریف ہوتی رہتی اور انہیں مسلسل نامکمل انداز سے پیش کیا جاتا رہتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ مصنف کا اپنا اسلوب اور انداز قائم رہتا۔

تاہم اجتماعی تحریر کی روایت نے مطبوعاتی کلچر کی سب سے اہم تخلیق کو برقرار رکھا ہے اور وہ ہے اخبار۔ اخبارات کا آغاز نجی خط، کتابت سے ہوا، جب کہ ایک فرد نے دوسرے کو اپنے ذاتی واقعات خط میں لکھ کر بھیجنے شروع کیے۔ وہ خطوط جو زیادہ لوگوں کی دلچسپی کے تھے، نیوز لیٹر یعنی اخباری خبرنامے کی بنیاد بن گئے۔ جلد ہی یوں ہوا کہ وہ خریدار پیدا ہو گئے جو مراسلوں سے رغبت رکھتے تھے۔ چھپائی کی ٹیکنالوجی کے تحت بہت سی کاپیاں کم خرچ میں چھاپنا ممکن ہو گیا۔ جلد ہی عام خبرنامے یا اخبارات شائع ہونے لگے۔ ایڈیسن اور سٹیل نے اپنی ہفت روزہ اشاعت Tatler & Spectator میں ایک نئے اسلوب کو فروغ دیا، جسے ایکیوٹون (equitone) کا نام دیا گیا۔ اس سے مراد یہ تھا کہ اخبار میں شروع سے آخر تک ایک ہی اندازِ فکر اور لب و لہجہ برقرار رکھا گیا ہے۔ دیگر صحافی بھی اس معروضی انداز میں گُتھی ہوئی عبارت لکھتے تھے۔ جب ان مطبوعات کے بہت سے پڑھنے والے پیدا ہو گئے تو یہ ممکن ہو گیا کہ کاروبار والوں کو اشتہار دینے کے لیے تقاضا کیا جائے۔ اس طریقہ نے اشیائے صرف کی فروخت اور فن میں

ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ چھپائی نے ایک نئی طرح کے عوامی تجربے کی تخلیق کی۔

برقیاتی تصویروں کا اثر

برقیاتی مواصلات کے اس عہد میں چند تہذیبی ٹیکنالوجیز شامل ہیں، جن کا مقصد ریکارڈنگ ہے، یا لطف انگیز تصویروں کو ناظرین کے لیے پیش کرنا۔ بہتر ہوگا کہ ان کو تین زمروں میں، ان کی ایجادات کے زمانے کے حساب سے تقسیم کیا جائے۔ فونو گراف اور ٹیلی گراف 1830 اور 1840 کے عشروں میں ایجاد ہوئے۔ 1870 کے عشرے میں تین اور ایجادات آئیں، یہ تھیں فونوگراف، موشن پکچر مشین اور ٹیلی فون۔ یہ پہلی کے بعد ایجادات کی دوسری لہر تھی۔ تھامس ایڈیسن کا ان سے تعلق تھا۔ آخری اور تیسری لہر اس وقت آئی جب بیسویں صدی کے چار عشروں کے دوران میں ریڈیو اور ٹیلی وژن ایجاد ہوئے۔ بعض ایجادات، یعنی فوٹوگرافی، موشن پکچرز اور ٹیلی وژن، ان کا تعلق ہماری دیکھنے کی حس سے ہے، جب کہ فونو گراف، ٹیلی فون اور ریڈیو کا تعلق ہماری سماعت سے۔ ٹیلی گراف، ٹیلی فون، ریڈیو اور ٹیلی وژن پیغامات کو یا تصویروں کو دور کے فاصلوں تک پہنچاتے ہیں۔ فوٹوگرافی اور ٹیلی گرافی برقیاتی ٹیکنالوجی سے پہلے کی ایجادات تھیں لیکن ان کی ملتی جلتی نوعیت کی بنا پر ہم انہیں ان کے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔

اگرچہ مطبوعہ ادب میں چوب کاری کے نمونے یا لکڑی کے چھاپے سے بنے ہوئے خاکے شامل ہوتے تھے، لیکن فوٹوگرافی اس طرح چھپائی کے کام میں داخل ہوئی کہ اس نے مشین سے سرور انگیز شباہتیں بنانی شروع کر دیں۔ 1880 کے عشرے میں انہی شباہتوں کو اخبارات میں شائع کیا جانے لگا، جو دھات کی پلیٹ پر منتقل کی جاتی تھیں اور جنہیں فوٹو انگریونگ کے ذریعے فوٹوگراف میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ اخبار کی تصویر خاص طور پر مقبول ہوئی، بالخصوص تارکین وطن کے گروہوں میں جو انگریزی بہ خوبی نہیں بول سکتے تھے۔ لیتھوگرافی اور کرومولیتھو گرافی کی ٹیکنالوجیز نے جو پہلے متعارف ہو چکی تھیں چھپائی کے کلچر میں ایک اور تصویری کلچر کا اضافہ کیا۔ ٹیلی گرافی نے ملکی اور بین الاقوامی خبروں کی رپورٹنگ کو ممکن بنایا۔ سول وار کے زمانے کے اخبارات کو اگر کوئی بہ غور دیکھے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے مضامین میں وہ تصویریں شامل ہیں، جو عین محاذِ جنگ پر لی گئی تھیں۔ اولین دو ایجادات جن کا تعلق پہلی لہر سے تھا،

اخبارات میں استعمال کے لیے نہایت مناسب تھیں، جو پرلطف تصاویر اور دور تک پیغامات کی ترسیل کرتی تھیں۔ شہر کے لوگ ان تصویروں کے مزے لیتے تھے اور بیانیہ مضامین کو جن کا تعلق ''شورش زدہ مغرب'' سے، افریقا کے جنگلات سے یا یورپ کی اعلیٰ سوسائٹی سے تھا، ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔

چونکہ انسانی چہروں اور مظاہر فطرت کی تصاویر ایک بیش قیمت روایت سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے ابتدائی دور کے فوٹو گرافر کبھی کبھی اپنے کام کو فن کارانہ روپ دینا چاہتے تھے۔ پینٹنگ کی نقل کرنے کی اس کوشش نے عالمی جنگ اوّل کے زمانے میں نیچرل فوٹو گرافی کے ایک نئے سکول کو جنم دیا۔ ستم ظریفی یہ کہ بصری شباہتیں پیش کرنے کی وہ اہلیت جو کیمرے کو حاصل ہے، اس کی بنا پر کیمرہ انسانوں میں اپنے بعض حریفوں سے بازی لے گیا۔ گزشتہ صدی کے آخر تک پینٹنگ کے ''امپریشنسٹ'' سکول نے جو فرانس اور دوسرے ملکوں میں مقبول تھا، نشاۃ الثانیہ کے زمانے کے مثالی نمونے، اجسام اور اشکال ترک کر دیں۔ اب اس کے تخیل کا اظہار رنگ کے بے تسلسل دھبوں میں ہونے لگا تھا۔ کلاڈ مونٹ نے کہا تھا ''وہ تو صرف آنکھ ہے، لیکن کیا خوب آنکھ ہے۔'' کیمرے کی طرح مونٹ کی ہنر کاری بھی یہی تھی کہ رنگین روشنیوں کی لہروں کو کینوس پر آنے دو، جہاں ان سے کوئی شکل مرتب نہیں ہو گی۔ لہٰذا بیسویں صدی کے اوائل میں فن کاری کا جو کلچر ابھر کر آیا، وہ غیر مربوط اور اکھڑا ہوا سا تھا، یہ فن روایتی ہم آہنگی کے احساس سے خالی تھا۔

تہذیبی ایجادات کی دوسری لہر جب ابھر کر آئی تو تصویروں میں حرکت کا اضافہ ہو گیا۔ آوازوں کی ریکارڈنگ موسیقی کے ارتعاش سے یا اس انسانی آواز سے جا ملتی ہے، جو پہلے سے موجود تھی۔ انسانی آواز کی موجودگی سے ایک زبردست تہذیبی تاثر ابھرتا ہے۔ موسیقی کے ساتھ مل کر یہ ایک پراسرار اور بھرپور جذباتی تاثر پیدا کرتا ہے۔ ایڈیسن کے فوٹو گراف اور موشن پکچر مشین نے سب سے پہلے اس اثر انگیز ذریعہ کو انسانی شخصیت کو گرفت میں لینے کے لیے استعمال کیا۔ جس طرح چھپائی نے ایک مصنف کے منتخب الفاظ کو محفوظ کر دیا، اس طرح آوازوں کو ریکارڈ کرنے اور اداکار کی آواز اور ظاہری تاثرات کو ریکارڈ کر لینے کے لیے ساؤنڈ ریکارڈنگ اور موشن پکچر کی ٹیکنالوجیز آ گئی تھیں۔ اب عام لوگ کسی شخصیت کا سراغ اس کی حیثیت کے حوالے سے لگانے لگے۔ منفرد اداکار اپنی قدرت کی بہ دولت تہذیبی سرمایہ شمار کیے

جانے لگے۔ جلد ہی ساؤنڈ ریکارڈنگ خریدی جانے لگی۔ محض اس لیے نہیں کہ اس کی موسیقی کو کسی مشہور موسیقار نے مرتب کیا تھا بلکہ اس لیے کہ خود گانے والے کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی۔ جب ناظرین کسی اداکار کو اس کی شباہتوں سے پہچاننے لگے تو ہالی وڈ میں ''اسٹار سسٹم'' شروع ہو گیا۔ اگر اداکار یا اداکارہ کی جنسی حسیت کو اپنے احساسات کی گرفت میں لینے کا کوئی طریقہ نہیں تھا تو مصنف اور کمپوزر توجہ اور ستائش کا مرکز بن گئے۔

اگر الیکٹرک ٹیلی گراف الفاظ کو محض علامتوں کے ذریعے دوسری طرف پہنچاتا تھا تو یہ پہلی ٹیکنالوجی تھی جس نے طویل فاصلوں کے درمیان فوری پیغام رسانی کو ممکن بنایا۔ ریل کی پٹری کے اوپر سے گزرتے ہوئے تار نے ٹرین کی روانگی کے عمل کی اصلاح کر دی۔ ٹرین کی آمدورفت کے سخت شیڈول کا تقاضا یہ تھا کہ امریکا کے مختلف حصوں میں معیاری وقت کے منطقے بنائے جائیں۔ بڑے بڑے شہروں میں ٹیلی گراف کی بہ دولت اشیا کے تھوک بیوپاریوں کا دیہات کے خُردہ فروشوں کے ساتھ زیادہ تیزی کے ساتھ کاروباری تعلق پیدا ہوا۔ اس سے پہلے یہی خُردہ فروش اشیا کی خریداری کا آرڈر دینے کے لیے وقتاً فوقتاً شہروں کا رخ کرتے تھے۔ جارج اور وِل نے دعویٰ کیا ہے کہ ٹیلی گراف نے افسر شاہی کے فروغ میں کردار ادا کیا ہے، کیوں کہ صوبوں کے ناظم اپنے طور پر قبضے کرنے کے اہل نہیں رہ گئے تھے اور ذرا ذرا سی بات کے لیے ہیڈکوارٹر سے رجوع کرتے تھے۔ اس طرح برطانیہ کی سلطنت کے معماروں کی حیثیت کلرکوں کے برابر رہ گئی تھی۔ پھر اس کے بعد جب ٹیلی فون آ گیا تو افراد اپنے دوستوں اور ہمسایوں سے بات چیت کر سکتے تھے۔ پولیس اور آگ بجھانے والوں کی مدد درکار ہو تو فوراً رابطہ پیدا کر سکتے تھے۔ اس نئی گھریلو، دریافت نے عورتوں کی سماجی تنہائی دور کر دی، خاص طور پر وہ عورتیں جو دیہات میں رہتی تھیں۔ بعضوں نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ ایجاد لوگوں کی خلوت میں مداخلت ہے۔ رابرٹ لوئی اسٹیفن نے ایک خط میں اس کی دانش مندی کا اقرار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''یہ دلچسپ آلہ ہماری خواب گاہ میں اور باہر اس بچے کی طرح روتا بلکتا رہتا ہے، جسے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہو۔'' تاہم اندازہ یہ ہوا کہ بیشتر لوگوں نے اس سماجی سہولت کے آلے کو پسند کیا۔ ٹیلی فون جب تک استعمال کی نوبت نہ آئے، میز پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے اور آپ کے سکون میں اس وقت مخل ہوتا ہے جب کوئی شناسا بات کرنا چاہتا ہو۔ البتہ ادھر حال ہی میں سیل فون، وائس میل اور آنسرنگ (جواب دینے والی) مشین اور دیگر آلات کی بہ

دولت افراد کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ جہاں کہیں بھی ہوں، فون کال وصول کر سکتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ بھی شکایت کی ہے کہ دکھاوے کے زیر اثر ''معمولی اور محض خرافات پر مبنی فون کالوں کا لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔'' اس نے معمول کی زندگی کے ربط میں جس کے لیے انسانوں کو ذہنی اعتدال درکار ہوتا ہے، بے ترتیبی پیدا کر دی ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی وژن تہذیبی ایجاد کی تیسری لہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دور دراز کی مسافتوں کو بصری اور سمعی بہ یک وقت دونوں ذریعے سے جوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ فضائی وقت مہنگا ہے اس لیے وہ دور تک بکھرے ہوئے اپنے ناظرین کو بہت محتاط اور سوچے سمجھے انداز سے پیغام پہنچاتے ہیں۔ کمرشل ایڈورٹائزنگ نے ان خدمات کو مفت حاصل کرنا ممکن بنا دیا ہے۔ نیٹ ورک پر براڈ کاسٹنگ نے ایک نیا قومی کلچر پیدا کیا ہے۔ ریڈیو گھر میں دیواری گھڑی بن گیا، زندگی کے معمولات میں دوبارہ ترتیب پیدا کرنی پڑی تاکہ اپنے پسندیدہ پروگراموں کے لیے وقت نکالا جا سکے۔ ریڈیو نے اپنی نشریات کے علاقے میں یک گونہ اجتماعیت کا احساس پیدا کر دیا۔ قومی نشریات نے ایک ہی جیسی آوازوں کو لاکھوں گھروں میں پہنچا کر علاقائی پالیسیوں کو کھوکھلا کر دیا۔ جب ٹیلی وژن 1950 کے عشرے میں ایک دھماکے کے ساتھ آیا تو اس طرح ایک بصری آلے کا اضافہ ہو گیا۔ پہلے تو اس کے حامیوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ آلہ خاندانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لائے گا، کیوں کہ تماشائی گھروں میں بیٹھے ہوئے اس سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ پھر یہ کہا گیا کہ ٹیلی وژن میں تعلیم و تربیت کے زبردست امکانات ہیں، لیکن جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ ٹیلی وژن کمرشل اشیا کی فروخت کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ ٹیلی وژن نے برانڈ ناموں کو متعارف کرایا جس کی وجہ سے لوگوں نے ان اشیا کو خریدنے کی خواہش کی، جن کے اشتہار دیکھے تھے۔

جب لوگ ٹیلی وژن کے دور میں داخل ہوتے ہیں تو زندگی کس طرح بدلتی ہے، اس کی ایک مثال ایلکس (کیلیفورنیا) کے ایک صحرائی علاقے کے لوگوں کی زندگی ہے۔ 1977 تک ایلکس، ٹی وی سگنل کی پہنچ سے دور تھا۔ پھر کسی نے ایک کیبل عطیہ کیا، جس سے ایلکس کے باشندوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ فونیکس اری زونا کے ٹی وی سٹیشن سے پروگرام وصول کریں۔ کیبل آنے سے پہلے ایلکس کے لوگ تفریح کے لیے کتابیں، کھیل، ہمسایوں کے یہاں آمدورفت، بدھ کی رات میں اسکوائر ڈانس (ایک رقص جس میں چار چار جوڑے، چار طرف

سے مقابل ہو کر سب ناچتے ہیں) اور جمعرات کی شب سکول ہاؤس میں دکھائی جانے والی مووی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کے بعد قصبے کے لوگوں نے کتابیں پڑھنی کم کر دیں، انہوں نے اپنے رات دن کے معمولات کو ٹیلی وژن کے پروگرام سے مشروط کر لیا۔ جمعرات کی رات میں فلم بینی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کی بہ جائے اب نوجوان بڑے شہروں کے فیشن سے واقف ہونے لگے۔ بچے جہاں پہلے باہر کی تفریحات اور مشاغل میں دلچسپی لیتے تھے، اب ٹی وی پر راک کے موسیقاروں کی پرستش کرنے لگے۔ کچھ لڑکیاں، جنہوں نے جلد شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، یہ طے کیا کہ کوئی پیشہ اپنائیں، جیسے کہ ایک خاتون وکیل یا انتظامی افسر، جسے انہوں نے ٹیلی وژن پر دیکھا تھا۔ ایلکس کے لوگوں نے چیختے چنگھاڑتے اشتہاروں کو ناپسند کیا، لیکن ٹی وی بہت طاقت وَر ثابت ہوا جس نے مصنوعات کی خریداری کے لیے لوگوں کو مجبور کر دیا۔ ایک خاتون نے ایک بار کہا تھا، ''اب میں کوئی حیلہ ڈھونڈ رہی ہوں کہ فونکس جاؤں اور کسی ریستوان میں بیٹھ کر وہ گرما گرم بھاپ دیتی ہوئی چاپیں کھاؤں، جنہیں میں نے ٹیلی وژن پر دیکھا تھا۔''

چونکہ ریڈیو اور ٹیلی وژن عام لوگوں کو، ان سے کچھ لیے بغیر، اعلیٰ معیار کی تفریح یا کم از کم بہت مقبول عام تفریح فراہم کرتے ہیں، لہٰذا خاص طور پر ٹیلی وژن ایک حتمی نوعیت کے تہذیبی تجربے سے روشناس کراتا ہے۔ گھر کے اندر، خلوت میں ٹی وی تفریح آرام کے ساتھ اور فوری طور پر میسر ہوتی ہے۔ انہیں برتنا اتنا آسان ہوتا ہے کہ یہ ترغیب ملتی ہے کہ بٹن دبایا اور سٹیشن چل پڑا۔ بہت سے لوگ اس تفریح سے پورا دن کاٹ لیتے ہیں۔ (اس میں بہ ظاہر ایک ہی رکاوٹ ہوتی ہے، یعنی کمرشل برداشت کرنا پڑتا ہے اور جب پروگرام چلتے ہوں تو ان کے پروگرام کی پابندی کرنی پڑتی ہے، لیکن جس نے پکا ارادہ کر رکھا ہو، اس کے لیے ٹیپ ریکارڈ یا وی سی آر وہ رکاوٹ دور کر دیتے ہیں) اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ہر امریکی گھر میں ٹی وی یومیہ سات گھنٹے چلتا رہتا ہے۔ اس طرح ہر شخص کی زندگی کا بیشتر حصہ جو اس نے بیداری کی حالت میں بسر کیا ہو ٹیلی وژن کی نذر ہو جاتا ہے۔ ماہرین تعلیم کو یہ تشویش ہے کہ ٹیلی وژن دیکھنے سے بچوں کی ذہنی صلاحیت تباہ ہو جائے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے بالغ افراد کتابوں کا مطالعہ تفریحی مشغلہ کے لیے ترک کر دیں اور یوں ان کے ذہن تخیل سے عاری، بودے اور پلپلے ہو کر رہ جائیں۔

میڈیا کے ماہروں کا خیال ہے کہ ٹیلی وژن ناظرین میں ذہنی نقالی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ پردے کی چمک دار لکیروں کو مربوط شباہتوں میں منتقل کرنے کے لیے آنکھوں کو ذرا دیر کے لیے فوکس سے ہٹانا پڑتا ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کو عصبی سکون ملتا ہے اور وہ ایک بے ارادہ راحت محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ کاؤچ پر دھرے ہوئے ایک پلپلے آلو کی طرح بن جاتے ہیں۔ ریڈیو ڈراموں میں کم از کم یہ تو ہے سننے والا کرداروں اور واقعات کا قیاس کرتے ہوئے اس کے عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ ٹیلی وژن سمعی اور بصری دونوں احساسات فراہم کرتا ہے۔ اس تجربے کے لیے اس طرح کے ذہنی تفکر کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے کتاب پڑھنے میں ہوتی ہے۔ اسے دیکھنے میں ذرا دیر کی توجہ درکار ہوتی ہے۔ ایک مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ٹیلی وژن کے شو میں، اور اس میں کمرشل بھی شامل ہیں، تیس فٹ کے اندر 39 مرتبہ توجہ بدلنی پڑی ہے۔ ٹیلی وژن پر خبریں نشر کرنے والے نیوز کاسٹر یہ ہنر سیکھ لیتے ہیں کہ نشریوں کو کبھی کبھی مزاح کے ساتھ کہاں توڑا جائے۔ دوسروں کو دیکھ کر ان کے تجربوں سے سیکھنے میں کون سی دانائی ہے، اس پر سوال کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ ٹیلی وژن کے خیال کو برابر ہدف ملامت بنایا جاتا رہا ہے، لیکن لوگ اسے پھر بھی دیکھتے ہیں۔ چرچل کے قول کو ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دوسری قسم کی تفریحات کو چھوڑ کر ٹیلی وژن بدترین قسم کی تفریح ہے۔

سیاسی پیغامات کے درمیان تصادم

1920 کے عشرے کے دوران میں یورپ کا معاشرہ نئی ٹیکنالوجیز سے روشناس ہوتا جا رہا تھا، جس نے انسانی آواز کو ریڈیو کے نشریے کی طرح دور تک پہنچا دیا تھا۔ وہ شخص جس نے اسے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے خاصے مؤثر انداز سے استعمال کیا، وہ ایڈلف ہٹلر تھا۔ وہ کرایے کا ہال لے کر نہایت پرجوش اور نفرت سے بھری ہوئی تقریریں کرتا تھا۔ بعد میں ریڈیو کے نشریوں اور اشتہاری فلموں کے ذریعے ہٹلر کا وہی پیغام زیادہ تعداد میں لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہٹلر کو اس بات پر اصرار تھا کہ رائے عامہ کو بنانے میں لکھے ہوئے الفاظ سے زیادہ مؤثر بولے ہوئے الفاظ ہوتے ہیں۔ بعد میں لیون ٹراٹسکی نے اس دلیل کا دوسرا پہلو پیش کیا۔ ٹراٹسکی ایک روسی یہودی تھا۔ اس نے بالشوک انقلاب میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس نے اس امر پر زور دیا کہ کمیونسٹ موقف کے حامی پیدا کرنے میں مارکسی ادب نے بڑا

کردار ادا کیا ہے۔

ہٹلر کا موقف یہ تھا کہ ''مطبوعہ تحریریں ایک تہذیبی وقار تو رکھتی ہیں، لیکن عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کے معاملے میں ان کی حیثیت صفر ہے۔ (اس نے لکھا تھا کہ وہ تمام واقعات جنھوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تحریر کے زور سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ تقریر کی طاقت سے ظہور میں آئے۔ بہت سے لوگ ایک طویل مضمون پڑھنے کی بجائے اسی موقف کو تصویر دیکھ کر زیادہ آسانی سے تسلیم کر لیں گے) مجمع سے خطاب کرنا مدلل تحریر سے زیادہ موثر تھا، کیوں کہ بولنے والا اپنے مخاطب مجمع سے اپنے بیان کی تصحیح کراتا جاتا ہے۔ ایک مقرر حاضرین کے چہروں کے تاثرات سے یہ جان لیتا ہے کہ آیا لوگ اس کے بیان کو سمجھ بھی رہے ہیں اور یہ کہ اس نے ان لوگوں کو کس حد تک اپنا قائل بنا لیا ہے۔ دوسری طرف ایک مصنف اپنے مخاطبین کو سرے سے نہیں جانتا، اس لیے وہ اپنے دلائل کو عمومیت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اس عمل کے دوران میں محسوس کرتا ہے کہ نفسیاتی نکتہ رسی نہیں رہی۔'' ہٹلر نے تسلیم کیا کہ بالشوازم کی سیاسی کامیابی ایک استثنائی صورت تھی۔ جس بات نے مارکسزم کو عام لوگوں پر حیران کن طاقت دے دی، وہ دنیا کے یہودی دانش وَروں کی رسمی تحریریں نہیں تھیں بلکہ ایک زبردست تصویری پراپیگنڈہ تھا جس نے لوگوں پر غلبہ پا لیا تھا... مارکسی تحریریں شورش برپا کرنے والوں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی تھیں...

لیون ٹراٹسکی نے جو انہی مارکسی شورش پسندوں میں سے ایک تھا، اختلاف کیا۔ اس نے لکھا کہ ''ہٹلر کی دلیل بلاشبہ بڑی حد تک طے شدہ ہے کیوں کہ وہ لکھ نہیں سکتا۔'' اس نے لکھا کہ ''مارکس اور اینگلز نے اپنی ساری زندگی میں فن تقریر سے مدد لیے بغیر لاکھوں مقلدین پیدا کر لیے... کوئی مقرر لکھنے والے پیدا نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ایک بڑا لکھنے والا ہزاروں مقرر تیار کر سکتا ہے... لینن، بجائے اس کے کہ زندہ الفاظ کے ساتھ عام لوگوں سے خطاب کرنے کا موقع اسے ملتا، وہ ایک مضبوط اور نہایت بااثر پارٹی کا سربراہ بن گیا تھا۔ ایک عوامی مقرر کے طور پر اسے 1917 تک تقریر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، اور وہ بھی جب موقع ملا تو بہت مختصر وقفے کے لیے تھا۔ وہ جب برسر اقتدار آیا تو ایک مقرر کے طور پر نہیں، بلکہ سب سے بڑھ کر ایک مصنف کے طور پر آیا تھا۔ وہ پروپیگنڈا کرنے والوں کا ہدایت کار تھا، جس نے اپنا کاڈر تیار کیا تھا اور ان میں تقریر کرنے والوں کے دستے بھی شامل تھے۔''

دراصل ہٹلر موشن پکچرز کو سب سے زیادہ طاقت وَر ذریعہ اظہار سمجھتا تھا، اس لیے اس نے اسی فلمی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکا کے کمیونسٹوں نے ہالی وڈ میں گھسنے کی کوشش کی، لیکن سکرین ایکٹرز گلڈ کے صدر رونالڈ ریگن نے ان کی مخالفت کی۔ ایک سابق اخباری ایڈیٹر ہونے کی بنا پر (جیسا کہ کارل مارکس بھی رہ چکا تھا) لینن نے ریڈیو کے بارے میں لکھا کہ یہ ایک اخبار ہے، جس میں کاغذ استعمال نہیں ہوتا اور جس کی کوئی حدیں نہیں ہوتیں۔ اس کے نئے امکانات کو انہوں نے چنداں پسند نہیں کیا۔ سوویت لیڈر چونکہ سینما میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے، اس لیے ریڈیو کی صنعت نے 1920 کے عشرے کے آخر سالوں تک، اور بڑی حد تک ریاستی مداخلت کے بغیر، ترقی کی۔ دوسری طرف نازیوں نے ریڈیو کو اپنے سیاسی پروپیگنڈے کا اصل آلہ کار بنایا۔ جرمنی میں فروخت ہونے والے ریڈیو سیٹ صرف دو اسٹیشنوں کے نشریے وصول کر سکتے تھے۔ برطانیہ اور امریکا میں ریڈیو کے نشریوں میں سیاسی اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ روز ویلٹ نے امریکیوں کے ساتھ اپنی ہلکی پھلکی گفت گو کے لیے ریڈیو کو موثر طور پر استعمال کیا۔ امریکی صدور قوم سے صرف ہنگامی صورتِ حال میں ریڈیو اور ٹیلی وژن سے خطاب کرتے آئے ہیں۔ برطانیہ میں نشریاتی نظام کے بانی لارڈ ریتھ کے خیال میں ریڈیو کا مقصد محض تعلیم کو فروغ دینا اور اخلاق کی اصلاح تھا۔ اس نے کہا تھا کہ "ریڈیو کلچر کا ملازم ہے۔" امریکا میں اسے زیادہ تر تفریح کے لیے استعمال کیا گیا۔

1870 کے عشرے کے اوائل میں جب تھامس ایڈیسن نے فونوگراف ایجاد کیا تو اس نے اس کو محض "ٹیلیفون" کا پیغام دہرانے والا سمجھا، بہ الفاظِ دیگر ٹیلیفون کی گفت گو کو مستقل طور پر ریکارڈ کرنے والا آلہ۔ انیسویں صدی کے وہ لوگ جنہیں برقی یا مواصلات کے برقی آلات سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا، اس کو ان میں عملی استعمال کے امکانات نظر آ گئے۔ انہوں نے سائنسی یا کاروباری استعمال کو نظر میں رکھا۔ تاہم اس نئے میڈیا کو جس بہترین انداز سے استعمال کیا گیا، وہ تفریح تھی۔ مارشل میکلوہن نے لکھا تھا "فونوگراف کو تفریح کا آلہ سمجھنے میں ناکامی دراصل پورے برقی نظام کو سمجھنے میں ناکامی سمجھی جائے گی۔ ہم اپنے زمانے میں اسے ایک سکون بخش کھلونا سمجھ کر برت رہے تھے، لیکن اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی نے بھی تفریح کے انہی وسیع امکانات کو حاصل کر لیا ہے۔ اس دوران میں تفریح اپنی انتہائی صورت میں کاروبار اور

سیاست کا خاص عنصر بن گئی۔'' امریکا میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کی صنعتیں، جن کی نظریں مارکیٹ پر لگی ہوئی تھیں، ان کا رخ نہایت تیزی سے عام تفریح کی طرف مڑ گیا۔ اب الیکٹرانک میڈیا کو اپنے اندر کے امکانات کی بنا پر کھل کھیلنے کا پورا پورا موقع مل گیا۔

اس کے برعکس سوویت معاشرہ آمریت کے تابع فرمان اور ماضی کی مثالیت پسندی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ یہ معاشرہ زیادہ تر خواندگی کے کلچر سے وابستہ رہا، جیسے انیسویں صدی کے اسالیب اور موضوعات کے حوالے سے پہچانا جا سکتا تھا۔ جہاں مغرب کا معاشرہ راستہ بدل کر عام تفریح کی طرف جا رہا تھا وہیں سوویت مصنف، فن کار، رقاص اور شاعر روایتی طریقوں سے فن کی تخلیق اور اس کی پیش کش میں سرگرم تھے۔ سوویت لیڈر خشک چہرے اور اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ پارٹی کانگریس میں طویل تقریریں کیا کرتے تھے۔ ٹیلی وژن کے نیوز کاسٹر انہیں محض خبر قرار دیتے تھے۔ مغرب کا میڈیا جس طرح کے ذاتی احساسِ مسرت اور بشاش قرینے کا مظاہرہ کرتا تھا، وہ اُن کے یہاں مفقود تھا۔ ''وال سٹریٹ جرنل'' نے 1994 میں کسی قدر نیم مزاحیہ انداز میں لکھا کہ ایک کمپیوٹر میگزین کے ایڈیٹر نے کس امریکی فرم کے چند اشتہارات محض اس بنا پر رد کر دیے کہ ''اس کے متن میں قارئین کے اندر کافی مقدار میں ٹیکنیکل معلومات موجود نہیں تھیں۔'' ان کے ایڈیٹر تو دیانت داری برت رہے تھے، لیکن مغرب کے مذاق کے مطابق کمرشل ایڈورٹائزنگ کو جس طرح کا ہونا چاہیے، اس کے بارے میں ان کے تصورات قدامت پسندانہ تھے۔ وہ اب تک چانپیں بیچ رہے تھے، اس سے بھاپ اٹھتا ہوا چٹ پٹا ذائقہ نہیں۔''

1989 میں جب تبدیلی آئی تو نظریہ نہیں بدلا بلکہ برقیاتی کلچر بدلا، جو سوویت نظام پر چھا گیا۔ مبصرین نے کہا ہے کہ اشتراکیوں کی سیاسی فرماں روائی کے زمانے میں مشرقی یورپ کے وہ شہر جو مغرب کے ٹیلی وژن سٹیشنوں کی حد میں تھے، سب سے زیادہ مزاحمت انہی شہروں میں پائی گئی تھی۔ یہ تھے یزگ (مغربی جرمنی) اور تیمی سورا (رومانیہ) کے شہر۔ ٹیلی وژن پر اشتہار چلانے کا ایک سادہ سا اصول رائے عامہ کی پسندیدگی تھا یعنی کچھ اس طرح کہ میں دیکھ رہا ہوں اور بس مجھے یہی چاہیے۔ مشرق کے لوگ ایسی بہت سی چیزیں خریدنا چاہتے تھے، جنہیں وہ مغرب کے ٹیلی وژن پر دیکھتے تھے۔ سوویت معاشرہ کا تناؤ بھی کسی قدر کم ہوتا جا رہا تھا، 'لٹل ویرا' جیسی فلموں میں اشتراکیت کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ میخائل گورباچوف

اوران کی طرحدار بیگم رئیسہ سابقہ روس رہنماؤں سے الگ مغرب کے سیاسی جوڑے لگتے تھے۔ مشرقی بلاک کے ملکوں میں مغربی طرز کے راک گروپ سرگرم ہو رہے تھے۔ منگولیا میں جمہوریت کی حمایت میں تحریک 'راک ان رول' کے ایک گانے سے ہوئی، جسے دو افراد کے ایک دستے نے گایا، اس کا نام ''ہونک'' تھا جس میں ریاستی افسر شاہی پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ سوویت ٹیلی وژن نے مشرقی یورپ کے باغیانہ واقعات کی رپورٹ دیتے ہوئے بغاوت کا خمیر تیار کرنے میں مدد دی۔ فیکس مشین، فوٹو کاپیئر اور انٹرنیٹ کے رابطے دنیا بھر میں پھیل گئے۔ کمیونزم کے سقوط پر رونالڈ ریگن نے کہا تھا، ''ہماری کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے، اس الیکٹرانک کے زمانے میں کاغذی معاشروں کو حیران و پریشان، بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔''

خوش آہنگی کے نئے مقاصد

موجودہ اشتہاری دور کا ایک مشہور مقولہ ہے ''چانپیں نہیں، ان کی چٹ پٹی لذت کا احساس بیچو''۔ یہ وہ سبق ہے جو روس میں کمپیوٹر میگزین کے ایڈیٹروں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ چٹ پٹا احساس بیچنے میں روایتی معنوں سے الگ ایک مختلف نوعیت کی ترغیب شامل ہوتی ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک طرح کی ترغیب جو دماغ سے مکالمہ کرتی ہے، حقائق کے مقابلے میں حقائق پیش کرتی ہے اور دلائل پر حاوی ہونے کے لیے دلائل پیش کرتی ہے۔ اس سارے سلسلے میں صداقت کی حیثیت مسلمہ ہے، جو سننے والے کو قائل کر دیتی ہے کیوں کہ وہ ان کے عالم گیر دعوؤں کو تسلیم کرتا ہے۔ (یہ چانپیں بیچنا ہوا) دوسری قسم وہ ہے جس میں سننے والے سے براہِ راست بات کی جاتی ہے۔ اس میں دلائل کم ہوتے ہیں اور مسحور کن شباہتیں زیادہ۔ جو اپنی حرکت اور عبارت سے سامعین میں ترغیب پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح کی ترغیب میں ایک تو پرکشش رقص ہوتا ہے جو دیکھنے والے کو خود فراموش بنا دیتا ہے اور وہ خود بھی اس میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ اس میں ایک مترنم خوش آہنگی ہوتی ہے، جس میں اسے خود کو ڈبو دینے کی گنجائش مل جاتی ہے۔ (چٹ پٹے احساس کی فروخت سے مراد یہی ہے) مطبوعہ تحریروں کا کلچر پہلے طریقے پر اصرار کرتا ہے الیکٹرانک میڈیا کا کلچر دوسرے طریقے پر وہ مصر ہے۔

معاشرے کی اقدار روایتی طور پر فلسفیوں اور مذہبی مبلغوں سے ہوتی ہوئی آئی ہیں جو نیکی اور صداقت کے تصورات پیش کرتے آئے ہیں، مقصد یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو، ان

معیارات پر کاربند رہا جائے۔ ایسا کرتے وقت ثابت قدمی اور کردار کی پختگی ضروری ہے، کیوں کہ نیکی اکثر اوقات عہد شکنی کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ ایک راست باز شخص وہ ہے جو گناہ نہیں کرتا، جس نے اپنی ساری زندگی ایک سیدھے اور تنگ راستے پر چلتے ہوئے گزاری ہے۔ اب ایک نئے کلچر میں، جس کی نشوونما الیکٹرانک میڈیا کے دور میں ہوئی ہے، کردار کی استقامت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اب زور اس امر پر ہے کہ فرد جب کیمرے کا سامنا کرے تو اس کی پیش کش اچھی ہونی چاہیے۔ کیمرے سے الگ اگر کچھ ہو رہا ہے، اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ موسیقار چاہتا ہے کہ اس کی ادائیگی بہترین ہو، اسی طرح وہ ایتھلیٹ، جو ایک اہم کھیل میں حصہ لینے کی تیاری کر رہا ہے، بہترین پیش کش کا آرزومند ہے۔ یہ پیش کش اس مہارت کا تقاضا کرتی ہے، جس کو ایک عادت کے طور پر ترقی دی گئی ہے، تاکہ اس سے مخصوص نوعیت کے تصورات کو تقویت پہنچے۔ تاہم کسی طرح کی پیش کش میں فرد کا ذہنی رویہ بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی ادائیگی درست ہوگی یا نہیں۔

جب کوئی ایتھلیٹ اچھا کھیلتا ہے تو کہتا ہے کہ مجھے تو پہلے ہی کامیابی نظر آ رہی تھی۔ ہم یہ کہیں گے کہ اس کامیاب پیش کش میں ایک مترنم خوش آہنگی تھی۔ یہ خوش آہنگی خوب صورت موسیقی میں پائی جاتی ہے۔ یہ جادو ٹینس کے کھیل میں بھی ہے، جہاں ہر لحہ کیمرے کی زَد میں ہوتا ہے۔ ٹیلی وژن پر ''ٹاک شو'' کے میزبان، ذہانت سے چمکتے دمکتے، اپنے مہمانوں سے برجستہ گفت گو کرتے ہوئے، یہ بھی خوش آہنگی کی مثال ہے، جس طرح کامیڈین جو اپنے بہترین لطیفے سنا رہے ہوتے ہیں۔ خوش آہنگی کا یہ مظاہرہ تمام تر ذاتی ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں میں یہ خصوصیت ہوتی ہے اور کچھ لوگوں میں نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ ایک نکتہ پاتے ہی خوش آہنگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسا نہیں کر پاتے۔ الیکٹرانک میڈیا عام لوگوں کو خوش آہنگ شخصیات سے روشناس کرانے کے کاروبار میں مصروف ہے۔ وہ ایسے افراد کی کھوج میں رہتے ہیں جو اس منفرد خصوصیت کا مظاہرہ کر سکتے ہوں اور پھر اس کا اچھا معاوضہ بھی دیتے ہیں۔

پرانے کتابی کلچر کا موقف یہ تھا کہ علم اچھی کارگزاری کی کنجی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کے اصولوں سے بہ خوبی واقف ہو تو مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے وہ ان کا بجا استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن خوش آہنگی کا میکانکی عمل اس سے مختلف ہے۔ اگر ایک کنسرٹ کا موسیقار، موسیقی سے بہ خوبی واقف ہو، پھر بھی جب وہ سٹیج پر جاتا ہے تو اسے اپنی اچھی کارکردگی کا یقین

نہیں ہوتا، کیوں کہ شان دار پیش کش اہم تو ہے، لیکن لازمی طور پر یہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ چنانچہ سٹیج پر کارکردگی دکھانے والے کو ''سٹیج کا خوف'' لاحق رہتا ہے۔ علم کے باوجود کوئی بھی شخص جب تک اس نے سیکھا نہ ہو مطالعہ نہیں کرسکتا۔ تحریر سے واقفیت کے باوجود کوئی بھی شخص تب تک الفاظ پر غور کرتا رہے گا، جب تک کوئی موزوں لفظ ذہن میں نہیں آتا۔ لیکن جب بیدار ذہن سامعین سامنے ہوں یا نیٹ ورک ٹیلی وژن پر ہوں، تو سٹیج کے اداکار کو خوش آہنگی کا مظاہرہ کرنا ہی پڑے گا، کیوں کہ کارکردگی دکھانے کا یہ ایک ہی موقع ہے، اس بات کا اس پر زبردست دباؤ ہوتا ہے، جب وہ شخص یا وہ خاتون اپنی کارکردگی میں پورے اترتے ہوں تو ناظرین کو اس کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ اس مظاہرے کو پسند کرتے ہیں۔

پرانے فلسفیانہ کلچر کا موقف یہ تھا کہ قوتِ ارادی شان دار کارکردگی کی کلید ہے۔ دماغ کو ایک خاص ڈسپلن کی ضرورت ہے اور جسم کو خاص انداز سے استعمال کرنے کی ضرورت۔ ارادے کا معاملہ اپنے عہد کو مضبوط بنانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا تعلق بھی ذہنی قوت برداشت کے استعمال سے ہے، لیکن خوش آہنگی خواہش مندانہ کاوش سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اداکار نے اگر یہ کوشش کی کہ کسی شخص کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اسے اچھی طرح کھینچے اور اسے ایک درست معمول کی پابند بنا دے تو وہ اس شخص کا گلا گھونٹ دے گا۔ خوش آہنگی کا معاملہ بہت حد تک اپنی جبلتوں پر کسی شخص کے اعتماد اور اس کے بے ساختہ اظہار کا ہے۔ کچھ اداکار سٹیج پر اپنے فن کو پیش کرتے ہوئے نشہ آور اشیا استعمال کرتے ہیں یا شراب پی لیتے ہیں تاکہ اپنے اندر دبے ہوئے خوف سے نجات پالیں اور اعصاب کا تناؤ دور ہو جائے، کچھ دوسرے افراد کسی رسم سے ابتدا کرتے ہیں۔ بہت سے اداکار معمول کے کاموں کا پہلے سے تصور کر لیتے ہیں، اس طرح انہیں سوچنا نہیں پڑتا اور اس کے لیے موڈ پیدا ہو جاتا ہے۔ کوچ اور کھیلوں کے نفسیاتی ماہر کھیل کے اس پہلو سے مدد حاصل کرسکتے ہیں۔ ایتھلیٹ کو بجائے خود یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے، اسے صرف اپنا کام کرنا چاہیے۔ بہترین بات یہ ہوگی کہ وہ بالکل خالی الذہن ہو۔

خوش آہنگی، اعلیٰ کارکردگی کی حالت میں پیدا نہیں ہوتی۔ اپنے اندر کی پختہ خوبیوں کے برخلاف خوش آہنگی باضابطہ اور ایک خاص وقت کے اندر توانائی کے اخراج پر ہے۔ سب سے زیادہ مشکل ابتدا میں ہوتی ہے۔ ایک بار جب توانائی کا اخراج صحیح سمت میں ہو جائے تو

اسے بہ ظاہر کوشش کے بغیر برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ درحقیقت بے ساختہ سرگرمی اس موڈ میں فنی اظہار کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ خوش آہنگی کے ساتھ ادائیگی فطری اور آسان ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ہزار کوشش کے باوجود یہ خوبی پیدا نہیں ہوتی۔ جیسا کہ شو بزنس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں ''جب تم گرم ہو، تو گرم ہی رہو گے، نہیں تو پھر ہرگز نہیں۔'' خوش آہنگی کے اپنے نشیب و فراز ہیں۔ یہی بات خوش آہنگی کو خواندگی کے کلچر کی حسین تخلیقات سے مختلف بناتی ہے۔ ادب اور آرٹ کے کلاسیکی سرمایے میں جس طرح کی اکملیت پائی جاتی ہے، وہ اتنی کراری شاید نہ ہو کہ سٹیج سے برجستہ طور پر پیش کر دی جائے۔ خوش آہنگی کو اپنے پھیلاؤ کے لیے کشادگی چاہیے، چنانچہ برقی ریکارڈنگ کے کلچر سے مکمل پختگی کا خیال بڑی حد تک غائب ہو چکا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اچھا ہونے سے خوش نصیب ہونا زیادہ بہتر ہے۔

کمپیوٹر کے رابطے

کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ ظاہر کرنا ابھی باقی ہے، لیکن یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اس ذریعہ اظہار نے اطلاعات کو ترتیب دینے اور پیش کرنے کا ایک نیا طریقہ مہیا کر دیا ہے۔ مطبوعہ تحریر کا معاملہ یہ ہے کہ ایک شخص متن کو ابتدا سے پڑھنا شروع کرتا ہے، پھر ایک مقررہ طریقے سے پڑھتا جاتا ہے۔ تا آنکہ اس کے آخر میں پہنچ جاتا ہے۔ مصنف متن کو خود ترتیب دیتا ہے، چنانچہ قاری مواد سے واقف ہو جاتا ہے۔ متن کے اندر جو بھی معلومات ہیں، وہ ایک طے شدہ ترتیب کے مطابق پوری وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوتی جائیں گی۔ قاری خیالات میں بھٹکنے کے لیے کبھی کبھار اوراق آگے پیچھے پلٹتا رہتا ہے، لیکن مسودے میں جو راستہ اس کے لیے متعین ہے، اس پر جما رہتا ہے۔ یہی معاملہ برقی ریکارڈنگ کا بھی ہے۔ ایک تخلیقی فن کار ایک خاص ترتیب کے ساتھ سلسلہ وار مرتعے پیش کرتا جاتا ہے۔ یہ تسلسل صرف اس وقت ٹوٹتا ہے جب وہ ٹیپ کو فاسٹ فارورڈ یا ریورس میں چلاتا ہے۔ دوسری طرف کمپیوٹر کے مینو، دوسری جگہ تک جانے کے لیے بہت سے آپشن (اختیارات) دیتے ہیں۔ آئیکون (نشان) پر ایک بار کلک کرنے سے اطلاعات کے دوسرے میدان میں پہنچ جاتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ ناظر کا ہے کہ وہ کس طرف جائے۔ معلومات کو معینہ طریقوں سے دوسروں تک پہنچانے کے طریقے سے انحراف کرتے ہوئے کمپیوٹر کے سسٹم میں پوری آزادی دے دی گئی ہے کہ اطلاعات کے حصول کے لیے وہ راستے کا انتخاب خود کرے۔

وہ لوگ، جو اپنے مقاصد کے تحت بے ترتیبی کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے تھیوڈر ایچ نیلسن نے 'ہائپر ٹکسٹ' کی اصطلاح وضع کی تھی۔ ہائپر ٹکسٹ کے اندر مطالعہ کی بنیاد فکری تسلسل کے مقابلے میں مربوط فکر پر ہوتی ہے۔ نوڈز اور لنکس، جو متعلقہ عناصر کو جوڑنے والے پوائنٹس میں متن کے مختلف اجزا کے درمیان ایک پل بنا دیتے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہومر، دانتے یا جان ملٹن کے پیراڈائز لاسٹ کا پیچھا کرنا۔ ایسے میں کمپیوٹر ناظر کو یہ موقع دیتا ہے کہ آئیکونز کو 'کلک' کرے اور حوالے کے متن حاصل کرے۔ یہ طریقہ ایسے قارئین کو راس آتا ہے جو متن پر سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں، نیز وہ قاری بھی جو ایک خاص مقدار میں معلومات، طویل متن کو پڑھے بغیر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس طریقے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مختلف فائلز تک پہنچنے اور معلومات کے اس سمندر میں کامیابی کے ساتھ جہاز رانی کرنے کے لیے ایک سسٹم بنایا گیا ہے جس کے تحت مختلف فائلوں سے رابطہ پیدا کیا جاتا ہے۔

یونان کے فلسفیوں نے ایک تصور عمومیت کا دریافت کیا تھا، جس کے تحت مجرد کو معروف سے جوڑا جا سکتا ہے۔ یوں ہی ہائپر ٹکسٹ متون کو اسی ترتیب سے جوڑ سکتے ہیں۔ متن کی پرتیں جو مینو سے جڑی ہوتی ہیں، بحث میں قاری کو عمومیت کے دائرے سے نکال کر معروف اور متعین تک پہنچا دیتی ہیں۔ عام بحث میں کسی علمی شعبے کا جس قدر زیادہ احاطہ کیا جائے گا، برقی لنکس مختلف پوائنٹس سے اس موضوع پر مفصل معلومات فراہم کر دیں گے۔ عالمی تاریخ کو بھی یہ طریقہ موافق آتا ہے۔ تاریخی واقعات کے مختصر احوال طویل تحریروں کے ساتھ اس طرح جوڑے جا سکتے ہیں کہ ہر واقعہ اور ہر موضوع مفصل طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ تاریخ کی عبارتیں بالآخر قاری کو افراد کی زندگیوں کی کہانیوں تک لے جاتی ہیں، جن کے نتیجے میں واقعات اتنی ''بلندی'' تک پہنچ گئے۔ اخبارات ہائپر ٹکسٹ کا استعمال کرتے ہوئے مطبوعہ مضامین کے تعلق سے اضافی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ سائنسی نوعیت کی رپورٹیں بھی اسی طرح مرتب کی جا سکتی ہیں۔ ایسے میں کسی الیکٹرانک انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے، جس کے متون میں انسانی علوم کا وسیع خزانہ محفوظ ہو۔ ایسا ہو سکتا ہے، کیوں کہ کمپیوٹر کی تہذیب عظیم اہرام مصر کی طرح ہے۔

نواں باب

تہذیبی ٹیکنالوجیز کی مختصر تاریخ

تحریر کا آغاز کیسے ہوا؟

بیشتر مؤرخ اس امر پر متفق ہیں کہ قدیم میسوپوٹامیا کے باشندے یعنی سمیری وہ پہلے لوگ تھے، جنہوں نے لکھنے کی ٹیکنالوجی دریافت کی۔ یہ تہذیبی ایجاد چار ہزار سال قبل مسیح وجود میں آئی۔ مصریوں کی تحریر (ہیروغلفی) علامتوں پر مبنی اور تقریباً اس زمانے کی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کچھ عرصہ بعد سمیریوں کی تحریر سے استفادہ کیا، کیوں کہ اس نے اچانک ہی ترقی یافتہ شکل اختیار کر لی تھی۔ سمیریوں اور مصریوں نے بھی وہ طرزِ تحریر اختیار کیا جس کی بنیاد تصویری علامتوں پر تھی۔ بعد میں اس میں آوازوں کے عناصر شامل ہوئے۔ تین دیگر اقوام ہیں۔ ایک تو وادیٔ سندھ کے باشندے، آریاؤں کی آمد سے پہلے کے لوگ، دوسرے چینی اور سوم وسط امریکا کے مایان۔ بہ ظاہر انہوں نے ہی تصویری اور آوازوں پر مبنی تحریریں آزادانہ طور پر دریافت کیں۔ ہڑپہ تہذیب کا سوادِ خط ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا، تاہم تین ہزار قبل مسیح شمال مغربی ہندوستان کے لوگوں نے اسے استعمال کیا۔ مایان کے باشندوں نے اپنا نظام تحریر تیسری صدی عیسوی سے قبل ایجاد کیا۔ ٹیڑھی میڑھی تصویریں، حافظے کا استعمال، ڈوری میں گرہ باندھنے کے طریقے، چھڑی پر کٹاؤ کے نشانات، یہ تھے ان کی تحریر کے قرینے۔ پھر وہ تصویریں سادہ اور باضابطہ اور خیالات کے قریب تر ہوتی گئیں، پھر گفت گو کے ساتھ ان میں آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔

سمیری تجارت پیشہ لوگ تھے۔ تحریر ان کے یہاں اسی مقصد کے لیے تھی۔ سمیری

تاجر اور بیوپاری اپنی اشیا کی تعداد ریکارڈ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مٹی کے ٹوکن آگ میں پکے ہوئے، جن کی لمبائی دو سے تین میٹر ہوتی تھی، استعمال کرنے شروع کیے۔ یہ اشیا کی تعداد بتاتے تھے، جن میں اناج، مویشی، مزدوری اور زمین کی بابت کوائف شامل تھے۔ ہر ٹوکن کسی شے کی مقدار اور قسم، دونوں بتاتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک بان (چھ لیٹر) گندم بار جیا (36 لیٹرز) گندم یا ایک بان جوَ یا ایک بوتل تیل کے لیے مختلف طرح کا ٹوکن درکار تھا۔ دو سو قسم کے ٹوکن عام استعمال میں رائج تھے۔ حساب کرنے والے یہ ٹوکن کسی برتن یا تھیلی میں رکھتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنی ٹوکنز کو مٹی کے مہر بند لفافوں کے اندر حفاظت کے خیال سے رکھنا شروع کیا، یہ جاننے کے لیے کہ مٹی کے اس لفافے میں کیا چیز رکھی ہے، محاسب ان کے اوپر نشان لگا دیا کرتا تھا۔ ایک نشان سے اس کے مالک کا پتہ چلتا تھا اور دوسرے نشان سے اندر رکھے ہوئے ٹوکنز کا علم ہوتا تھا۔ خاصے عرصے بعد سمیری تاجروں کو اندازہ ہوا کہ اصل ٹوکنز کو مٹی کے لفافے میں بند کر کے رکھنا غیر ضروری ہے۔ یاد رکھنے کے لیے اوپر کے نشانات ہی کافی ہیں، لہٰذا سمیری حساب دانوں نے لفافوں کا استعمال ترک کر دیا اور مٹی کی تختیاں اور ان کی پشت پر لگے ہوئے نشانات بہ طور تحریر برتنے شروع کر دیے۔ وہ گیلی مٹی کی ''تختی'' کو پکانے سے پہلے اس میں سرکنڈے کا ایک ٹکڑا یا ہڈی کا ٹکڑا پیوست کر دیتے تھے۔ شناخت کے لیے اس طریقہ سے بعد میں کھدائی کا رواج شروع ہوا۔

محاسبوں نے بہت سی سوچی سمجھی تبدیلیاں کیں اور تجارتی شماریات کے اس نظام کو تحریری زبان میں تبدیل کیا، لیکن اس سے پہلے مشرق وسطیٰ کے حساب دان مٹی کے پکے ہوئے انہی ٹوکن کو حساب فہمی کے لیے استعمال کرتے رہے۔ ایک بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب مقدار کو اشیائے صرف سے الگ کرنے کا مرحلہ آیا۔ ایک بان گندم کا ٹوکن 'ایک' کی نمائندگی کرتا تھا۔ گندم کے ایک بریجا کا ٹوکن اپنی ساخت میں دس شمار ہوتا تھا۔ اب اشیا اور مقدار دونوں کی ملی جلی تعداد سے مجرد تعداد کو الگ کر دیا گیا۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ عددی علامت کو اس علامت سے الگ رکھا گیا جو دوسری طرح کی جنس کی نمائندگی کرتی تھی۔ مثال کے طور پر ایک بریجا گندم (یعنی دس) کو اس ٹوکن کے مساوی رکھا جاتا تھا جو ایک بوتل تیل کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ علامتیں یا تو ایک بریجا گندم اور ایک بوتل تیل یا دس بوتل تیل کی نمائندگی کرتی تھیں۔ سمیریوں نے اس ابہام کو اس طرح دور کیا کہ تیل کے کچے برتن پر کسی نہ کسی چیز سے ایک

علامتی نشان لگا دیتے تھے۔ اس علامت نے رفتہ رفتہ مٹی کے ٹوکنوں کی جگہ لے لی۔ اب اعداد اور الفاظ دونوں کے لیے خاصی بڑی تعداد میں علامتیں استعمال کرنا ممکن ہو گیا۔ ہر تصویری علامت کسی تعداد یا کسی خیال کی نمائندگی کرتی تھی۔

ابتدا میں کاٹ دار علامتیں کسی تصویر یا خیال کی نمائندگی کرتی تھیں۔ ان کے کھینچے ہوئے خطوط کسی شے کی ہیئت کو واضح کرتے تھے۔ مثال کے طور پر سورج کی علامت یہ ہو سکتی تھی کہ دائرہ بنا کر بیچ میں ایک نقطہ ڈال دیا جائے۔ آنکھ کی تصویری علامت یہ ہوتی کہ دو عمودی لکیریں ڈال کر اوپر سے نیچے کی طرف ایک نصف دائرہ بنا دیتے، یہ آنکھ کا خاکہ ہوتا۔ اگرچہ یہ تصویریں فطری مظاہر کا اظہار کر سکتی ہیں، لیکن مجرد تصورات کو پیش کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اسم معرفہ اور گفت گو کے ایسے حصوں کو جن میں اسم ضمیر (یعنی وہ، ہم وغیرہ) حرف جاف (جیسے اس لیے، بعد میں) اور جوڑنے والے الفاظ آتے ہیں، ان کے مکمل اظہار سے قاصر ہیں۔ پھر دوسرا قدم یہ تھا کہ ایک یا زیادہ تصویری علامتیں، جن کے درمیان ایک فطری حوالہ ہوتا، الفاظ کی بجائے استعمال ہوتیں۔ مثال کے طور پر آنسو بہاتی ایک آنکھ کی تصویر رنج کا خیال ظاہر کرتی۔ ایک دائرہ جس سے سورج ظاہر ہوتا، اُس سے دن کی نمائندگی بھی ہوتی کیوں کہ طلوعِ آفتاب سے ہی دن ظاہر ہوتا ہے۔ بعض اوقات بہت سی تصویری علامتوں کو جوڑ کر ایک نیا علامتی مرقع بناتے تھے۔ چینی خط میں ''لفظ'' ان علامتوں سے مل کر بنا ہے، جو منہ اور بھاپ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سمیریوں کے یہاں ایک عورت اور ایک پہاڑ کی علامتوں کو جوڑنے کے معنی ہیں، ایک غلام عورت، اس لیے کہ میسوپوٹامیا میں رواج کے مطابق آس پاس کے پہاڑی علاقوں میں آباد قبائلی لوگوں میں سے غلام آتے تھے۔

ایک اور قرینہ یہ تھا کہ تصویری علامتوں کو ان مجرد الفاظ سے ملا دیتے، جن کی ادائیگی سے وہی لفظ نکلتا، جو بصری نمائندگی کرتا۔ دوسرے الفاظ میں ایک علامتی تصویر ایک لفظ کی بھی نمائندگی کرتی اور اس کے ہم شکل لفظ کی بھی۔ مثال کے طور پر چار (4) کے عدد کی نمائندگی (for) یا شاید fore کی نمائندگی کرتا۔ اس طرح تصویری علامت سازی ان الفاظ تک پہنچی، جن کا محض تصور کیا جا سکتا تھا۔ سمیریوں کی بات چیت میں بہت سے ارکان پر مشتمل الفاظ ہوتے تھے اور وہ مختصر بھی ہوتے تھے، جو دوسرے الفاظ میں پائے جاتے تھے۔ یہ حالات علامتی تحریر اختیار کرنے کا تقاضا کرتے تھے۔ اسے علامت نگاری کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک

مشہور محل کا نام ''بکنگھم پیلس'' ہے، اس میں تین ارکان ہیں۔ بک، کنگ اور ہم۔ تین علامتی تصویریں ایک ہرن، ایک بادشاہ اور ہم (سؤر)، یہ ایک لفظ کی علامت ہوئی۔ اسی طرح ایک اور علامت ہوتی تھی، جسےdeterminative (فیصلہ کن) کہتے تھے۔ وہ ان الفاظ کے درمیان فرق کرنا بتاتے تھے، جن کی آوازیں تو ایک سی ہوتیں، لیکن معنی مختلف ہوتے۔ مثال کے طور پر سمیریوں نے بول چال کا ایک لفظ ''ٹی'' (Ti) استعمال کیا، جس کے دو معنی تھے۔ ایک تیر، دوسرے زندگی اور V کا حرف پہلو کی سمت لٹا دیا جائے (>) جو تیر کی نمائندگی کرتا ہو اور فیصلہ کن علامت ایک اعراب ہے جو کچھ اس طرح لکھا جا سکتا ہے: (>)۔

تصویری علامت کی تحریر کے بیشتر اسالیب ایک ہی جیسے ناموں کی تکرار سے بوجھل ہوتے ہیں۔ چینی بول چال میں تمام الفاظ جدا جدا حروف سے مل کر بنتے ہیں۔ ایک حرفی آواز کے دس یا اس سے زیادہ مختلف معنی ہو سکتے ہیں۔ بول چال کی چینی (زبان) کے متنوع معنوں کا دائرہ اپنے لہجے اور سیاق وسباق کی بنا پر پھیل جاتا ہے۔ کسی لفظ کے معنی کا انحصار اس کو بولنے والے فرد کے لہجے کی موسیقی یا آواز کی بلندی اور فقروں کے اندر اس لفظ کی حیثیت پر ہوتا ہے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ بول چال کی چینی زبان میں ہم معنی الفاظ کی کثرت کی بنا پر تصویری علامتوں کو مجرد الفاظ پر منطبق کرنا آسان ہو گیا ہے۔ چینی رسم الخط کے نو یا دس الفاظ، بول چال کے الفاظ اور آوازوں سے ان کے تعلق کی بنا پر وضع کیے گئے ہیں۔ غلط فہمی سے بچنے کے لیے تصویری الفاظ کے درمیان اعراب لگائے جاتے ہیں۔ جدید چینی تحریر میں بہت سی آوازوں کی علامتیں اس زمانے کے بول چال کی عکاسی کرتی ہیں، جسے ایک زمانہ ہوا بھلایا جا چکا ہے۔ بولی جانے والی زبان تو عرصہ ہوا ختم ہو گئی، لیکن یہ سوادِ تحریر دو ہزار برس بعد بھی تبدیل نہیں ہوا۔ زمانہ قدیم کی سمیری تحریر کی طرح، جدید چینی عبارت ٹوائن بی کے الفاظ میں ''ایک غیر منطقی استعمال، تصویری تحریر اور اس کے پہلو بہ پہلو صوتی اکائیوں کو بھونڈے پن سے برتنے کی مثالیں ہیں۔

سمیریوں کی تحریر کے سلسلے میں الفاظ کی صوتی اساس اس بنا پر پیچیدہ ہو گئی کہ (قدیم بابل کی بستی) اکاد کے فاتحین نے سمیریوں کے رسم الخط میں اپنی بولی کا پیوند لگا دیا۔ اس طرح کی تحریر میں جو بھی الفاظ آتے، اگرچہ اکاد اور سمیری دونوں کے یہاں ان کے معنی ایک ہی ہوتے، لیکن اکاد بولنے والے ان زبانوں کے صوتی تعلق کو سمجھنے سے قاصر ہوتے تھے۔ ان کی

تحریر میں مصور الفاظ اور سمیری خط کی روایتی علامتوں کا مجموعہ ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر منہ کے لیے گول شکل بنا کر 'کا' کی آواز نکالنا سمیریوں کا طریقہ تھا اور اکادوالے اسے ''پم'' کہتے تھے۔ لیکن یہ لفظ اعراب کے استعمال سے ''کا'' بن جاتا تھا۔ تحریر کے ان دونوں طریقوں کے استعمال سے ہر ایک علامت سے بہت سے مختلف تلفظ اور معنی پیدا ہونے لگے۔ اس ذومعنویت کو دور کرنے کے لیے علامتوں کے ساتھ اعراب کا استعمال شروع کیا گیا، اس طرح وہ مختلف درجوں کی اشیا اور ساتھ ہی اس کی لسانی اقدار کی نشان دہی کرنے لگے۔ بالآخر انہوں نے ایک ایسی یک رکنی تحریر اختیار کی، جس میں ساٹھ علامتیں ہوتیں اور اکادیوں کی بول چال میں تمام الفاظ کے ارکان کی نمائندگی کرتی تھیں، ہر رکن میں ایک ہی آواز نکلتی تھی، جس میں صوتیہ حروف اور حروفِ علت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

خالصتاً آواز پر مبنی ایک تحریر تصویری عنصر کو الفاظ کے خیالی متن سے الگ کر دیتی ہے۔ اس کی بجائے لکھی ہوئی علامتیں بول چال کی زبان میں آواز کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یک رکنی تحریر میں ہر علامت کسی آواز کی نمائندہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر خود انگریزی کا لفظ syllable ہے جس میں تین آوازیں نکلتی ہیں۔ سِل (sill)، آ (ah) اور بل (bull) تینوں آوازوں کو الگ الگ تصویری علامتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ تینوں آوازوں میں سے ایک ایک کو تصویری علامت کے ذریعے واضح کیا جائے گا اور وہ علامتیں اس ترتیب سے رکھی جائیں گی، جس ترتیب سے وہ بولنے میں آتی ہیں۔ دوسرا امکان حروف تہجی کی لکھائی کا ہے۔ اس میں لکھی ہوئی علامتیں بول چال کے اندر آوازوں کے خالص عناصر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ آوازیں الگ الگ حروف کے مطابق ادا ہوتی ہیں۔ یک رکنی تحریر علامتی اور لفظ تحریر کے درمیانی مرحلے کا پتا دیتی ہے۔ جاپانیوں کے یہاں دو یک رکنی رسم الخط میں، جنہیں جاپانیوں نے آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے درمیان چینیوں سے اخذ کیا تھا، ان میں ایک 'کاٹا کانا' ہے۔ جسے رسمی دستاویزات اور علمی کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس میں پچاس تحریری علامتیں ہیں اور ضروری نہیں کہ وہ سب یک رکنی ہوں۔ دوسرا رسم الخط 'ہیرا گانا' ہے۔ اس کا استعمال اخبارات اور مقبول عام تحریروں میں ہوتا ہے۔ اس میں تقریباً 300 علامتیں ہیں، لیکن عام طور پر محض ایک سو استعمال میں آتی ہیں۔ یک رکنی تحریر کی ایک اور مثال کورین زبان کا رسم الخط ہے۔

علامتی تحریر کا پھیلاؤ

بیشتر قدیم اقوام کے پاس ایک "عبوری" رسم الخط ہوتا تھا، جو علامتی تحریر یا ملے جلے طرزِ تحریر اور یک رکنی یا حروف تہجی کی تحریر کے درمیان تشکیل کے مرحلے میں پایا جاتا تھا۔ مصر کی تصویری علامت نگاری میں خیالی خانوں کے علاوہ آواز کی علامتیں بھی ہوتی تھیں، جو الفاظ کے ماخذ کی نمائندگی کرتی تھیں۔ چونکہ مصری بول چال میں 24 حروف پورے نظام تحریر کی نمائندگی کرتے تھے، اس لیے بعض لوگوں کے خیال میں یہ حروف تہجی کی تحریر کا ابتدائی خاکہ تھا۔ تصویر اور اشکال پر مبنی تحریروں میں شروع سے ہی مختصر نویسی موجود تھی، جسے پروہتوں کی تحریر کہتے تھے اور جسے بیوپاری آپس میں مراسلت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بعد میں ایک اور اسلوب عام استعمال کے لیے روزمرہ کی بول چال کے حوالے سے وضع کیا گیا۔ کریٹ میں مینوان معاشرے نے مصری اور سمیری اور اکادا کی تہذیبوں سے سترھویں صدی عیسوی میں ان کا رسم الخط لینیئر اے (linear-A) حاصل کیا، اگرچہ اس تحریر کی گرہ اب تک نہیں کھل سکی ہے۔ قدیم یونانیوں نے، جنہوں نے تقریباً 1450 قبل مسیح میں کریٹ پر قبضے کے بعد اپنا linear B سوادِ تحریر وضع کیا تھا، دراصل مینوان کی تقلید کی تھی۔ اسوریوں نے سمیریوں کے رسم الخط کو قدرے آسان بنایا اور تحریر کو 570 علامتوں تک لے آئے، ان میں سے 300 علامتیں وقتاً فوقتاً استعمال ہوتی تھیں۔ ایرانیوں کے ابتدائی مخروطی رسم الخط میں جس پر آرمینیا کے حروف کا اثر تھا، 41 آوازوں کی علامتیں تھیں۔ چین کی تحریر خیالی صورت گری کی حد تک ایک عبوری تحریر کہی جائے گی۔

سمیرا اکادا معاشرے کے منشیوں نے مٹی کی تختیاں بنائیں، جن پر کاروبار میں لین دین کا حساب کتاب اور دوسری طرح کے پیغامات درج کیے جاتے تھے۔ اس طرح کی پانچ لاکھ سے زیادہ تختیاں دریافت کی گئی ہیں۔ اس میں ایک طرف کسی شے کا کٹاؤ ڈالا جاتا تھا، جو ایک طرف سے نسبتاً زیادہ چوڑا ہوتا تھا اور ایک تکونے زیور یا جوتے سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔ لکھاری اس پر پیغامات بائیں سے دائیں جانب عمودی پیرائے میں لکھتے تھے۔ اس طرح کا سوادِ تحریر میسوپاٹامیا سے قریبی علاقوں تک پھیل گیا، جہاں کے باشندوں نے اس رسم الخط کو اپنے یہاں کی تحریری زبان میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ سمیریوں کا رسم الخط، جس سے اکادا کی بولی کا علم ہوتا تھا، دو ہزار سال قبل مسیح میں ایک بین الاقوامی زبان کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ مصر کے فراعین بھی اس زبان اور سوادِ خط کو شام اور فلسطین کی ذیلی ریاستوں کے ساتھ

مواصلات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بابل کے بادشاہ مہاربی نے اپنا مشہور قواعد نامہ مرتب کیا تھا۔ اس نے اٹھارہویں صدی قبل مسیح میں اس رسم الخط کو سہل بنایا۔ اس کے دورِ حکومت میں ریاضی، نجوم، بنکاری اور دوسرے علمی شعبوں میں بڑی ترقی ہوئی۔ سمیرا، اکادا اور بابل کی مشترکہ تہذیب، ان کی بادشاہت کے خاتمے کے بعد بھی بہت عرصے تک مشرق وسطیٰ کی تہذیبی اور تجارتی زندگی پر حاوی رہی۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب بابل کی بول چال کی زبان استعمال سے خارج ہوگئی تو علامتی رسم الخط بھی بتدریج غائب ہونے لگا۔

سمیرا کی قدیم تحریر نے، یا بابل سے اخذ کردہ اس رسم الخط نے ایشیائے کوچک کے قدیم باشندوں، حِتّوں، الماتیوں، اشوریوں اور مشرقِ وسطیٰ کی اقوام کی زبانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ چین کی تحریر اپنی بناوٹ میں سمیریوں کے سوادِ خط سے مشابہت رکھتی ہے۔ تاہم اس بارے میں براہِ راست اثر کا کوئی یقینی ثبوت نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر دونوں رسم الخط میں کوئی علامت مشترکہ نظر نہیں آتی۔ چینی روایات کے مطابق تحریر کے فن کی ایجاد دو دیوتاؤں ژانگ چیہ اور چاؤ سونگ کی مرہونِ منت ہے جو ہوانگ ٹی کے سیکرٹری تھے۔ یہ بادشاہ تین ہزار سال قبل حکومت کر رہا تھا۔ اس کی شہرت کی داستانیں مشہور تھیں۔ ژانگ چیہ نے خاکوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، جسے عبادات میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا نام ''پاکووا'' تھا۔ اس میں تین شکستہ یا سالم عبوری لکیریں فطرت کے تین بنیادی عناصر کی نمائندگی کرتی تھیں۔ چاؤ سونگ نے حافظے کی مدد کے لیے گرہ ڈالنے کا ایک طریقہ وضع کیا تھا۔ ان دو ایجادات نے، جن میں ہاتھوں کے اشارے، چھڑیاں اور رسوم کی بابت علامتیں شامل تھیں، باہم مل کر دو ہزار سال قبل مسیح کے پہلے نصف زمانے میں چینی حروف کی وضع اختیار کی ہوگی۔ ایک کتاب جو نویں صدی قبل مسیح میں لکھی گئی تھی، اس میں تاچوان یا ''عظیم مہر'' کے حروف پائے گئے ہیں۔ ''چھوٹی مہر'' یا سیاؤ چوان کے حروف کو لی شو نے متعارف کرایا تھا، جو تیسری صدی قبل مسیح میں شہنشاہ چی این اول کا ایک وزیر تھا۔ پھر ایک آسان تر رسم الخط کو لی شو نے رواج دیا، جسے دستاویزات میں استعمال کیا گیا، جو قیدیوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ یہ بیشتر جدید چینی رسم الخط کا نقشِ اوّل ہے۔

جب ہسپانوی فاتحین 1519 عیسوی میں میکسیکو میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں کے ازتک باشندے خاکوں پر مبنی ایک سوادِ خط استعمال کر رہے ہیں، جو صرف مذہبی

مقاصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ آرچ بشپ زمیراگا نے حکم دیا کہ ایسی بیشتر ''شیطانی تحریریں'' تلف کر دی جائیں۔ ازتک تحریرانتہائی مصورانہ ہوتی تھی، تاہم اس میں کچھ لسانی عناصر بھی شامل ہوتے تھے۔ سپین کے لوگوں کو یوکاٹن کے جنگلات میں اور دوسری جگہوں پر بھی مایا تہذیب سے قدیم تر تہذیب کے آثار ملے، یہ تہذیب ایک ہزار سال قبل مسیح کے نصف اوّل دور میں پھل پھول رہی تھی۔ مایان کا بھی ایک تصویری سوادتحریر تھا، جو آرائشی حاشیوں میں، مصریوں کی خاکہ جاتی تحریروں سے ملتا جلتا تھا۔ عیسائی پادریوں نے جن کے اندر رواداری نہ تھی، ایک بار پھر اس زبان میں لکھی ہوئی عبارتوں کو غارت کر دیا۔ آج صرف 14 ازتک اور تین مایا تحریریں محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان تحریروں کو صرف جزوی طور پر پڑھا جا سکتا ہے، زیادہ تر عبارت سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق مایا اور ازتک کیلنڈروں اور ان کے عددی نظام سے ہے۔ ازتک اور تولٹک باشندوں نے اپنا رسم الخط غالباً مایا لوگوں سے حاصل کیا۔ مایا کے رسم الخط کی اصل کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔ مختلف رسم الخط کے سطحی تقابل سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان کا تعلق مصر کی قدیم تہذیب سے ہے۔ مشرقی جزائر کی تصویری تحریروں کا تعلق وادیٔ سندھ کی تہذیب سے ہے، لیکن اس طرح کی وضاحتیں محض قیاس پر مبنی ہیں۔

لسانیات کے ماہروں نے انیسویں صدی میں قدیم تحریروں کو پڑھنے کی کوشش کامیابی سے کی ہے۔ مصر کے رسم الخط کے نمونے اور بہت سے قدیمی خطوط کی تجدید کی گئی۔ ان میں شامل ابتدائی فارسی، نئی الادی، بابلی اور سمیری زبانیں شامل ہیں۔ (یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ مایا کے رسم الخط کی عبارت اب تک نہیں پڑھی جا سکی، حالانکہ سترھویں صدی کے اواخر تک اسے سمجھا جاتا تھا) ذریعۂ تحریر کے انتخاب کا اثر موجودہ قدیم دستاویزات کی مقدار پڑتا ہے۔ ایک طرف سمیری مٹی کی تختیوں پر لکھتے تھے، ادھر مصر کے لکھاری، پے پائرس پسند کرتے تھے۔ کاغذ کی طرح کا یہ مال نیل کے ڈیلٹا میں اگنے والے پوروں کے ڈنٹھل کو پیس کر بنایا جاتا تھا۔ اس طرح کے پارچے پر لکھنے یا جانوروں کی کھال پر لکھنے کے فن کو پرگامون میں، جو ترکی کا ایک علاقہ ہے، ترقی ہوئی۔ چین میں شانگ خاندان کے دورِ حکومت میں پروہتوں نے اپنی پیش گوئیاں ہڈیوں اور کچھوے کی استخوانی جلد پر لکھنی شروع کیں۔ کچھ سب سے زیادہ دیرپا عبارتیں جو پتھر کی تعمیرات پر لکھی گئیں۔ ایران کے دارا اوّل نے ایک فرمان جاری کیا کہ

بہستان کی پتھریلی چٹان پر اس کا حکم نامہ تین زبانوں میں کندہ کیا جائے۔ ہندوستان کے شہنشاہ اشوکا نے بودھ کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے پتھر35 سے زیادہ تختوں پر وہ تعلیمات کندہ کروائیں اور کھڑی کروا دیں۔ جنوبی عراق میں اُرک کے مقام پر پانچ سے چھ ہزار پرانی مٹی کی پکی ہوئی تختیاں اور ان کے ٹکڑے ایک ہزار سے زیادہ تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں۔

حروف تہجی کی تحریر

ہم نے یہ دیکھ لیا کہ الفاظ کو بصری صورت دینے کی ٹیکنیک نے کس طرح تصویر گری سے خیالی تحریر تک، جس میں آوازوں کا عنصر بھی شامل ہے، اور پھر حروف تہجی کی تحریر تک مرحلہ وار ترقی کی۔ اس سارے عمل میں آخری مرحلہ حروف تہجی کی تحریر کا ہے۔ بول چال کی زبان کے حروف میں آوازیں خالص عناصر کے درمیان ٹوٹ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی کا لفظ ورڈ (Word) ہے، اس کا ہجے ہے: ڈبلیو او آر ڈی۔ اس میں ہر حرف ایک آواز کا پتہ دیتا ہے اور جب کوئی شخص اسے ادا کرتا ہے تو آوازیں اس ترتیب سے سنائی دیتی ہیں۔ عبرانیوں نے ہر ایک حرف کو بول چال میں ہر لفظ کی پہلی آواز کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ یونانی زبان نے جس سے انگریزی کے حروف نکلتے ہیں، تحریر میں قدیم سامی نسل سے اور عبرانی نظام تحریر سے استفادہ کیا ہے۔

تحریر کے اس اسلوب میں خفیف سا تصویری حوالہ ملتا ہے۔ اس کی وضاحت رچرڈ ہاتھوے نے کی ہے۔

A — Alpha ہے جو عبرانی زبان کے Aleph سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں سانڈ کی کھوپڑی۔

B — Beta ہے، Beth سے نکلا ہے، یعنی مکان

C — اور G، یہ گاما Gamma ہیں اور Gimel سے نکلے ہیں، جس کے معنی ہیں اونٹ

D — Delta ہے، Delath سے نکلا ہے، معنی ہے، دروازہ

H — Eta ہے، Kheth سے نکلا ہے، اس کے معنی ہیں، باڑ

I اور J — یونانی ہیں Yod سے نکلے ہیں، معنی ہیں، ہاتھ

K Kappa ہے، Kaph سے نکلا ہے، اس کے معنی ہیں، ہاتھ کی ہتھیلی

M Mu ہے، Mem سے نکلا ہے، معنی ہیں، پانی

N Nu ہے، Num سے نکلا ہے، اس کے معنی ہیں، مچھلی

P Pi ہے، Pe سے نکلا ہے، اس کے معنی ہیں، منہ

R Rho ہے، Resh سے نکلا ہے، اس کے معنی ہیں سر

S Sigma ہے، Shin سے نکلا ہے، اس کے معنی ہیں دانت

اگر آپ A کو اُلٹ دیں تو آپ دیکھ لیں گے کہ یہ ایک سانڈ کی کھوپڑی ہے، جس کے دونوں سینگ باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ آنکھیں اور نتھنے غائب ہیں۔ عبرانیوں اور یونانیوں، دونوں نے حروف تہجی کو اعداد کے طور پر استعمال کیا۔ پہلے تو حروف تہجی، ایک سے نو تک ترتیب وار اعداد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کے بعد کے نو وہ اعداد ہیں جنہیں دس سے ضرب دیا جاتا ہے۔ 10، 20، 30، 40 وغیرہ اس یک جائی نے ان اسکیموں کو فروغ دیا ہے جو یہودیوں کی عارفانہ روایات میں اور دیگر جگہوں پر پائی جاتی ہیں جو اس وقت علامتی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں، جب ان کا عددی مجموعہ بعض الفاظ میں، خاص طور پر اسم ہائے معرفہ میں ادا ہو۔ مثال کے طور پر کتاب انکشاف (Book of Revelation) کہتی ہے کہ ایک جانور کی تعداد، ایک آدمی کا نام 666 کے برابر ہوں گے۔ لسانی تجزیے اور تفسیر کا ایک روحانی فن، جو ''جی میٹریا'' کہلاتا ہے، قدیم متون کا مطالعہ کرتا ہے اور ان اعداد سے جو الفاظ سے میل کھاتے ہیں، روحانی روشنی حاصل کرتا ہے۔ رومیوں نے بھی حروف کو اعداد کی خاطر استعمال کیا، لیکن ان کو بس یہیں تک محدود رکھا: I، V، X، L، C، D اور M۔ اعداد شماری کی نئی سکیم جو حروف نویسی سے الگ کر دی گئی مسلمانوں کے ذریعے ہندوستان سے آئی تھی، انہیں عربی اعداد کہتے ہیں۔

ہمارے خیال میں حروف تہجی پر مبنی تحریر خاکوں یا یک رُکنی تحریر کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے کیوں کہ الفاظ کی ادائیگی کے لیے اس میں علامتوں کے استعمال میں بہت کفایت ہوتی ہے۔ خانوں پر مبنی مسودوں میں اتنی ہی مختلف بصری علامتیں درکار ہوں گی، جتنے ایک لغت میں الفاظ ہوتے ہیں۔ یک رکنی مسودے میں آواز کی مناسبت سے کئی سو علامتوں کی ضرورت ہو گی۔ حروف تہجی کی تحریر میں بول چال کی ساری زبان 20 سے لے کر 30 تک

حروف میں آ جاتی ہے۔ حروف تہجی کے تحت ہر لکھا ہوا لفظ بہ آواز ادا ہو جاتا ہے تاکہ اس کا معنی سمجھ میں آ جائے۔ الفاظ اور آوازوں کے درمیان نسبتاً کم تعداد کے جوز کو یاد رکھنا آسان ہوتا ہے۔ دوسری جانب جیسا کہ جان لوگن نے کہا ہے کچھ ''چھپے ہوئے اسباق بھی ہوتے ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے آوازوں کو بصری علامتوں میں منتقل کرنا ہوتا ہے، اطلاع کو کوڈ میں بند کرنا اور کوڈ سے نکالنا ہوتا ہے اور الفاظ کو حروفِ تہجی کی ترتیب میں رکھنا ہوتا ہے۔'' ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے، امریکا میں بچوں کو انگریزی زبان سیکھنے اور لکھنے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے جتنا چینی بچوں کو اپنے تصویری رسم الخط کے ایک ہزار بنیادی ارکان کو سیکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ دونوں ہی طرف کے بچے پانچ سال کی عمر میں جب سکول میں داخل ہوتے ہیں تو پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے تین سال بعد خواندگی کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔

حروفِ تہجی کی تحریر بالکل ابتدائی زمانے میں مستقل طور پر ایک ہی سمت میں نہیں چلتی تھی۔ بعض تحریریں عمودی انداز میں لکھی جاتی تھیں اور کچھ افقی خط پر۔ قدیم سامی باشندوں کا رسم الخط افقی خط پر دائیں سے بائیں چلتا تھا۔ حبشہ اور یونان میں ان کے رسم الخط اس کے مقابلے میں بائیں سے دائیں جانب چلتے ہیں۔ بعض اقوام کی تحریر سطر بہ سطر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چلتی ہے۔ یونانیوں نے اس کے لیے ایک اصطلاح وضع کی ہے، جسے ''باؤ میں تھروپیڈن'' کہتے ہیں یعنی بیل جس طرح ہل میں چلتا ہے۔ اس طرح کی تحریر جنوبی عرب کی عبادت گاہوں کی دیواروں پر پائی گئی ہے۔ قاری ایک سمت میں اسے پڑھتے ہوئے چلتا ہے۔ پھر دوسری سطر پڑھنے کے لیے اسے واپس نہیں آنا پڑتا۔ گیارھویں صدی قبل مسیح کے وسطی زمانے تک حروفِ تہجی کی لکھائی پختہ ہو چکی تھی۔ بہت سے رسم الخط افقی انداز میں رائج ہو چکے تھے۔ تصویری اسلوب بتدریج غائب ہو چکا تھا اور حروف میں ایک قرینہ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ حروف تہجی جو چودھویں صدی قبل مسیح میں یوگرگ زبانوں کے گروہ میں شامل تھے، اب ان کے حروف میں ایک ترتیب پیدا ہو چکی تھی۔ انگریزی کا لفظ ایلفبیٹ (alphabet)، الفا (alpha) اور بیٹا (beta) سے مل کر بنا ہے جو یونانی زبان کے پہلے دو حروف ہیں۔

حروفِ تہجی پر مبنی تحریریں

حروفِ تہجی کی لکھائی ان رسم الخط سے شروع ہوئی، جنہیں شام، فلسطین اور سینائی

کے میدانی علاقوں میں آباد سامی نسل کے باشندوں نے دو ہزار سال قبل مسیح دریافت کیا تھا۔ اس رسم الخط میں لکھی ہوئی دستاویزات سینائی میں مرابتہ الخادم کے مندر میں اور اس کے قریب تانبے کی کانوں میں، جو تقریباً پندرہ سو قبل مسیح موجود تھیں، پائی گئیں۔ چونکہ ان میں سے کچھ حروفِ تہجی مصری تحریر کی علامتوں سے ملتے جلتے ہیں، اس لیے بعض محققین کو شک گزرا کہ وہ مصریوں کے اثر سے تھا۔ سینائی اور کنعانی تحریروں کی یہ نقل یہ رسم الخط غالباً تمام تحریروں کا ماخذ ہے۔ اس نے صنعت توشیح کے تحت جس میں کسی لفظ کا پہلا حرف ہی پورے لفظ کی آواز دیتا ہے، اس صنعت کی پابندی کی۔ مثال کے طور پر ''ڈاگ dog'' کی تصویری علامت D (ڈال) کی نمائندگی کرتی ہے۔ پھر باقی حروف اسی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں، جس ترتیب سے وہ آواز دیتے ہیں۔ لفظ ''ڈاگ'' (dog) اس طرح بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ ''ڈاگ'' کی نمائندگی کرنے والی علامتیں اس طرح ہجے کر کے رکھی جائیں۔ سینائی اور کنعانی زبانوں میں بائیس حروف اپنی آوازیں دینے والے موجود تھے۔

ابتدائی حروفِ تہجی، قدیم کنعانی، بدل کر سامی زبان میں پہنچے اور پھر تقریباً 1300 قبل مسیح میں قدیم عربی تحریر میں داخل ہوئے۔ بعد کے زمانے میں اس ذریعے سے وہ ارامی زبان میں داخل ہوئے۔ قدیم عربی رسم الخط نے ان اسالیب کو فروغ دیا جو جنوبی عرب اور حبشہ میں رائج تھے۔ قدیم شامی تحریر عبرانی سے بہت قریب ہے۔ وہ یونانی کے ساتھ ہی حروفِ تہجی کے نظام میں داخل ہوئی۔ یونانیوں نے سامیوں کے حروفِ تہجی 1050 قبل مسیح میں حاصل کیے ہوں گے۔ اگرچہ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ رسم الخط کا یہ تبادلہ آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہوا ہوگا۔ حروفِ تہجی کی یہ لکھارت ایک طرح کی مختصر نویسی تھی، جو بیوپاریوں اور تاجروں کو بہت مناسب معلوم ہوئی کہ اس سے ان کی ضرورت پوری ہوتی تھی۔ اس ہنر کو ہر ایک سے زیادہ تاجر طبقے نے ہی پھیلایا۔ اسے دور تک لے جانے والے سامی اور آرمینیائی لوگ تھے۔ دراصل ہر طرح کے رسم الخط کا ماخذ وہی سامی نسل کے لوگ تھے، جن سے شام کے مغرب میں سبھی اقوام نے اپنے اپنے رسم الخط وضع کیے۔ شام میں اور مشرق کے مقامات پر جو رسم الخط استعمال میں آئے، ان کی اساس ارامی خط پر تھی۔

سامی نسل کے لوگ تجارت کے لیے آبی راستوں پر سفر کرتے تھے۔ ایشیائے کوچک میں تائر اور سیدان اور شمالی افریقا میں کارتھیج ان کے خاص شہر تھے۔ وہ پہلے تہذیب یافتہ لوگ

تھے، جنھوں نے بحر اٹلانٹک میں سفر کیا۔ سامی رسم الخط، بحر روم کے علاقوں میں دور دور تک اور ایک ہزار سال تک استعمال ہوتا رہا اور جو خطوط اس سے نکلے، وہ لبنان میں اور قبرص، سارڈینیا، مالٹا اور سسلی کے جزائر کی نو آبادیات میں اور مارسیلز اور کارتھیج کے ساحلی شہروں میں استعمال ہوتے رہے۔ ایک ''پیونک'' نام نہاد رسم الخط کارتھیج میں استعمال ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ رومیوں نے 146 قبل مسیح میں اس کی شہری ریاست پر حملہ کر کے اسے ختم کر دیا۔ سامی رسم الخط تیسری صدی عیسوی تک آتے آتے ناپید ہو گیا۔ ایک روایت ہے کہ یونانی رسم الخط کو تھیبس (Thebes) کے قدوم (Cadmus) نے سامی زبان سے اخذ کیا تھا، جو سالہا سال تک شام میں رہتے آئے تھے۔ یونانی رسم الخط کی مشرقی اور مغربی، دو شاخیں تھیں۔ کلاسیکی یونانی رسم الخط میں 24 حروف تھے، جو مشرقی شاخ سے حاصل ہوئے۔ مالیٹس میں مستعمل لونی خط کو ایتھنس میں سرکاری طور پر اختیار کیا گیا۔ اس کے بعد نصف صدی کے دوران میں یونان کی دوسری شہری ریاستوں میں یہی رسم الخط قبول کر لیا گیا۔ مغربی شاخ سے اترسکان (Etruscan) اور لاطینی حروف نکلے۔ یورپی زبانوں کے بیشتر رسم الخط اس نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔

یونانیوں نے جب سامی رسم الخط اختیار کیا تو انہوں نے حروف میں کچھ ترمیمیں کیں، جس سے ان کی کشش میں بہت اضافہ ہو گیا۔ قدیم سامی اور سامی نسل سے متعلق دوسرے رسم الخط میں صرف حروفِ صوتیہ (consonants) ہوتے تھے۔ ان زبانوں میں الفاظ حروفِ صوتیہ (بالعموم تین) میں لکھتے جاتے تھے اور یہی ان کی بنیاد ہوتی تھی، کبھی کبھی ابہام سے بچنے کے لیے ایک حرفِ صوتیہ کو جس پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا، حرفِ علت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یونانیوں نے عبرانی کے ان الفاظ کو جن پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا، حروفِ علت میں تبدیل کر دیا، یعنی عبرانی زبان کے حروف الف، ح، یود، آئن اور واؤ کو a، e، i، o اور u میں منتقل کر دیا۔ انہوں نے مزید دو حروف کا اضافہ بھی کیا، یہ تھے a اور o اور تین نئے حروف صوتیہ شامل کر لیے جو یونانی میں تو تھے، لیکن کسی اور سامی زبان میں نہیں تھے۔ یہ تھے th، phi اور psi یوں یونانی رسم الخط نے آوازوں کا ایک مکمل انتخاب پیش کر دیا، جو پوری طرح ادا ہوتا تھا اور وہ حروف دیے، جن میں کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔ لاطینی حروف تہجی میں بہت سے یونانی حروف موجود ہیں، لیکن سہولت کی خاطر انہیں مختصر کر دیا گیا۔ Alpha کو A بنا دیا گیا، Beta کو B اور Gamma کو C وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی روم والوں نے ان حروف تہجی

میں ایک نئے حرف g کا اضافہ کیا۔ یہ z کی جگہ تھا اور بعد میں y اور z دو حروف داخل کیے۔

اس دوران میں حروف تہجی پر مبنی رسم الخط کا ایک اور خاندان، مشرق کی سرزمین میں داخل ہو رہا تھا۔ جس زمانے میں سامی نسل کے تاجر بحر روم کے ساحلی شہروں پر تجارت کر رہے تھے۔ انہی کے سامی (Semidic) عم زاد یعنی آرمینیائی اپنا مالِ تجارت لے کر مشرقِ وسطیٰ کی تجارتی شاہراہوں پر آ گئے۔ آرمینیائی لوگوں کا اصلاً تعلق شمالی عربستان سے تھا۔ وہ بارھویں صدی قبل مسیح میں شام میں آباد ہو گئے تھے اور وہیں انہوں نے حصار بند شہر بسائے تھے، جن میں سب سے اہم شہر دمشق تھا۔ شہری ریاستوں کے اس اجتماع کا تصادم بڑھتی اور پھیلتی ہوئی اسوریوں کی سلطنت سے ہوا۔ دمشق کو 732 قبل مسیح میں شکست ہوئی۔ اسوریوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ مفتوحہ قوموں کو قابو میں رکھنے کے لیے انہیں ان کے ٹھکانوں سے اٹھا کر سلطنت کی حدود میں کہیں آباد کر دیتے۔ اس بے رحمانہ طریقہ کار سے آرمینیائی تہذیب کو فائدہ پہنچا۔ اسوریوں کی سلطنت میں آرمینیائی بالادست تاجر قرار پائے۔ ان کی زبان کا علم پھیلا۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے زمانے تک ان کی ارامی زبان کا رسم الخط مشرق وسطیٰ میں تمام زبانوں پر حاوی ہو گیا۔ میڈیس اور بابل کے لوگوں نے اسوریوں پر غلبہ پا لیا جنہیں بعد میں ایرانیوں نے فتح کر لیا۔ اس وقت تک ارامی رسم الخط اتنی بااثر ہو چکی تھی کہ اسے ایرانی سلطنت میں سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی۔

ارامی طرز تحریر اگرچہ دسویں صدی قبل مسیح سے موجود تھا، لیکن تاریخی طور پر اہمیت اختیار نہ کر سکا، یہاں تک کہ شام میں ارامی ریاستیں ختم ہو گئیں۔ پھر جب اس کی تجارت کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی تو اسے فائدہ پہنچا۔ یہاں تک کہ سکندر اعظم نے جب یونان کے مقابلے میں اس کو رد کر دیا تھا، اس وقت بھی مشرق وسطیٰ میں آباد بیشتر اقوام کی بول چال کی زبان یہی ارامی تھی۔ اس زبان کے حروف تہجی سے بعد میں بہت سی تحریریں پھوٹیں جن میں کلاسیکی عبرانی، سینائی عربی، پالمیرین، شامی نستوری اور فنیشین وغیرہ شامل تھیں۔ ان میں سے کچھ زبانیں مشرقی مسیحی کلیساؤں میں استعمال ہوتی تھیں۔ وہ عربی سوادِ خط جس سے قرآن مجید لکھا جاتا ہے چوتھی صدی عیسوی میں نباتی (Nabataen) رسم الخط سے ہی پھوٹ کر نکلا اور ترقی کی۔ پہلوی، ایک ایرانی رسم الخط، دوسری صدی قبل مسیح میں ترقی پذیر ہوا، اسے پارتھیا اور ساسانی سلطنتوں میں استعمال کیا گیا۔ اس سے متعلق ایک رسم الخط اوسیتا

تھا، جس کا تعلق زرتشتوں کے مقدس ادب سے تھا۔ آرمینیائی تاجروں کا ہندوستان سے بھی واسطہ تھا، خاص طور پر اس زمانے میں جب وادیٔ سندھ پر ایرانیوں نے غلبہ پالیا تھا۔ دو ہندوستانی رسم الخط، براہمی اور خردشتھی، جو پہلے ہزار سال قبل مسیح میں رائج تھے، اسی ارامی زبان سے نکلے۔

جیسا کہ معمول ہے کہ جب تجارت چلتی ہے تو اس کے عقب میں جھنڈا بھی چلتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حروفِ تہجی کے نظام نے مذاہب کے ساتھ فروغ پایا۔ لاطینی حروف تہجی، جو رومن کیتھولک چرچ سے تعلق رکھتے ہیں، آج دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ عربی کے حروف تہجی جو سب سے زیادہ استعمال میں دوسرے درجے پر ہیں ان مقامات پر کثرت سے رائج ہیں، جہاں مذہب اسلام کا غلبہ ہے۔ اینٹیاک میں سیرانی زبان جو ارامی تحریر کی ہی ایک شاخ ہے، مسیحیوں کی تحریر ہے۔ 431 عیسوی میں ایفیسس کی کونسل (Council of Ephesus) کے بعد اس کی دو شاخیں ہوگئیں، مشرقی شاخ نستوری مسیحیت سے مل گئی اور مغربی شاخ مصری کوپٹکس سے جڑ گئی۔ نستوری رسم الخط ہندوستان کے مشرق میں پہنچ گیا، پھر چین اور ایک سرگرم مشنری دستے کے ذریعے وسط ایشیا تک پہنچ گیا۔ اس نے سغوری (Sogdian) اور الغر کی تہجی حروف کی زبانوں پر بھی اثرات ڈالے۔ جیکوبی (Jecobite) تحریر، کہ یہ نام ایک مسیحی بشپ کے نام پر تھا، شام، مصر اور ابی سینیا میں استعمال ہوئی۔ منی شن (Manichaen) حروف بھی تھے، جن کا تعلق مانیچی مذہب سے تھا، جو ٹکڑے ہو کر مشرقی اور مغربی مسیحیت میں بٹ گیا۔ اس تعلق سے رسم الخط کی عبارت بھی تقسیم ہوگئی۔ جن قوموں نے یونانیوں کا کٹر عقیدہ قبول کیا، انہوں نے مشرقی کلیسا میں رائج ان کا رسم الخط بھی اختیار کیا، اس میں بلغاریہ، سربیا، روس اور یوکرین شامل تھے۔ دوسری طرف پولینڈ، چیکوسلواکیہ، کروشیا اور سلوون کے باشندے تھے، جو رومن کیتھولک تھے اور جنھوں نے وہ رسم الخط اختیار کیے جن کی بنیاد لاطینی پر تھی۔

موجودہ عبرانی زبان، عبرانی رسم الخط کے مقابلے میں، جو ان کے جلاوطنی کے دور سے پہلے رائج تھا، اب ارامی تحریر سے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح وادی سندھ میں آریائی تہذیب سے پہلے کی تحریر کا کروشتی اور براہمی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ شہنشاہ اشوک نے 35 سے زیادہ پتھروں پر کندہ عبارتیں چھوڑیں، جو اسی حروف تہجی پر مبنی رسم الخط پر تھیں، جن میں وہ اپنے

سیاسی اور مذہبی خیالات (بودھ مت) کو فروغ دے رہا تھا۔ براہمی جو پہلی بار ساتویں یا چھٹی صدی قبل مسیح میں نمایاں ہوئی، وہ تحریر تھی جسے برہمن پجاریوں نے قدیم سنسکرت زبان میں استعمال کیا۔ جب سوریا سلطنت ختم ہوگئی تو یہ زبان بہت سی علاقائی بولیوں میں بٹ گئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں ہندو مذہب کی تجدید کا دور شروع ہوا، انہوں نے سنسکرت زبان میں مقدس ادب تحریر کیا۔ بودھ اور جین مذاہب کی دستاویزات مقامی زبانوں یا ''پراکرت'' میں لکھی جا رہی تھیں، خاص طور پر ان کی بول چال کی زبان 'پالی' تھی۔ حکمران گپتا خاندان چوتھی اور چھٹی صدی عیسوی میں موجود تھا۔ اتفاق سے وہی دور، ہندو تہذیب کا زریں دور تھا۔ اس کی تحریر کی زبان ہندوستان کے بیشتر رسم الخط کے لیے نقش اوّل تھی۔ اس کے علاوہ یہ تحریر تبت، سیلون اور دیگر ہمسایہ ملکوں کے لیے بھی اوّلین مثال تھی۔ شمالی ہندوستان میں ناگری یا دیوناگری رسم الخط ساتویں صدی عیسوی میں فروغ پذیر ہوا۔ یہ بنگالی، کیتھی اور دوسری تحریروں کا آبائی رسم الخط ہے۔ جنوبی ہند کے کنڑی اور تیلگو رسم الخط کا تعلق علی الترتیب پانچویں اور نویں صدی عیسوی سے ہے۔ جنوب مشرقی ہندوستان کی گرانتھ تحریر پرانی جاونیز زبان اور کھمر (کمبوڈیا) کی تحریروں کی مورث ہے۔

یونانی تحریر تمام یورپی زبانوں کی مورثِ اعلیٰ ہے۔ مفرد حروف پر مبنی اس نے خم دار (بڑے اور گولائی والے) حروف کو رواج دیا۔ اس کے بعد مسیحی عہد کی ابتدائی صدیوں میں رومن وضع کے چھوٹے حروف متعارف کرائے۔ یونان کے جلی اور قوس حروف سے دو رسم الخط نکلے، جنہیں سلاوک لوگوں نے استعمال کیا۔ یہ تھے گلاگولٹک (Glagolidic) اور سیرلک (Cyrilic) جسے نویں صدی عیسوی میں سینٹ سیرل نے متعارف کرایا۔ مغربی یونان کی تحریر ایٹرسکان (Etruscan) اور لاطینی رسم الخط کے لیے ایک نمونہ تھی۔ ایٹرسکان کے باشندے آٹھویں اور پانچویں صدی قبل مسیح کے دوران میں شمالی اٹلی پر حکمران تھے، انہوں نے حروف تہجی پر مبنی یہ رسم الخط آٹھویں صدی میں یونانی ذرائع سے حاصل کیا ہوگا۔ اس کے بعد کی صدی میں رومن باشندوں نے لاطینی حروف کو فروغ دیا۔ نیپلز کے نواح میں کیومے کی یونانی نوآبادی تبادلے کا وہ خاص مرکز تھی جہاں سے یونانی حروف اطالوی باشندوں تک پہنچے اور یوں دور دور تک پھیل گئے۔ یورپ میں رائج رسم الخط لاطینی حروف سے ماخوذ ہیں، جو یورپی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ لاطینی سے ملنے والے حروف میں انگریزی نے دو حروف کا اضافہ کیا۔ j اور u، یہ حروف سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے دوران میں انگریزی میں داخل ہوئے اور صرف

ڈبلیو (W) زمانہ وسطیٰ میں آیا۔ U اور V کسی زمانے میں ایک ہی حرف تھے، جیسے کہ I اور J تھے۔ W ایک گزشتہ حوالے سے U اور V کے ساتھ وابستہ تھا۔

چھپائی

چھپائی کا آغاز اس وقت ہوا ہوگا جب سمیریوں نے مٹی پر نقش ڈالنے کے لیے بیلن جیسی مہریں استعمال کی ہوں گی۔ چین میں مذہبی یاتریوں نے بودھ کے اقوال کو روشنائی سے ابھار کر ستونوں پر کھدائی کے لیے استعمال کیا۔ چھٹی صدی عیسوی تک چین کے نقاشوں نے، لکڑی کے بلاک چھپائی کے لیے بنانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس عمل میں کاغذ پر روشنائی کی عبارت کو لکڑی کی سطح پر منتقل کرنا اور پھر ان حصوں کو کاٹ کر الگ کرنا جن پر روشنائی نہیں لگی، اس طرح عبارت کو نمایاں کرنا ممکن ہوا۔ چھپائی کے لیے لکڑی کے چھاپے پر روشنائی لگائی جاتی تھی اور اس پر کاغذ پھیلا دیا جاتا تھا اور ایک برش سے اس کی پشت کو رگڑا جاتا۔ اس ٹیکنالوجی سے بودھ اور تاؤ مذاہب کے ادب کے مطالبے تانگ دورِ حکومت (906-618) قبل مسیح میں پورے ہوتے رہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں ایک کیمیا داں پی شینگ نے متحرک طرز کا چھپائی کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس نے ٹائپ کے حروف کو دھات کی ایک پلیٹ پر گوند اور مٹی سے چپکا کر اس طرح پکایا کہ وہ اچھی طرح پختہ ہو گیا۔ پھر دوبارہ استعمال میں آنے والے اس حرف کو پلیٹ سے الگ کرنے کے لیے اسے ایک بار پھر گرم کیا گیا۔ ایک چینی مجسٹریٹ نے چودھویں صدی میں ٹیکنالوجی کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی، جس میں ساٹھ ہزار سے زیادہ علامتوں کو لکڑی پر کندہ کیا گیا تھا۔ پندرھویں صدی کے اوائل میں کوریا کے ایک بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ ایک لاکھ ٹائپ کے حروف تانبے میں ڈھالے جائیں۔ یوں کوریا، چھپائی کی ٹیکنالوجی کا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد کی ہی صدی میں یہ ٹیکنالوجی یورپ میں پھیل گئی۔

ایشیا نے نہیں بلکہ یورپ نے چھپائی کے فن میں انقلاب برپا کیا، اس لیے کہ یورپ میں حروف تہجی کی چھپائی، چین کی تصویری چھپائی یا کوریا اور جاپان کے رسم الخط کے مقابلے میں زیادہ موافق تھی۔ نسبتاً کم تعداد میں حروف کی بہ دولت سانچوں میں دھات کے ٹائپ کم لاگت میں ڈھالنا ممکن ہو گیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چین کے مغرب میں آباد اویغور

ترکوں نے ٹائپ کی لکھائی کے ہنر کو ایشیا سے یورپ پہنچا دیا۔ اسلامی معاشرے نے یورپ والوں کو ایک اور ٹیکنالوجی دی، جسے چینیوں نے ترقی دی اور وہ تھی کاغذ سازی کی ٹیکنیک۔ یہ ایجاد دوسری صدی عیسوی میں ہوئی ہو گی۔ سمرقند میں مسلمانوں نے 715 عیسوی میں چینی سپاہیوں کے ایک حملے کو پسپا کر دیا اور ان میں کچھ افراد کو قیدی بنا لیا۔ انہی میں ایک گروہ کاغذ بانے والے ماہر کاری گروں کا تھا۔ تاہم خود مسلمانوں نے چھپائی کا کلچر اختیار نہیں کیا، کیوں کہ ان کے مذہب میں لفظ اللہ کو مصنوعی طور پر دوبارہ تخلیق کرنے کی اجازت نہ تھی۔ (اسلام میں چھپائی پر پابندی انیسویں صدی سے پہلے نہیں اٹھائی گئی) کاغذ پر چھاپہ، پارچے پر چھپائی کے مقابلے میں بہتر ہوتا تھا، کاغذ بارھویں صدی میں ہسپانوی مسلمانوں کے ذریعے یا اطالوی بندرگاہوں کے توسط سے جن کے اسلامی دنیا سے خاصے تجارتی تعلقات تھے یورپ پہنچا ہو گا۔ چنانچہ اٹلی بہت جلد ہی کاغذ سازی اور اس سے ملتے جلتے دوسرے فنون کا مرکز بن گیا۔ سستے کاغذ کی بہتات نے مارکیٹ میں مسودہ نویسوں کی لکھی ہوئی تحریروں کی مانگ پوری کر دی۔ اس [illegible] ادبیات کی بڑی مانگ تھی۔ یونیورسٹی کے طلبہ کو [illegible] کتابوں کی ضرورت تھی، جنہیں مستند مصنفوں نے تحریر کیا ہو۔ زندہ اور مقامی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں، عام لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن گئیں۔ دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' اور بوکاچیو (Bocaccio) کی تصنیف ڈیکامیرون (Decameron) نے چودھویں صدی عیسوی میں ان ادبی اصناف میں اولیت حاصل کی۔ بڑھتی ہوئی مارکیٹ کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے تقریباً دس ہزار نقل نویس اور منشی یورپ میں مصروف کار تھے۔ یورپ والوں نے چودھویں صدی کے اواخر میں لکڑی کے بلاک سے چھپائی کا آغاز کیا۔ ابتدا میں ان کا کام یہ تھا کہ بڑے کیپٹل، حروف تیار کریں، جن سے زمانہ وسطیٰ کے متون کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی نقش گروں نے متن کی عبارت کی نسبت سے مذہبی تصاویر بنانی شروع کیں۔ ان کی کٹائی کی مہارت جیسے جیسے بڑھتی گئی، حروف سازی کا معیار بھی بہتر ہوتا گیا، یہاں تک کہ آرائشی تصاویر کے مقابلے میں متن زیادہ اہم ہو گیا۔ لکڑی کے بلاک سے چھپائی کرنے والوں نے پندرھویں صدی میں کتابچے شائع کیے، جنہیں وہ ڈونٹس (عطیے) کہتے تھے۔ ہالینڈ کا ایک پرنٹر لارنس جانزون تھا جو کوسٹر کے نام سے بھی معروف تھا۔ اس نے مناجاتوں کا ایک مجموعہ چھاپا، اس کا نام تھا ''انسان کا نجات دہندہ''۔ یہ 1428 کی بات ہے۔ اس نے لکڑی کے حروف استعمال

کیے تھے۔ چھاپے والوں نے جلد ہی حروف کے لیے دھات کے ٹائپ استعمال کرنے شروع کر دیے، کیوں کہ انہیں بار بار ڈھالا جا سکتا تھا اور وہ لکڑی کے مقابلے میں زیادہ دیرپا ہوتے تھے۔

تاریخ دان عام طور پر چھپائی کی ایجاد کا سہرا یورپ میں جوہان گٹن برگ کے سر باندھتے ہیں جو جرمنی کے مقام پر مینز کا باشندہ تھا۔ اس نے ایک بائبل لاطینی زبان میں اور اپنے ہی چھاپے خانے میں چھاپی اور متحرک ٹائپ استعمال کیا۔ گٹن برگ سناروں کی گلڈ کا رُکن تھا، اس نے اس نئی ٹیکنیک پر تجربہ 1430 کے عشرے میں نہایت راز داری سے شروع کیا۔ اس عرصے میں وہ اپنی روزی کے لیے جواہر کو تراشنے اور آئینہ سازی کا کام کرتا رہا۔ تاہم طویل تجربات پر خاصی رقم خرچ ہو رہی تھی۔ لہٰذا وہ دوستوں اور کاروباری شریکوں سے قرض لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے 1450 میں ایک مال دار ساہوکار جوہن فسٹ سے 800 گلڈر قرض لیے۔ اس کے لیے اس نے اپنے اوزار اور چھپائی کی مشین گروی رکھ دی۔ گٹن برگ نے مزارین بائبل کی تیار 1454 میں مکمل کر لی۔ اس کی چھپائی کے نتیجے میں متعدد فنی اختراعات سامنے آئیں۔ ان میں ٹائپ تیار کرنے کے لیے ایک نئی طرح کا چھاپہ بھی شامل تھا۔ یہ چھاپے کی ایک بہتر صورت تھی۔ اس میں روشنائی کی تہہ میں تیل لگایا جاتا تھا۔ فسٹ نے اپنی رقم کی وصولی کے لیے گٹن برگ کے خلاف فوراً مقدمہ دائر کر دیا۔ عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ گٹن برگ، فسٹ کی رقم سود سمیت واپس کرے۔ حالانکہ چھپے ہوئے بائبل کے نسخوں سے وہ رقم پوری ہو سکتی تھی، پھر بھی فسٹ کو یہ اجازت دے دی گئی کہ بائبل کا ٹائپ، مناجاتوں کا نسخہ اور گٹن برگ کی چھپائی کے کچھ آلات اپنے قبضے میں کر لے۔ پھر فسٹ نے اپنے ایک داماد کی مدد سے، جو گٹن برگ کا نائب رہ چکا تھا، پرنٹر کے طور پر ایک دکان اپنی کھول لی۔

فسٹ اگرچہ اس ایجاد کا خود دعوے دار بن بیٹھا تھا، لیکن گٹن برگ کو تاخیر سے ہی اس کا موجد تسلیم کیا گیا کہ چھپائی کے دور کا آغاز اسی نے کیا۔ ہو سکتا ہے، وہ پہلا شخص نہ ہو جس نے متحرک ٹائپ سے چھپائی کی، لیکن اس ٹیکنیک کو کاروباری طور پر کامیاب بنانے کے لیے جن خاص عناصر کی ضرورت تھی، ان کو تو اس نے مکمل کیا۔ اس نے نرم دھات کے ٹھپّوں اور ایک سانچے سے بڑے پیمانے پر دوبارہ استعمال ہونے والے ٹائپ کے حروف تیار کیے۔ اس نے ہاتھ سے چلایا جانے والا اپنا چھاپہ خانہ بھی بنایا، جس میں چھپائی کے لیے بڑے کاغذ

رکھے جا سکتے تھے۔ اس نے چھپائی کے پریس میں، جسے اس نے شراب کشید کرنے کی ایک مشین سے وضع کیا تھا، ایک نچلی پلیٹ بنائی جو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتی تھی، پھر ایک پلیٹ اوپر کی سطح پر لگائی، جو ایک چھوٹے ہتھے کی مدد سے اوپر نیچے حرکت کرتی تھی۔ لکڑی کے ایک خانے میں ٹائپ کے حروف کو الگ الگ ترتیب کے ساتھ رکھا جاتا تھا اور خانے کو بند کر دیا جاتا تھا۔ چھپائی کے بعد حروف نکال کر الگ خانے میں ڈال دیے جاتے تھے۔ تقریباً 1475 میں تانبے یا جستے کے چھاپوں کی جگہ لوہے کے چھاپے آ گئے، جو کانسے کے قالب بنانے کے کام آتے تھے۔ پھر ایک پھسلنے والی سلیٹ اس میں لگائی گئی تا کہ چھپے ہوئے کاغذ کو اس میں سے نکالا جا سکے اور ہر ورق کی چھپائی کے بعد مزید روشنائی پھیری جائے۔ چھاپے کے پیچ کو اصلاح کے بعد ایسا بنا دیا گیا کہ سلیٹ کو تیزی کے ساتھ اوپر نیچے کرنا ممکن ہو گیا۔ بالآخر لکڑی کے چھاپوں کی جگہ دھات کے چھاپے نے لے لی۔ اب روٹری سلنڈر آ گئے جن میں حروف کی قطاریں حرکت کرتی تھیں۔

جوہان فسٹ اور اس کا خاندان یورپ کے پہلے پبلشر بن گئے۔ فسٹ نے بائبل کے چھپے ہوئے نسخے پیرس میں معمول سے پانچویں حصے کے برابر قیمت میں بیچ ڈالے۔ اس سے پیشہ ور نقل نویسوں میں کھلبلی مچ گئی۔ پندرھویں صدی کے آخر تک 35000 مختلف کتابوں کے تقریباً دو کروڑ نسخے چھاپے جا چکے تھے۔ گٹن برگ کی مہربانی سے اور اس کے بعد آنے والوں کی بہ دولت اب ہر شخص بائبل کا ایک نسخہ اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ چھاپے خانوں نے وہ مذہبی کتابچے چھاپے، جن سے پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکس دونوں کے طرف داروں کو ایک دوسرے کے خلاف مواد فراہم ہوتا رہا۔ ایک انگریز ولیم ٹائن ڈیل نے جو وٹن برگ میں مارٹن لوتھر سے مل چکا تھا، بائبل کا اپنا ترجمہ زبانِ انگریزی شائع کیا۔ بادشاہ ہنری ہشتم کو اس پر بہت غصہ آیا۔ اس نے ٹائن ڈیل کو الحاد کا مرتکب گردانا اور اسے سزائے موت دے دی۔ دو سال بعد ہنری نے بائبل کا انگریزی زبان میں اپنا ترجمہ شائع کیا۔ روم کے کلیسا سے نفاق کے بعد یہ اس کے اپنے اختیار کو سہارا دینے کی ایک کوشش تھی۔ بائبل کے پہلے صفحے پر اس نے اپنا نام اور اپنی تصویر شائع کی۔ سترھویں صدی کے یورپی باشندوں کے ایک گروہ نے جو مذہبی منافرت سے عاجز آ چکا تھا، اس قدرتی دنیا کا مطالعہ خود کرنا شروع کیا۔ پیری بائل کے سائنسی خبرنامے (Nouvelles de Rapublique de Letters) کی اشاعت 1684 میں شروع ہوئی۔

ڈاک کی سہولت چونکہ بہتر ہو چکی تھی، اس لیے مشترکہ دلچسپی کے حامل افراد کو آپس میں خط، کتابت کا موقع مل گیا۔ اس سے مطبوعہ خبرناموں اور عام دلچسپی کے اخباروں کی اشاعت شروع ہوگئی۔

یورپ میں مطبوعہ لٹریچر اور باعلم لوگوں کے درمیان خط، کتابت نے مذاہب اور قوموں کے درمیان رکاوٹیں توڑ دیں، چنانچہ ایک عالمی ری پبلک آف لیٹرز قائم ہوگئی۔ ہالینڈ کا ایک انسان دوست اراسمس راٹرڈیم کا رہنے والا تھا۔ چھپائی کی ٹیکنالوجی کا سب سے زیادہ فائدہ اسی نے اٹھایا۔ اس نے1516 میں عہد نامہ جدید کو لاطینی زبان میں چھاپا جو یونانی متن کا اصل ترجمہ تھا۔ اراسمس فی زمانہ اپنے ذہانت سے پُر تبصروں کے لیے مشہور ہے۔ والٹیئر کی طرح اس کے بھی پورے یورپ میں بہت دوست تھے۔ اس نے اپنے مراسم کی بہ دولت روشن خیالی اور مذہبی رواداری پھیلائی۔ مقامی زبانوں میں جب تیزی سے دلچسپی پیدا ہوئی تو درجہ اوّل کے قومی شاعر پیدا ہونے لگے، جیسے ولیم شیکسپیئر اور جان ملٹن جو کلاسیکی زبانوں میں ادب پیدا کرنے والوں کی ٹکر کے تخلیق کار تھے۔ مونٹین جیسے انشا نگاروں مولیئر جیسے ڈراما نویسوں اور ڈسکرٹیس یا وان لاک جیسے فلسفیوں نے چھاپے خانے میں پوشیدہ امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ فرانس کا نثری ادب سترھویں صدی کے دوران میں یورپ کے اندر ادبی کلچر کے لیے ایک مثال بن گیا۔ یہ تحریریں جامع اور فرحت بخش ہوتی تھیں، جن میں اصل موضوع کو اذیت ناک چرب زبانی اور ذیلی مصنوعات سے بچتے ہوئے سادہ فقروں میں بیان کر دیا جاتا تھا۔

چھپائی وہ آلہ بن گئی جس سے علم کو ڈیڈراٹ کی انسائیکلو پیڈیا میں سمونا اور سیموئیل جانسن کی انگریزی لغت میں مرتب کرنا ممکن ہوگیا۔ اس سے نئے سیاسی افکار کو پھیلانے میں بہت مدد ملی، جیسے ٹامس پین کی کتابCommon Sense، دی ڈکلیریشن آف انڈی پینڈینس The Declaration of independenceاور ڈیکلریشن آف دی رائٹس آف مین The Declaration of the rights of man۔ اس ٹیکنالوجی کا غالباً سب سے معقول استعمال اس کے ابتدائی زمانے میں ہوا، جب کسانوں، جہاز رانوں اور دیگر لوگوں کے لیے جنتریاں اور تقویم شائع ہونے لگیں۔ ان جنتریوں نے فصلوں کی کاشت یا سمندر میں آغازِ سفر سے پہلے نجوم پرمبنی شگون دینا شروع کیا۔ جگہ بھرنے کے لیے ان جنتریوں میں دوسری معلومات بھی ڈال

دی جاتی تھیں Poor Richards Almanac اپنے بھڑکیلے فقروں اور کامیاب زندگی کے بارے میں مشوروں کے لیے بہت مشہور ہوئی۔ شروع میں چھاپے والی دکانیں کتابوں کے علاوہ سرکاری اعلانات، جہازوں کے اندر مال داری کے محصول اور بندرگاہ میں لنگر انداز ہونے کے مصارف وغیرہ کی تفصیل شائع کرتی تھیں۔ مقبول عام گانے اور ہفت روزہ اخبارات ان کے علاوہ شائع ہوتے تھے۔ جرمنی میں مطبوعہ کتابوں کی اشاعت نے لوگوں کو یہ حوصلہ دیا کہ پنی سلوانیا چلے جائیں۔ ہینڈ بل، جن میں مصنوعات برائے فروخت کے اشتہار ہوتے، لوگوں کو اکساتے کہ گلیوں سے باہر نکلیں اور دکانوں پر آئیں۔ سیئرز کیٹلاگ (The Sears Catalog) 1896 میں شائع ہوا اور وہ سلائی مشینوں اور دیگر مصنوعات کی فروخت کے لیے اتنا مقبول ہوا کہ اس کے آگے جنرل سٹور اپنی موت آپ مر گئے۔ بہت سے امریکیوں نے خاص طور پر دیہاتیوں نے اس کتاب سے پڑھنا سیکھا۔

یورپ میں روزنامے پہلی بار اٹھارہویں صدی میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ انگلینڈ میں پہلے روزنامے دی ''ڈیلی کورنٹ'' نے 1702 میں اپنی اشاعت شروع کی۔ نوواؤ ویبسٹر مینورو 1793 میں نیویارک کا پہلا روزنامہ تھا۔ بہت سے ہفت روزے سیاسی پارٹیوں کے ترجمان تھے، تاہم ان کا مستقبل اخبارات کی کثیر الاشاعتی سے وابستہ تھا۔ سستی لکڑی کے گودے سے بنے ہوئے کاغذ پر اخبارات کی اشاعت کا آغاز 1860 کے عشرے میں ہوا، متن کے ساتھ تصویروں یا کارٹون کی اشاعت فوٹو انگریونگ، لیتھوگرافی اور اسٹیریوٹپکل پرنٹنگ سے ممکن ہوئی، جس سے قارئین کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ جوزف پولٹزر کے اخبار ''نیویارک ورلڈ'' نے اشاعت میں اضافے کی خاطر شہ سرخیوں کے لیے جلی حروف کا استعمال شروع کیا۔ اس کے علاوہ کومکس اور کھیلوں کے الگ گوشے بنائے اور اتوار کے ضمیمے کی اشاعت شروع کی۔ پرتشدد اور سنسنی خیز واقعات اخباری رپورٹنگ کی خاص خبر بن گئے۔ بجلی سے چلنے والی روٹری مشینوں میں ٹیکنالوجی کی بہ دولت تیز رفتاری آ گئی اور اخبارات کی تعدادِ اشاعت بڑھ گئی۔ اوتمار مارگنتھلر (Ottmar Mergnthaler) نے ایک لائنو ٹائپ سیٹنگ مشین بنائی جس میں ٹائپ رائٹر کی طرح ایک کی بورڈ ہوتا۔ یہ مشین 1886 ''نیویارک ٹریبیون'' میں نصب کی گئی تھی۔ ٹیلی ٹائپ پرنٹرز، برقی ذریعہ سے خبریں وصول کرنے لگے۔

فوٹوگرافی

تہذیبی ٹیکنالوجیز میں فوٹوگرافی وہ پہلی ایجاد تھی، جس نے الفاظ کی بجائے سرور انگیز تصاویر کو دوسروں تک پہنچایا۔ اس کی ابتدا ایک چھپے ہوئے کیمرے سے ہوئی۔ ایک تاریک کمرے میں یا ایک ڈبے کے اندر کی سطح پر ایک باریک سوراخ سے روشنی ڈالی جاتی تھی، جس سے ایک الٹی شباہت پیدا ہوتی تھی۔ گیو دنی بتستا ڈیلا پورٹا (Giovanni Bottista della Porta) نے اپنی کتاب میں، جو1553 میں شائع ہوئی، اس ٹیکنیک سے بحث کی ہے۔ جون ہنرک شُلز (Johann Heinrich Schulze) نے1727 میں دریافت کیا کہ سلور نائٹریٹ کے مرکب پر روشنی ڈالی جائے تو وہ کالا ہو جاتا ہے۔ سر ہمفری ڈیوی اور ٹامس ویج ڈو نے سلور نائٹریٹ میں ڈوبے ہوئے کاغذ پر اشیا کو رکھ کر جب اس پر روشنی ڈالی تو ان کے بیرونی خطوط (Silhouetles) نمایاں ہو گئے۔ فرانس کے ایک کیمسٹ جوزف نائسفور نے چھپے ہوئے کیمرے (Camera obscura) کی شباہتوں کو ایک شیشے پر جس پر سلور کلورائڈ کی ایک تہہ لگی ہوتی تھی، منتقل کرنے کے تجربات شروع کیے۔1816 میں اس نے کاغذ پر دنیا کا پہلا فوٹو گرافک نیگیٹو چھاپا، پھر دھات کی پلیٹ پر ایک پازیٹو تصویر چھاپی، نائسفور نے ایک اور فرانسیسی لوئی ڈاگر کی مدد سے اس عمل کو ترقی دی۔1833 میں اس کی وفات کے بعد ڈاگر نے سلور پلیٹ پر پازیٹو تصاویر اتارنے کا ایک اور طریقہ دریافت کیا۔ اس ایجاد سے نہایت کم خرچ پورٹریٹ بنانا ممکن ہو گیا۔

بلیک اینڈ وہائٹ (سیاہ اور سفید) فوٹوگرافی کا اصول یہ ہے کہ روشنی جس پلیٹ پر یا سلور برومائڈ لگے ہوئے کاغذ کی سطح پر ڈالی جاتی ہے، وہ اپنا عکس روشنی کی کیفیت کے مطابق چھوڑ جاتی ہے۔ پلیٹ پر جہاں روشنی نہیں پڑتی سلور برومائڈ کا ملمع باقی رہ جاتا ہے۔ جب سلور برومائڈ میں سوڈیم ملاتے ہیں تو نیگیٹو بنتا ہے، نیگیٹو فوٹوگرافی کے کاغذ پر منعکس کرتے ہیں تو پازیٹو بن جاتا ہے۔ اس طرح تصویر کے خطوط کو واضح کرنے کے لیے کیمرے کے اندر آنے والی روشنی کو مطلوبہ روشنی لینے کے بعد بند کر دیا جاتا ہے۔ شٹر کی رفتار اور اپرچر کی چوڑائی فلم کی ضرورت کے مطابق روشنی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ایسی فلم جو مختلف رنگوں کے سلسلے میں حساس ہوتی ہے، ایسے نیگیٹو بناتی ہے، جس سے رنگین پرنٹ نکالے جا سکتے ہیں۔

1840 کے عشرے میں ابتدائی فوٹوگرافی کے نمونے، پورٹریٹ کی صورت میں بہت مقبول ہوئے اور اس سے فوٹوگرافی کی ٹیکنیک بھی مقبول ہوئی۔ امریکا میں جو پہلی تصویر بنائی گئی، اس میں ''ایکسپوژر'' میں آدھے گھنٹا لگ گیا۔ بعد کے عشروں میں فوٹوگرافی کے فنی طریقوں میں بہتری پیدا ہوئی، زیادہ حساس ''کوٹنگ'' (ملمع) دریافت کیے گئے اور فوٹوگرافی کی پلیٹوں پر نم آلود کولوڈیم کا عمل آزمایا گیا۔

ڈیگر (Daguerre) کے ابتدائی فوٹوگرافی کے طریقے پر تصویریں بنانے والے فوٹو گرافر کشتیوں میں سوار ہو کر یا خاص طور پر آلات سے لیس گاڑیوں میں بیٹھ کر 1860 کے عشرے کے دوران میں جگہ جگہ جاتے اور پورٹریٹ بناتے تھے۔ میتھیو براڈی اور اس کے نائبین نے امریکا میں خانہ جنگی کے مناظر کی تصاویر بنائیں۔ جارج ایسٹ مین نے 1888 میں ایک رول فلم کو متعارف کرایا، جس کے مطابق کاغذ پر جلاٹین اور کیمیکلز کا ملمع لگاتے تھے۔ بعد میں کاغذ کا متبادل سلولائیڈ مل گیا جس سے موشن پکچر کی صنعت کے لیے فلمیں بنائی جانے لگیں۔ رنگین فلم پہلی بار 1930 کے عشرے میں بنائی گئی۔ 1938 میں پروفیسر ہیرالڈ ایڈگرٹن نے برقی فلیش ٹیوب ایجاد کی، جس نے فلیش پاؤڈر اور بلب کی جگہ لے لی۔ 1930 اور 1940 کے عشروں میں جب اخبارات نے خبروں کے ساتھ تصاویر کثرت کے ساتھ شائع کرنے شروع کیے تو فوٹوگرافی خبروں کی فراہمی کے پیشے پر حاوی ہوگئی۔

ٹیلی گراف

برقی ٹیلی گرافی سے ٹیلی مواصلات کے جدید زمانے کا آغاز ہوا۔ فرانس کے ماہر طبیعات آندرے میری ایمپرے کو پہلے برقی ذریعے سے پیغامات کی ترسیل کا خیال آیا۔ اس کی تحریروں سے ایک امریکی مصور اور فوٹوگرافی کے اولیں معمار سیموئل ایف بی مورس میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ ان خطوط پر تجربے کرے۔ مورس نے 1844 میں امریکی کانگریس کے ارکان کے سامنے برقی ٹیلی گراف کا عملی مظاہرہ کیا۔ اس نے واشنگٹن سے بالٹی مور یہ پیغام بھیجا۔ ''What hath God wrought''۔ (خدا نے کیا تعمیر کیا) یہ پیغام مورس کے کوڈ کے مطابق بھیجا گیا تھا، جس میں ہر حرف کے لیے نقطے ہوتے تھے اور طویل یا مختصر، چھن چھن کرتی آوازیں پیدا ہوتی تھیں، جو برقی سرکٹ کے عمل سے نکلتی ہیں۔ ٹیلی گراف کا انحصار ایک برقی

سرکٹ پر تھا جس میں ایک حصے کے لیے تانبے کا اکہرا تار استعمال ہوتا اور دوسرا ارتھ وائر ہوتا۔ جب بجلی تار سے گزرتی ہے تو ایک برقی مقناطیس ریسیور کے اندر اس کو متبادل انداز سے روکتی یا آگے لے جاتی ہے۔ تار کے ایک طرف کا یہ برقی عمل اس کے دوسرے سرے پر آواز بن کر سنائی دیتا ہے۔

مورس کی اس ایجاد نے انیسویں صدی میں ریلوے کے نظام کو فروغ دیا۔ ٹیلی گراف مشین کے ذریعے یہ ممکن ہو گیا کہ فوجی ہیڈ کوارٹرز سے بڑی بڑی فوجی کارروائیوں کے درمیان رابطہ قائم رکھا جائے۔ بعد کی توسیع میں یہ بھی ممکن ہو گیا کہ تار کے ذریعے بہت سی مختلف آوازوں کو بہ یک وقت ارسال کیا جائے۔1872 میں جے بی سٹرنس نے ''ڈپلیکس'' ٹیلی گرافی کا طریقہ ایجاد کیا، جس کے تحت تاروں کے ایک ہی سیٹ کے ذریعے دو آوازوں کی ترسیل ممکن ہو گئی۔ ٹامس ایڈیسن کی پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا ایک ٹیلی گراف آپریٹر کے طور پر ہوئی۔ اس نے1874 میں ایک ''چہار گونہ'' طریقہ دریافت کیا۔ اب سوراخ دار کاغذ کی پٹیوں کے ذریعے خود کار ٹیلی گرافی دست یاب ہو گئی۔1866 میں شمالی بحر اٹلانٹک میں ایک تار جس کے ذریعے پیغام رسانی ممکن تھی، بچھایا گیا۔1902 تک تار کے کیبل جو اولاً برطانیہ کے پاس تھے، بحر الکاہل سے لے کر دنیا کے تمام سمندروں کے درمیان جال کی طرح پھیل گئے۔ پھر اچانک تار پر چلنے والی یہ ٹیکنیک اہمیت کھو بیٹھی، کیوں کہ اب ریڈیو کے ذریعے پیغام رسانی کا طریقہ آ گیا تھا۔

ٹیلی فون

ٹیلی گراف، تصویری تحریر کی طرح وہ طریقہ تھا، جسے مخصوص کوڈ کے ذریعے ماہروں نے سیکھا تھا۔ دوسری تہذیبی دریافت ٹیلیفون تھا۔ یہ حروف کی تحریر کی طرح تھا۔ یہ ایک مقبول ذریعۂ اظہار بن گیا۔ کیوں کہ اس کے پیغامات گفت گو کی زبان کے تحت ادا ہوتے تھے۔ ٹیلی فون کا موجد الیگزینڈر بل کو قرار دیا جاتا ہے۔ وہ سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا تھا اور بوسٹن کے قیام میں بہرے کا استاد تھا۔ تاہم اس زمانے میں یلشا گرے نے بھی ویسا ہی طریقہ ایجاد کیا۔ بل ایک پرانی ڈھب کی ورکشاپ میں ایک روز اپنے تجربے پر کام کر رہا تھا، جب اس کے کپڑوں پر سلفرک ایسڈ گر کر پھیل گیا، اس نے تہہ خانے میں مصروفِ کار اپنے نائب کو آواز دی۔ ''مسٹر

واٹسن ادھر آؤ۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔'' واٹسن نے بل کی آواز تار سے آتی ہوئی سنی۔ وہ ایک ہیجانی کیفیت میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا، یہ خبر دینے کے لیے اوپر پہنچا۔ بعد میں اسی سال بیل نے فلوڈلفیا کی صد سالہ نمائش میں اپنی ایجاد کو جسے اس نے ''بولتا ہوا تار'' کہا تھا، پیش کیا۔ برازیل کا بادشاہ گروم پیڈرو بل کی اس ایجاد کو دیکھنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب بل نے ٹرانسمیٹر میں بولنا شروع کیا تو بادشاہ نے تار کے دوسرے سرے پر وہ آوازی سنی۔ بادشاہ نے حیران ہو کر کہا ''خدایا یہ تو بولتا ہے۔'' نمائش میں بل کی پیش کش کی دھوم مچ گئی۔

اس اصول کے تحت کہ انسانی آواز سے جو لہریں پیدا ہوتی ہیں، ان سے ایک برقی رو نکلتی ہے، جس میں سمعی اور صوتی خصوصیات ہوتی ہیں، ٹیلی فون کام کرتا ہے۔ بل کی ایجاد میں ایک ڈایا فرام (diaphragm) جو نرم لوہے کی ایک پتلی سی پلیٹ تھی، شامل تھی، اور کانوں کے پردوں کے قریب لہریں پیدا کرتی تھی۔ آواز کی یہ تھرتھراہٹ قریب ہی لگے ہوئے ایک لمبی برقی سلاخ سے لپٹے ہوئے تاروں میں برقی لہر پیدا کرتی۔ ایک ریسیور جو دوسرے سرے پر نصب ہوتا ان برقی اشاروں کو پا لیتا اور ایک معکوس عمل کے ذریعے انہیں آواز میں تبدیل کر دیتا۔ اس طریقے سے جو لہر موصول ہوتی، وہ ایک مقناطیسی عمل پیدا کرتی اور ڈایا فرام میں اس طرح لہریں پیدا کرتی، جو ٹرانسمیٹر میں پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح وہی آواز سنی جا سکتی ہے، جو دوسرے سرے پر بولی گئی تھی۔ تھامس ایڈیسن اور دیگر دو امریکیوں نے ایک سال کے اندر ایک بہتر ٹرانسمیٹر تیار کر لیا، جو برقی سلاخ کا محتاج نہ رہا، اب اس میں کاربن کے دانے رکھے جاتے تھے۔

آج امریکا کے تین چوتھائی گھرانوں میں ٹیلی فون موجود ہیں، سوئچ بورڈ پر عمل بہت حد تک خودکار ہو گیا تھا۔ ٹیلی فون کی لائنیں آواز کے سگنل سے بھی زیادہ کام کرتی ہیں۔ کمپیوٹر سے اعداد و شمار، انہی لائنوں کے ذریعے ڈور لگے ہوئے کمپیوٹروں تک پہنچ جاتے ہیں۔ لکھی ہوئی تحریریں فیکس مشینوں کے ذریعے منتقل ہوتی ہیں۔ ویڈیو ٹیلی فون کا دور آیا ہی چاہتا ہے۔ مواصلاتی کمپنیوں نے گزشتہ بیس برس کے اندر فائبر آپٹک کیبل ساحل تا ساحل بچھا دیے ہیں تاکہ صارفین کے بڑھتے ہوئے مطالبے اشکال کی ترسیل کے حوالے سے پورے کر سکیں۔ گلاس فائبر کے ذریعے دھات کے تاروں کے مقابلے میں اور روشنی کے سگنل کی صورت میں زیادہ مستعدی کے ساتھ پیغام رسانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فائبر کے ہر ایک بل کے ساتھ روشنی

کی ترسیل نے جس کے ویولنتھ کے درمیان قریبی فاصلہ ہوتا ہے اس امر کو ممکن بنا دیا کہ پیغامات بہت سے چینلز کو ارسال کیے جائیں، جسے اس کی کارکردگی بڑھ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ویو بینڈ کو سیلولر فون، پیجر اور ذاتی مواصلت کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور یہ وائرلیس کی نئی ٹیکنالوجی کی یہ دولت ممکن ہوا۔ اب کوئی کہیں بھی کال وصول کر سکتا ہے اور پیغام بھیج سکتا ہے۔ ایک ٹیلی فون سروس کو کمپیوٹر اور سیٹلائیٹ ٹرانسمشن سے جوڑ دیا گیا ہے اور مواصلات کے ماہروں کا قول ہے کہ ''مستقبل میں تمام راستے ٹیلی فون کی طرف ہی جاتے ہیں۔''

ساؤنڈ ریکارڈنگ

تھامس ایڈیسن امریکا کا مشہور ترین موجد تھا۔ اس نے 1877 میں پہلی فوٹو گراف مشین بنائی۔ ایک نائب کے ساتھ ایڈیسن گا رہا تھا۔ ''میری ہیڈ اے لِٹل لیمب''۔ اس کے گانے کی بلند آواز ایک گھومتی ہوئی مشین میں جا رہی تھی، جو ایک ٹن فوائل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کی آواز ایک سوئی کو حرکت دے رہی تھی جو سلنڈر میں پیوست تھی، اور جو ٹن فوائل کی نالی میں تھرتھراہٹ پیدا کر رہی تھی، کٹی ہوئی نالیاں اس وقت اصل آواز پیدا کرنے لگیں جب اس کے گردش کرتے ہوئے سلنڈر میں سوئی لگائی گئی۔ ایک اور موجد ایملی برلائز نے 1888 میں فونو گراف میں ایک ترمیم شدہ قسم پیش کی، جسے اس نے گراموفون کا نام دیا۔ یہ ایک چپٹی تھالی تھی، جس میں یکساں گہرائی والی گھومتی نالیاں بنی تھیں۔ اس کے پہلو میں دوسری نالیاں بھی تھیں۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ ایک ہی قالب سے لاتعداد کاپیاں نکالی جا سکتی تھیں۔ برلائز نے اپنے گراموفون ریکارڈ ایک بل آرڈر کیٹلاگ کے ذریعے بیچ دیے۔ 1895 میں اس کے پاس کیٹلاگ میں ایک سو مختلف ڈسک موجود تھے۔ ہر ایک میں جان فلپ سوسا کے مارچ یا موسیقی کے آپیرا سے چار چار منٹ کی ریکارڈنگ کی گئی تھی۔ اس میں حرکت وسکون کے عمل محدود تھے اور آواز غلطیوں سے پر۔ اس طرح کا ریکارڈ ایک گراموفون کی تھالی پر چلتا تھا جس میں سپرنگ لگی ہوتی تھی اور وہ ہر مرتبہ موٹر سے چلتا تھا اور ہر مرتبہ اسے گھمانا پڑتا تھا۔ لکڑی یا سٹیل کی سوئیاں اس کی نالیوں میں گردش کرتی تھیں۔

ساؤنڈ ریکارڈنگ 1890 کے عشرے میں سرراہ دکانوں کے اندر گاہکوں کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایڈیسن نے ایک مشین بنائیں جو سکے سے چلتی تھی۔ کھیل کے ایک

دورانیے کے لیے ایک پنی لگتی تھی۔ برقی ریکارڈ پلیئر سے ریکارڈنگ کی سہولت بہتر ہوگئی اور آواز بھی صاف آنے لگی۔ آلے میں لگے ہوئے بلور کے ایک ٹکڑے سے مشین میں تموج پیدا ہوتا اور اسے وولٹیج میں بدل دیتا جو ایک سمعی ایمپلی فائر میں منتقل ہو جاتا۔ فونوگراف سے نکلتی ہوئی آواز میں برقی لہروں میں بدل جاتیں، جس سے دوبارہ آواز پیدا ہوتی۔ ایک خودکار ریکارڈ چینجر بنایا گیا اور ریکارڈنگ بہتر کی گئی۔ فونوگراف ریکارڈز کی بڑھتی ہوئی تعداد صارفین میں ہاتھوں ہاتھ بکتی گئی جس سے موسیقی میں عام لوگوں کی دلچسپی اور اس زمانے کے قرینوں کا اندازہ ہوا۔ 1930 کے عشرے میں شراب خانوں اور ریستورانوں میں جیوک باکس رکھے ہوئے تھے، جو بہت مقبول ہوئے۔ پھر یہ ہوا کہ سب سے زیادہ مقبول چالیس ریکارڈ شدہ گانے ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں میں شوکیس کے اندر سجا دیے گئے۔ 70 آر پی ایم ریکارڈ کی جگہ 45 آر پی ایم ریکارڈ آ گئے، جن میں گانوں کا دوطرفہ دورانیہ بڑھ گیا اور ان میں منتخب گانوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ ریکارڈ شدہ موسیقی تیز رفتار زندگی کا جزوِ لازم اور جواں سال امریکی طرزِ حیات کا خاصہ بن گئی۔

اس عرصے میں کہ زیادہ تعداد میں ساؤنڈ ریکارڈ ٹیپ پر منتقل کیے جا رہے تھے۔ ٹیکنالوجی برابر بول رہی تھی۔ ٹیپ ریکارڈنگ کی ٹیکنالوجی 1898 میں والڈمار پولسن (Valdemar Poulsen) کی دریافت کے ساتھ شروع ہوئی۔ وہ ڈنمارک کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنے تجربے سے یہ دیکھا کہ ایک فولادی تار کو جب ایک مقناطیسی تاروں کے لچھے سے گزارتے ہیں جس میں آواز کی برقی لہریں پیدا ہوئی تھی، تو تار کے اندر مقناطیسیت جزوی طور پر برقرار رہتی ہے۔ اس طرح پولسن نے ایک آلہ ''ٹیلی گرافون'' بنایا، تا کہ مقناطیسی آوازوں کو گرفت میں لے کر اسے دوبارہ ادا کیا جا سکے۔ جرمنی کی کیمیکل کمپنیوں آئی جی فارین اور اے ای جی نے 1930 کے عشرے میں مقناطیسی ٹیپ ایجاد کیے جو تار کے مقابلے میں زیادہ صاف آواز دیتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکی سائنس دانوں نے ان کے چند مقناطیسی فون (Magnetophones) اپنے قبضے میں لے لیے اور اس کی ٹیکنالوجی کا مطالعہ کیا، اس طرح انہیں جو علم حاصل ہوا، اس کی مدد سے انہوں نے کمرشل ریڈیو سٹیشنوں کو فروخت کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر بنائے، لیکن صارفین میں اس کی خریداری کے لیے ابھی تیزی نہیں آئی تھی، یہاں تک کہ 1960 کے عشرے میں ٹیپ، خانوں میں اور کیسٹ کی صورت میں دست یاب

ہونے لگے۔ فلیس الیکٹرانکس این ری نے 1963 میں کیسٹ ٹیپ پلیئر تیار کر دیا۔ 8 ٹریک والے کیسٹ پلیئر مقبول ہو گئے۔ حالیہ برسوں میں ٹیپ پر مبنی ٹیکنالوجی نے کمپیکٹ ڈسکس (Compact discs) کی راہ کھول دی ہے، جس میں ریکارڈنگ اعداد (Digits) کے حساب سے ہوتی ہے۔

موشن پکچرز۔ متحرک تصویریں

متحرک تصویروں کی ایجاد کا سہرا تھامس ایڈیسن کے سر باندھا جاتا ہے۔ اس ٹیکنالوجی کو ایڈیسن نے فوٹوگرافی کی توسیع قرار دیا۔ سینما کی فلم دراصل اس سے زیادہ کچھ اور ہے بھی نہیں کہ جامد تصویروں کو اس طرح ترتیب سے لگاتے ہیں کہ ان کے یکے بعد دیگرے حرکت سے رفتار کا گمان ہوتا ہے۔ پیٹر مارک روگیٹ جس نے روگیٹ تھیسارس لکھی، 1824 میں ایک مقالہ اس مضمون کا تحریر کیا کہ ایک منظر کے بصری تاثرات اس کے بدل جانے کے باوجود برقرار رہتے ہیں۔ اگر متعدد تصویروں کو یکے بعد دیگرے تیزی سے دکھایا جائے تو وہ ایک ہی تصویر میں جڑی ہوئی معلوم ہوں گی اور وہ تصویر مسلسل حرکت کرتی نظر آئے گی۔ بہت سے فوٹوگرافروں نے انیسویں صدی کے دوران میں اس کا تجربہ کیا۔ ایڈورڈ مے برج اور جے ڈی آئزک نے ان کیمروں کے ساتھ جنھیں برقی شٹر کنٹرول کرتے تھے، ریس کے گھوڑوں کی تصویریں بنائیں، بعد میں ان تصویروں کو جب حرکت کرتی ہوئی ایک ڈسک پر لگایا گیا تو گھوڑے دوڑتے ہوئے نظر آتے۔ اس اصول پر مبنی اسطوانے کی شکل کا بصری کھلونا کئی سال تک بہت مقبول رہا۔ مے برج نے انسانوں اور حرکت کرتے ہوئے جانوروں کا فوٹوگرافی کی نظر سے جو مطالعہ کیا، ممکن ہے، وہی ایڈیسن کے تجربات کا محرک تھا جو اس کے نائب ولیم ڈکسن نے متحرک تصویروں کے حوالے سے کیے۔

ایڈیسن نے جو آلہ 1888 میں ایجاد کیا اس میں ایک بڑا سا ڈبہ شامل تھا، جس کے اندر ایک پردہ لگا ہوتا۔ جامد تصویریں پردے کے پیچھے گھومتے ہوئے ایک سلنڈر کے ساتھ لگا دی جاتی تھیں۔ تماشائی ایک باریک سوراخ کے اندر سے گھومتی ہوئی چیزوں کو دیکھتا تھا۔ ایڈیسن کی اس ایجاد کا مظاہرہ ابتدا میں سرراہ دکانوں کے اندر سیر بین کے ذریعے ہوتا رہا۔ وقفوں کے دوران میں اس کی فلمیں بھی دکھائی جاتیں۔ 1893 میں ایڈیسن نے ایک نئی مشین

بنائی، جس میں سلولائیڈ کی فلم استعمال ہوتی تھی۔ پھر تو کائن ٹوسکوپ (Kinetoscope) کی بیٹھکیں کھل گئیں، جن میں صرف یہی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ دوسرے ہی برس اوٹاوہ نیویارک سٹی اور دوسرے شہروں میں ان کی نمائش ہونے لگی۔ تماشائی ایک نکل کے عوض پچاس فیٹ کی فلم جس کا دورانیہ تیرہ سیکنڈ ہوتا، دیکھ کر لطف اندوز ہوتا۔ بہت سے موجدوں نے انہی تصویروں کو باہر کے پردے پر دکھانے کا راستہ نکال لیا۔ نیویارک میں لاتھم خاندان نے1895 میں پردے پر تصویری نمائش کا ایک طریقہ ریڈولوسکوپ (Ridoloscope) کے نام سے دریافت کرلیا۔ اس کے سات ماہ بعد آگسٹے اور لوئی لیمرے نے پیرس کے ناظرین کو اپنی پہلی فلم ایک ترمیم شدہ پروجیکٹر کی مدد سے دکھائی، جس کا نام سنیماٹوگرافی (Cinematographe) تھا۔ چند ہی ہفتوں کے اندر لیمرے برادران کے اس نئی طرح کی تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک ایک رات میں ڈھائی ہزار افراد آنے لگے۔

ابتدائی فلمیں محض حرکت کرتی ہوئی اشیا کی نمائش تھی۔ نیو جرسی میں ویسٹ اورنج کے مقام پر جہاں ایڈیسن کا اسٹوڈیو تھا، سیر بین کی نمائش شروع ہوئی۔ اس کے کھیل کا نام "Fred Ott's Sneeze" تھا۔ لیمرے برادران نے جو فلم دکھائی اس میں گھڑسوار بچے دوڑ لگا رہے تھے۔ مزدور مشین پر اپنے کارڈ پنچ کر رہے تھے اور ایک ٹرین ریلوے اسٹیشن میں داخل ہورہی تھی۔ ایک ہی غیر متحرک کیمرہ تھا جس نے براہِ راست دن کی روشنی میں وہ بیرونی مناظر فلم بند کیے تھے،۔ نئی صدی کے آنے تک فلم سازوں نے اس نئے ذریعہ اظہار میں ڈرامے کے قوی امکانات پر تجربہ کرنا شروع کر دیا۔ فرانس کے ایک ڈائریکٹر جارج میلیز نے پہلی بار ایک کہانی کے خطوط پر موشن پکچر بنائی۔ اپنی فلم "سنڈریلا اور چاند کا سفر" میں انہوں نے فوٹو گرافی کی چابک دستی سے کام لیا۔ ایڈون ایس پورٹر نے1903 میں اپنی فلم "دی گریٹ ٹرین رابری" (ٹرین میں زبردست ڈاکہ) بنائی برونکو بلی اینڈرسن نے اس میں کام کیا تھا۔ اس فلم میں نہ صرف یہ کہ ایڈیٹنگ کی بہت ترقی یافتہ ٹیکنیک استعمال کی گئی تھی بلکہ پہلی بار اس فلم میں ایک اداکار کو "سٹار" تسلیم کیا گیا۔1908 میں آزاد فلم سازوں کے ایک گروہ نے جنوبی کیلیفورنیا میں اپنا کام شروع کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کمپنیوں پر مشتمل ایک انجمن نے، جسے اس ٹیکنالوجی کے پیٹنٹ حقوق حاصل ہو گئے تھے اس امر کی کوشش کی تھی کہ غیر لائسنس یافتہ کمپنیوں کو اس کاروبار سے باہر نکال دیا جائے۔ فلم بنانے والے جن کے پاس لائسنس نہیں

تھے میکسیکو کی سرحد کے قریب رہ کر کام کرنا چاہتے تھے تاکہ امریکی عدالت ان پر پابندی لگائے تو بچ سکیں۔

خاموش فلموں کے دور میں نام وَر اداکاروں کی ایک بہت بڑی کھیپ تیار ہوگئی تھی، جن میں چارلی چپلن بھی شامل تھا۔ دوسرے نام وَر اداکار میری پک فورڈ اور جان بیری مور تھے۔1908 تک اداکار، ڈائریکٹر، کیمرہ آپریٹر، سکرین رائٹر اور لیبارٹری میں کام کرنے والے ٹیکنیشن میں سے ہر ایک کے جدا جدا کام متعین ہو گئے تھے۔ فلم بندی روشن اسٹوڈیوز میں نہیں ہوتی تھی۔ متحرک کارٹون، جو پہلی بار1906 میں بنائے گئے تھے، اس کے بعد کے عشروں میں بہت مقبول ہوئے۔ فلموں میں رنگ آمیزی ہاتھ سے ہونے لگی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں جو تجربے ہوئے، اس میں بصری مناظر کے ساتھ آواز کو بھی شامل کر لیا گیا۔ آواز کو روشنی میں بدل کر جو فلم میں ریکارڈ کی جاتی تھی، منظر کے ساتھ آواز کو جوڑنا ممکن ہو گیا۔ ''دی جاز برادرز'' وارنر برادرز کی پہلی ''بولتی فلم'' تھی جس کی نمائش نیویارک سٹی میں اکتوبر1927 میں ہوئی۔ اس کے دوسرے ہی سال والٹ ڈزنی کی بولتی کارٹون فلم جس میں ''مکی ماؤس'' کو پیش کیا گیا تھا، دکھائی گئی۔ فلم کا نام سٹیم بوٹ ولی تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ دو سال کے اندر تقریباً سبھی بڑے بڑے سٹوڈیوز کو بولتی فلموں میں تبدیل کر دیا گیا۔1930 اور1940 کے عشرے کے سال ہالی وڈ میں فلم سازی کے زریں زمانے تھے۔ بڑے بڑے سٹوڈیوز مثلاً ایم جی ایم، وارنر برادرز، پیراماؤنٹ پکچرز اور یونیورسل تماشائیوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر ایک تسلسل کے ساتھ فلمیں بنا رہے تھے۔ چونکہ فونوگراف ریکارڈ کی جگہ ٹیپ ریکارڈنگ اور کمپیکٹ ڈسک نے لے لی تھی، لہٰذا حرکت کرتی ہوئی بصری تصویروں کے لیے وڈیو ٹیپ کا استعمال بڑھ گیا۔ اولیں وڈیو ٹیپ ریکارڈز1950 کے عشرے میں سامنے آئے تھے۔ ایمپکس کارپوریشن نے1956 میں انہیں ٹیلی وژن سٹیشنوں کو فروخت کرنا شروع کیا۔ جب سونی نے بیٹامکس مشین متعارف کرائی تو1976 میں کنزیومر وڈیو کیسٹ ریکارڈر (وی سی آر) بھی آ گئے۔ ایک ٹیلی وژن سیٹ کو شامل کر کے اس کی قیمت دو ہزار ڈالر تھی۔ جب بیٹامکس اور وی ایچ ایس میں مقابلے کی دوڑ شروع ہوگئی تو ان کی قیمتیں گر گئیں۔ تاہم وی سی آر کی مقبولیت بڑھ گئی۔1983 میں ڈزنی اور ایم سی آئی نے سونی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا کہ ٹیلی وژن شو کے ٹیپ کو گھروں کے لیے چلا کر اس نے ان کے کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کی ہے۔ امریکا کی سپریم کورٹ نے اس کا تصفیہ کر

دیا۔ سونی کے حق میں اس عدالتی فیصلے سے ان کا کام اور بڑھ گیا اور وی سی آر کی فروخت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ جب فلم پروڈیوسر وڈیو ٹیپ ریکارڈنگ کے سلسلے کو روکنے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنی ہی فلموں کی نقول تقسیم کرنے کے لیے الگ کھول شعبے کھول دیے۔ اب ایک نئی صنعت وجود میں آ گئی، جس کے تحت وڈیو گھروں میں نمائش کے لیے افراد کو فروخت کیے جاتے یا کرائے پر دیے جاتے۔

ریڈیو

ریڈیو ایک برقی آلہ ہے، جو برقی مقناطیسی لہروں سے سمعی اشارے وصول کرتا ہے۔ کمرشل ریڈیو 550 اور 1600 کلو سائیکل فی سیکنڈ کے درمیان، ان لہروں کو استعمال کرتے ہیں۔ ایک مائیکروفون، ریڈیو سگنلز دینے کے لیے آواز کی لہروں کو برقی تحرک میں تبدیل کرتا ہے، پھر ایک سرکٹ کے ذریعے یہ معتدل لہریں ٹرانسمیٹر میں جاتی ہیں۔ یہ لہریں ایک بار پھر ایمپلی فائر سے گزر کر ایک انٹینا کو جاتی ہیں جو انہیں برقی مقناطیسی لہروں میں تبدیل کر کے خلا میں پہنچا دیتا ہے۔ ٹرانسمیشن کے دوسرے سرے پر انٹینا جو ریڈیو ریسیور سے لگا ہوتا ہے، خلا سے پلٹ کر آنے والی چند لہروں کو پکڑ لیتا ہے۔ اگر ریسیور اسی فریکوئنسی سے میل کھاتا ہو جو فریکوئنسی لہروں کی ہے، تو سگنل اسے لے لے گا اور انہیں ایک لاؤڈ اسپیکر کو پہنچا دے گا جو اس کی برقی لہروں کو آواز میں بدل دے گا۔

سکاٹ لینڈ کے ایک ماہر طبیعات جیمس کلرک میکس ول نے 1883 میں ایک مقالہ شائع کیا، جس میں ریاضی کے کچھ مساوی پیمانے درج تھے اور برقی مقناطیسی لہروں کا بھی حوالہ درج ہے۔ پندرہ سال بعد ہنرک برز نے ریڈیو کی لہریں پیدا کرنے کا ایک طریقہ نکالا۔ گوگیلیمو مارکونی (Gulielmo Marconi) نے 1895 میں ریڈیو سے پیغام رسانی کا پہلا عملی مظاہرہ کیا۔ اس نے ہنرز کے سپارک کوائل کو مورس کوڈ میں حرف "S" کی ترسیل کے لیے استعمال کیا اور ایک زیادہ صاف سنائی دینے والا آلہ جسے ایڈورڈ نے ایجاد کیا تھا، ایک میل دور سے آنے والے پیغام کے لیے استعمال کیا۔ وہ مقام اٹلی میں بولوگنا کے قریب اس کی خاندانی ریاست سے فاصلے پر تھی۔ مارکونی اپنے آلے کو بہتر بنانے کے لیے منہمک رہا، یہاں تک کہ وہ 1901 میں اپنا پیغام بحر اٹلانٹک سے آگے لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ تین سال بعد سر جان اے

فلیمنگ نے پہلا ویکوم ٹیوب تیار کیا، جو برقی ذریعے سے ریڈیو کی لہروں کو پہچان لے۔ لی ڈی فارسٹ کا آڈین ٹیوب جس میں ایک تار نائیلامنٹ اور پلیٹ کے درمیان لگا ہوتا تھا، اس نے برقی اشارات کی قوت کو بڑھایا۔ ایڈون آرم سٹرانگ نے اپنے سرکٹ کو دوبارہ لہریں پیدا کرنے والے ریسیور کے لیے جو آڈین کی ایجاد سے بہتر تھا، پیٹنٹ کرا لیا۔ آرم سٹرانگ کی دوسری اہم ایجاد برقی لہریں وصول کرنے والا ایک ریسیور تھا، جو موصول ہونے والے پیغامات کو مخصوص دورانیوں کے اندر سماعت کے قابل بناتا تھا۔

ریڈیو، ابتدا میں بیس سال تک تو شوقیہ استعمال کرنے والوں کے لیے ایک کھلونا تھا، سمندر میں جہازوں سے آنے والے پریشان کن سگنل کو وہ بہ آسانی پہچان لیتا تھا اور وائرلیس آپریٹر کے طور پر ڈیوڈ سرنوف نے بہت شہرت پائی جس نے ٹائی ٹانک سے تار برقی کے پیغامات وصول کر لیے تھے۔ ایک شوقیہ ریڈیو سٹیشن چلانے والے ایک شخص فرینک کونراڈ نے، کہ پٹسبرگ کا باشندہ تھا، اپنے ساتھی آپریٹروں کو ریکارڈ شدہ گانے اور بیس بال کے نمبر سناتا اور بتاتا رہا۔ ایک مقامی سٹور کے مالک نے مفت ریکارڈ مہیا کرنے کی پیش کش کی۔ شرط یہ تھی کہ اس کے عوض براڈکاسٹ میں اس کا نام لیا جائے۔ جب پیٹسبرگ کے ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور نے اخبار میں ایک ریڈیو ریسیور فروخت کرنے کا اشتہار دیا تو ویسٹنگ ہاؤس کے نائب صدر کو ایک اچھے کاروبار کا موقع مل گیا کہ ریڈیو ریسیور بناؤ اور فروخت کرو۔ ویسٹنگ ہاؤس کے کرسٹل ریڈیو سیٹ ''کیٹس وِسپر'' کے نام سے موسوم 25 ڈالر میں فروخت ہو رہے تھے۔ اپنے مال کی مانگ بڑھانے کے لیے کمپنی نے دنیا کا پہلا ریڈیو سٹیشن پیٹسبرگ میں قائم کیا جس کا نام KDKA تھا۔ اس سٹیشن نے 2 نومبر 1920 کو اپنی باقاعدہ نشریات کا آغاز کیا، جس کی ابتدا اس سال کے قومی انتخابات کے نتائج کی رپورٹ تھی۔ مارکونی وائرلیس کمپنی کی جانشین ریڈیو کارپوریشن آف امریکا (RCA) 1921 میں قائم ہوئی۔ اس نے ریڈیو ریسیور کی فروخت شروع کی۔ RCA نے 1926 میں پہلا ریڈیو نیٹ ورک قائم کیا، نام اس کا نیشنل براڈکاسٹنگ کمپنی تھا۔

کمرشل ریڈیو کے تین عظیم معمار لی ڈی فارسٹ، ایڈون ایچ آرم سٹرانگ اور ڈیوڈ سرنوف تھے، ان کا آپس میں تنازعہ لگا رہتا تھا اور ایک دوسرے کے خلاف عدالتی کارروائی کرتے رہتے تھے۔ ڈی فارسٹ نے آرم سٹرانگ پر 1915 میں پیٹنٹ کی خلاف ورزی کا

مقدمہ دائر کر دیا۔ پھر بیس سال بعد مقدمہ جیت لیا۔ ڈیوڈ سرنوف آر سی اے میں جنرل منیجر تھا۔ وہ آرم سٹرانگ کی ابتدائی اختراعات کا بڑا حامی تھا، بعد میں اس کا سب سے بڑا مخالف ہوگیا۔ آرم سٹرانگ نے نشریات کے مسائل سے نمٹنے کے لیے آٹھ سال کے اندر ایک ریڈیو سسٹم بنالیا، جس کے سگنلز کی بنیاد فریکوئنسی ماڈولیشن (آواز کی حاصل لہروں کے اتار چڑھاؤ) پر تھی، نہ کہ ایمپلی چیوڈ ماڈولیشن (لہروں کے انتہائی پھیلاؤ) پر۔ نیویارک سٹی میں ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ پر ایک تجربہ گاہ بنائی، جہاں اس نے1933 میں اپنا منصوبہ مکمل کر لیا۔ آرم سٹرانگ نے ایف ایم براڈ کاسٹنگ کے لیے اپنا ''یانکی نیٹ ورک'' قائم کر لیا۔ سرنوف اپنے لاکھوں اے ایم ریڈیو سیٹ گنوانا نہیں چاہتا تھا، چنانچہ اس نے آرم سٹرانگ کو وہاں سے نکلوا دیا۔ ہرنوف نے وفاقی کمیونی کیشن کمیشن میں اپنے ہم خیال پیدا کیے تاکہ ایف ایم کی فریکوئنسی کو ایک نئی دریافت ٹیلی وژن سے جوڑ دیا جائے۔ ابھی اس کی کمپنی بتدریج آگے بڑھ رہی تھی کہ آرم سٹرانگ نے1954 میں اپنے اپارٹمنٹ کی تیرھویں منزل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

ٹیلی وژن

ٹیلی وژن کی ٹیکنالوجی یہ ہے کہ وہ سمعی اور بصری دونوں اشکال، برقی مقناطیسی لہروں کے ذریعے خلا تک لے جاتا ہے۔ ٹیلی وژن کی لہریں54 سے216 میگا سائیکل فی سیکنڈ اور470 تا590 میگا سائیکل فی سیکنڈ کے حساب سے فریکوئنسی میں پھیلتی ہیں۔ برقی مقناطیسی وسعتوں میں اس کی ویولنتھ سب سے زیادہ ہے۔ تصویر حاصل کرنے کے لیے ایک برقی سکینر (جائزہ کار آلے) کو ایک پلیٹ سے گزارتے ہیں، پلیٹ پر فوٹو کا عکس لینے والا مادہ لگا ہوتا ہے، جو آڑے ترچھے حرکت کرتا ہے اور ایک سیکنڈ کے تیسویں حصے کے برابر وقت میں525 لائنوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس پلیٹ میں ایک باریک سی ابرق کی پرت لگی ہوتی ہے۔ اس پر سلیشیم کا مرکب دھات کے کنڈکٹر کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ اس موزیک پر روشنی خلیوں سے ٹکراتی ہے اور یوں ہر خلیے سے الیکٹرون پیدا ہوتی ہے، جو پازیٹو ہوتی ہے۔ سکینر اپنی سلاخ سے گزرتے ہوئے خلیوں سے گزرتی ہے اور برقی سگنل دیتی ہے۔ یہ سگنل ایک ایمپلی فائر سے گزر کر لہروں تک پہنچ جاتا ہے۔ ٹیلی وژن کے ریسیور میں لگا ہوا انٹینا ان نشریاتی سگنلز کو پا لیتا ہے۔ ایک سیکنڈ میں تیس تصویریں پردے پر تیزی سے گزرتی جاتی ہیں اور دیکھنے والی آنکھوں کو

متحرک تصویروں کا گمان ہوتا ہے۔

آئرلینڈ کا ایک ٹیلی گراف آپریٹر جوزف مے تھا، اس نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ سلینیئم (ایک دھات) سے بنے ہوئے پرزوں کی برقی مدافعت سورج کی روشنی سے متاثر ہوتی ہے۔1861 کی اس دریافت کے نتیجے میں سلینیئم کی برقی ایصالی قوت پر تجربے کیے گئے۔ایک جرمن موجد پال نپکوف کے1884 میں ایک پیٹنٹ سلینیئم کی اساس پر بنے ہوئے ایک ٹیلی وژن کا جس کے ساتھ ایک مکینکل سکینر لگا ہوتا تھا، دست یاب ہو گیا۔ اس میں ٹرانسمیشن کے دونوں طرف سوراخ دار طشتریاں لگی ہوتی تھیں جو برابر کی رفتار سے گھومتی تھیں، ان کے حرکت کرتے ہوئے سوراخوں سے روشنی گزر کر سلینیئم کے خلیوں سے ٹکراتی اور برقی سگنلز میں بدل جاتی۔ دوسرے سرے پر لگی ہوئی طشتری بجلی سے دوبارہ روشنی پیدا کرتی، جسے خُردبین سے دیکھا جا سکتا تھا۔ کارل فرڈینیڈ بران نے1897 میں ٹھنڈی کیتھوڈ رے (ایک خلادار نلکی میں سے چھوٹتی ہوئی برقیروں کی رَو) دریافت کی جس کی بہ دولت اشکال غیر مکینکی ذرائع سے پیدا ہوتی تھیں۔ ایک انگریز کیمبل سوئنٹن (Cpmpbell Swinton) نے1908 میں یہ بتایا کہ اگر کیتھوڈ لہروں کی ٹیوبیں دونوں سروں پر استعمال کی جائیں تو دور کی برقی بصیرت ممکن ہو سکتی ہے۔ جرمنی، روس اور فرانس میں اس نظام کی بنیاد پر ایک چالو ماڈل بنانے کے تجربے ہوئے۔ سینٹ پیٹرس برگ میں پروفیسر بورس روزنگ نے جن کا تعلق ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ سے تھا، پیٹنٹ کے لیے پہلے ہی درخواست دے دی تھی، پیٹنٹ اس سسٹم کا جس کے تحت دو مرر ڈرم (mirror drum) اشکال کو گرفت میں لینے اور انہیں ٹکڑے کرنے اور اسے ریسیو کرنے کے لیے ایک کیتھوڈ رے کا استعمال ہوتا۔ اس کام میں انجینئرنگ کے ایک طالب علم ولاڈمیر زورکن نے اس کی مدد کی۔

امریکا میں جنرل الیکٹرک، A T & T اور ویسٹنگ ہاؤس الیکٹرک کے درمیان پہلی جنگ کے خاتمے کے بعد ایک اتحاد قائم ہو گیا، جس میں طے پایا کہ ریڈیو کے تعلق سے پیٹنٹ کے معاملوں میں اپنے وسائل مجتمع کریں گے۔ انھی کے اشتراکِ عمل کی بہ دولت ٹیلی وژن میں بھی چھان بین شروع ہو چکی تھی۔ ویسٹنگ ہاؤس اور جنرل الیکٹرک نے چارلس ایف جینکنز کی ریسرچ میں ان کی مدد کی، جس نے1895 میں موشن پکچر کا پروجیکٹر بنایا تھا۔1922 میں اس نے اپنی اس ترکیب کے پیٹنٹ حقوق حاصل کر لیے جس کے تحت وائرلیس کی تصویریں روشنی

کے دائروں کے ساتھ سکینر کی طرح آتی تھیں۔ جان لوگی بیئرڈ نے لندن میں ایک ٹیلی وژن سسٹم کو پیٹنٹ کرانے کی درخواست دی، جس میں نپکوڈسک استعمال ہوتی تھی۔ ولاڈمیر زورکن نے جو اس وقت ویسٹنگ ہاؤس کے ساتھ کام کر رہا تھا، پورے برقی نظام کو پیٹنٹ کرانے کی درخواست دی جس میں ریسیور کے طور پر ایک بران ٹیوب اور ایک بہتر کیمرہ ٹیوب استعمال ہوتی تھی۔ بیئرڈ نے اپریل1925 میں ایک سلفرج کے ڈیپارٹمنٹل سٹور میں تین ہفتے تک ٹیلی وژن براڈ کاسٹنگ کا مظاہرہ کیا۔ بعد میں اسی سال زورکن نے ویسٹنگ ہاؤس کے عہدے داروں کے لیے اپنے کل برقی نظام کا مظاہرہ کیا۔ اس میں تصاویر کا معیار ناقص تھا۔ عہدے داروں نے زورکن سے کہا ''جاؤ، کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔'' ایڈورڈ بیلن نے ایک اور طریقہ پیش کیا، جس میں کیتھوڈرے ٹیوب استعمال کی گئی تھی۔ یہ نمونہ اس نے1926 میں فرانسیسی حکام کے سامنے پیش کیا۔1927 میں اڈامیو کے نام کا لڑکا موجد بن گیا۔ جو فیلو۔ ٹی فارمسورتھ تھا۔ اس کا ٹیلی وژن کیمرہ ٹیوب سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس کا نام اس نے امیج ڈائیسیکٹر رکھا۔

اپریل1927 میں اے ٹی اینڈ ٹی کی ریسرچ لیبارٹریز نے نیویارک میں اور واشنگٹن کے درمیان اپنے ٹیلی وژن ٹرانسمیشن کا مظاہرہ کیا تو ریڈیو کارپوریشن آف امریکا نے جو جنرل الیکٹرک کی ایک ذیلی کمپنی تھی، ایک مکمل ٹیلی وژن سسٹم تیار کرنے کے لیے اپنی کوششیں دوچند کر دیں۔ اس کی تصویروں کی کوالٹی اچھی تھی، حالانکہ مکینکل پرزے استعمال کیے گئے تھے۔ تب آرسی اے (ریڈیو کارپوریشن آف امریکا) کے نائب صدر ڈیوڈ سارنوف نے ولاڈمیر زورکن کو یورپ کے دورے پر اس لیے بھیجا کہ وہاں ٹیلی وژن کی ترقی کے لیے جو کام ہو رہا ہے اس کا مشاہدہ کریں۔ فرانس میں ایڈورڈ بیلن اور اس کے ساتھیوں نے جو سسٹم مکمل کیا تھا، زورکن اس سے بہت متاثر ہوا۔ اسے خیال گزرا ان کی کیتھوڈرے ٹیوب چند تبدیلیوں کے ساتھ ٹیلی وژن کا مسئلہ حل کر دے گی۔ زورکن نے پیٹسبرگ واپس آ کر ویسٹنگ ہاؤس میں اپنے اعلیٰ عہدے داروں کو امید افزا پیغام بھیجا، لیکن انہوں نے جواب میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ پھر اس نے سارنوف سے ملاقات کی، جس نے زورکن کی ریسرچ کے لیے ایک لاکھ ڈالر دینے کا وعدہ کیا۔ اب زورکن نے سارنوف کے لیے کام شروع کیا اور بیلن کے چیف انجینئر گریگوری اوگلوبنسکی کو ملازم رکھ لیا۔ اس طرح دونوں نے مل کر سات انچ کی ایک

کیتھوڈرے پکچر ٹیوب تیار کر لی، اس کا نام انہوں نے ''کینس کوپ'' رکھا۔ اب زورکن نے اپنی توجہ کیمرہ ٹیوب پر لگا دی۔ اس کے لیے بہترین پرزہ فیلو فارنسورتھ کا امیج ڈائی سیکٹر تھا۔ زورکن نے فارنسورتھ سے ملاقات کی۔ یہاں سان فرانسسکو میں اسے ہر چیز دکھائی گئی۔ سارنوف نے ذاتی طور پر فارنسورتھ کو ایک لاکھ ڈالر کے عوض خریدنے کی پیش کش کی، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ تب زورکن نے خود اپنی کیمرہ ٹیوب تیار کی اور اس تیاری میں فارنسورتھ کے خیالات سے بھی فائدہ اٹھایا۔

زورکن نے نومبر 1931 میں اپنے آئکنوسکوپ کو پیٹنٹ کرانے کی درخواست دی، لیکن اس کے اعلان میں تاخیر ہوگئی۔ فارنسورتھ نے 1934 میں فلاڈلفیا کے فرانکلن انسٹی ٹیوٹ میں اپنے الیکٹرانک ٹیلی وژن کا پبلک کی خاطر مظاہرہ کیا۔ دوسرے سال امریکا کے پیٹنٹ آفس نے اسے ٹیلی وژن سسٹم تیار کرنے پر پہلے موجد کا ایوارڈ دیا۔ آر سی اے نے رائلٹی دینے سے انکار کر دیا۔ فارنسورتھ نے 1936 میں فلاڈلفیا کے دیہی علاقے میں مختصر سی تعداد میں تماشائیوں کے لیے نشریہ شروع کر دیا۔ اس دوران میں انگلینڈ میں ایک نئی ہولڈنگ کمپنی قائم کر دی گئی تھی۔ یہ تھی ای ایم آئی (الیکٹرک اینڈ میوزیکل انڈسٹریز لمیٹڈ۔ یہ جزوی طور پر ای ایم آئی کی ملکیت میں تھی۔ جب ای ایم آئی نے 1933 میں براڈ کاسٹنگ کے لیے اجازت طلب کی تو بیئرڈ ٹیلی وژن لمیٹڈ نے اس پر شدید ردِعمل کا اظہار کیا، کیوں کہ وہ بی بی سی کے لیے 1929 سے تجرباتی طور پر براڈ کاسٹ کرتی آئی تھی۔ اس پر جنرل پوسٹ آفس اور بی بی سی نے تفتیش کے لیے ایک مشترکہ کمیشن قائم کر دیا۔ بالآخر اس نے لندن میں ایک ٹیلی وژن سروس قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے دونوں کمپنیوں کے ٹیکنیکل آلات استعمال کیے۔ لندن ٹیلی وژن سروس نے نومبر 1936 سے پابندی کے ساتھ اپنی نشریات شروع کر دیں۔ اس کی کامیابی سے سارنوف میں بھی حوصلہ پیدا ہوا کہ امریکا میں نشریات شروع کر دیں۔ اس کا پہلا مظاہرہ 1939 میں نیویارک کے عالمی میلے میں ہوا۔ بیچ میں دوسری عالمی جنگ آ گئی۔ اگرچہ آر سی اے نے اس وقت تک فارنسورتھ کو رائلٹی دینی شروع کر دی تھی، لیکن اس کے پیٹنٹ کی مدت 1946 میں ختم ہوگئی۔ فارنسورتھ نے کاروبار چھوڑ دیا۔ پھر آر سی اے نے امریکا میں ٹیلی وژن کا کاروبار بجائے خود سنبھال لیا۔ امریکا میں وفاقی مواصلات کمیشن (ایف سی سی) کو کمرشل براڈ کاسٹ میں ضابطہ پیدا کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ اس نے کمرشل سٹیشنوں کو چند

فریکوئنسی پر نشریے جاری کرنے کے لائسنس جاری کر دیے۔ سارنوف کی فرم نے پہلا ریڈیو نیٹ ورک شروع کیا تھا، دوسرا نیٹ ورک کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم (سی بی ایس) نے شروع کیا۔ اس کی تشکیل دو سال بعد ہوئی تھی۔ آزاد ریڈیو سٹیشنوں کے ایک سلسلے سے اسے ایک الگ آزاد حیثیت دی گئی تھی۔ ان کا مالک ولیم پیلے فلاڈلفیا کے سگار بنانے والے ایک شخص کا بیٹا تھا۔ اس کے کامیاب پروگراموں میں جیک بنی اور ریڈ سکلٹن جیسے کامیڈین شریک ہوتے تھے جس سے زبردست منافع آ رہا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد پیلے کا عزم یہ تھا کہ ریڈیو نشریات کے مقابلے میں این بی سی کو شکست دے دے۔ این بی سی کو ٹی وی میں فنی اعتبار سے واضح طور پر برتری حاصل ہو گئی تھی۔ ٹیلی وژن کی براڈ کاسٹنگ اس وقت تک VHF بینڈ میں فریکوئنسیز کی پابند تھی جو پورے ملک میں بارہ چینل کو مدد دینے کے لیے کافی تھے۔ پیلے نے ایف سی سی میں اس مضمون کی درخواست دائر کی کہ UHF بینڈ میں فریکوئنسیز کو رنگین ٹیلی وژن کے ایک نظام کا پابند کر دیا جائے، جس کے بارے میں سی بی ایس کا خیال تھا کہ آئندہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ ترقی کر لے گا۔ جب ایف سی سی نے اپریل 1947 میں سی بی ایس کی درخواست مسترد کر دی تو ساتھ ہی اس نے اس صنعت کے معیارات کے بارے میں وضاحت کر دی اور یوں کمرشل براڈ کاسٹ سٹیشنوں کے لیے درخواستوں کا تانتا بندھ گیا۔ پھر ایف سی سی نے چار سال کے لیے ٹیلی وژن سٹیشن قائم کرنے پر پابندی لگا دی اور لائسنسوں کا اجرا روک دیا۔ VHF لائسنسوں کی کم یابی کی وجہ سے فروخت کنندگان کی منڈی میں ٹی وی اشتہارات کی اور خریداروں کی مارکیٹ میں پروگراموں کی مانگ بڑھ گئی۔

ابتدا میں اشتہاری ایجنسیاں جو بڑے بڑے تاجروں کی نمائندگی کرتی تھیں، ٹیلی وژن پر آنے والے پروگراموں کو کنٹرول کرتی تھیں۔ انفرادی پروگراموں کی اسپانسر شپ سے گریز کرتے ہوئے وہ پروگراموں کے لیے لائسنس جاری کرنے کے فن سے دست بردار ہو گئے، لیکن قابل اعتراض مواد کو منسوخ کر دینے کا اختیار اپنے پاس محفوظ رکھا۔ ٹیلی وژن کے کاروباری سلسلے میں سی بی ایس اور این بی سی نے خاص طور پر خود مختار پروڈکشن کمپنیوں سے پروگراموں کے مالکانہ حقوق حاصل کرنے کی بات کی اور اس کے عوض 'پرائم ٹائم' یعنی کاروبار کے مصروف اوقات میں نشریات کے درمیان ان کے اشتہاروں کی ایک جھلک دکھانے کی پیش کش کی۔ ٹیکسا کو اسٹار تھیٹر نے جس کا میزبان ملٹن برل تھا، ٹیلی وژن کے ابتدائی دنوں کے ناظرین

پر غلبہ پالیا تھا۔ پھر مزاحیہ مکالموں کا دور آ گیا، جس کی ایک نمایاں مثال 'آئی لو لوسی' تھا۔ اس کامیڈی سیریل میں لوسیلی بال اور اس کا شوہر ڈیسی آرناز آتے تھے۔ انہوں نے ٹیلی وژن کے بصری امکانات کا بھرپور استعمال کیا۔ اب ان کے شو ٹیپ کیے جانے لگے اور انہیں دوبارہ چلانے کی بھی اجازت مل گئی۔ 1950 کے عشرے کے وسط میں جب کوئز شو کے بارے میں سکینڈل پھیلنے لگے تو ٹیلی وژن نیٹ ورک نے پروگراموں کے مواد کے لیے ہالی وڈ سے رجوع کیا۔ چونکہ امریکا کا کمرشل ٹیلی وژن تین بڑے نیٹ ورک کے درمیان مرکوز ہو چکا تھا، لہٰذا تماشائی، جنہوں نے کیبل ٹیلی وژن کی خدمات حاصل کی تھیں، پہلے سے زیادہ متنوع پروگراموں کا تقاضا کرنے لگے۔ ٹیڈ ٹرنر کیبل نیٹ ورک نے 1980 میں خبروں کی برمحل رپورٹ جو 24 گھنٹوں کے اندر ساری دنیا میں رونما ہونے والے واقعات پر مبنی ہوتی، نشر کرنی شروع کی۔ سیٹلائٹ براڈ کاسٹ اور کیبل ٹیلی وژن کی بہ دولت ایشیا کے لوگ بھی 1991 میں مغربی طرز کے ٹی وی پروگراموں سے لطف اندوز ہونے لگے ہیں۔ اسٹار نیٹ ورک دنیا کے 32 ملکوں میں جاتا ہے، جن کی آبادی دو ارب 70 کروڑ ہے۔

کمپیوٹر

کمپیوٹر بنیادی طور پر بجلی سے چلنے والی دیگر تہذیبی ٹیکنالوجیز سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ یہ نہ صرف اشکال اور اطلاعات کو ریکارڈ کرتا ہے بلکہ ضرورت کے تحت اس میں ترمیم اور رد و بدل بھی ممکن ہے۔ جدید کمپیوٹر الیکٹرانک کے پرزوں کا ایک مجموعہ ہے اور اس میں شامل اضافی تراکیب درج ذیل امور انجام دیتی ہیں۔ (1) وہ سسٹم میں اعداد و شمار داخل کرتی ہے (2) وہ اعداد و شمار کو میموری (حافظے) میں محفوظ کر لیتی ہیں۔ (3) وہ کمپیوٹر کی کارکردگی کو خود کنٹرول کرتی ہیں۔ (4) اعداد و شمار میں ترمیم و اضافے کے بعد، وہ ان کو پروسیس (تجزیہ، درجہ بندی وغیرہ) کرتی ہیں۔ (5) ساری کارکردگی کے نتائج کو وہ بیرونی طور پر پیش کر دیتی ہیں۔ اعداد و شمار کو کمپیوٹر میں داخل کرنے کا نہایت معروف طریقہ یہ ہے کہ حروف اور اعداد کو ایک کی بورڈ پر ٹائپ کرتے ہیں، اس کے ساتھ لگے ہوئے پرنٹر یا وڈیو مانیٹر (کیتھوڈ رے ٹیوب) پر نتائج نظر آ جاتے ہیں۔ کمپیوٹر کی میموری میں پراسیسنگ یونٹ کے اندر ایک پلیٹ لگی ہوتی ہے۔ ملمع لگی ہوئی اس پلیٹ پر الیکٹرو میگنٹ کے کوڈنگز موجود ہوتی ہیں۔

اس کے ابتدائی عمل کو سافٹ ویئر پروگرام کہتے ہیں۔ کوڈنگز، علامتی زبان ہوتی ہے، جو مشین کے اندر پروسیسنگ کو کنٹرول کرتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ سسٹم دیگر پروگراموں کو بھی اپنے اندر شامل کرسکتا ہے۔ مثلاً ورڈ پروسیسنگ، کمپیوٹر پروگرام یا گرافکس۔

کمپیوٹر کیلکولیٹنگ یعنی جمع تقسیم کرنے والی مشین کی روایت کا ہی تسلسل ہے۔ جان نیپئر نے، جو لوگارِدم (ریاضی کے ایک فارمولے) کا موجد تھا1617 میں اپنا مقالہ شائع کیا، جس میں ضرب اور تقسیم کا ایک نیا طریقہ تجویز کیا گیا تھا جس میں مشینی ''چھڑیاں'' اور ''ہڈیاں'' استعمال ہوتی تھیں۔ فرانس کے فلسفی بلیس پاسکل نے1642 میں ایک کیلکولیٹنگ مشین بنائی، جس میں پہیے لگے ہوتے تھے۔ اس سے اس کے باپ کے کاروبار میں مدد ملی۔ گوڈ فرائڈ ڈیلو وان لبنٹ نے1671 میں ایک مشین بنائی جس کی بنیاد ثنوی ریاضی پر تھی جو مربع کے حساب سے اعداد کو جوڑتی تھی۔ اس کا مقصد چونکہ فلکیات کے پیمانے کا حساب رکھنا تھا، لہٰذا اس کا نام 'اسٹیپڈ رکیز' رکھا گیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک ڈھول جس میں دنداں نما زینے لگے ہوتے اور جو اپنی لمبائی کے حساب سے اعداد کی نمائندگی کرتے، انھی کی گردش سے حساب جوڑا جاتا تھا۔ کاروباری کیلکولیٹر انیسویں صدی میں متعارف ہوئے۔ چارلس ایکس تھامس نے1820 میں لبنٹ کی ہی طرز پر ایک مشین تیار کی، جسے کاروبار میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا۔ ایک اور مشین ریاضی کے حساب کرتی تھی، یہ ایک گھومتا ہوا پہیہ تھا، جس کے ساتھ پلیٹ پر معینہ فاصلے پر پن لگا دی جاتی تھی، جو پلیٹ سے باہر نکلی ہوتی تھی۔ پہیّے کی گردش سے ہی حساب جوڑتے تھے۔

کیلکولیٹنگ مشینوں کے برعکس کمپیوٹر بعض شرائط کے تحت بہت سے کام انجام دے سکتا ہے۔ اس طرح کی صلاحیت کی حامل پہلی مشین 'جیکرڈ لوم' (کرگھا) تھی جسے اس کے موجد نے1801 میں بنایا۔ جوزف میری جیکرڈ فرانس کا ایک جولاہا تھا، اس نے ایک ٹیکنیک دریافت کی کہ کپڑے پر ڈیزائن از خود بن جاتا تھا۔ اس کے لیے کارڈ میں سوراخ بنے ہوتے تھے جو کرگھے کی حرکت کو کنٹرول کرتے تھے۔ ایک انگریزی موجد چارلس ببیج جیکرڈ کے ایک [illegible] حرفت کے ذریعے 24 ہزار کارڈ استعمال ہوتے [illegible] تھے۔ [illegible] بھی حاصل تھا کہ اس نے 1835 میں دنیا کا پہلا ڈیجیٹل کمپیوٹر بنایا۔ اس کمپیوٹر جس کا نام Analytical Rugine یا حسابی انجن تھا، اعداد وشمار کے لیے پنچ کیے

ہوئے کارڈوں کی ایک تختی ہوتی تھی اور دوسری تختی مشین کو کنٹرول کرتی تھی۔ مشین کو چلانے والے پرزے (Plungers) سوراخ کے ذریعے کارڈز تک پہنچتے تھے اور پروگرام میں اعداد و شمار شامل کرتے تھے جو عددی معلومات کو جمع کرتے تھے۔ اگر ''بیانات'' ہوتے تو مشین انہیں مشروط طور پر منتقل کر دیتی ہے اور اس کے لیے پروسیسنگ کے معمول میں جزوی تبدیلی کرنی ہوتی تھی۔ مشین میں دو ''پھندے'' ہوتے تھے، جو بار بار حرکت میں آتے۔ جس طرح جدید کمپیوٹر کے پروگراموں میں ہوتے ہیں، اگرچہ بیبج نے اپنی مشین کا کوئی عملی نمونہ نہیں بنایا تھا، لیکن ان کی ڈرائنگ ضرور بنائی تھی جن میں سارے پرزے نظر آتے تھے۔

ایک حساب دان ہرمن ہالرتھ کو 1886 میں یہ خیال گزرا کہ ایک مشین جس میں پنچ کیے ہوئے کارڈ لگے ہوں امریکی مردم شماری میں اعداد کو جمع کرنے کے کام آ سکتی ہے۔ اس نے 1890 کی مردم شماری کے لیے ایک ایسی مشین بنا لی۔ اب سے پہلے مردم شماری میں جتنا وقت صرف ہوتا تھا، مشین کی دریافت سے وہی کام ایک تہائی وقت میں ہونے لگا۔ ہالرتھ کی مشین میں پنچ کئے ہوئے کارڈ ایک تھالی کے اوپر ہوتے تھے، جس میں پارہ بھرا جاتا تھا۔ جب دھات کے پن سوراخ کے ذریعے پارے تک پہنچتے تو اس طرح ایک برقی سرکٹ مکمل ہوتا اور اسے جمع شدہ اعداد میں جوڑ دیا جاتا۔ کارڈ میں ایسی حکمت عملی بھی رکھی گئی تھی کہ جس سے آبادی کی امتیازی خصوصیات کی نشان دہی ہوتی تھی۔ جب کارڈ مشین سے گزرتے تو وہ معلومات الگ شمار کر لی جاتی تھیں۔ بیج کے حسابی انجن کی طرح ہالرتھ کی ایجاد میں مشینی فیلرز کی بجائے ایک برقی حساس آلہ استعمال ہوتا تھا۔ ہالرتھ اور اس کے ساتھ دیگر لوگوں نے مل کر 1911 میں ایک کمپنی بنائی، جو بعد میں انٹرنیشنل بزنس مشینز کے (1814) نام سے مشہور ہوئی۔

کمپیوٹر کی ایجاد ممکن نہ ہوتی، اگر ایک انگریز حساب دان اور منطق دان جارج بول کا کام سامنے نہ آتا۔ بول کی تصنیف Treatise on Differential Equations 1859 میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے اپنا الجبرے کا تصور پیش کیا تھا۔ اس نظام کا کلیہ یہ ہے کہ کسی قول کی دو ہی اقدار ہو سکتی ہیں، صحیح یا غلط۔ اسی طرح ثنوی ریاضی ہے جس میں کسی پورے عدد کی نمائندگی ایک یا صفر سے ہو سکتی ہے۔ ایک امریکی فلسفی چارلس سینڈرس پیرس نے 1867 میں یہ معلوم کیا کہ بول کے الجبرے میں جن اقدار کو پیش کیا گیا ہے، وہ مشینی طور سے ''آن'' اور ''آف'' کے ذریعے بیان ہو سکتی ہیں۔ ایک برقی سرکٹ پر سوئچ لگا کر اسے جلایا اور بجھایا جا

سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ بول کی سکیم کے مطابق کوئی شخص ایسا سرکٹ بنائے جو برقی رو کو کھولنے اور بند کرنے پر قادر ہو۔ ایک ایسا سرکٹ حسابی اور منطقی حسابات میں بھی کام آ سکتا ہے۔ بیل ٹیلی فون لیبارٹریز کے جارج سبٹز (George Sibitz) نے 1937 میں اپنے باورچی خانے کی میز پر کچھ بیڑیاں، تار اور روشنی لگا دیں اور بول کے اصولوں کے مطابق برقی سرکٹ کا پہلا عملی مظاہرہ کیا۔ کمپیوٹنگ کا نیا دور دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں آیا۔ آئی بی ایم کے انجینئر ول نے ہارورڈ کے پروفیسر ہوورڈ کے اشتراک سے 1939 میں کام شروع کیا۔ ان کا مقصد ایک پوری طرح خود کار الیکٹرومکینیکل کیلکولیٹر تیار کرنا تھا، جو پنچ کیے ہوئے کاغذ کے ٹیپ سے کنٹرول ہوتا ہو۔ یہ مشین یعنی ''مارک'' ریاضی کے حسابات کر سکتی تھی اور پہاڑوں کے حساب کو پرکھ سکتی تھی۔ اس مشین میں پہیے ہوتے تھے جس طرح بیج کی مشین میں تھے، اس فرق سے کہ اس نئی مشین میں سوئچ کو برقی عمل سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ پہلا کثیر المقاصد الیکٹرانک کمپیوٹر ''الیکٹرانک نیومریکل اینٹگریٹر اینڈ کیلکولیٹر'' (ENIAC) تھا، جسے پینسلوانیا کی یونیورسٹی میں الیکٹریکل انجینئرنگ کے دو پروفیسروں جان ماؤچلے اور جے ایکرٹ نے الیکٹرومکینیکل سوئچز کی بجائے ویکیوم ٹیوب سے بنایا تھا۔ اس کا مقصد جرمنی کے فوجی دستے کو توپ کے گولوں سے نشانہ بناتے ہوئے گولہ باری کا حساب رکھنا تھا۔ ای این آئی ٹی اے کا کمپیوٹر وہی حساب چند منٹ میں کر لیتا تھا، جسے کوئی شخص عام کیلکولیٹر کے ساتھ چالیس گھنٹے میں کرے گا۔ اس مشین میں 50 ٹن وزنی آٹھ فٹ اونچے کیبنٹ ہوتے، جن میں تھالیاں لگی ہوتیں، ان میں تار کے سرکٹ ہوتے اور ساتھ ہی ویکیوم ٹیوب بھی۔ ای این آئی اے سی پر کام فروری 1946 میں مکمل ہوا۔ لیکن جنگی کوششوں میں معاونت کے لیے اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ البتہ بحر اٹلانٹک کی دوسری جانب برطانیہ نے اپنا کمپیوٹر ''کولوسس'' کے نام سے بنا لیا تھا جو جرمن کوڈ کی گرہیں کھولنے میں استعمال ہوا۔

امریکی فوج کے افسر رابطہ ہرمن گولڈ سٹائن کی اتفاقیہ ملاقات ریلوے اسٹیشن پر ای این آئی اے سی کے جان ون نیومن سے ہو گئی، جو پرنسٹن کے انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس سٹیڈیز میں ریاضی دان تھے۔ انہوں نے نیومن کی بے انتہا صلاحیتوں کو ایک کمپیوٹر بنانے میں استعمال کیا۔ 1946 میں ون نیومن، گولڈ سٹائن اور آرتھر برکس نے ایک مقالہ شائع کیا، جس کا عنوان تھا: ''الیکٹرانک کے کمپیوٹنگ آلے کے منطقی ڈیزائن پر ابتدائی مباحث''۔ اس مقالے

میں ایک ایسی کمپیوٹنگ مشین کا تصور پیش کیا گیا تھا جس میں اعداد وشمار اور عمل درآمد کے لیے ہدایات، یہ دونوں ذخیرہ کی جاسکیں۔ جب نئی ہدایات جاری کی گئیں تو کمپیوٹر کے کاری گروں کو مشین میں دوبارہ تار جوڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس مقالے میں اس امکان پر بھی بحث کی گئی تھی کہ کمپیوٹر کس طرح مرحلہ وار انداز میں حسابی یا منطقی جمع تفریق کر سکتے ہیں۔ بہت سی یونیورسٹیوں نے ون نیومن کی تعمیر کو استعمال کرتے ہوئے مشینیں بنائیں۔ بہ ہرطور کمپیوٹروں کا ٹیکنیکل چیلنج صرف معلومات کو مرتب اور محفوظ کرنے تک محدود نہیں۔ ان کے پروگرام بھی بہ ہرطور اہمیت رکھتے تھے۔ ابتدا میں کمپیوٹر کے پروگرام بنانے والوں کو کوڈ میں مفصل ہدایات لکھنی پڑتی تھیں، جنہیں مشین سمجھ سکتی تھی۔1950 کے عشرے کے اوائل میں یو این آئی وی اے سی (UNIVAC) کے گریس ہوپر نے ایک ''کمپائلر'' تیار کیا، جو انگریزی جیسے مختصر بیانات مشین کی زبان میں ترجمہ کر سکے گا۔ آئی بی ایم کی ایک ٹیم نے سائنٹفک پروگرامنگ کے لیے فورٹرین زبان (Fortran) زبان تیار کی۔

کمپیوٹر سب سے پہلے بڑے پیمانے پر ہونے والی سرکاری مہمات اور سائنسی ریسرچ میں استعمال کیے گئے۔UNIVAC اوّل جسے ENIAC کے موجدوں اور ریمنگٹن رینڈ کے انجینئروں نے مل کر تیار کیا تھا، امریکی بیورو برائے مردم شماری کو فروخت کر دیا گیا تاکہ 1950 کی مردم شماری میں اس سے کام لیا جاسکے۔ لاس الموس اور لیورمور میں واقع وفاقی ریسرچ لیبارٹریوں کو زبردست کمپیوٹنگ پاور کی ضرورت تھی، جسے ہائیڈروجن بم کی تیاری میں استعمال کیا جانا تھا۔ امریکا کے خلائی پروگرام کا تقاضا تھا کہ 1960 اور 1970 کے عشروں میں زیادہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی فراہم کی جائے۔ چنانچہ دو سب سے بڑی کمپیوٹر ساز کمپنیوں ریمنگٹن رنیڈ اور آئی بی ایم نے فیصلہ کیا کہ کاروباری ضرورت کے لیے کمپیوٹروں کو ترقی دی جائے اور اس کے لیے سائنسی مارکیٹ کو چھوڑ دیا جائے۔ اس نفع بخش میدان میں آئی بی ایم کا پلہ بھاری تھا، جس نے کمپیوٹر کے خاصے بڑے مرکزی پرزے بنائے جن میں تنخواہوں اور بلنگ کا حساب کتاب اور پروڈکشن کے مرحلہ وار عمل کا حساب رکھا جاسکتا تھا۔ پھر سائنسی امور کے لیے ''سپر کمپیوٹر'' کی تیاری میں سنٹرل ڈیٹا کارپوریشن کی حیثیت سرکردہ پروڈیوسر کی ہوگئی، البتہ ویت نام کی جنگ کے ردِعمل میں یونیورسٹیوں کے اندر کمپیوٹر ریسرچ کا کام، وفاقی حکومت کی امداد نہ ملنے سے تباہ ہونے لگا۔1971 میں کنٹرول ڈیٹا کے خاص کمپیوٹر ڈیزائنر سیمور کرے نے سپر

کمپیوٹر بنانے کے لیے خود اپنی کمپنی بنالی۔ ان کے ادارے کرے ریسرچ نے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ تیز رفتار کمپیوٹر بنالیا۔

اس دوران میں کمپیوٹر کی ترقی کے لیے اس امر کی کوشش ہوتی رہی کہ اس میں پروسینگ (Processing) کتنی تیز رفتاری سے ہوتی ہے۔ کمپیوٹر جتنی تیز رفتاری سے حسابات کر سکیں گے، ان کی مشین میں اسی قدر کمپیوٹنگ کی طاقت ہوگی اور اس کی کارکردگی کا دائرہ بھی اسی

گوشوارہ 9-1 Table: 9-1

کمپیوٹر کی سوِچنگ رفتار میں اضافے

زمانہ	تکنیک	فی سیکنڈ	کمپیوٹر ماڈل
1939-46	الیکٹرومیگنیٹک ریلے	0.3	مارک I
1946-61	ویکیوم ٹیوب	400 تا 10^5	ENIAC, UNiVAC
1961-76	ٹرانزسٹر	10^6 تا 10^8	LRC, CDC 7600
1976-90	انٹی گریٹڈ سرکٹ	10^8 تا 10^{10}	Cray-I, X-MP
1990	مائیکروپروسیسر	10^{10} تا 10^{12}	Delta, CM-5

Source: Supercomputing and the Trasformation of Science by Kaufman.

تناسب سے وسیع ہوگا۔ رفتار کو ''گھڑی کے دورانیے'' سے ناپتے ہیں، یعنی ایک سادہ سے کام کے لیے کمپیوٹر کم سے کم کتنا وقت لیتا ہے۔ کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں جتنی تعداد میں کام کر سکتا ہے، اسے ''فلاپ (Flop)'' کہتے ہیں۔ ہوورڈ ایکن کا مارک ون کمپیوٹر تین سیکنڈ میں دو کے اعداد کو ضرب دے سکتا تھا۔ اس طرح اس کے یہاں گھڑی کا دورانیہ اعشاریہ 3 فلاپ تھا۔ این ای آئی اے سی کا کمپیوٹر جو سوئچ کی جگہ ویکیوم ٹیوب استعمال کرتا تھا، اس کے یہاں گھڑی کا دورانیہ 400 فلاپ تھا۔ یعنی تیز رفتاری میں بارہ سو گنا زیادہ۔ جب CDC 7600 کمپیوٹر میں ویکیوم ٹیوب کی جگہ ٹرانزسٹر استعمال کیے گئے تو گھڑی کا دورانیہ ایک کروڑ فلاپس تک پہنچ گیا (یعنی دس میگا فلاپس)۔ سوئچ میں جب نئی ٹیکنالوجی داخل کی گئی تو کمپیوٹر کی رفتار میں زبردست تیزی آگئی۔ 1959 میں ٹیکساس انسٹرومنٹس (Texas Instruments) میں جب تکمیل شدہ سرکٹ (Interparated Elements) دریافت کیے گئے تو مختصر سرکٹ استعمال کرتے ہوئے ان کی رفتار اور بھی بڑھ گئی۔ ابرق کے چھوٹے ٹکڑوں پر جنہیں چپس (Chips) کہا جاتا

ہے، ٹرانزسٹر اور تار بچھائے گئے۔ انٹل کارپوریشن نے 1971 میں مائکرو پروسیسر دریافت کیا اور تکمیل شدہ سرکٹ میں کمپیوٹر کے تمام عناصر داخل کر دیے۔ اس وقت سے گویا ایک اصول کے تحت مائیکرو پروسیسر ہر اٹھارہ ماہ بعد اپنی رفتار دگنی کر دیتے ہیں۔

مائیکرو پروسیسر ''ایک چپ کا کمپیوٹر'' ہے۔ اس نے 1970 کے عشرے میں ''پرسنل کمپیوٹر'' کے اندر انقلاب برپا کر دیا۔ پرسنل کمپیوٹر کا پہلا عملی نمونہ کیلیفورنیا کے پالو آلٹو ریسرچ سنٹر میں تیار کیا گیا۔ یہیں کمپیوٹر کی سکرین کے لیے پروگرام کی شناختی علامتوں کو فروغ دیا گیا۔ ڈین برکلس اور ڈین فلسٹر نے وزی کیل کے لیے پروگرام لکھا۔ وزی کیل پرسنل کمپیوٹر کے لیے پہلا الیکٹرانک سپریڈ شیٹ (کمپیوٹر پروگرام کو مرتب کرنے اور معلومات کو کام میں لانے والا پرزہ) ہے جو ایپل II میں استعمال کیا جانے والا تھا۔ آئی بی ایم نے 1981 میں اپنا پرسنل کمپیوٹر پیش کیا اور اس کے آپریٹنگ سسٹم کا لائسنس ایک چھوٹی سی کمپنی مائیکروسافٹ کو دے دیا۔ پھر پیک مین وڈیو گیم مقبول ہو گیا۔ 1983 میں آئی بی ایم اور آئی بی ایم کمپیٹبل مشینوں کے لیے لوٹس 1-2-3 سپریڈ شیٹ آ گئے۔ اس کے دوسرے ہی برس ایپل کمپیوٹر ایک بار پھر واپس آ گیا۔ اس نے مقبول عام میکنٹوش پیش کیا، جس کے ساتھ سہولت سے چلانے کے لیے 'ماؤس' ہوتا تھا۔ پھر مائیکروسافٹ نے 1985 میں ونڈوز کا پہلا نمونہ پیش کیا، اس کے ساتھ بھی آئکون اور ماؤس ہوتے ہیں۔ لوٹس نے 1990 میں ایک پروگرام 'لوٹس'' کے عنوان سے پیش کیا، جس میں یہ گنجائش رکھی گئی کہ کمپیوٹر آپس میں دستاویز کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ سافٹ ویئر کے میدان میں مائیکروسافٹ نے اپنی برتری قائم رکھی ہے۔ اس نے MS-DOS کا آپریٹنگ سسٹم لائسنس پر دینا شروع کیا، چنانچہ دنیا کے 90 فی صد کمپیوٹر اس کو استعمال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے ونڈوز اور اپنی دیگر مصنوعات کے بتدریج بہتر نمونے پیش کیے ہیں۔

موجودہ رجحان کمپیوٹر نیٹ ورکس کی طرف بڑھ گیا ہے۔ 1960 کے عشرے کے اواخر میں الینس یونیورسٹی کی ایک ٹیم نے ایک ہی جیسے 64 بروز (Burroughs) کمپیوٹر، IV-ILLIAC مشین کے متوازن نشری آلات کے لیے تیار کیے۔ بہت سی چھوٹی مشینوں میں بھی پروسیسنگ اس تیز رفتاری سے ہوتی ہے، جس طرح بڑی مشینوں میں ہوتی ہے۔ چھوٹی مشین میں سسٹم تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ آئی بی ایم نیٹ ورک کمپیوٹر کے تصور کو آگے بڑھا رہا ہے جو دفاتر میں پرسنل کمپیوٹر کی جگہ لے لے گا۔ اس میں ٹرمینل نسبتاً سستے ہوتے ہیں اور ہر

مشین پر سسٹم نہیں لگانا پڑتا۔ کمپیوٹر نیٹ ورکس دفاتر سے نکل کر بہت جلد گھروں میں پھیل گیا، فرانس کے محکمہ ڈاک وتار نے 1980 کے برسوں میں فیصلہ کیا کہ وہ اپنے سارے مواصلاتی نظام کو کمپیوٹر سے جوڑ دیں گے۔ لاکھوں امریکی باشندوں نے 'پروڈگی' کمپیوسروس یا امریکا آن لائن کی خدمات حاصل کر لی ہیں، جن تک رسائی اس طرح آسان ہوتی ہے۔ کمپیوٹر استعمال کرنے والے نیٹ ورک استعمال کرنے والوں کے لاتعداد افراد سے واقف ہوں گے، انفرادی حیثیت میں بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ اس سسٹم کو انٹرنیٹ کہا جاتا ہے۔ 1969 میں انٹرنیٹ کا آغاز اس وقت ہوا جب پنٹاگن نے آرپینٹ (Arpanet) نیٹ ورک تیار کرنے کے لیے بی بی این سے رابطہ کیا جو کیمبرج میسوچیوٹس کی ایک مشاورتی فرم تھی۔ بی بی این کے انجینئر رے ٹام سن نے 1972 میں پہلا ای میل پیغام، پتے میں @ کو استعمال کرتے ہوئے بھیجا۔ ابتدا میں آرپینٹ نے مغربی ساحل پر واقع چار بڑی یونیورسٹیوں کے درمیان کمپیوٹر سے رابطہ پیدا کیا۔ جب دوسری یونیورسٹیوں اور ریسرچ کے مراکز کا اضافہ ہو گیا تو سسٹم میں کئی کمرشل نیٹ ورکس شامل ہو گئے۔ آج انٹرنیٹ ایک گلوبل نیٹ ورک بن گیا ہے اور اس نے بارہ کروڑ کمپیوٹروں کے درمیان رابطہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ سسٹم اوسطاً اتنا بڑا ہے اور اتنا گنجلک ہے کہ نئی قسم کے سافٹ ویئر تیار کیے گئے ہیں تاکہ استعمال کرنے والے سائبر سپیس میں ان سافٹ ویئرز میں اپنا راستہ نکال سکیں۔ ویب سائٹس مفادات کے حامل گروہوں کو فوکس کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

دسواں باب

تاریخ کا استعمال
مستقبل کی پیش گوئی کے لیے

تاریخ اپنے آپ کو کیوں نہیں دہراتی

اگر تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہو تو ماضی سے مستقبل کی نشان دہی ہوتی ہے۔ پیش گوئی کے لیے عام طریقہ یہ ہے کہ مروجہ رجحانات کی روشنی میں قیاس آرائی کرتے ہیں۔ موجودہ واقعات کو دیکھتے ہوئے انہیں منطقی نتیجے تک لے جاتے ہیں۔ لہٰذا مستقبل بین کو آج کے معاشرے سے باخبر رہنا چاہیے۔ اسے ان تخلیقی مراکز سے رابطہ رکھنا چاہیے جہاں نئے خیالات پروان چڑھ رہے ہوں اور نئی مصنوعات زیرِ تخلیق ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہے کہ تین سال بعد امریکی گاڑیاں کیسی ہوں گی تو فورڈ یا جنرل موٹرز میں، جہاں گاڑیوں کے سٹائل بنائے جا رہے ہوں، ان کے دفتر کا دورہ کرنا سب سے اچھا ہوگا۔ اس کے بعد اس شخص کو اپنے وجدان اور سوجھ بوجھ کو استعمال میں لانا ہوگا اور یہ قیاس کرنا ہوگا کہ آج کی جدتیں مستقبل کی سوسائٹی میں کیا کردار ادا کریں گی۔ کسی بھی ظاہری تحریک میں اس کے انجام تک ایک بے یقینی کا عنصر تو بہرحال موجود رہتا ہے۔ دوسری جانب اگر تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہراتی تو بازی ختم ہوگئی۔ اس طرح کی دلیل کا کوئی فائدہ نہیں۔

لارڈ ایکٹن کا قول ہے ''طاقت بگاڑ پیدا کرتی ہے، یہ قول اس دورانِ عمل کو بیان کرتا ہے جو تاریخی واقعات کا سبب ہوئے۔ بدعملی پر مبنی رجحانات جب کسی تنظیم میں طبعی طور پر موجود ہوں تو اس وقت تاریخ خطِ مستقیم میں سفر نہیں کرتی۔ بددیانتی کی طاقت تعمیر کے ہر شعبے میں ترقی کا راستہ روک دیتی ہے۔ اب اس کی اصلاح کسی اور سمت سے ہوگی۔

بیورو کریسی اس تنظیم کا نام ہے جو بددیانت طاقت کی جانب قدم بڑھاتی جاتی ہے۔کوئی بھی منصوبہ جو اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اس تنظیم کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے پاس طاقت ہوتی ہے۔ یہ تنظیم ان افراد کے ذریعے سے کام کرتی ہے، جنہیں عمل کرنے کا منصب تفویض ہوا ہو۔ اقتدار کی بالائی سطح پر بیٹھے ہوئے افراد نچلی سطح کے لوگوں پر طاقت استعمال کرتے ہیں۔ تنظیم بھی بجائے خود سوسائٹی کے وسیع تر مفاد میں طاقت استعمال کرتی ہے۔ تنظیم کے معاملات چلانے والے جب تک اپنے مقاصد میں مخلص ہوتے ہیں، تنظیم صحت مند اور مضبوط رہے گی۔ لیکن طاقت ایسی چیز ہے جس کے سب گرویدہ ہوتے ہیں۔ طاقت کے حصول کی خواہش یا طاقت کو برقرار رکھنے کی طلب بیورو کریسی کے دائرے میں بجائے خود ایک مقصد بن جاتی ہے، جو اولین مقصد کو غارت کر دیتی ہے، اس طرح طاقت بگاڑ پیدا کرتی ہے۔

بیورو کریسی کے اداروں کے ایک عام اصول کے مطابق یہی معلوم ہو گا کہ ہر منظم کوشش وقت گزرنے کے ساتھ بدنظمی کا شکار ہوتی اور بگڑ جاتی ہے۔ جہاں پہلے کسی تنظیم کا ایک واضح مقصد تھا، اب وہی تنظیم اپنے مادی ڈھانچے کو ترقی دیتے ہوئے انتشار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مادی ترقی کے ساتھ بیرونی مقاصد کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور وہی توجہ داخلی طاقت کی خوش نودی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ تنظیم کے اندر کے لوگ اوپر کے طاقت وَر لوگوں کی ذاتی دلچسپیوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ افسر شاہی کی ذہنیت ابھرنے لگتی ہے۔ جس میں مقاصد کے صریح اظہار کی بجائے فیصلے اور فکر میں سازش کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، جس میں طاقت کا ڈھانچا، اس سے وابستہ شخصیات اور ان کی خاص ضرورتیں ہی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔

کوئی بھی شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ تاریخی تبدیلی سوسائٹی میں ان رجحانات کے سبب سے پیدا ہوئی، جو اس وقت کچھ اور تھے اور اب نہیں رہے۔ دنیاوی کاوشیں جو پہلے مضبوط مقاصد کا پتا دیتی تھیں، اب ان کی روح میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگی ہیں۔ ایسے میں طاقت وَر ادارے جبر اور فریب کے مراکز بن جاتے ہیں۔ مکمل طاقت، جیسا کہ کیلی گولا (Caligula) کے پاس تھی، اتنی بداخلاقی پیدا کر دیتی ہے کہ پھر اسے جاری رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ جب تک اندر سے کوئی مصلح پیدا نہ ہو، اس بداخلاقی کا علاج اقتدار کے حلقے سے باہر کی طاقت سے ہی

ممکن ہے۔ ایسے میں لوگ بولنے میں آزاد ہوتے ہیں۔ اور سچ بات سوچتے ہیں، اس سوچ سے ان میں طاقت آ جاتی ہے، چنانچہ جب کسی سوسائٹی میں جابرانہ فیصلوں اور بد دماغی پر مبنی جھوٹ سے رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں تو یہی وقت ہوتا ہے جب کوئی نیا پیغام مقتدر طبقے سے باہر سے موصول ہو۔ تب روایتی دانش اتنی پختہ ہو جاتی ہے کہ اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ روحانی طاقت، ماضی کی روش سے الگ کسی اور سمت میں سفر کرنے لگتی ہے۔

ایک منظم معاشرہ اپنی تباہی کے بیج اپنے وجود میں رکھتا ہے۔ مستقبل اس جانب گردش نہیں کرتا بلکہ ایک مثبت انجام کی طرف سفر کرتا ہے۔ تبدیلی عقل سے نہیں، جرأت سے پیدا ہوتی ہے۔ جرأت مندانہ اقدام حقیقی مشکلات کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں، جس کے معنی ہیں غلط کار طاقت کی مخالفت۔ اس لیے اکثر و بیشتر تاریخی تبدیلی مروجہ طاقت کی بنیاد پر کی گئی پیش گوئی کے خلاف ہوتی ہے۔ دنیا ترقی یافتہ حقیقتوں سے گریز کرتے ہوئے اَن دیکھے خیالوں کی جانب سفر کرتی ہے۔ وہ ماضی کے دنوں کی طرح نہیں رہتی بلکہ جو کچھ نہیں ہیں، اس سے کچھ زیادہ نظر آتی ہے۔ تہذیبیں انجام کار اپنے آپ سے گریز کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ دراصل تاریخی عہد کی ذہنیت ہی یہ ہے کہ واقعات اپنی اصل سمت کی الٹی جانب سفر کرتے ہیں۔

یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ انتہائی دہشت ناک طاقت بھی اگر اپنے دائمی وجود کی خاطر دنیاوی امور کو جبر کے ذریعے ہم رائے بنانا چاہے تو بھی وہ تاریخ کا رخ نہیں موڑ سکتی۔ تاریخ کے واقعات اکثر اوقات طاقت کے خلاف رونما ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو اختیارات کے نفاذ کی ساری طاقتیں مل جائیں، پھر بھی انسانی عقل معاشرے میں غلطیوں کو داخل ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اس وقت محفوظ ترین حکمت عملی یہ ہو گی کہ سوسائٹی کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ جب غلطی ظاہر ہو تو اس کی اصلاح کر دی جائے۔ سوسائٹی میں کچھ گوشے تساہل کے لیے چھوڑ دینے چاہئیں، یا ان مقاصد کے لیے جو مروجہ مقاصد کے خلاف ہوں تاکہ بد راہ طاقت کی مخالفت کا ایک ذریعہ موجود ہو اور اسے برائی کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ اگر اقتدار کا ڈھانچا مختلف الخیال افراد کے اشتراک پر مبنی ہو تو وہ زہریلی برائیاں جو ایک وجود کے لیے مہلک ہو سکتی ہیں، پورے معاشرے کو تباہ کر سکیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ کامل حاکمیت پر مبنی نظام حکومت زیادہ دنوں نہیں چلتا۔

گذشتہ کلچروں سے مشابہت کی بنا پر پیش گوئی کرنا

اگر کوئی دنیا کی تہذیب کے مستقبل کو جاننے کا خواہش مند ہو اور مستقبل ماضی سے ملتا جلتا نظر نہ آئے تو اس کے لیے تاریخ کا استعمال متضاد معلوم ہوگا۔ تاریخ کے واقعات کی رفتار میں زبردست وقفے ملیں گے۔ اس کی پیش گوئی کرنا ایک مسئلہ ہوگا۔ اس طرح کے رخنوں کو ہم کوئی انتہائی سنسنی خیز واقعہ یا "انقلاب" کہیں گے۔ عجیب بات ہے کہ دنیا کے خاتمے کی پیش گوئی کرنے والے پیامبروں نے پیش گوئی کی کوششوں کو ایک طرح کے ادبی مغالطے کے ساتھ جوڑ دیا تاکہ ان کے خیالات معتبر مان لیے جائیں۔ مصنف نے پیش گوئیوں کو اپنے نام کے تحت نہیں لکھا، بلکہ ماضی کی کسی مشہور و معروف مذہبی شخصیت کے حوالے سے تحریر کیا۔ البرٹ سوئٹزر (Albert Schweitze) نے لکھا کہ کلاسیکی پیغام ربانی (apocalypse) میں مبینہ مصنف تاریخ کے سفر کی پیش گوئی ماضی بعید میں اس دن سے شروع کرتا ہے، جب حقیقی مصنف زندہ تھا۔ جیسے یہ اس دور کی جھلکیاں ہیں اور آخری وقت کے تصور کے ساتھ اسے مکمل کرتا ہے۔ چونکہ قاری گزشتہ واقعات کے بارے میں پیش گوئیوں کی صداقت کی تصدیق کر سکتا ہے، اس لیے یہی امید کی جاتی ہے کہ آنے والے واقعات کے بارے میں جو پیش گوئی کی جا رہی ہے، وہ ان کا قائل ہو جائے گا۔

حقیقت تک پہنچنے کا ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کو نامیاتی وحدتوں سے مشابہ سمجھ لیا جائے، جن کے تجربات زندگی کی گردش سے ہم آہنگ ہوں۔ دنیا کی تاریخ میں تعطل کے بڑے زمانے نئی تہذیبوں کی پیدائش سے جڑے ہوئے ہیں۔ تہذیبیں جب ایک بار پیدا ہو جاتی ہیں، تو وہ واقعات کے تسلسل کے ساتھ چلتی رہتی ہیں جن کے بارے میں کسی حد تک پیش گوئی گزشتہ تہذیبوں کے ساتھ مماثلت کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔ چونکہ ان کی تاریخ معلوم ہوتی ہے، لہٰذا موجودہ تہذیب کے آئندہ پہلوؤں کے بارے میں قیاس، اس سے پہلے کے واقعات کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ درست ہے کہ مستقبل بالکل نئے اور غیر متوقع انداز سے منکشف ہوتا ہے، لیکن آئندہ ماضی کے واقعات میں ایک عمومی مطابقت ہو سکتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے آئندہ زندگی کے بارے میں ایک بچے کی توقعات والدین کے تجربے کے مطابق ہو۔ بچہ پنگھوڑے میں ہو تو بھی امید کی جائے گی کہ وہ آئندہ بڑا ہوگا، عمر

میں پختہ ہوگا اور پھر زوال آ جائے گا۔ اس نمونے کو اگر ہم تہذیبوں پر منطبق کریں تو تہذیب کی تعریف پیچیدہ ہو جائے گی۔ نہایت واضح تعریف کے بغیر زندگی کی نہج پر تاریخ کے تجربوں کی تفسیر لاتعداد طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔

اوسوالڈ سپنگلر نے تاریخ کی پیش گوئی کی ٹیکنیک وہی بیان کی، جس کا نمونہ گوئٹے کے تصور ''زندہ فطرت'' میں ملتا ہے۔ اس نے مغرب کے زوال (Decline of the West) میں لکھا کہ ہر تہذیب ایک فرد کی مرحلہ وار عمر کی طرح گزرتی ہے۔ ہر تہذیب کا بچپن ہوتا ہے، جوانی آتی ہے، پختہ عمری آتی ہے اور بڑھاپا۔ یہ ایک جوان اور کپکپاتی ہوئی روح ہے، خوش فہمیوں کے بار سے بوجھل، جو خود کو ابتدائی طرزِ تعمیر (محراب و گنبد) میں نمایاں کرتی ہے اور گوتھک (زمانہ وسطیٰ) کے اندر ظاہر ہوتی ہے... بچپن ہم سے مکالمہ بھی کرتا ہے۔ کبھی ابتدائی زمانے میں ہومر کی زبان میں، ابتدائی مسیحی فن میں، مصر کی قدیمی بادشاہتوں کے دور کی تخلیقات میں اور یہاں سے چوتھے حکمران خاندان تک ... اپنے وجود میں کلچر جس قدر نصف النہار تک پہنچتا ہے، وہ اتنا ہی قوتِ مردانگی کا حامل، سخت گیر، منضبط اور اس کی خود یافتہ زبان اتنی ہی صریح اور شدید ہوتی ہے، اسی قدر اسے اپنی طاقت کا شعور ہوتا ہے، اس کے خدوخال بھی اسی طرح واضح ہوتے ہیں... پھر اس کے بعد اکتوبر کے اواخر کی میٹھی میٹھی خوشبو کے ساتھ، حرم سرائیں، شہوانیت اور جنسی اُبال، عربی گھوڑوں کی نال کی طرح محرابی محلات، ڈریسڈن کے سوئنگر اور وائیو اور موزارٹ کا دور (موسیقی اور فنونِ لطیفہ کا دورِ شباب) یہاں تک کہ تہذیب کی صبح کاذب طلوع ہوتی ہے، اور روح کے اندر بھڑکتا ہوا شعلہ سرد ہو جاتا ہے۔ زمین بوس ہوتی ہوئی طاقتیں ایک بار پھر سنبھل کر کھڑی ہوتی ہیں، نصف حد تک کامیاب ہوتی ہیں، تخلیق کی کوشش کرتی ہیں اور کلاسیک پیدا کرتی ہیں جو مرتی ہوئی تمام تہذیبوں میں مشترک ہے۔

سپنگلر نے گوئٹے اور فریڈرک اعظم کی عظیم دانش کو پار کیا کہ یہ ہستیاں تاریخ کے مماثل کرداروں کے درمیان کامل اعتبار سے داخل ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ فریڈرک اعظم، فرانسیسیوں کا تقابل، فلپ کے دورِ حکمرانی میں مقدونیہ سے اور یونان کے زیرِ نگیں جرمنی سے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے ''اس وقت بھی جرمنی کے تھرمو فائل (thermophylae) الساک اور لورین، فلپ کے قبضے میں ہیں اور کارڈینل فلوری کی پالیسی کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ اس متوازی کیفیت کو ہم ہیسبرگ اور بوربن کے ایوانوں اور انیٹونی اور آکٹیولس کے درمیان

اختلاف میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ تاہم یہ بیشتر تاریخی وجدان کی جھلکیاں تھیں۔ سپنگلر کا مقصد تاریخ کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک طریقہ کار کی دریافت تھا۔ مشابہتیں جہاں تک ان کا مقصد تاریخ کے نامیاتی ڈھانچے کی پرتیں کھولنا تھا، تاریخ کے افکار کے لیے ایک مبارک بات تھی۔ ایک جامع تصور کے زیر اثر اس تصور کے فروغ سے ناگزیر نتائج یقیناً ظاہر ہوں گے۔ اس فن کارانہ طریقے کو عالمی تاریخ کی مارفولوجی (اشکال اور ہیئت کا مطالعہ) کہتے ہیں۔

مختلف تہذیبوں کے درمیان اشکال و ہیئت کے تقابل کی بنیاد پر پیش گوئی کی جائے تو یہ ٹیکنیک عملی طور پر سود مند ہوتی ہے۔ سپنگلر کی کتاب 'مغرب کا زوال' میں ایسی ہی پیش گوئی ملتی ہے، جس کا تعلق اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل سے ہے کہ جو کیفیت یونان اور روم کے تعلق سے مغربی یورپ اور امریکا کی تھی۔ اس نے لکھا تھا، ''یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس وقت تک انیسویں اور بیسویں صدیاں عالمی تاریخ کے خطِ مستقیم پر انتہائی بلند نظر آتی ہیں، جسے ہم ہر کلچر میں جو اپنی حد تک تکمیل پا چکا ہے، دیکھ سکتے ہیں۔ مشابہت کے حساب سے دیکھیں تو یہ زمانہ، ہمارے مخصوص معنوں میں ہمارے عہد کے متوازی نظر آتا ہے۔ ہماری مخصوص فہم کے مطابق ہم عصر ہیں، جس میں ایک پہلو یونانی تہذیب کا ہے اور اس کا نقطہ عروج ہے، جس پر ایک نشان عالمی جنگ کا ہے، جو یونانیت اور رومی تہذیب کے درمیان ایک عبوری زمانے کے مقابل ہے۔ روم اپنی نہایت سخت حقیقت پسندی کی بہ دولت ہمیں مشابہتیں مہیا کرتا رہے گا، جسے ہم رومن و کیتھولک کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں۔

سپنگلر پر اس لیے بہت سخت تنقید کی گئی ہے کہ مختلف تہذیبوں میں جو واقعات رونما ہوئے ان میں اس نے ایک آہنی گرفت کے ساتھ یکسانیت ثابت کی۔ جسمانی حرکات کے مقابلے میں حیاتیاتی عمل میں ایک ڈھیلا ڈھالا غیر رسمی تعلق ہو سکتا ہے۔ پھر جیسا کہ آئندہ واقعات سے ثابت ہوا، مغرب کے مستقبل میں بیسویں صدی کے اندر بہ مشکل کوئی ایسا نمونہ موجود تھا، جس کی مثل رومن سلطنت کی تاریخوں میں ملتا ہو۔ تفریحات کا عہد شروع ہوا تو سپنگلر اپنا مقالہ لکھتے ہوئے ''پاپ کلچر'' کے متعلق قیاس کرنا بھول ہی گیا، اس کی پیش بینی تہذیب کے تیسرے دور کی ذہنیت پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کہ سپنگلر کی واضح پیشگوئیاں اصل واقعات سے دور تھیں، لیکن اس کا تمثیلی طریقہ، تاریخ کی بے یقینیوں سے نپٹنے کا ایک قرینہ مہیا کرتا ہے۔ اگر مروجہ رجحانات پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تو بھی زندگی کے تہذیبی عمل میں

ایک دوسرے کے ساتھ منطبق ہونے والے نکات مستقبل کے راستے کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ موجودہ اور آئندہ معاشروں کے پیامبر مستند تاریخی واقعات کے درمیان مشابہت تلاش کرکے اوران پر دلائل پیش کر کے قیاس کر سکتے ہیں کہ گزشتہ تہذیبوں کے بارے عام معلومات کی روشنی میں کیا کچھ ہوا ہوگا، یہی داخلی توانائی ہر عہد کے انسانی معاشرے پر صادق آتی ہے۔

ماضی کی تہذیب کے چند مشاہدات

عالمی تاریخ مستقبل کی سوسائٹی کے سلسلے میں یقینی اشارے مہیا کرتی ہے، ماضی کی سوسائٹی سے چند ترقی پذیر اسلوب چن کر نکالے جا سکتے ہیں، ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

1) یہ کہ جب ایک بڑی اور نئی تہذیبی ٹیکنالوجی سوسائٹی میں نمو پذیر ہوتی ہے تو اس سے ایک نئی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے، یہی زندگی کی گردش کا مولد ہوتا ہے، اور یہ کہ

2) ایک نئی تہذیب اپنے ساتھ طاقت کے نئے ادارے لاتی ہے، بعض امور جو پہلے غیر رسمی طور پر ظاہر ہوتے تھے، اب اس ڈھانچے میں منظم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ ادارے اپنی سیاسی اور تہذیبی بالادستی کا دبدبہ قائم کرتے ہیں، اور یہ کہ

3) کسی تہذیب میں بالادست اداروں اور عمل پر مستعد اس کی تہذیبی ٹیکنالوجی کے درمیان ایک تعلق ہوتا ہے۔اس ٹیکنالوجی میں پوشیدہ خصوصیات اس نئی تہذیب کی تشکیل کرتی ہیں۔ اور یہ کہ

4) نئی تہذیبیں نئی قسم کے عقائد اور شخصیت کے نئے ماڈل اپنے ساتھ لاتی ہیں، اور یہ کہ

5) ایک عہد کے دوران میں تہذیبی تحرک اقدار میں تبدیلی لاتا ہے۔ جو موضوعات ایک عہد کے آغاز میں چھائے ہوئے تھے، اس عہد کے ختم ہونے تک ان سے بالکل متضاد موضوعات کے لیے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔

مخالف سمت میں حرکت

آخری نقطے کے حوالے سے ایک رجحان جو ہمیں نظر آیا وہ، مثال کے طور پر، تہذیب کے پہلے عہد کے آغاز میں فوجی اور سیاسی طاقت کا ارتکاز تھا۔ شہری ریاستوں کے حکمران اپنے اپنے علاقوں میں توسیع کے لیے ایک دوسرے سے جنگیں لڑتے تھے۔ مشرق وسطیٰ کی عظیم سلطنتیں نہایت خوف ناک لڑائیاں لڑتی تھیں۔ پوری پوری قوموں کو اپنی آبائی

زمینوں سے اجاڑ دیا جاتا تھا۔ کئی صدیوں کی مسلسل خون ریزی اور لوٹ مار کے بعد آ کیٹو والوں کو روم کی سوسائٹی میں مکمل طاقت حاصل ہو سکی تھی، پھر شہنشاہ آ گسٹس نے مزید فتوحات سے دست کش ہونے کا اعلان کر دیا۔ انہی دنوں میں ایک بچہ مویشی کی ایک کھرلی میں ان والدین کے یہاں پیدا ہوا، جنھوں نے شاہی مردم شماری کی تعمیل کی تھی۔ جلد ہی اسے ''امن کے شہزادے'' کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ حضرت عیسیٰ نے یہ درس دیا کہ خدا کی بادشاہت میں زمین کے وارث کمزور ہوں گے۔ جو سب سے پیچھے ہیں وہ اوّل ہوں گے، جو اوّل ہیں، وہ آخر میں ہوں گے۔ اس منکسر مزاج بادشاہ کو جس نے کانٹوں کا تاج پہنا تھا، صلیب پر ہلاک کر دیا گیا اور اس کے باوجود آئندہ صدی کلیتاً اس کی تھی۔ تہذیب کے دوسرے عہد کے اوائل میں فکر کا مرکزِ توجہ ''خیال'' تھا، ''لفظ'' تھا، جس کے لیے اپوسٹل پال نے کہا تھا ''اَن دیکھی اشیا۔'' خدا کو ظاہر کی شکل میں پیش کرنے کا مطلب تھا بت پرستی۔ ابتدائی دور کے عیسائی درویش صفت شخصیات کو پسند کرتے تھے، جیسے سینٹ اینتھونی۔ وہ صلح جو اور انسان دوست تھے، انہوں نے روم کی فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر مسیحی چرچ روم کا ریاستی مذہب بن گیا۔ پاپائیت طاقت کا مرکز بن گئی۔ تہذیب کے دوسرے عہد کے ختم ہونے تک پوپ یورپ کے شاہ زادوں کو حکم دیتے تھے کہ ارضِ مقدس کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف فوجی مہم کرتے رہو۔ پوپ کی ریاست نے اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے کرایے کے سپاہی بھرتی کیے تھے۔ انہوں نے سینٹ پال چرچ کی از سر نو تعمیر کے لیے تاریخ کے بہترین فن کاروں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ حسن، دولت اور طاقت، پھر یہ نیا دور ابتدائی مسیحی اقدار کے بالکل منافی تھا۔

تیسری تہذیب کی ابتدا اور نشاۃ الثانیہ کے دور میں فنی اظہار نے نظر آنے والی اشیا کی تمام و کمال نمائش میں راہ پائی۔ گیوٹو (Giotto) کے فن نے حقیقت پسندانہ پینٹنگ کو ایک نیا اسلوب دیا، جس کے تحت رنگ اور اشکال یوں معلوم ہوتے جیسے چھو کر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ دور بھی یورپی شاہ زادوں کی افضل و اعلیٰ طاقت کے ساتھ شروع ہوا۔ پھر انیسویں صدی میں فوٹو گرافی کی نئی ایجاد سامنے آئی۔ اس نے مشینوں کو یہ صلاحیت دی کہ نظر آنے والے مناظر کو انتہائی صحت کے ساتھ پیش کر سکتی تھیں، اس طرح کہ انسانی ہاتھ اس کامیابی کا صرف قیاس کر سکتا تھا۔ کیمرے سے متاثر ہو کر مصوروں نے خوش وضع اور جاذبِ نظر اشیا کو

پینٹ کرنے کی کوشش ترک کر دی، اس کی بجائے کینوس پر رنگین نقطے ڈالنے لگے، جیسے کیوب ازم، سریل ازم اور ڈاڈا۔ یہ پہلی عالمی جنگ کے آس پاس کی بات ہے۔ یہ فن روایتی معنوں میں کسی خوبصورتی اور ہیئت سے خالی تھا، یہ تو دنیا کے پارہ پارہ ہوتے ہوئے وجود کو پیش کر رہا تھا۔ تہذیب کے تیسرے عہد کے آخر میں تیسری جنگ عظیم کے ساتھ جرمنی، روسی اور آسٹرو ہنگرین بادشاہتیں اور ترکی کی سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئیں۔

تہذیب کے چوتھے عہد کا آغاز تفریح کی صنعت کے ساتھ ہوا۔ امریکا میں گوروں کو نیگرو غلاموں کے گیت اور ناچ کے ڈھنگ دیکھ کر ان کی نقل کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ مسرت انگیز اور سرکس جیسے مناظر میں گنوار تماشائیوں کو بہت دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ عوامی کلچر، علمی روایت اور متانت کے مقابلے میں لوگوں کی توجہ زیادہ حاصل کرنے لگا۔ اس میں خوش مذاقی تھی اور یہ محفوظ بھی تھا، اور چونکہ اس طرح کی تفریح خوب پھل پھول رہی تھی، لہٰذا اس کے کاروباری پہلو نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی۔ فلم، ریڈیو اور ٹیلی وژن نے خاصی تعداد میں اپنے ناظرین اور سامعین پیدا کر لیے، جن تک مشتہرین پہنچ سکتے تھے۔ پھر وہ وقت آیا کہ تفریح کے کاروبار سے لطف جاتا رہا۔ نپی تلی، پہلے سے بنائی ہوئی ٹھنڈی چیزیں، جن کے اظہار کی اجازت ہوتی، ناظرین اور سامعین تک پہنچنے لگیں۔ بہ ظاہر کارٹون کے سادہ و معصوم چہرے کے پیچھے ان عظیم الجثہ کارپوریشنوں کا خطرہ صاف نظر آتا جو اپنی تخلیق کے حق ملکیت کو بچانے کے لیے کوشاں رہتے۔ شہری حقوق کی تحریک کے نتیجے میں امریکا کی مقبول عام تفریحات میں سیاہ فام باشندوں کو پیش کرنے کا انداز سیاسی درستی کے تابع ہو گیا اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ یہاں بھی پنڈولم مخالف سمت میں نکل گیا۔

سیاسی قیادت: معاصرانہ یکسانیت

شخصیت کے نمونوں کے تعلق سے تمام تہذیبوں میں اوّل سے اب تک سیاسی لیڈروں سے ابتدا ہوتی آئی ہے۔ ان لیڈروں نے، جو تاریخی عظمت کے درجے پر پہنچ گئے، اپنے زمانے کی شخصیات کے مزاج کو سمجھا تھا۔ ایک سیاسی لیڈر کی اصل ضرورت یہ ہے کہ وہ ایک ماہر فوجی کمانڈر، منتظم یا قانون دان ہو۔ ان خصوصیات کے علاوہ تہذیب دوئم میں آنے والے بادشاہ اور شہنشاہ فلسفہ کا ذوق رکھتے تھے یا ان میں کوئی الوہی بصیرت ہوتی تھی۔ تہذیب

سوئم میں آنے والے اکثر اوقات باکمال مصنف ہوتے تھے۔ تہذیب چہارم میں سے بعض کا پس منظر تفریحات سے اُن کا تعلق تھا۔

سکندر اعظم ایک باکمال فوجی سالار ہونے کے علاوہ فلسفے اور ہومر کے ادبی ورثے میں ماہرانہ دست رس رکھا تھا۔ وہ ارسطو کا طالب علم تھا، چنانچہ اس نے فلسفے پر مبنی یونان کی تہذیب کو بڑی سرگرمی کے ساتھ فروغ دیا۔ ہندوستان کے بادشاہ اشوک کے بارے میں معلوم ہے کہ اس نے بودھ مت کو ترقی دی۔ مارکس آریلیس ایک قابل فلسفی تھا۔ اس کی تصنیف ''مراقبے'' (meditations) کو آج بھی بہ کثرت پڑھا جاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کو انسانوں تک پہنچانے والے پیغمبر تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ماہر فوجی اور سیاسی رہنما تھے۔ مشہور مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے خود اپنا مذہب ایجاد کیا تھا۔

تیسرے عہد کی تہذیب میں دو عظیم ترین امریکی صدور تھامس جیفرسن اور ابراہم لنکن، تحریر کے فن میں مہارت کے حامل تھے۔ جیفرسن نے اعلانِ آزادی کا منشور تحریر کیا اور لنکن نے گیٹس برگ ایڈریس لکھا۔ ان کی عظمت کی اساس ایک حد تک ان کی اس مہارت پر ہے کہ انہوں نے جمہوری مثالیت کے اظہار کی خاطر موزوں ترین الفاظ تلاش کر لیے۔ فریڈرک اعظم فرانس میں انشا نگاری کا ماہر فن تھا۔ ونسٹن چرچل اس لیے مشہور ہے کہ اس نے دوسری عالمی جنگ کے سیاہ ترین دنوں میں دارالعوام میں ولولہ انگیز تقریریں کیں۔ جان ایف کینیڈی کی صدارتی شہرت کا ایک سبب یہ تھا کہ اس کے افتتاحی خطبے کے بعض فقرے حوالے کے طور پر دہرائے جاتے ہیں۔

تہذیب چہارم میں سیاسی لیڈروں کے درمیان ایک مؤثر ترین لیڈر رونالڈ ریگن تھا، جو سیاست میں داخل ہونے سے پہلے ایک فلم سٹار اور ٹیلی وژن کے پروگراموں کا میزبان تھا۔ جان ایف کینیڈی بھی پردے پر نظر آنے والی ایک دلآویز شخصیت تھا۔ بل کلنٹن سیکسا فون بہت اچھا بجاتا تھا اور ایم ٹی وی کے جواں سال ناظرین سے اس کا رابطہ تھا۔ جیسی ونٹورا، ریفارم پارٹی کا وہ پہلا امیدوار تھا جو امریکا کی ایک ریاست میں گورنر منتخب ہوا۔ وہ ایک پیشہ ور پہلوان کے طور پر مشہور ہوا۔

مستقبل میں کسی روز کوئی کمپیوٹر کا ماہر ایک منتخب صدر ہو گا۔ تاریخ ایک اور سیاسی لیڈر کو اس بنا پر اہمیت دے گی کہ وہ عہد کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔

کچھ ایسے سیاسی لیڈر بھی تھے جن کے کارنامے ان کے اپنے عہد سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ لینن ایک فلسفی تھا، وہ تہذیب سوئم کے آخر تک زندہ رہا، اس کی مذہبی، سیاسی سلطنت اب باقی نہیں رہی۔ فرعون اخناتون اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوگا، اس کی مذہبی اختراعات کو اس کی موت کے فوراً بعد بھلا دیا گیا۔ بادشاہ نیرو ایک اپنی طرز کا فن کار تھا۔ ایڈلف ہٹلر سیاست دان بننے سے پہلے بیرونی مناظر کی پینٹنگز بناتا تھا، لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی خصوصیات نے ان کی تاریخی شہرت کو چار چاند نہیں لگائے۔

ایک یادگار فوٹو گراف میں رچرڈ نکسن، آزاد دنیا کا سیاسی لیڈر، راک میوزک کے بادشاہ ایلوس پریسلے سے مصافحہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا یادگار موقع تھا جب دو مختلف تہذیبوں کے نمائندے روبرو نظر آئے۔ جب انگلینڈ کی شہزادی ڈیانا 1997 میں کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئیں تو شاہی خاندان اور اخبارات کے درمیان ایک نہایت ناگوار تصادم دیکھنے میں آیا۔ ڈیانا کے بھائی لارڈ اسپنسر نے اخباری فوٹو گرافروں پر الزام لگایا کہ انہوں نے ڈیانا کی کار کا جارحانہ انداز سے پیچھا کرتے ہوئے انہیں ہلاکت تک پہنچا دیا۔ عوامی روزناموں نے جواب میں شہ سرخیوں کے ذریعے حملہ کیا اور اشارتاً بتایا کہ ملکہ الزبتھ اور شاہی خاندان کے افراد نے ڈیانا کی موت کو بہت زیادہ لاتعلقی کے انداز سے برداشت کر لیا۔ ایک اخبار کی سرخی چیخ کر سوال کر رہی تھی، ''ملکہ کہاں ہے؟'' ''تمہارے عوام سوگ میں ہیں، ہم سے بات تو کرو۔'' یہ ایک اور اخبار کی عبارت تھی۔ عام لوگ جلد ہی ملکہ کی سرد مہری کی شکایت کرتے نظر آئے، چنانچہ ملکہ کو ٹیلی وژن پر آنا پڑا اور عام لوگوں کو یقین دلانا پڑا کہ وہ بجا طور پر فکر مند تھی۔ حیرت ہے کہ وہی تند و تیز خبریں تھیں جن سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ شاہی خاندان کے افراد نجی طور پر اپنے آپ کو ''فرم'' کہتے تھے، جو اس عہد کے مطابق ایک موزوں نام تھا۔ کاروباری دور میں شاہی خاندان کا وہ حوالہ اس دور کی روایت کے مطابق بالکل موزوں تھا۔

بدلتی ہوئی تہذیبوں کا اثر

تاریخ کا ایک سبق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طاقت وَر ادارے اپنی طاقت کو دائم محفوظ کر لینے کی خاطر ظالم و جابر بھی ہو سکتے ہیں۔ بالعموم ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وہ عہد ختم ہونے کو آتا ہے، جس میں سوسائٹی کے اندر ان کی بالادستی ہوتی تھی۔ ایسے میں سوسائٹی کے غیر اہم گوشوں کے ادارے آئندہ عہد میں اپنی برتری قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

تخلیق کا ولولہ دوسرے علاقے کی طرف مڑ جاتا ہے۔

جب پہلی تہذیب نے دوسری کے لیے راستہ دیا تو فلسفیوں نے حکومت کا اخلاقی سطح پر ایک تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ حکومت کے پہلو بہ پہلو افکار پر مبنی مذہب نے معاشرے کے اندر اپنی جگہ بنالی۔ جب دوسری تہذیب الگ ہو کر تیسری کے لیے راستے سے ہٹ گئی، اس وقت پاپائے روم اور رومن شہنشاہوں کے درمیان طاقت کے حصول کے لیے خوف ناک جدوجہد ہو رہی تھی۔ عیسائی مسلمانوں سے جنگ کر رہے تھے۔ پروٹسٹنٹ کیتھولکس سے لڑائی لڑ رہے تھے۔ ان حالات میں ساہوکاروں اور مہاجنوں نے معاشرے میں بااختیار حیثیت حاصل کر لی۔ جب تیسری تہذیب چوتھی کے لیے راستہ چھوڑ کر الگ ہوگئی، اس وقت انسانیت دو عالمی جنگوں کے تجربے سے گزر چکی تھی، جن کا سبب اقتصادی رقابتیں اور متصادم نظریات تھے۔ اعلیٰ درجے کی تہذیب میں خود ستائی پیدا ہو گئی تھی۔ جب خیالات نے بہت سنجیدگی اختیار کر لی تو برہمی اور تفرقے پیدا ہوئے۔ لہٰذا عام لوگ ہلکے پھلکے مشاغل کی طرف متوجہ ہوئے۔ عوام الناس کے لیے تفریح روزمرہ کا معمول ہو گئی۔ اب ہم تاریخ کے پانچویں عہد کی طرف پیش قدمی شروع کرتے ہیں۔ تفریح کے کلچر کے ردِعمل کی تیاری ہو رہی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کلچر اپنی حد سے تجاوز کر چکا ہے۔

عجیب بات ہے کہ نئی تہذیب کی آمد کے ساتھ ہی ان اداروں میں بھی تبدیلی آتی ہے، جو دو عہد پہلے ظہور میں آئے تھے۔ ایسے ادارے ایک بڑی تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہیں اور جمہوریت کی تحریک کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

مذہبی ادارے، جن میں فلسفے کی بہ دولت دوسرے عہد میں تبدیلی آئی تھی، ہم پہلے ان کا مقابلہ اس مذہب سے کرتے ہیں جو ماقبل تاریخ رائج تھے۔ تاریخ سے پہلے کے یا ابتدائی دور کے مذہب پر موروثی پجاریوں کا قبضہ تھا۔ یہ رسوم و رواج پر مبنی غیر تحریر شدہ اور مظاہر قدرت سے منسلک مذہب تھا۔ عالمی مذہب اعتقادات پر مبنی اور صحائف کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کا مرکز خدا کے بارے میں خیالات ہیں۔ اس کی رکنیت تمام عقیدت مندوں پر کھلی ہوئی ہے اور اس کے مناصب کا تعین ایک معمول کے تحت اہلیت پر ہوتا ہے۔ بدھ مت کے ابتدائی زمانے میں، جب اس نے برہمن پجاریوں کے اقتدار کو چیلنج کیا تھا ایک جمہوری خواہش ابھرتی ہوئی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

اس کے بعد شاہی حکومت آتی ہے، جس کی پہلی تہذیب پر بالادستی تھی۔ تیسرے تاریخی عہد میں اس کے اندر بھی اسی طرح تبدیلی ہوئی۔ کوئی شہنشاہ بار بار کی کوششوں کے باوجود یورپی اقوام کو ایک دیرپا سلطنت میں متحد نہ کر سکا۔ اس کے بعد تو شہنشاہیت نے بجائے خود جمہوری حکومت کے لیے اقتدار چھوڑ دیا۔ عوام کی خواہش، کم از کم نظریے کی حد تک، نیا سیاسی مرکز اقتدار تھی۔

آخر میں عالمی مذہب، جو دوسری تہذیب کی پیداوار تھا، چوتھے تاریخی عہد میں ایک نہایت لطیف حملے سے دوچار ہوا، جب تفریح کی صنعت نے سنجیدہ تفکر کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔ ٹیلی وژن نے کنزیومرازم کو ہوا دی (لوگوں کو خرچیلا بنایا)، ساریت پسندی کا رویہ پیدا کیا، جس میں ترجیح ''نظر آنے والی اشیا'' کو حاصل ہے نہ کہ وہ جس کا جنت میں ملنے کا وعدہ ہے۔ مذہب کا دل دادہ شخص یا اپنے نظریاتی عقائد میں مضبوط شخص اس کلچر کا سامنا کرتے ہوئے اسے مفسدانہ اور بت پرستانہ سمجھتا ہے۔

اگر اس پیٹرن یا تبدیلی کے نمونے کو درست مان لیا جائے تو پھر امید کی جائے گی کہ چوتھی تہذیب ان اداروں کی ہیئت بدل دے جنھیں تیسرے تاریخی عہد میں فروغ حاصل ہوا تھا۔ ان میں سب سے اہم سیکولر تعلیم اور تجارت ہے۔ معاشرے کو جمہوریت سے ہم کنار کرنے کا عمل ان اداروں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اس طریق عمل کے حوالے سے کچھ سوالات

تہذیبیں جان دار مخلوق نہیں ہوتیں جو صاف طور پر بڑی ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ بلکہ ان کے درمیان اتحاد کے قرینے ہوتے ہیں، جن کو تاریخ دانوں نے وسیع پیمانے پر ہونے والے تجربوں کے درمیان پہچان لیا ہے۔ حقائق کے انبار میں ہر ایک کو ایک مختلف تہذیبی قرینہ مل سکتا ہے۔ سپنگلر نے گوئٹے کا حوالہ دیا ہے جس نے ستمبر 1792 میں والمی کی جنگ کے آخر میں کہا تھا، ''یہیں سے اور اس وقت عالمی تاریخ کا ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے اور آپ سب بھلے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ تم بھی وہاں موجود تھے۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کی فتح کے لیے فرانسیسی افواج کی پہلی پیش قدمی تاریخی طور پر بہت اہم تھی لیکن یہ ایک الگ بات ہے کہ اس سے عالمی تاریخ کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا تھا۔ یہ کتاب سال 1792 کو انسانی تاریخ

میں ان دنوں ہونے والے واقعات کی بنا پر محوری حیثیت نہیں دیتی۔ تاریخ دانوں نے ایسے نقاط کو اور اس کے ساتھ ہی ایسے تجربات کو عہد ساز قرار دیا ہے، جیسے صنعتی انقلاب، جمہوری حکومت کی آمد، مشاہدے اور تجربات پر مبنی سائنس کا عروج اور اقتصادی عالم گیریت (گلوبلائزیشن)۔ بلاشبہ یہ سب اہم واقعات ہیں، لیکن یقیناً عالمی تاریخ میں نئے عہدوں کا تعین کرنے والے واقعات نہیں۔

یقیناً یہ کتاب اپنی سکیم کا دفاع پیش کرے گی۔ آخر وہ کون سی بات ہے جو تہذیبی ٹیکنالوجیز کو تاریخ کے نئے عہدوں کے تعین میں سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہی مواصلاتی ٹیکنالوجیز، عوام کے تجربوں کی تشکیل کرتی ہیں۔ اداروں کے ساتھ ان کا ایک غیر رسمی سا رابطہ ضرور ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ ''اس کی تاریخ بناتے ہیں''۔ تاریخی تجربہ ان میں اپنا ذائقہ شامل کرتا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پہلی ایجاد اور ایک بڑی نئی ٹیکنالوجی، ایک نئے تمدن کا نقطۂ آغاز ہیں اور اس رعایت سے پرانے عہد کا خاتمہ ہے۔ چونکہ کمپیوٹر ایک نئی ٹیکنالوجی ہے، جو ابھی حال میں سامنے آئی ہے، اس لیے ہمیں علم ہے کہ ہم ایک اہم تہذیبی تبدیلی کے درمیان آ گئے ہیں۔ یہ پیش گوئی کرنا کہ اس کے بعد کیا ہوگا، ایک چیلنج ہے۔

تبدیلی، ہر وقت اور ہر زمانے کے لیے ایک حقیقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ تبدیلیاں جو لوگوں کو نظر آ رہی ہیں، کسی گہری بصیرت پر مبنی اور غیر مبدل تہذیبی تبدیلیاں ہیں، یعنی ایک نئی تہذیب ہے، یا محض نشیب و فراز کا ایک ثبوت ہے۔ ایک اصولی اور استدلالی تاریخ، جیسی کہ یہ ہے، کسی فیصلے تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے، لیکن کیا وہ فیصلہ درست بھی ہے؟ اس کے دفاع میں یہ کہا جانے لگا کہ اس کتاب میں جو نتائج حاصل ہوئے ہیں، وہ عام طور پر تاریخ کے اعداد و شمار کے مطابق ہیں۔ بیشتر تاریخ دانوں نے قبل مسیح چھٹی اور پانچویں صدیوں کو انسانی تاریخ میں محوری قرار دیا ہے اور ایک بار پھر چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اطالوی نشاۃ الثانیہ کے دور کو تاریخی اعتبار سے بہت اہم قرار دیا ہے۔ اس کتاب کی بصیرت کے مطابق وہ زمانے علی الترتیب دوسرے اور تیسرے تہذیبی ادوار کے نقطۂ آغاز تھے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا تعلق مخصوص حالات سے تھا، جو دوسرے زمانوں میں نہیں تھے، جن سے تخلیقی تبدیلی کے لیے امنگ پیدا ہوتی۔ اس مسئلہ پر بحث اس باب میں آگے چل کر ہوگی۔

ایک تعلق سماجی ڈھانچوں کے ساتھ

سب سے پہلے، ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ تہذیبی ٹیکنالوجیز کا ہمارے معاشرے پر اور اس کے کلچر پر بالعموم کیا اثر مرتب ہوا۔ یہ کتاب اس نظریے کو آگے بڑھاتی ہے کہ معاشرے میں نئی تہذیبی ٹیکنالوجیز کے آنے سے نئی تہذیب ظہور میں آتی ہے۔ ان دونوں باتوں کے درمیان کیسا تعلق ہے، اسے ثابت کرنے کے لیے یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ سبب، اثر کے مقابلے میں پہلے ظاہر ہوا، اگرچہ بہت پہلے نہیں، اور تقریباً اسی جگہ ظاہر ہوا یا اس نہج کے مقاصد اس میں شامل تھے۔ دوسری بات یہ کہ سبب اور اثر کے درمیان کوئی منطقی تعلق ہونا چاہیے، جس سے یہ ظاہر ہوا کہ ایک نے دوسرے پر کیا اثر ڈالا۔ اس سلسلے میں ہم یہ موقف رکھتے ہیں کہ ایک نئی ٹیکنالوجی سے وہ خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں، جن کا تعلق متاثرہ تہذیب کے عناصر سے ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ تہذیبی ٹیکنالوجیز سبب ہے، ہر ایک ٹیکنالوجی مخصوص زمانے میں اور مقام پر وجود میں آئی، جس کی بانی تاریخی شخصیات تھیں۔ اثر اس سبب کا تہذیب ہے۔ یہ اثر کہاں تک پہنچا، اس کی نشان دہی دشوار ہے۔

مواصلات کا جو ذریعہ حاوی ہوتا ہے، اس میں تبدیلی، عام لوگوں کے تجربے میں تبدیلی پیدا کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی معاشرے میں بھی آتی ہے۔ رابرٹ لوگان نے لکھا تھا کہ ''سماجی ڈھانچے لازمی طور پر ان نمونوں کی نقل کرتے ہیں یا انہی کو دہراتے ہیں جن سے یہ بالادست ٹیکنالوجیز کی تنظیم ہوتی تھی۔ اس کے خیال میں، مثال کے طور پر، تحریر کی زبان نے ایک نئی ذہنی لہر پیدا کر دی، وہ نمونہ ٹیلی وژن دیکھنے میں پیدا نہیں ہوتا۔ دماغ کا بایاں حصہ عقلیت پسندی، منطق، یقین، تسلسل، حساب دانی اور تجزیے کی صلاحیت رکھتا ہے جو مواصلت کے علمی طریقہ ہیں... دماغ کا دایاں حصہ، وجدان، تمثیلی استدلال، شناخت کے اسلوب، اہتمام، توارد اور زبانی اور برقی اسلوب بیان کی طاقت رکھتا ہے۔ بایاں حصہ دماغ کی خواندگی کی تخصیص پر مائل ہوتا ہے، دماغ کا دایاں حصہ زبانی اور برقی اسلوب اور متنوع نظم و ضبط کی پابندی کی طرف رخ کرتا ہے۔

خیالی خاکہ نگاری پر مبنی تحریر کا تعلق شاہی حکومت کے قیام سے ہے۔ منشیوں کی تربیت کا مقصد گرجا اور شاہی محل کے انتظامات کی خاطر منتظم افراد فراہم کرنا تھا۔ اس مرحلے

میں خواندگی تھوڑے سے پیشہ ور لوگوں تک محدود تھی۔ معاشرے کو بس اتنی ہی ضرورت تھی کہ ایک طریقے سے اطلاع درج کر لی جائے تاکہ اسے بعد میں پہچانا جا سکے۔ خیالی خاکوں پر مبنی تحریر کا عام لوگوں کو سکھانا سخت مشکل تھا۔ صرف ایک وسیع افسر شاہی اس ہنر میں چند افراد کی تربیت کر سکتی تھیں۔ تحریر کی زبان جو چند لوگوں کی دست رس میں ہوتی، وہی ان بہت سے لوگوں کو جو انہی ذمہ داریوں سے وابستہ ہوتے، مواصلات کا قرینہ فراہم کرتی۔ حکومت ایک بھاری اکثریت پر اپنا کنٹرول رکھتی اور بہت سی آبادیوں کو یکساں پیغام بھیجتی تھی۔ ان تحریروں کو شاہی دفتر اعلیٰ سے سلطنت میں مختلف جگہوں پر بھجوا دیا جاتا تھا۔ ٹیکسوں کی وصولی اور قانون کی عمل داری اس انتظام کے تحت ہوتی تھی۔

حروف تہجی کی عبارت پڑھنا نسبتاً آسان ہوتا تھا۔ جب زیادہ تعداد میں لوگ خواندہ ہو گئے، تو وہ کلچر بدل گیا۔ خواندگی جو پہلے پیشہ ور اشرافیہ کے قبضے میں تھی، وہاں سے نکل کر عام لوگوں تک پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مذہب جمہوری ہو گیا۔ خاص طور پر ہندوستان میں ایسا ہوا، عام خواندگی سے فلسفیانہ بصیرت میں اضافہ ہوا۔ لوگوں نے اس کی وضاحت یوں کی ہے۔ ''غالباً حروف تہجی کا سب سے نمایاں اثر یہ ہوا کہ بہت سے مجرد الفاظ کثیر تعداد میں تقریباً بہ یک وقت پیدا ہو گئے۔ لکھا ہوا لفظ بھی کلام کرتے ہوئے لفظ کا اخراج ہے اور صوتی حروف تو خیالی تحریر اور تصویری تحریر سے کہیں زیادہ معنی دیتے ہیں۔ حروف تہجی کی تحریر کا اثر کتنا گہرا ہوتا ہے، اسے مجرد خیال اور زبان میں اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ یونان کے ادب میں اس کا نہایت درجہ اضافہ ہوا۔ یونانی زبان اور ادب ہومر کے زمانے سے ترقی کر کے ہیوسیڈ تک اور سقراط سے پہلے کے فلسفیوں تک اور پھر افلاطون اور ارسطو تک ترقی کے مراحل طے کرتے گئے۔ حروفِ تہجی کی خواندگی کے زیر اثر یونانی مصنفوں نے مجرد خیالات کے لیے ذخیرہ الفاظ تخلیق کر لیا اور یہ آج بھی استعمال میں آ رہے ہیں۔ تصورات جیسے جسم، مادہ، جوہر... اور خیالات جیسے سچ، حسن، عدل، استدلال، ان کو نئے معنی مل گئے اور نئی طرح کے مباحث کا موضوع بن گئے۔

چھپائی ایک ہی متن کی متعدد نقول فراہم کرنے لگی۔ چھپی ہوئی تحریریں خرید و فروخت کی جانے لگیں۔ متن کی تیاری میں جو زائد احتیاط درکار تھی، وہ علمی کارکردگی کے لیے اور اس میں سائنس بھی شامل ہے، نہایت موزوں تھی۔ چھپائی نے علم کے پھیلاؤ میں تیز رفتاری

پیدا کی اور عام تعلیم کے نظام کو تقویت دی۔ اس نے ایک مصنف یا ایک فن کار کو تہذیبی ہیرو کا منصب عطا کیا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ اس نے نجی خط، کتابت کو خبرناموں میں اور بعدازاں روزناموں میں بدل دیا جو قارئین کی کثیر تعداد کے درمیان تقسیم کیے جانے لگے۔ چھپے ہوئے اخبارات اور مجلّوں نے برمحل تاریخ کا احساس پیدا کیا۔ مواصلات اور مراسلت نے حقیقی وقت کے اندر رونما ہونے والے واقعات کو ان کے تسلسل میں پیش کرنا شروع کیا اور افراد کو معاشرے کی اعلیٰ ترین سرگرمیوں کے ساتھ جوڑ دیا۔ اخبارات، کاروباری اشتہارات کی ترسیل کا ذریعہ بن گئے۔ اس طریقے نے انقلاب پیدا کر دیا کہ اب مصنوعات پیدا کرنے اور انہیں فروخت کرنے والے اچھے گاہکوں سے براہِ راست بات چیت کرنے لگے۔ متعدد نوعیت کی مصنوعات کے لیے صارفین کی ایک مارکیٹ پیدا ہوگئی، ساتھ ہی نئی اور بہتر اشیا فروخت کے لیے آنے لگیں۔

انیسوی صدی میں بجلی یا الیکٹرانک کے ذریعے جو ٹیکنالوجیز آئیں، انہوں نے عوامی واقعات کے مناظر کو پیش کرتے ہوئے اخبارات کا کچھ کام سنبھال لیا۔ البتہ ان کی اس اہلیت نے کہ کسی فرد کے سحرانگیز خدوخال کو بھی پیش کر سکتے ہیں، ان کو ایک نہایت درجہ شخصی روپ عطا کر دیا ہے۔ عام لوگ ان میں دلچسپی لینے لگے۔ معلومات حاصل کرنے کے لیے بلکہ تفریح کے لیے ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات نے بہت سی دلچسپ اور چونکا دینے والی شخصیات کو گھروں کے اندر متعارف کرا دیا ہے، جس سے روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں رخنہ پڑ گیا ہے۔ لوگوں نے ایک متبادل تفریح سے ایک دن یا ایک ہفتے لطف اندوز ہونا قبول کر لیا، لاکھوں افراد کا وہی ایک ہی تجربہ تھا، یعنی ریڈیو یا ٹیلی وژن پروگراموں کے متن معاشرے کے مشترکہ کلچر کا حصہ بن گئے۔ کمرشل اشتہار بازی پروگراموں کے ساتھ ہی چلتی رہی، کیوں کہ ان میں فروخت کرنے کی زبردست طاقت ہے۔ مواصلات کی ٹیکنالوجیز جو یہ زبردست ''شو'' پیش کرتی ہیں، تفریح کے کلچر سے وابستہ ہیں اور اس کے لیے ناظرین اکٹھا کر لیتی ہیں۔

چند بے قاعدگیاں

اگر یہ بات مان لی جائے کہ تہذیبی ٹیکنالوجیز ہی تہذیبوں کا تعین کرتی ہیں، تو ہم درج ذیل نتائج تک پہنچ جاتے ہیں۔

وہ سوسائٹی جو خیال پر مبنی تصویر یا حروف کی دریافت سے پہلے کی تحریر کو استعمال کرتی ہے، اس کا تعلق تہذیب کے اوّل دور سے ہوتا ہے۔

وہ سوسائٹی جو حروف تہجی پر مبنی رسم الخط استعمال کرتی ہے، اور جس کی عبارت مطبوعہ متون کی بجائے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہو، اس کا تعلق تہذیب دوم سے ہوگا۔

وہ سوسائٹی جس کا مطبوعہ ادب ہو، لیکن ترسیل کے لیے بجلی یا الیکٹرانک کا استعمال نہ کیا گیا ہو، اس کا تعلق تہذیب سوم سے ہے۔

جب کمپیوٹر کا کلچر قطعی طور پر مکمل ہو جائے گا، اس وقت اسے تہذیب چہارم کہا جائے گا۔

بہت حد تک اس تجویز کا اطلاق ان معاشروں پر اور ان زمانوں پر ہوتا ہے، جب کوئی مخصوص تہذیبی ٹیکنالوجی معرضِ وجود میں آتی ہے۔ البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سوسائٹی کسی ٹیکنالوجی کو جو دنیا میں دیگر مقامات پر موجود ہو نظر انداز کر دے یا اسے نافذ کرنے سے انکار کر دے۔ جب ایسا ہو تو ہماری تجویز کی رو سے اس سوسائٹی کا تعلق اس سے قبل کی تہذیب سے ہو گا، جب پرانی ٹیکنالوجی رائج تھی۔

اس صورتِ حال کی ایک مثال مشرق بعید کے اقوام کی تہذیب ہے۔ چین میں پہلی شہری ریاستیں تقریباً 1900 قبل مسیح میں قائم ہوئیں اور اس کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ انہوں نے تحریر کا ایک نظام مرتب کر لیا، لیکن چینیوں نے حروف تہجی پر مبنی تحریر کا اسلوب کبھی اختیار نہیں کیا اور ان کے ہمسایے کوریا اور جاپان کے باشندوں نے بھی قبول نہیں کیا۔ تہذیبی ٹیکنالوجی اور تہذیبوں کے باہمی تعلق کو اگر مان لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ چینی تہذیب (اور ساتھ ہی چین کی ملحقہ کوریا اور جاپان) کا تعلق تہذیب کے پہلے دور سے ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ تہذیبی پس ماندگی کی علامت ہے۔ دوسری جانب مغربی اقوام نے چین کی تہذیب کو بہت نفیس سمجھا ہے۔ اس کتاب میں یہ موقف پیش کیا گیا ہے کہ انہوں نے چونکہ حروف تہجی پر مبنی تحریر کو قبول نہیں کیا، لہٰذا چین اور اس کی ہمسایہ ریاستیں ہزاروں سال سے تہذیب کے پہلے عہد میں سانس لے رہی ہیں۔ ایک اور حقیقت جس سے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ چینی معاشرہ پر ایک طویل عرصے تک بادشاہی مسلط رہی، بادشاہت کا ادارہ پہلے دور کی تہذیب کے پختہ ہونے کی علامت ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح کا فلسفیانہ انقلاب بھی چین

میں مقامی نوعیت کا عالمی مذہب فروغ دینے میں ناکام رہا۔

عالمی مذہب کے کلچر کی ایک نہایت نمایاں مثال اسلامی سوسائٹی ہے۔ لیکن وہ بھی اسی طرح دوسری تہذیب کے عہد سے نکل کر تیسری تہذیب میں داخل نہ ہوسکی۔ اس لیے کہ اس نے چھاپے خانے کی ٹیکنالوجی کو روک دیا تھا۔ مذہبی مخالفت اور تہذیبی نخوت دونوں نے مل کر سلطنت عثمانیہ میں چھاپے خانے کو رواج دینے سے روک دیا۔ اگرچہ ایک ترکی پریس نے 1726 میں کام کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن اس نے ابھی بیس سے بھی کم کتابیں چھاپی تھیں کہ اسے 1742 میں بند کر دیا گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب اسلامی حکومتوں نے طلبہ کو مغرب میں فنی تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجنا شروع کیا، تب کہیں چھاپے خانے پر عائد پابندی کم کر دی گئی۔ اس کے بعد جلد ہی بہت سی کتابیں، عربی ترکی اور فارسی زبانوں میں ترجمہ ہوگئیں اور اسلامی ملکوں میں بھی اخبارات شائع ہونے لگے۔ مشرق وسطیٰ کی ان اقوام کو اپنی مذہبی عصبیت کو برقرار رکھنے میں ساڑھے تین صدیوں کی تاخیر ہوگئی اور اس عرصے میں سیکولر علوم کے گراں مایہ سرمایے سے محروم رہ گئے۔

ایک سوسائٹی جو تیسری سے چوتھی تہذیب کے عہد میں داخل ہونے میں ناکام ہوگئی اس کی مثال سوویت یونین ہوسکتی ہے۔ جو 1990 کے عشرے میں اپنے سقوط کے زمانے تک نہایت سختی کے ساتھ خواندہ ذہنیت اور انیسویں صدی کے تہذیبی رویوں کے ساتھ چپکی رہی۔ اس صورتِ حال پر پہلے گفت گو ہو چکی ہے۔

ایک سوسائٹی جو ماقبل تاریخ کے کلچر سے نکل کر بنیادی خواندگی کے کلچر میں داخل نہ ہوسکی، اس کی ایک مثال بدھ کے زمانے سے پہلے کا ہندوستانی معاشرہ ہے۔ وادئ سندھ کی تہذیب 1800 قبل مسیح کے زمانے کے آس پاس اپنے ختم ہونے تک ایک رسم الخط، خیالی صورت گری کا رکھتی تھی۔ اس کے بعد ہندوستان کے باشندے وید کے زمانے میں ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے تک تحریر کے بغیر زندہ رہے۔ تاہم ایک تہذیبی مرحلہ اس وقت تیار ہو رہا تھا جب نظمیں لکھی گئیں اور آریائی کلچر کی مذہبی شاعری کو اظہار کے لیے زبان مل گئی۔ اس نے ابتدائی مذہب کی ایک بنیاد رکھ دی، جس کے ساتھ وہی رسمیں تھیں اور بہت سارے بت تھے۔ بدھ اور مہاویر، جیسے مذہبی مصلحین کے زمانے سے کچھ ہی عرصہ پہلے خواندگی کی ابتدا ہوئی۔ ہندوستان کی مذہبی روایت میں فلسفے کے داخل ہونے سے ایک عالمی مذہب پیدا ہوا۔ یہ بدھ

مذہب تھا جس نے ابتدائی ہندو مذہب کو پھر قدامت کی طرف واپس کر دیا۔

اس ساری صورتِ حال کو دیکھنے کا ایک اور طریقہ یہ ہو گا کہ بعض تہذیبیں ''اگلے مرحلے میں داخل ہونے سے'' اس لیے ناکام ہو گئیں کہ وہ بجائے خود نامکمل تھیں۔ وہ معاشرے جو ایک خاص تہذیب کے اندر تاریخی عمل کے تحت نسبتاً تاخیر سے داخل ہوتے ہیں، وہ اس تہذیب کو ان قوموں کے مقابلے میں، جنہوں نے بہت جلد اسے اپنا لیا تھا، زیادہ مکمل صورت میں پاتے ہیں، پھر وہ اس تہذیب کو زیادہ گرم جوشی کے ساتھ اپناتے ہیں۔

جب شمالی مصر کے بادشاہ نارمر نے پہلے فراعین خاندان کی بنیاد رکھی، اس کے تقریباً تین ہزار سال بعد پہلے چینی شہنشاہ شیہ ہوانگ، ٹی نے 221 قبل مسیح میں چین کو متحد کیا تھا۔ شاہی حکومت نے اور اس کے بعد ہان جانشینوں نے حکمرانی کا جو طریقہ نافذ کیا تھا، وہی مزید دو ہزار سال تک برقرار رہا۔ تین خاص عالمی مذاہب میں اسلام آخری مذہب تھا، جو سب کے بعد آیا۔ اس طرح کا مذہب ابتدائی تاریخی عمل کے تحت فلسفیانہ کردار کا حامل ہوتا تھا لیکن بعد کے مرحلے میں روحانیت کی ملوکیت کے ساتھ سپاہ گری بھی شامل ہو جاتی تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلسفی کم اور بودھ اور عیسیٰ کے مقابلے میں زیادہ روحانی حاکم نظر آتے ہیں۔ وہ بجائے خود بھی ایک کامیاب فوجی سالار اور ایک ریاست کے حکمران تھے۔ مارکس اور لینن کی نظریاتی ریاست جو روس میں قائم ہوئی تہذیب کے تیسرے عہد کی پیداوار اور اس عہد کی فکر کی حامل تھی۔ مارکس اور لینن دونوں اپنے ابتدائی سیاسی زمانے میں اخبارات کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ بعد میں انہوں نے علمی کتابیں لکھیں۔ ان کے افکار کی روشنی میں جس معاشرے کی تشکیل ہوئی وہ ان دونوں یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ سیاست دانوں کے متشدانہ رویے، مزاج کی برہمی اور دانش ورانہ تکبر کا غماز تھا۔

عالمی تاریخ جب پہلی ٹیکنالوجی کے تعارف کا احاطہ کرتی ہے تو یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ ایجاد ساری دنیا میں مساوی طور پر پھیل گئی ہو گی، لیکن ہم نے یہ دیکھ لیا کہ کرۂ ارض پر آباد مختلف معاشروں نے نئی تہذیبی ٹیکنالوجیز کو مختلف زمانوں میں قبول کیا۔ پھر ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ایک معاشرہ پرانی ٹیکنالوجی کو اس کے عام استعمال کا زمانہ گزر جانے کے بعد برقرار رکھتا ہے۔ آخر میں یہ بات بھی یاد رہے کہ جب معاشرے میں ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف ہوتی ہے تو گزشتہ ٹیکنالوجی غائب نہیں ہو جاتی۔ اس چھپائی کے زمانے میں لوگ آج بھی ہاتھ سے لکھی

ہوئی تحریریں سامنے لاتے ہیں۔ ٹیلی وژن کے آزادانہ پروگراموں کے اس عہد میں بھی وہ کتابیں اور اخبار پڑھتے ہیں۔ وہ ادارے جو تاریخ کے پہلے اور دوسرے عہد میں پیدا ہوئے تھے، موجودہ سوسائٹی میں آج بھی نظر آ جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ تاریخی عہد مخصوص تاریخوں پر اچانک نمودار ہوتے ہیں اور اچانک غائب ہو جاتے ہیں اور یہ کہ تہذیبی منظر نامہ دفعتاً تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ بلکہ دونوں نئے زمانوں کی امتیازی شناخت پر کسی اور کا اضافہ ہوتا ہے۔ یوں معاشرہ زیادہ متنوع تہذیبی آداب و معمولات سے پُر مایہ ہو جاتا ہے۔

نئی تہذیبوں کے اوقات

اگر یہ موقف اختیار کیا جائے کہ کسی نئی تہذیبی ٹیکنالوجی کے نتیجے میں ایک نئی تہذیب پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس عمل میں وقت کے تعین کا معاملہ بہت اہم ہو جاتا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ جس تہذیبی ٹیکنالوجی کے اثرات کو سب سے پہلے محسوس کیا گیا، اس کی تاریخ کو یاد رکھنا زیادہ اہم بات ہوگی، بہ نسبت اس کے کہ وہ ٹیکنالوجی کس تاریخ کو وجود میں آئی۔ پھر ہمیں اس بات کا بھی شعور ہونا چاہیے کہ وہ ٹیکنالوجی معاشرے میں وسیع پیمانے پر کب استعمال ہونے لگی، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس نے تہذیبی طور پر کب اثر انداز ہونا شروع کیا۔ جب وہ ایجاد ہوئی یا جب نئی تہذیبی ٹیکنالوجی نے رواج پانا شروع کیا اس وقت سے اس زمانے تک جب معاشرے پر اس کے اثرات مرتب ہونے لگے، ان دونوں زمانوں کے درمیان مہ و سال کا کتنا عرصہ ہے؟ اس کا جواب واضح نہیں ہوگا۔

آسان بات یہ ہوگی کہ اس تاریخ کا تعین کر لیں جب وہ ٹیکنالوجی ایجاد ہوئی۔ خیالی مرقعوں پر مبنی تحریر 3300 قبل مسیح کے آس پاس میسوپوٹامیا میں دیکھی گئی۔ تین ہزار سال اور دو ہزار سال قبل مسیح کے درمیان یہ طرز تحریر مشرقِ وسطیٰ کے معاشروں میں اور پھر مختلف زمانوں میں چین پہنچی۔ ڈیوڈ ڈیرنگر کی کتاب دی الفابٹ (The Alphabet) کے مطابق، پہلی تہذیب کا عہد چار ہزار سال قبل مسیح کے وسطی زمانے سے پہلے مصر یا میسوپوٹامیا میں نمودار نہیں ہوا ہوگا۔ ہندوستان، چین اور کریٹ میں یہ کئی سو سال بعد آیا۔ دوسری تہذیب کا عہد فونیشیا یا فلسطین میں تیرھویں تا گیارھویں صدی قبل مسیح سے پہلے نہیں پہنچا ہوگا۔ اسی طرح اٹلی میں آٹھویں صدی قبل مسیح اور ہندوستان میں چھٹی صدی قبل مسیح، عربستان میں پانچویں صدی قبل مسیح یا جاوا میں آٹھویں صدی قبل مسیح سے پہلے نہیں پہنچا ہوگا۔

گوشوارہ 10-1 Table: 10-1

حروفِ تہجی والی تحریریں

طرزِ تحریر	کن لوگوں کی	کب شروع ہوئی	جس طرزِ تحریر سے مشتق ہے
شمالی سامی	سامی	16th B.C	مصری عوام کی زبان
فونیشین	فونیشین	13th B.C.	شمالی سامی
عبرانی (قدیم)	عبرانی	11th B.C.	شمالی سامی
یونانی	یونانی	11th B.C.	فونیشین
ارامی	ارامی	10th B.C.	شمالی سامی
جنوبی سامی	یمنی	8th B.C.	شمالی سامی
اترسکن	اترسکن	8th B.C.	یونانی
لاطینی	رومی	7th B.C.	یونانی/اترسکن
براہمی	ہندوستانی	6th B.C.	ارامی
عبرانی (نئی)	یہودی	3rd B.C.	ارامی
خروشتھی	ہندوستانی	3rd B.C.	ارامی
پہلوی	فارس	3rd B.C.	ارامی
نباتائین	نباتائین	2nd B.C.	ارامی
میروئتی	نبیان	2nd B.C.	مصری
سیرین	شام	1st A.D.	ارامی
کاپٹک	مصر	2nd A.D.	یونانی
رونی	کیلٹک	3rd A.D.	اترسکن
گپتا	ہندوستانی	4th A.D.	براہمی
آرمینی	آرمیینیا	5th A.D.	ارامی

عربی	عرب	5th A.D.	نباتائین
گرنتھ	ہندوستان	5th A.D.	گپتا
دیوناگری	ہندوستان	7th A.D.	گپتا
تبتی	تبت	7th A.D.	گپتا
کاوی	جاوا	8th A.D.	گرنتھی
گلاگوتی	مور	9th A.D.	یونانی
سریلک	سلاوک	9th A.D.	یونانی انشل

Source: Philosophical Library, Inc, New York.

رابرٹ لوگان کا اندازہ یہ ہے کہ ''تعلیم کو یونانیوں کے دماغ میں بٹھانے میں پانچ سو سال لگ گئے اور اسی طرح کا زمانہ سامی نسل کے لوگوں کے درمیان خواندگی کو متعارف کرانے اور پھر اسے پھیلانے میں گزر گیا۔'' اگر حروف تہجی کی تحریر سامیوں اور یونانیوں کے درمیان گیارھویں صدی قبل مسیح میں متعارف ہو چکی تھی تو اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس (رسم الخط) کا تہذیبی اثر سب سے پہلے چھٹی صدی قبل مسیح میں یونان اور جوڈی میں محسوس کیا گیا تھا۔ جو لوگ اس صدی میں زندہ تھے، ان میں فیثا غورث، سولون (Solon) ملکیٹس کے تھیل (Thales of Miletus)، ہیرا کلیٹس، جریمیا (Jeremiah) ایزاکیل اور دوسرے عیسائیہ (Second Isaiah) شامل تھے۔

کسی معاشرے میں خواندگی کی شرح سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحریر کی زبان نے اس کی تہذیب پر کس حد تک اثر ڈالا۔ اس سے پہلے کہ ادب براہِ راست طور پر اثر انداز ہو، لوگوں کو پڑھنا اور لکھنا آنا چاہیے۔ دوسری طرف ایک خواندہ اشرافیہ ان بہت سے لوگوں کے خیالات پر اثر انداز ہو سکتی ہے، جو خواندگی کی مہارت نہیں رکھتے۔ قدیم سامی نسل کے باشندے وہ پہلے لوگ ہوں گے، جنہوں نے بنیادی خواندگی میں اہلیت حاصل کر لی ہو گی، کیوں کہ ان کے مذہب میں صحیفوں پر بہت زور دیا گیا ہے۔ یونان میں سقراط کے زمانے میں ایک بہت چھوٹی سی اقلیت لکھ پڑھ سکتی تھی۔ پہلی بار ایک خواندہ آبادی ہیلن (Hellenistic) کے دور میں پیدا ہوئی۔ اس وقت تک جتنا ادب میسر تھا، اس میں ارسطو کے عہد میں اور خاص

طور پر ٹولیمی اوّل (Ptolemy I) کے دور میں زبردست اضافہ ہوا اور سکندریہ میں ایک زبردست لائبریری قائم ہوگئی۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس لائبریری کے اندر سات لاکھ سکرول (گول لپٹی ہوئی کتاب) موجود تھے۔ جب یونانی تحریروں کے ترجمے لاطینی میں ہونے لگے تو تیسری صدی قبل مسیح میں روم کے مقتدر افراد نے نجی کتب خانے قائم کیے۔ بادشاہت سے وابستہ حکام اعلیٰ نے بہت سے منشیوں کو انتظامی مقاصد کے لیے ملازم رکھ لیا تھا۔ جب روم کی سلطنت کا مغربی حصہ جرمن خصوصیات کے حامل حملہ آوروں کے پاس چلا گیا تو پھر لکھنے کی ضرورت بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق سال ایک ہزار تک یورپ میں خواندگی کی شرح ایک سے دو فی صد کے درمیان گر گئی۔

مسیحی چرچ نے ''سیاہ زمانے'' میں بھی یورپ کے اندر خواندگی کو زندہ رکھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں بنی ڈکٹین راہبوں کی اقامت گاہ کے صدر نے راہبوں کو حکم دیا کہ یونان اور اٹلی کے صحائف اکٹھا کریں۔ چرچ کی انتظامیہ لکھی ہوئی دستاویزات برابر استعمال کرتی رہی۔ نویں صدی عیسوی میں شارلیمین (Charlemagne) نے جو کلیسا سکول جاری کیے تھے، اس کے تحت علم کی روایت زندہ ہوگئی۔ سن 1200 اور 1400 کے درمیان جب یونیورسٹی کے طلبہ کو کتابوں کی ضرورت ہوئی، قانون اور دوسرے پیشوں کے ماہر پیدا ہونے لگے اور بائبل کے ترجمے لاطینی سے دیگر مقبول عام زبانوں میں ہونے لگے تو اس کے نتیجے میں خواندگی کی شرح نہایت تیزی سے بڑھ گئی۔ اس عرصے میں کاغذ سستا ہو گیا تھا اور ٹیکنالوجیز کا بھلا ہو کہ خاصی بڑی مقدار میں اسلامی دنیا سے درآمد کیا جانے لگا تھا، تاہم خواندگی کو سب سے زیادہ جس وجہ سے ترقی ہوئی، وہ چھاپے خانے کی ایجاد تھی۔ 1700 عیسوی تک یورپ میں خواندگی کی شرح 30 اور 40 فی صد کے درمیان بڑھ گئی تھی۔ عام ابتدائی تعلیم کی بہ دولت 1850 میں تعلیم کی شرح 50 فی صد سے زیادہ اور 1930 میں 90 فی صد سے زیادہ ہو گئی تھی۔

یونیسکو کا مفروضہ یہ ہے کہ خواندگی کی بنیادی تعلیم دینے کے لیے مدرسے میں چار سال لگتے ہیں۔ اس معیار تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی میں ایک خاص سطح کی خوش حالی ہو اور رسمی تعلیم کے فروغ کا پختہ عزم ہو۔ یونیسکو کا ایک جائزہ 1978 میں شائع ہوا تھا۔ اس جائزے کے مطابق 1970 میں 70 فی صد افریقی، 60 فی صد ہندوستانی، جنوبی ایشیا کے دیگر عوام اور لاطینی امریکا کے 30 فی صد لوگ ناخواندہ تھے۔ شمالی امریکی، یورپ، سوویت یونین،

جاپان اور جنوبی کوریا میں ناخواندگی کی شرح سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 5 فی صد سے کم تھی۔ 1988 میں قوموں کے اندر خواندگی کی شرح مقابلتاً کیا تھی، وہ اس جدول سے ظاہر ہے۔

جدول 2-10

اقوام میں خواندگی کی شرح: ایک تقابلی جائزہ

(1983 یا 1984 کی اطلاع)

قوم (ملک)	شرح خواندگی	قوم (ملک)	شرح خواندگی	قوم (ملک)	شرح خواندگی
جاپان	100	برطانیہ	100	جرمنی	100
جرمنی	100	آسٹریلیا	100	سوویت یونین	100
فرانس	99	اٹلی	97	کینیڈا	96
امریکا	96	ارجنٹائن	96	جنوبی کوریا	93
یوگوسلاویہ	91	میکسیکو	90	کولمبیا	88
وینزویلا	87	فلپائن	86	ویت نام	84
جنوبی افریقا	79	برازیل	78	ترکی	74
انڈونیشیا	74	ایران	51	الجزائر	49
مصر	45	نائجیریا	42	بنگلہ دیش	33
		پاکستان	26		

چھپائی کی ابتدا سے ٹیکنالوجیز کے تہذیب پر کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کا تخمینہ لگانے کے لیے ہمیں ایک دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ الیکٹرانک کے ذریعہ مواصلات میں زیادہ تر ٹیکنالوجیز اپنے پیغامات کی ترسیل گفت گو کی زبان میں کرتی ہیں۔ کوئی بھی شخص کسی اخلاقی تعلیم کے بغیر وہ پیغامات سمجھ سکتا ہے۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کی گفت گو کے لیے مطلوبہ آلہ کتنے لوگ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر جتنی تعداد میں لوگوں کے پاس ریڈیو سیٹ ہوتے ہیں، اس سے ریڈیو سننے والوں کی وسعت اور توانائی کا اندازہ ہوتا ہے اور کلچر میں اس کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ جدول 3 میں ریڈیو اور ٹیلی وژن رکھنے والوں کا فی صد

تناسب 1988 کے دوران میں مختلف ممالک میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ صنعتی ملکوں میں عام لوگوں کی اکثریت یہ ذرائع رکھتی ہے، لیکن چین، ہندوستان، پاکستان، نائیجیریا اور بنگلہ دیش جیسے ملکوں میں ان کی شرح 20 فی صد سے بھی کم ہے۔ جن ملکوں میں خواندگی کی شرح نسبتاً زیادہ ہے وہاں فرض کیا جائے گا کہ زیادہ تر لوگ ان ملکوں میں تفریح کے لیے کتابیں اور اخبارات پڑھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ریڈیو سننا یا ٹیلی وژن دیکھنا ان کے لیے ایک اجتماعی تجربہ ہوگا۔

ان اعداد و شمار سے جو مواصلات کے مختلف وسائل کی سالانہ فروخت کے بارے میں مرتب کیے گئے ہیں، ان سے مختلف ملکوں میں اور زمانوں میں ان کے تہذیبی اثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ امریکا میں چند برسوں میں کتنے ٹیلی فون، ریڈیو اور ٹیلی وژن زیر استعمال رہے، ان کی تعداد کو جدول 10-4 سے 10-6 تک میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر ایک آلے کے استعمال اور فروخت میں ایک وقت ان کی اٹھان کا تھا۔ اپنی تمام تر کامیابی کے باوجود، جو اسے 1876 کی صد سالہ نمائش میں حاصل ہوئی، کاروبار میں ٹیلی فون کا استعمال بہت سست رفتاری سے ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر تک بہ مشکل دس لاکھ سے زائد لوگوں نے ٹیلی فون کے لیے درخواستیں دیں۔

جدول 10-3

مختلف ممالک میں زیر استعمال ٹیلی فون، ریڈیو اور ٹیلی وژن

(ہر ایک ہزار باشندوں پر)

ملک	ٹیلی فون	ریڈیو	ٹیلی وژن
امریکا	771	2042	790
کینیڈا	668	761	463
مغربی جرمنی	572	401	360
آسٹریلیا	538	1300	423
فرانس	537	859	375
برطانیہ	479	993	523
جاپان	513	713	556
اٹلی	405	250	243

سپین	350	286	258
جنوبی کوریا	149	451	178
یوگوسلاویہ	123	238	303
جنوبی افریقا	113	282	75
سوویت یونین	107	514	308
ارجنٹائن	105	540	199
میکسیکو	86	291	111
برازیل	76	386	127
کولمبیا	73	141	105
ترکی	115	119	55
چلی	54	304	116
ایران	51	178	55
فلپائن	15	45	26
مصر	12	174	44
نائیجریا	8	79	5
پاکستان	25	77	12
چین	5	69	7
ہندوستان	3	62	4
انڈونیشیا	2	140	4
بنگلہ دیش	2	8	2

Source: World Facts and Figures by Victor Showers

پھر جب اس کی شرح میں نظر ثانی کی گئی تو اس کی مانگ بڑھی۔ جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی، اس وقت ہر دس امریکی شہریوں میں سے ایک کے پاس ٹیلی فون تھا۔ ریڈیو کے لیے اس کے اٹھان کا زمانہ 1923 سے 1933 کا عشرہ تھا۔ ٹیلی فون کے لیے اس کی مانگ 1950 کے عشرے میں بڑھ گئی۔ اس کی ٹیکنالوجی تو دس سال پہلے تیار ہو چکی تھی لیکن دوسری عالمی جنگ شروع ہو جانے سے اس کے کاروباری استعمال کی تاریخوں میں کھنڈت پڑ گئی۔ کیبل ٹیلی وژن

کی مانگ اور اس کی اٹھان کا زمانہ 1980 کا عشرہ تھا۔ 1980 میں جہاں 22.6 فی صد گھروں میں کیبل ٹیلی وژن تھے وہیں 1990 میں ان کی تعداد 59 فی صد ہو گئی تھی۔ اس عشرے میں پہلی بار کمپیوٹر کی مانگ اچانک شروع ہو گئی۔ 1980 میں کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کی تعداد 23 لاکھ، 1990 میں پانچ کروڑ اور 1995 میں نو کروڑ ہو گئی۔

جدول 10-4

امریکہ میں 1880 تا 1975 زیرِ استعمال ٹیلی فون

(ہزار)

سال	زیرِ استعمال ٹیلی فون
1880	60
1890	228
1895	340
1900	1,356
1905	4,127
1910	7,635
1915	10,524
1920	13,273
1925	16,875
1930	20,103
1940	21,928
1945	27,867
1950	43,709
1955	56,243
1960	74,342
1965	93,656
1970	120,218
1975	149,008

International Historical Statistics, Gale Research Co., 1983.

1920 کے عشرے میں متوسط حیثیت کے امریکی شہریوں کی زندگیوں پر فونوگراف، ٹیلی فون، فلم اور ریڈیو کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کے اشارے رابرٹ اور ہیلن لینڈ کی تصنیف ''مڈل ٹاؤن'' سے ملتے ہیں۔ فونوگراف 1900 تک ایک عجوبہ تھا۔ تاہم 59 فی صد امریکی گھروں میں موجود تھا۔ اس کے بعد محنت کش خاندانوں میں سے 23 فی صد نے فونوگراف خرید رکھے تھے۔ تقریباً 46 فی صد متوسط خاندانوں نے، جن میں کاروباری طبقہ بھی شامل تھا، ٹیلی فون حاصل کر لیے تھے۔ 1890 کے عشرے میں جہاں آپیرا بہت مقبول تھا اور جہاں لائیو شو (زندہ ناچ گانے) ہوتے تھے، اب بڑی حد تک ان کی جگہ چلتی پھرتی تصویروں نے لے لی تھی۔ آپیرا جانے والوں کی تعداد بھی گھٹ گئی تھی۔ مڈل ٹاؤن کی آبادی میں ان کی نصف اور تین چوتھائی تعداد نے جولائی 1923 میں ایک یا اس سے زیادہ فلمیں دیکھیں۔ کاروباری طبقے میں بارہ فی صد اور محنت کش طبقے میں 6 فی صد کے پاس ریڈیو تھے۔ ان دنوں گھروں میں ریڈیو سننا سب سے دلچسپ مشغلہ ہوتا تھا۔ اس سے مطالعہ اور فلم بینی کے اوقات بھی کم ہو گئے۔

یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ایک تہذیبی ٹیکنالوجی کی ایجاد اور معاشرے کے اندر

اس کے پھیلاؤ کے درمیان جتنا وقفہ آتا ہے، ہر تہذیب کی آمد کے ساتھ وہ وقفہ بتدریج کم ہوتا آیا ہے۔ جہاں حروف تہجی کی خواندگی کو سامی اور یونانی معاشروں کے اندر نفوذ کرنے میں پانچ سو سال لگے، وہیں فونوگراف کی ایجاد کے بعد پچاس سال کے اندر ہی امریکیوں کی آدھی تعداد کے پاس فونوگراف آ گئے تھے۔ پرسنل کمپیوٹر تو اور بھی تیز رفتاری سے مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ 1998 میں تقریباً 41 فی صد امریکی گھروں میں کمپیوٹر آ گئے تھے۔ مارکیٹ میں کمپیوٹر جس تیز رفتاری سے پھیلے ہیں، اس سے اس ایجاد کی غیر معمولی مانگ کا اندازہ ہوتا ہے جو ابھی 1970 کے برسوں میں ہی معرضِ وجود میں آئی تھی۔ ریڈیو کو پانچ کروڑ گھرانوں تک پہنچنے میں 37 سال اور ٹیلی وژن کو 23 سال لگے، اور کیبل ٹیلی وژن کو صرف پندرہ سال۔ انٹرنیٹ کی مقبولیت اس سطح تک صرف پانچ سات سال کے اندر پہنچ جائے گی۔

جدول 10-5

امریکہ میں 1922 تا 1975 زیر استعمال ریڈیو

(ہزار)

سال	زیر استعمال سیٹ
1922	60
1924	1,250
1925	2,750
1927	6,750
1930	13,750
1933	19,250
1935	21,450
1940	28,500
1945	33,000
1950	41.000
1955	46,000
1960	50,000
1970	62,000
1975	73,000

International Historical Statistics, Gale Research Co., 1983

جدول 10-6

امریکہ میں 1947 تا 1975 زیر استعمال ٹیلی وژن

(ہزار)

سال	زیر استعمال سیٹ
1947	14
1948	172
1949	940
1950	3,900
1951	10,000
1952	15,000
1953	20,000
1954	26,000
1955	31,000
1960	46,000
1965	53,000
1970	60,000
1975	73,000

International Historical Statistics, Gale Research Co., 1983

وقت کے معاملے میں تہذیب کے تیسرے عہد کے ساتھ ایک اور خلاف معمول صورتِ حال پیدا ہوئی۔ اگر اس عہد کا آغاز چھاپے خانے کی ایجاد کے ساتھ ہوا تو آئندہ کسی وقت میں کلچر کے اندر تبدیلی کی

توقع کی جائے گی۔ اس کی بجائے گٹن برگ کی ایجاد سے پہلے کی صدی میں کلچر کے اندر ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی۔ ایک عام خیال ہے کہ اطالوی نشاۃ الثانیہ پر چودھویں اور پندرھویں صدیاں احاطہ کرتی ہیں، لیکن گٹن برگ نے اپنی پہلی کتاب جرمنی میں پندرھویں صدی کے نصف آخر میں چھاپی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نشاۃ الثانیہ کا دور چھاپے کی ایجاد کی وجہ سے نہیں آیا۔ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق ان دونوں کے درمیان تعلق ان رجحانات کی بہ دولت تھا، جو پہلے سے رائج چلے آ رہے تھے۔ رابرٹ لوگان کا خیال یہ ہے کہ ''یورپ کے علوم جونویں اور بارھویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوئے اور بعد میں ان کی تجدید نو ہوئی، اس کے برخلاف چھاپے کی ایجاد نے اطالوی نشاۃ الثانیہ کو اپنی کارفرمائی کا موقع فراہم کیا تاکہ اس فن کارانہ تجدید کو طاقت پکڑنے کی مہلت مل جائے۔

زندگی کی گردش

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا، زندگی ایک جان دار حیوانی وجود کی طرح ہے۔ حیوان جو پیدائش سے اپنا آغاز کرتے ہیں جوان ہونے، پختہ ہونے اور طاقت پکڑنے میں طویل عرصہ لیتے ہیں۔ پھر ان میں انجماد کا عمل شروع ہوتا ہے اور بالآخر زوال آ جاتا ہے اور وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ایک نئی تہذیبی ٹیکنالوجی کی آمد سے وابستہ ہوتی ہے۔ جب ٹیکنالوجی موثر ہونے لگے اور اظہار کے لیے اسلوب پیش کرتے ہوئے اسے اپنی تخلیقی توانائی کا اندازہ ہونے لگے تو وہی اس ٹیکنالوجی کا دورِ شباب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ طاقت کے نئے ادارے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان اداروں سے مل کر جو سلطنت ظہور میں آتی ہے، اس کے ساتھ پختہ طاقت کا دور وابستہ ہوتا ہے اور جب سلطنتیں اپنے تحفظ کی خاطر پرتشدد اقدام کرنے لگیں اور طاقت کے استعمال پر آمادہ ہو جائیں، جو ان کی لوٹ مار اور بداعمالی کے لازمی نتائج ہوتے ہیں تو ان کے زوال کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی کی گردش میں اس مرحلے پر تہذیبوں کی مثال افراد کی طرح ہوتی ہے جو زندگی میں انہی مراحل سے گزرتے ہیں۔

ترقی کے دوران میں تخلیق کے عمل میں اور اس کے بلوغ کے زمانے میں ایک تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے، جس طرح ایک انسان اپنی اٹھان کے زمانے میں پہلے پندرہ سے بیس سال کے درمیان بڑی تیزی سے بدلتا ہے، پھر اپنی جگہ ٹھہر جاتا ہے، اور اس کی جسمانی حالت میں،

زندگی کے باقی مہ وسال کے اندر نسبتاً کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب نئی ٹیکنالوجیز، نئی اقدار، نئے افکار اور نئے سماجی اور فن کارانہ اسلوب متعارف ہوتے ہیں تو تہذیبوں کے اندر گہری اور باثمر تخلیقی سرگرمیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ ان زمانوں کے ساتھ مروجہ طریقوں کے مطابق استحکام کا نسبتاً طویل زمانہ آتا ہے۔ پھر ہم جذباتی انداز سے نوعمری اور بچپن کے دنوں کی طرف دیکھتے ہیں، جب نسبتاً تھوڑے ہی عرصے میں نہایت اہم انداز سے اٹھان پیدا ہوئی تھی۔ لیکن بچے کو جب اس اٹھان کا تجربہ ہوا تو وہ عمل سن بلوغ تک پہنچنے کے لیے تھا۔ اسی طرح سلطنت کے اس دور کو جو نسبتاً غیر تخلیقی ہوتا ہے، تہذیبوں کا دورِ کمال سمجھنا چاہیے۔ ان کی تاریخ کے لیے تیز رفتار ترقی اور سست کام ترقی کے دونوں ادوار بہت اہم ہیں۔

اوسولڈ سپنگلر نے تاریخ کے اس اختلاف کو تہذیب (کلچر) اور تمدن (سویلائزیشن) کی دو اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ تمدن کا حوالہ اسی سوسائٹی کی طرف ہے، جب وہ ایک مرحلے پر آ کر ٹھہر گئی اور اس سے وہ اشکال بتدریج ختم ہوتی گئیں جو بے نمو اور مردہ ہو چکی تھیں۔ ہم تہذیب اور تمدن کی اصطلاحات پھیر بدل کر کے استعمال کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ سپنگلر کی بیان کردہ تفریق سے ہم متفق ہوتے ہیں۔ سپنگلر کے زمانے کا ''کلچر'' یقیناً بہت خاص ہے، کیوں کہ یہ عالمی تاریخ کے نہایت اہم اور بڑے موڑ کے بعد آتا ہے، اس کی تخلیقی توانائی یہ بات وثوق سے بتاتی ہے کہ اب سلطنتوں کا ظہور ہونے والا ہے۔

جب ایک نئی تہذیبی ٹیکنالوجی پہلی بار متعارف ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ذہن کی ذکاوت، جوش اور جذبات آتے ہیں، جن کا تخلیقی اظہار ہوتا ہے۔ اس ماحول میں کلچر کے نادر کلاسیکی کارنامے ظہور میں آتے ہیں۔ پھر یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ بائبل کی بے مثل تحریریں یا افلاطون یا ارسطو کے فلسفیانہ مقالے اس زمانے میں تخلیق ہوئے جب حروف تہجی کا اسلوب تحریر ابھی تازہ تازہ آیا تھا۔ اسی طرح ٹوائن بی نے تہذیب کے تیسرے عہد کی بابت لکھا ''جب مقامی زبانوں نے مکمل طور پر بالادستی حاصل کر لی تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ اس نے تخلیقی اظہار کو کھلی آزادی دے دی جس نے نابغہ روزگار پیدا کیے۔ نثر میں اس کی مثال رابلیس (Rabelais 1494-1553) ہے اور شاعری میں شیکسپیئر (1564-1616)۔ اس کے علاوہ جب لاطینی سے تخلیق کا رخ مقامی زبانوں کی طرف ہو گیا تو اس وقت چھپائی کا انقلاب پورے شمالی یورپ میں پھیل گیا تھا۔ جہاں تک تہذیب کے چوتھے عہد کا تعلق ہے، تو فلم بندی کے عمل میں

پختگی آنے کے بعد کے عشرے میں گان وِد داوِنڈ، اور وزرڈ آف اوزیڈ جیسی فلمیں بنائی گئیں۔ جب فن کار پہلی بار ٹیلی وژن پر نظر آئے اس وقت ایلوس پریسلے اور بڈی ہائی ''گولڈن اولڈیز'' (پرانا سنہری زمانہ) گا رہے تھے۔

ممکن ہے ہم ہی سوچتے ہیں کہ وہ پہل کاری کرنے والے فن کار ہی بہترین تھے، دوسری جانب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دیگر فن کار اسی قدر ذہین اور باصلاحیت موجود تھے، جنہیں انکار کرنے والے نقادوں نے، جو انہی کے مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور نپے تلے قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے، روک دیا، ورنہ وہ دوسروں کو ان کی حیثیت یاد دلا رہے تھے۔ یا شاید ابتدا میں آنے والے نادر تخلیقی کام اس طرح سامنے آئے کہ انہوں نے اپنے مروجہ فنی اظہار میں سارے منطقی امکانات ختم کر دیے، یہاں تک کہ بعد میں اسی دور میں آنے والے کام، پہلے کے تخلیق کاروں کی نقل معلوم ہونے لگے۔ مارشل میکلوہن نے لکھا ہے کہ ''مختلف تخلیقی ذرائع اظہار ہمارے وجود میں خیالات کا ایک منفرد تناسب پیدا کرتے ہیں، جو ہماری فکر اور عمل کے دھارے کو موڑ دیتے ہیں... جو لوگ نئی ٹیکنالوجی کا تجربہ کرتے ہیں، خواہ وہ حروف تہجی کا طرزِ تحریر ہو، یا ریڈیو ہو، فوری ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ کیوں کہ آنکھوں اور کانوں کا نئی ٹیکنالوجی سے متعارف ہونا ایک نیا احساسِ تناسب پیدا کرتا ہے اور انہیں ایک حیران کن نئی دنیا سے دوچار کرتا ہے اور جو تمام حواس میں عمل، ردِعمل کا ایک انوکھا اظہار پیدا کر دیتا ہے۔'' ہم تہذیبی طور پر ان ثمر آور زمانوں کو وجدانی طور پر ایک نئے کلچر کی پُرشباب توانائی کے ساتھ مربوط کر سکتے ہیں۔ یہ وہ زمانے ہوتے ہیں جب ایک تہذیب ایک دلیرانہ اور ولولہ خیز عنفوانِ شباب کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔

سنہرے شہر

تاریخی تبدیلیاں مجرد انداز سے پیدا نہیں ہوتیں۔ ہم ایک نئی تہذیب کے آغاز کو ایک ''سنہرے شہر'' کے حوالے سے یاد کرتے ہیں، جو اس زمانے میں اور اس مقام پر آباد تھا، جب تہذیبی طور پر نہایت بار آور تبدیلیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔ مثال کے طور پر بیشتر اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جس زمانے میں پیریکلز یونان کا سیاسی رہنما تھا، اس وقت ایتھنز میں دانش اور فن کے نہایت شان دار مظاہر ایک غیر معمولی تہذیبی منظر پیش کر رہے تھے۔ پندرھویں

صدی عیسوی میں اٹلی کا شہر فلورنس بھی ٹھیک اسی کی طرح تہذیب کا ہرا بھرا اور لہلہاتا ہوا منظر پیش کر رہا تھا۔ کوسیموڈی میڈیسی اور اس کا پوتا لورینز و بھی پیریکلز کی طرح تھے۔ پیدائشی مدبر اور فنونِ لطیفہ کے سرپرست۔ جہاں ایتھنز کا کلچر پانچویں صدی قبل مسیح میں فلسفے، فن تعمیر، مجسمہ سازی اور ڈرامے کے فن میں کمال حاصل کر چکا تھا، وہیں فلورنس کو اس کی تعمیرات مجسمے اور تصاویر سے شہرت حاصل ہوئی۔ یہ دونوں سنہری شہر ایک تہذیب کے دورِ شباب میں پیدا ہوئے۔ وہ تہذیبی چمک دمک جو پیریکلز کے زمانے کے ایتھنز سے وابستہ تھی، دوسرے عہد کی تہذیب کے دور میں سامنے آئی اور اس کے بعد کی ہی تہذیب میں فلورنس کے کلچر کی نشاۃ الثانیہ ظہور میں آئی۔

کیا کوئی شہر چوتھی تہذیب کے عہد میں بھی ہے، جو اس طرح روشن اور درخشاں کلچر کو ظاہر کرے؟ چونکہ اسی تہذیب کو متعارف کرانے میں طویل عرصے پر محیط بہت سی ایجادات کا حصہ تھا، اس لیے یہ جاننا مشکل ہے کہ اس کا نقطہ آغاز کیا تھا۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکا میں 1920 کا عشرہ، نئے ذریعۂ اظہار سے سرشاری کا زمانہ تھا۔ اس عشرے کے آغاز سے ہی پہلے کمرشل ریڈیو نے اپنی نشریات شروع کیں۔ فونوگراف مشین نے پاٹ دار موسیقی کے ساتھ ''جاز کے دور'' کا علان کر دیا۔ 1920 کے عشرے میں پیرس اور نیو یارک سٹی ممتاز ترین شہر تھے۔ ادب کے منظر نامے پر نام وَر مصنفوں کا ایک ہجوم نظر آتا تھا اور فن میں اپنے اپنے اسلوب کے بانیوں کو ان کے سرپرست اور شائقین مل گئے تھے۔ اس کلچر کے برقی تعلق کو نظر میں رکھا جائے تو ''سنہرے شہر'' کی حیثیت کے لیے غالباً تاریخ کے چوتھے عہد کا شہر ہالی وڈ زیادہ موزوں ہو، یا غالباً مقبولِ عام موسیقی کے مراکز نیو آرلینز، ممفس یا نیشول، یا نیو یارک کا ریڈیو سٹی اس حیثیت کے زیادہ حق دار ہوں۔ جہاں تک پہلے اور پانچویں تہذیبی عہد کا تعلق ہے، ہمیں یہ معلوم ہے کہ حمورابی کے زمانے میں بابل کا شہر تہذیبی طور پر ایک نہایت بارآور شہر تھا اور پرسنل کمپیوٹر میں انقلاب کی پرورش اس مقام پر ہوئی جسے ''ٹیلی وژن ویلی'' کہتے ہیں۔

کلچر میں تیز رفتاری کی علامتیں

مستقبل شناس لوگ اکثر ایک نئے زمانے کے آغاز کا دعویٰ کسی ایک یا دوسری علامت پر کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مطابق ایک نئی تہذیبی ٹیکنالوجی کو کسی تاریخی تبدیلی کی

اصل علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ٹیکنالوجیز کی ایجادات کے زمانے ہمیں معقول حد تک صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے زیادہ بے یقینی اس زمانے میں نظر آتی ہے جب کوئی ٹیکنالوجی تہذیب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے باوجود تاریخ دان ایک موٹا جھوٹا خیال اس بارے میں رکھتے ہیں کہ کسی مخصوص مقام پر اور مخصوص زمانوں میں یکے بعد دیگرے تہذیبی ٹیکنالوجیز کے آنے سے کب نئی تہذیبیں پیدا ہوئیں۔ تہذیبوں کی ترقی کے ابتدائی زمانے ہماری رائے میں ''کلچر کی تیز رفتاری'' کے زمانے تھے۔ وہ تہذیبی شادابی کے زمانے ہوتے ہیں، جب اپنے اپنے وقت کے شیکسپیئر ذرا دیر کے لیے اپنی چمک دکھاتے ہیں۔ یہ وہ زمانے ہوتے تھے جب ایتھنز اور فلورنس جیسے شہروں کا دورِ شباب نظر آتا ہے۔ چونکہ بڑی بڑی تہذیبی ٹیکنالوجیز، زمین معاشروں میں مختلف اوقات کے اندر پیوست ہو چکی ہوتی ہیں، اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ برسوں پر محیط وہ کون سا ایک زمانہ ہے، جو الگ الگ ٹیکنالوجی سے وابستہ تہذیبی تیز رفتاری کے وقت کا احاطہ کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار معلوم ہوتا ہے۔ ان کی ایجاد کے زمانے اور بعد میں وسیع پیمانے پر ان کا استعمال ایک سے دوسری جگہ خاصا مختلف رہا ہے۔

یہ کہنے کے بعد ہم یہ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ ایک بڑی اور نئی تہذیبی ٹیکنالوجی کے ذریعے ایک بڑی تاریخی تبدیلی آئے گی، جیسے حروف تہجی کے رسم الخط سے پیدا ہوئی تھی۔ ایسا ہی کوئی واقعہ کسی نئی تہذیب کی آمد کی پیش گوئی کرتا ہے۔ جب تہذیبیں اپنی تشکیل کے عمل سے گزرتی ہیں تو تہذیبی تیز رفتاری سے درمیانی وقفے اپنے نشان چھوڑ جاتے ہیں، بعد کے کسی مرحلے میں وقت کے غیر اہم نشیب و فراز اور ساتھ رہنے والی تہذیبوں کی بنا پر یہ فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ اس کی بنا پر ہم یہ فرض کر لیں کہ:

- ☆ تہذیبی تیز رفتاری کا زمانہ جس کا تعلق تہذیب کے پہلے عہد سے تھا، وہ مصر اور میسوپوٹامیا میں 3100 سے پہلے کئی صدیوں پر پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان میں یہ پانچ سو سال بعد آیا اور چین میں ایک ہزار سال بعد۔
- ☆ تہذیبی تیز رفتاری کا زمانہ جس کا تعلق دوسرے عہد سے تھا، شام، فلسطین، یونان اور ہندوستان میں 600 سے 300 سال قبل مسیح کے درمیان گزرا۔
- ☆ تہذیبی تیز رفتاری کا زمانہ جس کا تعلق تیسرے عہد سے تھا، مغربی یورپ میں 1400

اور 1600 قبل مسیح میں رونما ہوا۔

☆ تہذیبی تیز رفتاری کا زمانہ جس کا تعلق تہذیب کے چوتھے عہد سے تھا امریکا اور دوسرے صنعتی ملکوں میں 1870 اور 1970 عیسوی کے درمیان گزرا۔

☆ تہذیبی تیز رفتاری کا زمانہ جس کا تعلق تہذیب کے پانچویں عہد سے ہے، وہ صنعتی ملکوں میں 1990 سے رونما ہو رہا ہے۔

ہم یہاں دنیا کی تاریخ میں ان مخصوص اوقات کی نشان دہی کر لیتے ہیں، جو نئی تہذیبوں کی طرف جا رہے ہوں، جب کہ دیگر اوقات ایسا نہیں کرتے۔ تاریخ دان چھ ہزار سال کے دوران میں ایسے بہت سے وقوعوں کی نشان دہی کر سکتے ہیں جو زبردست شادابی کے تھے۔ لیکن ان میں سے ہر وقوعہ تہذیبوں میں تبدیلی سے تعلق نہیں رکھتا۔ جب بابل میں تہذیب پہلی بار نمودار ہوئی تو حمورابی کے بابل کو اپنے تہذیبی عروج کے زمانے تک پہنچنے میں ایک ہزار سال سے زیادہ لگ گئے تھے۔ مسیحی علم و دانش اور فن کو آئرلینڈ میں فروغ چھٹی اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان ہوا اور اسلامی تہذیب کی افزائش اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ سترھویں صدی میں مغربی سائنس کے اندر انقلاب آیا۔ اٹھارھویں صدی روشن خیالی کی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں صنعتی انقلاب آیا اور یہ عمل جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب کا آغاز جب سے ہوا ہے، تہذیبی تخلیق کاری کا عمل تب ہی سے ہر زمانے میں جاری رہا۔ اس کے باوصف ہم پر نئی تہذیبی ٹیکنالوجی کے بعد آنے والے مقامات اور اوقات کے لیے ایک خاص تاریخی امتیاز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیا ایتھنز اور فلورنس، بغداد، قرطبہ، پیرس اور ایڈنبرگ کے مقابلے میں واقعی بہت غیر معمولی تھے؟ سلطنت کے زمانے کو پہچاننا تو آسان ہے، اس کی وسعت سے ہی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ روم کی سلطنت کے شان و شکوہ نے یا چین نے بلاشبہ انسانی شعور پر گہرا اثر پہلے بھی ڈالا تھا اور یہ اثر اب بھی ہے۔ البتہ وہ کیفیت جو نسبتاً کم دکھائی دیتی ہے، وہ سلطنت کی بنیاد میں پلنے والا بیج ہے۔ اس میں غلط فہمی کا آسانی سے امکان رہتا ہے۔ اگر ہم خود کو کسی غیر مستحکم تہذیبی تبدیلی کے درمیان پائیں تو اس وقت ہمیں یہ جاننے کی خواہش ہوگی کہ یہ تازہ ترین رجحان کیا چند روزہ ہے یا یہ تاریخ کے تسلسل میں ایک موڑ ہے۔ ہم چاہیں گے کہ اس قابل تو ہوں کہ جو چیز آغاز میں ہمیں معمولی نظر آ رہی ہے، کیا مستقبل میں وہی عظیم ہوگی۔ کچھ علامات ہیں، جن سے صحیح تبدیلی اوقات کی

نشان دہی ہو سکتی ہے۔ کچھ خاص حالات ہوتے ہیں، جن سے نئی تہذیبوں کی طفولیت کے زمانے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی نئی تہذیبی ٹیکنالوجی کے فوری بعد اگر کلچر میں تیز رفتاری کا عمل شروع ہو جائے تو اس کے درج ذیل اسباب ہوں گے۔

1) اس زمانے کا تعلق لباس اور تہذیبی خویش پروری اور پھلتی پھولتی تجارت پر ہوگا۔ چھوٹی ریاستوں کی کثیر تعداد اپنے درمیان بالادستی کے لیے جہد آزمائی کرتی رہتی ہے۔

2) اس زمانے میں ریاضی اور تجارت کے معمولات میں کچھ اہم اختراعات کی جاتی ہیں۔

3) جب اس وسیع تر دنیا کے بارے میں تصورات کشادہ اور اس کی تفہیم واضح ہوتی ہے تو یہی وقت جغرافیائی آفات کو وسعت دینے کا ہوتا ہے۔

ایک ماحول، خویش پرستی اور تجارتی رابطوں کا

آرنلڈ ٹوائن بی نے لکھا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایتھنز اور پندرھویں صدی عیسوی میں فلورنس کے درمیان نہ صرف تہذیبی چمک دمک ایک سی تھی، بلکہ ان کے جغرافیائی اور سیاسی حالات بھی یکساں تھے۔ دونوں آزاد شہری ریاستیں تھیں، جن کی آبادیاں پچاس ہزار سے ایک لاکھ 50 ہزار نفوس پر مشتمل تھیں۔ چونکہ یہ نسبتاً چھوٹی وحدتیں تھیں اس لیے بڑے ہمسایوں کی طرف سے ان پر فوجی حملہ کا خطرہ برابر رہتا تھا۔ وہ اپنے برابر کی ریاستوں کے ساتھ کشت وخون اور جنگوں میں سرگرم رہتی تھیں۔ ایتھنز اور یونان کی دوسری ریاستوں نے پانچویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں ایران کی فوج کشی کے خلاف اتحاد کر لیا تھا۔ لیکن اب وہی ریاستیں آپس میں خون ریز جنگیں لڑ رہی تھیں، جس کا سلسلہ آئندہ صدی تک جاری رہا، یہاں تک کہ مقدونیہ کے فلپ دوم نے ان پر غلبہ پا لیا۔ ایک ایسی ہی صورتِ حال اٹلی کے نشاۃ الثانیہ کے دَور میں دیکھی گئی، جب پوپ اور روم کے مقدس شہنشاہوں کے درمیان جنگیں ہو رہی تھیں۔ شمالی اٹلی کی شہری ریاستیں دو سو برس تک آزادی کا زمانہ گزارتی رہیں۔ یہاں تک کہ فرانس نے 1494 میں اس علاقے پر حملہ کر دیا۔ اپنے یونانی پیش رووں کی طرح اٹلی کی شہری ریاستیں بھی اس قابل نہ رہیں یا ان میں یہ خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی کہ وسیع پیمانے پر اپنا

سیاسی ادارہ بنا لیتیں۔ آخر یہی ہوا کہ فرانس، آسٹریا اور سپین کی طاقت وَر بادشاہتوں کے ہاتھوں وہ اپنی آزادی سے محروم ہوگئیں۔

اس قرینے کا اطلاق ان دیگر متحارب ریاستوں پر ہوتا ہے جو ایک نئی تہذیب کے دہانے پر کھڑی تھیں۔ یہی معاملہ جنگ آزما سامی ریاستوں کا تھا۔ جب تک وہ چوبیسویں صدی قبل مسیح کے اندر فتح مند نہ ہوئی تھیں۔ یہی قرینہ چینی بادشاہتوں کا تھا جو لاؤ زی (Lao-Tse) اور کنفیوشس کے عہد میں اپنی بالادستی کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ جن دنوں مہاویرا اور گوتم بدھ کی مذہبی تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا، شمالی ہندوستان متعدد جنگ آزما بادشاہتوں کے درمیان بٹا ہوا تھا۔ مگدھ کی بادشاہت نے، جہاں گوتم بدھ کو نروان ملا تھا، پانچویں صدی قبل مسیح میں دوسری بادشاہوں کے خلاف فوجی مقابلہ جیت لیا تھا۔ یونانیوں اور اطالویوں کو اپنی تہذیبی بالادستی کے زمانے میں جو صورتِ حال درپیش تھی اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو کیفیت مغربی یورپ والوں کی تھی ٹوائن بی کو ان دونوں میں یکسانیت نظر آئی۔ مشترکہ صورت حال یہ تھی کہ اپنے اپنے مفاد کے لیے آپس میں لڑنے والی ریاستیں کثیر تعداد میں ہوتے ہوئے اور اپنے ترقی یافتہ کلچر کی موجودگی میں سیاسی حیثیت سے محروم ہوتی جا رہی تھیں کیوں کہ آپس میں مل کر اتنی بڑی حکومت بنانے میں ناکام ہوگئی تھیں، جو بیرونی بادشاہوں سے خطرے کا مقابلہ کر سکے۔ مقدونیہ اور روم نے جو سلوک یونانیوں سے کیا اور جو کچھ یورپی بادشاہوں نے اطالوی حکمرانوں کے ساتھ کیا، امریکا اور روس وہی کچھ ٹوائن بی کے زمانے میں مغربی یورپ کی اقوام کے ساتھ کر رہے ہیں، یعنی سیاسی اور فوجی دونوں لحاظ سے انہیں بونا بنا کر رکھ دیا ہے۔

یہاں قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ وہ کون سے دنیاوی تقاضے ہیں جو تخلیقی فکر کے لیے تحریک پیدا کرتے ہیں۔ غیر معمولی حاجتوں کے نتیجے میں غیر معمولی تہذیبی اور سماجی حل برآمد ہوتے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں یورپی یونانیوں پر ایرانی سلطنتوں کا بڑا دباؤ تھا۔ ایتھنز کے باشندوں اور ان کے حامیوں نے بڑی کوشش اور دلیری سے ایران کے حملے کو پس پا کر دیا۔ اس کے بعد کی آدھی صدی یونان کی تاریخ میں تہذیبی طور پر درخشاں تھی۔ اٹلی کو اپنے نشاۃ الثانیہ میں ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا تھا، کیوں کہ عثمانی ترکوں کی جانب سے مغرب کی مسیحیت پر دباؤ پڑ رہا تھا۔ ترکی کی فوجوں نے 1453 عیسوی میں بازنطینی روما سلطنت کے آخری مضبوط مرکز قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تھا۔ چونکہ سلطنت عثمانیہ نے مشرق کو جانے والے تجارتی

راستوں پر بندش لگا دی تھی اس لیے یورپ کے تاجروں کو تجارتی مال کی ترسیل کے لیے مجبوراً سمندر کا متبادل راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس کی وجہ سے پرتگالیوں اور ہسپانوی جہاز رانوں نے نئے بحری راستوں کی تلاش کی مہم شروع کی اور یورپ نے نئی دنیائے کالونی آباد کرنا شروع کی۔ اٹلی اور یونان میں شہری معاشرے کی صورت ذہن و دانش میں تحریک پیدا کرنے والی تھی۔ چھوٹی چھوٹی برادریاں اپنے ساتھ متنوع کلچر لائیں، جن کا آپس میں قرب بڑھا اور مختلف اقسام کا تخلیقی مقابلہ شروع ہوا۔ ایتھنز، اسپارٹا اور یونان کے دوسرے شہروں کے اپنے اپنے قانونی اور سماجی رسوم و رواج تھے۔ ایسے میں شہری نہایت سخت وطن پرست تھے اور غیر اطالویوں کو وحشی سمجھتے تھے۔ اٹلی کے نشاۃ الثانیہ میں بھی یہی کیفیت موجود تھی۔

ایک اور تحریک و توانائی غیر ملکی تجارت سے پیدا ہوتی ہے۔ ایتھنز اپنے عروج کے زمانے میں بحری تجارتی راستے پر واقع ایک بھرپور اور سرگرم شہر تھا، جس کے نواح میں بحر روم اور بلیک سی کے کنارے بستیاں آباد تھیں۔ آئیونیا میں یونان کی نوآبادیاں تھیں، جنھوں نے سائنس اور فلسفے میں سب سے پہلے امتیاز حاصل کیا اور ترقی پذیر تجارت کو فروغ دیا۔ یونانیوں کا معمول یہ تھا کہ اپنی زائد آبادی کو نوآبادیات میں بھیج دیا کرتے تھے، لیکن نواح کی بستیوں نے جب اس معمول کے خلاف مدافعت کی تو پانچویں صدی عیسوی میں یونان میں اقتصادی انقلاب رونما ہوا۔ جب نوآبادیات میں توسیع کا معمول رک گیا تو یونانیوں کو محدود اراضی پر اپنے باشندوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی کفالت کے طریقے نکالنے پڑے۔ اس کا حل یہ تھا کہ مختلف اجناس کی کاشت کرنے کی بجائے آبادی کو مخصوص زراعت پر کاربند رہنے کے لیے ان کی مدد کی گئی تاکہ وہ برآمدی تجارت کے لیے اجناس پیدا کریں۔ اب یونانیوں نے اپنے یہاں سے شراب اور زیتون کے تیل جیسی اجناس برآمد کرنی شروع کیں اور ان کے عوض غلہ اور خشک مچھلی درآمد کرنے لگے۔ برتن جن پر سیاہ یا سرخ روغن چڑھایا جاتا تھا، اور جن کی فن کارانہ گل کاری کو ہم سب پسند کرتے ہیں، ان دنوں ایتھنز کا خاص برآمدی مال تھا، جس کی تجارت سے وہاں کے باشندوں نے تجارت کا توازن برقرار رکھا تھا۔

پندرھویں صدی عیسوی میں شمالی اٹلی میں تجارت کی بڑی دھوم دھام تھی۔ اس علاقے میں اکثر جنگیں لگی رہتی تھیں۔ چنانچہ اٹلی کے بنک کار قرضے دے کر خوش حال اور مالا مال ہو رہے تھے۔ وینس کے تاجر مشرق کے گرم مسالے اور ریشمی کپڑوں کی تجارت پر

قابض تھے۔ چودھویں صدی میں جب طاعون پھوٹ پڑی تو اٹلی اور یورپ کے دوسرے حصوں میں آبادی کی زبردست قلت پیدا ہوگئی۔ تقریباً ایک تہائی آبادی ختم ہوگئی تھی۔ اس کے نتیجے میں مزدوروں کی تعداد بھی گھٹ گئی۔ مزدوروں کی اجرتیں بڑھ گئیں۔ ان کے کھیتوں سے چلے جانے کے باعث کاشت کے وسائل نہیں رہے۔ اناج کی مانگ کے گھٹ جانے سے اس کی قیمت بھی گر گئی۔ اس کے جواب میں اٹلی کے زمین داروں نے کم پیداواری زمینوں پر کاشت کا سلسلہ بند کر دیا۔ آب پاشی کا نظام بہتر بنایا اور مخصوص نوعیت کی فصلیں کاشت کرنے لگے، جن میں منافع کے زیادہ امکانات تھے۔ ٹیکسٹائل کے شعبے میں کم منافع والے مال، مثلاً اونی کپڑے کی بُنائی بند کر دی گئی اور اس کی جگہ زیادہ مہنگے ریشمی کپڑے بنانے شروع کر دیے۔ نشاۃ الثانیہ کے دَور میں شمالی اٹلی تعیش کے اسباب کی فراہمی کا مرکز بن گیا۔

یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ سامیوں نے تحریر کا فن ایجاد کیا، کیوں کہ وہ کاروبار میں سرگرم رہنے والے لوگ تھے۔ مصریوں کے جنوبی عرب، نوبیا، شام اور کریٹ کے ساتھ بڑے وسیع تجارتی روابط تھے۔ نینوا اور بابل بھی تجارت کے بڑے اہم مرکز تھے۔ ہندوستان میں بدھ مت کے فروغ سے پہلے دو صدیاں مصنوعات کی تیاری اور بحری تجارت میں سرگرمی اور توسیع کی صدیاں تھیں۔ تاجر مختلف مصنوعات مثلاً زیورات، گرم مسالے، کپڑے اور خشک مچھلی کی تجارت ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل اور بابل، عرب اور مصر کے ساتھ کرتے تھے۔ مصر کے شہر سکندریہ نے جو مذہبی گہما گہمی کے لیے مشہور تھا، ہندوستان اور دیگر مقامات کے ساتھ بھرپور تجارت جاری رکھی تھی۔ مکہ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں عرب اقوام کے لیے ایک بڑا تجارتی شہر تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مذہبی مصروفیات سے پہلے یمن اور شام تک تجارتی قافلوں کی قیادت اور اپنی متمول بیوی خدیجہؓ کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کاروباری ماحول میں دوسری دلچسپیاں خارج نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ درحقیقت تجارت سے ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو تقویت ملتی ہے اور تلاش و تجسس کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔

حسابی اور تجارتی اختراعات

تہذیبی تیز رفتاری کے زمانے بھی وہی تھے جب نئے ٹیکنیک ظہور میں آئے۔ ان کے ساتھ ہی تحریر کی زبان اور الیکٹرانک ذریعۂ اظہار دونوں نے اپنے اپنے زمانوں میں ریاضی

کے شعبے میں ایجادات کیں۔ ہر ایک نے تجارت کے معمولات میں پیش قدمی کی۔ سامیوں نے بالاقساط خریداری کا ایک طریقہ وضع کیا تھا۔ انہوں نے جو اُور چاندی کو زَرِ تبادلہ بنا لیا۔ پیشہ وَر مہاجن کسانوں کو چاندی بطور قرض دیتے تھے تاکہ وہ بیج خرید سکیں۔ پھر اس قرض کی واپسی کا مطالبہ اُس وقت کرتے جب کٹائی کا موسم آتا تھا اور بازار میں اس کی قیمت گر جاتی تھی۔ اس طرح مہاجن کسانوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ قدیم مصریوں نے ریاضی اور اقلیدس کے بہت سے بنیادی تصورات کو ترقی دی اور ان میں اجزا بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ ریاضی کے علوم کو اس وقت استعمال کرتے تھے جب سیلاب زمین پر سے سب کچھ بہا لے جاتا تھا اور پچھلے نشانات کو بحال کرنا مقصود ہوتا تھا۔ مصریوں کی سادہ سی اقلیدس یہ ہوتی کہ خاص خاص مثالوں کو سامنے رکھ کر ایک عمومی نتیجہ نکال لیتے تھے۔

سن600 اور400 قبل مسیح کے درمیانی زمانے میں تجارت میں سہولت دھات کے سکے کی صورت میں پیدا کی گئی۔ اس کا آغاز تقریباً600 قبل مسیح میں لیڈیا سے ہوا۔ لیڈیا ترکی کی ایک چھوٹی سی بادشاہت تھی جس نے یونان کی شہری ریاستوں میں سے بیشتر ایشیائی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کا آخری بادشاہ کروسس تھا جس نے ایرانیوں پر حملہ کرنے کی غلطی کی، جنہوں نے کروسس کو میدانِ جنگ میں شکست دی اور اس کی بادشاہت پر قبضہ کر لیا۔ اس تباہ کن واقعہ سے پہلے کروسس نے پہلے طلائی سکے جاری کیے تھے جو یونان کے ایک مقبوضہ شہر فوشیا کے مقامی معیار کے مطابق تھے۔ ان ڈھلے ہوئے سکوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر سکے پر یہ سرکاری عبارت کھدی ہوئی تھی کہ اس میں سونا مقررہ معیار کا اور خالص ہے۔ اس طرح پہلے کے مقابلے میں تجارت آسان ہو گئی۔ ورنہ پہلے دستور کے تحت سکے کے حساب سے جنس کو وزن کرتے تھے اور اس کا معائنہ کرتے تھے، یا مویشی ہو تو اس کا تخمینہ لگاتے تھے۔ یونان کے دانش وَروں نے اس زمانے میں ریاضی کے علم میں اضافے کی خاطر منطقی استخراج کا طریقہ استعمال کیا۔ میلیٹس کا تھیلز تھا، جو مصر سے اقلیدس کے علم کو یونان لے آیا وہ ان پہلے حساب دانوں میں شامل تھا، جنہوں نے اقلیدسی اعداد کے مختلف اجزا کے درمیان تعلق کا مطالعہ کیا۔ فیثاغورث کی شہرت اس کے نظریہ (زاویۂ قائمہ اور مثلث) سے ہے۔ اس نے یہ معلوم کیا کہ مرتعش دھاگے سادہ عددی تناسب کی بنا پر ہم آہنگ موسیقی پیدا کرتے ہیں۔

تیسرے دور میں جو1400 سے1600 عیسوی پر محیط تھا، یورپ میں شہر بڑی تیزی

سے نمودار ہوئے۔ وہ صناعی اور تجارت کے مرکز تھے۔ زمانہ وسطیٰ میں بٹائی پر کھیتی باڑی کا جو نظام قائم تھا، اب اس کی جگہ ٹھیکے کی مزدوری نے لے لی۔ گلڈز (پیشہ ورانہ تنظیمیں) بن گئی تھیں جو شہروں میں پیشہ ورانہ کاموں کی نگرانی کرتی تھیں۔ تاجروں کی تنظیمیں مقامی مصنوعات کی برآمد کو فروغ دے رہی تھیں۔ دور دراز مقامات پر تجارتی مہمات کے لیے سہولت پیدا کرنے کی خاطر مالی بندوبست کو ترقی دی گئی۔ مشترکہ کمپنی کے اداروں نے اپنے وسائل یک جا کیے تاکہ بڑے تجارتی منصوبوں پر لگا سکیں۔ بحری بیمہ کاری نے نقصانات کے خطرے سے بچاؤ کی راہ نکال لی۔ بنک افراد سے ان کی رقوم جمع کرنے لگے۔ بانڈ کے عوض نقد رقم دے دیتے اور قرضے کا ضمانت نامہ جاری کرنے لگے۔ وینیشیا کے ایک پادری فرالوسا پاکولی کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اس نے 1494 عیسوی میں دہرے اندراج کا جدید نظام وضع کیا۔

ریاضی کے بہت سے تصورات اور طریقے، جنھیں ہندوستان میں ترقی دی گئی تھی، اس دور میں مسلمانوں کے توسط سے یورپ پہنچے۔ الجبرے کو اٹلی میں 1202 عیسوی میں متعارف کروایا گیا۔ یہ کام پیسا کے لیونارڈو نے انجام دیا۔ عربی کے ہندسوں کا علم یورپ میں گیارھویں صدی عیسوی میں متعارف ہوا۔ اسے یورپ والوں نے اس کتاب سے حاصل کیا جو ہندوستان میں لکھی گئی تھی اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا تھا۔ خود عربوں نے اس عددی نظام کو اپنے یہاں استعمال نہیں کیا۔ اس بارے میں کچھ رکاوٹ اس لیے تھی کہ صفر (0) کو غلطی سے 6 اور 9 بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ بعد میں چھپائی سے یہ غلط فہمی جو دیکھنے میں ہو سکتی تھی دُور ہو گئی اور نیا نظام رائج ہو گیا۔ طویل اعداد کی تقسیم کی ترکیب جس کا استعمال پندرھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا، پہلی بار قلندری کی ریاضی میں نظر آئی۔ یہ کتاب فلورنس میں 1492 میں شائع ہوئی تھی۔ ریاضی دانوں نے پندرھویں صدی میں مثبت (+)، منفی (-) اور فی صد (%) کی جدید علامتیں متعارف کرائیں۔

چوتھے تاریخی عہد میں جس کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا، خُردہ دکان داری کا جدید طریقہ نافذ کیا گیا۔ ڈیپارٹمنٹل سٹور پہلے پہل پیرس میں 1852 میں کھولے گئے۔ تجارتی مصنوعات گاہکوں میں جس طرح تقسیم کی جا رہی تھیں، اس طریقے میں انہوں نے انقلاب پیدا کر دیا۔ اب مصنوعات سٹور میں نمایاں جگہ پر رکھی اور مقررہ قیمت پر فروخت کی جانے لگیں۔ بازار میں قیمتوں پر تکرار کا روایتی طریقہ ختم ہو گیا۔ چونکہ خُردہ فروشی میں منافع کی

شرح کم ہوتی تھی، اس لیے منافع کا انحصار اس بات پر ہوا کہ متوقع خریدار سٹور میں آنے میں کشش محسوس کریں۔ تاجران نے اپنی مصنوعات میں عام لوگوں کی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اخبارات میں اشتہار دینے شروع کیے۔ اس زمانے میں ریاضی میں جدید معلومات کی بدولت خلا اور وقت کے متعلق ان مفروضوں کو چیلنج کیا جانے لگا، جو طویل عرصے سے رائج تھے۔ البرٹ آئن سٹائن نے اپنے نظریۂ اضافت کے مطابق نیوٹن کی طبیعات کو چیلنج کیا۔ طبیعات (Quantum Mechanics) نے تجرباتی سائنس میں متبادل مفروضوں پر سوالات اٹھائے۔ جارج اوّل کی منطقی اشکال نے، جسے اس نے1854 میں مرتب کیا تھا، ہندسوں کی نظریاتی بنیاد مہیا کی۔

ایک وسیع تر دنیا کا ادراک

جہاں تہذیبی ٹیکنالوجیز وہ طاقتیں ہیں جو تاریخی تجربوں کی تشکیل کرتی ہیں، وہیں تہذیبوں میں تبدیلی نئے ادراک اور شعور سے بھی آتی ہے۔ معاشرے اپنے ذہنی افق کو دونوں طرح وسعت دے سکتے ہیں، یعنی اس طرح کہ دنیا کو مختلف انداز سے دیکھیں اور نامعلوم علاقوں کا سفر اختیار کریں۔ دنیا کی مختلف قومیں جو تاریخی طور پر منتشر تھیں، اس وقت ایک دوسرے سے بہتر طور پر آگاہ ہوگئیں جب ان کے درمیان رابطہ بڑھ گیا۔ رسل و رسائل اور مواصلات کے بہتر قرینوں کی بہ دولت انسانیت اس وسیع تر دنیا سے واقف ہوگئی جسے پہلے زیادہ نہیں جانتی تھی۔ اپنے قریب ترین ماحول سے شروع ہو کر انسانوں نے نسبتاً اس بڑی دنیا کو دیکھا جس میں انسانی تہذیب فروغ پا رہی تھی۔ یونان کے لوگ اسے دنیا کا ''آباد'' حصہ کہتے تھے۔ علاوہ دیگر باتوں کے دنیا کی تاریخ میں ان مکانات کی ''دریافت'' کا عمل بھی شامل ہے جو پہلے نامعلوم تھیں اور ان مقامات کے رہنے والوں سے آگاہ ہوئے، اس طرح ان کے ''آباد'' کے تصور میں وسعت پیدا ہوئی۔

دنیا کی تاریخ میں موڑ ان زمانوں میں آئے، جب وسیع تر دنیا دریافت کی گئی۔ الگ الگ رہنے والے باشندے جب ایک بار آپس میں ملے تو ایک پُرمسرت اور ولولہ انگیز تجربے سے آگاہ ہوئے۔ اولین ترین آبادیاں، یعنی سامی نسل کے باشندے، مصری، ہندوستانی اور چینی، چند شہری ریاستوں تک مرکوز تھیں، ان میں کسی کو دوسرے لوگوں کے وجود

کے بارے میں ایک دھندلے سے تصور سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔آ ثار قدیمہ کے ماہروں کو پندرھویں صدی قبل مسیح سے پہلے کی سامی تحریروں کے اندر کوئی حوالہ مصر کا نہیں ملتا۔ جب سولھویں صدی عیسوی میں سپین کے لوگ آئے تو اس وقت تک 'ازتک' اور 'انکا' معاشروں کو ایک دوسرے کے وجود کا کوئی علم نہیں تھا۔ پہلے عہد کی تہذیب کی آمد کے ساتھ ہی جغرافیائی افق وسیع ہوتا گیا۔ پہلے فرعون خاندان نے جنوب اور شمال کے مصری علاقوں کو متحد کیا اور ایک ایسے علاقے میں سیاسی اور تہذیبی اتحاد پیدا کیا جو دریائے نیل کے کنارے سینکڑوں میل میں پھیلا ہوا تھا۔ساميوں کے معاشرے میں ابتداً ایک درجن چھوٹی چھوٹی برادریاں شامل تھیں، جو آپس میں کوئی ایک سو میل کے دائرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جب بادشاہ یوروکا گینا نے چوبیسویں صدی قبل مسیح میں ان علاقوں کو متحد کیا تو اس وقت اس نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ میری سلطنت سمندر سے سمندر تک پھیلی ہوئی ہے — یعنی خلیج فارس کے شمال سے بحیرہ روم تک۔سن 600 اور 400 قبل مسیح کے دوران میں بحیرہ روم کے علاقے کے باشندوں نے دنیا کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں آرمینیا کے تاجران نے خشکی کے راستے مشرق کا سفر اختیار کیا۔ وہیں کارتھیج کے جہاز رانوں نے بحرالکاہل کے ساحلی علاقوں کی سیر کی۔ان تاجروں کو سپین کی کانوں سے تانبا مل گیا اور جنوب مغربی انگلینڈ سے ٹن دست یاب ہوا۔کارتھیج کے ایک بحری کپتان ہنو نے 520 قبل مسیح میں افریقا کے مغربی ساحل کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ گیا جسے آج کل گمبیا کہتے ہیں۔ وہاں سے اس کے جہازی عملے نے چند پودوں کی اقسام، کچھ جان دار، جن میں چند چمپینزی بھی شامل تھے، اکٹھا کیے اور ساتھ لے لیے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ساتویں صدی قبل مسیح میں فرعون نیچو نے فونیشیا کے جہازیوں کے ایک گروہ کو براعظم افریقا کے طول و عرض کی پیمائش کے لیے کہا۔اس زمانے میں یونانیوں نے جنوبی فرانس میں نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ان کی نوآبادیاں سسلی، لیبیا، ترکی اور یوکرین میں بھی تھیں۔یونان کے سیاح مصر کے آثار کو دیکھنے کے لیے اکثر آتے رہتے تھے۔ایک جغرافیہ دان اور مؤرخ ہیروڈوٹس جس کا تعلق پانچویں صدی قبل مسیح سے تھا، یہ جانتا تھا کہ آباد دنیا صرف خشکی کا ایک ڈھیر ہے، جس کے چاروں کونوں میں ہندوستان، حبشہ، آئبیریا (سپین) اور سیتھیا (یوکرین) آباد ہیں جس میں دو عظیم سمندر داخل ہیں۔ ہیروڈوٹس کے جغرافیہ میں قدیم تہذیب کی تین چوتھائی دنیا شامل تھی۔صرف چین اس میں شامل نہ تھا۔اس نے، ظاہر ہے، نئی دنیا کی تہذیبوں کو بھی خارج کر

دیا تھا۔ دوسری کوشش میں ان دونوں علاقوں کو معلوم دنیا کے دائرے میں شامل کر لیا گیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں جب منگولوں نے پولینڈ اور ہنگری پر حملے کیے تو اس سے یورپ کا رابطہ اس سیاسی سلطنت سے ہو گیا جو بحرالکاہل تک پھیلی ہوئی تھی۔ وینس کے ایک نوجوان مارکو پولو نے اپنے باپ اور چچا کے ساتھ پیکنگ کا سفر کیا، جہاں منگول شہنشاہ نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ مارکو پولو نے چین میں 17 سال گزارے، پھر اٹلی واپس آ گیا۔ یہاں اس نے اپنی مہمات کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ مشرق کے زَر و مال کی خواہش نے اور اس توقع کے ساتھ کہ بہت سے بے دین لوگوں کو مسیحیت میں داخل کرنے کا موقع مل جائے گا، کولمبس نے مغرب کی جانب بحری سفر اختیار کیا۔ اس کا ارادہ چین اور جاپان جانے کا تھا، لیکن بحرالکاہل میں اس کے سفر کے نتیجے میں ایک اور براعظم دریافت ہو گیا۔ کولمبس غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ وہ ہندوستان پہنچ گیا ہے۔ پرتگالی جہازراں تھوموجوڈیاس نے1488 عیسوی میں جنوبی افریقا کے گرد چکر لگایا۔ اس مہم سے جغرافیہ کے علم میں توسیع ہوئی۔ ایک اور پرتگالی کپتان واسکوڈی گاما دس سال بعد اس راستے پر سفر کرتا ہوا کلکتہ پہنچ گیا تھا۔

ایک اور بحری کپتان فرڈیننڈ میگلن نے جو سپین کی ملازمت میں تھا، دنیا کے گرد پہلا سمندری سفر اختیار کیا۔ وہ اپنے ساتھ پانچ جہاز لے کر ستمبر1519 میں جنوبی امریکا روانہ ہوا۔ جنوبی ارجنٹائن کے گرد بحرالکاہل کا راستہ تلاش کرنے میں اسے ایک سال لگ گیا۔ اس مہم کے دوسرے مرحلے میں وہ سمندر میں سیدھا جزائر فلپائن کی طرف روانہ ہوا، جہاں میگلن کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے وکٹوریہ نام کے جہاز نے سفر جاری رکھا۔ بحر ہند اور افریقا کے گرد چکر لگا کر وہ22 ستمبر1522 کو پرتگال واپس پہنچ گیا۔ اس سفر سے دو باتیں ثابت ہو گئیں، ایک تو یہ کہ زمین گول ہے، اگرچہ کولمبس کے اندازے سے بہت بڑی ہے، اور دوسری یہ کہ اس کا ایک دوسرا نصف کرہ بھی ہے۔ اس طرح کی مہمات نے کرۂ ارض کی تمام بڑی بڑی تنظیموں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ اس سال جب کہ میگلن نے بحری سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہرنانڈو نے چار سو مسلح آدمیوں کو ساتھ لے کر میکسیکو میں ازٹک کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔ فرانس کے مہم جوؤں نے شمالی امریکا کی اندرونی آبی گزرگاہوں کا پتہ چلایا اور اس طرح بحرالکاہل تک شمال مغربی راستے کو تلاش کیا، جس طرح میگلن نے جنوب میں راستہ نکالا تھا۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب تہذیب کا چوتھا عہد شروع ہوا تو جغرافیائی مہمات

میں دلچسپی کچھ اور بڑھ گئی۔ لندن نے ایکسپلورر کلب نے خط استوا کے افریقی علاقے کے لیے ایک مہماتی سفر کا آغاز کیا تا کہ دریائے نیل کے منبع کا صحیح پتہ چلایا جا سکے۔ رچرڈ برٹن اور جان سپیک نے1858 میں تنگانیکا نام کی جھیل دریافت کر لی۔ سپیک چلتا ہوا جھیل نیانزا تک پہنچ گیا جسے اب دریائے نیل کا منبع سمجھا گیا ہے۔ اتاہ تک مارمن کی پیدل مہم اور1849 میں کیلیفورنیا گولڈ رش (سونے کی تلاش) کے نتیجے میں شمالی امریکا میں مشرقی آبادی مراکز مغربی حصے کے بنجر قطعاتِ اراضی کی طرف متوجہ ہوئے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں گورے تارکین وطن کی بھیڑ لگ گئی۔ ایڈمرل میتھیو پیری نے1853 میں جاپان کا دورہ کیا اور اس جزیرے کو خود ساختہ تنہائی سے باہر نکالا۔1905 میں ٹرانس سائبیرین ریل روڈ کی تکمیل سے شمال مغربی ایشیا کے اندرونی علاقوں کے دروازے روسی آبادکاروں کے لیے کھول دیے گئے۔ زمین کے کچھ ایسے علاقے جن میں ابھی تک کوئی مہم جو ٹیم نہیں پہنچی تھی، ان میں قطب شمالی بھی تھا۔ رابرٹ ای پیری نے1909 میں وہاں کا سفر اختیار کیا۔ مہم جوؤں کی حریف ٹیموں نے جن کی قیادت رابرٹ اسکاٹ اور رولڈ امنڈسن کر رہے تھے1911-12 میں نہایت تیزی سے قطب جنوبی کی طرف پیش قدمی کی۔ امنڈسن کی ٹیم کو فاتح قرار دیا گیا۔ اسکاٹ اور اس کے چاروں ساتھی قطب شمالی سے واپس آتے ہوئے برف میں دب کر ہلاک ہو گئے۔ البتہ انہوں نے اپنی ڈائریاں چھوڑ دی تھیں۔

تب ہی سے انسانیت جغرافیائی اور طبیعاتی دریافتوں کے ایک نئے عہد میں داخل ہو گئی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں تجرباتی طبیعات کے علم (Theoretical Physics) نے لوگوں کو اس امر سے آگاہ کر دیا کہ جہاں اس کی حدیں ختم ہوتی نظر آتی ہیں، ان کے بعد بھی انتہائیں اور نئی دنیائیں موجود ہیں۔ انہوں نے مادے کے انتہائی خفیف ذرّے کے اندر ایک ایٹمی ڈھانچا پروٹونز اور الیکٹرونز کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ ایٹم سے پیدا ہونے والی انرجی اور اس کی تباہ کن طاقت بھی انہوں نے دیکھ لی، جب امریکی حکومت نے دوسری عالمی جنگ کے دوران میں جاپان کے شہروں پر دو ایٹم بم گرائے۔ اس جنگ میں جرمنی کے وی ون اور وی ٹو راکٹ برطانیہ کے شہروں پر بم برساتے رہے، پھر انہی راکٹوں کو ترقی دے کر انٹر کانٹی نینٹل بیلاسٹک میزائل بنائے گئے، جن کے ساتھ ایٹمی وار ہیڈز سرد جنگ کے زمانے میں لگائے گئے تھے اور دوسرے مہلک ہتھیاروں کے انبار لگا دیے گئے۔ اس زمانے میں جو لوگ زندہ تھے،

انہیں علم ہو گیا تھا کہ زمین کس قدر خطرناک حد تک چھوٹی ہو گئی ہے۔ زمین کے دوسرے نصف کرہ سے پھینکے جانے والے میزائل آدھ گھنٹے کے اندر ان کے اپنے شہر کو نیست و نابود کر دیں گے، تاہم اس طرح کے میزائل خلائی دور کا آغاز کرنے میں معاون ہوئے۔ دونوں فوجی سپر پاورز کے درمیان مقابلے کا آغاز ''سپوتنک'' کی خلائی پرواز سے ہوا، اس کے بعد چاند کی طرف راکٹ، جن میں سے بعض میں انسان موجود تھے اور بعض میں نہیں تھے، خلا اور دیگر کئی سیاروں کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیجے گئے۔

نئی دنیاؤں کے ساتھ یہ زندہ ملاقات ذہن میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ یہ تجربات نئے تصورات لے کر آتے ہیں جو غالباً ان کے بغیر کبھی زمین میں پیدا نہ ہوتے۔ چونکہ یونان کے دانش وَرا اپنے شہروں کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی مانوس تھے، اس لیے وہ مختلف طرز کی حکومتوں کی خصوصیات پر ذہانت کے ساتھ گفت گو کر سکتے تھے۔ افلاطون ایک مثالی معاشرے کا تصور کرنے میں کامیاب رہا، جیسا کہ اس نے 'ری پبلک' میں لکھا ہے۔ امریکا کی دریافت نے سر تھامس مور کو 1514 میں ''یوٹوپیا'' تصنیف کرنے پر اکسایا۔ اس نے اس امکان کے بارے میں بتایا کہ اس دنیا سے بہتر ایک اور دنیا کا وجود ممکن ہے۔ ایک ماہر فلکیات فریڈ ہائل نے مشاورتاً کہا کہ اگر کوئی شخص زمین کے بالائی خلا سے اس کا فوٹوگراف بنا سکے تو یہ تجربہ اس کے ذہن کو اس طرح بدل دے گا کہ پہلے کبھی ایسا نہ رہا ہو گا۔ اس کی پیش گوئی اس وقت پوری ہو گئی جب چاند کی جانب اپولو کی پرواز کے دوران ایسی ہی ایک تصویر بنا لی گئی۔ یہ ہمارے اپنے سیارے کی تصویر تھی۔ نیلگوں جس پر سفید پٹیاں تھیں، یہ سیارہ اندھیرے خلا میں معلق تھا، اس تصویر کا یہ امتیاز تھا کہ اس نے خلا میں پرواز کے لیے تحریک پیدا کی۔ آرتھر کلارک نے پیش گوئی کی ہے کہ خلا میں آباد کاری سے انسانی فکر پر اور بھی گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

گیارھواں باب

پانچویں تہذیب کی اطلاع

انسانیت دوسرے ہزاریہ کے اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے۔ عالمی تاریخ میں تین تہذیبیں گزر چکی ہیں، چوتھی اپنی پختہ سالی کے قریب ہے اور پانچویں افق پر نمودار ہو رہی ہے۔ چونکہ یہ پانچویں تہذیب ابھی اپنے اوائل میں ہے، اس لیے ہمیں نہیں معلوم یہ عہد ہمارے لیے کیا لے کر آئے گا، سوائے اس کے کہ کمپیوٹر ہماری تہذیبی ٹیکنالوجی کے خطوط متعین کریں گے۔ اس تہذیب کے بارے میں ہماری امیدوں کی بنیاد ان دیگر تہذیبوں سے یکسانیت کی نسبت سے ہے، جن کی تاریخ کا ہمیں علم ہے۔ ان کی اساس گزشتہ واقعات پر اور موجودہ رجحانات پر ہے اور معقول آثار پر جو آگے بڑھتے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن تاریخ کا ایک حصہ ایسا ہے، جس کے بارے میں فی الوقت کچھ بھی معلوم نہیں۔ مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں بدنامی کی حد تک نادرست پائی گئی ہیں۔ یہ پہلے سے بتا دوں کہ باب کے باقی حصے میں جو بحث ہوگی وہ اسی پر ہوگی۔

اپنی تاریخی دلیل دیتے ہوئے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایک برتر تہذیبی ٹیکنالوجی اور فی الوقت کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے آنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک نئی تہذیب رونما ہونے والی ہے۔ ہر نئی تہذیب معاشرے میں نئے ادارے پیدا کرتی ہے، کیوں کہ اس کے منطقوں میں مزید تقسیم پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ان کی کارکردگی ممکن ہے اگلے وقتوں میں بھی وہی ہو، لیکن اب وہ بہتر انداز سے منظم ہوتے ہیں اور معاشرے کی مستحکم ساخت میں شامل ہوتے ہیں۔ اب تہذیب اپنے ساتھ نئی اقدار، عقائد اور مثالی شخصیات ساتھ لے کر آتی ہے۔ واقعات کا ایک دھارا ہے۔ جو پچھلی تہذیبوں کے ساتھ بہتا چلا آتا ہے۔ کچھ اختلافی نکتے بھی ہوتے ہیں۔ کسی تاریخی عہد کے آغاز میں جو اقدار اور خیالات غالب ہوتے ہیں، اب آخر میں ان پر مخالف اقدار اور خیالات کا غلبہ ہوتا ہے۔

کمپیوٹر کی نوعیت اور اس سے متعلق عوامل

اگر نئی تہذیب کی تشکیل کمپیوٹروں سے ہو گی تو واقعات کا رخ اسی نکتہ کے تعلق سے ہو گا۔ اس ضمن میں کمپیوٹروں کے حوالے سے درج ذیل باتیں کہی جا سکتی ہیں۔

☆ کمپیوٹر حساب یا منطق میں جمع، تفریق کا کام تیز رفتاری سے اور پوری صحت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ وہ سائنسی شماریات یا کاروبار کا ریکارڈ رکھنے کے کام میں زبردست مستعدی دکھاتے ہیں، اتنی زیادہ کہ کوئی کلرک یا انجینئر مکینیکل کیلکولیٹر سے اور کاغذ پر حساب لگا کر نہیں کر سکتا، اس میں تو کچھ ایسے حساب کرنا بھی ممکن ہوتا ہے، جو ایک معقول وقت میں انجام دینا دشوار ہوتا ہے۔

☆ کمپیوٹر میں یہ اہلیت ہے کہ الگ الگ لوگوں کے بارے میں متعدد حقائق کو یاد رکھتے ہیں اور ان لوگوں کی ایک فہرست بنا لیتے ہیں جن میں بعض خصوصیات مشترک ہوتی ہیں۔

☆ کمپیوٹر ٹیلی فون لائن پر دوسرے کمپیوٹر کے ساتھ رابطہ کر سکتے ہیں، وہ اطلاعات کو لاتعداد فائلوں کے اندر ذخیرہ کر سکتے ہیں۔

☆ کمپیوٹر بصری اور سمعی اشکال کو جمع کر سکتے ہیں۔ پھر ان میں حسب منشا تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں اور ایک خیالی منظر سامنے لا سکتے ہیں۔

☆ کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی جیسے جیسے ترقی کر رہی ہے، اس کی وجدانی صلاحیتیں انسانی ذہن کی صلاحیتوں تک پہنچنے والی ہیں۔ اس دنیا میں آدمی کی حیثیت کو اگر کوئی اتنی ہی ذہین اور اسی کی بنائی ہوئی چیز کو چیلنج کر سکتی ہے تو یہی کمپیوٹر ہے۔ ان صلاحیتوں کے بہت سے ضمنی فوائد ہیں۔ اگر کمپیوٹروں کی لاگت کا مقابلہ ملازموں کی اجرتوں کے ساتھ کیا جائے، جو ایک ہی نوعیت کے کام کر رہے ہوں تو آج کمپیوٹروں کو ملازموں پر ترجیح دیں گے۔ اس فیصلے کے ملازمتوں پر اور سماجی حالات پر بھی اثرات مرتب ہوں گے۔ اگر کمپیوٹر افراد کے بارے میں معلومات محفوظ کر سکتے ہیں اور ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ادارے افراد کی نشان دہی تیزی سے اور آسانی کے ساتھ کر لیں گے۔ اس طرح مارکیٹنگ کی مہم کو زیادہ مستعدی سے چلانا ممکن ہو جائے گا۔ اب اگر کمپیوٹر کا رابطہ دوسرے کمپیوٹروں کے ساتھ ہو جائے تو

معلومات کی پرکھ اور درجہ بندی کی صلاحیت بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ وہ کمپیوٹر جو ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں ہوں، مواصلات کا ایک الگ وسیلہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ نئی بصری اور سمعی اشکال پیدا کر سکتے ہیں تو اس کا تخلیقی اظہار فلم یا ٹیپ پر تاثرات سے کہیں زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے۔ اس طرح تعلیم، روزگار یا تفریح کے لیے مواصلات کے امکانات کہیں زیادہ بڑھ جائیں گے۔ آخری بات یہ کہ کمپیوٹر اپنی ذہانت میں اگر انسانوں کے حریف ہو سکتے ہیں تو اپنی اہلیت میں وہ ایک برتر درجے کے ملازم ہوں گے، یا نسل انسانی کے آقا بن جائیں گے۔

ملازمت اور ضمنی عوامل

جب کاروباری فرموں نے 1950 کے عشرے میں پہلی بار کمپیوٹر ٹیکنالوجی اختیار کی تو ''آٹومیشن'' (خودکار عمل) کی اصطلاح کو صنعتی معمولات میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس لفظ سے ان کمپنیوں کو معجزہ نما سمجھا جانے لگا جو آٹومیٹک پائلٹ چلاتے تھے اور انسانی محنت سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اس وقت سماجی نظریہ دان یہ سوچ کر حیران ہو رہے تھے کہ اگر پرانے طرز کے کام سرے سے ختم ہو گئے تو محنت کشوں کو روزگار کہاں سے ملے گا۔ بدترین صورتِ حال یہ ہو گی کہ کمپیوٹر کا دور اپنے ساتھ عام بے روزگاری اور افلاس لے کر آئے اور بہترین بات یہ ہو گی کہ ایسی سوسائٹی وجود میں آئے جب لوگ کام کے بغیر گزر بسر کرنے لگیں۔ زیادہ پرامید امکان کی وکالت کرنے والے لوگ اپنے سامنے اس وقت کو دیکھ رہے ہیں جب حکومت صنعتی ترقی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت کو ایک توسیعی، رفاہی، ریاست میں عام لوگوں کی طرف منتقل کرنے کی ہدایت کرے۔ آمدنی کا کام کے ساتھ تعلق ختم ہو جائے گا۔ یہ بھی امکان ہے کہ مزدور یونینیں زائد اجرت اور کم تر اوقات کار کے لیے احتجاج کی مہم شروع کر دیں گی۔ مزدوروں کے فرائض کا کچھ حصہ اگر مشینیں انجام دینے لگیں تو بھی بعض پیداواری شعبوں میں انسانی محنت کی ضرورت رہے گی اور اس بنیاد پر وہ بھاری اجرت طلب کریں گے۔ مخالفین نے یہ دلیل دی کہ اس طرح کے الٹ پھیر کی ضرورت پیش رہے گی۔ معیشت خود اپنے طور پر ہر فرد کو پیداوار کے عمل میں شامل رکھنے کے لیے نئی طرح کی پیداواروں کو بھی فروغ دے گی۔

بیسویں صدی کے ختم ہونے تک اب یہ تصویر ابھرتی ہے، کاروبار نے کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی کو نہایت تیز رفتاری سے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ مزدوروں کی پیداواری محنت

کے تناسب سے ان کے حالات بھی بہتر ہوں گے۔ لیبر کے شعبے میں بہتری کی بہ دولت روزگار ختم نہیں ہو گیا ہے۔ تاریخی معیارات کی رو سے امریکا میں بے روزگاری کی سطح بہت کم ہے۔ مغربی یورپ میں روزگار کے اندر کمی کی توقعات کو بڑی حد تک حاصل کر لیا گیا ہے۔ امریکی لیبر یونینوں نے اوقاتِ کار میں کمی کے مطالبے پر احتجاج کرنا ترک کر دیا ہے۔ اوور ٹائم کا پریمیم جس کا مقصد مزدوروں کو دیر تک کام کرنے سے باز رکھنا تھا، اب ایک طرح سے اضافی اجرت بن گیا ہے جس کا بعض مزدور بڑی خوش دلی سے خیر مقدم کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ امریکا میں کام کے اوسط اوقات بڑھ گئے ہیں۔ یہ خیال کہ حکومت لوگوں کو کام کے بغیر اجرت دیا کرے گی، شروع میں تو بہت پرکشش معلوم ہوا، لیکن اس معمول میں اب پہلی سی گرم جوشی نہیں رہی۔ رفاہ کے لیے اصلاح کی مہم اور اکیلی رہنے والی ماؤں کو مجبور کرنا کہ بااجرت کام تلاش کریں، انھی باتوں نے دونوں جانب سے تعاون حاصل کیا ہے۔ بااجرت ریٹائرمنٹ نے بہت سے بوڑھوں کو آمادہ کیا ہے کہ مزدوری سے باز آ جائیں، لیکن ان کے لیے فنڈ کے حصول کا طریقہ ہمیشہ کے لیے ایک مسئلہ رہا ہے۔

مجموعی قومی پیداوار میں مسلسل اضافے کی وجہ سے روزگار کا تحفظ ہوا ہے۔ پیداوار میں اضافے سے مراد بڑھی ہوئی بے روزگاری نہیں، کیوں کہ پیداوار جس پر ڈالر کی حکمرانی ہے، وہ بھی بڑھی ہے۔ اس کے باوجود روزگار کی تعداد خاصی مستحکم ہے۔ گزشتہ سال کی پیداوار کے حساب سے بیشتر مزدوروں کو فائدہ نہیں پہنچا۔ بالائی سطح کے انتظامی عہدے داروں اور پیشہ ورانہ منصب پر فائز افراد کو اچھا خاصا فائدہ ہوا ہے، لیکن مزدوروں کی ایک کثیر تعداد معمولی اجرتوں کے کاموں میں پھنسی ہوئی ہے۔ جہاں تک پیداوار کا تعلق ہے، اشیائے صَرف اور خدمات کے شعبوں میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ حالانکہ دراصل یہی شعبے عام لوگوں کے فائدے کے ہیں، بہت سے شعبوں میں بڑھتی ہوئی اقتصادی سرگرمیاں محض زیاں ہیں۔ جوئے کے مجنونانہ شوق نے امریکا کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، جس نے کچھ بھاری انعامات پانے والے بھی پیدا کیے ہیں اور وہ بستیاں بھی خوش حال ہوئی ہیں جو کیسینوز (جوا خانوں) کے آس پاس آباد ہیں ورنہ افراد کی ناداری میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ایک طرف منشیات کی وبا ہے اور انھیں ختم کرنے کی جنگ بھی جاری ہے، اس کے نتیجے میں لاقانونیت کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پولیس افسروں کے لیے ملازمت کے مواقع بڑھ گئے ہیں اور اصلاح کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ ہماری معیشت بتدریج

آسان قرضے کی پالیسیوں اور ملازمتوں میں اچانک ترقی کی طرف جارہی ہے۔ یہاں تعطیلات کو ان اوقات میں بدل دیا جاتا ہے کہ اشیائے صرف بیچنے کے لیے فارغ وقت سے فائدہ اٹھائیں۔ اس معیشت میں عدالتی کارروائیوں کی کثرت ہے اور طبی علاج کی شدت ہے۔

قدرتی دنیا کی تشکیل

کمپیوٹر اس لیے بنائے گئے ہیں کہ قدرتی دنیا کو ایک نمونہ بنائیں۔ سائنسی علم کا اظہار ریاضی کی مساوات میں ہوتا ہے۔ جو بہ ظاہر قدرت میں ہم رشتگی ظاہر کرتی ہے۔ اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا استعمال حقیقی صورتِ حال میں کیا جائے۔ سائنس کے شعبے میں کمپیوٹر استعمال کرنے والوں نے ایک ٹیکنیک نکالی ہے جس کے تحت وہ مختلف مقامات پر اپنے مشاہدے اور پیمائش کی مدد سے قدرتی حالات میں تحرک پیدا کرتے ہیں اور فضائے بسیط میں تغیر پذیر حالات کی عددی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سے مقامات پر درجۂ حرارت، ہوا کی رطوبت اور اس کی شدت رفتار کے بارے میں اعداد وشمار جمع کیے گئے۔ اب برق و باراں کے متوقع طوفان کی تصویر بنانے کے لیے ان کوائف کو کمپیوٹر میں داخل کر دیا گیا۔ سائنسی مساوات کے حساب سے اس سے پیش گوئی میں مدد ملتی ہے کہ یہ مختلف عناصر ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوں گے اور ایک طوفان کو پوری طاقت کے ساتھ آنے میں کتنا وقت لگے گا۔ اس کے نتیجے میں خطرناک حالات سے بچاؤ کے لیے موسمی پیش گوئی اور پہلے تنبیہ کر دی جاتی ہے اور بروقت کارروائی سے نقصان کم ہوسکتا ہے۔ اگر اعداد وشمار کی کثرت ہو اور مفید نتائج حاصل کرنے کے لیے بروقت حساب کرنا ہو تو اس کے لیے زیادہ طاقت وَر کمپیوٹروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

زیادہ سائنسی تجربات کا تعلق زیادہ بڑی یا بہت ہی زیادہ چھوٹی دنیاؤں سے ہوتا ہے۔ اس سطح پر واقعات سے معنی اخذ کرنے کے لیے کمپیوٹر لازمی طور پر ریاضی کے اعداد وشمار کو اشکال میں تبدیل کر دے گا، جن میں انسانی ذہن کے لیے کچھ اشارے ہوں گے۔ مثال کے طور پر فلکیات کے ماہروں نے سیاروں کی دنیا میں دور سے آنے والی الیکٹرومیگنیٹک لہروں سے نہایت قیمتی اعداد وشمار جمع کیے ہیں۔ کائنات کے اس دائرے میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کو کسی نمایاں تبدیلی کے لیے درج کرنا بہت دیر طلب عمل ہے۔ البتہ کمپیوٹر اس عمل میں

تیزی پیدا کر کے یہ دکھا سکتے ہیں کہ یہ منظر جو اس وقت نظر آ رہا ہے کئی سال بعد ظاہر ہوگا۔ اس علم کے کچھ حصے کو ان نظریوں کی آزمائش کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی ابتدا کب ہوئی۔ اتنی ہی لازمی ضرورت یہ ہے کہ ساخت کے ان نمونوں کو سمجھنے کے لیے خُرد بینی کی انتہائی کم سطح پر دیکھا جائے۔ اگر سپر کمپیوٹر نہ ہوتے تو جینیات کی ترقی پذیر سائنس ڈی این اے اور آر این اے کی نہایت خفیف اکائیوں کی کیمیاوی ساخت کے بارے میں موصولہ معلومات کو محفوظ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ جینیاتی اکائیاں اپنے اندر ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ لاکھوں کروڑوں جینین رکھتی ہیں، جن کے تحت زندگی کا سارا عمل جاری رہتا ہے۔

کمپیوٹر کی نقول کسی ساخت کے نمونے میں تبدیلیوں کے اثر کو اس سے کہیں زیادہ آسانی سے اور کم خرچ میں دکھا سکتی ہے، جس کے لیے جسمانی طور پر تجربہ کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹروں نے جیٹ طیاروں سے لے کر ٹوتھ برش تک، تجارتی اشیا کے ڈیزائن میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے صنعتی ڈیزائن بنانے والوں کو دباؤ اور کھنچاؤ کی کیفیتوں کو دکھانے کے لیے جسمانی نمونوں کا سہارا لینا ہوتا تھا۔ اب وہ ان تبدیلیوں کو اپنے کمپیوٹر پر کھیلتے ہوئے کی بورڈ پر انگلی کی ایک جنبش سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ جب میک گروگر گولف کمپنی کو ایک نئے اور بہترین نمونے کے گولف کلب کا خیال آیا جس کی تعمیر طیطانیم (ایک دھات) سے ہوتی تھی تو انہوں نے ایک سپر کمپیوٹر پر اس کے نمونے کی تلاش کی۔ نتیجہ یہ کہ کئی اضافی نمونے مل گئے اور کلب کو اپنی ہوائی پرواز (aerodynamics) کو بہتر بنانے میں آسانی ہوگئی۔ موٹر کاروں کی صنعت میں کمپیوٹر پر کاروں کی ٹکر کے تجربے کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ ڈاؤ کیمیکل نے کمپیوٹر پر امتحان کیا ہے کہ بچوں کے پوتڑے جو صفائی کے بعد پھینک دینے کے لیے ہوتے ہیں، ان میں سیال عنصر کو جذب کرنے کی کتنی صلاحیت ہوتی ہے۔ طیارہ بنانے والے کمپیوٹر پر یہ دیکھتے ہیں کہ مختلف شکل کی اشیا کے گرد ہوا کا دباؤ کیا ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح طیارے کے لیے وہ نمونہ اختیار کیا جاتا ہے جس میں ہوا کی ہلچل کم سے کم ہوتی ہے۔ کمپیوٹر کے ماڈل کو متعین حجم کے اندر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کو گھمایا جا سکتا ہے یا اس طرح دکھایا جا سکتا ہے کہ ماڈل کے اندر کی بناوٹ کو دیکھا جا سکے۔

جغرافیہ کے اطلاعاتی نظام کی نئی ٹیکنالوجی میں کمپیوٹر سے نقشوں پر موصول ہونے والی اطلاعات شامل ہیں۔ اس کے تحت ہر مقام کے جغرافیائی محل وقوع کی نشان دہی نہ صرف فضائے بسیط سے اس کے رابطے کے تعلق سے کی جاتی ہے بلکہ اس کی ارضیاتی خصوصیات بھی

مہیا کی جاتی ہیں اور غیر طبیعاتی خصوصیات بھی، مثلاً یہ کہ وہ مقام کس کی ملکیت میں ہے اور اس کی سیاسی حیثیت کیا ہے۔ کمپیوٹر کی یہ اہلیت کہ وہ معلومات کو جوڑ دیتے ہیں، اس لیے علاقوں کے نمایاں خصائص کی نشان دہی کے لیے ان کو الگ الگ رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نقشہ نویس مسس سپی کے لیفیاٹ کاؤنٹی میں اراضی کے تمام ٹکڑوں کو سرخ رنگ میں دکھا سکتا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ قطعات اصل میں کاشت کاری کے لیے تھے اور پچاس برس پہلے کن لوگوں کے تصرف میں تھے۔ غالباً اس طرح کا نقشہ اس سیلز مین کو دلچسپ معلوم ہو گا جس نے پیداوار کو بوڑھے کسانوں کے ہاتھ فروخت کرنے میں خصوصی مہارت حاصل کی ہو۔ سیٹلائٹ نے ایک جگہ کی نشان دہی کر دی، اب وہاں تک پہنچنے کے لیے کمپیوٹر پر اس کی مخصوص گلی کا پتہ، راستے کے خم و پیچ کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خلا میں گردش کرتے ہوئے سیٹلائٹ، جن میں حساس قسم کے کیمرے رکھے ہوئے ہیں اور جو ریڈی ایشن کے عمل میں مختلف ویولینتھ پر کام کرتے ہیں، زمین پر مطلوبہ اعداد مہیا کر سکتے ہیں اور یہ بتا سکتے ہیں کہ کسی مخصوص علاقے میں ہریالی کس نوعیت کی ہے۔ اس اطلاع سے خاص مقاصد کے نقشے بنائے جا سکتے ہیں تاکہ، مثال کے طور پر یہ دکھا سکیں کہ ان ملکوں میں خشک سالی سے کیا اثرات نکل رہے ہیں جو مخصوص زرعی اجناس پیدا کرتے آئے ہیں۔

کمپیوٹروں کی نہایت واضح کارکردگی کا انحصار ہندسوں میں فراہم کردہ اس اطلاع پر ہے، جنھیں مختلف نتائج حاصل کرنے کے لیے حسب ضرورت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے میں وہ پہلے کی دیگر تمام ٹیکنالوجیز سے مختلف ہے جو ظاہری اشکال کو، ان کی ہیئت بدلے بغیر برقیاتی لہروں میں تبدیل کرتی تھیں۔ کمپیوٹر کی تصاویر نے فلم کی تیاری کا خرچ سرے سے ختم کر دیا جب کہ اس کے بصری امکانات میں زبردست اضافہ کر دیا ہے۔ کمپیوٹر ایسی اشکال تخلیق کر سکتے ہیں جن کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ کارٹون کے کردار اداکاروں کے اندر، اور اداکاروں کے کردار کارٹونوں کے اندر منتقل کیے جا سکتے ہیں۔ کسی خیالی صورتِ حال کے لیے مثلاً ایک پورے شہر کی تباہی یا خلا میں جنگ کے مناظر جو بالکل حقیقی معلوم ہوں، تخلیق کیے جا سکتے ہیں۔ آج کل کی چند نہایت مقبول فلمیں بہت حد تک کمپیوٹر کی ممنونِ احسان ہیں۔ حرکت سے بھرپور ایسی مہماتی فلمیں جیسے ٹرمینیٹر II (Terminator II) اور انڈیپنڈینس ڈے (Independence Day) نے تماشائیوں کو ایسے حیران کن مناظر دکھائے ہیں جن کا انھوں

نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ ڈزنی میں کمپیوٹر انڈسٹری کے ایک سابق عہدے دار ڈینیل بلز نے کہا ہے ''جس طرح ایک زمانے میں خلائی پروگرام نے (کمپیوٹر) ٹیکنالوجی میں زبردست تحرک پیدا کیا ہے، اسی طرح آج کل تفریح کی صنعت نے تحریک پیدا کی ہے۔''

کمپیوٹر کی فروخت

کمپیوٹروں نے اشتہار بازی کے فن اور تجارتی مال کی فروخت کے انداز بدل دیے ہیں۔ چونکہ کمپیوٹر فرداً فرداً گاہکوں کی ترجیحات کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں اس لیے اب ایڈورٹائزنگ کی حکمت عملی بھی بدل گئی ہے۔ ایچ ایم ایس پارٹنرز کے چیئرمین ڈیوڈ بیلینتھل نے یہ وضاحت کی ہے کہ ''اب سے پہلے ایڈورٹائزنگ کا مقصد ایک برانڈ نام کو مستحکم کرنا تھا تاکہ اس طرح ہماری مصنوعات اور خدمات کو استحکام ملے۔ جب وہ برانڈ نام اور اس کی شخصیت ترقی پا کر صارفین کے شعور میں جڑ پکڑ لیتے ہیں، تو ہم اپنی بچی ہوئی رقم مزید پیغامات کو قدرے زیادہ ترقی دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔'' اب کمپیوٹر کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی بہ دولت ایڈورٹائزر انفرادی طور پر اپنے صارفین کو پہچان لیتے ہیں۔ خاص طور پر ان کو جو دوسروں سے زیادہ رقم خرچ کرنے پر مائل ہوتے ہیں۔ بیلینتھل نے کہا ''ہم شاٹ گن اسٹائل (اندازے سے نشانہ لگانے) کے زمانے سے نکل کر وسیع پیمانے پر خریدار بنانے کے ایک نئے ہزاریے میں داخل ہو گئے ہیں، بالآخر حقیقی صورت حال کو جاننے کی کنجی، ہمیں مل گئی ہے، اب ہم محض قیاس آرائی پر بھروسا نہیں کرتے۔ اپنا پیغام اپنے گاہکوں اور خریداروں تک بہترین انداز میں پہنچانے میں یہ کنجی ہماری معاون ہے۔

مارکیٹنگ کے نئے انداز کی محرک دو ضرورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ ہمارا پیغام اس طرح مرتب ہونا چاہیے جو گاہکوں کی انفرادی ترجیحات کے مطابق ہو، دوسرے مارکیٹنگ کی کوشش میں کافی تعداد میں لوگوں کو شامل کرنا ہوگا تاکہ بیچنے والا ان کی معیشت کے معیار سے فائدہ اٹھا سکے۔ ان دونوں، مختلف ضرورتوں سے نپٹنے کے لیے گاہکوں کی ایک کثیر تعداد کے درمیان سے ایک محدود تعداد کا انتخاب کر کے ٹائپ کا تعین کرنا ہوگا۔ نہایت ہوشیار فروخت کنندگان جن کے پاس کمپیوٹر کی فراہم کردہ معلومات ہوتی ہیں، یہ کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ بینک، اشیائے صرف فروخت کرنے والے تاجر، ٹیلی مواصلات یا ڈاک سے مدد لینے والے ادارے،

جن کے پاس کمپنیوں کے بارے میں بنیادی معلومات ہوتی ہیں، گاہکوں کی درجہ بندی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ امریکیوں کو اوسطاً ہر سال553 نامے، بے طلب اور بے مصرف ان اداروں کی طرف سے ملتے ہیں، جن کے پاس متوقع خریداروں کی فہرست ہوتی ہے۔ اس طرح کی سروس پر خرچ ہونے والے ہر ایک ڈالر کے عوض منافع میں دس ڈالر آتے ہیں۔

ٹیلی وژن پر اشتہار دینے میں جو لاگت آتی ہے، یہ اس سے دوگنا زیادہ مؤثر ہے۔ اس لیے امید ہے کہ آئندہ عشرے میں ''بے مصرف'' خطوط کی تعداد تین گنا بڑھ جائے گی۔ تاہم براہِ راست خطوط کے ذریعے مال فروخت کرنے والے مشتہرین کو چاہیے کہ اپنے خطوط کے ڈیزائن پر خاص توجہ دیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے متوقع خریداروں کی فہرست صحیح ہونی چاہیے۔ کمپیوٹر کے فراہم کردہ اعداد و شمار کا صحیح طور پر تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

فنگر ہٹ کمپنیز براہِ راست ڈاک سے اپنا مال بیچتے ہیں۔ وہ130 ممالک کے اندر کمپیوٹر کے بتائے ہوئے گروپ کے گاہکوں کو خطوط بھیجتے ہیں، جن کی تعداد کبھی بھی دس ہزار سے کم نہیں ہوتی، اور طویل ہو تو دس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ کمپنی میں مارکیٹنگ کے ماہروں نے ''ڈیٹا مائنگ'' (اعداد و شمار کو پرکھنے کے عمل) میں3500 اقسام کے خریداروں کا تجزیہ کیا، جو ان کے کمپیوٹر میں تھے اور ان افراد کو اکٹھا کر لیا جن کی خریداری کی عادتیں یکساں تھیں۔ اس تجزیے کی مدد سے فنگر ہٹ نے پیش گوئی کر دی تھی کہ ''ڈائریکٹ سیل'' کی اس مہم سے کون سے لوگ کس طرح کا ردِعمل ظاہر کریں گے۔ ایک ''سافٹ ویئر'' کے پروگرام میں ڈیٹا فائل کا جائزہ لیا جائے تو مختلف نوعیت کے خریداروں کے درمیان ان تعلقات کا علم ہوگا، جو نہایت دلچسپ اور پہلے سے نامعلوم تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا بعض اشیا کی خریداری کے سلسلے میں گاہکوں کا میلان کیا ہے۔ فنگر ہٹ ان معلومات کو اس غرض سے بھی کام میں لاتے ہیں کہ کون سے کیٹلاگ کن گاہکوں کو بھیجنے چاہئیں، بلکہ کتنے کیٹلاگ چھاپنے چاہئیں۔ اس کے چھاپنے میں کمپنی کے400 سے لے کر900 ڈالر خرچ ہوتے ہیں اور ڈاک سے ترسیل میں1000 ڈالر۔ اگر مطلوبہ گاہکوں کی تلاش میں ذرا سی بھی کامیابی ہو جائے تو اشیا کی فروخت اور اس کے منافع میں زبردست اضافہ ہو سکتا ہے۔

چونکہ یہ برقی پیغام رسانی ایک طاقت وَر وسیلہ ہے جس سے لوگوں تک بہت بڑی تعداد میں اپنا پیغام پہنچایا جا سکتا ہے، اس لیے ایڈورٹائزنگ کا ایک امید افزا ذریعہ انٹرنیٹ بھی نکل آیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ ناظرین کو ایک ویب سائٹ پر لے آتے ہیں، جس پر

اشیا کی نمائش ہوتی ہے۔ اب چونکہ ویب سائٹ تعداد میں بہت زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے انہیں استعمال کرنے والے انتہائی مخصوص دلچسپی کے حامل فائدوں پر نظر رکھتے ہیں۔ جو لوگ اپنی ویب سائٹ رکھتے ہیں یا اس پر اشتہار دیتے ہیں، انہیں یقین ہونا چاہیے کہ ان کا پیغام نہایت صحیح لوگوں تک پہنچے گا۔ اس پر لاگت نہایت کم آتی ہے۔ کمپیوٹر کے ذریعے پیغام رسانی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پیغامات بھیجنے والے ازخود اس کے ردِعمل کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ وہ کسی زحمت کے بغیر ایک اپنا ''ڈیٹا بیس'' بنا کر صارفین کی ترجیحات کا ریکارڈ تیار کر سکتے ہیں۔ اشتہار دینے والوں کو بالکل صحیح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح کے لوگوں نے اور کتنی تعداد میں ان کا کمرشل پیغام سنا اور ان میں سے کس نے ان کی اشیا خریدیں۔ آئی بی ایم نے کھیلوں کے سامان کے ایک خُردہ فروش ایل ایل بین اور دوسروں کے ساتھ مل کر انٹرنیٹ پر ایک کیٹلاگ جیسا ڈسپلے کیا ہے۔ اس کے سافٹ وئیر کے پیغام میں آرڈر بھیجنے کا طریقہ، جہاز سے ان کی ترسیل کا بندوبست اور خریدے گئے مال کی قیمت کی ادائیگی کے کوائف شامل ہوتے ہیں۔

آج کے ویب سائٹس میں سے نصف سے بھی کم نفع بخش ہیں، پھر بھی کاروبار کے لیے انٹرنیٹ پر اشتہارات دیتے رہتے ہیں کیوں کہ آنے والے برسوں میں اس کے اندر زبردست توسیع ہوگی۔ انٹرنیٹ پر سالانہ فروخت امید ہے کہ 1998 میں سات بلین سے 13 بلین ڈالر، 2002 میں 41 بلین ڈالر اور 2003 میں غالباً 103 بلین ڈالر ہو چکی ہوگی۔ امریکا آن لائن نے، جس کے بامعاوضہ خریداروں کی تعداد اگست 1998 میں 13.5 ملین ڈالر تھی، یہ بتایا ہے کہ ان میں سے 48% نے اس سال جنوری میں 42 فیصد کے برابر ''آن لائن'' خریداری کی تھی۔ 1998 میں انٹرنیٹ کامرس پر تین بڑی فرموں کا غلبہ تھا، امریکا آن لائن، یاہو اور مائیکروسافٹ۔ یاہو تو ایک برقی شاپنگ مال ہے۔ تنہا اس نے 27 ہزار مختلف اسٹوروں سے 20 لاکھ سے زائد مصنوعات فروخت کے لیے مہیا کیں۔ 1999 میں توقع کی جارہی تھی کہ آن لائن سیلز، کیٹلاگ سیلز سے بڑھ جائے گی۔ تجارت میں زبردست ابھار کا سبب یہ ہے کہ پرسنل کمپیوٹر کی قیمتیں اور ان کے کنکشن کے اوقات گر رہے ہیں۔ ویب کے اوراق کو استعمال کرنا آسان ہو گیا ہے اور بڑی ویب سائٹس پر دیکھنے اور تلاش کرنے کے بہترین طریقے استعمال کریں تو مارکیٹیں بکھری ہوئی نظر نہیں آئیں گی۔ بہت سی فرموں نے پروسسنگ کی بڑھی ہوئی لاگت سے بچنے کے لیے اور کریڈٹ کارڈ میں رازداری نہ ہونے کے خیال سے، قیمتوں کی

ادائیگی کے نئے طریقے تلاش کیے ہیں اور ڈیجیٹل رقم یا اسمارٹ کارڈ استعمال کرنے لگے ہیں۔

سب سے زیادہ مقبول مصنوعات جو اب تک آن لائن خریدی جا رہی ہیں، ان میں کمپیوٹر ہارڈ ویئر، سفر کے لیے ٹکٹ اور کتابیں شامل ہیں۔ آن لائن تاجروں نے صارفین کو اپنے اشتہارات کا گاہک بنا لیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص امازون ڈاٹ کام کو ایک کتاب کی خریداری کا آرڈر دیتا ہے تو ساتھ ہی اسے ایک اور کتاب کے بارے میں سفارشی اطلاع مل جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس سے ملتی جلتی کتابیں دوسرے خریداروں نے بھی حاصل کی ہیں۔ اب وہ شخص یا خاتون اس ''بااجازت اشتہار'' کو (جو متوقع بھی ہے، نجی بھی اور برمحل بھی) اپنے لیے مفید سمجھ سکتے ہیں، نہ کہ مدافعت بے جا سمجھ لیں۔ تلاش کے یہ طریقے، جنہیں ''سرچ انجن'' کہتے ہیں، وہ شاپنگ روبوٹس یا ''بوٹس'' ہیں جو خریدار کو کسی خاص چیز کے حصول میں جو کم از کم قیمت میں دست یاب ہو مختلف ویب سائٹس میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ وہ مطلوبہ مصنوعات کے لیے آن لائن آرڈر دے سکتے ہیں یا اس ضمن میں معلومات کی مدد سے روایتی دکان داروں سے مول تول کرتے ہیں، اس مفروضے کے تحت کہ صارفین سپر مارکیٹوں میں خوراک کے لیے اپنی شاپنگ خود کرنا چاہیں گے، ایک فرم ''اسٹریم لائن ان بوسٹن'' نے انٹرنیٹ پر غذائی اشیا کے آرڈر لینے شروع کر دیے ہیں اور سامان 30 ڈالر فی ماہ کے عوض گھر پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح ایک گاہک اپنے ہر آرڈر کے لیے چار گھنٹے بچا لیتا ہے۔ وہ انٹرنیٹ پر آرڈر کا رس تو نچوڑ نہیں سکتے، لیکن ڈبے کے لیبل پر ان کے اجزائے ترکیبی تو پڑھ سکتے ہیں۔ اسٹریم لائن کے معاون کا کہنا ہے کہ بالآخر اپنے تمام سامان کو خریدار الیکٹرانک کے گودام سے مہیا کر لیا کریں گے۔

جب جرنلسٹ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے امکانات کی بات کرتے ہیں تو وہ ان غیر اہم باتوں کے مقابلے میں اس کے کہیں زیادہ مفید استعمال کو نظر انداز کر دیتے ہیں، مثلاً ایک جرنلسٹ یہ تو رپورٹ کرتا ہے کہ بل گیٹس کی عمارت میں کمپیوٹر کی بہ دولت محسوس کر لینے کی ایسی صلاحیت موجود ہے کہ روشنی از خود کھلتی اور بند ہوتی رہے یا کوئی شخص ایک سے دوسرے کمرے میں ٹہلتا ہوا جائے تو اس کی پسند کا نغمہ از خود بجنے لگے۔ لیکن کمپیوٹر کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہوگی کہ انسانوں کو اس علم کی طلب سے بے نیاز کر دیں تو ٹیکنیکل طور پر نہایت حساس آلات کو خریدنے اور اسے نبھانے میں درکار ہوتی ہے۔ کارل مارکس نے ایک بار کہا تھا کہ سرمائے کی منڈی میں صحیح کارکردگی کے لیے ضروری ہے کہ گاہک اشیا کے صرف اور ان کی

قیمتوں کے بارے میں ''قاموسی'' علم رکھتے ہوں۔ ایک ناتجربہ کار خاتون خانہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہزاروں اشیا کے صرف کو اپنی نظروں میں رکھے اور ان کی ہر کیفیت اور برابر بدلتی ہوئی قیمتوں سے باخبر رہے۔ جس معاشرے میں آرام اور سہولت کا انحصار لاتعداد ٹیکنیکل مصنوعات پر مثلاً برقی اشیا، گاڑی اور تعمیراتی سامان کی خریداری پر ہو، وہاں علم کے اعصاب شکن دباؤ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے تو ایک فرد کو بے اندازہ علم کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایسے ماحول میں ذہانت کے ساتھ خریداری کرے اور خریدی ہوئی اشیا کی دیکھ بھال بھی قرینے سے کرے۔

مسئلے کا ایک حل یہ نکالا گیا ہے کہ ہر شے کے اندر اس کی بابت ضروری علم محفوظ کر دیا جائے۔ ہر شے کے اندر نہایت باریک پروسیسر رکھ دیے جائیں، جن میں ساری ٹیکنیکل ہدایتیں موجود ہوں، جو گاہک کی رہنمائی کریں کہ اسے کس طرح استعمال کیا جائے اور مرمت کی ضرورت ہو تو وہ بھی ممکن ہو جائے۔ مثال کے طور پر فوٹو کاپی کی مشین میں ایک ترکیب استعمال کا سرکٹ لگا ہو۔ اب اگر مشین کام نہ کرے اور اس کی درستی کی ضرورت آ پڑے تو کسی ٹیکنیشن کو بلانے کی بجائے آفس کا ایک کارکن سادہ سی ہدائتوں کی روشنی میں پھنسے ہوئے کاغذ کو درست کر سکتا ہے۔ اگر ریفریجریٹر صحیح طرح کام نہیں کر رہا ہے تو مشین میں ایک ترکیب موجود ہو جو کارخانہ دار سے اس کے ویب سائٹ پر رابطہ پیدا کرے اور اہم اطلاع حاصل کرے۔ نئی ماڈل کی کاروں میں 83 فی صد نقائص جن میں فیول انجکشن اور بریک وغیرہ شامل ہیں، مائیکرو پروسیسر خود ہی ٹھیک کر لیتے ہیں۔ یہ نہایت باریک کمپیوٹر ہیں جو موقع پر کارکردگی کو بہتر بناتے ہیں اور زیادہ مستعدی سے کام کرتے ہیں۔ اب یہ بھی ہونے والا ہے کہ گھروں کے اندر بجلی کی کارکردگی کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کے لیے، عام استعمال کی چیزوں میں بھی مائیکرو چپس لگا دیں۔ بجلی اور گیس کے اداروں نے گھروں کے اندر چولہے اور کنڈیشنر کو کنٹرول کرنے کے لیے فیوم سرور لگا دیے ہیں جو ان کی مشینوں کو صحیح درجہ حرارت پر رکھتے ہیں اور میٹر ریڈر کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

جہاں کسی غیر معمولی کام کی ضرورت ہو اس وقت کمپیوٹر سگنل دینا شروع کریں، اور عام حالات میں مشینوں کی کارکردگی کی نگرانی کرتے رہیں، اس وقت اس کا مالک سب کچھ بھول کر مطمئن ہو سکتا ہے۔ کمپیوٹر استعمال کرنے والے مالک کو بتائے گا کہ مشین کی دیکھ بھال کی کب ضرورت ہو گی۔ اگر کوئی گھریلو مشین خطرناک حد تک گرم ہو گئی ہو تو وہ از خود بند ہو جائے گی۔ مشین کے اندر مقناطیسی ڈبیاں یا پٹیاں نصب ہوتی ہیں جن میں وہ اطلاعات اور

ہدایات موجود ہوتی ہیں، جنہیں مرمت نامہ کہہ سکتے ہیں۔ پرسنل کمپیوٹر پر ڈاؤن لوڈ کیا جائے تو آسان پیرایے میں ہدایات موصول ہوتی ہیں۔ اس کے بعد صارفین کو اصل مالک کا مینول تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، جسے خریداری کے بعد ممکن ہے پھینک دیا گیا ہو، یا گھر میں کہیں ادھر ادھر گم ہو گیا ہو۔ وھرل پول جو ہر سروس کال پر 50 ڈالر خرچ کرتی آئی ہے، جب انٹرنیٹ میں معلومات مہیا کر دے تو ایک ٹیکنیشن کے بقول جو مشینوں کے پرزوں کی مرمت کرتا آیا ہے، اخراجات میں خاصی بچت ہو جاتی ہے۔ وال اسٹریٹ جرنل کے ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ "ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے، انٹرنیٹ میں بہت سی سرگرمیوں کا ایک گچھا رکھ دیجئے اور روزمرہ گھریلو استعمال کے بہت سے آلات پہلے سے زیادہ تیز رفتار اور کارآمد ہو جائیں گے۔ جب لوگ اپنے پرسنل کمپیوٹر کو ورلڈ وائڈ ویب پر لگاتے ہیں تو عالمی نوعیت کی اطلاعات فراہم کرنے میں وہ اعلیٰ درجے کے ٹائپ رائٹروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

تعلیم اور ٹریننگ

امریکا میں بہت سے بچے ڈے کیئر کے اداروں میں کمپیوٹر سے روشناس ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر کی ہدایت، کنڈر گارٹن اور پہلے گریڈ میں بہتر طور پر منظّم ہوتی ہے۔ پٹ پٹ شو، جیسے کھیل اسکول جانے سے پہلے کی عمر میں بچوں کو یہ دکھاتے ہیں کہ ان کے بڑے روزمرہ کے معمولات کس طرح انجام دیتے ہیں۔ ماریو برادرز کا ٹائپنگ پروگرام انھیں ٹائپ کرنا سکھاتا ہے۔ پھر کچھ ایسے کھیل ہیں جو انہیں اے بی سی اور ریاضی سکھاتے ہیں۔ بچے اس وقت جغرافیہ سیکھتے ہیں جب جاسوسی کا تماشا دیکھتے وقت انہیں کھوج لگانے کے لیے دُور بھیج دیا جاتا ہے1980 کے عشرے کے اوائل میں معلموں نے ایک طرح کی ہدایات مرتب کیں جس نے ایپل لا کمپیوٹر کو وڈیو پلے بیک مشینوں کے ساتھ جوڑ دیا۔ خیال یہ تھا کہ دوسرے تمام وڈیو گیم کی طرح کمپیوٹر سے جڑے ہوئے یہ سسٹم بھی بچوں کو ہنر سکھانے اور علم کے علاوہ جزوی فائدے کے طور پر تفریح بھی مہیا کریں گے۔ اس طرح طلبہ وقفے کے دوران میں اکیلے کام کریں گے اور پروگرام سے لطف اندوز بھی ہوں گے۔ ساتھ ہی ایک سیٹی بھی لگی ہوگی، یہ آواز آس پاس ٹہلتے ہوئے استاد کو خبردار کر دے گی کہ بچے کو کس طرح کی اضافی مدد چاہیے۔ کمپیوٹر کی کچھ مشقیں امتحانی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ جن میں طلبہ کو کچھ مشقیں زبانی یاد کرنی پڑتی ہیں اور فوری جواب دینا ہوتا ہے۔ غلط جواب کی تصحیح بھی ساتھ ہی ہو

جاتی ہے۔ کمپیوٹر بینائی، آواز اور متن کو بیان کے پیرایے میں اس طرح جوڑ دیتے ہیں جو سیکھنے والے فرد کے طریقے کے مطابق ہوتا ہے اور اسے راس آتا ہے۔ آج کل امریکا کے ہر اسکول میں اوسطاً 8-7 طلبہ کے پاس کمپیوٹر ہوتا ہے اور ہر دس میں سے نو اسکول انٹرنیٹ سے رابطہ رکھتے ہیں۔

بعض حالات میں تدریس کے روایتی طریقوں کی جگہ کمپیوٹر پر مبنی تدریس کے طریقے نے لے لی ہے۔ عام طور پر ایسا اس وقت ہوتا ہے جب روایتی انداز کی تعلیم بہت مہنگی یا فرداً فرداً درس دینے کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جیٹ طیارہ اڑانے والے پائلٹ کی عام حالات میں ٹریننگ مصنوعی یعنی زمین پر بنے ہوئے کاک پٹ میں ہوتی ہے۔ زیر تربیت پائلٹ جس وقت کنٹرول پینل پر کام کر رہا ہوگا، اس وقت موزوں مناظر دکھائے جا رہے ہوتے ہیں۔ حقیقت سے قریب مشینوں نے زیر تربیت پولیس افسروں کو اس طرح تیار کیا ہے کہ وہ چند ہی سیکنڈ کے اندر صحیح فیصلے کر لیں، جب یہ سوال ہوتا ہے تو مشکوک مسلح شخص کو گولی مار دی جائے یا ابھی نہیں۔ اس وقت امریکی فوج نے Simnet کا نظام تیار کر لیا جس میں بیک وقت ایک ہزار افراد ٹینکوں کی ایک بھرپور جنگ میں حصہ لیتے ہیں اور ایک زبردست میدانی جنگ میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ فورٹ فاکس آرمر سکول کے طلبہ فوج میں ٹیم ورک اور توپچی کی مہارت کمپیوٹر کی فراہم کی ہوئی ترکیبوں سے حاصل کرتے ہیں۔ قریبی میدانوں کی خاک چھاننے سے بچ جاتے ہیں۔ ان ''مصنوعی حقیقی'' مشینوں میں تماشائی کے جسم کے ساتھ سگنل لگے ہوتے ہیں جو جسم کی حرکت میں تبدیلی کے ساتھ ہی منظر کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ پھر کوئی اپنا سر بائیں طرف جھکاتا ہے تو پردے پر ایک اور منظر نمودار ہوتا ہے۔ برقی اشکال کو دیکھنے کا انحصار تماشائی کی جسمانی حرکات پر ہے، جو خیالی اشکال کو اس حد تک تبدیل کرتی ہے کہ تماشائی اصل وقوعے میں خود کو شریک محسوس کرتا ہے۔

کمپیوٹر کے ماہر کاریگر اب ایک اور تجربہ حقیقت کی افزونی (augmented reality) کا کر رہے ہیں، جو کام سے متعلق علم حقیقی وقت میں مہیا کرتا ہے۔ اس طریقے میں کارکن عینک لگاتے ہیں، جس پر خاکے، پرزوں کی فہرست اور ہدایات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ جب کہ مزدور کارکن، اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ بوئنگ کا خیال ہے کہ اس ٹیکنالوجی سے طیاروں کے انجن مکینک اپنا کام زیادہ مہارت کے ساتھ انجام دیں گے۔ عینک کے شفاف شیشے میں ایک تو حقیقی مناظر نظر آتے ہیں اور کمپیوٹر سے نکلنے والی اشکال بھی، جیسے انجن کا اندرونی حصہ۔ بعض امریکی کمپنیاں معمولی تربیت پانے والے مزدوروں کو پیچیدہ ٹیکنکل کام کرنے کی تربیت ایک خاص

طرح کے کمپیوٹر سافٹ ویئر کے ذریعے دے رہی ہیں، جسے 'برقی سپورٹ سسٹم' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ سافٹ ویئر وہ بیشتر علم فراہم کرتا ہے جو معمول کے کام میں درکار ہوتا ہے۔ ساتھ ہی کارکنوں کو کام کے دوران برمحل ہدایات بھی دیتا ہے تا کہ باقی ماندہ کام وہ خود کر لیں۔ سکیورٹی ڈیلرز کی قومی انجمن کا ایک پروگرام ''کارنر اسٹون'' ہے۔ ایک آڈیٹر بڑے بڑے مراحل سے قدم بہ قدم گزرتا ہوا ایسے کلیدی تناسب کا انکشاف کرتا جاتا ہے، جس سے سکیورٹی میں خلاف ورزی کی نشان دہی ہوتی ہو۔ سکیورٹی ڈیلرز کا اندازہ یہ ہے کہ کارنر اسٹون نے زیر تربیت کارکنوں کے لیے تربیت کی مدت ڈھائی سال سے کم کر کے ایک سال کر دی ہے۔ ایک پبلک اکاؤنٹنگ فرم پرائس واٹر ہاؤس کوآپرز ہے، اس نے اپنے سافٹ ویئر کو مشیروں کی تربیت کے لیے استعمال کیا ہے۔ خفیہ تفصیلات کے حوالے سے یہ سافٹ ویئر خاص طور پر بہت کارآمد ہے۔ کاروباری دنیا میں کمپیوٹر کا استعمال جوں جوں بڑھ رہا ہے، ملازمت کے ناتجربہ کار امیدوار ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ عہدوں پر تقرر کے لیے اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکتے ہیں۔ اس طرح درخواست گزاروں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جائے گا، جو کسی خاص ملازمت کے لیے آپس میں مقابلہ کریں گے اور ان کا ایک مقررہ مطالبہ ہو گا۔ اس کے نتیجے میں اجرتوں کی پیش کش حوصلہ شکن ہو سکتی ہے۔ اس وقت یہ کہاوت کہ ''تمہاری کمائی اس کارکردگی کا صلہ ہے کہ تم اتنا ہی سیکھ سکتے ہو''، زیادہ نہیں ہو گی۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ عام مزدوروں اور کالج کے ڈگری یافتہ مزدوروں میں، جن کی تعداد آج کل 50 فیصد ہے، اجرتوں کا فرق کم ہوتا جائے گا، کیوں کہ متوقع آجر جس کام میں واقفیت دکھاتا ہے، اس کی اہمیت گھٹ جائے گی، اجرتوں کے درمیان اس فرق کی بنا پر تعلیم جاری رکھنے سے نوجوانوں کی دلچسپی کم ہو جائے گی۔ اس طرح یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ کمپیوٹر کی بدولت کام (computerized work) تیسری تہذیب کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد کو کمزور کر سکتا ہے۔ وہ ہے کسی پیشے میں ترقی کے لیے تعلیم کا استعمال۔ کالج کے تعلیم یافتہ اکیسویں صدی کے مزدور کے ساتھ کمپیوٹر وہی کچھ کریں گے جو بیسویں صدی کے اوائل میں صنعتی اور دفتری مشینوں نے ہائی اسکول گریجوایٹس کے ساتھ کیا تھا، یعنی اپنے ذاتی علم کو ایک طرف رکھو، کام کی مہارت کو چھوڑ و اور کام کرنے والے فرد کو مشین کا نگران بنا کر بٹھا دو۔

مماثلت کی پیش گوئی

گزشتہ تہذیبیں جنھوں نے پہلے ہی اپنے راستے طے کر لیے ہیں، موجودہ تہذیبوں

کے مستقبل کے بارے میں کچھ اشارے دے سکتی ہیں۔ اب سے پہلے جو بحث ہوتی آئی ہے، اس کی بنیاد موجودہ رجحانات کے تحت معلوم کے ذریعے نامعلوم کی تلاش ہے۔ واقعات، جن کی پیش گوئی کی جاتی ہے، ممکن ہے وہ اس کے مطابق رونما ہوں۔ اس باب کے باقی حصے میں ہم اس خیال کے تحت آگے بڑھیں گے کہ ایک نئی تہذیب کی آمد سے اداروں میں بھی تبدیلی آتی ہے، دونوں طرح کے ادارے، وہ بھی جو گزشتہ عہد میں قائم ہوئے تھے اور وہ بھی جو دو عہد پہلے قائم ہوئے۔ پانچویں تہذیب جو کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی طاقت سے چل رہی ہے، موجودہ معاشرے کی بنیادوں کو جلا ڈالے گی۔ ایسے طریقوں سے جو ابھی نظر نہیں آ رہے ہیں، اگر ماضی سے کوئی اشارہ ملتا ہے تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف اخبارات اور تفریحات کے وسائل اور دوسری طرف تجارت اور تعلیم کے وسائل بنیادی تبدیلیوں کے بھنور میں آ جائیں گے۔ تفریحات کے کلچر کی مملکتوں میں ایک ردِعمل بظاہر ابھی سے نظر آ رہا ہے۔ تفریحات کی نشریات بتدریج نہایت مخصوص نوع کی اور متنوع مراسلت میں حل ہو جاتی جا رہی ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ چوتھے عہد کی تخلیقی توانائی ابھی کلیتاً ختم نہیں ہوئی، اس کتاب میں قیاس کیا جا رہا ہے کہ واقعات بالآخر کس طرح نمودار ہوں گے۔ جہاں تک پیش گوئی کے دوسرے علاقے کا تعلق ہے، ان اداروں میں تبدیلی کا عمل نظر آ رہا ہے جن کا تعلق تیسرے عہد کی تہذیب سے ہے۔ ایک بھرپور جمہوری عمل ان اداروں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ جن کا تعلق نشاۃ ثانیہ کے دور سے ہے۔ یہ بحث اگرچہ قیاسات پر مبنی ہے، لیکن ہم کم از کم ان علاقوں پر تو روشنی ڈال سکتے ہیں، جن میں تبدیلیوں کی توقع کی جاتی ہے۔

اشیائے صرف کی خریداری کے لیے فیصلہ کرنے کے نئے طریقے

ایک شخص کی مادی ضروریات ان اشیائے صرف سے پوری ہوتی ہیں جو بازار میں دست یاب ہیں۔ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہر صارف کو ہے کہ بہت سی مصنوعات کے درمیان اسے کیا چیز خریدنی ہے۔ یہ فیصلہ کرتے وقت اسے تین باتوں کا خیال کرنا ہوتا ہے۔ (1) وہ شے صارف کی طلب کو ممکن حد تک پوری کرتی ہو۔ (2) وہ چیز کم سے کم قیمت میں حاصل ہو۔ (3) اسے خریدنا اور لے جانا سہولت کے ساتھ ہو۔ موجودہ نظام میں فیصلہ کرنے کے عمل پر میڈیا (اخبار اور الیکٹرانک ذرائع) کے اشتہارات جنہیں قیمتاً چھاپا جاتا ہے، اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر دوسرے طریقے بھی

ہیں۔ اسٹورز میں ان کی نمائش جاذبِ نظر ہوتی ہے۔ حالانکہ اس وقت متوقع خریدار کچھ اور سوچ رہا ہوگا۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی مصنوعات کے بارے میں معلومات صارف کو اس وقت پہنچاتی ہے، جب اس کا دھیان انہی کی خریداری پر اٹکا ہوتا ہے۔ اشیا کی خریداری کا یہ ایک زیادہ دانش مندانہ طریقہ ہے۔ اس عمل میں صارف کی خدمت ہوتی ہے، نہ کہ اشیائے صرف بیچنے والوں کی۔

یہ خیال کہ ایک شخص زندگی میں ایک خاص مقصد کی تکمیل کے لیے ایک چیز خریدنا چاہتا ہے، اس کی تربیت کی پیدا کردہ عادت کے نتیجے میں ذہن میں آیا۔ ایسی احتیاج اور ضرورت دوسروں کا مشاہدہ کرنے، اور زبانی ملنے والی معلومات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تفریح کے میڈیا میں با معاوضہ اشتہارات برانڈ والی مصنوعات کا خیال ذہن میں بٹھاتے ہیں۔ اشیائے صرف کی خریداری کے ضمن میں اس طرح کے رویے کو تیر یا تکا کہا جائے گا۔ بہتر بات یہ ہوگی معلومات کو ویب سائٹس پر پیش کیا جائے۔ اس کے مخاطب زندگی میں تجربے کے مخصوص علاقے ہوں گے۔ انٹرنیٹ پر جو معلومات پیش کی جائیں گی وہ صارفین کو صحیح مصنوعات کے سلسلے میں رہنمائی کریں گی۔ مثال کے طور پر کسی ایسی ہی پیش کش میں یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ ایک مالک مکان کو اپنے مکان میں حرارت کا نظام درست رکھنے کے لیے کیا معلوم ہونا چاہیے۔ اس بحث میں کمرشل اشیا کی وضاحت بھی شامل ہوسکتی ہے تاکہ ضرورت میں کام آئے۔ ٹیلی وژن کی اطلاعاتی اور کمرشل پیش کش کی طرح وہ بھی بصری ہوگی اور بالکل ذاتی ہوگی۔ اطلاعاتی اور کمرشل کے برخلاف ان کا مقصد کسی چیز کو فروخت کرنا نہیں بلکہ اس کے برعکس صارفین کو یہ بتانا ہے کہ مصنوعات کس سلسلے کی ہیں اور ان کے درمیان میں سے مطلوبہ چیز کا انتخاب ذہانت کے ساتھ کرنا ہے۔ ایک بار صارفین مختلف ویب سائٹس پر بھروسا کرنے لگیں تو ان کے مالکان لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ٹیلی وژن نیٹ ورک کی طرح کسی قدر اپنی طاقت بھی استعمال کرنے لگیں گے۔

ٹیکنیکل طور پر نہایت ترقی یافتہ اور حیران کن مصنوعات کے ہوتے ہوئے یہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ مصنوعات سے متعلق معلومات کو کمپیوٹر کے الگ ڈیٹا بیس میں معیاری طور پر محفوظ کر دیا جائے۔ اس کی ابتدا یوں ہوگی کہ ایک عالمی معیار کا کوڈ نمبر بنایا جائے۔ جس سے روزانہ استعمال کی اشیائے صرف کی نشان دہی کی جا سکے۔ تمام مصنوعات کی مکمل اطلاع کے لیے ویب سائٹ کوڈ نمبر ٹائپ کرنا ہوگا۔ اس کوڈ میں صنعتی ادارے کا نام بھی شامل ہوسکتا ہے۔ کسی خاص چیز کے لیے فائل کے اندر اپنی دلچسپی کے عنوانات پر برابر کلک کرنا ہوگا۔ اگر وہ چیز

صحیح کام نہیں کر رہی ہو یا مرمت طلب ہو تو اسکرین پر ایک وضاحتی تحریر نظر آ جائے گی۔ بعض کلیدی الفاظ کو ٹائپ کرنے سے متن کے مطابق موزوں شخص کو، جہاں بھی وہ ہو گا، ہدایت دے دی جائے گی۔ مصنوعات کے بارے میں معلومات کو ڈاؤن لوڈ کرنے سے تلاش کا دائرہ سمٹ جائے گا اور مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کمپیوٹر نے اب اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ ہر بڑی تجارتی پراڈکٹ کے بارے میں اس کے استعمال، مرمت اور ٹیکنیکل خصوصیات کی تفصیل ایک ہی جگہ محفوظ کر دیں۔ کسی بات کے بھولنے یا کھو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بوسٹن کے مضافات میں کریانے کی شاپنگ کا ایک نمونہ 'سٹریم لائن' نے فراہم کیا ہے۔ اس کا اطلاق دوسری قسم کی اشیا کی خریداری پر بھی ہو سکتا ہے۔ اِس کی بجائے کہ چل کر اسٹور پہنچا جائے، اشیائے صرف کا معائنہ کیا جائے، پھر خریداری کا آرڈر دیا جائے اور اشیا سنبھالی جائیں، خریدار انٹرنیٹ پر ساری معلومات حاصل کر کے آن لائن آرڈر دے سکتا ہے۔ فروخت کرنے والا شخص یہ بھی کر سکتا ہے کہ گاہک کے ہمسایے میں واقع دکانوں میں سے کسی ایک کے ذریعے مطلوبہ شے کو گھر پر پہنچانے کا بندوبست کر دے۔ پھیری والا ٹرک میں یا وَین پر اشیائے ضروری لاد کر دن میں دو یا تین بار شہر کی بستیوں کا چکر لگائے گا اور مصنوعات ڈپو پر رکھ دے گا، جہاں سے گاہک اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس کے علاوہ کہ بار برداری میں مستعدی آ جائے گی، اس بندوبست کے نتیجے میں اسٹورز کو بہت سارے سامان کی فہرست نہیں بنانی پڑے گی۔ اشیائے صرف کی نمائش اور ان کو گھروں تک پہنچانے کے اس بندوبست کی وجہ سے خُردہ فروشی کا موجودہ طریقہ، اسٹور اور شاپنگ مال کی موجودگی، یہ سب بے فائدہ معلوم ہوں گی۔

چوتھی تہذیب میں عام لوگوں کے تفریح اور کمرشل مصنوعات کی فروخت کے درمیان جو تعلق بیان کیا گیا ہے اور جو اس تہذیب کی نمایاں خصوصیت ہے، بس اس تعلق کے کمزور ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ اگر خریدار کو یہ معلوم ہو کہ بہترین مصنوعات کم سے کم قیمت پر آن لائن دست یاب ہو سکتی ہیں، تو فیصلہ کرتے وقت وہ کسی اور طریقے کے بارے میں کیوں سوچے گا؟ اشیائے صرف کے ایک انبار میں سے کسی ایک شے کا انتخاب کرنے کے لیے وہ اس کی جھلکیوں پر بھروسا کیوں کرے گا؟ جو لوگ خریداری کرنا چاہیں گے، سیدھے اطلاعات کے مرکز پر پہنچ جائیں گے اور جو کچھ چاہیں، ٹھیک ٹھیک حاصل کر لیں گے۔ اشیائے صرف میں سے انتخاب کے لیے ٹیلی وژن کے تفریحی پروگراموں پر کوئی صارف صرف اس وقت بھروسا کرے گا جب کوئی

دوسرا متبادل طریقہ موجود نہیں ہوگا۔ جب لوگ انٹرنیٹ پر شاپنگ کرنے لگیں گے تو مارکیٹ مجبور ہو جائے گی کہ زیادہ اچھی چیز زیادہ پرکشش قیمت پر فراہم کرے کیوں کہ خریدار کے پاس مقابلہ کرنے کے لیے، بہت سی متبادل اشیا ہوں گی۔ اس زمانے میں خرید و فروخت کے ساتھ جو انعام کا لالچ اور مبالغہ آمیز تشہیری ترغیبیں لگی ہوئی ہیں، انٹرنیٹ پر خریداری ان سب سے آزاد ہوگی۔ فی زمانہ آزاد منڈی میں شاپنگ کے لیے جس قدر بے اندازہ معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، شاپنگ کا بیان کردہ طریقہ مسرفانہ خریداری اوران کی قیمتوں میں لاعلمی سے بچالے گا۔

ایک اوسط امریکی جو دس لاکھ کی آبادی کے ایک شہر میں رہتا ہے، اس کو دس لاکھ کمرشل اشیا میں سے اپنی پسند کی چیز خریدنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اشیائے صرف کے اس ہراساں کر دینے والے تنوع میں سے ایک خریدار کو بہرحال ان اشیا کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی ہر احتیاج یا ضرورت پوری کر سکیں۔ ٹیلی وژن کے کمرشل نشریے جو مجموعی نشری اوقات میں سے تقریباً 18 فیصد وقت لے لیتے ہیں، ان مصنوعات کو ناظرین کے آگے ڈھیر کرتے جاتے ہیں، جب وہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے، اشیائے صرف کے بارے میں جاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ اب اگر کوئی بہتر طریقہ آ جاتا ہے تو پھر بھی ناظرین تفریح کے لیے سہی لیکن کمرشل ضرور دیکھیں گے۔ لیکن جب کوئی چیز خریدنا چاہیں گے تو کوئی معقول متبادل طریقہ اختیار کریں گے۔ ایسے میں اشتہار دینے والے ادارے جنھیں اشتہاروں کی ساکھ میں کمی کا علم ہوگا، ٹیلی وژن کے پروگراموں کی لاگت پوری کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیں گے۔ اس وقت تفریحات کے شعبے کو مالی تعاون کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا پڑے گا۔

کمپیوٹر برائے تعلیم

کوئی وجہ نہیں کہ اس صنعتی دنیا میں، ذہنی طور پر ایک اہل شخص اعلیٰ درجے کی تعلیم مناسب لاگت پر کیوں نہ حاصل کرے۔ لاگت کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ علم تو کتابوں میں نہایت ماہرانہ انداز سے پیش کر دیا گیا ہے۔ کوئی بھی شخص سالانہ کئی سو ڈالر خرچ کر کے اپنی پسند کی سب کتابیں جنھیں وہ اطمینان سے پڑھ سکے، حاصل کر سکتا ہے۔ کتابیں تبدیل بھی ہو جاتی ہیں یا پبلک لائبریریوں سے مفت حاصل کی جا سکتی ہیں۔ بلاشبہ، بہت سے لوگ کلاس روم کے ذریعے اپنی بصری تعلیم میں اضافے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ مکالمہ اور مباحثہ بھی چاہتے

ہیں، تاہم تدریس کے اس طریقے کے لیے طلبہ کو آڈیو ٹیپ سننا پڑے گا۔ کوئی بھی شخص کتاب کے اسباق بلند آواز سے پڑھ سکتا ہے یا مباحثے کا ریکارڈ چلا کر ان موضوعات کو دہرا سکتا ہے۔ ٹیپ میں کلاس روم کے ماحول کو ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک شخص ایک بڑے پردے کے آگے بیٹھا ہے اور اونچے درجے کے ٹیلی وژن سیٹ کو وی سی آر سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ اس سے وہی درسی تجربہ حاصل ہو گا، جو ایک کلاس میں بیٹھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس میں بس ایک ہی کمی ہو گی کہ طالب علم استاد سے کوئی سوال نہیں کر سکے گا، نہ اس سے کوئی سوال کیا جا سکے گا۔ اگر وہ تیاری کے بغیر آ گیا ہو تو اسے پکڑے جانے کا ڈر نہیں ہو گا۔

باہمی سرگرمی کا عنصر جو کتابوں اور ویڈیو ٹیپ میں نہیں تھا، کمپیوٹر کی خصوصیات میں شامل ہے۔ یہ الیکٹرانک مشین استاد اور شاگرد کے درمیان دو طرفہ رابطہ قائم کرتی اور اسے برقرار رکھتی ہے۔ اس نے اصل تدریسی تجربے اور ٹیپ چلانے کے درمیان جو فاصلہ ہے، اسے جزوی طور پر دُور کیا جا سکتا ہے۔ ایک کامیاب درسی معمول اگر ایک بار کمپیوٹر کی میموری میں محفوظ ہو جائے اور اس کام کو ایک انسانی ٹیچر انجام دے تو ایک خودکار تدریسی معمول تیار ہو سکتا ہے۔ مشین پر مبنی تمام ہدایات کسی خرچ کے بغیر تیار کر کے طلبہ میں مفت تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ بہرحال تدریس کا باہمی تعلق، ٹیکنالوجی کی موجودہ صورتِ حال میں مشینوں سے بخوبی انجام پذیر نہیں ہوتا، خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لیے الیکٹرانک کے آلات، مشینی اشکال اور اسکرین کے ذریعے بہتر تدریس ممکن نہیں۔ وہ الفاظ کو زبان سے ادا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہیں گے، اسے جیتے جاگتے استاد چاہئیں جو بہتر طور پر درس دے سکیں گے۔ البتہ مذکورہ دونوں طریقوں کے درمیان فرق کو اس طرح کم کیا جا سکتا ہے کہ اس طریقہ تدریس میں بصری عنصر بہتر ہو اور آوازیں مانوس اور پہچانی ہوئی ہوں۔ جب کمپیوٹر کے سافٹ وئیر میں انگریزی زبان کے اندر ذہانت سے پُر مکالمے کا مرحلہ آئے تو اس طرح دونوں طریقے مؤثر طور پر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔

یقیناً ہم اس مرحلے تک ابھی نہیں پہنچے۔ یہ خیال کہ سات سال کے بچے اپنے پرسنل کمپیوٹر کے آگے بیٹھے، کئی کئی گھنٹے چھوٹی سی اسکرین پر نظریں جمائے، مشکل سوالوں کے جواب ٹائپ کر رہے ہوں گے، بجا طور پر بہت سے لوگوں کے لیے تباہ کن ہو گا۔ ایک اوسط درجے کے کمپیوٹر کی دانے دار اسکرین دو حجم پر مبنی ہوتی ہے جسے 30 درجہ عمودی اور 40 درجہ افقی زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا مقابلہ ایک بغیر دانے دار تین حجم والی اشکال سے کیجیے، جنہیں

حقیقی زندگی میں 155 درجے عمودی اور 185 درجے افقی زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر کے ساتھ طالب علم کا سابقہ ان چیزوں سے پڑ سکتا ہے۔ کی بورڈ، ماؤس، بٹن، ناب، بال، جرائے اسٹک، وھیل پانچ سکرین۔ لیکن ٹیکنالوجی میں ترقی ہو، اور بڑے سکرین کے ساتھ ہائی ریزولیوشن ٹیلی وژن ہو تو کمپیوٹر مانیٹر میں اور سکرینز تک بات پہنچ جائے گی۔ کمپیوٹر جو بولے جانے والے الفاظ کو پہچانتے ہیں، ان میں بہتری پیدا ہو گی اور ان کا استعمال پہلے سے بڑھ جائے گا۔ ایک جیتے جاگتے کلاس روم کے ماحول میں داخل ہونے کے لیے جو ٹیکنیکل رکاوٹ ہے وہ کچھ عرصے میں دور ہو جائے گی۔ مصنوعی حقیقی خصوصیات حاصل ہو جائیں گی۔ باقی خلا کو پر کرنے کے لیے جس آخری تدبیر کی ضرورت ہو گی وہ ہے ایک تخلیقی بصیرت تا کہ کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی میں تعلیم دینے کی جو طاقت ہے، اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ جیسا کہ ڈی ڈبلیو گرفتھ نے فلم کی ٹیکنیک میں استعمال کیا تھا۔ مستقبل کے فن کار اور معلم یقیناً اس چیلنج کو قبول کریں گے اور ایک ایسا تجربہ کریں گے جو تعلیمی بھی ہو گا اور ذاتی طور پر تسکین بخش بھی۔

تعلیمی انتظامیہ کے لوگ یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ تدریس کے ہنر سے باخبر معلم اتنے ہی بیش قیمت لوگ ہیں جتنے تحقیق کے ماہر، مینیسوٹا یونیورسٹی میں فلکیات کے پروفیسر لیری رڈنک کو ایک کامیاب استاد مانا گیا ہے۔ تدریس کے سلسلے میں اس کا طریقہ یہ ہے: سیکھنے کے لیے آمادگی، طلبہ کی بات سننا اور پھر تبدیلی، اس امر کو تسلیم کرنا کہ مختلف لوگ مختلف طریقے سے سیکھتے ہیں۔ سمسٹر کے وسط میں پروفیسر رڈنک اپنے نصاب کے بارے میں طلبہ کا ایک سروے کرتے ہیں اور درمیان میں رد و بدل کرتے ہیں۔ انہیں یہ اقرار ہے کہ انہوں نے تعلیم و تدریس کے بارے میں اچھے خیالات دوسروں سے حاصل کیے ہیں۔ کلاس روم میں ان کا طریقہ، لیکچر اور پھر تختہ سیاہ پر خاکہ بنانا، سلائیڈ سے مدد لینا اور آڈیو ٹیپ چلانا، یہ سب شامل ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک جیتے جاگتے استاد نے کلاس روم کے تجربے سے جو مہارت حاصل کی ہے، کیا اسے کمپیوٹر کی میموری میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ صاف ظاہر کہ پروفیسر رڈنک اور دوسرے سرکردہ اساتذہ نے جو معینہ ہدایات اپنے اپنے نصابوں میں شامل کی ہیں، الیکٹرانک میڈیا کے افراد، جو تفریح کے کلچر کو فروغ دے رہے ہیں، اتنی لچک نہیں رکھتے کہ اس طرح معینہ ہدایات فراہم کر سکیں۔ البتہ ملٹی میڈیا کمپیوٹر سافٹ ویئر میں اس کی اہلیت ہے۔

اگر تدریس میں مکمل کامیابی حاصل کرنا ہے تو تجربے سے جو کچھ حاصل ہوا، اسے زیادہ

سے زیادہ سامعین تک پہنچانا چاہیے۔ اس وقت ایسے وسائل مہیا ہو جائیں گے کہ ان تجربات کو اعلیٰ طور پر چمکائیں اور صیقل کریں۔ اس وقت ہمیں یہ نظر آئے گا کہ کس طرح کا سبق بامقصد ثابت ہوتا ہے۔ معیاری اور اعلیٰ درجے کے اسباق کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیم کو انسانی معلم سے آگے بڑھ کر مشینی بنیاد کی طرف جانا چاہیے۔ ایک استاد کی مہارت اس کے مرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے، لیکن کمپیوٹر کا حافظہ لازوال ہوتا ہے۔ سب سے اہم تعلیمی سبق بچوں کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ کیسے بولیں۔ چونکہ والدین بھی استاد ہوتے ہیں۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ معاشرہ انہیں اتنا وقت دے کہ پیشہ ورانہ کاموں سے دُور رہتے ہوئے گھر کے ماحول میں پابندی کے ساتھ بات چیت کریں۔ دوسرے بچوں کا ساتھ بھی ان میں دیکھا دیکھی سیکھنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ اس سے اعلیٰ سطح پر تعلیم کے لیے کمپیوٹر اپنے بے اندازہ علوم کے دروازے کھول دیتا ہے، جس سے تدریس کے تجربے میں اضافہ ہو۔ پائمنٹل اوٹیکسیرا نے لکھا ہے، ''ایک دن آئے گا جب استاد اپنے طلبا کو ساتھ لے کر سمندر کی تہہ میں اتر جائیں گے، لیکن کلاس روم چھوڑے بغیر، طلبا ایٹم سے کھیلیں گے اور کیمسٹری میں تجربے کے لیے اپنے مالیکیولز (ایٹمی ذرات) خود بنائیں گے نہ صرف یہ کہ انہیں کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ روایتی تعلیم بڑی محنت طلب ہوتی ہے۔ ایک استاد کلاس روم میں غالباً تیس طلبا کو لیکچر دیتا ہے اور ان کے سوالوں کے جواب دیتا ہے، پھر یہ جاننے کے لیے سوال کرتا ہے کہ انہوں نے کیا سیکھا۔ وقفوں کے درمیان امتحانات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کتنا یاد رکھا ہے۔ کمپیوٹر کی بنیاد پر دی جانے والی تعلیم جہاں تک کلاس روم کے تجربے کا تعلق ہے طلبا کی تعداد یعنی کم وبیش کی پابند نہیں۔ تمام طلبا بہترین استاد تک پہنچ سکتے ہیں اور ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ موجودہ ٹیکنالوجی کی ضرورت یہ ہو گی کہ اپنے کمپیوٹر پر اپنے جوابات ٹائپ کریں یا مینو کی فہرست میں مطلوبہ آئٹم کو کلک کرتے جائیں چونکہ کمپیوٹر طالب علم کے ''کی اسٹروک'' کے بارے میں معلومات اسٹور کر لیتے ہیں، اس لیے وہ سوالوں کے جواب معلوم کر کے بتا سکتے ہیں کہ طالب علم نے کتنا سبق یاد رکھا ہے۔ طالب علم جب سیکھنے کی مشق کر رہے ہوں، اس وقت وہ اپنا امتحان لے سکتے ہیں، نہ کہ ایسا صرف سرکاری ''ٹیسٹ'' کے مرحلے میں ہو۔ یہ سارے مؤثر طریقے ہیں، جن سے تدریس کے شعبے میں انقلابی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

علم: جسے محنت کشوں سے دُور رکھا گیا ہے

آج کے نظریے کا تقاضا ہے کہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے اس معاشرے میں ایسے

کاموں کے لیے جو ذہنی طور پر نہایت ہمت آزما ہیں، بہت وسیع علم کی ضرورت ہے۔ ایسے پیشے جن میں زیادہ علم کی ضرورت ہے، تعلیم اور تربیت کا تقاضا کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہو۔ کیوں کہ ایک پیشے میں تھوڑے تھوڑے بہت سے علوم سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک فرد میں وہ سب کچھ موجود ہو۔ کچھ علوم کمپیوٹر فراہم کر سکتے ہیں۔ کسی زمانے میں بیشتر پیشوں میں جسمانی مشقت درکار ہوتی تھی۔ جب پاور ٹول (بجلی کے اوزار) اور دیگر اوزار آ گئے، جنھوں نے جسمانی مشقت کی جگہ لے لی تو بلیو کالر ((غیر ہنر مند کام) کی نوعیت بدل گئی۔ ہنری فورڈ کے کارخانے میں یہ دیکھا گیا کہ گاڑیوں کی بڑے پیمانے پر تیاری کے لیے مزدوروں کے درمیان رابطہ ہو اور پرزے ان تک تیزی سے تسلسل کے ساتھ پہنچتے رہیں۔ پرزے کنویر بیلٹ پر آتے ہیں اور حسب ضرورت ان کے ڈھیر لگتے جاتے ہیں۔ معلومات اور علم کی حیثیت آج انھی پرزوں کی طرح ہے جو اسمبلی لائن میں ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر کی حیثیت پاور ٹول (بجلی سے چلنے والے اوزار) کی ہے۔ مالکان، کام کے معمولات میں معقولیت سے کام لیتے ہوئے سفید کالر والے فرائض میں مستعدی پیدا کر سکتے ہیں اور وہ اس طرح کہ معلومات کو، جس مرحلے میں ان کی ضرورت ہو استعمال کریں اور کارکن کو بروقت مہیا کریں۔

اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے کا نظام، حساب کتاب کے لیے کمپیوٹر کو معلومات فراہم کرتا ہے۔ فلو چارٹ (خاکے) بتاتے ہیں کہ معلوم شے دوسری شے کے ساتھ کس طرح جڑتی ہے۔ کمپیوٹر کے طالب علم اس طریقے پر عمل کرتے ہیں اور کام ہو جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ معلومات کو ترسیل کے اس عمل میں انسانوں کو شامل کرتا ہے۔ ایک مزدور کو کام کرتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ معمول کے تحت اسے ہر مرحلے میں کیا کرنا چاہیے۔ طویل طریقے کے عمل میں یہی علم عادت بن جاتا ہے۔ معلومات کے ہوتے ہوئے تمام ٹیکنیک کی کس طرح درجہ بندی ہو سکتی ہے۔ نظری طور پر ہر فرد کے کام کا تجزیہ کر کے اسے منطقی انداز میں مرحلہ وار خاکے کے اندر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر ان معلومات کو ذخیرہ کر سکتے ہیں اور صحیح مواقع پر انھیں اگل سکتے ہیں اور مزدور کو یاد دلاتے جاتے ہیں کہ آئندہ کیا کرنا ہوگا۔ کمپیوٹر ہر مرحلے میں کام کو انجام دینے کے لیے مکمل معلومات مہیا کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک ناتجربہ کار شخص بھی مناسب استعداد کے ساتھ پیچیدہ کام بھی پورا کر سکتا ہے۔ انتظامی یا پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی میں کچھ زیادہ تیاری درکار ہوگی، لیکن معمول کے حساب سے اسے بھی منضبط کیا جا سکتا ہے۔ ہر کام کے ساتھ ایک موہوم سایہ سا لگا رہتا ہے۔

دراصل یہ وہ علم ہے جو کام کی انجام دہی میں مدد دیتا ہے۔ کمپیوٹر کارکردگی کے اس معمول کو ایک غیر محسوس سرمایے کی طرح اپنی میموری میں رکھتا جاتا ہے اور بوقت ضرورت اسے فراہم کر دیتا ہے۔

اگر آنے والے زمانے کے دفاتر اپنے ملازموں کو بالکل بروقت معلومات دیتے رہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ وہاں کام کرتے ہیں انہیں اپنے کام کی معلومات ساتھ لانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ سوائے بنیادی خواندگی اور حساب کے پہلے سے تعلیم حاصل کرنا بڑی حد تک غیر ضروری ہے۔ مزدوروں کو اپنے کام کا روٹین (معمول) یاد رکھنا پڑے گا، بس اتنا ہی علم کافی ہو گا جو کمپیوٹر کے اس پرزے کو جس میں اس کی توجہ درکار ہو گی، چلا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ درجے کے کام میں منصبی حیثیت کا تقاضا وسیع علم اور فکر میں لچک کا ہونا ضروری ہے، جس کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ اعلیٰ دماغی اور تخلیقی کاموں کے لیے تجربہ کاری درکار ہے، جو کسی پروگرام کے تابع نہیں ہو سکتی اور وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ کام کے ایک خاص حصے کو انسانی تجربے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے، بہت سارے کام علم کے صوابدیدی استعمال پر چھوڑے جا سکتے ہیں۔ جس کا دعویٰ صاحبان علم کرتے ہوں۔ ذاتی منفعت اور تفاخر سے قطع نظر معلومات کو کمپیوٹر پر لانے (computerization) میں ایک رکاوٹ یہ ہے کہ اہم شخصیت کے پاس عام طور پر اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ایک منشی کو پاس بٹھا لیں اور وہ ساری باتیں بیان کر دیں جو وہ کرتے ہیں۔ اس عمل میں وہ اپنے بارے میں حساس ہو کر غور کرتے ہوں گے۔ اس کام میں حکمت یہ ہے کہ جب کوئی شخص کوئی کام کر رہا ہو تو کام کے متعلق علم کو کسی کوشش کے بغیر ریکارڈ کر لیں۔ مثال کے طور پر جو لوگ کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں، ان کے "کی اسٹروکس" کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے، اسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دراصل جن پیشوں میں زیادہ معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، وہ افادیت پسندانہ نوعیت کے کام ہیں۔ ان میں کسی کو آئن سٹائن کے نظریہ اضافت یا شیکسپیئر کے ڈراموں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے ایک خاص صنعتی مال یا سسٹم کی ٹیکنیکل خصوصیات اور ان کے تقابلی فائدوں کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروگرامر تجزیہ کار کی خدمات اس لیے نہیں حاصل کی جاتیں کہ وہ کمپیوٹروں کے تمام اصولوں سے آگاہ ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ HTML، Linix، ونڈوز95، جاوا یا دوسری طرح کے سافٹ ویئر سے واقف ہوتے ہیں۔ یہ کوئی بڑی پرکشش قابلیت نہیں ہے، کیوں کہ کمرشل سسٹم آتے اور چلے جاتے ہیں۔ علم کو طالب علم کے دماغ میں ٹھونسنا تو

کوئی معقول بات نہیں۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ کسی کام کی انجام دہی میں اس کا علم ہونا لازمی ہے اور آجروں کو اس کے حصول کی اجرت دینی چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ علم صرف مخصوص تربیت یافتہ یا تجربہ کار لوگوں کے اندر موجود ہوتا ہے۔ معلومات کو اس شکل میں رکھنا کہ مشینی ہنر رکھنے والے افراد اسے تیزی سے بروئے عمل لاسکیں، اس کی ٹیکنالوجی موجود ہے۔ عارضی طور پر بعض افراد میں یہ علم عمل کے لیے تیار ہوسکتا ہے لیکن آخرکار معلومات رکھنے کے حوالے سے کوئی بھی شخص ذاتی امتیاز کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ علم بجائے خود افراد سے منتقل ہوتا رہتا ہے۔ کسی خاص کام کو انجام دینے کی اہلیت کس کے پاس ہوتی ہے۔ ملازم کے پاس یا آجر کے پاس؟ یہ وہ ملکیت ہے جس کی کوئی ممکنہ حیثیت مالک کے ادارے سے باہر نہیں رہتی۔ مالک ہونے کی صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ ایک ملازم کو اچھی خاصی اجرت باعلم ہونے کی بنا پر دے۔ چونکہ کمپیوٹر کا استعمال کاروبار میں بڑھتا جا رہا ہے لہٰذا کام کے حوالے سے زیادہ علم اس صورت میں درکار ہوگا کہ ایک ملازم سے حاصل کرکے، اسے دوسرے ملازموں تک منتقل کیا جائے۔ مقصدی علم جو ایک ملازم کے دماغ سے حاصل کیا گیا ہو، اس صورت میں آجر کی ملکیت ہوگا اور خاص طور پر اُس وقت جب اسے کمپنی کے مقررہ اوقات کار کے دوران میں حاصل کیا گیا ہو۔

اگر محنت کشوں کو اس ملکیت سے بھی محروم کر دیا جائے، جو انہیں امید اور تحفظ دیتی ہے تو اس صورت میں مستقبل بہت تاریک نظر آئے گا۔ اگر لوگوں کو اس اہلیت سے محروم کر دیا جائے کہ ملازمت میں رہتے ہوئے تعلیم کے ذریعے ترقی کریں اور بہتر علم حاصل کریں، تو پھر ان کے پاس رہ کیا جاتا ہے۔ انہیں فائدے اس بات کے حاصل ہیں کہ ایک منصب پر کام کر رہے ہیں۔ اس میں ناکامی کے بعد، ان کی انسانی حیثیت منیجروں اور مشینوں کے مالکوں کے ساتھ مشترکہ ہوگی۔ ان کے سیاسی حقوق ہیں، جسے وہ قانونی اور کاروباری بندوبست کے لیے طاقت میں بدل سکتے ہیں۔ آج کل کے سیاسی فکری رجحان کے برعکس آخری جواب یہی ہوگا کہ کاروبار سے متعلق علم کو پوری انسانیت کا مشترکہ اثاثہ سمجھا جائے۔ ہنری فورڈ نے ایک بار کہا تھا، ''یہ سارے نام نہاد ذاتی سرمائے عام لوگوں کے فراہم کردہ ذخیرے کسی طرح کم نہیں، میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ تمام لوگ جو محض پیسے کے لیے کام کرتے ہیں، وہ پیسہ ان کے پاس رہتا نہیں، تاوقتیکہ وہ اسے پبلک کے لیے کام میں لائیں۔'' یہ بیان ایک تخلیقی سرمایہ داری کے رویے کی ترجمانی کرتا ہے۔ غیر تخلیقی سرمایہ داری کا بہرحال ایک مختلف نقطۂ نظر ہے۔ اس

میں بزنس منیجر ملازموں اور گاہکوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے پیسہ مٹھی میں دبا کر رکھتے ہیں۔ معلم، یونین کے ارکان، سرکردہ ناظمین اور مختلف پیشوں کے لوگ اور دیگر افراد، یہ سب لالچ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

منظّم لیبر نے منیجروں کے طبقے میں ان کی بداعمالیوں پر گرفت رکھی ہے۔ تاہم امریکا میں یونینیں، ارکان کی تعداد میں کمی اور پوری برادری کے مسائل کو لے کر آواز اٹھانے میں ناکامی کی بنا پر کمزور ہوگئی ہیں۔ ممکن ہے حکومت بھی تاجروں کی بے لگام طاقت کو چیلنج کرے، لیکن تجارتی مہم اور آزاد منڈی کے نظریے کے تحت موجودہ سیاسی رویے مختلف سمت میں سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ادارے جو اقدار کی تعمیر کرتے ہیں، جیسے مذہبی اور ابلاغ کا میڈیا، ان کے یہاں ان سوالوں کے بارے میں کوئی تشویش نہیں پائی جاتی۔ امید کا ایک ذریعہ تعلیم کے شعبے میں نظر آتا ہے۔ شاید اس کا امکان نظر نہ آتا ہو، یہ ایک امید افزا شعبہ ہوسکتا ہے۔ جہاں رائے عامہ کو ذمہ داریوں کے حوالے سے ہموار کیا جاسکتا ہے۔ اگر بہت سے لوگ جو معاشرے میں اعلیٰ حیثیت کے مالک ہیں، سماجی طور پر غیر ذمہ دار ہوں، تو کچھ نہ کچھ ذمہ داری ان افراد پر بھی ڈالی جاسکتی ہے، جنھوں نے ایسے لوگوں کو تعلیم دی۔ یہ خیال کہ کچھ لوگوں کی آمدنی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہے کیوں کہ انہوں نے طویل مدت تک تعلیم یا خصوصی تعلیم حاصل کی، یا آزاد منڈی میں ان کی قیمت مقابلتاً زیادہ ہے، تو ایک مرتبہ جب علم عام ہو جائے گا پھر ان لوگوں کی حیثیت نقلی شمار ہونے لگے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ کمپیوٹر اور دوسری تخلیقی ٹیکنالوجیز میں ترقی تمام لوگوں کے لیے بہتر زندگی کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ زیادہ پیداواری اہلیت کی یہ دولت اور زیاں کو ختم کرکے ہم پیداوار میں زبردست اضافہ کرسکتے ہیں۔ جب کہ مطلوبہ انسانی محنت میں کمی بھی ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس کی بجائے طویل اوقاتِ کار، آمدنیوں میں بڑھتی ہوئی نابرابری اور زیادہ زیاں کا انتخاب کیا ہے، جس سے مقتدر اشرافیہ کی خودغرضی کا پتا چلتا ہے، جس نے پیداوار میں بہتری کے سارے فائدوں کا رخ اپنی طرف موڑ لیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ انہیں باور کرایا گیا ہے کہ معاشی اہلیت کی بنا پر وہ غیر معمولی دولت کے مستحق ہیں۔ اپنے اعلیٰ ترعلم کی بہ دولت ترقی کا دعویٰ اگر ان سے چھین لیا جائے تو ان میں غالباً کچھ انکسار پیدا ہوجائے۔ کیوں کہ ٹیکنالوجیز کے فروغ سے جس میں مزدور کی ضرورت

نہیں رہتی، صرف غیر ماہر کاریگر ہی بے روزگار نہیں ہوں گے۔ اگر تعلیم کی وکالت دراصل اس لیے کی جائے گی کہ تعلیم صرف اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کا ذریعہ ہے تو پھر ہم منیجروں اور پیشہ وَروں کی طرف آتے ہیں جو پبلک کو لوٹ رہے ہیں، پھر انہیں طالب علمی کے زمانے کا قرض واپس کرنا پڑے گا۔ لیکن کسی ادارے میں اگر تحقیق و تلاش کا جذبہ ہے، سچائی کے لیے محبت ہے اور اگر ٹیوشن سستی ہے، تب اس کے گریجوایٹ ایسے شعبے میں جا سکتے ہیں جس میں قربانی اور ایثار کا کچھ عنصر موجود ہے۔ افلاطون کا یہ خیال تھا کہ فلسفے کے طلبہ انہی خیالات کے مالک ہوں۔ یہ بات تعلیم کو صحیح خطوط پر مستحکم کرے گی۔

کالج پر نظرِ ثانی

تعلیم کا تمام تر مقصد محض سیکھنا کبھی نہیں تھا، سماجی پیش رفت ایک عنصر ضرور رہا ہے۔ ایک سماجی مؤرخ جے سی فرناس نے انیسویں صدی کے امریکا کے کالجوں پر تبصرہ کیا ہے۔ ''جب کالج اور یونیورسٹیاں مسس سی پی کی طرف کھلنے لگیں تو ایک لڑکے کے لیے یہ بات بڑی پروقار تھی کہ وہ کالج ہو کر آیا ہے۔ اس کا یہ احساس اس بات پر حاوی تھا کہ اس نے سیکھا کیا تھا۔ اسے کالج بھیجنے کا حاصل ہی بظاہر معاش کا حصول تھا اور وہ آتا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ سماجی مرتبہ حاصل کرتا ہوا ایک امریکی اپنے بیٹے کو اسکول بھیج کر جہاں کیبٹس، ونڈریٹس اور سالٹن اسٹالز کے بیٹے تعلیم حاصل کر رہے تھے، ایک طرح کا اطمینان محسوس کرتا ہوگا، لیکن جلد ہی اسے یہ خیال گزرا کہ وہی مواقع غریب لیکن لائق طالب علموں کو بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ پھر جلد ہی اس طرف دباؤ بڑھتا گیا کہ کالج کی تعلیم ہر ایک کو حاصل ہونی چاہیے۔ بہرحال اگر سماجی مرتبے کا حصول کالج کی ہی تعلیم کا مقصد ہو تو سب کے لیے تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا کیوں کہ سوسائٹی میں ہر ایک کا اوپر کے مرتبے تک پہنچنا ممکن نہیں ہوگا۔

کمپیوٹر جو معلومات کو جمع کرنے کی ایک مشین ہے، اس میں علم کو تقسیم کرنے کی لافانی اہلیت ہے۔ کمپیوٹر میں منتقل کیے جانے والے اسباق، جب کلاس روم میں زندہ تجربوں کی جگہ لے لیں تو اعلیٰ درجے کی تعلیم کسی کلاس میں داخلے کی گنجائش یا طالب علموں سے انفرادی طور پر نپٹنے میں ٹیچر کی اہلیت تک محدود نہیں رہے گی۔ پھر تو ایسے کوئی اسکول نہیں جو دوسروں سے بہتر ہوں۔ جب طلب کے مقابلے میں رسد بڑھ جائے تو دوسری اشیا کی طرح تعلیم بھی

بے وقعت ہو جائے گی۔ اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ کمپیوٹر میں یہ اہلیت ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کی تعلیم بے حد وحساب طریقے سے فراہم کرتا رہے۔ وہ تو اس کا کمیاب ہونا ہے جو اسے مہنگا بنا دیتا ہے۔ اصولی طور پر سرمایہ داری نظام میں مشین سے بنی ہوئی کسی بھی شے کو منڈی میں فراہم کرنے کی اہلیت ہوتی ہے، لہٰذا یہ ممکن ہوگا کہ تعلیم کی مقدار کو کسی بھی سطح کے مطالبے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آگے بڑھائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کمپیوٹروں کے آئندہ زمانے میں جو بھی شخص کمپیوٹر حاصل کرنا چاہے گا، اسے اس معیار کی اعلیٰ درجے کی تعلیم بھی مل جائے گی۔ اس طرح کے کالج میں داخلے سے احساس محرومی میں اضافہ پریشان کن ثابت نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت کہ کسی شخص نے ایک خاص طرح کے ادارے میں داخل ہو کر کچھ سیکھا ہے، اس کو دوسروں سے مقابلتاً برتر ثابت نہیں کرتا۔ تعلیم سماجی درجہ بندی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔

بلاشبہ نوجوانوں کو اپنا کیریئر شروع کرتے وقت کچھ سیکھنا تو ہوتا ہے۔ یہ تعلیم اسکول فراہم کریں گے۔ جس کی بعد میں جانچ پرکھ اور تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس سے آگے یہ خیال کہ چار سال کا کامیاب تعلیمی نصاب مکمل کرنا یا کوئی مخصوص پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنا، کامیاب کیریئر کے لیے ضروری ہے، محض ایک واہمہ ہے، اگر یہ بات درست ہوتی کہ ایک علمی سند سے کسی شخص کی ذہنی اہلیت کا پتہ چلتا ہے یا دانش مندی ظاہر ہوتی ہے، جس کا آج کے پیچیدہ معاشی حالات میں ہونا لازمی ہے، تو پھر بل گیٹس جیسا کالج کا بھگوڑا چالیس سال کی عمر سے پہلے دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی کس طرح بن جاتا، جس نے اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی پر مبنی ایک کامیاب فرم جاری کی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کا تعلیمی ریکارڈ بالکل متاثر کن نہ تھا لیکن بعد کی زندگی میں انہوں نے دولت اکٹھی کی یا اہم اختراعات کیں، یا نہایت پیچیدہ ٹیکنیکل شعبے میں کامیاب منیجر ثابت ہوئے، تعلیم دینے والوں کے لیے مثال بن گئے اور اس امر کی دلیل کہ کسی پیشے میں کامیابی کے لیے ان کی مثال ضروری ہوگی۔

مشینیں اعلیٰ درجے کا تعلیمی تجربہ فراہم کرنے میں جتنا کامیاب ہوں گی، کام سے متعلق علم کا تجربہ غیر ماہر کارکنوں کو منتقل کرنا اتنا ہی آسان ہوتا جائے گا۔ تربیت دینے کا کام بھی کم خرچ ہوگا۔ اگر کسی ایک شعبے میں زیادہ تعداد میں کارکنوں کو تربیت دی جا رہی ہو، تو اس شعبے کے اندر کام کو سنبھال لینے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ یہ سب برابر کے لوگ ہوں گے اور اُجرتیں گر جائیں گی۔ اس کے کچھ اور عواقب بھی ہیں۔ ان سکولوں کے لیے جنھوں نے طلبہ کو اعلیٰ

علمی سند کی خاطر تاعمر بڑی آمدنی کے عوض بھاری معاوضہ لے رکھا ہے، اگر ان مہنگے کالجوں کے گریجوایٹس اپنے آپ کو ان لوگوں کے برابر پائیں گے، جنہوں نے کمپیوٹر کی مدد سے سستی تعلیم حاصل کی تو پھر ان مہنگے اداروں میں طلبہ کی مطلوبہ تعداد داخلے کے لیے نہیں آئے گی، پھر ممکن ہے، وہ مہنگے ادارے بھی اپنا خرچ کم کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ امریکا میں طلبہ کو ہر سال ٹیوشن روم میں 20 ہزار ڈالر دینا ہوتا ہے، یہ رقم کالج کے چار سالہ پرائیویٹ نصاب کے لیے ہے جس میں رہائش کا خرچ شامل ہے۔ چار سالہ کالج کے نصاب کے لیے 80 ہزار ڈالر دینے ہوتے ہیں۔ ہارورڈ کا خرچ 31 ہزار ڈالر ہے۔ پچھلے بیس برسوں میں، افراطِ زر میں تیز رفتار اضافے کے بعد کالج کی ٹیوشن فیس میں دو بار اضافہ ہو چکا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے مصارف میں نہ صرف ٹیوشن، کمرہ اور رہائش (موصولہ مالی امداد اس میں شامل نہیں) کے اخراجات شامل ہیں بلکہ ان چار تعلیمی برسوں میں کمائی کرنے کا موقع بھی نکل گیا، جو عمر کے اس بھرپور زمانے میں سیکھنے اور کیریئر شروع کرنے کے لیے میسر تھا۔ مالی طور پر سیدھا حساب یہ ہے کہ ایک طالب علم، والدین اور مالی مدد دینے والے دوسرے افراد کے 80 ہزار ڈالر جو چار سالہ تعلیم کے لیے پرائیویٹ کالج کی نذر ہو گئے، وہ رقم بڑے آرام سے ایک مکان خریدنے کے کام آ سکتی تھی، اس سے کوئی کاروبار شروع کیا جا سکتا تھا۔ یا ایک کیریئر کے درمیان انہیں اگر ملازمت تبدیل کرنی ہوتی تو اس کے حساب میں کام آتا۔ خرچ کے مقابلے میں فائدہ یہ ہوا کہ جس نوجوان نے کالج سے گریجوایشن کیا، مالک کے نزدیک فوری بھروسے کے قابل ٹھہرا۔ نوکری کے لیے شدید مقابلے کے اس زمانے میں کسی بھی پیشہ ورانہ منصب میں، جہاں آگے ترقی کرنے کے مواقع ہوں، علمی سند مانگی جا سکتی تھی۔ تاہم اکثر و بیشتر سننے میں آتا ہے کہ گریجوایٹس کو جنہوں نے اپنی تعلیم پر سرمایہ لگایا تھا موزوں ملازمت نہیں ملی۔ بہت سے نوجوان پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ٹیکسی چلا رہے ہیں یا معمولی کلرکی کر رہے ہیں۔ تعلیم کے اس سارے عمل میں کوئی حتمی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

امریکا میں کالج کی عمر کے نوجوانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد نے یہ طے کیا کہ وہ کالج کی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے بہتر تنخواہوں کے عوض ملازمت کو ترجیح دیں گے اور آج کی پھلتی پھولتی معیشت میں ایسی ملازمتوں کے لیے مواقع بھی موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں خواتین نے اعلیٰ تعلیمی ڈگری کے حصول کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ 1999 میں جن امریکی طلبہ نے گریجوایشن کیا، ان میں 57 فیصد تعداد خواتین کی تھی۔

1970 میں یہ تعداد 43 فیصد اور 1950 میں 24 فیصد تھی۔ نوجوان لڑکوں کی نظریں ٹیکنیکل ملازمتوں پر لگی ہوئی تھی، جہاں مختصر سا تربیتی زمانہ گزارنے کے بعد وہ کام پر لگ جاتے ہیں اور ابتدائی تنخواہ بھی اچھی ملتی ہے۔ جب کمپیوٹر کے شعبے میں چند سال کی ملازمت پر 75 ہزار سے ایک لاکھ ڈالر تک تنخواہ مل رہی ہو تو کسی علمی ڈگری کے لیے یہی عرصہ گزارنے کی بجائے ملازمت ہی بہتر ہو گی۔ روایت کے پابند لوگوں کا خیال ہے کہ مرد کوتاہ اندیش ہوتے ہیں اور آخر میں معلوم ہو جائے گا کہ پوری زندگی میں اعلیٰ آمدنی کی خاطر تعلیم کا جاری رکھنا ہی سودمند تھا۔ دوسری طرف ہم ایک بدلتی ہوئی صورتِ حال کے درمیان میں ہیں جس میں روایتی قسم کی تعلیم میں نہ کوئی کشش رہ گئی ہے اور نہ اس میں یہ اہلیت ہے کہ اچھی آمدنی کی ملازمت دلوا سکے۔

ایک یونیورسٹی کا خیال

یہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ کالجوں اور جامعات کو معاشرے میں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے اپنی تنظیم نو کرنی پڑے گی۔ طلبہ اور آجر دونوں کے لیے کشش پیدا کرنے کی خاطر ان کو زیادہ محنت کرنی ہو گی۔ ان کے فوری گاہک تو طلبہ ہیں، وہ اس طرح کی اصلاحی تدبیروں کا مشورہ دے سکتے ہیں: اوّل یہ کہ کمپیوٹر اور دیگر ٹیکنالوجی استعمال کر کے آپ ان کے تعلیمی مراحل میں کمی کر سکتے ہیں اور فیس اور ٹیوشن کی ایک شرح مقرر کر کے مصارف میں بھی کمی ممکن ہے۔ دوم یہ کہ کالج اور جامعات تعلیم کو بہت متنوع صورتوں میں، طلبہ کی انفرادی ضرورتوں کے مطابق پیش کر سکتے ہیں اور اس تناسب سے رقوم دے سکتے ہیں۔ وہ مزید کام یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے گریجوایٹس کو آجروں سے متعارف کرائیں، ان کی حیثیت محدود انداز سے ایک دفتر روزگار کی ہو گی، جو اپنے گاہکوں کے لیے روزگار تلاش کرتا ہے اور جب انہیں ملازمت مل جاتی ہے تو یہ دفتر ان کو آجروں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس سے بھی آگے، امید کی جا سکتی ہے کہ جامعات کی حیثیت کسی عارضی ایجنسی کی طرح، گریجوایشن کے رسمی آجر کی ہو گی۔ اس وقت جامعات مختلف کاروباری اداروں میں کام کرنے پر مامور کر سکتی ہیں بلکہ ان کی معمولی سی نگرانی بھی کر سکتی ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کو تربیت اور دفتری کاموں سے واقفیت درکار ہو۔

ایسی جامعات کاروباری فرموں کو بہت سے فائدے پہنچا سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ جب درسی معیار ایک خاص وضع کا ہو گا اور طلبہ کی اہلیت متعین کرنے کا طریقہ بھی موجود ہو گا، تو

آجروں کے لیے ایسے گریجوایٹس کو ملازمت دینے میں تحفظ کا احساس ہوگا، تعلیم سے ہی ان کی اہلیت ظاہر ہو جائے گی۔ دوسرے، تعلیمی مصارف میں کمی کے بعد ابتدائی تنخواہ کے لیے ان کی توقعات بھی بہت زیادہ نہیں ہوں گی۔ تیسری بات یہ کہ جامعات کا آجروں کے ساتھ قریبی کاروباری تعلق برقرار رہے گا۔ جامعات نے چونکہ ان طلبہ کو تعلیم دی ہوتی ہے، اس لیے انہیں الگ الگ ہر گریجوایٹ کا تعلیمی ریکارڈ معلوم ہوتا ہے اور بالکل قریب سے ان کی اہلیت کا علم ہوتا ہے۔ اس سے جامعات کو ہر ایک کی اہلیت کا صحیح اندازہ ہوگا اور وہ آجروں کو پورے وثوق کے ساتھ صحیح اور دیانت دارانہ معلومات دیتی رہیں گی۔ چوتھی بات یہ کہ جامعات عارضی ایجنسی برائے روزگار ہونے کی بنا پر کاروباری اداروں کو کارکن فراہم کریں گی، جن میں خطرے کا امکان نسبتاً کم ہوگا۔ اگر ایک خاص کارکن نے مناسب کارکردگی نہیں دکھائی تو جامعہ اسے واپس بلا لے گی اور اس کی جگہ دوسرے کارکن کو بھیج دے گی۔ جس نوجوان کو کام سے واپس بلا لیا گیا ہو، اسے اضافی ٹریننگ کے لیے دوبارہ اسکول بھیج دیا جائے گا یا اس کے ساتھ مشاورت کے بعد اسے کسی اور ذمہ داری کے لیے تیار کیا جائے گا۔ پانچویں بات یہ کہ جامعات، کاروباری اداروں کو بہت سے دفتری کاموں سے آزاد کر دیں گی، مثلاً تنخواہوں اور دیگر مراعات کا حساب کتاب رکھنا۔

ایک ایسی جامعہ یا یونیورسٹی بعض پہلوؤں سے لیبر یونین کا کردار بھی ادا کر سکتی ہے۔ جہاں وہ ہڑتالوں اور دوسرے نزاعی معاملات سے لاتعلق رہے گی، وہیں تعلیمی انجمن آجروں کے ساتھ ان کی شرائط ملازمت میں اپنے ارکان کی نمائندگی کرنے اور ان کے لیے کیریئر متعین کرنے میں معاونت کر سکتی ہے۔ وہ رویوں کو تبدیل کرنے اور محنت کش لوگوں کی فلاح کے لیے ایک سیاسی طاقت ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر آجر ان گریجوایٹس کو ملازمت دینے اور ان کے ساتھ زیادہ مستقل تعلق قائم کرنا چاہیں گے تو طلبہ کی انجمن کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ملازمت کی ذمہ داریوں کے بعد یونیورسٹی، آجروں کے ساتھ قریبی تعلق برقرار رکھے گی اور یوں ایسے نصاب تیار کرے گی جو حقیقی پیشہ ورانہ ضرورتوں کے مطابق ہوں گے۔ یہ تمام عمر سیکھنے کا عمل اور کیریئر میں تبدیلی کا مسئلہ، ان سب کو احتیاط سے برتا جائے گا۔ پنشن اور تعطیلات کے معاوضے جو سال ہا سال کی ملازمت کے دوران میں جمع ہو گئے ہوں، آسانی سے قابل حصول ہوں گے۔ ان سب باتوں کے باوجود یونیورسٹی بہرحال یونیورسٹی رہے گی۔ کوئی پیشہ ورانہ مدرسہ یا کسی کاروبار کی پھیلی ہوئی درس گاہ نہیں ہو گی۔ اس کا مقصد محض یہ ہوگا کہ جو ملازمتوں میں بدلتی ہوئی ضرورتوں کا سمندر ہے اور اس میں

نوجوان عورتیں اور مرد بے اختیار بہتے جا رہے ہیں، ان کو ایک حیثیت، مقام اور تحفظ حاصل ہو۔

ایک تعلیمی ادارے کے بہت سے فرائض ہوتے ہیں، پہلا اور سب سے اہم فریضہ بنیادی علم کی تدریس ہے۔ پڑھنا، لکھنا اور ریاضی، یہ تین بنیادی ہنر ہیں، جنہیں ابتدائی سکول کی سطح پر سکھایا جاتا ہے۔ پھر کچھ اضافی اور قابل لحاظ مضامین ہیں، جنہیں سکول میں پڑھانا اور سکھانا چاہیے، جیسے ٹائپنگ، کمپیوٹر اور کیلکولیٹنگ مشین کا استعمال، ذاتی آرائش و زیبائش، غذا، صحت اور جسمانی ورزش اور پبلک کے سامنے خطابت۔ تدریس سے اوپر کی سطح پر، دوسرا کام معاشرے کے تہذیبی ورثے کی منتقلی ہے۔ اس زمرے میں جو مضامین آتے ہیں، ان میں تاریخ، ادب، لسانیات، سائنس، موسیقی اور فنون، فلسفہ اور قانون شامل ہیں۔ کالج کے نصابوں میں انہی مضامین پر توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ اس سے بھی آگے تحصیل علم کا ایک اور علاقہ ہے۔ اس کا تعلق ادارے کی روح اور الگ الگ طلبہ سے ہے۔ ان میں وہ مضامین شامل ہوں گے، جن کا تعلق ذاتی اقدار سے ہے۔ مذہب، اخلاقیات اور سماجی شعور کے معاملات اس زمرے میں آتے ہیں وہ لوگ جو مخلص ہیں اور سچائی کی تلاش میں کامل ہیں، معاشرے میں ایک باعزت مقام پاتے ہیں۔ ان کی کاوشوں میں اعانت کے لیے مالی اثاثے رکھے جاتے ہیں۔ ان کے گرد و پیش کے لوگ اور ورثہ دار، صداقت کی تلاش کرنے والوں کے کارناموں کو ہر سطح پر نمایاں رکھتے ہیں۔

اس سے بھی آگے، مزید ذاتی نوعیت کی اقدار ہوتی ہیں۔ اقدار کے نصاب کا رہنما اصول یہ ہے کہ زندگی کی اہم ترین اقدار وہ ہیں، جو خود منتخب کی جاتی ہیں۔ کوئی سکھانے والا طلبہ کو یہ نہیں سکھاتا کہ انہیں کن باتوں پر عقیدہ رکھنا چاہیے یا ان پر فخر کرنا چاہیے۔ دوسری جانب تمام معاشروں کی ایک مشترکہ قدر یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی حدود کا احترام لازمی طور پر کرنا چاہیے۔ اس بارے میں اتفاق رائے یہ ہونا چاہیے کہ ہم لوگوں کی رائے کا، ان سے اختلاف کے باوجود احترام کریں۔ ایک اور قدر یہ ہونی چاہیے کہ ہم لوگوں کی اس طرح ہمت افزائی کریں کہ انہیں اپنی عزت نفس کی بنیاد میسر آ جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ افراد کی اس طرح حوصلہ افزائی کریں کہ وہ اپنی نسل، جنس، مذہب قومیت اور سماجی پس منظر پر، خواہ اس کی حیثیت کچھ بھی ہو، فخر محسوس کریں اور انہیں ایسے وسائل مہیا کریں کہ ان معاملات میں ان کا شعور پختہ اور گہرا ہو جائے۔ اس طرح کی برادری میں جہاں مختلف نوعیت کے لوگ آباد ہوں مذہبی تعلیمات آسانی کے ساتھ قبول کر لی جاتی ہیں، بشرطیکہ انہیں احترام کے ساتھ اور نرم خوئی سے پیش کیا جائے۔ اقدار کے نصاب میں یہ بھی سکھانا چاہیے کہ لڑائی میں بھی کس طرح انصاف سے کام لیا جائے۔ نرمی سے کس طرح پیش آنا

چاہیے۔ اپنے جائز مفاد کے لیے کس طرح اصرار کرنا چاہیے، لیکن ایسا کرتے وقت بھی دوسری کی جائز تشویش اور تعلق خاطر کا خیال رکھا جائے۔ مقصد یہ نہیں کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ وہ اپنے مفاد کا خیال ترک کر دیں بلکہ اپنی اغراض کا خیال رکھتے ہوئے بعض حدود کو تسلیم کرنا ہوگا۔

اپنی شخصیت کو متعین کرنا

کمپیوٹر سے تعلیم کے اس زمانے میں بھی سقراط کی ہدایات سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ''اپنے آپ کو پہچانو''، آج کل عام لوگ یہ جاننے میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ اس خواہش کا اظہار ستاروں کی علامتوں سے عام لوگوں کی دلچسپی کو دیکھ کر ہوتا ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق افراد کے بعض طبعی رجحانات سے ہوتا ہے۔ ذاتی شناخت کے بارے میں علم ایسی شے ہے کہ اس کا نفسیاتی امتحان ہونا چاہیے۔ یہ علم غالباً افراد کو حقیقی زندگی میں موزوں کردار منتخب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ تاجر گاہک کے متعلق کوائف کا تجزیہ کرتے ہیں اور ایسے افراد کے فائل تیار کر لیتے ہیں، جن کے بارے میں یہ امکان ہوتا ہے کہ بعض مصنوعات کے خریدار بن جائیں گے۔ انہی کوائف کی مدد سے پولیس مشکوک لوگوں کو پہچان لیتی ہے، جن کے بارے میں اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ جرم کریں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کسی نہ کسی کی فہرست پر ہے، کیوں کہ وہ ایسی شخصیت کا اظہار کر رہا ہے جو کسی استحصالی مقصد کے لیے موزوں نظر آتی ہے۔ لیکن لوگ تو صرف یہ سادہ سی بات جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ اگر کسی فرد کو اپنے اوپر بے جا طور پر فخر ہے۔ تو اسے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر لطف آتا ہوگا۔

انسانی شخصیت کی تعمیر اتنے حساس طریقے سے ہوئی ہے کہ اسے بیان کرنے کے لیے مجرد طریقے سائنس کی حدود میں نہیں آتے۔ نفسیاتی تشخیص میں ان خیالات کا استعمال ہو سکتا ہے، جو احمقانہ اور بناوٹی معلوم ہوں گے۔ اس طرح کا امتحان مرتب کرنے کے لیے جو طریقے برتے جائیں گے، وہی بجائے خود نتیجے کا اعلان کر دیں گے۔ اس کے علاوہ نفسیاتی امتحان دینے والوں کو غالباً بعض سوالوں کے تعلق سے اپنی حیثیت کا صاف اندازہ نہیں ہوگا اور اس طرح کے امتحان سے، جس معیار کی معلومات حاصل ہوں گی، وہ اس سے زیادہ نہیں ہوں گی کہ جو کچھ پہلے کہا گیا تھا، ممکن ہے آئندہ نفسیاتی امتحانات میں اس عمل میں شریک افراد کو زیادہ سرگرمی سے حصہ لینا ہوگا۔ ایسے امتحان میں یہ بھی ضرورت ہوگی کہ ان کے دل و دماغ کو ٹٹولا جائے اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ کس طرح کے علم سے ان کی شخصیت کے بارے میں بہترین

اشارے مل سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں اپنے ایک خاص پسندیدہ گانے کا علم ہو یا ایک خاص تاریخی شخصیت سے اپنا گہرا تعلق رکھتے ہوں یا ان کی دلچسپی کسی خاص مشغلے (ہابی) میں ہو۔ ان کی شخصیت میں جس بات کی گونج زیادہ کھل کر سنائی دے گی، بس اس سے ان کی شخصیت کا مرقع بنانے میں رہنمائی حاصل ہوگی۔ تعلیم خود شناسی کی تعریف متعین کرنے میں آسانی بہم پہنچاتی ہے۔ کمپیوٹر اور دوسرے آلات کی مدد سے ایک طرح سوچنے والے لوگوں کو ایک گروپ میں شامل کر کے ان کے خود اختیار کردہ راستوں کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ کوئی کام کرنے یا سیکھنے کے لیے وقت مقررہ پر تکمیل کا عہد، ایک شخص کو ایک خاص سمت میں لے جاتا ہے اور اسے کچھ بنا دیتا ہے۔ اکثر اوقات وہی کرنا چاہتے ہیں جن کو وہ بخوبی کر سکتے ہیں اور جن کے لیے ان کی اہلیت مانی گئی ہے۔ امتحانات اور مقابلے جن کے بعد جیتنے والوں کی تقریب منائی جاتی ہے، ان میں اپنی ذات کا اعتماد اور غرور پیدا کرتے ہیں۔

بسا اوقات تعلیم کا منفی ردِ عمل بھی ہوتا ہے۔ فیل ہوجانے کے خوف سے بچے بہت زیادہ اور بہت تیزی سے پڑھ جاتے ہیں۔ اگر کامیاب پیشہ ورانہ کام کا تقاضا یہی ہے کہ حتی الامکان زیادہ سے زیادہ معلومات رٹ لی جائیں، تو پھر اس ''پریشر کوکر'' تعلیم کے معنی سمجھ میں آ جاتے ہیں، لیکن مقصد اگر اپنے آپ کو دریافت کرنا ہو، تو رٹ لینا کوئی کام نہیں، کیوں کہ کوئی شخص اگر آزادی سے اپنے راستے پر گامزن ہے تو بچپن کے تجربوں کا ایک محکم پس منظر اس کی ذات کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔ اگر نوجوانوں کو یہ معلوم کرنا ہو کہ ان کی حقیقی دلچسپی کہاں ہے تو ان کے لیے اتنی گنجائش ضرور ہونی چاہیے کہ وہ افتم وخیزاں آگے چلتے جائیں اور غلطیاں بھی کریں، کیوں کہ خود شناسی کی تحریک اندر سے ابھرتی ہے۔ بچوں کو جکڑنے کی ضرورت نہیں، انہیں اپنے طور پر ابھرنے دینا چاہیے۔

اپنے وجود کی تلاش ایک چیلنج پیش کرتی ہے۔ اس کا مقابلہ تجربات سے کیا جا سکتا ہے یا ڈرامائی کردار ادا کرنے سے۔ چند مصنوعی حقیقی کھیل بچوں کو خیالی طور پر مختلف کرداروں میں ظاہر ہونے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ پردے پر ایک دوسرے کے ساتھ اداکاری کرتے ہوئے وہ جیتے جاگتے کردار بن جاتے ہیں۔ ملٹی میڈیا کمپیوٹر کے ذریعے ایک ذاتی خیالی دنیا میں پناہ لینا آسان ہوگیا ہے۔ یہ بات مصنوعی تو ہوتی ہے لیکن سیکھنے کے لیے حقیقی مواقع مہیا کرتی ہے۔ تاہم ٹیکنالوجی کے بغیر بھی یہ اہتمام ہونا چاہیے کہ اپنے آپ کو کسی مخصوص ذمہ داری

کی خاطر تج دینے سے پہلے مختلف نوعیت کے تجربے حاصل کریں۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی میں کامیابی بیس بال کے مقابلے کے گرد گھومتی ہے۔ ایک بہترین گول بنانے کے بعد، وقفے وقفے سے کامیابی۔ متنوع تجربات سے اپنے آپ کو دریافت کرنا، یعنی یہ معلوم کرنا کہ شخصیت میں توانائی کہاں ہے، اور اصل دلچسپی کہاں پائی جاتی ہے، ایسی بات بہت اہم ہوتی ہے۔

تباہی کا امکان

کسی بھی پیش گوئی سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پانچویں تہذیب شاید آئے ہی نہیں۔ دنیا کی تاریخ کا رخ اب تک تو ترقی کی طرف رہا ہے۔ یہ ترقی انسانی آبادی میں اضافے، ترقی پذیر ٹیکنالوجی اور بڑھتی ہوئی دولت اور علوم سے عبارت ہے۔ بدقسمتی سے اگر یہ کوئی اور رُخ اختیار کر لے تو صورتِ حال بدل سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگرچہ سرد جنگ ختم ہو گئی ہے، لیکن ایک ایٹمی دھماکے سے انسانیت صفحہ ہستی سے نابود ہو سکتی ہے۔ پچیس سے زیادہ قومیں ایٹمی، جراثیمی اور کیمیاوی ہتھیار بنا رہی ہیں اور انہیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی ان کے پاس ہے۔ انسان کے مستقبل پر کثرتِ آبادی، ماحولیاتی کثافت کا سایہ بھی منڈلا رہا ہے۔ صنعتی توسیع کا عمل زمین پر حرارت کو اس انتہا تک پہنچا سکتا ہے کہ آباد علاقے ریگستانوں میں بدل سکتے ہیں اور ساتھ ہی دوسرے علاقے سمندر کے متلاطم پانی میں ڈوب سکتے ہیں۔ اوزون کی چادر اتنی گھس چکی ہے کہ سورج کی ریڈیائی لہریں انسانی آبادی کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہیں۔ ہماری زندگی کا انحصار قدرتی خام مال پر ہے، اس میں نمایاں طور پر کمی ہو جائے گی۔

ٹیکنالوجی مختصر وقت کے لیے سودمند ثابت ہوئی ہے، لیکن اس نے بعض دُور رَس اور پریشان کن نتائج بھی پیدا کیے ہیں۔ دواؤں نے بیماروں کو سکون بہم پہنچایا ہے، لیکن اس نے ایسے بہت سے لوگوں کو زندہ رکھا ہے، جو بہ صورتِ دیگر مر چکے ہوتے۔ ان کی سلامتی کے نتیجے میں ممکن ہے کہ انہی خصوصیات کی حامل ان کی اولادیں پیدا ہوتیں۔ قدرت کا نظام یہ ہے کہ انسانی آبادی سے نسلی کمزوریوں کے حامل افراد کو اٹھا لیتی ہے، لیکن دواؤں نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد ایک نسل بڑھتی ہوئی میڈیکل ٹیکنالوجی اور طبعی طور پر زوال آمادہ صحت کے درمیان نظر آئے گی۔ اس سے متعلق ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ علاج میں اینٹی بائیوٹک ادویہ کا اکثر استعمال جسم میں جراثیم اور وائرس کے خلاف مدافعت پیدا کر دیتا ہے۔ بعض مریض جنہیں یہ ادویہ تجویز کی جاتی ہیں، جراثیم کو سرے سے ختم کرنے کے لیے ان

کی پوری خوراک نہیں لیتے۔ نتیجہ یہ کہ ان میں سب سے سخت جان جراثیم بچ جاتے ہیں، پھر ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور جب بیماری کا دوسرا حملہ ہوتا ہے تو علاج زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ حال ہی میں جاپان میں عفونت کے دباؤ کی ایک مثال سامنے آئی۔ جسم میں وینکووائسین کے خلاف مدافعت پیدا ہو گئی جو طاعون کے علاج کی آخری دوا ہے اور اس کے جراثیم مہلک ہو سکتے ہیں۔ انسانی ذہانت کو گھٹانے کے لیے منفی قسم کی ترغیبات بھی اپنا کام کرتی ہیں۔ ایک ترقی یافتہ تعلیمی معیار، جو معاشرے میں غالباً ذہین ترین لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے، ذہین نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اوائل عمری میں شادی کرنے سے باز رکھتا ہے۔ عورتیں شادی کرنا اور بچے پالنا ملتوی کر دیتی ہیں کیوں کہ معاشرہ ان کا حوصلہ بڑھاتا ہے کہ تعلیم حاصل کریں اور کوئی کیریئر شروع کریں۔ اب اگر زیادہ ذہین افراد کو منظم طور پر اجتماعی نسل انسانی میں اضافہ کرنے سے روک دیا جائے، جب کہ دوسرے کم تر ذہانت کے لوگ آزادی سے بچے پیدا کرتے جائیں تو چند سال بعد اوسط ذہانت کی سطح گر جائے گی۔ یہی اثر ان روایتی طریقوں کے استعمال سے ہو گا جن میں فوجی ملازمت کے لیے انتخاب کا روایتی طریقہ شامل ہے۔ فوجی حکومتوں نے تندرست لوگوں کو ملازمت کے لیے منتخب کیا ہے اور ان سب کو مسترد کر دیا، جن میں ذہنی یا جسمانی نوعیت کا کوئی مسئلہ نظر آیا۔ معاشرے کو آخر کیا ضرورت آن پڑی کہ زیادہ صحت مند نمونے کے نوجوانوں کو توپ کا ایندھن بنانے کے لیے لے لیں اور جو نسبتاً کم صحت مند ہیں، انہیں آئندہ زمانے کے والدین بننے کے لیے چھوڑ دیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

جیسا کہ نظر آ رہا ہے، انسانی صحت اور ذہانت رُو بہ زوال ہوتی جائے گی، اگرچہ نہایت سست رفتاری کے ساتھ، جس کا اثر دکھائی نہیں دیتا۔ ٹیکنالوجی کے علوم میں پیش قدمی اس کے اثر کو کسی قدر کم کر دے گی، لیکن ٹیکنالوجی جتنی پیچیدہ ہو گی، اس دوران میں ذہانت کم ہوتی جائے گی۔ ان دونوں رجحانات کے درمیان تہذیب تصادم کی راہ پر چلتی ہوئی نظر آئے گی۔ دنیا کے معاملات اتنے پیچیدہ ہوتے جائیں گے کہ انسانی عقل ان مسائل کے آگے زِچ ہو جائے گی۔ کم از کم یہ ہو گا کہ انسانیت اسی فطری حالت میں مستقبل سے دوچار ہو گی، لیکن انسانیت کسی فطری کیفیت میں موجود نہیں۔ قدرت نے انسان پر جو ذمہ داریاں وارد کی ہیں، اور جو بڑھتی جا رہی ہیں، ان پر قابو پانے کے لیے کچھ معاون طریقے موجود ہیں۔ یہ ایک نیا اور تاریخی عنصر ہے جو زمین پر آباد زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر صورتِ حال مایوس کن نظر آتی

ہو اور انسانی آبادی کسی جوہری جنگ کے نتیجے میں یا کسی ہَول ناک مرض کے باعث تہس نہس ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ زمین پر کیڑے مکوڑے، جراثیم اور کچھ دوسری قسم کے بالا دست عناصر غالب آ جائیں۔ اس کے نتیجے میں ممکن ہے کہ آئندہ غالب آنے والی قوتیں نہایت ذہین مشینوں کی نسل قرار پائیں۔ اس سے پہلے بھی کرۂ ارض کو ایک نسل کے ہاتھوں، جو سرزمین پر آباد تھی، زبردست زہریلے اثرات کا تجربہ ہو چکا ہے۔ تقریباً تین بلین سال پہلے ایک خلیے والے پودے، جن میں فوٹوسنتھیس (ہرے پودے سورج کی روشنی سے کام لے کر کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی سے کاربوہائیڈریٹس ترتیب دیتے ہیں۔ مترجم) کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی، ہوا میں آزادانہ طور پر آکسیجن پیدا کر کے ماحول کو "آلودہ" کر رہے تھے۔ اس سے حیواناتی زندگی کی ایک نئی شکل نمودار ہوئی جس نے اس آکسیجن کو توانائی دی اور ماحولیاتی گیسوں میں توازن پیدا کیا جس میں آج ہم سانس لے رہے ہیں۔ اور اب گزشتہ دو سو برس سے انسانیت بڑی تیزی کے ساتھ زمین کو کثافت کے ایک تودے میں تبدیل کر رہی ہے۔ اب یا تو وہی جان دار نظر آئیں گے جو اس کثافت سے غذا حاصل کر کے زندہ رہیں یا ذہین اجسام باقی رہیں گے یا مشینیں زندہ رہیں گی جو ان مہلک اثرات سے محفوظ ہیں۔ ایک امکان یہ نظر آتا ہے کہ کمپیوٹر اس نئے عہد کی طرف رہنمائی کریں گے۔ کمپیوٹر انسان کو اپنا ڈی این اے تبدیل کر کے اپنے آپ کو دوبارہ ایجاد کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ متبادل طور پر انسان خود بھی مشینوں میں حل ہو جائے گا۔

خود کو تباہ کر دینے والی تہذیب

زمانہ وسطیٰ کے یہودی ایک پرتشدد معاشرے میں رہتے تھے اور "گولیم" کا خیال کر کے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ مٹی سے بنا ہوا ایک جانور تھا، جسے یہودی علما یعنی ربیوں نے چھومنتر سے زندہ کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سولھویں صدی کے پراگ میں ربی لو نے اسے بنایا تھا، لیکن یہی جانور جب آپے سے باہر ہو گیا تو ربی اسے مار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ انگریز شاعر شیلے کی بیوی میری وِلسٹن کرافٹ شیلے نے فرنکنسٹن کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ایک جرمن طالب علم نے جسے بے جان چیزوں میں جان ڈل دینے کا راز معلوم تھا، ایک مصنوعی وجود پیدا کیا۔ یہی عفریت پلٹ پڑا اور اس نے اپنے بنانے والے کو ہلاک کر دیا۔ چیکوسلواکیہ کے ایک ڈراما نویس کارل کیپک نے ایک مشین کے بارے میں ڈراما لکھا، جو اَن تھک طریقے سے

کام کرتی رہتی تھی۔ ''روبوٹ'' کی اصطلاح اس کھیل سے نکلی اور اب پانچواں عہد اسی مفروضے یا ادبی تخلیق سے شروع ہوتا ہے، جس میں مصنوعی انسانی زندگی کی پیدائش کا خیال شامل ہے۔ اسے اب ''فرانکنسٹین تہذیب'' کا نام دے سکتے ہیں۔ اس عنوان سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان مشینی طور پر ایک بار پھر اپنی تخلیق کرے گا۔ ممکن ہے ''جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے اپنا جسم دوبارہ بنائے۔ یہ عمل کئی طریقوں سے ممکن ہے۔ انسان، شاید اپنے دماغ کا ایک مشینی نمونہ تیار کرے، وہ اپنی زندگی کے معمولات پورے کرنے کے لیے ایک مصنوعی ماحول پیدا کر سکتا ہے۔

اگر اس عہد کا زمانہ شباب آئے گا تو یہ وہی وقت ہو گا جب انسانیت کو پہلے تو ایک اجنبی مخلوق سے مقابلہ درپیش ہو گا جس کی ذہانت کی سطح خود انسان کے برابر یا اس سے زیادہ بلند ہو گی۔ ہمارا پہلا خیال تو یہ ہے کہ انسانیت کو کسی خلائی مخلوق سے مقابلہ کرنا پڑے جو اڑن طشتریوں میں سوار ہو کر آئیں گے۔ یہ ہمارے تاریخی تخیلات ہیں، جو بہت محتاط ہوں گے۔ ہم اپنے ماضی کے تجربوں کا اطلاق مستقبل پر کرتے ہیں۔ ایک بار پہلے بھی تیسرے عہد کے آغاز میں یورپ کے باشندوں کو ایک مساوی ذہانت کی حامل مخلوق سے، جن کے متعلق پہلے سے کوئی علم نہیں تھا، مقابلہ ہو گیا۔ کولمبس اور اس کے جہاز کے عملے نے جب امریکا کی سرزمین پر قدم رکھا تو یہاں اراورک انڈینز ان کے سامنے کھڑے تھے۔ خلائی مخلوق، اگر اس کا کوئی وجود ہے تو امکان یہ ہے کہ اس کی ساخت کسی بالکل مختلف کیمیکل سے ہو گی۔ اس کی ذہانت بھی ایک بالکل مختلف نوعیت کی ہو گی۔ اس نوع کی مخلوقات کی موجودگی کے بہترین اور معروف شواہد ایک ایسے واقعے سے منسلک ہیں جو 1947 میں رونما ہوا۔ اس وقت نیو میکسیکو میں روزویل کے کھیتوں کے پاس دھات کا ایک ٹکڑا جس کی شناخت نہ ہو سکی، آسمان سے گرا۔ تب ہی سے بہت سے لوگوں نے ناقابل شناخت اشیا کو، خلائی طشتریوں، اور ایسی ہی چیزوں کو اڑتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کی شہادت دی ہے۔ امریکی حکومت کے ترجمانوں نے اس بارے میں کچھ جاننے سے انکار کر دیا ہے۔ خلائی مخلوق اور خلا سے پرے موجودات کو جاننے کی زبردست خواہش لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ تاہم یہ خواہش ''اسٹار ٹریک'' کے خیال تک محدود ہے، یعنی ایک خلائی سفر اور وہاں سے واپسی، جو ماضی کے ایک سفر کی مثال ہے۔ یہ پرانے نمونے کے ماہی گیر ہیں (یہاں میرے معاملے میں یونانی فلسفیوں کی مثل) جو خلائے بسیط کے سمندروں میں ایک بہت بڑی کشتی میں سوار گھوم رہے ہیں اور راستے میں ان کا مقابلہ عجیب

وغریب مخلوقات سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے، خلائی سفر کا انسانی تجربہ کسی بہت ہی بڑی اور سست رفتار شے سے مڈبھیڑ کے ساتھ ہوگا۔ سوائے بین الانسانی مواصلات کے، واقعات معمول کی رفتار سے رونما نہیں ہوں گے۔ فاصلوں کو روشنی کے سال سے ناپا جائے تو روایتی معنوں میں اس سفر کی وسعت کا اندازہ، قیاس سے باہر ہے۔ انسان اگر اس فاصلے کے ایک چھوٹے سے حصے کو طے کریں گے تو اس سے پہلے کسی اور مخلوق میں تبدیل ہو چکے ہوں گے یا ان کا ایک بامعنی مقابلہ نہایت تیزی سے پیدا ہونے والے مائیکروبس (خلیوں) سے ہو چکا ہوگا۔ امکان یہ ہے کہ انسانی زندگی خلا میں نظامِ شمسی کے اندر قریبی فاصلوں تک محدود ہوگی، جہاں کشش ثقل قدرے کم ہوگی اور خام مال اس طرح کا ہوگا، جن سے ایسا ماحول پیدا ہو سکے جن کے حالات زمینی حالات سے ملتے جلتے ہوں۔ سائنس دانوں کا گمان ہے کہ مریخ یا مشتری یا غالباً زمین کا اپنا چاند انسانی بستیوں کے لیے موزوں مقامات ہوں گے۔

جس طرح سمندر میں لہریں اٹھتی ہیں، اس طرح خلا کے سفر میں اجرامِ سماوی کے درمیان کشش اور فاصلوں سے اثرات مرتب ہوں گے۔ انسانی مسافروں کے لیے مقناطیسی میدان اور ریڈیائی لہروں والے علاقے بہت اہم ہوں گے، لیکن خاص سوال تو یہ ہوگا کہ کبھی سفر کی نوبت بھی آئے گی، بیشتر سفر کہیں کچھ پہنچانے کے لیے یا کچھ سیکھنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اگر سفر کا مقصد دور افتادہ جگہوں کے لیے حقائق جمع کرنا ہو تو یہ معلومات بہت کم خرچ میں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ انسانی دھاکے کرنے کی بجائے انہیں خلائی تفتیش کے طیارے سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ وہ مشینیں جو سخت حالات کو برداشت کر سکتی ہیں، جنہیں انسان برداشت نہیں کر سکتے، وہ معلومات کو زمین پر منتقل کرنے کے ساتھ ہی خلائی مسافروں کو بھی بہم پہنچا سکتی ہیں۔ مزید یہ کہ انہیں یک طرفہ سفر میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ رفتہ رفتہ کر کے باربرداری کی جگہ مواصلات کا شعبہ سنبھال لے گا۔ خلا میں انسانی تجربہ بس اس حد تک محدود ہو کر رہ جائے گا کہ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بات چیت کر سکیں گے۔ انسانی سفر میں ممکن ہے یہ بات شامل ہو کہ وہ آبادکاری کے لیے یا اپنی بقا کی خاطر جینیاتی مواد کو مطلوبہ مقام پر پہنچائیں تاکہ نسل انسانی کے بالکل معدوم ہو جانے کا امکان کم ہو جائے۔

جب تک مشینیں ہمارے اور فطرت کے درمیان ثالث کا کردار ادا نہیں کریں گی خلا میں انسانیت کے برقرار رہنے کا امکان زیادہ نہیں۔ مشینوں سے مراد ڈینیل بورسٹن کے الفاظ میں ''چوتھی

بادشاہت‘‘ ہے۔ (یعنی معدنیات، نباتات اور جانوروں کے بعد) تاریخ خواہ کسی طرف جائے ہمارے مستقبل میں اس کا بہت بڑا حصہ ہوگا۔ مشینوں کو آج اوزار سمجھا جاتا ہے۔ جو انسانی تخلیق کار کے مقاصد کے تابع ہیں۔ ذہین مشینیں اس نمونے کو بدل سکتی ہیں۔ تاریخ کے پانچویں عہد میں جب ہم اس لمحے کا تصور کرتے ہیں، جس وقت انسانیت کو اس کے برابر کی ذہین ہستی کا سامنا ہوگا تو ایک تجربہ خلائی مخلوق سے دوچار ہونے کا نہیں، بلکہ اس سے بالکل الگ انسان کی اپنی ہی تخلیق کردہ ٹیکنالوجی کی ذہانت کے ساتھ اس کا معرکہ ہوگا۔ شاید اس سے کم تر سطح پر وہ وقت آ ہی گیا ہے۔ مئی 1996ء میں شطرنج کھیلنے والے کمپیوٹر ’’بگ بلیو‘‘ نے جسے آئی بی ایم نے تخلیق کیا تھا، ایک ٹورنامنٹ میں دنیا کے سب سے بڑے شطرنج باز گیری کیسپوروف کو ہرا دیا۔ کمپیوٹر کو ایک اعتبار سے انسانی ذہانت پر برتری حاصل ہے کہ وہ نہایت صحیح جمع تفریق تیز رفتاری کے ساتھ کرتے ہیں اور اپنے جواب ’میموری‘ میں محفوظ رکھتے ہیں اور نہایت سخت حالات میں بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ تاہم انسانی دماغ بہ اعتبار مجموعی اس عمل میں زبردست برتری رکھتا ہے۔ لیکن کمپیوٹر ٹیکنالوجی تیزی سے ترقی کر رہی ہے، جب کہ انسانی دماغ سستی کے ساتھ ارتقائی مرحلے میں پھنسا ہوا ہے۔

بعض کمپیوٹر ڈیزائن کرنے والوں کا مقصد ایسی مشینیں بنانا ہے جو انسانوں کی طرح سوچتی ہوں۔ تفکر کے عمل میں وہ دماغ کے اندر کی کیفیت کی نقل تیار کرتے ہیں۔ چند نفسیات دانوں کا خیال ہے کہ دو عصبی خلیوں کے مابین گزرتے ہوئے سگنل ان خلیوں کو تقویت دیتے ہیں۔ خیالات دراصل مخصوص رابطوں کے درمیان طاقت کے نمونے ہیں۔ کمپیوٹر کے انجینئروں نے کمپیوٹر کے عملی طریقے، سیکھنے کے عمل کو ترقی دینے کے لیے تحریر کیے ہیں۔ کمپیوٹروں کو ایک نقشے پر مرکزی نظام اعصاب کے مطابق رکھا گیا جو دماغی خلیوں کے باہمی تعلق اور عمل کی طرح ہوں۔ اس کے ظاہری نمونے اس پراسرار اندھیرے سے ملتے جلتے ہیں، جو بندر کے دماغ پر اس وقت پائے گئے، جب وہ حسی تجربے سے گزر رہا تھا۔ انسانی دماغ میں ایک کھرب سے زیادہ خلیے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک دوسرے ایک ہزار خلیوں سے مربوط ہوتا ہے۔ لہٰذا ان رابطوں کی حالت پر نظریں جمانا اور دماغ کی کارکردگی کا مطالعہ کرنا اور پھر مختلف طریقوں سے ان کو حسب منشا استعمال کرنا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کی لازمی ساخت کی تشکیل اس اطلاع سے ہوتی ہے جو ڈی این اے اور آر این اے کے سالموں میں ذخیرہ ہوتی ہے۔ یہ پیچیدہ سالمے اپنے اندر ایک دوسرے سے مربوط جینیاتی مواد کے دو ریشے رکھتے ہیں۔ ہر ایک اُن دھاگوں کی طرح

ہوتے ہیں جن میں موتی پروئے گئے ہوں۔ ہر ایک ''موتی'' یا نامیاتی مرکب (Nucleotides) ایک خاص فاسفیٹ گروپ اور ایک انگشتری وضع سے بنا ہوتا ہے۔ جسے base یا بنیاد کہتے ہیں۔ سالمے اپنے تسلسل میں جینیاتی اطلاع پروٹینز پیدا کرنے کے لیے پہنچاتے ہیں۔ ان پروٹینز میں ایک زندہ وجود کے خلیے ہوتے ہیں۔ ہیومن جی نوم پروجیکٹ کی یہ کوشش ہے کہ انسانی ڈی این اے کے سالموں کے سارے عمل کا نقشہ بنا لے۔ اس ایک سالمے کے اندر تین بلین بیس base ہوتے ہیں، جو ایک دوسرے میں گندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان بے پایاں اعداد و شمار کو یاد رکھنے کے لیے ایک سپر کمپیوٹر درکار ہوگا۔ جینیات کے ماہروں نے بہت سے اور مختلف نسل کے جانوروں کے سالموں کا تقابل کیا ہے، جن کے اندر انہیں مشابہت نظر آتی ہے، اور جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک خاص طرح کی فکر کا تعلق کس طرح عضویاتی عمل سے ہوتا ہے۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق انسان کی 70 فی صد جین چوہے کی جین سے ملتی جلتی ہے۔ خود انسانوں کی اقسام میں ایک ہزار میں سے ایک حصے میں جینز ملتی جلتی ہوتی ہیں۔

انسان کی جینز میں جو معلومات موجود ہیں، ان کے بارے میں جب مزید معلومات حاصل ہو جائیں گی تو اس وقت میڈیکل شعبے کے ماہرین اس قابل ہوں گے کہ جہاں ضرورت ہوگی، مداخلت کرتے ہوئے ان حصوں کو نکال دیں گے، جو صحت کے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ سائنس دان ٹیسٹ ٹیوب میں ایک نئی زندگی کی تخلیق میں کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن تحقیق کے مراحل کا علم تو ہو گیا، مثلاً یہ کہ پہلے سے موجود نسل کے جینیاتی مواد کو لے کر ایک زندہ وجود کی تخلیق کر لینا، جیسے کلوننگ۔ جیسا کہ قیاس کیا جا سکتا ہے، جینیاتی سرجری کی بدولت ایک ''بہتر'' قسم کا انسان، یا ایک نئی نسل پیدا کی جا سکے گی۔ انسانیت اس وقت بے حساب علم کی مالک ہوگی اور ''خدائی کھیل'' کھیلنے لگے گی۔ سائنسی علم تو پہلے ہی بتا چکا ہے کہ وہ دائمی زندگی کی ضمانت دے گا۔ ایک شخص تھوڑی سی قیمت پر دائمی زندگی تو اب بھی حاصل کر سکتا ہے، وہ اس طرح کہ جینی لنک (Gene Link) نامی فرم کے سرد خانے میں اپنے جینیاتی مواد کے نمونے جمع کرا دے۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی مردہ عزیز کے جینیاتی بلیو پرنٹ محفوظ کر لینا چاہتا ہے تو یہ فرم تکفین کرنے والے ڈاکٹرز کو ہدایت کر دے گی کہ متوفی کے جسم میں سے گوشت کا ایک نمونہ کپڑے سے منہ پونچھ کر بلا تاخیر حاصل کر لیا جائے۔ یقیناً جب تک دماغ کے خلیوں کو محفوظ نہیں کیا جاتا، شخصیت زندہ تو نہیں ہو پائے گی، لیکن پھر بھی کرائی جینکس (cryogenies) کی ٹیکنالوجی جس کے تحت لاش کو آئندہ زندہ کرنے کے لیے منجمد کر دیا جاتا ہے، اپنے اندر ایک امکان تو رکھتی ہے۔

تہذیب کا پانچواں عہد انسانیت کو ہمیشہ سے زیادہ خطرناک اور گہرے تجربات کے درمیان میں پہنچا دے گا۔ اس وقت یہ پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ آیا وہ انسانی وجود کا آخری مرحلہ ہوگا یا انسان مزید ترقی کرے گا اور عالمی تاریخ کا ساتواں یا آٹھواں عہد بھی آئے گا۔ جب کمپیوٹر اپنا دماغ خود تخلیق کرنے لگے گا اور ایک فسادی بچے کی طرح اپنے والدین کی خواہشات کے خلاف عمل کرنے لگے گا، تب ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ فرانکنسٹین (یعنی اپنی ایجاد کے ہاتھوں اپنی تباہی) کا دَور آ گیا ہے۔ یہ حقیقت کہ کمپیوٹر سافٹ ویئر ایک نام نہاد وائرس بھی پیدا کر سکتے ہیں، یہ بتاتی ہے کہ انسان کی پیدا کردہ ذہانت نے ایک خودمختار زندگی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اگرچہ انسانیت مشینی آلات پر انحصار کرنے لگی ہے، تاکہ اونچا سننے والوں کی سمعی طاقت بڑھ جائے، دل کی حرکت معمول کی پابندی سے کام کرتی رہے اور جو اعضا باقی نہیں رہے، ان کی جگہ نئے اعضا لگا دیے جائیں، اس طرح کی طبی ترقی یہ بتاتی ہے کہ انسانیت کا مستقبل ایک آدمی بشمول مشین، یعنی کی دوغلی مخلوق کے ساتھ وابستہ ہوگا۔

دنیا کی تاریخ ختم نہیں ہو گی، جب تک انسانیت ختم نہیں ہو جاتی۔ ترقی اور جدوجہد، دونوں ساتھ جاری رہیں گی۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ آبادی کا ایک حصہ طبعی علاج سے پرہیز کرتا ہو اور ان کے وارثوں کا شمار ایک یکسر خالص لیکن خطرے سے دوچار خلقت میں ہونے لگے۔ اس وقت ''مصنوعی'' اور ''قدرتی'' انسانوں کے درمیان تنازعہ اٹھ کھڑا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ طبقہ اشرافیہ کے آمر کمپیوٹر کا سارا نیٹ ورک اپنے قبضے میں لے لیں اور انسانی آبادی کے ایک بڑے حصے کو کسی خطرے سے دوچار کر دیں۔ دوسری جانب تجربات کی تقسیم در تقسیم کا عمل یونہی جاری رہے اور تاریخ کی تصویر گنجلک نظر آئے۔ اس وقت جی چاہے گا کہ گزرے ہوئے دنوں کی شجاعانہ سادگی واپس آ جائے۔ آدمی اور مشین کے نقطہ اتصال پر ایک تخلیقی نوعیت کا عمل اور ردِعمل ہوسکتا ہے۔ حکومتیں، مذاہب، تجارت، تفریحات اور وہ ادارے جن کی ابھی کوئی شکل نہیں بنی، سب موجود ہوں گے۔ درجہ بہ درجہ اختیارات کا سماجی عمل بھی برقرار رہے گا۔

اختتام